DUE DATE

JC

Cl No. 378.54092 Acc. No. 196204
168PO

Late Fine **Rs. 1.00** per day for first 15 days.

Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

ذاکر حسین

استاد سے صدر جمہوریہ تک



ذاکر حسین

استاد سے صدر جمہوریہ تک

مُرتبہ

سیّدہ سیّدین حمید

انڈین کونسل فار کلچرل ریلشنز

ہر آنند پبلی کیشنز پرائیوٹ لمیٹڈ

پہلا ایڈیشن ۲۰۰۰ء
انڈین کونسل فار کلچرل ریلشنز
آزاد بھون اندر پرستھ اسٹیٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ناشر
ہر آنند پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ڈی۔۹، آنند نکیتن نئی دلّی۔۲۱

ٹائٹل کور
او۔ پی۔ شرما

آئی۔ ایس۔ بی۔ این

ISBN 81-241-0691-6

ہندوستان میں شائع ہوئی۔ پرنٹ لائن۔ نئی دہلی۔

سیّدہ سیّدین حمید

اظہارِ تشکّر

اس کتاب کی تیاری میں بہت سے لوگوں کی کاوشیں شامل ہیں جنھوں نے مل کر اس کی کوشش کی ہے کہ اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی ہمہ جہت اور دلکش شخصیت کی تصویر لوگوں کے سامنے آجائے۔ ان کے کارناموں پر اس طرح روشنی ڈالی جائے کہ یہ ان کی جیتی جاگتی یادگار بن جائے۔

جن حضرات کے مضامین اس میں شامل ہیں انھوں نے بھی اس کی کوشش کی ہے کہ اس زمانے میں جب کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت آنے والی نسلوں کے لیے اس اندھیرے میں مشعل راہ ثابت ہو۔

جناب خورشید عالم خاں گورنر کرناٹک کا میں کیسے شکریہ ادا کروں کہ ابتدا سے آخر تک وہ برابر اس کتاب کی تیاری میں دل چسپی لیتے رہے اور اس سلسلے میں طرح طرح کی جو مشکلات آئیں ان کو دور کرنے میں انھوں نے میری پوری مدد کی۔

ایڈیٹوریل بورڈ کے صدر جناب شاردا پرشاد اور دوسرے ممبران حضرات نے بھی اس کتاب کی تیاری میں پوری دل چسپی لی میں ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ بہت سے ادیبوں اور اسکالرز نے ترجمہ، پروف ریڈنگ اور دوسرے کاموں میں میرا ہاتھ بٹایا میں اُن سب کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ خاص طور پر ڈاکٹر صغرا مہدی، ڈاکٹر نیر جہاں اور مینہ مصرا کا۔

انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی پیدائش صدی کے موقع پر اس یادگاری جلد کا اجرا کرکے وقت کے اہم تقاضے کو پورا کیا، اس کے لیے وہ مبارک باد کی مستحق ہے۔ اس کے ڈائرکٹر جنرل جناب ہماچل سوم نے جو کوششیں اس سلسلے میں کیں، اس نے اس کام کو آسان کر دیا اور نائب صدر جمہوریہ اور آئی۔ سی۔ سی۔ آر کے صدر عالی جناب کرشن کانت نے اس کام میں ذاتی دل چسپی لی، میں تہہ دل سے ان کی ممنون

ہوں۔ اس کام میں بہت سے دوستوں نے میرا ہاتھ بٹایا، پروفیسر شکیل اختر فاروقی جنھوں نے اپنے والد مرحوم اور جامعہ کے ممتاز استاد اور آرٹسٹ جناب اختر حسن فاروقی کے تصویروں کے ذخیرے سے مجھے ذاکر صاحب سے متعلق گراں قدر تصویریں دیں۔ ذاکر صاحب کی نواسی ریحانہ مصر نے اپنا خاندانی البم میرے سپرد کر دیا اور وقتاً فوقتاً خاندان کے سلسلے میں معلومات فراہم کیں اور او۔ پی۔ شرما نے اس کتاب میں ان تصویروں کو ترتیب اور خوبصورتی سے پیش کرنے میں میری مدد کی۔ میں ان سب کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ جناب اے ایس بھسین نے نہ صرف میری ہمت افزائی، بلکہ عملی طور پر بھی اس کام میں مدد کرتے رہے، اُن کا شکریہ کیا ادا کروں کہ دوستوں کا حساب تو دل میں ہوتا ہے۔

ہر آنند پبلشرز کی بھی میں ممنون ہوں کہ ان کی وجہ سے یہ کتاب طباعت کے مرحلے طے کر سکی۔

اس کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جو آج ہم میں موجود نہیں ہیں، مگر روحانی طور پر وہ اس کام میں میری رہنمائی کرتے رہے اور وہ ہیں ذاکر صاحب کے زندگی بھر کے ساتھی رفیق اور اُن کے کاموں میں ان کے مددگار خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین اور صالحہ عابد حسین۔ میری زندگی پر ان تینوں کا جو گہرا اثر ہے، اسی کا فیضان ہے کہ میں یہ کام کر سکی۔

یہ کتاب کافی تاخیر سے شائع ہو رہی ہے۔ خدا کرے کہ اس پر یہ مثل صادق آئے کہ دیر آید درست آید۔

سیّدہ سیدین حمید
سیدین منزل
جامعہ نگر، نئی دہلی

सत्यमेव जयते

राष्ट्रपति
भारत गणतंत्र
PRESIDENT
REPUBLIC OF INDIA

پیش لفظ

ڈاکٹر ذاکر حسین نہ صرف ہندوستان کے صدر جمہوریہ تھے بلکہ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا بے مثل نمونہ بھی تھے۔ وہ ایک ایسے انسان تھے جن کی شخصیت میں اسلامی روایات اور اسلام کی روحانی قدریں سموئی ہوئی تھیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان کا نقطۂ نظر جدید اور سیکولر تھا۔ وہ ایک عالم تھے مگر وہ اپنے علم وفضل کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے جب ملک کا سب سے بڑا اعزاز ملا تو انھوں نے اسے نہایت انکسار مگر وقار کے ساتھ قبول کیا۔ ذاکر صاحب پہلے گورنر بنے پھر انھیں نائب صدر جمہوریہ بنایا گیا اور آخر میں صدر جمہوریۂ ہند۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ وہ ان عہدوں پر سیاست کے ذریعے سے نہیں تعلیم کے میدان سے آئے تھے۔ ایک ایسے استاد اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے جس نے اپنی پوری زندگی تعلیم کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی۔ اسی لیے اپنے صدر جمہوریۂ ہند کے انتخاب کے موقع پر انھوں نے جو پہلی تقریر کی تھی اس میں کہا تھا "مجھے امید ہے کہ آپ سب حضرات مجھے معاف فرمائیں گے مگر میں یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اس منصب کے لیے میرا انتخاب بہت حد تک نہیں، تمام تر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ میری وابستگی ہندوستان کے لوگوں کی تعلیم سے ایک طویل عرصے سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم وہ ہتھیار ہے جسے ہم قومی مقاصد کے حصول میں کام میں لا سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کا تعلیمی معیار ہی ہماری قوم کے معیار کا تعین کرے گا۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین غیر معمولی صلاحیتوں کے استاد اور ماہر تعلیم تھے۔ گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک کے تحت ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ سے خود کو وابستہ کر لیا تھا جس کے بارے میں پنڈت نہرو نے کہا تھا "جامعہ عدم تعاون تحریک کا تندرست اور چونچال بچہ ہے۔"

جامعہ سے خود کو وابستہ کرنے کے فیصلے کے بارے میں ذاکر صاحب کہتے تھے کہ "یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری فیصلہ تھا جو میں نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ یہی میری زندگی کی بنیاد ہے جس پر میری پوری زندگی کی عمارت تعمیر ہوئی۔" ذاکر صاحب بار بار اس بات کو دہراتے

رہے جس پر اُن کا پورا یقین تھا کہ "ہمارے قومی نشاۃ الثانیہ کو آنے کے لیے سیاست کے "تنگ دروازوں کی نہیں تعلیم کے کشادہ دروازوں کی ضرورت ہے"۔

ذاکر صاحب کے تعلیمی تصورات کی بنیاد جرمن تصورات تعلیم تھے اور وہ گاندھی جی کے خیالات سے بھی متاثر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں قومی ایجوکیشن کانفرنس میں انھوں نے گاندھی جی کی مجوزہ اس تعلیمی اسکیم پر تنقید کی تھی جس میں مرکزیت ہاتھ کے کام کو دی گئی تھی۔ گاندھی جی ان کی تعلیمی سوجھ بوجھ کے بہت قائل تھے۔ اسی لیے انھوں نے ذاکر صاحب کو واردھا تعلیمی اسکیم کی نصاب کمیٹی کا صدر بھی منتخب کیا تھا۔ قومی تعلیم کی تعمیر میں ذاکر حسین نے جو رول ادا کیا ہے گاندھی نے کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا بلکہ یہاں تک کہا "اگر ذاکر حسین نہ ہوتے تو شاید مجھے اپنی تعلیمی اسکیم کو ترک کرنا پڑتا"۔ ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کو جامعہ میں عملی جامہ پہنایا۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے علاوہ دوسرے لیڈران قوم نے بھی جامعہ میں بنیادی تعلیم کے کامیاب تجربے کو سراہا۔ گاندھی جی کو جامعہ سے کس قدر گہرا تعلق تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کہتے تھے "میں جب جامعہ آتا ہوں مجھے لگتا ہے میں اپنے گھر آیا ہوں"۔ جامعہ جب سخت مالی بحران سے گزر رہی تھی اور یہ سوچا جا رہا تھا کہ اسے بند کر دیا جائے تو گاندھی جی نے کہا تھا "جامعہ بند مت کرو۔ میں اس کے لیے قوم سے بھیک مانگ لوں گا"۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک ایسا زندہ تاریخی ادارہ ہے جو ذاکر صاحب کی تعلیمی سوجھ بوجھ کی زندہ مثال ہے۔ ایک بات اور بھی میں بتانا چاہتا ہوں کہ ذاکر صاحب تعلیم نسواں کے حامی تھے اور کہا کرتے تھے کہ "عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ وہ ہے جو میرے دل سے قریب ہے"۔ ذاکر صاحب کو اس پر بہت غم و غصہ تھا کہ مسلمان تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں۔ اور وہ تعلیمی تحریک جو سرسید احمد خاں نے شروع کی تھی اس کے اثر سے تعلیم صرف مسلمانوں کے ایک طبقے تک محدود رہی۔ ایک دفعہ انھوں نے راجیہ سبھا میں کہا تھا "تعلیم جمہوری ریاست کی جان ہے۔ یہ تعلیم ہی ہے جو ہمیں مستقبل کا مشترکہ وژن دے سکتی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ہم کوشاں ہیں۔ یہ ایک حیرت ناک بات ہے کہ مہاتما گاندھی پنڈت نہرو ذاکر صاحب اور دوسرے سماجی مصلح برسوں سے برابر تعلیم کی اہمیت پر زور دے رہے ہیں مگر آج بھی ہم دنیا کے مقابلے میں تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ اس لیے ہم سب جی جان سے اگر تعلیم کے فروغ میں لگ جائیں تو یہ ذاکر صاحب کو یاد کرنے کا سب سے اچھا طریقہ ہے اور انھیں ہمارا نذرانۂ عقیدت بھی۔

آج جب کہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے اس میں نت نئی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ خیالات اور تصورات بدل رہے ہیں۔ ذاکر صاحب کے خیالات و تصورات آج بھی اتنے ہی کارآمد ہیں

جتنے ان کے زمانے میں تھے۔ نئے تھیوریوں اور نئے نظام کے فلسفی جو یہ بات کہہ رہے ہیں کہ اب تک جو نسلی تصادم ہے وہ تہذیبوں کے تصادم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ بات ناگزیر ہے۔ ذاکر صاحب کا کہنا تھا کہ "تہذیبیں نہیں ٹکراتیں، انسانوں کا وحشی پن ٹکراتا ہے اور یہ ٹکراؤ تصادم بھی کبھی نہ ہو اگر لوگ اپنے اندر کے وحشی پن پر قابو پالیں اور مل جل کر رہیں اور اپنی تہذیبی قدروں کا آپس میں تبادلہ کریں۔" پروفیسر سموئل ہنٹنگٹن کی تھیوری "تہذیبوں کا تصادم" کا یہ منہ توڑ جواب ہے جو ذاکر صاحب نے اب سے بہت پہلے دیا تھا۔

ذاکر صاحب ایک مہذب اور صحیح معنی میں ایک اچھے انسان تھے جیسا کہ گاندھی نے جامعہ کے جشن سیمیں کے موقع پر کہا تھا "ایک اچھے انسان کی اچھائی ہی اس کی اصلی جوبلی ہے۔" ذاکر صاحب زندگی کی خوب صورت چیزوں سے خوش ہوتے تھے۔ گلابوں کا وہ باغ جو انھوں نے مولانا آزاد روڈ والے اپنے رہائشی مکان میں لگایا تھا جسے دیکھ کر آج بھی ایک عجب خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے قوم کو جو انسانی قدریں دی ہیں وہ بہت قیمتی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۶۰ء میں ماولنکر میموریل لیکچر دیتے ہوئے جو الفاظ کہے تھے، ان ہی الفاظ پر میں اپنی بات ختم کروں گا۔ یہ وہ باتیں ہیں جنھیں نظر انداز کرنا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ انھوں نے کہا تھا " آج کل سیاست داں اور پبلک سروس سے متعلق لوگ ہماری گفتگو کا خاص موضوع ہیں۔ ایک طرف تو میرا یہ خیال ہے کہ ان کی جو تصویر ہم کھینچتے ہیں اس میں کچھ زیادہ ہی تیکھے رنگ بھر دیتے ہیں۔ دوسری طرف میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ ان لوگوں کا اپنے فرض کی طرف جو لاپرواہی کا رویہ ہے اسے انھیں بدلنا چاہیے غلط باتوں سے چشم پوشی کرنا پھر ان کے طرح طرح جواز تلاش کرنا اور پھر ان کے خلاف اقدام کرنا، یہ صحیح رویہ نہیں ہے۔ بعض وقت ایسی صورت حال ہوتی ہے کہ انھیں اس سے پریشان ہو کر فوراً اس سے نمٹنا چاہیے۔ یہ ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے۔"

کے۔ آر۔ نرائنن
صدر جمہوریۂ ہند

شجرۂ نسب

حسین —— حسین خاں، مدہ آخون

- احمد حسین
  - محمد حسین
    - غلام حسین
      - عطا حسین
      - فدا حسین
        - مظفر حسین
          - خدیجہ بیگم
          - امتیاز حسین
          - مسعود حسین
        - عابد حسین
        - ذاکر حسین
          - صفیہ
          - سعیدہ
        - زاہد حسین
        - یوسف حسین
          - راشدہ
          - اجمل حسین
          - نہرو
        - جعفر حسین
        - محمود حسین
          - انور حسین

فہرست مضامین

حصہ دوم : ذاکر صاحب کے معاصرین کا ان کی خدمت میں خراج عقیدت

حصّہ سوم : ذاکر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلو

مقدّمہ

ہندوستان انگریزوں کی طویل غلامی سے آزاد ہوا تو اس وقت یہاں ایسے بلند قامت سیاست دانوں کی بڑی تعداد تھی جو غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جیسے پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ولبھ بھائی پٹیل، راجندر پرشاد اور بی آر امبیڈکر۔ اسی کے ساتھ ان کی مدد کے لیے تعلیم کے میدان میں بھی باصلاحیت اور اعلیٰ خصوصیات کے حامل شخصیات موجود تھیں جن میں دو ماہرین تعلیم نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر رادھا کرشنن اور دوسرے ڈاکٹر ذاکر حسین۔ جو بعد میں ہندوستان کے اعلیٰ ترین عہدہ صدارت جمہوریہ ہند پر بھی فائز ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ہندوستان سے جہالت، غریبی اور بیماریوں کو اس حد تک دور نہیں کر سکے جس حد تک کچھ اور ممالک نے ان کو دور کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ ان عظیم لیڈروں کے سبھی سوانح نگاروں نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ باوجود ایک طویل مدت تک اعلیٰ عہدوں پر رہنے اور شاندار کارنامے انجام دینے کے اپنے آخری زمانے میں ان پر ایک یاس کی کیفیت طاری رہتی کہ وہ ان کاموں کو اسی طرح انجام نہ دے سکے جیسا کہ وہ چاہتے تھے۔ ایک خلش سی رہتی تھی جیسا کہ شیکسپیئر نے ہیملٹ میں لکھا ہے کہ "ڈنمارک کی ریاست میں سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔" ایس۔ ایس گل پنڈت نہرو کے دُکھ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ایک حسّاس مہذب اور تنہائی پسند انسان قومی زندگی کے بھنور میں پھنس گیا۔ اور وہ زندگی گزاری جس سے ان کو طبعی مناسبت نہیں تھی۔ اگر مقصد اتنا عظیم نہ ہوتا یعنی ملک کو آزادی دلانا تو وہ اس تحریک میں شامل نہ ہوتے۔ ان کا رجحان سیاست کی طرف نہیں تھا۔ مگر حالات کی وجہ سے سیاست ان کی تقدیر بن گئی۔"

سردار پٹیل کے بارے میں ان کے سوانح نگار راج موہن گاندھی نے لکھا ہے منی بین کا کہنا تھا کہ آخری دنوں میں ان کے وردِ زبان نظیر اکبر آبادی کا یہ مصرعہ رہتا تھا ؎

زندگی کا یہ تماشا چند روز

سیاسی جدوجہد سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ اس میں کسی اور دلچسپی کا گزر ہی نہیں تھا۔ نہ خدا کا نہ انسان کا۔ وہ جب اس قید سے آزاد ہوئے تو نہ انھوں نے کوئی شیریں نغمہ سنا نہ کوئی کتاب کھولی۔ راجہ گوپال اچاریہ کے نواسے ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "جب ان کے خیالات پلٹا کھاتے اور ان کا رخ ہندوستان کے نظام حکومت کی طرف ہوتا تو ان پر عجب بیزاری اور افسردگی کی کیفیت طاری ہو جاتی جب وہ کراہت آمیز سیاسی کاروبار اور اونچی سطحوں پر بھی ہر قسم کی بدعنوانیاں دیکھتے۔" مولانا آزاد کے بارے میں بھی ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں "ان پر اس عرصے (۱۹۴۷ء - ۱۹۵۸ء) میں برابر شدید افسردگی کی کیفیت طاری رہتی۔ کیونکہ ان کو اس ہندوستان میں رہنا پڑ رہا تھا جو ان کے اس خواب کی تعبیر تھا جو ادھورا ہی رہ گیا تھا۔ اور زندگی بھر جن مقاصد کے لیے وہ جیے تاریخی حرکات نے ان کو خاک میں ملا دیا۔"

محمد مجیب جو ذاکر صاحب کے قریبی دوست اور رفیق کار تھے انھوں نے ذاکر حسین کے تعلیمی معیار اور نظریات کے باب میں لکھا ہے کہ "ذاکر صاحب کا المیہ یہ تھا کہ بحیثیت معلم ان میں جو قوت محرکہ تھی وہ ان کو ہر وقت سرگرم عمل رہنے پر اکساتی مگر ماحول سے انھیں اس کے مطابق مدد نہیں مل پاتی تھی ان میں منصوبہ بنانے اور حالات کا صحیح صحیح اندازہ لگا کر اس کے مطابق قدم اٹھانے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ وہ ایک طریقہ کار سوچتے اور نہایت جوش و خروش سے سرگرم عمل ہو جاتے۔ جامعہ میں ان کے ساتھ کام کرنے والے بھی یہ سوچنے لگتے کہ ان کی طرح کام کرنا اور ان کو مطمئن کرنا ممکن نہیں اور بحث و مباحثہ سے بھی ان کو اپنا ہم رائے بنانا آسان نہیں ہے اس لیے وہ جو کام دیتے اسے یہ لوگ بے دلی سے انجام دیتے اور ساتھ ساتھ ان مشکلات کو ان کے سامنے پیش کرتے رہتے۔ جو عام طور پر تو حقیقت پر مبنی ہوتیں اور کبھی اپنی کمیوں کو چھپانے کا ایک بہانہ ہوتا۔ جامعہ کے نسبتاً محدود ماحول سے نکل کر کم ایسے لوگ ان کو ملے جو ان کے عزائم کو سمجھتے اور ان کا ساتھ دیتے۔ اس لیے ان کی قوت عمل کو جیسے جیسے بظاہر سکون کے موقعے میسر آئے ان کی افسردگی بڑھتی گئی۔" محمد مجیب کی عالمانہ دیانت داری پر حرف گیری ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کا یہ تجزیہ بہت صحیح کیا ہے۔ ذاکر صاحب کی زندگی کے واقعات اور جامعہ سے باہر تیس سالوں کو دیکھیں تو اس سے اس تجزیہ کی پوری طرح تصدیق ہوتی ہے۔ اس تجزیہ اور متذکرہ بالا سوانح نگاروں نے جو دوسری شخصیات کا تجزیہ کیا ہے اس میں بہت مماثلت ہے۔ یہ سب وہ لوگ تھے عوامی زندگی میں جنھیں شہرت ملی۔ ان کے کارناموں کو سراہا گیا مگر ذاتی زندگی میں یہ سب آخر میں ایک افسردگی کی کیفیت میں رہے۔ ان کو لاحاصلی کا احساس رہا۔ اور یہی ان سب کا المیہ ہے۔

۱۹۵۹ء میں جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر تھے تو انھوں نے عبدالماجد دریابادی کو

ایک خط میں ۱۹۴۷ء کے اس واقعہ کو بیان کیا تھا جب وہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر فسادیوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے اگر ان کا پرانا طالب علم جو ایک افسر تھا ان کو بچا نہ لیتا۔ وہ اس وقت بال بال بچ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت سے انسان اگر بچ بھی جائے مگر اس اذیت سے نہیں بچ سکتا جو اس کو اپنے نظریات اور مقاصد کو خاک میں ملتے دیکھ کر ہوتی ہے۔

"... اپنی جان بچنے پر یہ کہہ سکتا نہیں کہ خوش ہوں کہ شرمندہ۔ دوبارہ یہ نعمت دی گئی اور اس سے کچھ کام نہ لیا اس پر ندامت ہی زیادہ ہے۔ دعا فرمائیے کہ جو باقی ہے وہ ٹھیک کٹے اور خاتمہ بالخیر ہو"

یہی احساس شکست ان کی کچھ اور تحریروں اور خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ سوائے امید کی ایک کرن کے جو ہر قسم کے حالات میں ان کے ساتھ رہی۔ ایک استاد کی امید۔

نومبر ۱۹۶۲ء میں انھوں نے کشمیر یونیورسٹی کے طالب علموں کو خطاب کرتے ہوئے ان کو ہدایت کی کہ وہ حکومت کے شہنشاہیت کے تصور اور جنگ جویانہ قومیت سے اپنے کو الگ رکھیں۔ مہذب زندگی گزارنے کے لیے کم سے کم انھیں یہ کوشش کرنا چاہیے کہ ملک سے نا بینی، محرومی، جہالت اور بیماریاں دور ہوں۔ مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش پر ۲؍اکتوبر ۱۹۶۷ء میں انھوں نے نرم اور مہذب انداز میں اس بات کی کمی کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا کہ چھوت چھات کو ختم کرنے کے لیے ہندوستان میں جس حد تک کوششیں ہونا چاہئیں تھیں وہ نہیں ہو پائی ہیں۔ اسی طرح نشہ بندی، آپسی نفاق، بدنظمی اور عورت مرد کی حیثیت میں جو نمایاں فرق ہے اس میں بھی زیادہ کمی نہیں ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کی ذمہ داری حکومت پر نہیں خود قوم پر ہے۔

اس جلد میں ان کی اسی قسم کی تقریروں کا انتخاب شامل کیا گیا ہے اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ ذاکر صاحب کو ان تقریروں کے آئینے میں ایک نئے زاویہ سے دیکھا جائے اس لیے اس کا عنوان اسی مناسبت سے "ذاکر صاحب: استاد سے صدر تک" رکھا گیا ہے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ اپنے بچپن سے ہی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کو جانتی تھی۔ ہمارے خاندان میں جب کوئی اہم موقع ہوتا تو اس میں وہ ضرور شامل ہوتے۔ میرے بزرگ ان کی جادوئی شخصیت کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہم بچے پوری طرح اس محبت کی گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ ہمارے خاندان کا یہ معمول تھا کہ ہر ہفتے نئی دہلی سے جامعہ جو جمنا کے کنارے آباد ہے ضرور جاتا۔ ایک اجاڑ بستی جہاں بجلی نہ پانی۔ ہم بچے یہاں آنے سے کئی کاٹتے مگر ہمارے والدین ہمیں زبردستی ساتھ لاتے اور ہم یہ سوچتے کہ آخر اس اجاڑ بستی میں ہم کیوں رہیں گے۔ ہم جو کانونٹ میں پڑھتے۔ اس کے مقابلے میں جامعہ کا ماحول ہمیں بہت عجیب ہوا غیر آباد سا لگتا۔ جب ہماری کار جامعہ کے اوبڑ کھابڑ راستوں پر دھکے کھاتی

چلتی تو ہم لوگ منہ بناتے۔ چاروں طرف کیکر کے پیڑ۔ زمین پر بجری کا فرش۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس وقت یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہمارے یہ خیالات کتنے کھوکھلے ہیں۔ کاش کوئی۔ ذاکر صاحب ہی ہمیں یہ احساس دلاتے کہ ہم خود مُجوش ہیں کہ جامعہ جیسی درس گاہ کی عظمت کا ہمیں احساس نہیں ہے۔ ہم پبلک اسکول کی تعلیمی قدروں کی بدولت احساسِ برتری میں مبتلا تھے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم اس پر نازاں تھے کہ ہم پبلک اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ ایک طرف میرا یہ پس منظر۔ دوسری طرف ذاکر صاحب کی عظمت اور محبت کا نقش جو دانش وروں، سیاست دانوں اور عام لوگوں کے دلوں پر یکساں طور پر ثبت ہے۔ میں نے ان کی سوویں سالگرہ پر اس جلد کی تدوین کا کام اپنی کم مائگی کے احساس کے ساتھ اپنے ذمہ لیا۔ جب میں نے یہ کام شروع کیا تو اپنے بزرگوں کے برعکس ذاکر صاحب کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے یکسر ناواقف تھی۔ مگران دو سالوں میں اس کام کے دوران میں نے ذاکر صاحب کو جس حد تک جانا اس کو انگریزی شاعر کیٹس کے الفاظ میں بیان کرسکتی ہوں۔

میں نے سیّارہ بینوں کی طرح آسمان کو دیکھا تو
ایک نیا ستیارہ میری آنکھوں میں متحرک تھا

میں جیسے جیسے ذاکر صاحب کی تحریروں اور تقریروں کو پڑھتی گئی مجھ پر نئی نئی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا گیا اور ان کی شخصیت کی عظمت کا راز مجھ پہ کھلنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ ان کی تحریروں، ان کی کہانیوں، ان کے دوستوں اور ساتھیوں کی تحریروں کے ذریعے مجھ پر ان کی تہہ دار شخصیت کی پرتیں کھلتی گئیں۔ اور میں اُن کی شخصیت کے سحر میں کھونے لگی۔ اس کی مثال محمد مجیب کے مضمون (ایک نرم دل مفکر اور دوست) کا یہ اقتباس ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کا کس قسم کا تاثر لوگوں پر ہوتا تھا۔ وہ یہ گُر جانتے تھے کہ کب، کن اور کہاں لفظوں کو استعمال کیا جائے جس کا لوگوں پر بھرپور تاثر ہو اور تا دیر رہے۔

مجیب صاحب لکھتے ہیں " ذاکر صاحب اگر کبھی اپنے بارے میں کوئی بات کرتے بھی تو نہایت سرسری انداز میں مثلاً انھوں نے مجھے یہ واقعہ اس طرح سنایا کہ جیسے کوئی مزیدار قصہ ہو۔ کہنے لگے آپ کو ایک بات بتاؤں۔ چند سال ہوئے میں پنجاب یونیورسٹی کے لیے گورو گوبند سنگھ کے بارے میں ایک تقریر لکھ رہا تھا کہ میں نے ایک دم محسوس کیا کہ کاغذ پر پانی کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ میں حیران رہ گیا۔ پھر محسوس کیا کہ یہ تو میرے آنسو ہیں۔ میں نے ان کو پونچھا اور پھر لکھنے لگا۔ پھر یہ خیال آیا کہ اگر تقریر کرتے ہوئے بھی میری یہی کیفیت ہوئی تو میں کیا کروں گا۔ میں نے پوچھا " پھر ہوا کیا " مسکرا کر بولے ہاں وہاں بھی آنسو نکلے مجھے عجیب۔ مالگ رہا تھا مگر سوچا کون دیکھے گا۔ مگر مجمع پر میں نے ایک نظر ڈالی تو دیکھا سب لوگ رو رہے تھے۔" اچھا یہ تقریر مجھے دیجیے گا۔" میں نے کہا " ضرور میں اپنے سکریٹری سے

کہہ دوں گا کہ وہ آپ کو بھیج دے۔ مگر اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں کہ آپ اسے پڑھیں"۔

اس یادگاری جلد کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ذاکر صاحب کے مضامین اور تقریریں ہیں۔ دوسرے میں ان کے مشہور اور اہم ہم عصروں اور رفیقوں کے مضامین ہیں۔ تیسرا حصہ ستائیس مضامین پر مشتمل ہے۔ جو خاص طور سے اس یادگار جلد کے لیے لکھے گئے ہیں۔ یہ سب ممتاز لوگ ہیں جن کو ذاکر صاحب سے عقیدت ہے اور ان کے قریب بھی رہے ہیں۔ ذاکر صاحب سے گہری واقفیت ہے۔ ذاکر صاحب کی اپنی تصانیف کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلا مضمون تو وہ ہے جو انھوں نے چودہ سال کی عمر میں ۱۹۱۱ء میں لکھا۔ جب وہ اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اس مضمون کو پڑھ کر اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا وہ نصب العین جو بعد میں ان کی عوامی زندگی کے زمانے میں سامنے آیا۔ اس کی داغ بیل چودہ سال کی عمر میں پڑ چکی تھی۔ اس مضمون کا عنوان ہے "ایک طالب علم کی زندگی"۔

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک طالب علم کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ انھوں نے اس میں یہ بتایا کہ "علم حاصل کرنے کا مقصد دولت کمانا نہیں بلکہ بے پڑھے لکھے بھائیوں کو علم کی دولت سے مالا مال کرنا ہے اور ایک اعلیٰ اخلاقی معیار کو پہنچنا ہے۔ اگر کوئی طالب علم دولت کمانے کے لیے علم حاصل کرتا ہے تو یہ نہ اس کے شایان شان ہے نہ انسانیت کے"۔ اسی مضمون میں نہیں تقریباً اپنی سبھی تقریروں اور تحریروں میں انھوں نے بارہا اس پر زور دیا ہے کہ ہمیں کوئی کام صرف اپنے محدود ذاتی مفاد کے لیے نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس دوسروں کا مفاد اور بھلائی ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔ یہ صوفیا کا مسلک ہے۔ جو انھوں نے اپنے پیر حسن شاہ سے حاصل کیا تھا۔ جو ایک صوفی تھے اور طریقت کے قائل تھے۔ ذاکر صاحب کا پورا خاندان ان سے متاثر تھا۔ اس انتخاب میں شامل اکثر مضامین میں اس کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اس بات کی سخت مذمت کی موجودہ دور میں تعلیمی اداروں میں جو تعلیم ہو رہی ہے۔ اس کا مقصد ذاتی مفاد کا حصول ہے اور بس۔ ان کی زندگی کا خلاصہ اکبر الٰہ آبادی کے اس مصرع میں بہت خوبی سے بیان کیا گیا ہے ؎

بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

اس خامی کو موجودہ نظام تعلیم سے جڑ سے نکال کر پھینکنے پر ذاکر صاحب نے بار بار زور دیا کہ ایسے نظام تعلیم کو لانا ہے جس سے موجودہ نسل کے نوجوانوں میں سماجی فلاح و بہبود کے کاموں کا شغف پیدا ہو۔ غریبی جہالت اور بیماریوں کو ہندوستان سے ختم کرنے کی جدوجہد کرنے کا جذبہ ہونا چاہیے۔ یہ صرف زبانی جمع خرچ تھا نہ لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے یہ باتیں کہی گئی تھیں، یہ ذاکر صاحب کے دل کی گہرائیوں سے نکلی آواز تھی۔

ان خیالات کو انھوں نے کس طرح عملی جامہ پہنایا۔ اس کی تفصیل آپ کو اس انتخاب کے صفحوں میں ملے گی۔ جس میں زیادہ تر ان کے وہ خطبے ہیں جن کا موضوع تعلیم ہے اور جنھیں انھوں نے الگ الگ مقامات اور پلیٹ فارم سے پیش کیا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں دہلی میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس میں ان کی پہلی تقریر ہوئی۔ دوسری تین سال بعد اسی کانفرنس میں ہوئی۔ تیسری اس سلسلے کی وہ تاریخی تقریر ہے جو انھوں نے ۱۹۴۱ء میں جامعہ میں دوسری بنیادی تعلیم کی کانفرنس میں کی۔ جامعہ جو بنیادی تعلیم کا گہوارہ تھا اس تقریر میں انھوں نے ملک کے لیڈروں سے اپیل کی تھی وہ ایسے ملک کی بنیاد ڈالیں جس میں ایک فرقے کے لوگوں کا دوسرے فرقے کے لوگوں پر اعتماد ہو ان میں آپس میں اتحاد ہو۔ ہر انسان کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا موقع ملے۔ انھوں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد سے جو اس کانفرنس کا افتتاح کرنے والے تھے۔ معلموں کی طرف سے کہا تھا " خدا کے لیے جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے۔ کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو۔ غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے۔ جس میں تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھول پھل سکیں۔ ہر ایک ہر دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو سماج کی فلاح و بہبود میں لگا دے۔"

ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ "موجودہ صورت حال میں استاد کس طرح انسانی ذہن کی تربیت کر سکتا ہے۔ آج کل جو حالات ہیں انھوں نے سب کو اس قدر پریشان کر دیا ہے کہ ہر شخص خوف زدہ ہے نہ کوئی سمجھ سکتا ہے نہ سمجھا سکتا ہے۔" اسی تقریر میں جو بنیادی تعلیم کے موضوع پر شاہکار سمجھی جاتی ہے اس میں ذاکر صاحب نے کہا کہ " ہم تعلیم دینے والوں کی حالت قابل رحم ہے۔ ہم کب تک سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں کب تک شبہے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں، کب تک ہم اس ڈر سے تھرّاتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت کو کوئی ایسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم نہ کر دے ہمارا کام کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں۔ اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اکثر دل ٹوٹتا ہے پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں۔ کیا اس سماج میں جہاں بھائی یک دل نظر نہیں آتے کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں۔ کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں۔ کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔"

مہاتما گاندھی نے ذاکر صاحب کا انتخاب تعلیم کی اشاعت کے لیے منتخب کیا تھا۔ جامعہ اسی لیے بنیادی تعلیم کی تجربہ گاہ بن گئی جہاں طرح طرح کے منصوبے بنا کر ان کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ اور ان منصوبوں کی تفصیل کو بنیادی تعلیم کے مرکزوں میں بھیجا گیا۔ گاندھی کو یہ بھروسہ

تھا کہ جامعہ یہ کام کرلے گی۔ اس لیے کہ ان کو ذاکر صاحب پر اعتماد تھا کہ ان کی سربراہی میں یہ کام ہوسکے گا۔ دنیا بھر کے ماہرینِ تعلیم جیسے مورگن زیلیا کس ڈاکٹر زیلینس ڈاکٹر بو دٹ ڈاکٹر ایبٹ اور مسٹر وڈ جامعہ آئے اور یہاں کے طریقۂ تعلیم اور بنیادی تعلیم سے متعلق کاموں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ جامعہ ذاکر صاحب کے "مستقبل کے اسکول" کا ایک نمونہ تھا۔ ایسا نمونہ جس کی مثال لہریں مارتی ہوئی ندی سے دی جا سکتی ہے جیسا کہ انھوں نے ۱۹۴۱ء میں یوپی کی سکنڈری ایجوکیشن کانفرنس میں کہا تھا:

"دریا کی روانی میں ایک قسم کی شان اس کی گہرائی میں اسرار ہے مگر یہی چھوٹا سا چشمہ جو کنکروں اور پتھروں کے چاروں طرف بہتا ہے آپ کا دل موہ لیتا ہے، مستقبل کے اسکول کا بھی یہی حال ہے اگر آپ کے ذہن میں اس کا دھندلا سا تصور بھی ہو تو آپ اسے اپنا دل دے بیٹھیں گے۔"

ذاکر صاحب کی بعد کی تحریروں میں خاص طور سے جو انھوں نے اس صدی کے چوتھے دہے کے وسط میں لکھی ہیں۔ اس میں ایک دم تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں دونوں قوموں میں تفرقہ پیدا ہو گیا تھا اور اس کا انجام ملک کی تقسیم کی صورت میں سامنے آگیا۔ یہ تبدیلی ذاکر صاحب کے اور ان کے دوستوں اور رفیقوں کے یہاں بھی نظر آتی ہے وہ سب اپنی اپنی طرح ان سے نمٹے۔ ذاکر صاحب نے اس زمانے کی سیاسی صورت حال سے آئندہ پیدا ہونے والے خراب نتائج سے لیڈروں کو آگاہ کیا۔ برادرانِ قوم پر غم و غصے کا اظہار کیا۔ ان کی یہ تحریریں چاہے مختصر ہوں یا طویل مگر بہت پُراثر ہیں۔ ہم نے ان کو اس انتخاب میں شامل کیا ہے کہ ذاکر صاحب کے اس کرب کا اندازہ کیا جا سکے جس سے وہ اور ان کے سب ہم خیال ان کے زمانے کے لوگ گزرے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جامعہ اپنا جشنِ سیمیں منا رہی تھی اس موقع پر یہ ذاکر صاحب کی شخصیت کا کمال تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈر ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہوئے کہ یہ سب ہی ذاکر صاحب کی قدر کرتے تھے۔ ذاکر صاحب نے ان لیڈروں سے تعلیمی برادری کی طرف سے اپیل کی:

"آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں لوگوں کے دلوں میں آپ کے لیے جگہ ہے۔ آپ کی یہاں موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر اخلاقی فضا پر ہم انسانی اخلاق

کو کیسے سنوار سکیں گے۔ بربریت کے دَور میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے۔ آپ کو کیا بتائیں ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگائی۔"

"نئی روشنی" میں انھوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں جس میں خاص طور سے مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے۔ کہیں انھوں نے ہدایت کی، کہیں ان کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ کہیں ڈانٹا ہے کہیں جھنجھوڑا ہے تاکہ وہ غفلت سے چونکیں۔ بیشتر جگہ ان کی اپیل دونوں قوموں سے ہے۔ جس میں انھوں نے اتحاد کی قدیم روایت کو زندہ رکھنے پر زور دیا ہے۔ جیسے ان کی "بھائیو، دوستو، ساتھیو" والی تقریر:

"اب جب کہ آزادی کا سورج نکل آیا ہے ہمارے دل ایک دوسرے سے کیوں اجنبی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری آنکھوں نے ایک دوسرے کو پہچاننا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ دوستو، دوستی کے قاعدے برتو، دوستوں کو دشمن مت جانو۔ صدیوں کی دوستی کو عارضی دیوانگی کی حالت میں جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکو۔"

ان کی اس قسم کی تقریروں میں مایوسی بھی ہے اور امید بھی۔ کبھی وہ ہجرت کے بعد بچے کھچے مسلمانوں کی دلدہی کرتے ہیں کہ وہ اپنی مادر وطن جہاں ان کے آباؤ اجداد رہتے آئے ہیں اس میں اپنی منقسم زندگی کو مجتمع کر سکیں۔ "قرار یا فرار" ان کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے فی البدیہہ جامعہ برادری کے سامنے کی تھی:

"قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے نازک موقع آتے ہیں یہ وقت قدرت کی طرف سے آزمائش کا ہوتا ہے۔ اب آپ کے سامنے یہ سوال ہے کہ آپ اس آزمائش سے گزرنا چاہتے ہیں یا اس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا فیصلہ بھاگ نکلنے کا ہے تو بسم اللہ۔۔۔۔۔ پاکستان کا راستہ کھلا ہوا ہے جو جانا چاہے شوق سے جائے مگر یاد رکھیے موت آپ کا پیچھا وہاں بھی نہ چھوڑے گی۔ کتنے ہوں گے جو راستے میں مارے جائیں گے۔ کتنے ہوں گے جو ریل کے بند ڈبوں میں گھٹ کر مر جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کا فیصلہ اس آزمائش سے گزرنے کا ہو تو پھر یہاں ڈٹ جائیے۔ یہ یاد رہے کہ بہت ممکن ہے کہ آپ مار ڈالے جائیں لیکن آپ کا یہ قتل رائیگاں نہیں جائے گا۔ بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جن پر قاتل شرماتے ہیں اور مقتول فخر کرتے ہیں۔ بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جو

پوری زندگیوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ بعض قتل گرتی ہوئی قوموں کو سنبھال لیتے ہیں۔ گرتی ہوئی قوموں کو اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔"

ذاکر صاحب کا تعلق اس نسل سے تھا جس کا یہ عقیدہ تھا کہ طاقت کمزور کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ یہ لوگ گاندھی جی کے اصولوں کو مانتے تھے۔ جسمانی طاقت کے قائل نہیں تھے۔ جامعہ کے لوگوں میں عجب اخلاقی قوت تھی۔ جو بڑی سی بڑی طاقت کو جھکا سکتی تھی۔ کھدر کی شیروانیوں، ورگاندھی کیپ میں مرد اور برقعوں میں عورتیں جس طاقت کے مالک تھیں اس کا اندازہ مشکل ہے۔ ان کے لیے دو لفظ استعمال کیے جا سکتے ہیں کہ ان میں ایک لگن تھی، جنون تھا جس کی ایک مثال گریڈا فلپس بورن تھیں۔ جرمن نژاد ذہین اور خوب صورت خاتون جن سے ذاکر صاحب کی دوستی جرمنی میں ہوئی تھی۔ انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی ذاکر صاحب کے ساتھ ان کے مقصد کے حصول میں کھپا دیں گی۔ جو جامعہ برادری میں آپا جان کہی جاتی تھیں۔ جو آخری وقت تک ذاکر صاحب کے شانہ بشانہ جامعہ کے کاموں میں مصروف رہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۴۳ء میں ہوا۔ مجیب صاحب برلن اور جامعہ میں ان کے ساتھ رہے۔ ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ اپنی کتاب "ذاکر حسین" میں فلپس بورن کا ذکر مجیب صاحب نے جہاں کیا ہے اس حصے کو بھی ہم نے اس انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ مجیب صاحب نے ایک مضمون بھی ان پر لکھا ہے جو جامعہ کے رسالہ 'جوہر' میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی انھوں نے آپا جان کی ایثار و قربانی کا ذکر بہت مؤثر انداز میں کیا ہے۔ ابھی حال میں صغرا مہدی نے بھی ان پر بچوں کے لیے ایک چھوٹی سی کتاب "آپا جان" لکھی ہے۔ ذاکر صاحب کی دوست بلکہ مرید پیدا اور زیادہ کام ہونا چاہیے۔ یہ ذاکر صاحب کا کرشمہ تھا کہ اتنی مشکلات کے باوجود جامعہ کے لوگ خوش اور مطمئن تھے۔ موسیقی کی محفلیں ہوتیں، مشاعرے منعقد ہوتے، تھیٹر، بیت بازی ان سب چیزوں میں جامعہ کے لوگ آگے آگے تھے۔

ڈاکٹر عابد حسین جو جامعہ میں فلسفے کے پروفیسر تھے اور ذاکر صاحب کے قریبی دوست بھی۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں یہ طے کیا کہ وہ ایک ہفتہ وار اخبار "نئی روشنی" نکالیں گے جو ہندوستان میں ان مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے گا۔ جب "نئی روشنی" کا پہلا شمارہ نکلا تو ذاکر صاحب اپنی آنکھ کے آپریشن کے سلسلے میں سوئزرلینڈ میں تھے۔ اسی حالت میں ذاکر صاحب نے عابد صاحب کو ایک خط لکھا اور اس پر افسوس ظاہر کیا کہ وہ "نئی روشنی" کا پہلا شمارہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکیں گے۔ ان میں یہی کشش تھی جس کی وجہ سے لوگ انھیں بہت چاہتے۔ اور یہی ان کا ہتھیار تھا، بہت مؤثر ہتھیار:

"مجھے یقین ہے کہ آزمائش کا یہ وقت بھی گزر جائے گا اور ہندی سماج کو ایک اخلاقی سماج بنانے کا کام آپ کے میرے جیسے کمزور ہاتھ ہی مل کر

کریں گے۔"

اس "کمزوری" میں جو طاقت پوشیدہ تھی وہی جامعہ کی روح تھی۔

ذاکر صاحب کی یہ بھرپور کوشش کہ قوم کو قومی دھارے میں لائیں، ان کی ہر تحریر و تقریر میں نظر آتی ہے۔ ۱۹۴۷ تک وہ اس کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں کہ ملک تقسیم نہ ہو اور مسلمانوں کو اس مصیبت سے بچائیں۔ لیکن جب ملک تقسیم ہوگیا تو یہاں رہ جانے والے مسلمانوں کے زخموں پر انھوں نے مرہم لگایا۔ ۱۹۴۷ میں ان کو جو حادثہ پیش آیا تھا جب جالندھر ریلوے اسٹیشن پر ان پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور جو سپاہی ڈیوٹی پر تھے وہ اس کو دیکھ کر بھی انجان بنے ہوئے تھے اس کا ذکر ذاکر صاحب نے عبدالماجد دریا بادی کے نام خط میں کیا ہے۔ ہم نے اس خط کو بھی اس انتخاب میں شامل کرلیا ہے۔ ان کو اس وقت بھی اپنی جان سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ سپاہیوں کو یہ یاد دلائیں کہ ان کو یہاں لوگوں کی جان بچانے کے لیے تعینات کیا گیا ہے اور وہ اپنا فرض نہیں ادا کر رہے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر استاد تھے۔ جس کا یہ فرض ہے کہ پہلے وہ لوگوں کو صحیح بات بتائے اور بعد میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچے۔ یہ اس وقت موت کے منہ سے نکل آئے، مگر لوٹ کر آئے تو ان پر شدید افسردگی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ مجیب صاحب کے گھر ایک کمرے میں بند ہوگئے۔ اس کمرے سے وہ تب نکلے جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ جامعہ میں ایک خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ اور لوگ یہاں سے بھاگنے کی فکر میں ہیں۔ یہ سن کر وہ گھبرا کر کمرے سے نکلے اور اپنے معمول کے خلاف بغیر شیروانی ٹوپی کے صرف کرتے پاجامے میں جامعہ کے چبوترے پر کھڑے ہوکر انھوں نے اپنی مشہور تقریر کی جو "قرار یا فرار" کے عنوان سے ڈاکٹر عابد حسین نے اپنے ہفتہ وار اخبار "نئی روشنی" میں شائع کی:

> "یہ جنون جو آپ دیکھ رہے ہیں، ایک وقتی جنون کا نتیجہ ہے جس میں سبھی مبتلا ہیں۔ ہندو مسلم، سکھ سب نے جی بھر کے گناہ کیے ہیں۔ سب نے اپنے دین ایمان کے گلے پر چھری پھیری ہے۔"

ذاکر صاحب اور ان کے سارے مسلمان دوستوں کا یہ المیہ تھا کہ انھوں نے بجائے نئے ملک میں اپنی قسمت آزمانے کے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا اور پھر بھی ان کو شک کی نظر سے دیکھا گیا اور ان کو وطن سے وفاداری کا ثبوت دینا پڑا۔ جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو انھوں نے اسٹریچی ہال میں ونوبا بھاوے کی موجودگی میں متعصب ہندوؤں سے بہت سختی سے یہ بات پوچھی کہ آخر آپ مسلمانوں کی وفاداری پر شک کیوں کرتے ہیں۔

ونوبا بھاوے کا استقبال کرتے ہوئے انھوں نے اس موقع کا فائدہ اٹھا کر لوگوں کو

اس طرف متوجہ کیا کہ مسلمانوں کی وطن کی وفاداری کیوں مشکوک ہے۔ انھیں بار بار کیوں اس کی تصدیق کرنی پڑتی ہے :

"آج میں صاف صاف یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس قسم کی غلط باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم بھی اس ملک سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی ہندو کرتے ہیں۔ مادر وطن کا ہر ذرّہ ہماری محبت اور خدمات کا گواہ ہے جب تک ہم اس حقیقت کو باور نہ کرالیں گے چین سے بیٹھنے والے نہیں ہم کو بھی ہندوستان میں وہی حقوق حاصل ہیں جو اور ہندوستانیوں کو ہیں۔ ہم سے یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہم خود کو ہندوستانی سمجھیں۔ کسی متعصب ہندوستانی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ہم سے ہماری ہندوستانیت چھینے یا ہم سے وفاداری کا سرٹیفیکٹ طلب کرے۔"

ذاکر صاحب کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں سب مل جُل کر رہیں۔ لیکن جب ان سے ہی ان کی وفاداری کا ثبوت مانگا جانے لگا تو ان کو بہت دکھ ہوا۔ جنیجل سرکار کا مضمون جو اس انتخاب میں شامل ہے۔ اس میں ذاکر صاحب کے غم و غصّے کا ذکر ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان پاکستان کی جنگ کے دوران جب سیاسی حلقوں میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ ذاکر صاحب کو نظر بند کر دیا گیا ہے اور ان کا پائلٹ بیٹا سینیئر فوجی افسران کو لے کر پاکستان جانے کی کوشش کر رہا تھا، اس کو سُن کر ذاکر صاحب نے بہت دکھ سے کہا تھا "جنیجل تم تو جانتے ہو کہ میرا کوئی بیٹا ہی نہیں ہے" باوجود اس کے کہ اس قسم کے حملے ان پر ہوتے رہے مگر وطن کی محبت اور ملک کے اتحاد پر جو ان کا عقیدہ تھا اس میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔

ذاکر صاحب کے نزدیک سیکولرازم کا مطلب لادینی نہیں ہے مگر اس میں مذہب طبقوں اور ذات پات کے بھید بھاؤ کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس انتخاب میں ذاکر صاحب کی وہ تقریر بھی ہے جو انھوں نے راجیہ سبھا میں کی تھی۔ جب بنارس ہندو یونیورسٹی ترمیم بل پر بحث ہو رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قانون کی اس شرط کو ختم کر دیا جائے کہ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر مسلمان ہو سکتے ہیں اور ہندو بنارس یونیورسٹی کے مسلمان۔ ذاکر صاحب نے اس ترمیم کے خلاف تقریر کی تھی۔ انھوں نے یہ کہا تھا کہ :

"یہ شرط غیر سیکولر نہیں ہے۔ ہندوستان کے دستور میں جس سیکولرازم کا ذکر ہے وہ خالص ہندو یا خالص مسلمان ہونے سے ہمیں نہیں روکتا ہے۔ ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ہندو یونیورسٹی اور مسلمان یونیورسٹی

مرکزی یونیورسٹیاں ہیں۔ یہ رواداری وسیع القلبی اور دور اندیشی ایک سیکولر ریاست کی وجہ سے ہے کیونکہ سیکولر جمہوری ریاست مذہب مخالف نہیں ہے۔ اس کا تعلق کسی ایک فرقے یا مذہب سے نہیں ہے۔ اس جمہوری ریاست میں صرف رواداری نہیں ہے بلکہ وسیع القلبی ہے۔ اس کا مقصد ایک صحت مند قومی زندگی کی نشوونما ہے۔ اسی لیے بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہندو مذہب کی تعلیم ہوگی اور مسلم یونیورسٹی میں دینیات اور اسلامک اسٹڈیز کی"

سیکولرازم کا یہ تصور ذاکر صاحب اور ان کے جامعہ کے ساتھیوں کا تھا۔ راقم الحروف نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے کچھ اسی طرح کی باتیں سنی ہیں حالانکہ وہ مذہبی تھے۔ اصل میں یہ تصور مخصوص حالات اور زمانے کی دین تھی ـــ ان لوگوں کے بعد اب اس قسم کے خیالات کے لوگ عنقا نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔

ذاکر صاحب کی تحریروں کا آخری حصّہ ان کی شخصیت کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ ایک معلم تھے جو بڑوں اور بچوں دونوں کو اپنی تقریر کے جادو سے مسحور کر لیتے تھے۔ کہانیاں سنانے کا گُر بھی جانتے تھے۔ اس انتخاب میں ان کی سات کہانیاں شامل ہیں۔ بچوں کی کہانیاں لکھنے کا شوق ان کو اپنی بیٹی رقیہ ریحانہ کی وجہ سے ہوا۔ جو چار پانچ سال کی عمر میں خدا کو پیاری ہو گئیں۔ ان کہانیوں میں ان کے ذاتی غم کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ان کہانیوں میں سے زیادہ تر انھوں نے جامعہ میں لکھی تھیں۔ اس زمانے میں جن چیزوں کے بارے میں سوچتے تھے ان کا عکس بھی ان کہانیوں میں موجود ہے۔ ایک تو ہر قیمت پر آزادی کا حصول۔ دوسرے اقدار پر مبنی تعلیم۔ تیسرے بنی نوع انسان کی خدمت۔ ان میں بچوں کے لیے لکھنے کا قدرتی مادّہ تھا۔ اس کی ایک وجہ ان کی بچوں سے دل چسپی تھی۔ بچوں کے بارے میں ان کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں بچوں کی ایک لائبریری کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے بتایا تھا کہ بچوں کے تخیل کو کس طرح مہمیز کیا جا سکتا ہے۔ "بچوں کے لیے لکھنے والوں کو میں ایک گُر کی بات بتانا چاہتا ہوں کہ آپ اس وقت تک بچوں کا ادب نہیں لکھ سکتے جب آپ میں لکھتے وقت جوش نہ ہو۔ جو آپ کو افسردہ یا خوش نہ کر سکے"

ذاکر صاحب نے بچوں کی جو کہانیاں لکھی ہیں وہ بہت دل چسپ ہیں۔ اس انتخاب میں دو مضامین ایسے ہیں جن سے ذاکر صاحب کو بچوں کے ادب سے کس قدر دل چسپی تھی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک غلام حیدر کا مضمون "ذاکر صاحب اور بچوں کا ادب" جس میں ذاکر صاحب کی ساری کہانیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا عبداللہ ولی بخش قادری کا "ذاکر صاحب ایک استاد" جس میں انھوں نے ذاکر صاحب کی طویل کہانی "کچھوا اور خرگوش" کا تجزیہ کیا ہے۔ زیادہ تر کہانیوں کا موضوع آزادی کی اہمیت ہے۔ غلام حیدر نے

اپنے مضمون میں ان سب کہانیوں کی تصنیف (۱۹۴۷ - ۱۹۷۲ء) کے درمیان بتایا ہے۔

اسی لیے ان میں سے زیادہ تر کہانیوں میں آزادی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ابو خاں کی بکری، ایک کہانی ہے۔ کہانیوں کے مجموعہ کا نام بھی یہی ہے۔ ابو خاں نے ایک چھوٹی سی خوب صورت بکری چاندنی پالی تھی۔ جسے وہ بہت چاہتے تھے۔ اس کی بہت محبت سے دیکھ بھال کرتے تھے مگر اس نے ابو خاں کے یہاں کے ہر طرح کے آرام اور آسائش کے مقابلے میں پہاڑوں کی آزادی کی زندگی کو ترجیح دی۔ وہ جانتی تھی کہ بھیڑیا اس کی تاک میں ہے مگر پھر بھی وہ پہاڑ پر گئی۔ رات بھر بھیڑیے سے مقابلہ کیا اور آخر کو صبح ہوتے ہوتے مرگئی۔ وادی کی ساری چڑیاں ہم رائے تھیں کہ چاندنی ہار گئی۔ مگر ایک بوڑھی چڑیا اس بات پر اڑ گئی کہ چاندنی جیتی۔ آزادی کی یہ چاہ چیل کی کہانی "عقاب" میں بھی پائی جاتی ہے۔ چیل آسمان پر اڑتی اور برف سے ڈھکی چوٹیوں سے باتیں کرتی ہے جو قید کی زندگی سے موت کو بہتر جانتی ہے ایک بلی کا بچہ اسے بہت پیارا ہے اور اس کی محبت کی وجہ سے وہ انسانوں کی بستی میں رہنا چاہتی ہے۔ مگر آخر میں وہ اس کی محبت کی زنجیر کو بھی توڑ ڈالتی ہے اکیلی مگر آزاد زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہے۔

'آخری قدم'، ایک سبق آموز کہانی ہے۔ اس میں ایک ایسے آدمی کی زندگی کے بارے میں بتایا گیا ہے جو لوگوں میں کنجوس مشہور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی ساری پونجی لوگوں پر صرف کر دیتا ہے مگر یہ اتنی خاموشی سے کرتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ کبھی اس کا اس بات پر دل بھی کڑھتا کہ لوگ اس کو کس قدر غلط سمجھتے ہیں۔ اس نے ایک ڈائری "حساب امانت" بنائی تھی اس میں ان اخراجات کی تفصیل تھی جو وہ خیرات کے طور پر کرتا تھا۔ اس کو دیکھ لیتا اور سوچتا کہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس ڈائری کو دیکھیں گے تو معاف کر دیں۔ مگر جب اس کا آخری وقت ہوتا ہے تو اسے ایک روشنی نظر آتی ہے اور وہ اس ڈائری کو آگ میں پھینک دیتا ہے اور خود کو خدا کے حضور میں پیش کر دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کہانی خود ذاکر صاحب کی کہانی ہے جیسے محمد حفیظ الدین جن کا ذاکر صاحب پر مضمون "کیا گر" اس انتخاب کے دوسرے حصے میں شامل ہے۔ اس مضمون میں حفیظ صاحب لکھتے ہیں کہ جب ذاکر صاحب بچے تھے تو وہ بڑوں کا جو کام کرتے اس کا معاوضہ لیتے تھے اور اس سے ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے۔ پڑوسی بچے ان کو کنجوس کہتے رئیس گھر کا کنجوس بچہ۔ یہ سن کر ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان سب کو یہ بتا دیں کہ وہ یہ کنجوسی دوسروں کی مدد کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ لیکن وہ آخری قدم کے آدمی کی طرح اپنے کو ایسا کرنے سے باز رکھتے۔ حفیظ صاحب کا خیال ہے کہ اس کہانی میں ذاکر صاحب کا مقصد اسلام کے اس اصول کو بھی لوگوں کو بتانا تھا جس میں خیرات کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اس طرح کی جائے کہ دائیں ہاتھ سے کسی کو کچھ دیا جائے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔

مجیب صاحب نے اپنی متعدد تحریروں میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ذاکر صاحب کس طرح اسلام کے اصولوں پر عمل کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "ایک مرتبہ ہم لوگ مسلمان کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو انھوں نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس میں متقی کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ ذاکر صاحب خود بھی اس پر عمل کرتے تھے۔ صوفیاء کے یہاں اسے تنہائی کی عبادت کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کہ ذاکر صاحب نہایت مذہبی انسان تھے مگر وہ اپنی کسی بات سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے اور اپنے عقائد اور اپنی عبادت کو رازداری میں رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کا ظاہری پہلو ایک دل کش باغ کی طرح تھا جس میں ہم خوش خوش سیر کے لیے داخل ہوں۔ اور ہمیں وہ وہاں ایک عبادت خانہ بھی نظر آجائے۔"

"کچھوا اور خرگوش" بچوں کی کہانی تو نہیں ہے۔ مگر انھوں نے رائج شدہ نظام تعلیم پر طنز کیا ہے اور تعلیم کو الگ الگ خانوں میں بانٹ کر اس میں مہارت پیدا کرنے کا جو مرض ہے اس کے نقائص کو ذاکر صاحب نے کہانی کے پیرایے میں بیان کیا ہے۔ بوڑھے کچھوے کے اس سوال پر پرانی کہانی میں کچھوے اور خرگوش کے درمیان دوڑ کا جو مقابلہ ہوا تھا اس میں کون جیتا ــ انھوں نے اس سوال کا سرا ماہرین تعلیم کے اس اصول سے ملا دیا جس کے تحت انھوں نے علم کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے اور گرد و پیش سے بے خبر ہیں۔ اس میں ذاکر صاحب نے ان لوگوں پر کڑی تنقید کی ہے کہ اس طرح کی تقسیم سے تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ فدا حسین کے دل چسپ اسکیچوں نے جو انھوں نے اس کہانی کے کرداروں، پروفیسر چنقچاق، مولوی غفران اور پنڈت کچھوا کے بنائے ہیں، اس کہانی کو امر کر دیا۔ اس کہانی سے کم لوگ واقف ہیں۔ ہم نے اسے بھی انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔

اس جلد کے دوسرے حصے میں تیرہ مضامین ذاکر صاحب کے ان ہم عصروں کے ہیں جو اپنے اپنے میدانوں میں مشہور و معروف ہیں اور ذاکر صاحب سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ مجیب صاحب ذاکر صاحب کے ساتھ برلن میں بھی رہے اور ان کے ساتھ جامعہ میں کام کیا اور ساری زندگی ذاکر صاحب سے ان کا قریبی تعلق رہا۔ انھوں نے ذاکر صاحب کی سوانح عمری "ذاکر حسین" لکھی ہے جو خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب سے کچھ حصہ انتخاب کر کے اُسے دو ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا باب وہ ہے جس میں ابتدا سے جامعہ کے جشن سیمیں تک کا احوال ہے جو ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا۔ دوسرا وہ جو اس جلد کا پانچواں باب ہے جس کا موضوع ذاکر صاحب کے تعلیمی خیالات و افکار ہیں۔ دوسرا مضمون جو تاریخی اعتبار سے پہلا ہونا چاہیے۔ رشید احمد صدیقی کا ہے۔ رشید صاحب ذاکر صاحب کے علی گڑھ میں طالب علمی

کے زمانے کے دوست تھے اور اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار ذاکر صاحب سے ان کی کتنی قربت تھی اس کا اندازہ ان واقعات سے لگایا جا سکتا ہے جو رشید احمد صدیقی نے اس مضمون میں بیان کیے ہیں۔

اس کے بعد دو مضمون ان کے بہت قریبی دوستوں اور رفیقوں کے ہیں۔ پہلا ڈاکٹر سید عابد حسین کا جو جرمنی سے ان کے ساتھ تھے پھر جامعہ میں انھوں نے اور مجیب صاحب نے اسّی روپے ماہانہ تنخواہ پر کام کیا اور آخر وقت ان کے قریبی تعلقات رہے۔ دوسرا مضمون خواجہ غلام السیدین کا ہے۔ جو عابد صاحب اور مجیب صاحب کی طرح ان کے جامعہ کے ساتھی تو نہیں تھے مگر ذاکر صاحب کے دوست اور پرستار تھے اور جامعہ سے باہر رہ کر جو کر سکے انھوں نے جامعہ کی خدمت کی اور ذاکر صاحب کے ساتھ بنیادی تعلیم کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ دو مضامین ذاکر صاحب کے خاندان کے لوگوں کے ہیں۔ سعیدہ خورشید جو ان کی بیٹی ہیں اور ہمیشہ ذاکر صاحب کے ساتھ رہیں انھوں نے بہت خوبی اور تفصیل سے ذاکر صاحب کی گھریلو زندگی پر روشنی ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے۔ دوسرا مضمون یوسف حسین کی سوانح عمری کا ایک حصّہ ہے جو انھوں نے "فخرِ خاندان" کے عنوان سے ذاکر صاحب پر لکھا ہے۔ یوسف حسین خاں اردو کے ادیب اور مورخ کی حیثیت سے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ ان دونوں مضامین سے ہمیں ذاکر صاحب اور ان کے خاندان کے بارے میں مکمل تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔

خالدہ ادیب خانم جو ترکی کی مشہور ادیب ہیں۔ انھوں نے قیام ہندوستان کے بارے میں ایک کتاب "ہندوستان میں" لکھی تھی۔ ان کا کافی قیام ڈاکٹر انصاری کے ساتھ رہا۔ اس کتاب میں ایک باب جامعہ کے بارے میں ہے۔ ہم نے اُسے بھی اس انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔

ایک اور مضمون پروفیسر محمد حبیب کا ہے جنھوں نے یہ بتایا ہے۔ اٹاوہ میں اسلامیہ ہائی اسکول میں ذاکر صاحب کو ان کے ہیڈ ماسٹر کس قدر بدمزہ کھانا دیتے تھے جسے ذاکر صاحب خاموشی سے کھا لیتے تھے۔ مولوی حفیظ الدین کا مضمون رسالہ پیام تعلیم سے لیا ہے جس میں انھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کو تمثیلی طور پر پیش کیا ہے۔

خواجہ حمید کی ذاکر صاحب کی دوستی ان کے جامعہ کے دوستوں جیسی ہی تھی۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ بمبئی میں رہتے تھے۔ ان کا مضمون "ایک دیرینہ دوست کی یادیں" اس انتخاب میں ہم نے شامل کیا ہے جو ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد السٹریٹڈ ویکلی کے ذاکر حسین نمبر میں شائع ہوا تھا۔ خواجہ حمید نے ذاکر صاحب کو جرمنی جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ جرمنی میں ان کے

ساتھ رہے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کے ساتھ دیانا میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری سے ملنے بھی گئے تھے اور جامعہ میں کام کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس مضمون میں ان مختلف ٹی پارٹیوں کا ذکر بھی ہے جو ڈاکٹر سنڈ بر میر (ڈائرکٹر آف انسٹی ٹیوٹ آف فارن لینگویجز) کے گھر میں ہوتی تھیں۔ ذاکر صاحب ان پارٹیوں کے روح رواں تھے۔ اور ان کی فرنچ کٹ داڑھی کی وجہ سے ان کے سب جرمن دوست ان کو حضرت عیسیٰ کہنے لگے تھے۔ اس حصے کا آخری مضمون ذاکر صاحب کی سوانح عمری "شہید جستجو" سے لیا گیا ہے جس کے مصنف ضیاالحسن فاروقی ہیں۔ اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے جو ذاکر صاحب کو جالندھر ریلوے اسٹیشن پر پیش آیا تھا۔ اس کا عنوان "یہ داغ داغ اجالا" فیض احمد فیض کی مشہور نظم سے لیا گیا ہے ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس نظم میں فیض نے یہ کہا ہے کہ یہ آزادی وہ نہیں ہے جس کا سب کو انتظار تھا۔ یہ آزادی وہ ہے جس میں روشنی کے ساتھ اندھیرا بھی ہے۔

اس جلد کے تیسرے حصے میں اٹھائیس مضامین ان لوگوں کے ہیں جو ذاکر صاحب کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے جامعہ کے ساتھی اور طالب علم تھے۔ جیسے عبدالستار جو ۱۹۳۷ء میں جامعہ آئے تھے۔ ڈاکٹر محمد اکرام، ڈاکٹر سلامت اللہ جو ان کے ساتھ ۱۹۴۱ء میں بنیادی تعلیم کی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی جو ان کے جامعہ کے عزیز دوست شفیق الرحمٰن قدوائی کے بیٹے ہیں۔ دوسرے مصنفین وہ ہیں جو تعلیم کے میدان میں ان کے ساتھ تھے جیسے سوشیلا نائر، چینزا نائک، صادق علی۔ ذاکر صاحب کی دل چسپیوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ان کے حلقۂ احباب میں آرٹسٹ بھی تھے اور سائنس داں بھی صحافی بھی اور ادیب بھی۔ اسی لیے اس یادگاری جلد میں شاعر جگن ناتھ آزاد، صحافیوں میں ہیرن مکرجی اور چنچل سرکار، آرٹسٹ رام کمار اور سائنس داں ظہور قاسم کے مضامین شامل ہیں۔

ایک مضمون ذاکر صاحب کے داماد خورشید عالم خاں کا بھی ہے جو جانے مانے سیاست داں اور کرناٹک کے گورنر بھی ہیں۔ یہ مضمون اس لحاظ سے الگ نوعیت کا ہے اس میں ذاتی تاثرات ہیں۔ اس کے علاوہ نٹور سنگھ، راج موہن گاندھی۔ اے۔ جی نورانی، ایل۔ پی۔ سنگھ اور رفیق ذکریا کے مضامین سے ہمیں بہت اہم معلومات ہوتی ہیں۔ محمد یونس اور خلیق احمد نظامی کے مضامین معلوماتی بھی ہیں اور ذاتی بھی۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اس یادگاری جلد میں ذاکر صاحب کو مختلف لوگوں نے الگ الگ زاویۂ نظر سے دیکھا ہے اسے پیش کیا جائے

تاکہ ان کی ہمہ جہت شخصیت ہمارے سامنے آئے۔

۱۹۸۷ء میں جامعہ ملیہ نے ذاکر صاحب کی نوّے سالہ سالگرہ منائی تھی۔ اس موقع پر ایک کتاب "نقشِ ذاکر" نکلی تھی جسے عبدالحق خاں نے مرتب کیا تھا۔ اس میں مختلف لوگوں کے مضامین ہیں جن سے ذاکر صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں پہلا مضمون خود ذاکر صاحب کا ہے "اچھا استاد" اس کتاب کے پیش لفظ میں عبدالحق خاں نے لکھا ہے کہ ذاکر صاحب ابتدا سے آخر تک ایک استاد رہے۔ نہ صرف جامعہ نے ان سے فائدہ اٹھایا، علی گڑھ میں بحیثیت وائس چانسلر آئے۔ بہار میں بھی جہاں کے وہ گورنر تھے۔ یہ سلسلہ عہدۂ نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریۂ ہند کی صدارت تک جاری رہا۔ ذاکر صاحب کو اس پیشے سے کیسی گہری وابستگی تھی اس کا اندازہ ان کے مضمون "اچھا استاد" کے آخری پیراگراف سے ہوتا ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے لیے مشعلِ راہ تھا مگر آج بہت سے لوگوں نے اسے شاید سنا بھی نہ ہو:

> "یہ وہاں امید رکھتا ہے جہاں دوسرے دل چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں تازہ دم رہتا ہے جہاں دوسرے تھک جاتے ہیں۔ اسے وہاں روشنی دکھائی دیتی ہے جہاں دوسرے اندھیرے کی شکایت کرتے ہیں یہ زندگی کی پستیوں کو دیکھتا ہے لیکن ان کی وجہ سے اس کی بلندیوں کو نہیں بھول جاتا۔ وہ بڑے کی قدر کے ساتھ چھوٹے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ فوق البشر کا تصور بھی سامنے رکھتا ہے مگر نادان اور بے بس بچے کی خدمت کو اپنی زندگی کا افتخار جانتا ہے اور بچے کی طرف سے جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے۔ ایک اس کی ماں اور ایک اچھا استاد۔"

ذاکر صاحب کو اپنی زندگی میں قدم قدم پر مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کے اندر جو "استاد" تھا، جو صدر جمہوریہ بھی بنا بچے میں جو اس کی امید تھی اس کو کبھی ختم ہونے نہیں دیا۔

سیدہ سیدین حمید
نئی دہلی
۲۲ فروری ۱۹۹۸ء

حوالہ جات

۱۔ ڈاینیسٹی از ایس ایس گل ہارپر کولنز ۱۹۹۶ء
۲۔ پٹیل۔ اے لائف از راج موہن گاندھی نوجیون ۱۹۹۰ء
۳۔ دی راجہ جی اسٹوری از راج موہن گاندھی بھارتیہ ودیا بھون ۱۹۸۴
۴۔ اسلامک سیل آن انڈیا ز انڈی پینڈینس۔ ابو الکلام آزاد ــــــ اے فریش لک،
آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۸ء

حصّہ اوّل

ذاکر صاحب کی تقریریں اور مضامین

طالب علم کی زندگی

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ایک شخص کا تعلیم پانے سے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے ایک شخص وکالت کرنے کے لیے تعلیم پاتا ہے، دوسرا ڈاکٹری کے لیے، تیسرا عام سرکاری نوکری کے لیے اور عام خیال یہ ہے کہ طالب علم کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ زیادہ دولت پیدا کرے۔ یہ مقصد ابتدا ہی سے طالب علم کے اس قدر پیش نظر نہیں رہتا جس قدر اس کے والدین کے۔ ہر طالب علم کا یہ فرض ہے کہ اگر اپنے خاندان کی پرورش اس پر منحصر ہو تو اس کو اپنے والدین کے گزارہ کے لیے پڑھنا چاہیے اور یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ہر شخص کی مالی ترقی سے قوم کی مجموعی ترقی ہوتی ہے مگر طالب علم ہونے کی وجہ سے صرف دولت پیدا کرنے اور پیٹ بھرنے کو اپنا مقصد قرار دینا، صرف طالب علم ہی کی نہیں بلکہ انسانیت کی بھی ذلت ہے۔ اگر طالب علم کا پڑھنے سے یہ مقصد ہو کہ میں اچھے اچھے کوٹ پہنوں گا، گاڑی پر بیٹھوں گا، حکام سے ہاتھ ملاؤں گا تو وہ طالب علم کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔ الغرض دولت پیدا کرنا طالب علم کی زندگی کا بدترین مقصد ہے جو ہو سکتا ہے۔

جس طرح تحصیل دولت طالب علم کی زندگی کا مقصد نہیں اسی طرح آرام طلبی سے بھی اس کو کنارہ کشی کرنی ضروری ہے کیونکہ آرام طلبی ایک ایسی چیز ہے جو سب آدمیوں کو عموماً اور طالب علموں کو خصوصاً ترقی کرنے سے روکتی ہے۔ اب تک میں نے مختصر طور سے ان چیزوں کا بیان کیا ہے جو طالب علم کو کرنی چاہئیں اور جو اس پر فرض ہیں۔ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے پہلے بے جا نہ ہوگا اگر میں طالب علم کی مختصر تعریف کر دوں۔

طالب علم سے مراد وہ شخص ہے جو اپنی طبیعت کو موجودہ حالت سے بہتر کرنا چاہتا ہے، جو اپنی قوتوں کو جہاں تک ان میں بڑھنے کی طاقت ہے وہاں تک ان کو بڑھانا چاہتا

۱۹۱۱ء میں جب وہ آٹھویں درجہ کے طالب علم تھے انھوں نے یہ مضمون لکھا جو غالباً کسی موقع پر تقریر کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس میں حصولِ علم کے مقاصد اور طالب علم کے فرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہے، جو علم و خیالات کے ان خزانوں سے جو ہزاروں برس میں سینکڑوں نسلیں اپنے آئندہ آنے والے وارثوں کے لیے چھوڑ گئی تھیں، فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو اس بات کا خواہش مند ہو کہ جہاں سے عقل کا سبق اس کو ملے، جہاں سے عمدہ باتیں اسے معلوم ہوں، جہاں سے دانش اور اعلیٰ خیالات اس کو میسّر آسکے جہاں سے اسے دنیا کی بابت اور خود اپنی بابت ایسی باتیں معلوم ہوں جو اسے نہیں معلوم اور جن کے معلوم کرنے سے اس کو دنیا میں مدد ملے گی، وہاں سے ان سب کو حاصل کرے۔ طالب علم ہونے کے لیے کم سے کم اتنی عقل ضرور ہونی چاہیے کہ وہ نیک و بد میں، مفید و مضر میں قابل پسند اور قابل نفرت باتوں میں تمیز کر سکے۔ اس کو چاہیے کہ محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کرے، اس کو چاہیے کہ تعلیم سے اپنے دل میں غور و فکر کا مادّہ پیدا کرے، اس کو چاہیے کہ غور و فکر کے ذریعہ سے ان اچھی باتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جو انسان کے لیے ممکن ہیں۔ لیکن اس دنیا میں کچھ ترقی نہیں کر سکتا، وہ اپنا اثر دوسروں پر نہیں ڈال سکتا جب تک کہ وہ استقلال کے ساتھ اپنی اخلاقی سطح دنیا کی مشکلوں میں بلند نہ رکھے۔ وہ شخص ہرگز طالب علم کہلانے کا مستحق نہیں جو اپنے فرائض کو استقلال اور سنجیدگی سے پورا نہ کرے۔ اس کو ہرگز اپنے دل میں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ اگر وہ ایسا خیال کرے گا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے گا بلکہ اس کو ہمت کے ساتھ کیے جانا چاہیے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ ضرور اپنے کام میں کامیاب ہوگا۔

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق   باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

طالب علم کی زندگی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ جو اوہام و تعصبات اس میں ہوں ان پر غالب آجائے اور اس کو چاہیے کہ ذلیل عادتوں کو چھوڑ دے۔ اس کو چاہیے اور اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے جاہل بھائیوں میں تعلیم کو بھی اپنی تعلیم کا جزو سمجھے۔ اس کو علم کو علم کے لیے پڑھنا چاہیے۔ اور ساتھ ہی اس کو زندگی کی ضرورت سے بھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ دنیاوی ضروریات سے غافل ہوگا تو وہ اپنے خاندان کو سنبھال نہیں سکتا اور وہ بنی نوع انسان کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ پڑھا ہوا نہ ہو تو وہ کوئی آدمی نہیں اور وہ دنیا میں کچھ اچھے کام نہیں کر سکتا۔"

تعلیم و آزادیٔ فکر

ہم کسی پچھلی اشاعت میں 'ہیئتِ اجتماعی کی تعمیرِ نو' کے متعلق انگلستان کے مشہور فلسفی مسٹر برٹرنڈ رسل کے خیالات ہدیۂ ناظرین کر چکے ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ اپنے فلسفۂ سیاسی میں فاضل موصوف نے ہیجانات کی دو قسمیں کی ہیں یعنی تخلیقی و تملیکی۔ اور اول الذکر کے تحت میں آپ تعلیم، مذہب اور ازدواج کو سب سے موثر قوتیں تصور کرتے ہیں۔ ہم ذیل میں مسئلہ تعلیم پر موصوف کے خیالات کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ انشاء اللہ وقتاً فوقتاً اس مسئلہ پر دیگر حکماء فرنگ کے افکار پیش کرتے رہیں گے کہ ان سے آگہی ہمارے پیچیدہ مسئلہ تعلیمی کے صحیح حل کے لیے ازبس ضروری ہے۔

تعلیم معمولاً حالاتِ موجودہ کی موافقت اور ہر بنیادی تغیر کی مخالفت میں سب سے قوی طاقت ہوتی ہے۔ موجودہ نظامِ اجتماعی جب اپنے کو خطرہ میں پاتا ہے، تو فوراً، (اگر ابھی اس کا اقتدار باقی ہے) تعلیمی نظام پر قبضہ کر لیتا ہے اور کم عمر بچوں کے اثر پذیر دماغوں میں اپنے محاسن کا یقین اور ان کی عظمت جاگزیں کرنے لگتا ہے اُدھر مصلحین ان لوگوں کو اس مورچہ سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ غریب بچوں کا طرفین میں سے کوئی خیال نہیں کرتا۔ یہ گویا بے سیکھے سپاہی ہوتے ہیں۔ جنھیں چاہے اس لشکر میں شامل کر لیا چاہے اُس میں۔ اگر بچوں کا لحاظ کیا جائے تو تعلیم کا مقصد یہ نہ ہو کہ بچے اس فریق کے ساتھ ہوں یا اس کی، بلکہ انھیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ معقولیت کے ساتھ فریقین میں انتخاب کر سکیں۔ تعلیم کا مقصد پھر یہ نہ ہو کہ لڑکے وہ سوچیں جو ان کے اُستاد سوچتے ہیں، بلکہ ان میں خود فکر کا مادہ پیدا کر دیا جائے۔ چنانچہ اگر بچوں کے حقوق کا خیال ہو تو تعلیم کا وجود بہ حیثیت ایک سیاسی حربہ کے باقی نہ رہے۔ ...

عدل اور حریت کے وہ دو اصول جو ہیئت اجتماعی کی تعمیرِ نو میں بہت سی چیزوں پر حاوی ہیں تعلیم میں آکر بجائے خود کافی نہیں رہتے۔ عدل اگر اسے مساواتِ حقوق کے معنی میں لیا جائے تو ظاہر ہے کہ بچوں کے معاملہ میں ممکن نہیں۔ رہی حریت، تو اول تو یہ اصلاً ایک منفی چیز ہے۔ یہ آزادی میں ہر ممکن الدفع مداخلت کی مخالف ہے لیکن کوئی مثبت اصول تعمیر اس سے فراہم نہیں

ہوتا۔۔۔۔ تعلیم میں ایک حد تک تسلط اور اختیار ناگزیر ہے۔ ہاں، معلموں کو اس تسلط کے استعمال کا ایک ایسا راستہ دریافت کرنا ہے، جو حریت کے منشاد کے مطابق ہو۔ جہاں تسلط ناگزیر ہو وہاں ضرورت ہوتی ہے حرمت و تکریم کی۔ جو شخص بچوں کو دراصل اچھی تعلیم دینا چاہتا ہے۔ اور ان کی صلاحیتوں کو درجۂ کمال پر پہنچانے کا آرزومند ہے، اسے اس جذبۂ تکریم سے لبریز ہونا چاہیے۔ مشین میں ڈھلے ہوئے آہنی نظاموں کے موئیدین میں یہی جذبہ ناپید ہوتا ہے۔ حریت سرمایہ داری، فاشی، اشتراکی اور حکمی جماعتیں، اور وہ تمام زندان و محبس جو مصلحین اور ان کے مخالفین روح انسانی کو مقید کرنے کے لیے بناتے ہیں اسی ذیل میں ہیں۔ اس تعلیم میں جس کے قواعد و ضوابط دفتر حکومت سے نکلتے ہوں مع اپنی بڑی بڑی جماعتوں، مقررہ نصاب، اور کثرت کار سے شل اساتذہ کے اور مع اپنے اس تہیّہ کے ایک ہی ڈھنگ کے متوسط استعداد کے لوگ پیدا کر دیئے جائیں، یہ فقدان تکریم تقریباً ہمہ گیر ہے۔ اس حرمت و تکریم کے لیے ضرورت ہے تخیل اور حرارت زندگی کی۔ اور پھر جن کی طاقت یا واقعی تحصیل سب سے کمتر ہے انھیں کے باب میں سب سے زیادہ یہ تخیل درکار ہے۔ بچہ کمزور ہوتا ہے اور بظاہر بیوقوف۔ استاد مضبوط ہوتا ہے، اور اصطلاح عام میں بچہ سے زیادہ دانشمند۔ بے حرمت استاد یا بے تکریم دفتریت کا دلدادہ بآسانی بچہ کو ان کمزوریوں کے باعث تحقیر سے دیکھنے لگتا ہے۔ یہ بزعم خود سمجھتا ہے کہ میرا فرض ہے کہ بچے کو فلاں سانچے میں ڈھالوں۔ یہ اپنے تخیل میں خود کو ایک کمہار تصور کرتا ہے جس کے ہاتھ میں بچہ بمنزلہ مٹی کے ہے۔ چنانچہ بچہ کو کوئی غیر فطری شکل دے دیتا ہے جو زیادتی سن کے ساتھ پختہ ہوتی جاتی ہے۔ پھر ذہنی کشاکش اور روحانی بے اطمینانیاں تراوش کرتی ہیں، اور ان سے حسد و بے رحمی، نیز یہ یقین بھی ترقی کرتا ہے کہ اوروں کو بھی اسی مسخ کن منزل کے طے کرنے پر مجبور کرنا چاہیے جس اُستاد میں جذبۂ تکریم موجود ہے وہ بچہ کو کسی سانچہ میں ڈھالنے کا خیال نہ کرے گا۔ وہ تو ہر حیّ شئے میں، خصوصاً وجود انسانی اور پھر اس میں بھی سب سے زیادہ بچہ میں، ایک مقدس، غیر محدود، ناقابل تشریح، اس سے مختص اور ایک عجیب بیش بہا چیز یعنی دنیا کی بے نداسی کمال کے ایک ریزۂ مجسم کے وجود کا احساس کرتا ہے۔ بچہ کے سامنے یہ ایک ناقابل توجیہ انکسار محسوس کرتا ہے، ایک انکسار جو عقلی وجوہ سے بآسانی قابل پذیرائی نہ سہی لیکن بہر حال اس سہولت پسند، بر خود غلط اعتماد کے بہ نسبت عرفان سے قریب تر ہے جو اکثر والدین اور اساتذہ میں ہوتا ہے۔ بچہ کی بیچارگی اور کسی کا سہارا ڈھونڈھنے کی التجا اس میں ایک امانت کی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اس کا تخیل اسے بتاتا ہے کہ بچہ خیر یا شر دونوں کے لیے کیسے کیسے ممکنات اپنے اندر رکھتا ہے: اس کے ہیجانات کس کس طرح نشو و نما پا سکتے یا دبائے جا سکتے ہیں؛ اس کی امیدیں کس طرح مرجھا جائیں گی؛ اس کی زندگی کس طرح کم زندہ بن جائے گی؛ اس کی امانت کیونکر مجروح اور

اس کی آرزوئیں بیوتحر ارادہ میں مبدل ہو جائیں گی۔ یہ سب احساسات اس میں ایک خواہش پیدا کرتے ہیں کہ اس معرکہ میں بچہ کی مدد کرے۔ وہ بچہ کو کسی خارجی غرض کے لیے نہیں (جو ریاست نے متعین کی ہو یا کسی اور غیر شخصی استبداد نے) بلکہ خود ان اغراض کی خاطر تقویت پہنچانا اور مسلح کرنا چاہتا ہے جنھیں بچہ کی روح پوشیدہ طور پر تلاش کر رہی ہے۔ جس شخص میں یہ احساس ہو وہ معلم کے اختیار کو اصول حریت کے توڑے بغیر استعمال کر سکتا ہے۔

جب تک تعلیم کا مقصد فکر و خیال کے بجائے یقین و اعتقاد پیدا کرنا باقی رہے گا آزادی تحقیق کا خون ناگزیر ہے۔ تعلیم کا مقصد آرزوئے صداقت کی پرورش ہونا چاہیے، نہ یہ عقیدہ پیدا کرنا کہ کوئی خاص مسلک سچا ہے۔ لیکن وقت یہ ہے کہ اتحاد مسلک ہی لوگوں کو جارحانہ نظام میں منسلک رکھ سکتا ہے۔ جس قدر مسلک پر اعتقاد شدید ہے اسی قدر جدال میں کار کردگی زیادہ ہوگی۔ یہ شدت اعتقاد اور کارکردگی پیدا کرنے کے لیے بچہ کی فطرت پس پشت ڈالی جاتی اور اس کا مطمح نظر تنگ کر دیا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ لیکن آزادی فکر کو دبا کر جنگ و جدال میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ بہت آنی اور بے قیمت ہے۔ آخر کار کامیابی کے لیے بھی دماغی اور نفسی قوت اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی کہ حیات حسنہ کے لیے بدقسمتی سے تعلیم کا یہ تصور کہ یہ قواعد کی ایک شکل اور غلامی کے ذریعہ اتحاد عمل پیدا کرنے کی ایک سبیل ہے بہت عام ہے اور زیادہ تر اس بنا پر اس خیال کی پیچ کی جاتی ہے کہ یہ حصول فتح کا ذریعہ ہے۔ تاریخ قدیم کی تمثیلوں کے شائق اس کی تائید میں ایتھنیس پر اسپارٹا کی فتح کی مثال دیں گے۔ لیکن یاد رہے کہ لوگوں کے فکر تخیل پر فرمانروائی ایتھنیس کی رہی نہ کہ اسپارٹا کی آج ہم میں سے ہر ایک اگر وہ کسی گزشتہ عہد میں پیدا ہو سکتا تو ایتھنیس میں پیدا ہونا چاہتا۔ اسپارٹا میں نہیں۔

تعلیم دینے والے عموماً بعض عادات کی تلقین کرتے ہیں، مثلاً اطاعت اور ڈسپلن دنیاوی کامیابی کی بے پناہ کشمکش، مخالفین سے نفرت و حقارت، بے چون و چرا باور کرنے کی عادت اور استاد کے عقل و فہم پر مجہول یقین یہ ساری کی ساری عادتیں زندگی کی منافی ہیں۔ اطاعت اور ڈسپلن کے بجائے ہمیں چاہیے خود مختاری اور ہیجان کی حفاظت یا بے رحمی کی تلقین کے بجائے تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے کہ خیال و فکر میں عدل کی پرورش کرے، تحقیر کے بجائے اسے تکریم پیدا کرنی چاہیے اور تفہیم و تفہم کی کوشش؛ دوسروں کی رائے سے یہ ضروری نہیں کہ اتفاق پیدا کیا جائے بلکہ اگر مخالفت ہو تو وہ حس کے ساتھ تخیل اور وجوہ مخالفت کا واضح احساس شامل ہو۔ بجائے زود عقیدگی کے اشتباہ تعبیری و تخلیقی اور ذوق نہاں ذہنی کو تحریک دینا اور ان عالم ہائے گوناگوں کا احساس پیدا کرنا چاہیے جو فکر کی حوصلہ مندی اور خیال کی

جرأت سے نتیج کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے مدارس میں ڈسپلن اور ضبط نفس پر جو اصرار پایا جاتا ہے وہ زیادہ تر ایک عیب ہے۔ ضبط نفس کی ایک قسم ہے جو ہر حصول مقصد کے لیے لازمی ہے۔ لیکن یہ پسندیدہ قسم خود اندر سے پیدا ہوتی ہے اور ایک بعید مقصد کے لیے استقلال کے ساتھ کوشش کرنے اور اس کی راہ میں بہت سی چیزیں ترک کرنے اور بہت سے مصائب برداشت کرنے سے عبارت ہے۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے ہیجانات کو ارادہ کا ماتحت کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے مہتم بالشان تخلیقی آرزوؤں سے عمل کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے، ایسے موقعوں پر بھی کہ یہ آرزوئیں خود روشن طور پر زندہ نہ ہوں۔ اس ضبط کے بغیر کوئی حوصلہ، اچھا ہو یا بُرا، پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ ضبط خود اپنے ارادہ سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ کسی خارجی جبر سے۔ لیکن یہ قسم جو بُری نہیں اسی پر مدارس میں زور نہیں دیا جاتا۔

معاشی کش مکش میں بے رحمی اور سفاکی کی تعلیم اس وقت ناگزیر ہے تاکہ ہمارے جماعتی نظام کی ساخت میں تبدیلی نہ ہو۔ یہ چیز علی الخصوص متوسط طبقہ کے مدارس میں اور بھی پائی جاتی ہے کیونکہ مدرسہ کی کامیابی کا مدار والدین میں اس کی نیک نامی پر ہے اور یہ نیک نامی طلبا کی کامیابی کی تشہیر پر منحصر ہے۔ یہ منجملہ ان بہت سی صورتوں کے ایک صورت ہے جس میں ریاست کا نظام مسابقت و مقابلہ اپنا نقصان پہنچاتا ہے۔ علم کی فطری اور بے لوث آرزو بچوں میں کچھ کمیاب نہیں ہوتی، اور اکثر صورتوں میں جہاں یہ دبی ہوتی ہے اسے ابھارا جا سکتا ہے۔ لیکن اساتذہ اسے نہایت بیدردی سے کچلتے ہیں، اس لیے کہ انھیں تو سند، فضیلت، اور امتحان کا خیال ہوتا ہے۔ مدرسۂ ابتدائی میں داخلہ سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے ختم تک قابل لڑکے کو فکر و خیال اور مذاق ذہنی کی پرورش کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ از اول تا آخر سوائے امتحان کے لیے اشارات اور درسی کتابوں میں مندرج حقائق کی ایک لمبی داستان کے اور کچھ ہوتا ہی نہیں۔ طلبا میں جو سب سے ذہین ہوتے ہیں وہ آخر میں تعلیم سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اسے کسی طرح فراموش کر کے دنیائے عمل میں داخل ہونے کے آرزو مند رہتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی معاشی نظام انھیں مقید رکھتا ہے اور ان کی تمام فطری خواہشات مجروح اور پامال ہو جاتی ہیں۔

استاد کے فہم و دانش پر مجہول قبول و تسلیم اکثر لڑکے لڑکیوں کے لیے نہایت سہل کام ہے۔ اس میں اپنی فکر ذاتی کی ضرورت نہیں پڑتی اور پھر بات بھی معقول معلوم ہوتی ہے کہ استاد اپنے شاگردوں سے زیادہ جانتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر استاد غیر معمولی آدمی نہیں تو اس کی نظر میں اچھا بننے کا بھی یہ ایک ذریعہ ہے۔ لیکن مجہول قبول و تسلیم کی یہ عادت آگے چل کر بہت مضر اثرات پیدا کرتی ہے۔ یہ انسانوں میں ایک قائد کی آرزو پیدا کر دیتی ہے اور پھر جو کوئی اس حیثیت میں ملتا ہے اسے یہ اپنا راہنما تسلیم کر لیتے ہیں۔ کلیساؤں، حکومتوں

سیاسی فرقہ بندیوں، اوران تمام نظاموں کی قوت، جو سادہ لوح انسانوں کو اپنی اور اپنی قوم کی اغراض کے منافی نظامہائے کہنہ کی تائید پر آمادہ کرتے ہیں اسی عادت سے پیدا ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ باوجود تعلیم کی تمام ممکن مساعی کے آزادیٔ فکر بہت عام نہ ہوگی۔

لیکن اس وقت کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہوگی۔ اگر لڑکے سے بعض نتائج کا قبول کرانا مقصود نہ ہو بلکہ اس میں فکر کی عادت پیدا کرنا تو تعلیم یقیناً بالکل دوسرے رنگ سے دی جائے۔ مثلاً تدریس کی بہ سُرعت کم ہو اور بحث مباحثہ زیادہ، طلباء کو اظہار خیال کے زیادہ مواقع ملیں اور تعلیم ان چیزوں سے واسطہ رکھنے کی زیادہ کوشش کرے جن میں طالب علم کو دلچسپی ہے۔ اوران سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ ذہنی حوصلہ مندی کے ذوق کو تحریک دینے اور ابھارنے کی کوشش ہو۔ یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں بہت حیرت خیز اور رنگا رنگ ہے۔ بعض چیزیں جو بہت سادہ معلوم ہوتی ہیں غور کرو تو اتنی ہی دشوار نظر آتی ہیں۔ (اینہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است) بہت سی چیزیں جن کا انکشاف ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ انھیں محنت اور ذہانت آشکار کردیتی ہے۔ خیال کی قوت، وہ وسیع میدان جو یہ سر کر سکتا ہے، اور وہ وسیع تر میدان جن کی ایک دھندلی سی تصویر یہ متخیلہ کے سامنے پیش کرتا ہے، یہ چیزیں ان لوگوں کو جو روزمرہ کے چکر سے ذرا پرے پہنچ گئے ہیں ایک عجیب متاعِ گراں ارز بہم پہنچاتی اور انھیں آئے دن کی کم حیثیت اور ماندکن جزئیات سے نجات دلادیتی ہیں جس سے اُن کی ساری زندگی دلچسپیوں سے پُر اور حیات عامیانہ کے زنداں کی دیواریں شکست ہوجاتی ہیں وہی حوصلہ مندی اور ذوق اور امنگ جو لوگوں کو قطب جنوبی لے جاتی ہے، جو قوت کے ایک فیصلہ کے امتحان کے لیے بہتوں کو آمادہ پیکار بنادیتی ہے، وہی تخلیقی فکر و خیال میں اپنے لیے ایک راستہ نکال سکتی ہے، جو نہ مضرت رساں ہو نہ بے رحم؛ بلکہ حیات بشری میں اس جمال روشن کو شامل کرکے جو روح انسانی "غیر معلوم" کی بلندیوں سے لارہی ہے، وقار انسانیت میں افزونی کا باعث ہو۔ اس مسرت کو تھوڑا یا بہت، ہر اس شخص تک پہنچا دینا جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے وہ مقصد اصلی ہے جس کے لیے دماغی تعلیم کی قدر کرنا چاہیے۔ لوگ کہیں گے کہ ذہنی حوصلہ مندی کی مسرت لازماً کمیاب ہوگی، بہت کم لوگ ہیں جو اس سے محظوظ ہوسکیں گے اور معمولی تعلیم اس موتمری خوبی کا کس طرح خیال کرسکتی ہے۔ میرا یہ عقیدہ نہیں۔ دماغی حوصلہ مندی کا انبساط جوانوں میں بڈھوں سے بہت زیادہ عام ہے اور بچوں میں تو بہت ہی عام۔ لیکن بعد کی زندگی میں یہ اس لیے نادر و کمیاب ہوجاتا ہے کہ تعلیم کے ذریعہ اس کے قتل کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ انسان جتنا خیال سے ڈرتا ہے دنیا میں کسی اور شئے سے نہیں ڈرتا۔ نہ تباہی سے حتیٰ کہ موت تک سے نہیں۔ خیال انقلاب انگیز ہے اور تہ و بالا کرنے والا، تباہ کن ہے اور ہیبت ناک، یہ قائم شدہ رسوم اور رواج، مراعات، آرامدہ عادات، غرض کسی پر رحم نہیں کھاتا۔ یہ نراجی ہے اور بے آئین، یہ اختیار و استبداد کی طرف سے بے نیاز ہے اور قرنوں کی آزمودہ دانش سے بے پروا۔

خیال دوزخ کے تعرتاریک تک میں جھانکتا ہے اور ڈرتا نہیں۔ یہ اس پشتہ ضعیف انسان، کو خاموشی کی گہرائیوں میں محصور دیکھتا ہے، لیکن ایک انداز تفاخر سے اسے اس طرح بے تاثر ہوئے جھیل جاتا ہے گویا یہی کائنات کا مالک ہے۔ خیال عظیم ہے، سریع ہے اور آزاد۔ یہ دنیا کا نور ہے اور انسان کی شوکت خصوصی۔

لیکن اگر خیال کو بجائے معدودے چند لوگوں کے حق کے اکثر کی ملک ہونا ہے تو ہم کو خوف سے منہ موڑ لینا چاہیے۔ خوف ہی انسانوں کو روکتا ہے۔ اس کا خوف کہ کہیں ان کے عزیز عقائد دھوکہ نہ ثابت ہوں۔ اس کا خوف کہ جن کیفیات اساسی میں وہ زندگی گزارتے ہیں وہ مضر نہ قرار پائیں، اس کا خوف کہ کہیں وہ خود عزت کے اس سے کم مستحق نہ نکلیں جتنا وہ سمجھا کیے ہیں۔" کیا مزدور املاک کے متعلق آزادی سے سوچے؟ پھر ہم امیروں کا کیا حشر ہوگا؟ کیا نوجوان مرد عورتیں اپنے تعلقات باہمی کے متعلق آزادی سے سوچیں؟ پھر اخلاق کی کیا گت ہوگی؟ سپاہی جنگ کی بابت آزادئ خیال رکھیں؟ تو فوجی نظام کی کیا نوبت ہوگی؟ نہیں نہیں۔ خیال سے باز آؤ۔ خدا کی پناہ۔ پھر تعصب کی تاریکیوں میں لوٹ چلو کہ کہیں املاک، اخلاق اور جنگ معرض خطر میں نہ آجائیں۔ بہتر ہے کہ انسان بے شعور رہے، کاہل رہے، ظالم رہے، لیکن اس کا خیال آزاد نہ ہو! اگر خیال آزاد ہوا تو ممکن ہے یہ اس طرح نہ سوچیں جیسے ہم سوچتے ہیں۔ اور یہ وہ مصیبت ہے جس کے ٹالنے کے لیے ہر قیمت کم ہے۔" اپنی روح کی غیر شعوری گہرائیوں میں حریت خیال کے مخالفین یوں دلیلیں کرتے ہیں۔ اور اسی کے مطابق اپنے کلیساؤں، اپنی حکومتوں، اپنے مدارس اور کلبوں میں عمل پیرا ہوتے ہیں۔

کوئی اساس جس کی آبیاری خوف سے ہوئی ہو معاون حیات نہیں ہوسکتی۔ معاملات انسانی کا اصول تخلیقی و تعمیری، امید ہے نہ کہ خوف۔ وہ سب کچھ جس نے انسان کو بڑا بنایا خیر کے حصول کی کوشش سے پیدا ہوا ہے، شر کے دفع کرنے کی کش مکش سے نہیں۔ جدید تعلیم میں چونکہ بہت کم کسی بڑی امید کی روح ہوتی ہے اسی لیے اس درجہ کم اچھے نتائج اس سے مرتب ہوتے ہیں۔ بچوں کے معلمین کے دماغ پر تخلیق استقبال کے مقابلہ میں قیام ماضی کا خیال زیادہ مستولی ہے۔ لیکن تعلیم بس واقعات مردہ سے ایک مجہول آگہی پر مشتمل نہ ہونی چاہیے۔ اسے ایک عملی کیفیت ہونا چاہیے جس کی سمت اس دنیا کی طرف ہو جسے ہماری مساعی پیدا کریں گے۔ اس کی روح رواں یونان اور نشاۃ الثانیہ کے معدوم حسن کی غمناک جوع نہ ہونی چاہیے بلکہ جماعت کی ہیئت استقبالی کا ایک درخشاں منظر، ان فتوحات کا تصور جو خیال آیندہ حاصل کرے گا، اور کائنات پر نظر انسانی کا روز افزوں اور ہر آن وسعت پذیر افق۔

جامعہ کے نشان (موٹو) کی تشریح

جانتے ہو اس نشان کا مطلب کیا ہے ؟ دیکھو اس میں سب سے اوپر ایک ستارہ ہے جس میں لکھا ہے اللہ اکبر۔ جب اندھیری رات میں غریب مسافر جنگل بیابان میں سفر کرتے ہوئے راہ بھٹک جاتے ہیں، کوئی راہ بتانے والا نہیں ہوتا تو وہ ستاروں کو دیکھ کر راستہ نکالتے ہیں۔ جامعہ والوں کو راستہ بتانے والا ستارہ یہی اللہ اکبر کا ستارہ ہے۔ ان کی نظر اسی پر جمی ہے۔ یہی دنیا کی اندھیاری میں انھیں راہ بتاتا ہے، اس لیے کہ یہ جتاتا ہے کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ جس نے اس کے آگے سر جھکایا اس نے سچی زندگی کا پتہ پایا۔ اس کے سامنے جھک کر پھر یہ سر کسی اور کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے۔ اس چمکتے ہوئے ہدایت کے تارے کے نیچے ایک کتاب ہے جس پر لکھا ہے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ یہ کتاب قرآن پاک ہے۔ اس سے خدا نے اپنے بندوں کو اپنی مرضی کا پتہ دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کس طرح نیکی کرکے آپس میں ایک دوسرے کو بھائی بھائی جان کر، غریب امیر کا فرق مٹاکر، رنگ روپ کی تمیز مٹاکر، آقا اور غلام کی تقسیمیں مٹاکر، اس کے بندے اچھے سچے بندے بن سکتے ہیں۔ اس کتاب نے آدمیوں کو تاریکی سے روشنی میں پہنچایا اور جو راہ بھٹک گئے تھے انھیں بھی سیدھی راہ بتائی۔ اور اس کے لانے والے نے اپنی پاک زندگی کی مثال سے، اپنی آنکھوں کی تاثیر اور دل کی گرمی سے ایک گروہ ایسے نیک آدمیوں کا تیار کر دیا جس نے دنیا سے طرح طرح کی برائیوں کو مٹا دیا اور اس میں خدا کی سچی برادری قائم کی۔

اس نشان کے دونوں طرف کھجور کے دو پیڑ ہیں۔ یہ کیا ہیں ؟ یہ اُس دیش کا نشان ہیں جہاں خدا کا یہ آخری پیام لانے والا پیدا ہوا۔ اس بنجر وادی کا نشان جس

جامعہ کے نشان (موٹو) کی تشریح "پیام تعلیم" ۲۰ء ۱۹

ہیں یوں تو کچھ اگتا نہ تھا، پر جہاں دینِ الٰہی کے پودے نے جڑ پکڑی۔ جو لوگ ناموافق حالات سے اپنے کاموں میں گھبرا جاتے ہیں ان کے لیے یہ درخت ڈھارس کا سامان ہیں کہ اس دیس سے جہاں ان کھجوروں کے سوا پھول بوٹا نام کو نہ تھا ہدایت کے چشمے ابل پڑے جن سے دلوں کی بستیاں سیراب ہوگئیں۔ پھر تم ظاہری حالات کو دیکھ کر کیوں تھڑدلے ہوتے ہو۔

سب سے نیچے ایک پتلا سا ہلال ہے جس میں لکھا ہے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" یہ ہلال ابھی چھوٹا سا ہے لیکن جیسے ہلال بڑھ کر چودھویں رات کا چاند بن جاتا ہے، اسی طرح یہ جامعہ جس کے کام کی ابھی ابتدا ہے، انشاءاللہ بڑھ کر روشن چاند بنے گی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کا سرور ہوگی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اکثر کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی جدید تعلیم، جو سرکاری محکمہ تعلیم کی پابند اور مقلد ہے، کوئی نصب العین نہیں رکھتی۔ مگر میرے خیال میں یہ صحیح نہیں۔ نصب العین کے وجود کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ معین الفاظ میں قلم بند ہو، تعلیم دینے والوں، تعلیم کا انتظام کرنے والوں، تعلیم دلانے والوں کے ذہن میں اس کا ہونا اور ان کے عمل سے اس کا اظہار ہونا کافی ہے۔

ہاں تو یہ نصب العین کیا تھا؟ یہ نصب العین یہ تھا کہ اس ملک کے مسلمانوں میں اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد کی جتنی تعداد اپنا پیٹ پال لے، سرکاری نوکریاں پا کر آرام، چین اور ہاں تھوڑی سی حکومت کے ساتھ زندگی کے دن کاٹنے کے قابل ہو جائے، اچھا ہے۔ یہ چند افراد اپنی خوشحالی کا معیار جس قدر بڑھا لیں اتنی ہی قوم خوشحال سمجھی جائے۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہوں وہ ہر طرح کم کی جائیں، مستقبل کے مشتبہ منصوبوں سے حال کی یقینی بہرہ مندیوں میں ہرج نہ ہو اور آخرت کا تصور انفرادی دنیا کے عیش میں خلل نہ ڈالنے پائے۔ معاشرت بدل جائے، اپنی پرانی معاشرت بری ہے اور بری اس لیے ہے کہ ایک با اقبال صاحب اقتدار قوم کی معاشرت سے مختلف ہے۔ سیاست سے بے تعلقی رکھی جائے اس لیے کہ انفرادی ترقی و ترفع کے لیے اپنی جماعت کے سیاسی اقتدار کی ضرورت کچھ واضح نہ تھی۔ حکومت کی جو شکل بھی ہو، بس وہ امن قائم رکھ سکے، محکموں کے معاملات باہمی میں انصاف کر سکے، نوکریاں دے، چند افراد کو مراتب بلند تک پہنچائے کہ اس کا کام نکلے اور باہمی عزت بڑھے۔ مذہب صدیوں تک اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا، چھوٹتا تو کیسے، ضرور قائم رکھا جائے مگر اس طرح کہ دوسرے ارادوں

ذاکر صاحب نے علی گڑھ کی کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء کے خطبے میں تعلیم کے ان آدرشوں پر جو مسلمان معلموں نے اختیار کر رکھا ہے خوب بحث کی ہے۔

میں بھی مانع نہ ہو، اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ معاملات پر کہ اہل دنیا سے متعلق ہیں، اس کی تعلیمات اوران کی حکمتوں کو زیادہ نہ ابھارا جائے۔ چپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہل دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے۔ البتہ عقائد و عبادات پر زبانی زور رہے اور عملاً رخصت، اور ہاں احساس مذہبیت کے باب میں خود فریبی کے لیے مذہب کے ان حصوں پر جو ماورائے عقل ہیں عقلی بحثیں اور فلسفہ و حکمت سے تعلق کی کوششیں ہوتی رہیں تو مضایقہ نہیں۔

"اس نصب العین کے حصول کے لیے جو نظام تعلیم کارآمد ہو سکتا تھا، وہ وجود میں آگیا، بہت کچھ دوسروں کی مدد سے کچھ کچھ اپنی کوششوں سے۔ اس نظام تعلیم کے پیش نظر ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا تھا کہ نوجوان لکھنا پڑھنا سیکھ کر سرکاری ملازمت حاصل کریں، اپنا پیٹ پالیں، معاشرت میں مغربی نمونوں کو بھلی بری نقل اتار سکیں۔ مذہب کے سرے سے منکر تو نہ ہوں مگر اس کی حیات بخش اور زندگی پرور قوت سے محروم رہیں تو ہرج نہیں۔ سیاست کے جھگڑوں سے الگ تھلگ رہیں، شخصی مفاد کی خاطر قوم کا نام لینے کی ضرورت پڑی تو یہ ہنر زمانہ خود سکھا دے گا۔ یعنی تعلیم عبارت تھی چند جزوی ہنرمندیوں سے، اطاعت شعاری کی چند عادتوں سے، انفرادی معاشی خوشحالی کے لیے مسابقت اور مقابلے کے رجحانات سے۔

"ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لیے بنائے اوران میں اپنی قوت اور وقت اور وسائل کا جو صرف کثیر نصف صدی سے زیادہ سے کیا، ان کو دیکھئے۔ کیا انھوں نے بھی اسی نصب العین کی خدمت انجام نہیں دی؟ اکبر مرحوم نے تعلیم یافتہ آدمی کی زندگی کا جو خلاصہ کیا ہے کہ۔ بی۔ اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے۔ کیا وہ ہمارے ان ملی اداروں کے تعلیم یافتوں پر بھی صادق نہیں آتا؟ ہم کس معنی میں انھیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں؟ کیا اسلام کے پیش نظر جماعت کا یہی تصور ہے کہ وہ الگ الگ افراد کا بس اتفاقی مجموعہ ہے؟ کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے؟ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے؟ نہیں، اور ہزار بار نہیں۔"

"ہمارے یہ مدرسے بے شک اسلامی مدرسے ہوں گے اور اسلامی نصب العین ان کے سامنے ہوگا، مگر اس نصب العین کی کوئی اور غلط تعبیر ان مدرسوں کو فرقہ پروری اور جماعتی خود غرضی کا مرکز نہ بنانے پائے گی اور بیجا تعصب ان کی نظر سے اس نکتے کو نہ چھپا سکے گا کہ اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں، اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مجبور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی معاشی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر و غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کردے، اگر ہم دولت کی شرافت کی جگہ تقویٰ کی شرافت کا قیام چاہتے ہیں، اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، تو ان سب فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے خود اپنے پیارے وطن میں ہے، جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم پھر واپس جائیں گے۔ چنانچہ ہمارے نئے مدرسوں کی تعلیم نوجوانوں کے دل میں جماعتی خدمت کی وہ لگن لگائے گی کہ جب تک ان کے اردگرد ان کے اپنے گھر میں غلامی رہے گی اور افلاس، فلاکت رہے گی، اور جہل، بیماریاں رہیں گی، اور بدکرداریاں، پست حوصلگیاں رہیں گی اور مایوسیاں یہ چین کی نیند نہ سوئیں گے۔ اور اپنے بس بھر ان کو دور کرنے میں اپنا تن من دھن سب کھپائیں گے۔ یہ روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے، پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی بلکہ اپنے دین کی اور اپنے وطن کی خدمت ہوگی جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھے گی، دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی۔ یہ اپنے ذہنی نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی، کہ کبھی دنیا اسے جنت نشان کہتی تھی، پر جو آج بے شمار انسانوں کے لیے دوزخ سے کم نہیں، سیوا کریں گے اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمان و رحیم، رزاق و کریم، حی و قیوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ ان کا وجود محدود نگاہوں کو اس کی شان ربوبیت پر ایک دھبہ سا معلوم ہوتا ہے۔

"اور یہی نہیں یہ اپنی اس بے غرض خدمت سے خود اپنے دیس والوں کو تنگ نظر وطنیت کے عذاب سے بچائیں گے اور اپنے وطن کو دنیا اور انسانیت کا خادم بنائیں گے۔ ہمارا وطن اپنی آبادی کے لیے دوسروں کی بربادی، اپنی ترقی کے لیے دوسروں کا تنزل، اپنی قوت کے لیے دوسروں کو کمزور اور اپنی آزادی کے لیے دوسروں کی غلامی کے سامان کبھی نہ کرے گا۔"

آپ کہیں گے کہ یہ شخص ہمیں مستقبل کے یہ فرضی افسانے کیوں سُنا رہا ہے۔ معاف کیجیے، اس لیے سُناتا ہوں کہ اس طرف امید کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور ہر جگہ "شاید" اس لیے لگا تا جاتا ہوں کہ اپنے آس پاس ان امیدوں کے بر آنے کے خلاف بھی قرائن پاتا ہوں، لیکن ایک بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک خود دار آزاد جماعت کی طرح زندہ رہنا ہے تو اُن کو اپنی قومی زندگی کے پچھلے پون سو سال پر سختی سے محاسبہ کرنا ہوگا، پچھلی مساعی کی تہ میں جو نصب العین کارفرما تھا اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور اگر اس سے اعلیٰ تر نصب العین ان کے ہاتھ آ گیا، جیسا کہ میرے عقیدے میں ضرور آئے گا، تو پھر اس نصب العین کے حصول کے لیے منجملہ اور چیزوں کے اپنا ایک خاص نظامِ تعلیم بھی مرتب کرنا ہوگا جو کسی دوسرے ناقص نظام کی ناقص تر نقل نہ ہوگا بلکہ ہماری مخصوص تخلیق ہوگا۔ ہمیں ثانوی تعلیم کے نظام سے پہلے عام ابتدائی تعلیم کا نظام بنانا اور جاری کرنا ہوگا، ایک خاص عمر پر بچوں کے رجحانات کی پڑتال کا انتظام کرنا ہوگا پھر ثانوی تعلیم کے لیے ایک ساتھ مختلف قسم کے، غالبًا چار پانچ قسم کے مدارس قائم کرنے ہوں گے، ان مدرسوں میں علاوہ اس شعبۂ تمدن کے جو ہر مدرسے کا مخصوص ذریعۂ تعلیم ہوگا، اپنے دین، اپنی تاریخ اور اپنی زبان کی تعلیم کا نصاب معین کرنے اور اس کے اُستادوں کی تیاری میں خاص توجہ سے کام لینا ہوگا، ذہنی نشو ونما میں انفرادی طریقے کے ساتھ مدارس کے اندر اور باہر جماعتی خدمت کے مواقع کثرت سے فراہم کرنے ہوں گے، کتابی تدریس کی جگہ عملی اکتشاف کو دینی ہوگی اور خالی واقفیت کی جگہ صحیح ذہنی تربیت اور خالی علم کی جگہ اچھی سیرت کو مرکزِ توجہ بنانا ہوگا اور اپنے مدرسوں کو قومی زندگی کے ساتھ ربط دینے کی تدبیریں نکالنی ہوں گی۔

میں نے دشوار کاموں کی ایک خاصی لمبی فہرست گنوادی، لیکن یہ صرف اُن کاموں کے نام ہیں اُن کی تفسیر و توضیح بہت کچھ چھان بین اور تحقیق کی محتاج ہے۔ پہلے ان میں سے ہر مقصد کا واضح تعین ضروری ہے، اور پھر اس کے وسائل کی تلاش۔ اُن پر آپ کے بہترین دماغوں کی سالہا سال کی کوشش صرف ہوگی۔ یہ سب مشکل کام ہیں لیکن کرنے کے کام ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی قومی جماعت واقعی انھیں کرنا چاہے تو کرنے والے بھی مل سکتے ہیں۔ میری آرزو ہے کہ یہ کانفرنس اپنے آئندہ لائحۂ عمل میں ان تحقیقی کاموں کی انجام دہی کو شامل کرے، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ ایسا ہو سکے گا یا نہیں، اگر نہ ہو سکا تو آج ہم تو اس کانفرنس کے

پچاس سالہ وجود پر خوشی منا رہے ہیں، ڈر ہے کہ آئندہ پچاس سال بعد خاکم بدہن اس کا ماتم کرنے والے بھی موجود نہ ہوں گے۔ قومی تعلیم کی موجودہ بے راہ روی شاید قوم کے وجود ہی کو ختم کر دے۔ اور پھر یاد انھیں کی کی جاتی ہے جو مشکل کام اپنے سر لیتے ہیں، یا تو طوفان میں طوفان کا مقابلہ کرتے ہیں یا طوفان سے پہلے اس کے مقابلے کی تیاری۔ ہمارے پچھلے کام کرنے والوں نے جو کام اٹھایا تھا وہ اس وقت کچھ بہت سہل کام نہ تھا اور باوجودیکہ ہم رفتہ رفتہ اپنے پچھلے پچاس سال کے کام سے غیر مطمئن ہوتے جاتے ہیں اور اُس کا نصب العین آج ہمیں پست نظر آتا ہے، لیکن جن لوگوں نے اس کام کو شروع کیا تھا اُن کے زمانے کی بے حسی کو یاد کیجیے، اور قومی زندگی کے شیرازے کے اس انتشار کا خیال کیجیے جو ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا اور ان کی ان کوششوں میں بھی جو آج ہمیں زیادہ نہیں جچتیں، قوم کی مخالفت اور حالات کی نا مساعدت کا اندازہ لگائیے تو پتا چلتا ہے کہ بونوں کی ایک جماعت میں یہ لوگ دیو تھے، دیو۔ ان کے کام پر تنقید، مستقبل کی راہ تلاش کرنے کے لیے بے شک ضروری اور مفید ہے اور اس سے ہرگز نہ جھجکنا چاہیے مگر ان شخصیتوں کی عظمت، ان کے ارادوں کی مضبوطی، ان کی نیتوں کا خلوص دشمن سے بھی خراج تحسین وصول کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے کاموں کی تنقید کیجیے اور بن پڑے تو ان سے بہتر کام کیجیے، مگر اُن کی ہمت اور عزم اور بے غرض خدمت کی یاد پر احسان مندی کے دو پھول ضرور چڑھاتے جائیے ؎

آوازۂ خلیل ز بنیادِ کعبہ نیست !
مشہور گشت زاں کہ در آتش نکو نشست

کاش آج کے بدلے ہوئے حالات میں ہم بھی اسی عزم اور ہمت کا ثبوت دے سکیں اور اپنی قومی زندگی کے تحفظ و ترقی کے لیے ایک نئے نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالنے کا کٹھن مگر ضروری کام شروع کر دیں۔

جامعہ کے پچیس سال

۲۵ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دیوبند کے سردار شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم و مغفور کے ہاتھوں سید احمد خاں کے دارالعلوم کی مسجد جامع میں اس کام کا افتتاح ہوا۔ عجب زمانہ تھا، صاحبو۔ نشۂ جوانی کے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی۔ جس کا ایک لمحہ کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے۔ یہ جرمانوں کے ڈر سے نمازیں پڑھنے والے راتوں کو روتے اور گڑگڑاتے سنائی دیتے تھے، خود غرضیوں کی ہر وقت جکڑے رہنے والی زنجیریں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں، ٹوٹ رہی ہیں۔ ملازمتوں کے متلاشی، سفارشوں کے لیے سرگرداں، اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بے تاب تھے کہ اپنے وجود کو وجود ملی میں گم کر دیں، اور اپنی ساری قوتوں کو اس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ لیکن عمر بھر خود غرضی کی تکرار سے بے غرض کاموں کی مشق تو نہیں ہوتی اس بے غرضی کا رخ بھی جاذبِ توجہ ہنگاموں کی طرف، گلوں میں جھولیاں ڈال کر نکل کھڑے ہونے کی طرف، تقریروں کی طرف نئی نئی وضع کے لباسوں کی طرف ہی جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں کے اصرار پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے اُس وقت اس جوش اور خلوص کو ایک پائے دار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور مجھے وہ وقت یاد ہے، اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی، جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجودِ مقدس، قید، جلاوطنی، علالت اور تفکراتِ ملی نے جس کی ہڈیاں پگھلا دی تھیں، جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے، لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے، لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مددِ خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا ہے، ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا اور اس کا پیام اس کے شاگردِ رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو، یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی، وہ ایمانِ محکم اور اس ایمان کے نتیجے یعنی ایک

حذ ، ہیمیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۴۶ء

عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی اور وہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرمارہے تھے جوان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا۔ چند دن کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ بے قافلہ سروسامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہورہا تھا، یہ وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی، وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیرِ نو کے لیے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔

اس کام کے ساتھ مسلمانوں کے بہترین دل ودماغ رکھنے والے وابستہ رہے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم اس کے پہلے امیر جامعہ مقرر ہوئے، اور مولانا محمد علی مرحوم پہلے شیخ الجامعہ۔ حکیم صاحب مرحوم نے ہم نوجوانوں کو متانت، رواداری، خاموش خدمت کا سبق دیا۔ حکیم صاحب کی ذہنی جڑیں مسلمانوں کے علمی اور فنی ماضی میں بہت گہری پیوست تھیں، اور ان کی نظر حال کی ترقیوں اور مستقبل کے امکانات کو اس طرح صاف دیکھتی تھی جیسے شاید ہی کوئی نام نہاد جدید تعلیم یافتہ دیکھ سکتا ہو۔ ہم نے ان سے قدیم اور جدید کے ہم آہنگ بنانے اور سمونے کا سبق سیکھا۔ حکیم صاحب اپنے دلی کرب کو اپنے دل فریب تبسم کے پردے میں یوں چھپانا جانتے تھے جیسے صرف ایک ہم آہنگ شخصیت جانتی ہے، تکلیف میں مسکراتے رہنے کی عادت بھی ہم نے ان سے سیکھی۔

پھر کچھ عرصے بعد حکیم اجمل خاں صاحب کا سایہ ہمارے سر سے ہٹ گیا۔ اس جگہ جامعہ کی زندگی کے ایک خاص واقعے کا ذکر مناسب ہوگا، اس سے جامعہ کے کام کی روح اور اس کے اسلوب کار پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری ہمارے امیر مقرر ہوئے، ان کی محبت اور شفقت، ان کی فراخ دلی اور انسانی ہمدردی، ان کی برائی سے بیزاری اور نیکی کی ہر رنگ میں اعانت کا جذبہ ہم کارکنوں کی تربیت میں اپنا اثر چھوڑ گیا ہے اور ہم شکرگزاری کے ساتھ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امارت جامعہ کا کام جب سنبھالا تو ہماری مالی حالت بہت سقیم تھی۔ شروع میں جامعہ کے تمام مصارف کا بار جمعیت خلافت اٹھاتی تھی۔ لیکن سیاسی دریا کے اتار نے اس صورت کو ممکن نہ رکھا، حکیم صاحب تنہا اپنی ذاتی کوشش سے جامعہ کے کام کے لیے وسائل فراہم کرتے تھے۔ آخری زمانے میں مسلسل علالت اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث ماہ بہ ماہ فراہمیٔ زر کے کام میں خلل پڑتا رہا۔ اور جب حکیم صاحب سدھارے تو جامعہ پر خاصا قرض تھا۔ ہم کارکنوں کو، حتیٰ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم تک کو یہ علم نہ تھا کہ حکیم صاحب کہاں سے

ہمارے لیے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ جب وہ رخصت ہوگئے تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے خود ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مشورے سے ان کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا کہ جامعہ کے کام کو جاری رکھنے کا قصد ہو تو فراہمی زر کی طرف امنائے جامعہ توجہ فرمائیں یا اس کے بند کرنے کا فیصلہ کریں تو مجھے اس فیصلے کے اعلان سے کچھ پہلے آگاہ فرما دیں تاکہ اگر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی مدد سے میں اس ادارے کا کوئی چھوٹا سا حصّہ بھی قائم رکھ سکوں تو اس کی کوشش کروں۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا یہ مراسلہ امنا کی خدمت میں بھیجا اور انھیں فیصلے کی فوری ضرورت کی طرف متوجہ فرمایا۔ زمانہ بہت بُرا تھا، سیاسی ردِّعمل نے ساری امنگیں دبا دی تھیں، ایک عام انتشاری حالت تھی۔ تعلیم کے ایک ایسے کام کے لیے جسے حکومت وقت بھی تسلیم نہ کرتی ہو، جو اپنی بے سروسامانی کے باعث خود بھی ظاہر میں نظروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے، کون روپیہ دینے پر تیار نظر آتا، چنانچہ ہمارے امنا کی بہت بڑی اکثریت نے بلکہ پانچ چھ کو چھوڑ کر سب نے جواب دیا کہ جامعہ کو بند کر دینا چاہیے، روپیہ فراہم نہیں کیا جا سکتا اور بہت سوں نے کہ شخصی طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے یہ مشورہ دیا کہ اس کے کسی حصّے کو زندہ رکھنے کا خیال قابلِ تعریف تو ہے مگر قابلِ عمل نہیں، اس خیال کو چھوڑو، کوئی اور مفید کام کرو۔ اس فیصلے اور اس مشورے میں تجربہ، زمانہ شناسی، مصلحت اور احتیاط کتنی بھی ہو یقین اور جُرات کی کمی ضرور تھی۔ لیکن یہ چیزیں الحمدللہ کہ قوم کے نوجوانوں میں موجود تھیں۔ میں نے اس خط کے ساتھ جس کا ذکر کیا، ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا تھا جو جامعہ میں کام کیا کرتے تھے۔ انھیں بتایا تھا کہ غالباً امنا کا فیصلہ یہی ہوگا کہ جامعہ کو بند کر دو، کیا آپ ہم مل کر اس کے کسی حصّے کو بچائیں؟ روپیہ نہیں ہے قرض سے جلد روپیہ ملنے کی کوئی توقع بھی بظاہر نہیں ہے، مکان کرائے کے ہیں، بچوں کو بلا کر کم سے کم سال تعلیمی کے ختم سے پہلے واپس کرنا بہت بے جا ہوگا، کہیے کیا رائے ہے؟ ان کا جواب آیا — — سب کا، بلا استثنا سب کا، کہ کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، روپیہ نہ ہوگا بلا معاوضہ کام کریں گے، ایک دوسرے کو سہارا دیں گے، لیکن ایک بار کوشش کر کے ضرور دیکھیں گے۔ اس باہمت جواب کے بعد بے یقینی کا جو درجہ کام کو بند کرنے کے لیے ضرور تھا وہ میں نے اپنے اندر نہیں پایا، لہٰذا کام جاری رہا۔ ان ساتھیوں کی ہمّت کا امتحان خوب خوب ہوا، مہینوں کسی کو ایک پیسہ معاوضے کا نہ دیا جا سکا، لیکن ہم نے جامعہ کے انتظام میں ایک بنیادی تبدیلی کر لی۔ سب وہ جن کا تعلق رسمی تھا اس سے الگ ہو گئے، سب وہ جن کے دل کو لگی تھی اس کام کے ذمے دار بن گئے۔ ایک انجمن، انجمن تعلیم ملّی کے نام سے، قائم کی گئی، جس میں چند بنیادی امنا کے علاوہ جو ہمارے شریک رہنے پر آمادہ تھے، ۱۱ ساتھیوں نے حیاتی رُکن بننا قبول کیا، اس شرط پر کہ وہ بیس سال تک،

یا تا حیات، اگر زندگی بیس سال سے پہلے ختم ہو جائے، جامعہ کی خدمت کریں گے، اور اپنی خدمت کا صلہ کبھی ۱۵۰ روپے سے زیادہ طلب نہ کریں گے، حالات نے آج تک کسی حیاتی رکن کو یہ معاوضہ بھی نہیں لینے دیا ہے۔

اس انجمن کے قیام سے غیر سرکاری تعلیمی کام کے لیے ایک نئی راہ نکلی ہے۔ تعلیمی آزادی کا وہ خیال جو پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے، اس انجمن کے قیام سے اور واضح ہو گیا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہو، سیاسی جماعتوں کے اثر سے آزاد ہو، بلکہ ناواقف شخصیتوں اور غیر تعلیمی رجحانات رکھنے والی ٹولیوں کے اثر سے بھی پاک ہو۔ غیر سرکاری مدارس کی انتظامی جماعتوں اور اس کے ملازموں، یعنی واقعی تعلیمی کام کرنے والوں - - - - - کی روز کی کشاکش وکیلوں اور تاجروں اور عہدے داروں کے انمل بے جوڑ مجموعوں کو جو استادوں کو خریدتے ہیں اور زر خرید چیز کی طرح برتتے ہیں اور ان استادوں کو جو اپنے کو جنس بازاری کی طرح بیچتے ہیں، تعلیم گاہوں میں یک جا کر کے صحیح تہذیبی تعلیمی مرکز کیسے بن سکتے ہیں؟ تعلیم کا کام صرف انھیں کرنا چاہیے جو اسے اپنا حقیقی کام سمجھتے ہوں، جو اس کے بغیر بے چین رہیں، جو اس کی انجام دہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھیں اور جو اس کام کی اہمیت اور اپنی اس کے ساتھ وابستگی کے باعث خود اپنا احترام کرتے ہوں کہ اپنے کام کو اپنی بصیرت کے مطابق بہترین طریق پر انجام دیں۔ میرا خیال ہے کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں میں اس قسم کی پہلی انجمن ہے، اور میری دعا ہے کہ ایسی متعدد انجمنیں جلد وجود میں آئیں اور ہماری تعلیم کا کام کرانے کے کام کی جگہ عبادت کی ایک شکل بن جائے۔

واقعی کام کرنے والوں نے انجمن جامعہ ملیہ کی شکل میں اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے مالی وسائل کی فراہمی کا بھی ایک نیا ڈھنگ ڈالا ہے۔ سرکاری امداد کا تو سوال ہی نہ تھا، متمول طبقے کی مدد کم یاب تھی، اہل ثروت سرکاری بے اعتنائی بلکہ مخالفت کی صورت میں ایک تعلیم گاہ کو جس کے کام نے بھی ابھی اپنی ساکھ پیدا نہ کی تھی کیسے اپناتے؟ اور ہم کہ اپنی آزادی کی قدر شروع سے کرنا چاہ رہے تھے اپنے وجود اور اپنے طرز کار کو کیسے اس قسم کی مدد پر منحصر کرنے پر راضی ہو جاتے؟ ہم نے چند خواص کی جگہ جمہور ملت کو اپنا مددگار بنانا چاہا اور ۱۹۳۲ء میں ہمدردانِ جامعہ کے نام سے ایک حلقے کی تنظیم شروع کی، جس میں ہوتے ہوتے دس ہزار ہمدرد ہو گئے ہیں، جو ہمیں ماہانہ یا سالانہ چھوٹی چھوٹی رقمیں مرحمت فرماتے ہیں، لیکن ایک بار نہیں بلکہ برابر مرحمت فرماتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے کام سے ناخوش ہوتے ہیں تو اپنی مدد بند کر دیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں تو اور دوسرے دوستوں کو بھی اس حلقے میں شامل کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق دو چار صاحبانِ ثروت سے نہیں بلکہ ہزاروں ہمدردوں سے بندھا رہتا ہے اور ہمیں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کسی ایک آدمی

کے ناخوش ہونے سے ہمارا کام رُک جائے گا، بلکہ ہماری مدد صرف اس وقت بند ہوگی جب ہم اتنے بُرے ہوں کہ جمہور اُمّت ہم سے متفقہ طور پر ناخوش ہو جائیں۔ اس وقت بے شک یہ مدد بند ہو بھی جانی چاہیے اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کیوں اپنے ہمدردوں کی ہمدردی قائم نہ رکھ سکے۔

آج جامعہ ایک چھوٹا سا اقامتی کالج چلا رہی ہے، جس کے متعدد فارغ جامعہ کے کام میں اپنی ساری قوتیں وقف کر رہے ہیں اور ملک کے مختلف گوشوں میں، علمی، تعلیمی، صحافتی تجارتی، سیاسی کاموں میں نیک نامی کے ساتھ مصروف ہیں۔ اس نے ایک چھوٹا سا کوئی پچیس ہزار مجلّدات پر مشتمل کتب خانہ جمع کر لیا ہے، ایک اقامتی مدرسہ ثانوی، ایک اقامتی مدرسہ ابتدائی چلا رہی ہے، جن میں جدید طریق ہائے تعلیم پر تجربے کیے جا رہے ہیں، اور انھیں اپنی قومی ضرورتوں کے لیے مفید بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، ایک ادارہ تعلیمی مرکز کے نام سے شہر دہلی میں چل رہا ہے، جو ایک مڈل اسکول، ایک عمومی دارالمطالعہ، عام اجتماعات کے لیے ایک ہال، پڑوس کے شہریوں کے لیے ایک کلب پر مشتمل ہے اور اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے۔ تعلیم بالغان کے طریقوں پر تجربہ حاصل کرنے کے لیے ادارۂ تعلیم و ترقی کے زیر اہتمام ایک تجربی مرکز قائم ہے، اور دوسرے کام کرنے والوں کے لیے طریق کار سے متعلق لٹریچر شائع کرنے کے علاوہ اس نے بالغ مبتدیوں کے لیے ڈیڑھ سو سے ادپر رسالے شائع کیے ہیں۔ ایک استادوں کا مدرسہ ہے جس میں بنیادی مدرسوں کے استادوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔ اردو میں اشاعت کا کام وسیع پیمانے پر مکتبہ جامعہ انجام دے رہا ہے، اور آج اردو کے خادموں کی صفِ اوّل میں اپنے لیے ایک اچھی جگہ پیدا کر چکا ہے، ایک چھوٹا سا شعبہ مصنوعاتِ جامعہ کے مدرسہ ثانوی کے معمل سائنس سے متعلق ہے، اور روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں تیار کرتا ہے، ان مختلف اداروں کے کچھ کام کا اندازہ آپ کو جوبلی کی نمائش کے ملاحظے سے ہو سکے گا۔

غرض خاصا پھیلا ہوا کام ہے اور اس پر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں لیکن سب چھوٹا چھوٹا کام ہے، ابتدائی حالت میں ہے، ہر پہلو سے اصلاح و ترقی کا پیاسا ہے، اور بلا کسی بے جا انکسار کے نہایت خلوص کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کاموں کی تفصیل بیان کرنے میں فخر کا شائبہ بھی نہیں کہ شرم سے آنکھیں اٹھانے کا بھی یارا نہیں۔ پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ! پچیس سال کی کوہ کنی اور یہ جوئے کم آب!! جانتا ہوں کہ بے صبری کا حق نہیں، جانتا ہوں کہ کام کی ماہیت میں ہر پختہ کام کی طرح سُست رفتاری ہے، جانتا ہوں کہ تعلیمی، تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارتے میں پھیل جائے، اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے، چمن بندی

ہے، مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے، دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے، اور ہاں، خونِ جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی، پسینہ بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خونِ جگر کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے؟ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے تو کیا یہ جلد بازی ہے؟ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اُکسے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، دیکھ کر سیکھ سکیں، برت کر اپنا سکیں اور سنوار سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل درس اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمتہ اللعالمین کے چمن کے نونہال بار آور سایہ دار درخت بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو اور ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے۔ اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھیریں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔ اعلیٰ حضرت، اکابرِ قوم اور بلند ہمت دوستو اور عزیزو، اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنانِ جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہوگا جس کی تعبیر نہ ہو سکے گی؟ اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہو کر رہے گا، لیکن اس کا ایک جواب آپ سب کے ذمے بھی ہے۔

جیسا کہ آپ صاحبان، اعلیٰ حضرت کی زبان مبارک سے ابھی سُن چکے ہیں، اس منصوبے کو ایک قدم اور آگے بڑھانے کے لیے ہم نے اگلے چند سال میں بعض کام شروع کرنے کا قصد کر ہی لیا ہے۔ طالب علموں اور استادوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ہوسٹل اور مکان فوراً بنوانے ہیں، چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک اچھا کنڈرگارٹن بنانا ہے۔ ثانوی تعلیم میں ضروری تنوع پیدا کرنے کے لیے صنعتی اور تجارتی مدرسہ قائم کرنا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک اقامتی درس گاہ قائم کرنی ہے۔ علمی تحقیق کے ادارے قائم کرنے ہیں، جن میں سب سے پہلے اسلامی علوم کے تحقیقاتی ادارے، بیت الحکمتہ، کو صحیح اور مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔ اپنے مرحوم امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی یادگار کے طور پر ایک شفا خانہ بنانا ہے۔ کتب خانے کے لیے عمارت بنوانی ہے اور اس میں خصوصاً اسلام اور ہندوستان سے متعلق کتابوں کا ایک

اچھا ذخیرہ فراہم کرنا ہے اور اس نو آبادی کے مرکز میں اس کے قلب کی حیثیت سے ایک مسجد تعمیر کرانی ہے۔ ان کاموں کے لیے ہیں نے اپنی ناتجربہ کاری میں دس لاکھ کا اندازہ کیا تھا۔ اس امید پر کہ جنگ کے بعد قیمتیں کچھ تو اپنی سابقہ حالت کے قریب آئیں گی، لیکن یہ خیال غلط نکلا اور اب اس کام کے لیے تقریباً تیس لاکھ کا اندازہ کیا جا رہا ہے۔ ہم نے قوم سے جوبلی کے موقع پر دس لاکھ روپیہ مانگا، دس لاکھ سے زیادہ تقریباً بارہ لاکھ روپیہ فراہم کرنے کا انتظام قوم نے کر دیا ہے، لیکن اب ان اٹھارہ لاکھ کا انتظام بھی تو اسی کو کرنا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ انتظام بھی ہو ہی جائے گا، لیکن جلد ہو یا دیر میں، ہم نے کام شروع کرتے وقت کب پہلے روپیہ جمع ہونے کا انتظام کیا تھا کہ اب اس کے منتظر رہیں گے۔ یہ کام تو خدا نے چاہا تو ہوگا ہی، اگر یہ اچھا کام ہے تو خدا آپ سب کو اس کی تکمیل کی سعادت میں شرکت کی توفیق عطا فرمائے۔

میں قائدِ اعظم محمد علی جناح اور امام الہند ابو الکلام آزاد کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس جشن میں شرکت فرما کر ہمیں مفتخر فرمایا۔ آپ کی قوم کے چند بوڑھوں اور نوجوانوں نے خاموش تعلیمی کام کا ایک نمونہ اس جامعہ میں پیش کرنا چاہا ہے۔ آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ قومی وجود اور قومی تہذیب کا تحفظ صرف اسے بگڑتے سے بچا کر نہیں ہو سکتا، بلکہ اسے بناتے رہنے کا طالب ہوتا ہے، آزادی ہو یا نمو پذیر حیات تمدّنی یا اقدارِ عالیہ مطلقہ، یہ بس ایک بار حاصل کرنے اور سونپ کر رکھ دینے کی چیزیں نہیں ہیں؛ یہ انھیں کو ملتی ہیں اور انھیں کے پاس رہ سکتی ہیں جو ہر دم اُن کے از سرِ نو حصول اور ہر دم از سرِ نو تخلیق کی دشواریاں انگیز نے پر تیار ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے، لیکن ہم ہندوستانی مسلمانوں میں اس تخلیقی عمل کے نمائندہ بننا چاہتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے کام کو پسند فرمائیں گے آپ کی پسند ہماری محنتوں کا بڑا انعام ہوگی۔

آپ صاحبان آسمانِ سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول، کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطحِ اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز

ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجیے۔

آخر میں اعلیٰ حضرت، میں چند لمحوں کے لیے اپنے کو جامعہ کے کارکنوں کی صف سے الگ کر کے اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کا۔ حضور والا نے اپنے ارشادات صدارت میں مجھ ناچیز کے متعلق جو فرمایا ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ کاش میں اس کا مستحق ہوتا۔ حضور، جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں، میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات اس ادارے کی خدمت میں اپنی جان کھپاتے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی ادارے کو نصیب ہوں گے۔ انھوں نے اس پچیس سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے۔ یہ قوم کے بچوں کے لیے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں۔ اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لیے ترسے ہیں، یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لیے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا، یہ کتابوں کو ترستے ہیں۔ تحقیقی رسائل کو ترستے ہیں، انھیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے، اور پھر کہیں سے روپیہ آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لیے زمین خریدوا دیتے ہیں اور اپنے مطالبات کو موخر کر دیتے ہیں، یہ ہماری قوم کے مستقبل کے لیے ایک فالِ نیک ہیں۔ انھوں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے۔

آغشتہ اند ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ اند

میں قوم کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

قرار یا فرار

(یہ ڈاکٹر صاحب کی اس تاریخی تقریر کی بالواسطہ رپورٹ ہے جو موصوف نے ۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی کے جنم دن کے جلسے میں جامعہ ملیہ کی چھوٹی سی جماعت کے سامنے کی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب شمال کی طرف سے مشین گنوں کی آواز آرہی تھی۔ جنوب کی طرف سے مسلح بلوائیوں کے حملے کا خطرہ تھا، مشرق کی طرف سے ستائے ہوئے سہمے ہوئے دیہاتی آکر جامعہ میں پناہ لے رہے تھے اور مغرب کی طرف سے ہمایوں کے مقبرے کا اور وہاں سے پاکستان کا راستہ کھلا ہوا تھا۔)

... آپ جانتے ہیں کہ اس بزرگ کا جس کی سالگرہ منانے کو آپ یہاں جمع ہوئے ہیں جامعہ سے کیا تعلق ہے! اُسی کی دعوت پر کچھ سرپھرے نوجوان مولانا محمد علی کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی کی شاندار عمارتوں کو چھوڑ کر ان کے کچے پکے مکانوں اور خیموں میں آکر پڑ گئے تھے جن کا نام جامعہ ملیہ تھا۔ اسی کے سہارے حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری جامعہ کے نیم جان مریض کو دہلی لے کر آئے تھے اور اسی کے مشورے اور مدد سے دونوں بزرگوں نے اس کی چارہ فرمائی کی تھی اور اُسے تندرست اور تنومند بنایا تھا۔ اس وقت تک گاندھی جی مسلمانوں کے سچے دوست اور محسن سمجھے جاتے تھے۔ اُس کے بعد وہ دور آیا کہ جب مسلمانوں کے نئے دوست اور محسن پیدا ہو گئے اور انھوں نے ان کو سکھایا کہ گاندھی تمہارا نمبر ایک کا دشمن ہے۔ یہ جھوٹ اس طرح پھیلا کہ مسلمانوں کے دلوں کے دروازے گاندھی جی پر بند ہو گئے۔ مگر گاندھی جی کے دل کا دروازہ اُن کے لیے ہمیشہ کھلا رہا۔ وہ اپنے مسلمان دوستوں اور رفیقوں کے ذریعے سے اور جامعہ ملیہ کے ذریعے سے برابر کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کے دل ہاتھ میں لیں۔ آج دوست، دشمن کی پہچان کا دن آگیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کا سچا یکا دلی دوست ایک ہی ہے، جو آپ کا پشت پناہ اور سینہ سپر ہے آج مسلمان گاندھی جی کو مان گئے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمان اور چاہے جو کچھ ہوں احسان فراموش ہرگز نہیں ہیں۔

... یہ قیامت جو آپ آج دیکھ رہے ہیں، ایک وقتی جنون کا نتیجہ ہے جس میں سبھی مبتلا ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب نے جی بھر کے گناہ کیے ہیں۔ سب نے اپنے دین کے، اپنے ایمان کے گلے پر

رسالہ نئی روشنی

چھری پھیری ہے۔ گاندھی جی سب کو ان کے گناہ کا احساس دلا رہے ہیں، توبہ کی طرف بلا رہے ہیں، سب کو اس ہلاکت کے گڑھے سے آگاہ کر رہے ہیں جس کی طرف وہ تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں اگر لوگ گاندھی جی کی پکار سن لیں گے، اپنے کرتوتوں پر شرمائیں گے، اپنے گناہوں سے توبہ کریں گے تو بچ جائیں گے، ورنہ بھر وہ ہیں اور جسم اور روح کی موت، دین اور دنیا کی ہلاکت۔

.... مگر مجھے یقین ہے کہ گاندھی جی کی آواز اپنا اثر کر کے رہے گی اور وہ ہمارے دلوں سے اس عارضی وحشت اور بہیمت کو دور کر دیں گے ہماری انسانیت کو جگا دیں گے۔ وہ ہندوستان جو آج اس قدر نیچے گر گیا ہے، ایک بار پھر اٹھے گا اور ایک بار پھر دنیا کو امن اور تہذیب کا پیام پہنچائے گا۔ ہندوستانی قوم کے اس مصلح پر صرف ایک ہی قوم نہیں بلکہ سب قومیں فخر کریں گی، پوری انسانیت فخر کرے گی۔

آپ دہلی کی اور آس پاس کی فضا کو دیکھ کر خائف اور پریشان مایوس اور دل شکستہ نہ ہوں۔ خدا پر بھروسہ کیجیے اور اس کے کمزور اور نحیف بندے پر بھروسہ کیجیے، جس کا نام موہن داس کرم چند گاندھی ہے۔ اپنے ملک کی حکومت پر بھروسہ کیجیے جس کی باگ ڈور آپ کے عمر بھر کے آزمائے ہوئے لیڈروں کے ہاتھ میں ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے برطانیہ جیسی عظیم الشان سلطنت کے دانت کھٹے کر دئے وہ ان فساد کی قوتوں سے جو آج ابھر آئی ہیں شکست کھا جائیں گے؟ ابھی ان لوگوں کو حکومت کا کام اپنے ہاتھ میں لیے چند ہی روز ہوئے ہیں۔ اُن کو یہ اندازہ نہ تھا، کسی کو یہ اندازہ نہ تھا، کہ ایک دم سے یہ قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ فساد کے پہلے ہلے نے اچانک آلیا۔ اب وہ سنبھل گئے ہیں، اپنی قوت کو جمع کر رہے ہیں اور اس فتنہ کا سر کچلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مگر آپ لوگ یہ نہ سمجھ لیجیے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ خطرہ ابھی سر پر منڈلا رہا ہے اور جو کچھ اب تک ہوا ہے اس سے بھی بدتر حالات پیش آ سکتے ہیں۔ یہ آگ سارے ملک میں پھیل سکتی ہے، اپنے کو دھوکے میں نہ رکھیے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو بے فکری کا اطمینان دلایا جائے۔ میں آپ کو وہ اطمینان دلانا چاہتا ہوں جو خطرے کا پورا احساس رکھنے کے باوجود ہوتا ہے۔

... قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے '''' موقع آتے ہیں یہ وقت قدرت کی طرف سے آزمائش کا ہوتا ہے۔ اب آپ کے سامنے یہ سوال ہے کہ آپ اس آزمائش سے گزرنا چاہتے ہیں یا اس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا فیصلہ بھاگنے کا ہے تو بسم اللہ... پاکستان کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ جو جانا چاہے شوق سے جائے مگر یاد رکھیے موت آپ کا پیچھا وہاں بھی نہ چھوڑے گی۔ کتنے ہوں گے جو راستے میں مارے جائیں گے۔ کتنے ریل کے بند ڈبوں میں گھٹ کر مر جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کا فیصلہ اس آزمائش سے گزرنے کا ہو تو پھر یہاں ڈٹ جائیے۔ یہ یاد رہے کہ بہت ممکن ہے آپ مار ڈالے جائیں۔ لیکن آپ کا یہ قتل رائگاں نہیں جائے گا بعض قتل ایسے ہوتے ہیں۔ جن پر قاتل شرماتے ہیں اور مقتول فخر کرتے ہیں۔ بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جو پوری زندگیوں پر بھاری ہوتے ہیں بعض قتل گرتی ہوئی قوموں کو

سنبھال لیتے ہیں گری ہوئی قوموں کو اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جامعہ کے لوگ اگر ایسے مقتولوں میں داخل ہو جائیں تو وہ کام کر جائیں گے جو پچھلے سب کاموں پر بھاری ہوگا۔

جو لوگ موت کے استقبال کے لیے تیار رہتے ہیں ان کے لیے زندہ رہنے کی راہیں بھی نکل آتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی جس کو غلط رہنمائی نے اس بھنور میں ڈال دیا ہے۔ آپ کے کمزور ہاتھوں سے پار لگ جائے۔ کیا عجب ہے کہ خدا آپ ہی کے ہاتھ سے مسلمانوں کی تنظیم کا کام لے جس کی بنا خدا کے خوف اور خلقِ خدا کی محبت، وطن کی وفاداری اور اہلِ وطن کی خدمت پر استوار ہو۔ اور کچھ نہ سہی تو آپ اپنی مثال سے اس وقت دہلی کے لوگوں کی ہمت بندھائیں گے۔ اب بھی جو مسلمان اپنے اپنے محلوں میں ڈٹے ہوئے ہیں وہ بھاگنے والوں سے زیادہ آرام میں ہیں۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے دہلی بچ جائے گی آپ بھی اس کے بچانے میں حصہ لیجیے۔

آپ میں سے جو لوگ ہمایوں کے مقبرے میں مصیبت زدوں کی خدمت کر رہے ہیں وہ اسے چھوٹا کام نہ سمجھیں۔ اس وقت موت اور زیست کا سوال ہے۔ اگر آپ نے ہمایوں کے مقبرے کو بچا لیا تو دہلی کو بچا لیا اور دہلی کو بچا لیا تو ہندوستان کو بچا لیا۔ اس خیال کو دل میں لیے ہوئے کام کیجیے تو آپ کی قوتِ عمل دس گنی ہو جائے گی۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ یہی کام اس وقت کرنے کا ہے اور آپ ہی اس کے کرنے والے ہیں۔ ۔ ۔

اب مجھے چند لفظ خواتین سے کہنے ہیں۔ ۔ ۔ آپ کی اس گریہ وزاری سے آپ کو یا دوسروں کو کیا فائدہ پہنچے گا یہ وقت رونے کا نہیں بلکہ کام کا ہے اور جو کام ہمارے سامنے ہے اس میں آپ کو بھی مردوں کا ہاتھ بٹانا ہے۔ اب سردی آنے والی ہے۔ آپ اپنے کو بہت تکلیف میں سمجھتی ہیں مگر کم از کم آپ کے سر پر چھت تو ہے۔ اُن مصیبت کے ماروں کا خیال کیجیے جو آسمان کی چھت کے نیچے زمین کے فرش پر رہتے ہیں۔ اپنے اوڑھنے بچھونوں کو کم کر کے زیادہ سے زیادہ گدے، توشکیں لحاف ہمایوں کے مقبرے پہنچا دیجیے۔ پُرانے کپڑوں کی مرمت کر کے ان کو استعمال کے قابل بنا دیجیے۔ ۔ ۔ ۔

بس یہی چند باتیں مجھے کہنی تھیں۔ ان پر غور کیجیے، اپنے دل مضبوط رکھیے۔ اپنی طرف سے سعی کرتے رہیے۔ انجام کو خدا پر چھوڑ دیجیے۔

نورِ اُمید

(یہ ذاکر صاحب کا مکتوب گرامی ہے جو انھوں نے آنکھوں کے آپریشن کے بارھویں دن لکھا تھا آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مگر دل کی آنکھیں روشن تھیں۔ ہاتھ کی جنبش بصارت کی مدد کے بغیر بصیرت کا پیام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کاغذ پر ٹیڑھے میڑھے نقش بنے اور آپس میں گڈمڈ بھی ہو گئے بڑی مشکل سے پڑھے گئے مگر پڑھ لیے گئے۔)

بیمارستان ,, لاکولین ،، جنیوا

۱۶ر جون

عابد صاحب،

آج شاید بارھواں دن ہے کہ دونوں آنکھیں بند اس بیمارستان میں بستر پر پڑا ہوں، کروٹ لینے کی بھی اجازت نہیں۔ اس وقت رات ہے، نہ جانے کیا بجا ہوگا۔ تاریکی اور روشنی کے ادل بدل سے ناآشنا کو اس کا پتہ اس سناٹے سے چلتا ہے جس میں قریب کا دریا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے کمرے کے نیچے آ گیا ہے اور بس مجھ سے ہی باتیں کر رہا ہے، اور چاہتا ہے کہ میں اس کی سنتا رہوں۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے باتیں کروں۔ بستر سے لگی ہوئی ایک چھوٹی سی میز ہے، جسے چھو سکتا ہوں اور ٹٹول کر اس پر سے چیزیں اٹھا سکتا ہوں۔ اس کے دراز میں آپریشن سے پہلے ایک پنسل اور کاغذ کا ایک پیڈ رکھ دیا تھا وہ اس وقت کام آیا۔ نابینا آنکھوں کے باوجود لکھنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ سطر پر سطر تو شاید چڑھ جائے مگر کچھ نہ کچھ تو پڑھا جائے گا ضرور۔

اس حالت میں خط لکھنے کو جی یوں چاہا کہ شام ہوتے آپ کا خط ملا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ شاید "نئی روشنی" ۱۶ کو نکل آئے گا ۹ بجے سے جب سونے کا وقت سمجھ کر سب رفیق اور مددگار چلے جاتے ہیں، کچھ اسی کا دھیان بندھ گیا ہے۔ آج وہ پرچہ نکلا ہوگا اور میں نہ جانے کب اسے دیکھ سکوں گا؟ نہ جانے کب اس کے لیے کچھ لکھ سکوں گا؟ یہ پرچہ کیسی پریشانی کے وقت نکلا ہے۔ آپ کے اپنے اور سب کاموں کی طرح اس کی بے سروسامانی کا حال بھی جانتا ہوں۔ چل بھی سکے گا یا نہیں؟

رسالہ نئی روشنی

کیا پیسہ بنانے کا کام کیے بغیر رائے بنانے کا کام ہو سکے گا؟ لوگ اسے غداروں کی سازش سمجھیں گے یا ساتھیوں، ہم سفروں کے دل کی آواز؟ یہ عام مذاق کو سدھار سکے گا یا عام بدمذاقی کا شکار ہو جائے گا؟ یہ حق کی تلخی سے کترائے گا تو نہیں؟ نشہ پلا کر لوگوں کو بدحواس اور بے عقل بنانے کا چلتا کاروبار تو نہیں کرنے لگے گا؟ نہ جانے کیا کیا سوال دل میں اٹھتے ہیں۔ مایوس کن سے مایوس کن خیال آتا ہے مگر ٹھیرتا نہیں جمتا نہیں نہ جانے کیا بات ہے کہ اس وقت کہ حالات کا میرے اپنے ذاتی اور وطن کے عمومی حالات کا تقاضا یاس افزا ہونا چاہیے، اپنے سینے کو امید سے معمور پاتا ہوں آپ کو تعجب ہوگا، عابد صاحب کہ ان پچھلے بارہ دن میں جاگتے میں مجھے کبھی ایک لمحے کو تاریکی کا احساس نہیں ہوا۔ دن ہو یا رات، میری بند آنکھیں برابر کمرے کو روشن پاتی ہیں۔ اس روشنی کی کچھ بے ربطیاں بھی محسوس کرتا ہوں۔ مثلاً میرے کمرے کا دروازہ جو میرے بائیں جانب دیوار کے بیچ میں ہے مجھے دور کے کونے میں دکھائی دیتا ہے! لیکن پھر بھی یہ روشنی اسی طرح کی روشنی ہے، البتہ ذرا دھیمی دھیمی جیسی کھلی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اس روشنی میں وسیع کھیت دیکھتا ہوں، ہل کی لیکھ صاف دکھائی دیتی ہے، اس کے ایک طرف روشنی ایک طرف سایہ تک محسوس ہوتا ہے؛ بڑے بڑے مکان بنتے دیکھتا ہوں، آس پاس کثرت سے تعمیر کا سامان، اس کی طبی وجہ مجھے معلوم نہیں، نہ اس کے بھید چلانے کی مجھے فکر ہے۔ آپ سے اس کا ذکر اس لیے کیا کہ حالات کی تاریکی میں میرے دل کا بھی یہی حال ہے۔ اس لیے کہ اس امید کی وجہ بھی صحیح معلوم نہیں۔ عرفی کا شعر وجہ نہیں بتلاتا لیکن کیفیت کی صحیح تصویر ضرور پیش کرتا ہے:

دلم بہ کوئے باصد ہزار نومیدی
بہ ایں خوش است کہ امید داری گزرو

مجھے یقین ہے کہ آزمائش کا یہ وقت بھی گزر جائے گا اور ہندی سماج کو ایک اخلاقی سماج بنانے کا کام آپ کے میرے جیسے کمزور ہاتھ ہی مل کر کریں گے۔ اور ایک صالح، عادل سماج بنانے کی کٹھن مہم سر کرنے کی کوشش ہی میں ہم سب کو اپنی شخصیت کے ایک آزاد اخلاقی شخصیت بنانے کا موقع بھی ہاتھ آئے گا۔ اس مہم میں راہ نما روشنی کی ہر قدم پر ضرورت ہوگی۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کا پرچہ یہ روشنی مہیا کرے، جی کہتا ہے کہ یہ ایسا کر سکے گا۔ آپ نے اس کا نام "نئی روشنی" خوب رکھا ہے۔ میری دوری اور بے بسی ہے یہ نہ سمجھیے کہ اس دیئے کی لو کو روشن رکھنے کے لیے میں اپنے آپ کو پگھلانے سے بچ نکلوں گا۔

سمجھتا ہوں کہ اب بس کروں۔ شاید اب صبح ہونے والی ہے۔ ابھی کچھ دیر ہوئی مرغ نے بانگ دی تھی۔ اب وہ چڑیا بولی جو روز میری کھڑکی کے قریب درخت پر بولتی ہے۔ پہلے



معین الدین حارث، ذاکر حسین، شفیق الرحمٰن قدوائی، غلام احمد کاشمیری



ذاکر حسین فرشی نشست (نیچے بیٹھے ہوئے) جامعہ



(بائیں سے دائیں) اے۔ ایم خواجہ، ذاکر حسین، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر انصاری



سلور جوبلی فنکشن

دائیں سے بائیں عبداللطیف اعظمی، اخلاص احمد صدیقی، سعید حسین

ذاکر حسین، اے۔ ایم۔ خواجہ۔



تعلیمی مرکز، قرول باغ ۱۹۳۲ء

پہلی صف میں بیٹھے ہوئے (بائیں سے دائیں) : ماسٹر عبدالسمیع، ایچ۔ اختر فاروقی

الیاس احمد مجیبی، حافظ فیاض احمد،

دوسری صف میں کرسی پر بیٹھے ہوئے (بائیں سے دائیں)

(۱) (۲) گرڈا فلپس بورن (۳)

(۴) (۵) ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۶) خواجہ حسن نظامی

(۷) (۸) اسلم جے راج پوری (۹) (۱۰)

پہلی صف میں کھڑے ہوئے (۱) عابد حسین (۲) ذاکر حسین (۳) الحسین حسان

دوسری صف میں کھڑے ہوئے (۱) عبدالواحد سندھی (۲) اظہر عباس (۳) حامد علی خاں

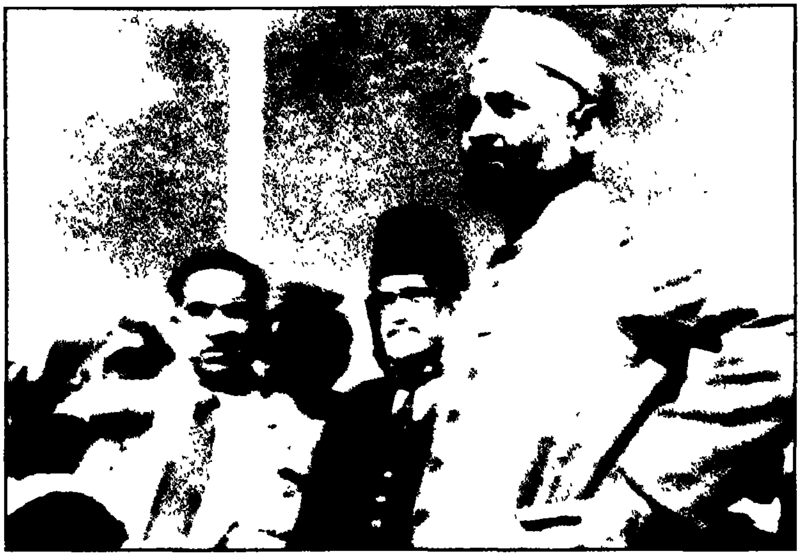
(۴) عبدالحفیظ (۵) حکیم میرن۔



جوبلی کے لیے آتے ہوئے
لیاقت علی خاں، عابد حسین ذاکر حسین، محمد علی جناح، فاطمہ جناح

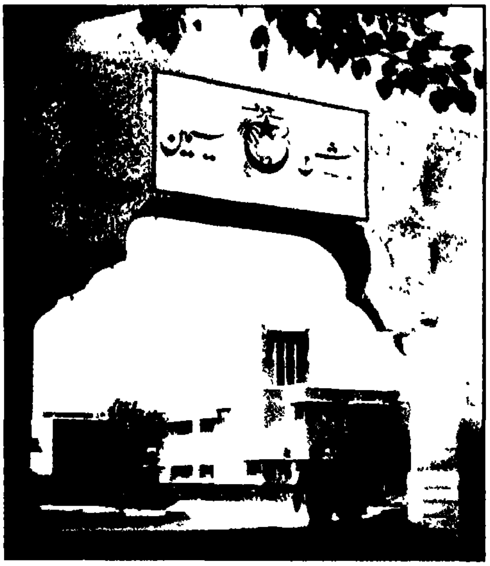


نواب بھوپال، ذاکر حسین جوبلی جشن کے موقع پر



جامعہ کی سلور جوبلی ۱۹۴۶ء

ذاکر حسین، شیخ عبدالقادر، کے۔ اے۔ حمید



جشنِ سیمیں میں (سلور جوبلی)

جامعہ کا گیٹ (باب جوہر)



جرمنی میں دوستوں کے ہمراہ
پہلی صف میں: کے۔ اے۔ حمید، ذاکر حسین دو دوستوں کے ہمراہ
دوسری صف میں: پہلے سے دائیں عابد حسین



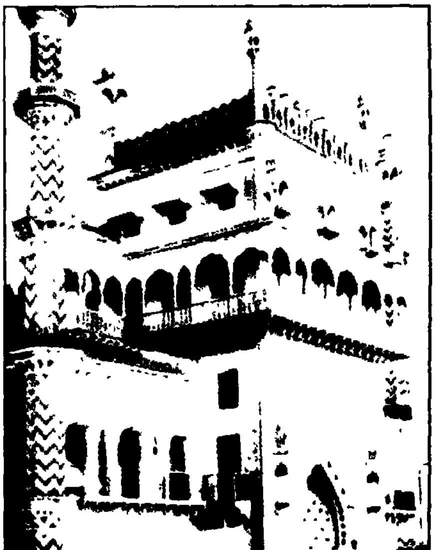
ڈاکٹر ذاکر حسین



بی۔ اے کی سند لیے ہوئے



خاندان کے افراد
بیٹھے ہوئے عابد حسین، عطا حسین (چچا)، فدا حسین (والد)، مظفر حسین
کھڑے ہوئے (پشت پر)، ذاکر حسین، زاہد حسین۔ کھڑے ہوئے (آگے)، یوسف حسین





ذاکر حسین سات سال کی عمر میں

اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ

ذرا آہستہ آہستہ، ٹھہر ٹھہر کر جیسے آزماتی ہو کہ اور بھی جاگتے ہیں یا نہیں۔ پھر چند منٹ بعد جہاں کوئی اور ہم نوا ملا تو ذرا جلد جلد اور تیز تیز۔ کوئی آدھ گھنٹے میں سارا باغ گونج اٹھتا ہے اور نغمے کا ایک ایسا طوفان ہوتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چڑیاں ہی نہیں، درختوں کی ہر پتی اور چمن کا ہر پھول بھی اس کورس میں شریک ہو گیا ہے۔ مگر جب دن چڑھے آدمیوں کا شور و غل، ڈاکٹروں کی آمد نرسوں کی مستعدی، اس جشن موسیقی کو دبا دیتی ہے اس وقت بھی مجھے اس چڑیا کی آواز بار بار یاد آتی ہے، سنائی سی دیتی ہے۔ جو پہلے پہل رُک رُک کر ذرا آہستہ آہستہ بولی تھی۔ اور آج ایسا لگتا ہے کہ شاید اس چڑیا ہی کا نام "نئی روشنی" ہے!

بس خدا حافظ

آپ کا

ذاکر

بھائیو! دوستو! ساتھیو!

بھائیو، دوستو، ساتھیو! میں نے یہ تینوں لفظ جان کر بولے ہیں. آدمی کو آدمی کا بھائی قدرت بناتی ہے. ہم کو تم کو قدرت نے ایک دیس میں پیدا کیا ہے اسی مٹی سے ہم سب بنے ہیں، اسی مٹی میں ہم سب ملتے رہے ہیں، اسی میں پلے بڑھے ہیں اور اسی میں مرتے، جلتے، گڑتے ہیں۔ اس کے تاروں سے سرگوشیاں کرنے والے پہاڑوں کی طاقت اور مضبوطی اس کے میدانوں کو مدت کے بعد زندگی بخشنے والے دریاؤں کا فیض رساں بہاؤ، اس کے جنگلوں کی عارفانہ دم کشی، اس کی چڑیوں کی چہک اس کے پھولوں کی مہک، یہ سب تم جانو کہ نہ جانو، ہمارے تمہارے سب کے رونگٹے میں بسے ہوئے ہیں۔ ہم نے تم نے سب نے اس کے ہر آرام اور اس کے ہر دکھ میں ایک سا حصہ پایا ہے۔ اس کی نسیم نے سب سے ایک سی اٹھکھیلیاں کی ہیں اور اس کی لو نے ہم سب کو ایک سا جھلسایا ہے اس کی زمین نے جو اگلا ہے اس سے ہم سب نے پیٹ پالا ہے اور اس کے کالوں اور قحطوں نے ہم سے کبھی نہیں پوچھا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان ہو یا سکھ؟ اس کے جانوروں نے تمہاری ہماری سب کی مدد کی ہے اور ہاں اس کے سانپوں نے تم کو ہم کو، ہاں تم کو اور ہم کو یکساں ڈسا ہے اور تم کو ہم کو یکساں فائدہ پہنچایا ہے۔ قدرت نے جو رشتہ جوڑا ہے اسے توڑنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟

ہاں، تم شاید کہو کہ آدمی خالی قدرت کا حصہ نہیں۔ پتھر نہیں۔ پودا نہیں، جانور نہیں ہے کہ قدرت نے جو بنا دیا وہی رہے۔ یہ آدمی ہے۔ اپنی دنیا آپ بھی بناتا بگاڑتا ہے۔ تو یہ بالکل سچ ہے۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں دوست کہہ کر پکارا ہے۔ ہم کو تم کو قدرت نے ہی ایک دیس میں پیدا کر کے بھائی نہیں بنایا ہے بلکہ ہم اپنی خوشی سے مل جل کر صدیوں ساتھ رہے ہیں۔ غم، شادی میں ایک دوسرے کے شریک رہے ہیں۔ آپس میں سلوک کیے ہیں، ایک دوسرے کے عیبوں سے چشم پوشی کی ہے، ہنر ڈھونڈے ہیں، سیکھے ہیں، سکھائے ہیں۔ ایک نے اپنی کمی دوسرے سے پوری کی ہے ایک دوسرے کو برتا ہے، پرکھا ہے سمجھا ہے۔ محبت کی ہے وفاداری کی سب رسمیں نباہی ہیں۔ ایک دوسرے کے جان و دل میں دخیل رہے ہیں۔ غلامی کی لمبی اندھیری رات کو اسی ٹمٹماتے دیئے کے سہارے کاٹ کر سحر کی ہے۔ آزادی کا روشن سورج نکلتے ہی کیوں دل پھٹے جا رہے ہیں۔ کیوں نگاہیں بدلی جاتی ہیں۔ دوستو، دوستی کی رسمیں نباہو۔ دوستوں کو دشمن نہ جانو

رسالہ نئی روشنی

کسی عارضی جنوں میں صدیوں کی دوستیوں کو ختم نہ ہونے دو، مجنونوں کا علاج کرو، وہ بھی بھائی ہیں، وہ بھی دوست بن جائیں گے۔ دشمن جان کر دوستی اور وفاداری کے مطالبے نہ کرو۔ دوستی سے وفاداری کی جڑیں مضبوط کرو۔ دوستی کا پودا شبہ اور بدگمانی اور نفرت کی زمین میں جڑ نہیں پکڑتا۔ محبت بھروسہ اور یقین سے کام لو اور دیکھو کہ اس میں یہ پودا کیسا لہلہاتا ہے، اور اس پر وفا کے پھول کھل کر کس طرح اپنی خوشبو سے کینہ اور کپٹ کی گندی فضا کو مہکا دیتے ہیں اور اپنی شفاف خوش رنگی سے شک اور شبہ کے گدلے پن کو کیسے کاٹ دیتے ہیں۔
بھائیو، دوست بنو، دوستی کے حق ادا کرو، دوستی کے تقاضے پورے کرو اور پورے کراؤ۔

بھائی دوست بن جائیں تو اس عظیم الشان کام میں جو ہم سب کے سامنے ہے ساتھی بھی بن سکتے ہیں۔ دوستو دیکھو، صدیوں کی غلامی کے بعد جس نے ہمارے بدنوں ہی کو نہیں جکڑا تھا، جس نے ہمارا پیٹ ہی نہیں کاٹا تھا جس نے ہمیں وباؤں اور طاعون کا شکار ہی نہیں بنا رکھا تھا، بلکہ جس نے جہل اور بے علمی کے بوجھل طوق بھی ہماری گردنوں میں ڈال رکھے تھے جس میں ہم سوچنا سمجھنا بھول گئے تھے جس میں ہم سے برے بھلے کی تمیز چھن گئی تھی، جس میں ہم زہر کو امرت سمجھنے لگے تھے، جس میں ظلم سہتے سہتے ہمارے سینوں میں ظلم کرنے کے ارمان پرورش پانے لگے تھے جس میں ہم نے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دوسروں کو بھوکا مارنے کا ہنر پیٹ بھر کر سیکھ لیا تھا۔ جس کی شیطانی کمک پر ہم انسانوں سے جانوروں کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ جس میں ہم نے پیسے کو خدا بنا لیا تھا، اور خود غرضی کو اپنا دھرم ایمان جس میں ہم اپنا الو سیدھا کرنے کی خاطر مذہبی تعصبات کو بے روک ٹوک اکساتے اور بھائی کو بھائی کے اور دوست کو دوست کے خلاف کھڑا کر دینے کا ہنر سیکھ گئے تھے۔ جس نے ہمیں ٹکڑیوں میں بانٹ کر ہماری قومی زندگی کو تتر بتر کر دیا تھا۔ وہ غلامی ابھی دو مہینے ہوئے کہ قانوناً ختم ہوئی ہے۔ قانوناً، عملاً تو وہ اس وقت ختم ہوگی۔ جب ہم تم سب مل کر اپنے اپنے ایکے سے، اپنی سوجھ بوجھ سے، اپنے فولاد جیسے جسموں کی مشقت سے جن پر گولیاں پھسل جائیں اور اپنے دلوں سے جن میں اپنے ساتھیوں کی چھوٹی سے چھوٹی مصیبت اور بپتا سے ایک ٹیس اٹھے، اپنی محنت سے اپنی محبت سے، اپنی مایوسی اور تھکاوٹ سے بے پروا کوشش سے، اپنی نفرت اور طرفداری سے بڑی مخلصانہ خدمت سے ان سارے روگوں کو دور کر دیں گے جو غلامی نے ہم میں پیدا کر دئے ہیں۔ ساتھیو کیسا بڑا کام ہے۔ کیسا کٹھن، پر کیسا پیارا کام! جن زندگیوں کو اس پیارے کام میں کھپانا ہے انھیں نفرت کی تلوار سے ہلاک کرتے ہو۔ جن قوتوں کے بغیر اس پیارے کام کو انجام دینے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے انھیں برباد کرتے ہو؟ کیسی نادانی ہے۔ کیسی ناسمجھی ہے، کیسا جنون ہے؟ ساتھیو سب سے پہلا کام یہی ہے کہ اس نادانی کو دور کرو اس ناسمجھی کو ہٹاؤ، جنوں کا ہاتھ پکڑ لو۔۔۔

اسٹریچی ہال میں خطاب

ونوبا جی! میں دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے ہمارے لیے بھی کچھ وقت نکالا۔ ہمیں شرمندگی ہے کہ آپ کو ہمارے پاس پیدل چل کر پہنچنا پڑا اور آج صبح کی طویل مسافت کے بعد آپ نے سہ پہر میں یہ تکلیف ہماری خاطر اٹھائی۔ مجھے یقین ہے آپ کا یہ دو میل کا سفر ان نوجوان طالب علموں کو دو، دو سو میل طے کرنے پر آمادہ کرے گا اور یہ آپ کا پیام ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں گے۔

آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ہمارے لیے بڑا قیمتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم سب اپنی اپنی بساط اور استعداد کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ آپ نے اس یونیورسٹی کو ایک اہم فرض کی طرف متوجہ کیا ہے اور ہم سب اس کے لیے دل سے آپ کے شکر گزار ہیں۔

اب میں اجازت چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں اور اس صحبت میں کچھ بطور تشریح اور کچھ بطور شکوہ آپ کی خدمت میں عرض کروں۔

ونوبا جی! آپ نے فرمایا اور بجا فرمایا کہ اس دار العلوم کے سامنے اس کی نیو پڑنے کے وقت سے آج تک کچھ وچار رہے ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ہماری قوم سے ذہنی جمود مٹے۔ وہ پیچھے دیکھے تو آگے دیکھنا بھی سیکھے۔ ہم نے اپنے آپ کو ساری دنیا سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ اُدھر مغرب سے ایک سیاسی سیلاب آیا۔ اس کے ساتھ وہاں کے نئے وچار، نیا علم، نیا فلسفہ، نیا ادب، نئے دن رات اور نئے زمین و آسمان آئے۔ ہم اُن سے منہ موڑنا چاہتے تھے، اُن سے کترانا چاہتے تھے۔ علی گڑھ کے بانی نے سمجھ رکھا تھا کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ان

آچاریہ ونوبا بھاوے نے نومبر ۱۹۵۱ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں تقریر کی۔ ونوبا جی کی تقریر کے بعد ذاکر صاحب نے شکریہ ادا کرنے کے لیے جو تقریر کی اس کے بعض حصے پیش ہیں۔

باتوں اور ان حالات سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہ کہ ہم کو ان سب سے دوچار ہونا بھی چاہیے۔ جو دینے کے قابل ہو اُسے لینا اور جو رد کرنے کے قابل ہو اُسے رد کرنا چاہیے۔ کھرے کھوٹے کے پرکھنے کی استعداد بھی ہونا چاہیے اور ہمت بھی۔

اُس وقت اس کی یہ باتیں دیوانے کی بڑ معلوم ہوتی تھیں، مگر دیوانے نے اپنی بات منوا کر چھوڑی اور ہماری قوم کو علم اور ترقی کے راستے پر ڈال دیا۔ دیوانے کی بات بڑی دیر میں سمجھ میں آتی ہے۔ شاید اس لیے اور کہ وہ سمجھانے کے درپے اتنا نہیں ہوتا جتنا کر ڈالنے اور کرا کر چھوڑنے کے درپے ہوتا ہے۔

مغربی تہذیب و تمدن اور فلسفہ و حکمت سے مشرق کو مانوس کرانے اور قومی زندگی میں شخصی مفاد کے مقابلے میں قومی بہبودی کو فضیلت اور فوقیت دینے میں علی گڑھ نے جو کام کیا وہ بڑا قیمتی کام تھا۔ پھر یہ ہوا کہ علی گڑھ کا اور اس مغربی طاقت کا جو ہندوستان پر حکمراں تھی ایک تعلق ہو گیا۔ اس مغربی طاقت نے اسے سیاسی اغراض کے لیے استعمال کیا۔ جس کا نتیجہ آخر میں ملک کی تقسیم کی شکل میں نکلا۔ اس تقسیم میں علی گڑھ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس تحریک کے چلانے والے اکثر ہمارے طالب علم تھے، لیکن اچھا ہوا یا بُرا، یہ تقسیم ہو گئی۔ آپس کے سمجھوتے سے ہوئی، سب کی رضامندی سے ہوئی اور آج کوئی بھی سمجھ دار آدمی اس تقسیم کو مٹانا نہیں چاہتا۔ بڑی سے بڑی قوم اور بڑے سے بڑے ملک میں اس طرح کے واقعات اور باتیں ہوتی ہیں، مگر سمجھ دار اور مہذب لوگ ان باتوں کو بغض و عناد اور بے ہودگی کا بہانہ نہیں بنایا کرتے۔

آچاریہ جی! آج کا علی گڑھ اپنے سامنے یہ اہم کام دیکھتا ہے کہ بٹے ہوئے ملکوں کے باہمی تعلقات کو دوستانہ بنائے اور خود اس ملک کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں مدد دے، جس طرح یہ پہلے مشرق اور مغرب کا سنگم بنا تھا، اسی طرح اب ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی تہذیب۔ تمدن کے قیمتی عناصر کو یک جا کرنے کا کام اُسے کرنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سارے ملک میں کوئی دوسرا ادارہ اس اہم فرض کو اس طرح انجام نہ دے سکے گا جس طرح علی گڑھ۔

میں نے اپنے ملک کی خاصی گشت لگائی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تعلیم گاہیں دیکھی ہیں۔ زندگی بھر اسی طرح کا کام دیکھتا، سمجھتا اور خود بھی کرتا رہا ہوں۔ مجھے تو کوئی اعلیٰ تعلیم گاہ ایسی نظر نہیں آئی جسے ایسے کام کرنے

کے اتنے اور اس جیسے مواقع حاصل نہوں جیسے اور جتنے علی گڑھ کو۔ یا جن پر وہ ذمہ داری عاید ہوتی ہو، جو علی گڑھ پر عاید ہوتی ہے۔

آپ غور فرمایئں: یہ کہیں ہزاروں ہندو طالب علم ہیں تو ایک دو درجن سے زیادہ مسلمان نہیں۔ کہیں عیسائی ہیں تو ہندو مسلمان نہیں۔ کہیں سکھ ہیں تو دوسرے برائے نام ہیں، لیکن علی گڑھ میں پہلے دن سے ہندو مسلم کی آمیزش رہی اور اس وقت بڑی تعداد تمام ہندوستانی جماعتوں اور فرقوں کی یہاں موجود ہے —— اس کے اساتذہ میں بھی مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی دوش بدوش اعلیٰ مناصب پر فائز رہ کر کام کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ صحیح معنوں میں ہندوستان کی قومی تعلیم و تربیت کا سب سے اہم مرکز علی گڑھ ہے اور ہم اپنے بس بھر اس بڑے اور مبارک کام کو انجام دینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

لیکن آچاریہ جی! ہماری اس کوشش میں ایک بات بڑی طرح سے حائل ہوتی ہے جس کا مجھے بڑا دکھ ہے۔ اس لیے میں اس کا آپ کے سامنے بڑی صفائی سے اظہار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں آپ کو قوم کا ضمیر سمجھتا ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ یہ ضمیر قوم کو اس گمراہی اور ظلم پر تنبیہ کرے۔

وہ بات یہ ہے کہ ملک کے خاصے وسیع طبقے میں ہماری پچھلی تاریخ کی وجہ سے ایک عام آمادگی اس امر کی ملتی ہے کہ جو بری بات ہمارے بارے میں کہی جائے اُسے فوراً مان لے۔ پچھلے دنوں بھی اس قسم کا ایک واقعہ ہوا اور اخباروں میں بے سر و پا خبریں گشت کر رہی ہیں کہ علی گڑھ میں فرقہ وارانہ جذبات کا دور دورہ ہے اور لیاقت علی خاں مرحوم کی رحلت کے موقع پر اس کا مظاہرہ بڑے بدنما طریقے سے کیا گیا —— اسی طرح کی اور بہت سی بے بنیاد خبریں شائع کی گئیں۔

آچاریہ جی! میں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں اور آپ کے ذریعے تمام قوم کو بھی بتانا چاہتا ہوں کہ یہ بیانات ازسرتاپا جھوٹ ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ چند لڑکوں نے یونیورسٹی یونین کے سالانہ انتخابات کے غلط جوش میں کچھ بدعنوانیاں کیں۔ میں نے اس پر تمام طلبا کو اسٹریچی ہال میں طلب کیا اور جی بھر کر ان کو برا بھلا کہا۔ جس کا حق دار میں اس محبت کی وجہ سے ہوں جو مجھے اُن سے ہے۔ انھوں نے میری باتوں کو دھیان دے کر سُنا اور اپنے طرز عمل کو ایسا بدلا کہ سب حیرت میں رہ گئے —— انھوں نے انتخاب کی تمام کارروائی نہایت مناسب طریقے سے انجام دی۔ اس کے بعد متعدد جلسے بڑے رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے کیے۔

آج کے جلسے میں جس ادب اور توجہ سے یہ آپ کے سامنے گھنٹہ بھر سے ہمہ تن گوش ہو کر آپ کی قیمتی نصیحتوں سے بہرہ مند ہو رہے ہیں وہ آپ خود ملاحظہ فرما رہے ہیں — کون کہے گا کہ یہ بدتمیز بد سلیقہ اور آبرد باختہ نوجوان ہیں۔ یہ بڑے شریف لڑکے ہیں۔ بڑے سلیقہ مند لڑکے ہیں — غلطی کرتے ہیں تو اس پر نادم ہونا اور تلافی کرنا بھی جانتے ہیں — میں نے انھیں برا بھلا کہا تھا تو مجھ سے زیادہ اس برائی کو کون جانے گا جس پر میں نے انھیں بُرا بھلا کہا تھا لیکن ستم دیکھیے کہ میری نفرین ہی کا حوالہ دے کر اس میں جھوٹے اور فتنہ انگیز واقعات کے ایسے حاشیے چڑھائے گئے کہ میں خود حیران رہ گیا۔ لیاقت علی خاں کے حادثۂ رحلت کے روز کے ایک واقعہ کو نہ جانے کیا کیا رنگ دیا گیا۔

کہا گیا کہ "لڑکوں نے جلوس نکالا"، یہ جھوٹ ہے۔
کہا گیا کہ "لڑکوں نے پاکستانی نعرے لگائے —" یہ جھوٹ ہے۔
کہا گیا کہ "لڑکوں نے سائرن بجایا"، یہ جھوٹ ہے۔
سائرن میرے حکم سے بجا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے یہ حکم ٹھیک دیا۔

آچاریہ جی! بات یہ ہے اور صرف اتنی ہی ہے کہ یونیورسٹی سے متعلق کسی بڑے بزرگ یا عام قومی زندگی میں کسی بڑے آدمی کے انتقال کا اعلان یا اعلانِ غم سالہا سال سے سائرن بجا کر یونیورسٹی میں کیا جاتا ہے۔ لیاقت علی خاں صاحب ہمارے ایک ممتاز اولڈ بوائے تھے۔ ہماری کورٹ اور مجلسِ منتظمہ کے بڑے اہم رکن رہ چکے تھے، میں نے ان کے ساتھ یونیورسٹی سے باہر بھی تعلیمی اور سوشل سرگرمیوں میں کافی حصہ لیا تھا اور ہم ایک دوسرے کی عزت اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ یہی نہیں وہ ہمارے ہم سایہ ملک کے وزیر اعظم بھی تھے۔ پھر کیوں نہ سائرن بجتا؟

لیکن اس واقعے سے چند ہی روز قبل یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل میں اس امر پر گفتگو ہوئی تھی کہ کسی کے انتقال کے اعلان کا یہ طریقہ کچھ مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہے اس کو بند کر دیا جائے۔ چنانچہ سائرن کو موت کے اعلان کا وسیلہ بنانے کا یہ طریقہ یا روایت ختم کر دی گئی۔ لڑکوں کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ کوئی واقعہ اس دوران میں ایسا ہوا بھی نہیں تھا کہ اس پر سائرن نہ بجتا۔ اور لوگ جان جاتے کہ اب یہ طریقہ ترک کر دیا گیا ہے۔

سائرن نہ بجنے سے خیال ہوا ہوگا کہ شاید کسی مصلحت کی بنا پر ایسا نہیں کیا

گیا۔ میں نہیں جانتا یہ خیال کس کو ہوا ؟ چنانچہ جب لڑکوں نے سائرن بجانے کی درخواست کی تو میں نے بجانے کا حکم دے دیا۔

لڑکے تعزیت کی تجویز پاس کرنے کے لیے یونین میں جمع ہوئے تھے۔ میں وہیں گیا اور میں نے ان کو بتایا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ سائرن بجا دیا جائے تو بجا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ضرور بجا دیا جائے گا — لیکن سائرن کا بجانا فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر ترک کر دیا گیا تھا۔

پھر میں نے پوچھا کہ یہ سب باتیں معلوم ہونے کے بعد بھی اگر تم سب چاہتے ہو کہ سائرن بجا دیا جائے تو ضرور بجے گا، مگر کیا کوئی طالب علم یہ بھی چاہتا ہے کہ سائرن نہ بجے ؟ ایک طالب علم یہ کہنے کے لیے اٹھا کہ نہ بجے۔ اس کے پاس کے طلبا نے اُسے بٹھا دیا۔ وہ پھر اٹھا، پھر بٹھا دیا گیا۔ وہ بینچ کے اوپر کھڑا ہو گیا۔ لڑکوں نے اسے اُتار لیا۔ اس میں آس پاس کے لڑکوں میں کچھ گڑبڑ ہوئی، لیکن دوسرے لڑکوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔

آچاریہ جی ! مجھے اس مظاہرے سے دکھ ہوا اور میں نے اُسی وقت لڑکوں کو نادم کیا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ غلطی ہوئی۔ نوجوانوں کا کبھی کبھی اپنے آپ سے باہر ہو جانا اچھی بات تو نہیں ہے پھر بھی قدرتی بات ضرور ہے۔

لیکن میں ایسے نوجوانوں کی قدر کرتا ہوں جو اپنی غلطی کو تسلیم کر کے اس پر ندامت کا اظہار کرتے ہیں۔ میں نے پھر دریافت کیا — کیا کسی طالب علم کا خیال ہے کہ سائرن نہ بجایا جائے ؟ اگر ایسا ہے تو وہ اپنا ہاتھ اٹھائے۔ ایک طالب علم نے پھر ہاتھ اٹھایا۔ لیکن دوسرے لڑکوں نے اس بار کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ میں نے لڑکوں کو جو بات سمجھائی تھی وہ انھوں نے سمجھ لی ہے۔ میں نے کہا تم سب کی دلی خواہش ہے کہ سائرن بجے۔ اس لیے میں ابھی سائرن بجوادوں گا — چنانچہ میں نے سائرن بجوا دیا۔

اس بات اور اتنی سی بات کو لے کر ہندوستان کے ساتھ غداری اور پاکستان کی طرف داری اور فرقہ پرستی وغیرہ کے خیالی اتہام جوڑنا بڑی ہی نادانی، تنگ دلی اور کمینے پن کا مظاہرہ ہے۔ پھر یہ کہ میں فرقہ پرستوں سے مایوس ہو کر یونیورسٹی چھوڑنا چاہتا ہوں۔ سائرن کی مخالفت کرنے پر وائس پریذیڈینٹ یونیورسٹی یونین سے لڑکوں نے استعفیٰ لے لیا — یہ سب مطلق جھوٹ ہے۔ ایسی باتیں کہنے والے کو ہندی میں جھوٹا اور عربی میں کذاب کہتے ہیں۔

آچاریہ جی ! اس یونیورسٹی کے بارے میں، جس میں آپ اس وقت تشریف رکھتے ہیں اور ان لڑکوں کے بارے میں جو آپ کے سامنے موجود ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ یہ غنڈوں کا اڈا ہے۔ اور یہاں غنڈے بستے ہیں۔ آج میں بے جھجک کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس ظلم اور جھوٹ کو برداشت نہیں کر سکتے۔

ہمیں ہندوستان سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی ہندو یا غیر مسلم کو ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا ذرّہ ذرّہ ہماری زندگی اور ہماری خدمات سے تابناک ہے۔ ہم ہندوستانی ہیں اور اچھے ہندوستانی ہیں اور جب تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر لیا جائے گا ہم چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ دراصل ہمارے اپنے ہی وطن میں ہماری بے عزّتی اور بے غیرتی کی زندگی چاہنے والے ملک و وطن کے غدّار ہیں۔ ہمارے سامنے کھلا ہوا آدرش ہے جس پر کسی بھی سچے اور شریف ہندوستانی کو فخر ہو سکتا ہے۔ ہم ایک وچار کے ماتحت زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ ہم کسی کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں ہیں ــــ کون بے غیرت ہندوستانی ایسا ہے جو کسی کے رحم و کرم پر جینا گوارا کرے گا ــــ ؟ ہندوستان پر ہمارا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور ہندوستانی کا ــــ ہم سے بار بار یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھیں۔ کسی کم ظرف اور بدنیت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہم سے ہمارے ہندوستانی ہونے کا حق چھین سکے۔ یا ہم سے وفاداری کا سرٹیفکٹ طلب کر سکے۔

آچاریہ جی ! آپ میری تلخ کلامی کو معاف فرمائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جھوٹے لوگ قومی اداروں کے مستقبل سے کھیلنے سے باز آجائیں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایسے جھوٹوں کے جھوٹ کو آپ سب پر ظاہر کر دیں۔

میں بہت کمزور آدمی ہوں مگر یہ بھروسا رکھتا ہوں کہ اگر ٹھیک بات کہہ رہا ہوں اور ٹھیک کام کر رہا ہوں تو ان جھوٹوں کے جھوٹ سے وہ کام رکے گا نہیں۔ اور یہ جھوٹے رسوا ہو کر رہیں گے۔"

تقریر ختم کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے بڑی محبّت اور احترام کے ساتھ آچاریہ جی کا دوبارہ شکریہ ادا کیا۔ تقریر ختم ہوتے ہی آچاریہ جی پھر سامنے تشریف لائے اور کچھ دیر تک تشفی اور اُمید کے کلمات فرمانے کے بعد کہا:

"جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین موجود ہوں وہاں شک و شبہ کرنے کی گنجائش نہ کبھی رہی اور نہ رہ سکتی ہے۔"

پارلیمنٹ میں خطاب

جناب وزیر تعلیم کو مبارکباد دینے کے لیے اٹھا ہوں،
کیونکہ انھوں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ میرے نزدیک یونیورسٹی کمیشن کی مجوزہ تجاویز کی تعمیل میں ایک اہم قدم ہے۔ عام طور پر یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹوں کا انجام ایک صریح مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ اس لیے یہ اور بھی خوشی کی بات ہے کہ یونیورسٹی کمیشن کی اس رپورٹ کے بارے میں کچھ کیا جارہا ہے۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ ہم اس بات کو یاد رکھیں کہ یہ صرف پہلا قدم ہے۔ اور پہلا قدم سفر کی شروعات ہوتا ہے اس کا اختتام نہیں۔ قانون کی جن حدود میں یونیورسٹی کا نظام چلتا ہے اس کی بہت اہمیت ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ ان ہی حدود کے اندر کیا کیا جارہا ہے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ ان ہی قواعد کی حدوں میں اچھا، یا برا، یا بے دلی سے بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ اور ان ہی حدود میں یونیورسٹی ساکن وجامد بھی ہوسکتی ہے میں نے جان کر ساکت کہا، متحرک نہیں کہا، حالانکہ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ یونیورسٹی ساکت رہ کر بھی چل سکتی ہے کسی کارآمد کام پر لانے کی خوشی اور سرور حاصل کیے بغیر۔ یا وہ فخر سے سر اٹھا کر امید کرسکتی ہے کہ وہ قومی زندگی کی تبدیلی اور ترقی کے لیے کام کرنے میں ایک نمایاں حصہ لے گی۔ لیکن اس طرح بہتری کا کام کرنے کے لیے قانون کا سہارا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے کافی ذرائع کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اب جب وزیر تعلیم کی طرف سے یہ پہلا قدم اٹھا ہے، تو اس کے ساتھ ساتھ وزیر مالیات کو بھی قدم اٹھانا چاہیئے۔ مجھے افسوس ہے کہ آج یہاں نہ وزیر مالیات موجود ہیں اور نہ ہی شری تیاگی۔ لیکن ان کو کچھ کرنا تو ضرور پڑے گا۔

کچھ تبدیلیاں ہیں جو قانون کے اس حصے میں تجویز کی گئی ہیں۔ چاہے وہ منسٹرل یونیورسٹیوں کے کئی سال کام کرنے کے تجربے کی وجہ سے ہوں، یا یونیورسٹیوں پر لاگو قوانین میں یکسانیت لانے کے نقطۂ نظر سے ہوں لیکن ان کے علاوہ میرے خیال میں تین اور اہم باتیں ہیں جو اس قانون سے ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے موجودہ قواعد میں

بنارس ہندو یونیورسٹی امینڈمینٹ بل ۲۶ ستمبر ۱۹۵۱ء

جو بندش تھی کہ ان کے کورٹ کے ممبران صرف ایک فرقے کے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مسلمان اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہندو ہی، تو اس بندش کو خارج کر دیا گیا ہے۔ جو میری رائے میں ایک بہت اہم قدم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اور میرے خیال میں اس اہمیت کو ہم تب ہی سمجھ سکتے ہیں اگر ہم اپنی جمہوریت کے سیکولر نظریے کے بارے میں جلد بازی سے کوئی نتیجہ نہ نکالیں صرف ایک سیکولر حکومت میں ہی ہمارے موجودہ آئین کے مطابق یہ ممکن ہے کہ ایک سو فیصدی مسلمان ادارہ۔ یا سو فیصدی ہندو ادارہ قائم ہو سکے۔ ہمارے آئین میں اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا ہے۔ اکثر باتیں جو میرے سننے میں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمارا آئین اس طرح کے خالص ہندو یا خالص مسلمان اداروں کی اجازت نہیں دیتا ہے، مگر ایسا نہیں ہے اور پھر بھی ہم یہ قدم اٹھا رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح اٹھا رہے ہیں۔ اس قدم کی اہمیت کو ٹھیک سے سمجھنا چاہیے اور اس کے لیے ہم کو کچھ اور چیزوں کو بھی سمجھنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر ہندو یونیورسٹی بنارس کے بل کی ترمیم میں یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلقہ بل میں ان دونوں کے نام تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو علی گڑھ یونیورسٹی کے موجودہ بل میں اسلامی اور مشرقی تعلیم حاصل کرنے کا خاص ذکر ہے اور اسلامی مذہب اور دینیات سکھانے کا بھی۔ اور اسی طرح اگر آپ بنارس ہندو یونیورسٹی کے موجودہ ترمیم شدہ بل میں "یونیورسٹی کے اختیارات" کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بھی قدیم مشرقی تعلیم مہیا کر سکتی ہے خاص طور پر ویدک، بدھ ہندو اور جین لوگوں کے بارے میں اور ہندو مذہب کی تعلیم بھی دے سکتی ہے دراصل یہ ظاہری تضاد ہی اس کی اہمیت کو سمجھنے کی چابی ہے جو ہم کر رہے ہیں ایک سیکولر جمہوریت ہی میں ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی دونوں مرکزی یونیورسٹیوں کی حیثیت سے قائم رہ سکتی ہیں، کیونکہ صرف ایک سیکولر جمہوریت ہی میں وہ فراخ دلی اور روشن خیالی ہو سکتی ہے جس میں وہ دونوں سما سکتے ہیں۔ یہ بات ہم کو جان لینا چاہیئے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری جمہوریت اس بات کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ نہ صرف برداشت کرے گی بلکہ یہ بہت اچھی بات ہے کہ وہ اس کو برداشت کر سکتی ہے۔ مذہبی تعلیم فراہم کرنے کا انتظام صرف ایک سیکولر حکومت میں ہی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ کسی مذہب کے خلاف نہیں ہوتی، بلکہ غیر جانب دار اور فراخ دل ہوتی ہے وہ رسمی طور پر کسی طبقے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ قومی زندگی کے ہر صحت مند عناصروں کی نشو و نما اور ترقی کی خواہاں ہوتی ہے۔ لہٰذا بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہندو مذہب کی اور ویدک تعلیم ہوگی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلام اور دینیات ہوگی۔ اور دونوں اپنا مخصوص کردار قائم رکھ سکیں گی۔ لیکن یہ کام علیحدگی میں نہیں بلکہ سب لوگوں کی اجتماعی

دانش مندی اور تعاون سے ہونا چاہیے۔ اس لیے ذاتی طور پر میں اس تبدیلی کے موافق ہوں لیکن اس تبدیلی کی اہمیت کو صحیح طرح سے سمجھنا چاہیئے۔ ہر ادارہ اپنی امتیازی خصوصیات پوری طرح قائم رکھ سکتا ہے۔ عیسائی ادارہ اپنی خصوصیت کو اور سکھ ادارہ اپنی۔ لیکن ان سب کو اپنی تہذیب کے مختلف عناصر کو متحد کرکے ایک خوب صورت ہم آہنگ اور روشن تصویر بنانی ہوگی جس سے سب کو فائدہ حاصل ہو سکے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ سب مل کر اپنے اپنے ماضی کے سارے قیمتی خزانوں کو جو چاہے کسی مذہب یا عہد سے حاصل ہوئے ہوں، ہر ہندوستانی کی ذہنی اور جذباتی میراث بنانے میں کامیاب ہوں گے اور اس طرح سب لوگوں کو ایک مشترکہ ماضی کا ورثہ مل جائے گا جس کی ہدایت اور روشنی میں وہ ایک مشترکہ مستقبل بنانے کی کوشش کر سکیں گے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ تبدیلی اسی جذبے کے تحت عمل میں آئے گی۔ یہ تبدیلی اداروں کے کردار بدلنے کے لیے نہیں لائی گئی ہے بلکہ حالات حاضرہ کی روشنی میں ان کے نظریوں کو بدلنے کے لیے کی گئی ہے۔

ان یونیورسٹیوں کے طریقۂ عمل کو ملک کے قانون کی دفعہ ۲۸ کی مد کے مطابق کرنے کے لیے یہ قرار دیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم یا اس کا امتحان ہر ایک کے لیے ضروری نہیں ہوں گے لیکن ان لوگوں کے لیے جو اس کو حاصل کرنا چاہیں اس کا انتظام ہوگا۔ یہ بھی ایک اہم کام ہے اور اس کی وجہ سے یونیورسٹیوں کو پہلے سے زیادہ چوکنا رہنا پڑے گا۔ مذہبی تعلیم میں جبر ایک قسم کی بے دلی اور بے پروا ہی پیدا کر سکتا ہے جس سے بچنا چاہیے لہٰذا بنارس اور علی گڑھ میں مذہبی تعلیم دینے کے لیے ہم کو بہتر اور زیادہ موثر طریقے اختیار کرنا ہوں گے ہماری مادری یونیورسٹی میں بہت سے شعبے ہیں، جو بہت خوشی کی بات ہے لیکن ہمیں یہ خیال رکھنا ہے کہ ہم اصلی معنوں میں ایسا مذہبی ماحول پیدا کر سکیں جہاں مذہب کو آپس میں تفرقہ ڈالنے یا کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ مذہب انسانوں میں باہمی اتفاق پیدا کرنے کا باعث ہو، اور ایک کائناتی شعور جس سے نہ صرف زندگی کو معنی مل سکے، بلکہ جو زندگی کے منتشر اور عارضی لمحات کو ایک ایسی ہدایت بخش سکے جس سے ایک ایسی طاقت پیدا ہو جائے جو قوم کے سب نیک ارادوں کو اکٹھا کرکے صحیح اور مفید کام انجام دینے کا کام کر سکے۔ اگر ہم یہ کر سکیں گے تو مذہبی تعلیم اصلی طرح سے موثر اور کارآمد ہو سکتی ہے۔ اور میری دعا ہے کہ اس سے یہ ہی نتیجہ نکلے گا۔

تیسری اہم بات ہے بنارس ہندو یونیورسٹی ایکٹ میں نیا سیکشن ۵۸ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں نیا سیکشن ۱۳ - A کا داخلہ جس میں یونیورسٹی کے کار عمل

اور ترقی کا پنج سالہ معائینہ ہونے کی گنجائش ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اب جس طرح اس دفعہ کو لایا گیا ہے اس میں کافی نرمی برتی گئی ہے۔ ورنہ پہلے اس کے الفاظ کافی غیر مہذب تھے۔ سید هوا صاحب نے چناؤ کمیٹی کی کارکردگی کے بارے میں کچھ جملے کہے تھے جن پر میں نہ کچھ کہوں گا اور نہ ہی مجھے کہنا چاہیئے۔ میرے اپنے بارے میں جو مہربان جملے انھوں نے کہے اس کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں، کاش میں اس کا مستحق ہوتا۔ یہ سب میں اس یونیورسٹی یا اس یونیورسٹی کی پاسداری کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں خاص کر جس یونیورسٹی کے ساتھ دراصل میرا تعلق ہے۔ اگر حکومتِ ہند اس سلسلے میں تفتیش کرنا چاہتی ہے تو کل ہی کر سکتی ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ کسی بھی یونیورسٹی کی خودداری کے لیے نہایت توہین آمیز بات ہے۔ یہ یونیورسٹی کی خود اختیاری کی جڑ پر ہی حملہ ہے کہ کوئی ایسی قانونی دفعہ لائی جائے جس سے اس کا میعادی معائینہ کیا جا سکے۔ دنیا کی کوئی خوددار یونیورسٹی اس بات پر راضی نہیں ہوگی۔ آپ کسی بھی یونیورسٹی سے معلوم کر سکتے یا کسی ملک سے پوچھ سکتے ہیں اور آپ کو ایسی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

۱۲ بجے دوپہر۔

شری سدھوا — بنگلور کے سائنس انسٹی ٹیوٹ میں یہ مثال موجود ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین — وہ کوئی یونیورسٹی نہیں ہے۔ اور ہم بات کرتے ہیں اس رقم کی جو یونیورسٹیوں پر خرچ کی جا رہی ہے۔ تو آپ کس قدر روپیہ خرچ کر رہے ہیں؟ جو دوسرے ملکوں کی یونیورسٹیوں کے خرچے کے مقابلے میں بالکل حقیر اور قلیل رقم ہے۔ جب ہم اپنی یونیورسٹی کی تعلیم پر خرچے کی رقم کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہمیں شرم سے اپنا سر جھکا لینا چاہیے ہو سکتا ہے کہ ہم اس معاملے میں بے بس ہیں، لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر ہمیں فخر ہونا چاہیئے۔ اگر آپ روپیہ خرچ کر رہے ہیں تو ایسی جگہیں ہیں جہاں آپ کو ایک طریقے سے خرچ کرنا چاہیے اور یونیورسٹیاں ایسی جگہیں ہیں جہاں آپ کو پیسہ خرچ کرنا چاہیے اور پھر اس بات کو بھول جانا چاہیئے۔ یونکہ یونیورسٹی کے لوگ ایک خاص قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ علم، کردار اور اخلاقی خوبیوں کے لوگ ہیں اگر آپ ان پر بھروسا نہیں کریں گے تو یہ کچھ نہ کر پائیں گے۔ اگر یہ کسی گڈھے یا دلدل میں گر جائیں تو ان کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ سوائے اس کے کہ یہ خود ہی اپنے بال پکڑ کر اوپر نکل آئیں۔ یہ لوگ بیرن منچ ہاؤسن کی طرح ہیں۔ اگر ان کو بچنا ہے تو ان کو خود اپنے بال کھینچ کر اوپر آنا ہوگا۔ ایک یونیورسٹی صرف اپنے آپ کو اپنی اندرونی کاوش ہی سے سدھار سکتی ہے ان قوتوں کے ذریعے جو وہ خود اپنے اندر سے مہیا کرتی ہے۔ آپ چاہے اس کو کتنا بھی پیسہ دے دیں لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اس کی اصلاح کسی طرح کی پولیس نما جانچ یا کبھی کبھی معائینہ کر کے کر سکتے

ہیں تو آپ سراسر غلط سوچتے ہیں۔ اس سے نہ ہی کوئی نتیجہ نکلے گا اور نہ ہی آپ کو یونیورسٹی کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے گا۔ کیونکہ یا تو وائس چانسلر بہت ہوشیار ہوگا اور آپ کو بے وقوف بنا کر ایک اچھی رپورٹ لکھوانے میں کامیاب ہو جائے گا جب کہ آپ کو خراب رپورٹ لکھنا چاہیے تھا۔ یا آپ خود بہت چالاک ہوں گے اور یہ ارادہ کر کے جائیں گے کہ آپ ایک نالی کے انسپکٹر کی طرح کی رپورٹ لکھیں گے جو کوئی بھی کسی بھی معائینہ میں لکھ سکتا ہے۔ کیونکہ ایک مختصر معائینے میں اور کوئی بھی کیا سکتا ہے۔ اس اہم بات پر یونیورسٹیز کمیشن نے غور کیا ہے اور اس سلسلے میں اپنی سب سے اہم تجویز پیش کی ہے کہ ایک یونیورسٹی گرانٹ کمیشن ہونا چاہیئے۔ میں ان کی رپورٹ کا کچھ حصہ پڑھنا چاہوں گا جس سے آپ کو اندازہ ہو جائے کہ کس طرح کا کنٹرول ہونا چاہیے۔

" پچھلے چند صفحوں میں ہم نے اپنی یونیورسٹیوں کی بہت سی افسوسناک کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے (وہ خود بھی آپ کی طرح ان کوتاہیوں سے بے خبر نہیں ہیں) اور بہت سے اصلاحات کا جو ضروری ہیں۔ مگر ہم کو یہ یقین نہیں ہے کہ باہر سے اور کنٹرول لانا یہ اصلاح کرنے کا طریقہ ہے۔ بلکہ موجودہ خراب حالت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری زیادہ تر یونیورسٹیوں میں خود مختاری نہیں ہے اور وہ خارجی دباؤ کی مدافعت نہیں کر پاتیں۔ یونیورسٹیوں کو روشن خیال لوگوں کی رائے سے متاثر ہونا چاہیئے اور ان کو کبھی رشوت یا دباؤ کے تحت ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جو تعلیمی لحاظ سے غلط یا ناقابل قبول ہو۔ اور کسی طرح کی رعایت یا بد اطواری یا فرقہ پرستی کے سبب سے ہو۔ سب سے صحیح پالیسی تو یہ ہوگی کہ یونیورسٹی کو بہترین آئین مہیا کیا جائے جس میں اس کی گورننگ بورڈ میں سمجھ داری سے چنے ہوئے باہر کے لوگوں کا شامل ہونا ضروری ہو اور پھر اس میں دخل اندازی نہ کی جائے۔"

یہ اس کمیشن کا نظریہ ہے جس پر حکومت نے کافی رقم خرچ کی ہے۔ یونیورسٹیز کمیشن کے اپنے بارے میں دو جملے پڑھنا چاہوں گا۔

"اول تو ان کو چاہیے کہ اکثر یونیورسٹیز میں جاتے رہیں، چاہے اکیلے یا کسی مضمون کی کمیٹی کے ایک یا زیادہ ممبران کے ساتھ۔"

اس طرح کرنے سے آپ کو وہ ساری معلومات حاصل ہو جائیں گی جن کی آپ کو ضرورت ہے اور پھر آپ یونیورسٹی کو مشورہ دے سکتے ہیں کہ ان کو کیا چاہیے۔

پھر وہ کہتے ہیں۔

"مشورہ لینے میں پہل ہمیشہ یونیورسٹی کی طرف سے ہونا چاہیے۔ اگر کمیشن خود سے بغیر مانگے صلاح دے گا تو آپس کے وہ تعلقات جو ہم چاہتے ہیں کہ یونیورسٹیوں کے ساتھ

قائم ہوں وہ خراب ہو جائیں گے۔ جو دوستی کے تعلقات ہونے چاہئیں نہ کہ پولیس یا انسپکٹر کے"۔
ان الفاظ کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ کوئی گنجائش کسی پنج سالہ معائینے کی ہونا چاہیئے نہ ہی ایسی کوئی دفعہ۔ کیونکہ اس بات کا ذکر ہوا ہے کہ چناڈ کمیٹی میں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے تقرر کے بارے میں بحث کی گئی، تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ بات اٹھی تھی کہ اگر اس کمیٹی کا تقرر ہوا تو یہ دفعہ غیر ضروری ہو جائے گی۔ میرا اپنا خیال تھا کہ پھر ہم صرف چند مہینوں کے لیے ہی اس کا استعمال کریں گے۔ میں سمجھا تھا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیٹی کا تقرر جلد از جلد ہو جانا چاہیئے کیونکہ یہ یونیورسٹیز کمیشن کی سب سے اہم اور بنیادی تجویز تھی۔ مجھے یہ اس لیے یاد ہے کہ مجھے اس خیال سے سخت نا امیدی ہوئی تھی کہ حکومت یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے تقرر کے بارے میں نہیں سوچ رہی ہے اس لیے وہ دفعہ چاہتی ہے لیکن مجھے بہت خوشی ہے کہ وزیر تعلیم نے اس مسئلہ کے بارے میں سوچا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کمیشن کا تقرر ضروری ہے اور جلد از جلد ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا ہے تو یہ مد نہ صرف ہر لحاظ سے بری ہے بلکہ بالکل غیر ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں اپنے دوست مسٹر سدھوا سے جوابی درخواست کروں گا کہ وہ اس نکتہ پر زور نہ دیں اور یونیورسٹیوں کو آزادی کے ماحول میں جینے اور بڑھنے کا موقع دیں۔ صرف تب ہی وہ پھل پھول سکتی ہیں یا اس کی امید کر سکتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی آزادی بھی خطرناک ہو سکتی ہے لیکن اگر ان کو ترقی کرنا ہے تو وہ صرف آزادی کے ماحول ہی میں پل بڑھ سکتی ہیں۔

میں اس بل کے مرکزی Provision کی تائید کرتا ہوں۔

استقبالیہ تقریر

(نہرو کی علی گڑھ میں آمد)

حضرت امیر جامعہ، پنڈت جی، دوستو اور عزیزو!

کیسی خوش نصیبی ہے میری کہ اپنے محبوب اور محترم مہمان پنڈت جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہند کو اس یونیورسٹی میں خیر مقدم کہنے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے۔ پر ہے یہ شرف خاصا کٹھن۔ رسمی خیر مقدم ہو تو جیسے تیسے لفظوں میں ادا ہو جائے۔ جب گرمی کی تپتی پیاسی زمین پر برسات کی گھنگھور گھٹا منڈلاتی ہے تو اس کا ذرہ ذرہ زندگی کی ایک چھپی ہوئی لہر سے تھرکنے لگتا ہے پر اس گھٹا کے خیر مقدم کے لیے وہ لفظوں سے کام نہیں لیتی۔ جب خزاں کی مردنی کے بعد پودوں کی رگوں میں دوڑنے والا رس اور ٹہنیوں میں سے جھجک جھجک کر ٹھٹک ٹھٹک کر جھانکنے والی کلیاں باد بہاری کا خیر مقدم کرتی ہیں تو مارے خوشی کے کھل پڑتی ہیں مگر ان کا جوش نمو خیر مقدم کے لیے لفظ نہیں ڈھونڈھ پاتا۔ جب بہار کے قافلہ کی پہلی چڑیا چمن میں پہنچتی ہے تو سارا چمن فرط خوشی سے لہلہاتا ہے مسکراتا ہے پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آدمی نادان ایسے موقعوں پر بھی اس مشورہ کو بھول کر کہ نگاہ شوق اس مضمون رنگین کو ادا کر دے۔

لفظوں ہی میں کچھ کہنا چاہتا ہے اور آخر کو اپنی بے بسی پر شرماتا ہے۔ میں بھی اپنی سادگی اور نادانی میں اس رنگین مطلب کو لفظوں میں ادا کرنے کھڑا ہو گیا ہوں پر جانتا ہوں کہ یہ کہتے بنے گا نہیں۔ پھر بھی یقین ہے پنڈت جی اسے سمجھ لیں گے۔

پنڈت جی۔ اس یونیورسٹی کی طرف سے آپ کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس کے منتظموں کی طرف سے جن کو اس کا پورا احساس ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے ایسے مرکز جیسا کہ یہ یونیورسٹی ہے دوکانیں نہیں ہیں قومی افکار اور قومی کردار بنانے کی جگہیں ہیں جو مانتے ہیں کہ ان کا شرف یہ ہے کہ اچھے سے اچھے استادوں کو اچھے سے اچھے دل و دماغ کو اس کام کے لیے یہاں یکجا کریں۔ پھر انھیں

۱۱ر نومبر کو پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم کی یونیورسٹی میں تشریف آوری کے موقع پر ذاکر صاحب نے تقریر فرمائی۔ ۲۴ر نومبر ۱۹۵۵ء

فکر اور اظہارِ فکر کی کامل آزادی دیں اس لیے کہ علم اور شخصیت دونوں آزادی ہی کی فضا میں نشو و نما پاتے ہیں! ان کو قومی زندگی کا بنانے والا جانیں ان کی کھری نظر اور اچھی زندگی کے لیے ان کا پورا ادب اور احترام کریں اور تعلیم و تربیت کے دلکش مگر کٹھن کام میں ان کے لیے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائیں۔ پھر طلبا کے لیے رہنے سہنے کی آسائش کے اور تعلیم و تحقیق کی راہوں کو سہل بنانے کے سب انتظام کریں اور اچھے استادوں اور شائق طالب علموں کو یکجا کر کے اس کا اہتمام کریں، کہ ایک کے علم اور دوسرے کی طلب ایک کی حکمت اور دوسرے کے تخیل ایک کی شفقت اور دوسرے کی عقیدت کے باہم ملنے سے اچھے کردار اور اچھی زندگی کے ایسے حامل پیدا ہوں کہ اپنی سیوا سے قومی زندگی بنا سکیں۔ سدھار سکیں نکھار سکیں۔ ان منتظمین کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ انھیں آپ کی ذات میں ان کے خیالوں اور منصوبوں کا سمجھنے والا اور ان کی مدد کرنے والا دکھائی دیتا ہے۔

یہاں کے استادوں کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں جو اپنے کو قوم کا خدمت گزار سمجھتے ہیں اور اپنے کام کی سماجی اہمیت کا پورا احساس رکھتے ہیں جو اپنے کندھوں پر اس ذمہ داری کا بوجھ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے کام کی اچھائی پر ان کی قوم کا مستقبل منحصر ہے جو اپنے طالب علموں کو قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ جانتے ہیں اور ان کی صحیح تعلیم اور تربیت اور ترقی کو اپنی سب سے بڑی سعادت مانتے ہیں جو یونیورسٹی کی آزاد فضا میں آزادئ فکر کے ساتھ اس کی سماجی ذمہ داریوں کا پورا حق ادا کرنا جانتے ہیں اور پڑھائی کا کمرہ ہو یا کھیل کا میدان ہو ہوسٹلوں کی زندگی ہو یا تفریح کے مشغلے سب اپنی بہترین توانائیاں صرف کرنے پر آمادہ رہتے ہیں اور اپنے شاگردوں کی شخصیت کے بناؤ میں سب اپنی زندگی کا پھل دیکھتے ہیں۔ ان سب کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ انھیں آپ کی ذات میں ایک روشن دماغ ایک گرم دل کے ساتھ اس خوبی سے مل کر سماجی سیوا کے راستہ پر یقین ہمت سے چلتا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے کام میں آپ کی شخصیت ایک موثر جیتے جاگتے نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اور پنڈت جی سب سے زیادہ میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ آپ کی قوم کے ان ہونہار نوجوانوں کی طرف سے جن کی خاطر یونیورسٹی کا یہ سارا کاروبار چل رہا ہے۔ آج ان کی روشن آنکھیں اور دلوں سے زیادہ روشن دکھائی دیتی ہیں اس لیے کہ آپ کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں لیکن جب آپ ان کے سامنے نہیں ہوتے تو یہ اپنے میں آپ کی محبت اور آپ کی عقیدت کا خزانہ چھپائے رہتے ہیں۔

آزادی کی راہ میں آپ کی قربانیاں، غلامی کی زنجیریں کاٹنے میں آپ کی جاں بازیاں ان کے دلوں کو گرماتی ہیں۔ آزادی کے بعد اسے قائم رکھنے اور اسے قابلِ قدر بنانے میں آپ کی ان تھک سخت کوششیں ان کو بار بار اس پر ابھارتی ہیں کہ جلد اپنی تعلیم و تربیت کا

مقررہ نصاب پورا کرکے یہ آپ کا ہاتھ بٹائیں اور سب سے زیادہ یہ کہ ان میں آپ سے کچھ ایسا لگاؤ ہے، ایسی محبت ہے، ۔۔۔ ۔۔۔۔۔ ایسی عقیدت ہے کہ جب یہ اپنی جوانی کے جوش میں یا اپنی جلد بازی میں حالات سے گھبرا اٹھتے ہیں یا اپنے بڑوں سے مایوس ہونے لگتے ہیں اور آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ یہ گھبراتے بھی ہیں اور مایوس بھی ہوتے ہیں تب بھی آپ کے ساتھ ان کی گرویدگی کم نہیں ہوتی۔ انھیں آپ کی ذات میں اپنی آرزوؤں، اپنے ولولوں، اپنے ارادوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے اس لیے اگر کبھی آپ ان کے طبقہ یعنی طالب علموں سے مایوس ہونے لگتے ہیں تو ان کا دل ٹوٹ سا جاتا ہے، یہ سہم سے جاتے ہیں ان سے ضرور غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور پنڈت جی ہم بڑوں سے کیا کچھ کم غلطیاں ہوتی ہیں۔ مگر میں کہ ۲۰ برس سے انھیں کی خدمت میری زندگی ہے۔ شہادت دیتا ہوں کہ ہیں ہماری قوم کے نوجوان بڑے اچھے نوجوان۔ ان کا دل سونے کا دل ہے، نہیں اس سے بھی زیادہ گراں بہا ہے اس لیے کہ اپنے وطن کی محبت، اپنی قوم کی سرفرازی کی آرزو اس کے مستقبل پر یقین اور نیکی، خوبی انصاف کی لگن ان کے ریشہ ریشہ میں بھری ہوئی ہے۔ اور میں کوئی راز افشا نہیں کرتا جب یہ بتاتا ہوں کہ آپ ان کے بڑے ہی چہیتے محبوب ہیں ان کی طرف سے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اگرچہ ان کی گرم آنکھوں کی چمک ان کے نورانی چہروں کی دمک ان کے پُرارمان دلوں کی دھڑکن اسی تاثیر کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کر رہے ہیں کہ میرے لفظ ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

بڑا ہی کرم فرمایا پنڈت جی آپ نے ہم سب پر کہ باوجود اپنی طرح طرح کی مصروفیتوں کے آپ نے ہمارے لیے وقت نکالا۔ اس وقت ہم آپ کو تکلیف دینا چاہتے ہیں دو عمارتوں کے سنگ بنیاد رکھنے کی ایک سیفی ہوسٹل کا سنگ بنیاد اور ایک یونیورسٹی لائبریری کا سیفی ہوسٹل۔ ہمارے محترم امیر جامعہ حضرت سیدنا ڈاکٹر طاہر سیف الدین صاحب کے نام نامی سے منسوب ہے۔ یونیورسٹی میں ایک انجمن ہے انجمن القرض جو سالہا سال سے غریب طلبا کی مدد کا کام کرتی ہے۔ اس کی دستگیری نے بے شمار طالب علموں کو ضرورت میں سہارا دیا ہے اس کے لیے انجمن کے خادم چندہ جمع کرتے ہیں سیدنا نے بارہا اس کو گرانقدر عطیے مرحمت فرمائے ہیں۔ پچھلی بار جب انجمن کی طرف سے مدد کی درخواست ہوئی تو سیدنا نے فرمایا کہ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ کوئی عمارت اچھے بڑے سرمایہ سے تعمیر کرادی جائے اور اس کے کرایہ کی آمدنی سے غریب طلبا کی مدد کی جائے تاکہ اس مدد کی کچھ مستقل صورت ہو جائے اور وقتی چندوں پر ہی کام کا انحصار نہ رہے۔ اس شفقت بزرگانہ کی وجہ سے جو سیدنا اس یونیورسٹی کے طالب علموں پر رکھتے ہیں ان کا ارشاد تھا کہ ایک اچھے نمونہ کا ہوسٹل تعمیر کراؤ جس میں کم سے کم سو طلبا آرام سے رہ سکیں اور یکسوئی سے اپنی تعلیم اور تحقیق کا کام کر سکیں۔

حسب ارشاد دہلی کے مشہور آرکی ٹکٹ مسٹر کارل ہائس سے نقشہ تیار کرایا گیا اور تخمینہ یہ ہے کہ عمارت کی تیاری میں ساڑھے تین لاکھ سے کچھ اوپر خرچ ہوگا۔ سیدنا نے اس گرانقدر رقم کی فراہمی اپنے ذمہ لے لی اور اپنی جماعت کے لوگوں کو اس کار خیر کی طرف متوجہ فرمایا۔

یہ مستعد اور منظم اور کارکردہ جماعت سارے ملک میں اور ملک سے باہر کاروبار کے سلسلہ سے پھیلی ہوئی ہے اور اپنی ہوش مندی، حوصلہ دینداری اور خوش معاملگی کے لیے معروف ہے اس نے سیدنا کے ارشاد پر لبیک کہا اور ہندوستان میں ہندوستان سے باہر بوہرہ جماعتوں نے چھوٹی اور بڑی بڑی رقموں سے اتنا سرمایا فراہم کر دیا کہ سیدنا نے حکم دیا ہے کہ کام شروع کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آج اس ہوسٹل کا سنگ بنیاد آپ کے مبارک ہاتھوں سے رکھا جائے گا۔

اس زمانہ میں جب لوگ اداروں کا تمام تر بوجھ حکومت پر ڈالنا چاہتے ہیں یہ ایک قلیل تقلید مثال ہے۔ ہمارے چانسلر کا فیض یہیں تک محدود نہیں بلکہ طالب علموں کی بہبود کے طرح طرح کے کاموں میں یونیورسٹی کے نئے شعبوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں آپ کی مشفقانہ امداد برابر سہولتیں پیدا کرتی ہے۔ اور صرف مالی مدد نہیں بلکہ مشورہ اور ہمت افزائی اور گہری دلچسپی سے بھی۔ یہ اس طرح ہمارا سہارا ہیں جیسے ایک مشفق بزرگ اپنے بالغ سمجھدار بچوں کا ہوتا ہے۔ ہمیں بجا طور پر فخر ہے کہ ہمارا چانسلر علم و تقویٰ کا پیکر ہے اور فیاضی و ہمدردی کا بھی۔

دوسرا سنگ بنیاد جس کے رکھنے کی درخواست ابھی آپ سے کروں گا یونیورسٹی لائبریری کا سنگ بنیاد ہے یونیورسٹی کی لائبریری پہلے ایک کالج کی لائبریری تھی جس میں کوئی چالیس ہزار کتابیں تھیں اور کوئی تین سو قلمی نسخے۔ یہ کتابیں ایک بڑے خاصے وسیع کمرہ میں رکھی جاتی تھیں جس کے ادھر ادھر پڑھائی کے کمرے تھے۔ جب کالج یونیورسٹی بن گیا تو لائبریری کی اہمیت بھی بڑھی۔ دس ہزار روپیہ سال کی کتابیں اور رسالے خریدے جانے لگے۔ جگہ کی کمی پڑنے لگی۔ تو اس کے پاس کے کئی کمرہ ایک ایک کر کے لائبریری میں شامل ہوتے گئے۔ آج مرکزی لائبریری میں ساٹھ ہزار کتابیں ہیں اس کے علاوہ ۲۶ چھوٹے چھوٹے کتب خانے علیحدہ علیحدہ شعبوں میں ہیں جن میں چالیس ہزار سے اوپر کتابیں ہیں۔ قلمی کتابوں کا ایک ذخیرہ ہے جس میں چھ ہزار سے اوپر قلمی نسخے ہیں۔ حال میں ایک ادارہ علوم اسلامیہ قائم ہوا ہے اس کا کتب خانہ تیزی سے بڑھ رہا ہے اور مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ممالک سے متعلق ایک اچھا ذخیرہ اس کے پاس فراہم ہو گیا ہے۔

شعبہ تاریخ ہندوستانی تاریخ کے مسلم عہد پر خاص کام کر رہا ہے اور اس سلسلہ میں بڑی مستعدی سے تمام ایسی کتابوں کے آٹو گراف اور مائکرو فلم ہر جگہ سے جمع کر رہا ہے جن سے ہندوستانی تاریخ کے اس عہد پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ سب ذخیرہ ۲۶-۲۷

جگہ منتشر ہے، کوئی بڑی مرکزی عمارت نہیں ہے اس وقت سالانہ پچاس ہزار کی کتابیں اور رسالہ خریدے جاتے ہیں۔ اسی سال یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے سائنس کی کتابوں کے لیے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ سے اوپر کی منظوری دی ہے

[illegible] Loan Fund سے اسی ہزار کی کتابیں اسی سال آچکی ہیں۔ سالانہ کوئی تیس ہزار کتابیں جاری ہوتی ہیں۔ اکتوبر سے مارچ تک مطالعہ کا کمرہ صبح ۸ بجے سے رات کے دس بجے تک کھلا رہتا ہے کتب خانہ سال بھر کھلتا ہے۔ لیکن عمارت نہ ہونے سے کام میں بڑی مشکلیں ہوتی ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے کتب خانوں کو اپنے پروگرام میں خاص اہمیت دی ہے چنانچہ اس یونیورسٹی کے لیے بھی لائبریری کی عمارت کے واسطے دس لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے اس نئی عمارت کا نقشہ حیدرآباد کے مشہور آرکیٹکٹ جناب فیاض الدین صاحب اور دہلی کے معروف آرکیٹکٹ شری مانکم نے بڑی محنت اور توجہ سے بنایا ہے۔ کتب خانوں کی نقشہ سازی میں جو تجربات حال میں ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہ کتب خانہ جب بن جائے گا تو امید ہے کہ ملک کے اچھے کتب خانوں میں ہوگا۔ پانچ لاکھ کتابیں اس میں رکھی جا سکیں گی اور اس کے آرام دہ ہالوں میں طلبا کو مطالعہ کی ہر قسم کی سہولت ہوگی۔ ریسرچ کا کام کرنے والوں کے لیے الگ زاویے ہوں گے۔ قلمی کتابوں کی حفاظت کا اچھے سے اچھا انتظام ہوگا۔

[illegible] سلسلہ میں ہمیں اس کا موقع بھی ملا کہ ہم اپنے لائبریرین سید بشیرالدین صاحب کو چھ ماہ کے لیے امریکہ بھیج سکے وہ وہاں اچھے کتب خانوں کے انتظامات دیکھ کر واپس آگئے ہیں۔ ان کی نگرانی میں امید ہے کہ یہ نیا کتب خانہ ہماری یونیورسٹی کی علمی اور تحقیقاتی زندگی میں ایک بہت قیمتی اضافہ ہوگا۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے اس کا سنگ بنیاد رکھنا منظور فرما لیا ہے۔

میں اب باادب درخواست کرتا ہوں کہ آپ پہلے سیفی ہوسٹل کا اور پھر یونیورسٹی لائبریری کا سنگ بنیاد اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھ دیں۔

علی گڑھ سے خطاب

میرا دھیان اس وقت ۴۴ برس پہلے کی اس گرم دوپہر کی طرف رہ رہ کر جاتا ہے جب میں پہلی بار اس دانش گاہ میں پہنچا تھا۔ اپنے دوسرے سینکڑوں ساتھیوں سے ذرا کم اجنبی، کہ میرے دو بڑے بھائی پہلے سے یہاں موجود تھے۔ یہ دونوں یہاں رہ بس کر یہاں کے ہو چکے تھے، میں نو وارد تھا۔ سہ پہر میں شہر سے ایک جوتا، کچھ کتابیں اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے مجھے خرید وادی تھی۔ شہر گئے تھے ہم پیدل، ادھر سے آئے تھے آکے میں، اس لیے کہ ہاتھ میں سامان اٹھا کر چلنا اس زمانے میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا! مجھے یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے اپنے کچی بارک کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا گھنٹی بجی، میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے کہ ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ اور جراب اور انگریزی جوتے پہنے بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا، یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی، اور دیر کیسے نہ کرتا، جوتے کا فیتہ ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا، اس میں سلیقے سے گرہ دینے کا جو فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرادی تھی وہ گھبراہٹ میں سب ذہن سے اتر گیا اور کئی بار کے بست و کشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا۔ لیکن جب کس بندھ کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے زیادہ چوکس ساتھی ڈائننگ ہال جا چکے تھے۔

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

راستہ معلوم نہ تھا، نہ جانے کتنی دیر ادھر ادھر گھومتا پھرا اور اپنے خیال میں تلاش منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے ہی کمرے کے سامنے آن پہنچا۔ کمرہ بند تھا، دوسرے کمرے بھی سب بند تھے۔ گھڑی دیکھی، یہ بھی اسی دن نئی نئی بھائی صاحب نے دی تھی اس سے پہلے اسکول کے گھنٹے یا سورج کی مدد سے دن کی تقسیم کر لیا کرتا تھا۔ گھڑی جو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اسے گزرے صرف آٹھ منٹ ہوئے ہیں۔ اور

یہ خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۲۸ جنوری ۱۹۷۵ء کو پڑھا گیا۔

اس جانِ ناتواں نے اس آٹھ منٹ میں خود فراموشی، بازیافت، تلاشِ منزل گم کردہ راہی اور ناکامیٔ سفر کے جملہ مقامات طے کرلیے تھے!

سچ ہے وقت صرف گھڑی کی سوئیوں ہی سے نہیں ناپا جاتا، جس پر یہ گزرتا ہے اس کی کیفیت بھی اس کا ایک پیمانہ ہے، کبھی چند منٹ، انتظار اور مایوسی کے چند منٹ پہاڑ بن جاتے ہیں، کبھی کشفِ حقیقت، قصد نیک، مشاہدۂ جمال، مجاہدانہ سرفروشی کے ایک لمحے ازل اور ابد سمٹ کر سما جاتے ہیں کبھی بے مقصدی، بے راہ روی، بے دلی میں پوری کی پوری عمر بیت جاتی ہے کہ گھڑی کا ایک منٹ بھی اس پر حقارت سے ہنستا ہے۔ خیر، تو ہم آٹھ منٹ بعد جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ چارپائیاں باہر نیم کے درختوں کے قریب پڑی تھیں۔ وہاں بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے ساتھی کوئی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، کوئی گنگناتے، کوئی ہنستے، کوئی ذرا چپ چپ، واپس آنے لگے۔ یعنی جانا، کھانا، آنا، سب لو، دس منٹ میں ختم۔ اس زمانے میں اور چیزوں میں تو نہیں البتہ کھانے میں بہت ہی فوجی شان تھی۔ اس پر زیادہ وقت صرف کرنا بدذوقی سمجھا جاتا تھا اور منتظمین کی طرف سے بھی ایسا اہتمام تھا کہ زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع بھی کم ہی ہوتا تھا۔

یہ اس دن کی یاد اس تفصیل سے کیوں آرہی ہے آج؟ شاید اس لیے کہ وہاں سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے، مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا، گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق۔ یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دلگیر ہونا سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے، بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا اپنی قومی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا دیکھے، پر اس کے پچھتاوے سے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں۔ اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا، اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا، سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے شعلے کی طرح بھڑک بھی اٹھے، مگر سچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا، صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو و نما دے سکنے کے لیے ان میں زندگی کی تند اور تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت، مگر سیرت کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی، خلوت و جلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا، یہاں فرماں برداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی، ادب سیکھا بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب، اور خود اپنا ادب، سعادت مندی

اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی، باغی بنے، نکالے گئے، دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی مگر اس مادر علمی کی طرف دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ بن باس میں بھی دل اسی میں اٹکا رہا۔ حالات بدلے، ملک آزاد ہوا، یہاں کا نظام بھی بدلا، ذمّے دارانہ حیثیت سے اس کی خدمت کا موقع میسّر آیا۔ بری بھلی جو بن پڑی خدمت کی، اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سر شوریدہ کو یہیں بالین آسایش نصیب ہوجائے گی مگر یہ مقدر نہ تھا، صحت کی خرابی فرائض کی انجام دہی میں مخل ہوتی رہی، بالآخر محبت پر ذمّے داری کے احساس نے غلبہ پایا اور میں آپ سے رخصت ہوگیا۔

آج کاسۂ دل، کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے، اس سب پر جو یہاں سے پایا شکرگزاری سے بھرا ہے، اور ان تمام کوتاہیوں پر جو اس دانش گاہ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں شرمساری سے بھی چھلک رہا ہے۔ میرے لیے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی زندگی کا بڑا انعام ہے۔ آپ اس پر اس نئے اعزاز کا اضافہ کر رہے ہیں۔

من بوئے مست و ساقی پر دہد پیمانہ را

جناب والا! رسم سی ہے کہ تقسیم اسناد کے جلسے میں جس شخص کو خطبہ دینے کے لیے بلایا جاتا ہے وہ اعلیٰ تعلیم کے کسی مسئلے یا بعض مسائل کے متعلق اپنے خیالات دانش گاہ کے طلبا، اساتذہ اور کارکنوں کے سامنے رکھتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ایسا نہ کروں، اس لیے کہ جو کہا جاتا ہے وہ محفل آرائی بلکہ وقت گزاری کے سوا بظاہر کسی کام نہیں آتا۔ مگر سوچتا ہوں کہ تکرار ہمیشہ سے تعلیم کا چاہے افراد کی ہو، چاہے جماعتوں کی، خاصا مؤثر ذریعہ رہی ہے، اس لیے عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

سب سے پہلی چیز جو میرے خیال میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے تیزی سے بڑھیں گے اور باوجود اس شور کے جو ہم روز سُنتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ لوگ اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں، اور اس لیے بے روزگاری بڑھ رہی ہے، اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھے گی اور تعداد کو قابو میں رکھ سکنے کی خام خیالی کا نتیجہ بس یہ ہوگا کہ اس بڑھتی تعداد کے لیے اچھی اعلیٰ تعلیم کے صحیح انتظامات سوچ سمجھ کر اور پوری تیاری کے ساتھ نہیں کیے جائیں گے، معیار تعلیم گرے گا ادھ کچرے گریجویٹ جو کسی مرض کی دوا نہ ہوں گے، لاکھوں کی تعداد میں نکلیں گے، بوجھ بجھکڑ فرمائیں گے کہ تعداد کم کرنی چاہیے اور سمجھیں گے کہ بڑی دور کی کوڑی لائے اور تعداد ہوگی کہ بڑھتی جائے گی۔ بوجھ بجھکڑوں کے ذہن نشین اگر یہ ہوجائے کہ ہزار جتن کرنے پر بھی تعداد بڑھے گی شاید اس

بڑھتی ہوئی تعداد کو اچھی تعلیم دینے کے انتظامات کی طرف زیادہ دھیان دیا جا سکے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ملک میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور اس توسیع کی رفتار کو سچ یہ ہے، اور بھی تیز ہونا چاہیے۔ ہمارے ملک کے دستور میں ہدایت ہے، صاف ہدایت کہ دستور کے نفاذ کے دس سال کے اندر ہندوستان کے سب لڑکوں لڑکیوں کے لیے ۶ سال سے ۱۴ سال تک مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہو جانا چاہیے۔ ہم نے دلیں کی عام ترقی کے دو پنج سالہ منصوبے بنائے اور دوسرے منصوبے میں بڑی دیدہ دلیری سے اس ہدایت کو پس پشت ڈال دیا! اور مجھے ڈر ہے کہ دستور کی اس ہدایت پر تیسرے منصوبے میں بھی پورا عمل نہ ہو پائے گا۔ کچھ عجیب سی بات ہے، یہ قومی ترقی کا منصوبہ بنایا جاتا ہے قومی ارادوں کی تکمیل کے لیے، کسی اور معاملے پر قوم نے اپنے ارادے اور اپنی خواہش کا اس صفائی کے ساتھ اظہار نہیں کیا تھا جتنا کہ تعلیم کے معاملے میں۔

غرض ملک میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے اپنے کام کی اصلاح اور توسیع کے لیے روز بروز حکومت سے زیادہ وابستہ ہو جائیں گے۔ حکومت تعلیم پر فیاضی سے روپیہ صرف کرنے کی نیت بھی رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ بہت اچھا ہے، مگر دل میں ایک وسوسہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی آزادی کہیں خطرے میں نہ پڑ جائے۔ آزادی سے پہلے انگریزوں کے راج میں ہماری اعلیٰ تعلیم کے ادارے بالکل غیر ملکی سیاست میں ... ... کسے ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ انھیں قومی زندگی میں وہ تنویری اور تخلیقی مرتبہ حاصل نہیں تھا جو ان کا منصب ہونا چاہیے۔ آزاد ہندوستان میں یہ تعلیم گاہیں اگر قومی زندگی کی نشو و نما میں اس کے نکھار اور سدھار میں، اپنا فرض اس طرح انجام دینا چاہیں گی جیسا کہ ان کا حق ہے تو انھیں اپنے کام میں آزادی درکار ہوگی۔ دانش گاہیں، ذہنی اور اخلاقی زندگی کا مرکز ہوتی ہیں اور ذہنی اور اخلاقی زندگی آزادی ہی میں پھلتی پھولتی ہے، نہیں، آزادی اس کے لیے شرط حیات ہے۔ آزادی کے بغیر کوئی دانش گاہ نہ تمدنی سرمایہ کو نئی نسلوں تک صحیح طور پر پہنچانے کا کام کر سکتی ہے نہ اس کی صحت مند تنقید و تطہیر کا، نہ جہالت اور توہمات اور تعصبات کے لشکروں کو پسپا کر کے علم و دانش، اخلاق حسنہ اور حیات صالحہ کے گڑھ سر کر سکتی ہے۔ نہ اچھی سیرت و تعمیر کا کام کر سکتی ہے نہ اسے شخصیت کے مقام بلند تک پہنچانے کا۔ مبارک اور خوش نصیب ہے وہ قوم جس کی حکومت اعلیٰ تعلیم کے اس گر کو سمجھ لیتی ہے، اپنی دانش گاہوں کو بے دریغ وسائل فراہم کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی اور ان کی آزادی میں ایک لمحے کے لیے مخل نہیں ہونا چاہتی۔ یہ حکومت کی صحت اقدار کی کسوٹی ہے، مجھے یقین ہے کہ ہماری

آزاد حکومت اس امتحان میں پوری اترتی رہے گی۔
لیکن، جناب محترم، ہمیں جو دانش گاہوں سے وابستہ ہیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ یہ آزادی بھی ہر دوسری آزادی کی طرح اپنے اوپر آزادی سے پابندیاں لگاتی ہے۔ صحیح آزادی کہتے ہی ہیں خوشی سے اپنے اوپر ضروری پابندیاں لگانے کو بے راہ روی من مانے تلون کو آزادی نہیں کہتے۔ تلاش حق اور تبلیغ حق میں آزادی کے حق کے ساتھ دانش گاہوں پر سماجی ذمے داریوں کو بخوشی اٹھانے کا فرض بھی عاید ہوتا ہے۔ ہندوستان کی دانش گاہوں کی سماجی ذمے داری بہت بھاری ہے۔ ملک صدیوں کی غلامی سے آزاد ہوا ہے۔ غلامی، ذہن اور روح کا بڑا مہلک روگ ہوتی ہے۔ غلام، ذمے داری کے تصور سے عاری ہوتا ہے اور اخلاق کے تصور سے بے نصیب، آزادی میں قدم رکھتے ہی اپنے ہر فعل کے حسن و قبح کا بوجھ اس کے سر آپڑتا ہے۔ اخلاق کی پابندیاں اپنے سر لے کر ہی اس کو سچی آزادی نصیب ہوتی ہے۔ غلامی سے آزادی میں یہ سفر بڑا دشوار گزار سفر ہوتا ہے۔ ذہن اور روح کی قوتوں کو بے دار کرنا ہوتا ہے، پرانی عادت بار بار قدموں میں لغزش پیدا کرتی ہے، اقدار صالحہ کے سہارے ہی سے ان قدموں کو قوت ملتی ہے، رہروؤں کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ نو وارد اس نئی آزاد دنیا میں اجنبی اجنبی سے لگتے لگتے ہیں۔ ان کے ذہنوں کو اقدار کے معاملے میں صاف کرنا، ان کے جذبات کو فلاح قومی کے ساتھ وابستہ کرنا، انھیں خود غرضی اور نفس پروری کی تنگ و تاریک گھاٹیوں سے نکال کر مفاد جماعتی کی روشنی وسعتوں کا خوگر بنانا، فرقہ وارانہ وفاداریوں کو نکھار کر انھیں وحدت قومی کا دل دادہ بنانا، ان کی تن آسانیوں کو مفید جماعت مشقت میں بدلنا، غرض قومی مزاج کو آزادی کے مطالبوں کے مطابق بنانے کا کام بڑی حد تک دانش گاہوں کا کام ہے۔ یہ کام چونکہ آزادی ہی میں ہو سکتا ہے اس لیے ہر دانش مند، آزادی دوست، جمہوری حکومت، دانش گاہوں کی آزادی میں خلل انداز ہونے سے باز رہے گی مگر دانش گاہوں کو بھی یہ عظیم الشان کام انجام دے کر اپنے کو اس آزادی کا مستحق ثابت کرنا ہوگا۔ اس وابستگی کی بنا پر جو مجھے اس دانش گاہ سے رہی ہے اور ہے، جی چاہتا ہے کہ کاش یہ اس میدان میں اوروں سے آگے رہتی اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسے اوروں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی اس کا موقع ہے کہ یہ آزاد ہندوستان کی ذہنی اور روحانی قیادت میں اوروں سے آگے رہے۔ میری دانست میں کسی ہندی دانش گاہ کے طلبا میں ہندو مسلم سکھ، عیسائی کی ایسی اور اس نسبت میں آمیزش نہیں ہے جتنی کہ یہاں ہے۔ اس کے اساتذہ میں بھی یہ تنوع جس طرح جلوہ گر ہے دوسری جگہ کم ہے۔ اس کی اقامتی زندگی کی روایتیں اسے ایک مثالی علمی بستی بنانے میں سازگار ہیں۔ آزادی کے بعد بڑی مایوسی

کے دور سے گزر کر خود اعتمادی حاصل کی ہے اور نئے آزاد سماج کے تجربے نے اس کے ساتھ ایک تازہ اور شاداب تعلق خاطر پیدا کیا ہے۔ اس سے یہ توقع کسی طرح بے جا نہیں کہ یہ صالح انفرادی اور اجتماعی زندگی، ذمے دار شہریت، بے لاگ تحقیق، نڈر تنقید، بے لوث خدمت بے باک صداقت، مخلصانہ تعاون باہمی، ادب، تمیز، سلیقہ اور سب سے زیادہ وحدت قومی کے تصور میں سرشاری کی خصوصیتوں سے ممتاز، ایک تعلیمی بستی بن جائے گی جس پر ہمارا وطن ناز کر سکے گا۔ مبارک ہے وہ دانش گاہ جس کے طلبا، اساتذہ اور کارکنوں کی مشترک کوشش سے، کہ بغیر سب کی کوشش یہ کام ہونے والا نہیں، یہ منصوبہ بہ روئے کار آسکے۔

بہادر شاہ ظفر

آج سے پورے سو سال پہلے، ۷ نومبر کو بہادر شاہ ظفر اپنی پیاری دلّی اور اپنے محبوب لال قلعہ سے دور رنگون میں بے کسی اور تنہائی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ زمانے کے نشیب و فراز اور زندگی کی دھوپ چھاؤں پر غور کرتے ہوں گے تو انھیں اپنے ذی ہوش اور منچلے بزرگوں کے کارنامے یاد آتے ہوں گے جنھوں نے ہندوستان میں ایک ایسی وسیع سلطنت تعمیر کی جو ہندوکش سے کاویری تک پھیلی ہوئی تھی، جس کی بے شمار دولت، بے مثل صنعت و حرفت اور بے نظیر خوشنما اور شاندار عمارتوں کی سارے سنسار میں دھوم تھی، جس کے علوم و فنون، شاعری اور موسیقی کا دیش بدیش چرچا تھا۔ اس سلطنت کے نظم و نسق کی عمارت گاؤں پنچایت کے پرانے خود اختیاری نظام پر قائم تھی اور منزل بہ منزل سرکار، ضلع، صوبے اور مرکزی حکومت تک جس کا فرماں روا شہنشاہ تھا، اٹھتی چلی گئی تھی، اس کے حکمرانوں نے دانش مندی سے کام لے کر اپنی ساری رعایا کی حمایت حاصل کر لی تھی، اور وہ ہندو مسلمان دونوں کو اپنے قصر حکومت کے ستون سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستانی علم و حکمت اور فنون لطیفہ کے قدر دان اور سرپرست تھے اور ان کے زمانے میں دیسی بھاشاؤں، برج بھاشا اودھی، اور بنگلہ نے بہت فروغ پایا اور سور، تلسی، بہاری اور کاشی رام کے لافانی کلام سے ہندوستانی ادب کو مالا مال کر دیا۔

بہت سے نیک اور پرہیزگار بزرگوں نے جن میں بعض شہنشاہ بھی شامل تھے اس بات کی کوشش کی کہ مختلف مذہبی عقیدوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک مشترک زندگی کی بنیادیں رکھیں۔ وہ صلح کل کے مسلک کو اپنا کر ایک ایسی راہ نکالنا چاہتے تھے جس پر سبھی سالک دوش بدوش چل سکیں اور سعادت کی ابدی منزل تک پہنچ سکیں۔

پھر بہادر شاہ ظفر یہ سوچتے ہوں گے کہ خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے اور تقدیر کا

رسالہ 'جامعہ'، ستمبر ۱۹۵۷ء

لکھا اٹل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آپس کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے، بھائی بھائی سے لڑنے لگا، ایک ذات دوسری ذات کی، ایک مت دوسری مت کی خون کی پیاسی ہو گئی اور ہزاروں میل دور سات سمندر پار سے ایک بدیسی قوم آئی، اور آپس کی پھوٹ سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی مالک بن بیٹھی۔

اس ناٹک کے آخری سین میں خود بہادر شاہ محض تماشائی نہیں بلکہ خود ایکٹر کی حیثیت سے بہت اہم حصہ لے رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سلطنت آنے والی بلا کو ٹالنے کا موقع کھو چکی تھی۔ مگر اس کی دو سو سال کی شان و شوکت کی گہری چھاپ ہندوستانی قوم کے دلوں پر موجود تھی۔ اٹھارہویں صدی میں مغل شہنشاہ کی سیاسی طاقت برائے نام رہ گئی تھی، پھر بھی اس کے نام کا اور اس خاندان کی روایات کا جادو اب تک کام کرتا تھا۔ پرانے راجپوت راجا اب بھی دہلی کے دربار سے خطاب اور خلعت پاتے تھے، مرہٹہ پیشوا اور ان کے سردار اب بھی اس کی عنایات سے سرفراز ہوتے تھے خود مختار صوبہ دار اب تک اپنی غصب کی ہوئی حکومت پر جواز کا پردہ ڈالنے کے لیے سندیں حاصل کرتے تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل اب بھی اپنے آپ کو شہنشاہ کا فدوی کہتا تھا نئے بادشاہ کی تخت نشینی سے اب بھی سنہ جلوس شروع ہوتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر اکتوبر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۷ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ ان کی قلم رو لال قلعہ کی دیواروں تک محدود تھی۔ سلطنت کی بس ایک پرچھائیں رہ گئی تھی اور دربار کی حیثیت جھگڑالو، بیکار، شہزادوں، مرشد زادوں، درباریوں اور چوبداروں کی ایک بھیڑ سے زیادہ نہ تھی۔ اس اداس گھٹتے ہوئے ماحول میں بہادر شاہ اپنے جاہ و منصب کے وقار کو قائم رکھنے اور اپنے بزرگوں کی تہذیبی روایات کو نبھانے کی اپنی سی کوشش کرتے تھے۔

لال قلعے میں اب بھی اہل سخن اور اہل قلم کا جمگھٹ رہا کرتا تھا۔ دہلی والوں کے محبوب میلوں اور تیوہاروں کو پہلے کی طرح اب بھی دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ بادشاہ کے جلوس کو دیکھ کر اب بھی لوگوں کو سلطنت کی عظمت رفتہ یاد آجاتی تھی۔ اور اس کے دم قدم سے شہر کے آس پاس باغوں اور سیرگاہوں کی رونق کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ خزانے میں روپے پیسے کا توڑ تھا۔ پھر بھی خانقاہوں اور دھرم شالوں، غریبوں اور محتاجوں کے لیے تھیلیوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔

بہادر شاہ ظفر علم دوست اور شاعر تھے اور ان کے وقت کا بڑا حصہ ادبی مشاغل میں گزرتا تھا۔ وہ کئی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے اردو ہندی کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن کی باریکیوں کو سمجھتے تھے، ستھرا اور

پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور محاورے اور روزمرہ کے استاد تھے۔

بظاہر ان کی پرسکون زندگی کا بندھا ہوا ڈھرا بدلنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی مگر ہندوستانی زندگی کی خاموش اور ساکن زندگی کی سطح کے نیچے بے چینی اور شورش کا ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔ ان حکمراں خاندانوں کے سینوں میں جو اپنے تاج و تخت سے محروم کردئے گئے تھے۔ انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ عام لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ حکومت کی پالیسی جبر و تشدد پر مبنی ہے انصاف مہنگا ہے، عدالت کی کارروائیوں میں بہت دیر لگتی ہے اور بڑی ذلت اٹھانی پڑتی ہے وہ اپنے دین دھرم، ذات پات کو بدیسی حکمرانوں کے ہاتھوں خطرے میں پاتے تھے۔ اور ان کی خود پسندی اور غرور سے بیزار تھے۔ یہ مادّہ جو اندر ہی اندر پک رہا تھا ۱۸۵۷ء کی زبردست شورش کی شکل میں پھوٹ نکلا۔

اس مہیب اور خطرناک مہم کی رہنمائی کے لیے لوگوں نے ہندوستان کی عظمت رفتہ کے نشان سلطنت کے نام و نگین کے وارث، اکبر اور شاہجہاں کے جانشین بہادر شاہ کو چنا۔ زبان خلق سے ایسی دعوت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے اور جنھیں ملتی ہے ان میں بھی بہت کم ہیں جو سود و زیاں کے اندیشے سے بے نیاز ہوکر اس پر لبیک کہتے ہیں۔ مگر بہادر شاہ نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور سچی شاہانہ شان سے نبھایا۔ وہ محاصرۂ دہلی کے یادگار زمانے میں جنگ آزادی کے روح رواں بن گئے۔ لڑنے والی فوج کی ہمت بڑھائی، اس کے لیے مالی وسائل فراہم کیے اور ان پرآشوب دنوں میں شہری امن قائم رکھا۔

اس آزمائش کے موقع پر ان کے دل میں بس ایک ہی لگن تھی کہ جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے پورا کرنے میں کوئی کوشش اور کوئی تدبیر نہ اٹھا رکھیں۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ شہزادوں کی نااہلی اور خود پسندی سے کامیابی خطرے میں پڑ گئی ہے تو فوج کی کمان ایک قابل اور آزمودہ کار سپہ سالار جنرل بخت خاں کے ہاتھ میں دے دی۔ فوجی اور ملکی امور کے انجام دینے کے لیے ایک انتظامی کونسل قائم کی، جو ہو بہو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل کی کونسل کا نمونہ تھی۔

مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے والوں کی ناپاک کوششوں کو چلنے نہیں دیا۔ وہ ساری عمر اپنی خاندانی روایات کے مطابق ہندوؤں کے تہوار رکشا بندھن، بسنت، ہولی، دیوالی اس طرح مناتے آئے تھے جیسے یہ ان کے اپنے تہوار ہوں۔ ان کا قول تھا۔ "اگر مسلمان مجھے ایک آنکھ کی طرح عزیز ہیں تو ہندو بھی دوسری آنکھ کی طرح پیارے ہیں۔" چنانچہ انھوں نے

محاصرے کے زمانے میں اپنے ہندو سپاہیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے گاؤکشی کی ممانعت کردی اور یہ فرمان جاری کیا کہ جو لوگ فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کریں گے انھیں سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔

ان کی بے نفسی بھی یادگار رہے گی کہ انھوں نے اعلان کردیا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ اپنے لیے کوئی منصب نہیں چاہتے اور تحریک آزادی کے کارکنوں پر چھوڑ دیں گے کہ ملک کے مستقبل کے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کریں۔

بہادر شاہ نے ملک کی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا، اور وہ ہار گئے، ہاں وہ ہار گئے، مگر اس لڑائی کا جو آزادی کو حاصل کرنے کے لیے اور اس لڑائی کا جو آزادی کو قائم رکھنے کے لیے لڑی جاتی ہے، انجام ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور وہ فتح ہے آزادی کے علمبرداروں کی۔ بے شک بہادر شاہ ہار گئے، مگر جو تحریک انھوں نے شروع کی تھی وہ دھیرے دھیرے بڑھتی گئی، پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ نوّے سال بعد کامیاب ہوکر رہی۔ آزادی کی جدو جہد جب شروع ہوتی ہے تو نفع نقصان کا کھاتہ نہیں کھولا جاتا۔ آزادی وہ قدرِ اعلیٰ ہے جو ہر قیمت پر سستی ہے، اس لیے کہ اس کے بغیر زندگی میں اخلاقی ذمہ داری نہیں رہتی، بلکہ سچ پوچھیے تو زندگی زندگی نہیں رہتی، آزادی کے بغیر زندہ رہنا موت سے بدتر ہے۔ آج ہمارا بڑا کڑا مقابلہ ہے اس ہمسائے سے جس کے ساتھ امن و عافیت سے رہنے اور دوستی کے نبھانے میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مگر ہم اس آزادی کی جسے ہم نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے حاصل کیا ہے، حفاظت کرنا بھی جانتے ہیں ہماری قوم کا یہ عزم کہ ہم مرتے جائیں گے مگر آزادی کا سودا نہیں کریں گے ہماری کامیابی کی کافی ضمانت ہے، لڑائی کتنی ہی کڑی کتنی ہی کٹھن کیوں نہ ہو ہم فتح کی منزل پر پہنچ کر دم لیں گے۔ ہاں بہادر شاہ ہار گئے کہ ہماری جیت کے لیے راہ کو ہموار کردیں، ہاں، وہ ہار گئے۔ ان کے بیٹوں کو بے دردی سے ان کی آنکھوں کے سامنے گولی ماردی گئی، ان کو ذلیل کیا گیا اور ایک برطانوی عدالت کے سامنے جس کو قانون کی رو سے ان پر کوئی اختیار نہ تھا، ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ انھیں جلاوطنی کی سزا سنائی گئی اور قید کرکے رنگون بھیج دیا گیا، جہاں وہ اپنے گھر بار سے دور، بہت دور تھے، جہاں ان کا کوئی عزیز، کوئی دوست ان کی خدمت اور دل جوئی کے لیے نہ تھا۔ ان کی زندگی کے یہ آخری دن رنج و مصیبت کے دن تھے، مگر ان کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا اور وہ اس آزمائش سے صبر و وقار کے

ساتھ گزرے۔ ان کا یہ راضی بہ رضا رہنا ان کی روحانی رفعت کی دلیل ہے، ان کے اہل وطن انھیں شکر گزاری کے جذبے کے ساتھ یاد رکھیں گے کہ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے بڑی ہمت کی اور بہت دکھ اٹھائے۔ مجھے امید ہے کہ سارے ہندوستان میں ان کی صد سالہ برسی ان کے شایان شان اس آہنی عزم کے ساتھ منائی جائے گی کہ ہم سب کندھے سے کندھا جوڑ کر حملہ آور قوت کا مقابلہ کریں گے اور اس آزادی کی حفاظت کے لیے جو ہم نے بہت کٹھنائیاں اٹھا کر حاصل کی ہے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔ جے ہند۔

خطبہ

(افتتاح کتب خانہ ونمائش)

سبھاپتی جی، قاضی عبدالودود صاحب، جسٹس خلیل احمد صاحب اور دوستو!

میں نے اپنے بس بھر اس بات کو پھیلانے کی بہت کوشش کی ہے کہ جلسوں اور اداروں کے افتتاح اور سبھاؤں اور سنستھاؤں کی ادگھاٹن کی رسم اکثر کچھ غیر ضروری سی ہوتی ہے۔ پھر جب کسی جلسے کو شری بابو جیسا صدر نصیب ہو تو یہ رسم سراسر غیر ضروری ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ بات کا سُن لیا جانا اور بات ہے اور اس کا مان لیا جانا اور بات۔ ایک وجہ شاید اس کے بین بین بھی ہوتا ہے، اسی طرح مان جانے کا کہ ماننا نہ ماننا ایک سا ہو جائے۔ یعنی بہت اچھا، آپ افتتاح اور ادگھاٹن کو غیر ضروری سمجھتے ہیں تو ٹھیک ہے ہم کسی اور کو اس مبارک اور لازم کام کے لیے بلا لائیں گے، آپ صدارت کر دیجئے گا اور ناصح غریب کے نام کے سامنے اعمالنامہ یعنی پروگرام میں تقریر افتتاح کی جگہ خطبۂ صدارت درج ہو جاتا ہے۔ بہر حال شاید ممکن صورت بس یہی ہے کہ آدمی کہے جائے کہ افتتاح اور ادگھاٹن کی چنداں ضرورت نہیں اور بر کہہ چکنے کے بعد کچھ اور بھی کہہ دیا کرے۔ اس کا ضمیر بھی ہلکا ہو جاتا ہے، فرمائش بھی پوری ہو جاتی ہے۔

تو اور کچھ جو کہنا ہے وہ یہ کہ آج جن کاموں کے افتتاح کے سلسلے میں آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے، یعنی "اردو نمائش" اور "ادارۂ تحقیقات اردو" کے کتب خانے کا افتتاح، یہ دونوں ایسے کام ہیں کہ اگر آپ افتتاح کی دعوت نہ بھی دیتے تو بھی ان کو دیکھنے اور جاننے کو جی ضرور چاہتا۔ نمائش کے متعلق یہ دعویٰ ضرور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاید اپنی نوعیت کی پہلی نمائش ہے۔ اس کے دیکھنے والوں کے سامنے اردو زبان کی تاریخ کا ایک نقشہ سا آجائے گا، اس کے ماضی کی تفصیلات سے اس کے مستقبل کے امکانات واضح ہوں گے اور اردو ادب کا وطن کے سرمایۂ علمی و ادبی میں جو اونچا مقام ہے وہ کچھ کچھ سامنے آجائے گا اور اردو ادب کو قومی زندگی کی ترقی و تہذیب میں کسی دوسری ہندوستانی زبان سے پیچھے نہ رہنے کا ولولہ پیدا ہوگا، جو ایک نہایت مبارک ولولہ ہے۔

۱۹۵۹ء

ادارے نے اس نمائش سے متعلق جو کتابچہ شائع کیا ہے اس سے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ ادارے کو اپنی اس قابلِ تحسین کوشش میں بہت سے افراد اور اداروں کا تعاون حاصل ہو سکا کوئی تیس اداروں نے پچاس سے اوپر غیر مقامی اصحاب نے اور کوئی یون سو سے اوپر مقامی ہمدردوں نے اس کام میں ہاتھ بٹایا۔ یہ تعاون خود اردو کے مستقبل کے لیے ایک نیک فال ہے۔

اس نمائش میں طرح طرح کی دل چسپ چیزیں آپ کے دیکھنے میں آئیں گی ایک طرف قلمی کتابیں تو دوسری طرف چھپی ہوئی چیزیں۔ قلمی چیزوں میں اردو کے مخطوطے ملیں گے، مشاہیرِ اردو کے خط، ان کے اپنے ہاتھ کی تحریریں، ان کے مرقع، سب کچھ سامنے آئیں گے۔ ۱۸۸۵ء سے پہلے کے سرکاری محکموں اور عدالتوں کے کاغذ بھی آپ دیکھیں گے۔ خطاطی اور کتابت کے اچھے اچھے نمونے بھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے اور ادب، زبان و تاریخ اردو سے متعلق فارسی اور ہندی کے قلمی نسخے بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ دوسری طرف بہت سی چھپی ہوئی چیزیں ہوں گی جو اب بہت کمیاب ہیں: پرانی چھپی ہوئی نظم اور نثر کی کتابیں، پرانے رسالے اور اخبار، پرانے ادبی گلدستے، علمی اور ادبی انجمنوں کی رودادیں اردو لغت، لسانیات اور تاریخ اردو کی کمیاب کتابیں، پھر علوم و فنون کی نئی پرانی کتابیں، اسلام اور دوسرے مذہبوں پر اردو کی پرانی کتابیں، جنتریاں، اچھی چھپائی کے نمونے اور دیوناگری، رومن یا دوسری لپیوں میں اردو کی کتابیں۔ ایسی نمائش کا افتتاح کرنے پر کسے خوشی نہ ہوگی۔

لیکن نمائش تو ایک عارضی چیز ہے۔ خاص کوشش سے یہ سب چیزیں آپ کے لیے یکجا کر لی گئی ہیں۔ دوسری چیز جس کا افتتاح مجھے کرنا ہے وہ مستقل چیز ہے، وہ ہے ادارۂ تحقیقاتِ اردو کا اپنا کتب خانہ۔ یہ نوعمر ادارہ بڑا ہونہار ادارہ ہے۔ چند سال کے اندر ہی اس نے قابلِ قدر کام کیا ہے اور بہت کچھ امیدیں تحقیق علمی کی اس سے وابستہ ہیں۔ یہ خالص تحقیقاتی ادارہ ہے جسے سیاست سے کوئی سروکار نہیں، یہ صفت بھی آج کل کمیاب کتابوں سے کچھ کمیاب نہیں یہ کئی تحقیقی کتابیں شائع کر چکا ہے اور کئی زیرِ طبع ہیں۔ جدید اصولِ لغت نگاری کے مطابق ایک جامع اردو لغت مرتب کرنے کا کام بھی ادارہ کر رہا ہے۔ مشاہیرِ اردو سے متعلق محققانہ کتابیں شائع کرنا، اردو ادب کی مختلف تحریکوں اور مختلف ادوار کی تاریخ پر مقالات تیار کرانا، اردو نظم و نثر کی پرانی قابلِ قدر کتابوں کے مستند نسخے شائع کرنا، یہ بھی منجملہ ان اہم کاموں کے ہیں جو ادارے نے اپنے ذمے لیے ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والوں کو بھی ادارے سے بہت مدد اور ہدایت ملتی ہے۔ پانچ اصحاب جو ادارے سے متعلق ہیں، اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند کے لیے تحقیقی مقالوں پر

کام کر رہے ہیں، جن میں تین عنقریب اپنے مقالے پیش کر دیں گے۔ ادارے کے ساتھ ملک کے بعض ممتاز محقق وابستہ ہیں اور اس ادارے کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی صدارت کی ذمہ داری قاضی عبدالودود صاحب کے ذمے ہے۔ قاضی صاحب نے قابل رشک یکسوئی کے ساتھ تحقیق علمی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور سچ یہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ اور اس کے متعلقہ مسائل پر ان کو جو عبور حاصل ہے، ان کا علم اس بات میں جتنا وسیع اور حاضر ہے، ان کی نظر جتنی گہری اور تیز ہے اور تحقیق کے بوجھل کام کے لیے ان کے اندر جو شیفتگی ہے اس نے انھیں محققین کی صف اوّل میں ایک بلند درجہ دیا ہے۔ بہار ان پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ ان کی نگرانی میں، مجھے یقین ہے کہ، یہ ادارہ بہت گراں قدر خدمات اردو سے متعلق تحقیقات کے میدان میں انجام دے سکے گا۔

ادبی تحقیقاتی کام کے لیے کتب خانے کی ضرورت پر کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ ادارے نے ایک کتب خانہ جمع کیا ہے جس میں سات ہزار سے اوپر قیمتی اور کمیاب کتابیں یکجا کر لی گئی ہیں۔ اس کا انتظام ادارے کی ایک ذیلی کمیٹی کے ذمے ہے جس کے صدر میرے دوست جسٹس خلیل احمد صاحب ہیں۔ اس کتب خانے کے افتتاح کی رسم بھی اس وقت مجھے انجام دینی ہے۔ مجھ سے ان میں سے ایک ہی کام کے لیے کہا جاتا تو بھی باعث مسرت اور موجب افتخار ہوتا۔ یہ تو ایک چھوڑ دو دو کام آپ ایک ناکارے سے لے رہے ہیں۔ کرم بالائے کرم ع

"من ہنوز مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را"

ہاں، ایک بات اور کہہ دوں۔ وہ یہ کہ مجھے ان کاموں سے خاص خوشی اس وجہ سے بھی ہے کہ ادارے کے معتمد میرے ایک پرانے شاگرد، جامعہ ملیہ کے سابق طالب علم، قاضی محمد سعید صاحب ہیں۔ جنھوں نے نمایش کے اہتمام میں واقعی دن رات ایک کر دیا ہے۔ لیکن علاوہ اس شخصی تعلق کے یہ خوشی مجھے اس وقت بھی ہوتی کہ یہ نمائش اُردو کی نمائش نہ ہوتی اور کتب خانہ اُردو کے ایک تحقیقاتی ادارے سے متعلق نہ ہوتا۔

کتابیں، کسی زبان کی ہوں، تمدن انسان کی دستاویزیں ہوتی ہیں، ذہنی قوتوں کا خزینہ متاعِ روحانی کا دفینہ۔ ان سے استفادہ اور ان کا تحفظ ہر حال میں ایک اچھا کام ہے۔ اسی طرح تحقیق علمی، میدانِ تحقیق کیا ہے اس سے قطع نظر، دراصل تلاش حق کی ایک راہ ہے۔ اس راہ میں گرم رو رہنے کے لیے تربیت و تہذیب کا سامان ہے، اس راہ کے وسوسوں، گمراہیوں اور فریبوں سے، کہ ان سے یہ راہ پُر ہوتی ہے، بچنے کی مشق پہنچاتا ہے، لیکن سچ کہہ دوں آپ سے کہ مجھے اس عام خوشی اور افتخار سے کچھ زیادہ خوشی، کچھ زیادہ افتخار اس لیے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ دونوں کام جو اس وقت انجام پا رہے ہیں اردو زبان سے تعلق

رکھتے ہیں، وہ زبان جسے پہلے پہل اپنی ماں سے سیکھا تھا، جس میں میری ذہنی پرورش ہوئی، جس میں اب تک سوچتا ہوں، جس کے علمی اور ادبی سرمائے سے اپنی استعداد کے بقدر فیض اٹھایا ہے اور یہی نہیں کہ اس سے مجھے یہ شخصی اور ذاتی لگاؤ ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ایک وفادار ہندوستانی شہری کی حیثیت سے مجھے یہ زبان اس زندگی کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کی بشارت دیتی ہے جو ہم سب ہندوستانی اپنے آزاد دیس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی زندگی کی روح کیا ہے؟ اس کی روح ہے اور ہمیشہ سے رہی ہے کثرت میں وحدت کی تلاش! الگ الگ اور طرح طرح کے عناصر سے ایک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کے بنانے کی آرزو، جو زینتِ چمن کو گلہائے رنگا رنگ کا نتیجہ جانتی ہے جو رنگ برنگے تمدنی پھولوں کو وحدت قومی کے ڈورے میں پرو کر ایسا ہار بنایا چاہتی ہے کہ وہ ہار گوندھ کر انسانیت کی گردن میں ڈالا جائے تو اس کی شوبھا کو بڑھا دے، جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ؎

"ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا"

یہ کہنے کی ہمت رکھتی ہے کہ "ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے"، جہاں گل اپنے کو جزو کا رقیب نہیں سمجھتا، اس کی طاقت کو اپنا بل جانتا ہے۔ ہندوستانی زندگی کے تمدنی مظاہر میں مجھے یہ روح اُردو زبان میں بڑے سُتھرے اور نکھرے ہوئے روپ میں دکھائی دیتی ہے اور اردو کی تاریخ پر تحقیقاتی کام مجھے اس وجہ سے اور بھی اہم دکھائی دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادنیٰ تامل سے یہ بات بالکل روشن ہو جائے گی کہ اردو نہ کسی فرقے کی زبان ہے، نہ کسی مذہب کی زبان ہے، نہ کسی حکومت کی زبردستی چلائی ہوئی زبان ہے، نہ کسی خاص نیت سے مصنوعی گڑھی ہوئی زبان ہے۔ یہ تو جنتا کی بولی ہے! لوگوں کی زبان ہے! آپس کے میل جول کا پھل ہے، میلوں، ٹھیلوں، بازاروں منڈیوں کی ریل پیل میں رلی ہوئی زبان ہے، زندگی کے بیوہار کے کانٹوں میں تلی ہوئی زبان ہے، چیزوں کے لین دین کے ساتھ وچاروں کے لین دین کا نتیجہ ہے۔ یہ فقیروں اور سنتوں کی زبان ہے جو اپنے پریم سے چھلکتے ہوئے دل کی بات اوروں تک پہنچانے کے لیے بے کل تھے اور جن کی من موہن باتیں سننے کو عام لوگ کان لگائے رہتے تھے اسی لیے... محبت اور پریم کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے، میل ملاپ کی زبان ہے، اس کا دل بھی بڑا ہے اس کی جھولی بھی بڑی ہے۔ یہ نئے انداز سے جھجکتی نہیں، نئی بات پر بدکتی نہیں، لفظوں سے گھنیاتی نہیں وچاروں سے چھوت چھات نہیں کرتی۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اُردو کے یہ گن خواہ مخواہ گا رہا ہوں، ان کا ذکر اس لیے کرتا ہوں کہ ہمیں جو سماج بنانا ہے اس میں جوڑنے والی طاقتوں کو ابھارنا ہے، توڑنے والی طاقتوں کو دبانا ہے۔ زبان جوڑنے والی طاقت ہے، ہر زبان جوڑتی ہے پر ہر زبان والے اسے اپنے کو دوسروں سے الگ کرنے کا آلہ بنا لیتے ہیں، اس پر لڑتے ہیں کٹتے مرتے ہیں۔

ایک دوسرے پر تہمتیں باندھتے ہیں۔ ایک ہی دیس میں ایک زبان والا علاقہ دوسری زبان والے علاقے سے ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسے کوئی پرایا دیس ہو۔ یہ سب بڑی بھول کی باتیں ہیں اور آج جب کہ دیس کو اپنی آزاد زندگی کی پہلی کٹھن منزل درپیش ہے اتحاد قومی از بس ضروری ہے۔ ان جھگڑوں میں پھنس کر ہم ان مشکلوں کا سامنا کیسے کریں گے جو آگے دکھائی دے رہی ہیں۔ اردو چونکہ دیس کے کسی ایک علاقے میں محدود نہیں ہے۔ ہر جگہ ہی اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں اس لیے اس کو تو وحدت قومی کے پیدا کرنے میں سب سے آگے ہونا چاہیے لیکن پچھلی تاریخ نے اس میں بھی بہت سے پیچ ڈال دیے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ مسلمانوں کی زبان ہے کوئی کہتا ہے یہ پردیسی زبان ہے مگر ہر سچ ہے کہ یہ نہ خالی مسلمانوں کی زبان ہے نہ پردیسی زبان ہے۔ اور اچھا مان لو کہ یہ مسلمانوں ہی کی زبان ہوتی تو بھی تو ہماری آزاد جمہوری زندگی میں یہ کوئی عیب کی بات نہ ہوتی۔ ہر آدمی جو ہمارے دیس میں بستا ہے اسے اپنا دیس جانتا ہے اس کے ددھان کو مانتا ہے اس کے مطابق چلتا ہے وہ ہمارا بھائی ہے ساتھی ہے دوست ہے اس کی ترقی ہماری ترقی ہے اس کی بھلائی میں ہماری بھلائی ہے مگر اردو تو خالص مسلمانوں کی زبان ہے بھی نہیں۔

کوئی فہرست نہیں بنائی ہے جو نام اس وقت یاد آگئے وہ لیتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ "تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار، پروفیسر رام چندر، سندر شن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، برجموہن دتاتریہ، نسیم، چکبست، سرور جہاں آبادی، فراق گورکھپوری، منشی نولکشور، لالہ سری رام صاحب خمخانہ جاوید، منوہر لال زتشی، دیانرائن نگم کی زبان کو کوئی مسلمان کی زبان کیسے بتاتا ہے اور اس زبان پر مذہبی تنگدلی اور فرقہ پرستی کی تہمت کیسے باندھ سکتا ہے؟ جس زبان میں آریہ سماج کا تمام تر مذہبی لٹریچر موجود ہو، جس سے عیسائیوں نے اپنے مذہب کی خدمت کا پورا پورا کام لیا ہو اسے مسلمانوں کی زبان کہہ کر تنگدلی اور تنگ نظری کی پرورش کرنا کون سی دیانت ہے، کون سی فراست ہے؟ پھر اردو نہ بدیسیوں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے۔ ذرا بھی دیکھیے تو قدم قدم پر اس کی شہادت ملتی جائے گی۔ لسانی نقطۂ نظر سے اس کے افعال، اور حروف، اور عام ضرورت کے اسم سب ہندی ہیں۔ اس کی آوازوں پر کان دھریے تو ایران اور عرب سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ آوازوں کی بہت بڑی تعداد خالص ہندوستانی ہے۔ عربی لفظوں میں جو سامی آوازیں آئی ہیں انھیں بھی بول چال میں ہندیا لیا ہے۔ لکھائی میں بھی کہ اس کے پردیسی ہونے پر بہت زور دیا جاتا ہے درجنوں ہندوستانی آوازوں کے ظاہر کرنے کا اس میں سامان ہے اس میں ٹ ڈ ٹ ٹھ د، ڈھ، بھ پھ، ںھ چھ اور گھ کیا پردیسی آوازوں کے نشان ہیں؟۔

دوستو! شاید اس وقت یہاں اردو دوست زیادہ جمع ہوں، آپ سے یہ کہنا

ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا فرض ہے کہ اپنی عزیز زبان کی روح کو آپ کسی حال میں مسخ نہ ہونے دیں۔ کوئی اس روح سے ناواقف ہو تو اسے بتائیں کہ یہ روح کیا ہے۔ اس روح کو تازگی بخشیں کہ ایک اچھی سماجی زندگی کے بنانے میں آپ کا ادب کسی سے پیچھے نہ رہے۔ زبان اور ادب کا مقابلہ یہ نہیں کہ کسی سے روٹھ گئے، کسی کو برا سمجھ لیا، کسی کو دبا دیا، اس میں جیت اس کی ہے جو خدمت کے میدان میں اوروں سے بازی لے جائے۔ مقابلہ اس میں کیجیے کہ کس زبان کے گیت قوم کے دل کو گرماتے ہیں، کس کا ادب صالح اقدار کی ترویج کا ذریعہ بنتا ہے۔ کون اچھے آدمی، اچھی ریاست اور اچھے سماج کے بنانے میں، اس کو عدل و انصاف، صداقت و امن کی بنیادوں پر مضبوط کرنے میں، غلطی کرنے پر جرأت سے ٹوکنے میں نیکی کو فراخدلی سے سراہنے میں، دماغوں کو تنگ نظری اور تنگدلی کے جالوں سے صاف کرنے میں علم کی سرحدیں آگے بڑھانے میں، آدمی نے جن سچائیوں کا سراغ لگا لیا ہے، کہیں لگایا ہو کسی نے لگایا ہو، ان سے اپنے ہم وطنوں کے ذہنوں کو منور کرتے ہیں، جذبۂ قومی کو ایک قومی اور مؤثر جذبہ بناتے ہیں، وطن اور اہل وطن کی اچھائیوں اور خوبیوں سے وہ ذہنی وابستگی اور روحانی دلبستگی پیدا کرتے ہیں، جو قومی وفاداری کی جڑ ہے کون زبان دوسری زبانوں سے زیادہ کارگر ہے۔ یہ نیکی کا مقابلہ ہے اس میں جیت اور ہار نہیں ہوتی۔ اس میں مقابلہ کرنے والے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں اور دوسرے کے آگے بڑھ جانے پر بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہیں جتنا خود اپنے آگے نکلنے پر۔

میری التجا ہے اور مجھے امید ہے کہ تاریخی اتفاقات نے اردو ہندی کے تعلق میں جو گتھیاں سی ڈال دی ہیں وہ اردو اور ہندی دونوں کے کام کرنے والے اپنی سوجھ بوجھ اور صاف دلی سے اس طرح سلجھائیں گے کہ یاد بھی نہ رہے گا کہ کبھی یہ الجھنیں پیدا بھی ہوئی تھیں۔ محبت سے کہتے ہیں ٹوٹے دل جڑ جاتے ہیں اور ایسے جڑتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں بال پڑا تھا۔

دل شکستہ درآں کوئے میکنند درست
چناں کہ مینشناسی کہ از کجا بشکست

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ اردو کسی طرح ہندی کی رقیب نہیں ہے۔ سب ہندوستانی شہری، ان کی زبان کچھ بھی ہو، دستور ہند کے مطابق ہندی کو دیس کی سرکاری زبان مانتے ہیں اور اس کی ترقی میں ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، اردو والے بھی اس سے باہر نہیں ہیں۔ پھر اردو ہندی کی رقیب کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی ہندوستانی دستور کی تسلیم کی ہوئی قومی زبانوں میں سے ایک ہے اور ہندی سے سب سے قریب ہے۔ اس لیے اگر اردو والوں کو کہیں کوئی شکایت ہو کہ ان کی زبان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ ہے تو میرا

جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان کی طرف سے پیروی ہندی والے کریں۔ اس سے بھروسا اور محبت کے ایسے سوتے پھوٹیں گے کہ ساری قومی زندگی انھیں سے سیراب ہو گی۔ سارے دیس میں لسانی سیاست کا رنگ ہی بدل جائے گا۔ ذہنی تعاون کی راہیں کھل جائیں گی۔ آپس کا ربط بڑھے گا تو کیا عجب ہے سارے دیس میں ایسی حسین اور شیریں زبان، ایسی سندر اور مدھر اور کومل بھاشا کا چلن ہو جائے جو بس ہزاروں کی گنتی میں عالموں اور ودوانوں تک محدود نہ ہو بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا سکے۔

بات میں بات نکل آئی اور میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ آپ کے ساتھ میں بھی شری بابو کو سننے کا مشتاق ہوں۔ اس لیے ختم کرتا ہوں اور بیٹھنے سے پہلے نہایت مسرت کے ساتھ اس اردو نمائش اور ادارۂ تحقیقاتِ اردو کے کتب خانے کا افتتاح کرتا ہوں۔

تعلیم اور روایتی قدریں

(انڈین نیشنل کمیشن کا جو مرکزی وزارت تعلیم نے یونسکو کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے بنایا ہے۔ سہ روزہ اجلاس پچھلے ماہ ۲۶ ستمبر کو نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس ادارہ کے متعلق ایک تعارفی مضمون "تعلیمی مسائل" کے تحت شائع کیا جا رہا ہے۔ اجلاس کے آخری دن "تعلیم اور روایتی اقدار" کے عنوان سے ایک سمپوزیم ہوا تھا، جس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ نے فرمایا تھا۔ اس افتتاحی خطبہ کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب نے شروع میں "افتتاحی رسم" کے روز افزوں رواج پر اپنے مخصوص انداز میں لطیف طنز فرمایا تھا، مگر ہم صرف وہی حصہ شائع کر رہے ہیں، جو اصل موضوع سے متعلق ہے۔ اس سلسلے کی بعض دوسری تقریروں کے ترجمے بھی آئندہ اشاعتوں میں شائع کیے جائیں گے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے املا کرایا ہے۔)

آپ حضرات اس سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم میں روایتی اقدار کی کیا اہمیت ہے بہتر ہے کہ پہلے ہم ان الفاظ کے معنی کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لیں، جو اس سوال میں استعمال کیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ نوع انسانی کا ہر فرد تین طرح کے وظائف انجام دیتا ہے۔ جسمانی یا نباتی، دماغی یا حیوانی اور ذہنی یا روحانی، جنھیں ہم مخصوص انسانی وظائف کہہ سکتے ہیں۔ جسمانی اور دماغی وظائف کا اظہار پہلے ہوتا ہے۔ ان کے انجام دینے میں بچے کو پہلے پہل آسودگی یا ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بعض چیزوں، بعض کاموں کو پسند اور بعض کو ناپسند کرنے لگتا ہے، گویا وہ ان کی قدر کا تعین کرتا ہے۔ یہ منفی یا مثبت قدر کا احساس ذہنی نشوونما کی بنیاد ہے۔ جب بچے کے حافظے میں احساس قدر کے تجربوں کا ذخیرہ جمع ہونے لگتا ہے، تو اس کی ذہنی زندگی ترقی کی ایک اہم منزل طے کرتی ہے' یعنی وسائل و مقاصد کا شعور بیدار ہو جاتا ہے، مگر یہ اقدار، جن کا شعور نشوونما کی ان ابتدائی منزلوں میں ہوتا ہے، سراسر حسی یا مادی ہوتی ہیں۔ بچپن کی میزان قدر میں صرف خوشگواری یا ناگواری آرام یا تکلیف، جسمانی آزادی یا جسمانی بندش، حسی لذت یا حسی کوفت کا احساس

تولا جاتا ہے۔ ابھی تک اس میزان کی سطح انسان کے یہاں کم بیش وہی ہوتی ہے، جو اونچے درجے کے جانوروں کے یہاں۔ افسوس ہے کہ بعض انسان اسی سطح پر ٹھہر کر رہ جاتے ہیں۔

مگر طبعاً فردِ انسانی کے اندر ایک تیسری قسم کے وظائف یعنی ذہنی اور اخلاقی عمل بھی ظہور میں آتے ہیں۔ ان وظائف کے انجام پانے سے بھی کچھ قدروں کا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ قدریں کچھ اور ہی طرح کی ہیں۔ دونوں کی نوعیت میں جو فرق ہے، اس کو ظاہر کرنے کے لیے ایک طرف حق، حُسن، خیر، قدس اور عدل کا اور دوسری طرف جسمانی صحت، حسّی لذّت، مادی منافع یا جنسی محبت کا نام لے دینا کافی ہے۔ تعلیم فردِ انسانی کی مکمل نشو و نما کا ذریعہ ہے۔ اُسے انھیں مخصوص انسانی اقدار سے سروکار ہے، جو اقدارِ عالیہ مطلقہ کہلاتی ہیں۔ تعلیم کا سب سے بڑا اور سب سے مقدم موضوع فرد اور اس کی مخصوص انسانی قدر ہے۔ تعلیمی عمل یہی ہے کہ وہ شعورِ اقدار کو جو فرد کے اندر بالقوۃ موجود ہوتا ہے، تہذیبی اشیاء کے ذریعے سے قوت سے فعل میں لائے۔ یہ تہذیبی اشیاء خود کسی فرد یا جماعت کی ذہنی کوشش کی پیداوار ہوتی ہیں۔ چنانچہ تعلیم کو بجا طور پر معروضی تہذیب کا فرد کے اندر نئے سرے سے موضوعی زندگی پانا کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اسے معروضی ذہن کا موضوع بن جانا کہہ سکتے ہیں۔ سچی تعلیم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ان دونوں میں مناسبت اور مطابقت ہو۔ صحیح تعلیم یہ نہیں ہے کہ متعلم کو کسی مقررہ سانچے میں ڈھال دیا جائے، جو فلاں اسکیم یا فلاں منصوبے کی رو سے ضروری سمجھا گیا ہے۔ تعلیم نام ہے متعلم کے انفرادی نفس میں مخصوص انسانی صلاحیتوں کے بیدار ہونے اور نشو و نما پانے کا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی تعلیمی ادارہ جو اپنے خیال میں بچے کے خالی ذہن میں تھوڑی سی یا بہت سی معلومات بھر دیتا ہے، دراصل اسے تعلیم نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نظریے کا ٹھونس دینا تعلیم نہیں کہلاتا۔ تعلیم وہ عمل ہے، جس کے ذریعہ ذہن کو زیادہ سے زیادہ نشو و نما کا جو اس کے لیے ممکن ہے، موقع ملے اور وہ صرف انھیں تہذیبی اشیاء کے سابقے سے ہو سکتی ہے، جو اُسی قسم کے ذہنوں کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہیں اور جن کے اندر کچھ معروضی اقدار موجود ہیں۔ یہ اقدار تہذیبی اشیاء میں اس طرح پیوست ہوتی ہیں کہ جب کوئی ذہن جو ان سے مناسبت یا مشابہت رکھتا ہے، انھیں حاصل کرتا ہے یا اسے ان کا ادراک یا معرفت یا تجربہ ہوتا ہے، تو خود اس ذہن کے اندر یہ اقدار جاگ اٹھتی ہیں اور اس کی اخلاقی نشو و نما کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان اقدار کے تجربے کے ساتھ ہی ان کی صحت و معقولیت، ان کے دوام اور ان کی قدرِ مطلق کا خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ انسان انھیں بے چوں و چرا تسلیم کر لیتا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اس کے نظامِ زندگی کو اس کے احساسِ قدر اور معیارِ قدر

کو اس کی پسند اور ناپسندیدگی اور اس کے عمل کے محرکات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔
سچی تعلیم یہی ہے کہ انفرادی ذہن کو ان مخصوص انسانی معروضی اور روحانی اقدار کا تجربہ کرایا جائے، تاکہ وہ اسے خود بخود اس بات پر مجبور کردیں کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے عمل میں اُسے حاصل کرے۔ یہ گویا ایک ایسی شمع جلانا ہے جو اندھیرے میں انسان کو راہ دکھائے اور وہ مضبوطی سے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ سکے۔ یہ شمع دراصل انسان کے مرکز وجود میں یعنی اس کے قلب میں روشن ہوتی ہے۔ تعلیم کو یہ شرف بخشا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کے سینے میں شمع کی جوت جگائے۔ اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے یعنی تہذیبی اشیاء ادب، آرٹ، سائنس، صنعت، مذہب، اخلاقی اور قانونی ضابطے اور خاص طور پر وہ پاکیزہ شخصیتیں جن میں ذہنی اور اخلاقی قوت نے مکمل شکل اختیار کرلی ہے۔

مگر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس قوت سے کام لینے کے لیے اس کا ذکر کردینا، اس کے بارے میں معلومات بہم پہنچا دینا کافی نہیں ہے، بلکہ زندگی میں اس کا تجربہ کرنے، اسے برتنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کا خاص کام یہی ہے کہ اس تجربے کا موقع بہم پہنچائے۔ تعلیم کو متعلم کے موضوعی ذہن اور اس معروضی ذہن کے درمیان جو تہذیبی اشیاء سے معمور ہے، یا دوسرے الفاظ میں فردِ انسانی اور انسانی تہذیب کے درمیان واسطہ بننا ہے۔

عملِ تعلیم کا مرکزی مسئلہ یہی ہے کہ یہ توسط کس طرح اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ یہاں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں، مگر میرے خیال میں بلاشبہ ایک بات کہی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس قسم کے موثر اور کامیاب توسط یعنی اچھی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ اس خیال کو ذہن سے بالکل نکال دیا جائے کہ محض معلومات، تجربے اور دریافت کا بدل ہوسکتی ہے۔ اگر نئی نسل کو اس چیز سے جسے ہم تہذیب کی روایتی اقدار کہتے ہیں، آشنا کرنے میں یہ رجحان غالب آگیا کہ ہم معلومات پر اکتفا کریں اور تجربے اور دریافت کو نظر انداز کردیں تو یہ اندیشہ ہے کہ تعلیم میں ناقابل برداشت سطحیت اور ریاکاری پیدا ہوجائے گی۔

روایتی اقدار کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں جس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو اقدار کے انتخاب میں خاص اہتمام کیا جائے اور دوسرے ایسی موثر تدبیروں سے کام لیا جائے کہ متعلم ان اقدار سے پوری طرح فیض اٹھا سکے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جن میں ان اقدار کا تجربہ کرسکے۔ جو اس کی اپنی ذہنی اور روحانی وضع نفسی سے مطابقت رکھتی ہیں۔

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ ہمیں اپنے بے شمار تہذیبی کارناموں میں سے جنھوں نے

معروضی شکل اختیار کرلی ہے، بڑی احتیاط سے مناسب انتخاب کرتا ہے۔ تاریخ وہ خزانہ ہے جس سے ہم اس تعلیمی مواد کا انتخاب کر سکتے ہیں، اس لیے کہ ہر قوم کی جڑیں اس کی تاریخ میں پیوست ہوتی ہیں اور وہ ماضی کی گہرائیوں میں پھیلتی جاتی ہیں تاکہ اسے مستقبل میں زیادہ سے زیادہ بلندی اور وقت کے سیل پیہم میں قرار و دوام حاصل ہو سکے۔ ٹیگور نے ایک جگہ کہا ہے:۔

میں نے تیری بے آواز آہٹ کو اپنی رگوں میں دوڑنے والے لہو میں محسوس کیا
اے ابد قرار ماضی!
میں نے تیری خاموش صورت کی جھلک دیکھی ہے۔
وقت کے پرشور قلب میں
تو اس لیے آیا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی ناتمام کہانی کو لکھے
خط مخفی میں ہماری زندگی کے اوراق پر
تو بھولے بسرے زمانے کو نئے سرے سے یاد دلاتا ہے۔
تاکہ اس کی روشنی میں نئے پیکر تراشے جائیں۔

یہ تو صحیح ہے مگر ماضی کی دولت بے شمار ہے۔ تعلیم کو اس میں سے انتخاب کرنا ہے اور یہی اس کی بڑی کٹھن ذمہ داری ہے۔ انتخاب کے معنی ہیں چھانٹنا اور چھانٹنے کے لیے کوئی اصول ہونا چاہیے۔ بعض لوگ قدیم کو انتخاب کریں گے، بعض جدید کو۔ بعض ہماری مرکب تہذیب اور مرکب قومیت کے ایک عنصر کو بعض دوسرے عنصر کو۔ ہماری میراث دراوڑوں، آریوں، عربوں، ترکوں، مغلوں اور یورپینوں کا عطیہ ہے۔ اس کی تخلیق میں ہندوؤں، بودھوں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں اور پارسیوں نے حصہ لیا ہے۔ ماضی کے وافر خزانے میں کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا اس پر موقوف نہیں کہ وہ قدیم ہے یا جدید ہے۔ وہ ہندوؤں کی ہے یا بودھوں کی، مسلمانوں کی ہے یا سکھوں کی عیسائیوں کی ہے یا پارسیوں کی، بنائے تمیز دراصل یہ ہے کہ ان میں سے کونسی اصلی ہے اور کونسی نقلی، کونسی عارضی اور کونسی دائمی، کونسی وقتی قیمت رکھتی ہے اور کونسی ابدی قدر کی حامل ہے۔ سماج کے سوچے سمجھے عمل یعنی تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ اس میراث کے وسیع سمندر کو کھنگال کر ان چیزوں کو نکالے جو ہماری نئی نسلوں کی اخلاقی اور روحانی غذا بن سکتی ہیں اور اسے ان کے سامنے دسترخوان پر چن دے۔ تعلیم کو تمیز کرنا چاہیے ان روایات میں جو زندگی کی جڑوں کو کمزور کرتی ہیں اور ان میں جو ان کو قوت پہنچاتی ہیں۔ صرف وہ روایات جو جاں بخش اور جانفزا ہیں ابدی اقدار کی حامل ہوتی ہیں اور تعلیم کا کام کرتی ہیں، جو نشو و نما اور ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہیں، وہ تعلیمی اعتبار سے محض بے کار ہی نہیں بلکہ مضر ہیں۔ فرد اور سماج دونوں کی زندگی کو منزل کی راہ دکھانے والی

صرف معروضی ابدی اقدار ہی ہیں ان کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ اقدار خود ہی اپنے از سرِ نو حاصل کیے جانے کا تقاضا کرتی ہیں اور برابر ترقی کی تحریک کرتی رہتی ہیں۔ میں نے "از سرِ نو حاصل کیے جانے" کا فقرہ جان بوجھ کر رکھا ہے۔ اس لیے کہ ان اقدار کا آخری اور قطعی طور پر حاصل کرنا کسی زمانے میں بھی ممکن نہیں ہے۔ قدر بجائے خود ابدی ہے، مگر ہر نسل کو بلکہ ہر فرد کو اسے اپنے طور پر تلاش کرنا اور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ہماری روایتی میراث جن ابدی اقدار کی حامل ہے ان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ماضی کے ٹھٹھرے ہوئے جامد جسم کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھیں، وہ تو زندگی اور حرکت بخشنے والی ہیں اور ہر نئی نسل کے دل میں یہ لگن پیدا کرتی ہیں کہ وہ انھیں نئے سرے سے حاصل کرے، تاکہ ایک نئی اور بہتر تہذیب کی تعمیر ہو سکے۔

ہمیں نئی نسل کو یہ بتانا چاہیے کہ ہماری تاریخ میں یہ معروضی قدریں کس طرح حاصل کی گئیں۔ ہمیں ایسے مواقع فراہم کرنا چاہیے کہ فرد کے شعور میں ایک یا ایک سے زیادہ قدروں کا تجربہ کرنے کی جو صلاحیت قدرتی طور پر موجود ہے، وہ قوت سے فعل میں آئے اور اسے ہر ممکن ذریعہ سے مدد دے کہ وہ اس قدر کو جس کا اسے تجربہ ہے، خود اپنی یا اپنے گرد وپیش کی زندگی میں حاصل کر سکے، چاہے وہ حق ہو یا حسن یا خیر یا قدس یا عدل۔ تبھی اس میں مخصوص انسانی صفات نشوونما پا سکتی ہیں، تبھی اس کی سچی تعلیم ہو سکتی ہے، اس لیے کہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے، سچی تعلیم یہی ہے کہ فرد کے شعور میں اقدارِ عالیہ کا احساس ان تہذیبی اشیاء کے اثر سے پیدا ہو، جو اقدار کی حامل ہیں۔

ہماری روایات ایسی تہذیبی اشیاء سے مالا مال ہیں۔ ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں ان کے تعلیمی اثرات ہماری نئی نسل پر پڑیں۔ خاص طور پر ایک قدر ہے، جس کی طرف ہماری قومی زندگی کے موجودہ دور میں غیر معمولی توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ عدل کی قدر ہے، جس کا ریاست کو حامل ہونا چاہیے۔ ہماری روایات ہمیشہ سے یہی رہی ہیں کہ ریاست دھرم یا اخلاقی قانون کی تابع ہو۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے ملک کے سارے بچّوں اور نوجوانوں کو اس اثر پذیر عمر میں تعلیمی اداروں کے ذریعہ اس قدر کا تجربہ ہو سکے۔ ریاست محض قوت واقتدار کی حامل ہونے کی حیثیت سے کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتی یہ ہمارے مزاج کا ایک جزو ہے۔ ہماری تاریخ کے بہترین صفحات کا ایک سبق ہے، ایک قیمتی میراث ہے، جو ہمیں اپنی تحریک آزادی کے عظیم رہنما سے ملی ہے کہ قوت کا استعمال محض جائز اخلاقی مقصد کے لیے ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنے آپ کو اس امن کے قیام کے لیے وقف کر دینا چاہیے، جو اخلاقی قدر سے حاصل ہوتا ہے مجھے امید ہے اور یقین ہے کہ ہم اپنی قومی زندگی کی منزل کے تصوّر کو ہمیشہ سامراجی

ملک گیری کے رجحان سے پاک رکھیں گے۔ ہم سامراج کے قدموں تلے سے نکلے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ان کا بوجھ کمر توڑ دیتا ہے۔ ہم ایسی اندھی وطن پرستی کو جو جنگ جوئی سکھائے کبھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیں گے۔ ہماری سعی یہ ہوگی کہ افلاس، جہالت اور بیماری کو دور کرکے وہ قلیل ترین شرائط فراہم کردیں جو ایک معمولی انسان کی طرح بسر کرنے کو درکار ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے سماجی نظام سے قبیح رسوم اور لا طائل اوہام کو خارج کردیں گے۔ اور اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ کوئی انھیں ہماری میراث کے نام سے قائم رکھنے کی کوشش کرے۔ ہم ہر قسم کی تنگ دلانہ اجتماعی خود غرضی کو، ہر قسم کی نفرت کو جو ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے ایک ذات کو دوسری ذات سے ہے، جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے اور یہ برداشت نہیں کریں گے کہ کوئی انھیں قومی روایات کہہ کر ان کی حمایت کرے۔ یہ سب کچھ ہم عدل وانصاف کی ان ابدی اقدار کی خاطر کریں گے جو ہماری قومی میراث کا جزو ہیں۔ ہم اس خدمت کو اخلاقی فرض سمجھ کر دل سے قبول کریں گے اور خوشی سے انجام دیں گے۔ ہم قوت اور عدل، صنعت اور اخلاق، عمل اور فکر ومراقبے کو ایک دوسرے کے ساتھ سمونے کی کوشش کریں گے۔ اس مشکل کام کو انجام دینے کی صلاحیت ہمارے اندر کس طرح پیدا ہوگی؟ اس طرح کہ تعلیم ان ابدی اقدار کے ذریعہ جو خود ہماری تہذیبی اشیاء میں مجسم ہوگئی ہیں، ہمارے اندر ان قدروں کو بیدار کردے گی اور وہ صرف ہماری ہی تہذیبی اشیاء سے کام نہیں لے گی، بلکہ بقیہ نوع انسانی کی تہذیبی میراث سے بھی، خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کی ہو، اس لیے کہ ہم اس کا دل سے احترام کرتے ہیں اور اس طرح اس کے وارث بن جاتے ہیں۔

ہماری تعلیم حیات انسانی کے اور اہم وظائف کی طرح، اس کڑی کا کام دے گی جو ابدی زندگی اور زمانی زندگی، روحانی بیداری اور فنّی کارکردگی، اخلاقی عقیدے اور مادی فلاح کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابدیت، روحانیت اور اخلاق کے مفہوم کو الفاظ میں ضبط کرنا مشکل ہے۔ مگر جو کچھ بھی ہو تعلیم کا فرض اولین ان میں اقدار کا شعور پیدا کرنا ہے۔ اس فرض کو وہ تہذیبی اشیاء مناسب انتخاب سے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کا سب سے موثر ذریعہ یہ ہے کہ خود معلموں میں ان ابدی اقدار کے جیتے جاگتے مظہر موجود ہوں، ماضی اور حال کی حقیقی شخصیتوں میں اخلاقی عظمت کے نمونے دکھائے جائیں اور مشکل اور پیچیدہ حالات میں حق پسندانہ فیصلے کرنے کے قصے سنائے جائیں۔ ہندوستان کی تاریخی روایات ایسی شخصیتوں کے نور اخلاق سے منوّر ہیں اور مجھے امید ہے کہ آنے والے زمانے میں خود ہمارے تعلیمی ادارے ایسے معلموں سے خالی نہ ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ اب میں اس سیمینار کا افتتاح کرتا ہوں مجھے امید ہے کہ آپ کی مشاورت ہماری تعلیم کی بہت سی اہم گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دے گی۔ میں آپ کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ جے ہند۔

فرقہ وارانہ جنون

راج بھون، پٹنہ

۲۲؍اپریل ۱۹۵۹ء

مخدوم محترم، السلام علیکم

گرامی نامہ کئی روز ہوئے مل گیا تھا، جواب میں تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ ۴۷ء میں جالندھر اسٹیشن پر جو گزری اس کا حال کیا لکھوں۔ مختصر یہ کہ قید حیات سے رہائی کی ایک صورت نکلی تھی وہ بھی یوں ہی گزر گئی! تاریخیں مجھے یاد نہیں رہتیں، لیکن غالباً اگست کا مہینا تھا۔ ۱۵ یا ۱۶ کو اعلان آزادی کے بعد میں نے کشمیر کے سفر کا قصد کیا۔ کئی ہفتے سے بیمار بیمار سا تھا۔ کام میں جی نہ لگتا تھا، نیند نہ آتی تھی۔ طبی مشیروں نے کہا کہ کچھ دن مکمل آرام کرو۔ آرام کیسے کرتا اور کہاں کرتا۔ کئی دوستوں نے انتظام کر دینے کو کہا مگر جی انھیں تکلیف دینے کو نہ چاہا۔ آخر میں ایک دوست نے لکھا کہ کشمیر میں ایک کشتی کا انتظام کر لیا ہے۔ ایک ملازم کو اگر ساتھ لے آؤ تو پھر کوئی آدم زاد کشتی میں نہ پہنچ پائے گا۔ یہ اس لیے کہ میں اپنی بیماری میں کچھ مردم بیزار ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک ملازم کو ساتھ لیا اور کشمیر کے قصد سے نکل کھڑا ہوا۔ دہلی کے اسٹیشن پر پہنچا تو دیکھا کہ کچھ سناٹا سا ہے۔ مجھے پہنچانے ایک دوست جامعہ سے ساتھ گئے تھے۔ انھوں نے ادھر ادھر پوچھ کر مجھ سے آکر کہا گاڑی سُنا ہے کہ جالندھر سے آگے نہیں جائے گی۔ آگے گڑبڑ ہے۔ میں نے کہا جالندھر ہی میں دو چار روز قیام کر لوں گا۔ وہاں بھی دو ایک جاننے والے ہیں۔ ان غریب نے اصرار نہ کیا اور گاڑی چل دی۔ گاڑی خالی تھی۔ میں نے بستر کر لیا اور ایک کتاب نکال لی، لیٹ کر پڑھنے لگا۔ اسی میں شاید سو گیا۔ وقت دن کا تھا۔ لدھیانہ کے قریب ڈبے میں کچھ لوگ آئے۔ مجھے دیکھ کر کچھ ٹھٹکے۔ مسلح تھے۔ آپس میں

ذاکر صاحب کا یہ خط علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔ یونیورسٹی اور لائبریری کے شکریے کے ساتھ اسے یہاں شائع کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام مکتوب

کچھ باتیں کرتے رہے، جو مجھے اکھڑی اکھڑی لگیں۔ ایک اسٹیشن پر پاس کے ایک ڈبے سے ایک مسلمان واقف میرے پاس آئے۔ وہ جالندھر جا رہے تھے۔ سرکاری ملازم تھے اور تقسیم کے بعد پاکستان جانے سے پہلے اپنے گھر جا رہے تھے۔ بندۂ خدا اس قدر پیے ہوئے تھا کہ باتوں سے وحشت ہوتی تھی۔ مگر وہ میرے پاس آ بیٹھے۔ جب معلوم ہوا کہ کشمیر جا رہا ہوں تو بولے کہ ،، جالندھر سے آگے کیسے جاؤ گے۔ جالندھر میں اُتر لینا، میرے ساتھ ٹھہرنا۔ والدہ اُرد کی دال لاجواب پکاتی ہیں۔ وہ آپ کو کھلواؤں گا اور مسلم لیگ کے صدر کو بھی بُلا لوں گا۔ آپ دونوں کا مباحثہ ہوگا اور ہم مزے سے سنیں گے۔" مجھے ان کے اس پروگرام سے کچھ زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ گفتگو سُن کر ایک ہندو مسافر نے کہا کہ آپ کشمیر جانا چاہتے ہیں تو لدھیانہ میں گاڑی بدل لیں۔ وہاں سے فیروز پور کی طرف سے ابھی گاڑی جاتی ہے۔ لدھیانہ آیا تو میں اپنے ڈبے سے اُترا۔ اسٹیشن کا رنگ کچھ عجیب تھا۔ خاصا مجمع، لوگ پریشان اور سراسیمہ اکثر کے پاس پستول، باقی کی کمر میں تلواریں۔ میں اُتر کر پُل پر ہو کر اسٹیشن ماسٹر کے دفتر گیا۔ پوچھنے پر کہ وہ فیروز پور والی گاڑی کب ملے گی، اس بندۂ خدا نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ " وہ گاڑی تو آج سے بند ہے، جالندھر چلے جاؤ، وہاں تمہارا انتظام ہو جائے گا۔" اس آدمی کو یقیناً معلوم تھا کہ جالندھر میں کیا ہو رہا ہے اور جالندھر اسٹیشن پر مسلمان کس طرح قتل کیے جا رہے ہیں۔ بعد کو سمجھ میں آیا کہ اس نے " انتظام " کا لفظ خاص معنوں میں بولا تھا۔ میں مایوس گاڑی پر لوٹ آیا۔ وہ دوست اپنے ڈبے کے سامنے کھڑے کچھ پی رہے تھے، فوراً میری طرف لپکے اور فرمایا کہ طبیعت کچھ خراب ہے، دست ہو رہے ہیں، اس لیے دوا پینے گیا تھا۔ اب دیکھا کہ ان کے ساتھ ان کا ایک لڑکا بھی ہے، کوئی بارہ برس کا۔ لڑکے کو اپنی جگہ پر چھوڑ وہ میرے پاس آ گئے، اور نہ جانے کیا کیا بکتے رہے کہ اتنے میں جالندھر آ گیا۔ پلیٹ فارم بالکل خالی خالی نظر آیا اور اس پر فوج کے سپاہی قابض دکھائی دیے۔ ہم لوگ اُترے تو میرے ان بدحواس رفیق نے کہا کہ ہو نہ ہو ہڑتال ہے۔ میں جاتا ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس میرا دوست ہے اور قریب ہی رہتا ہے، اس کی موٹر منگاتا ہوں، یہیں ٹھہریئے۔ میں وہیں سامان کے پاس کھڑا رہا۔ میرے پاس میرا ملازم تھا اور ان رفیق کا لڑکا۔ ایک ہی دو منٹ کھڑے ہوئے گزرے تھے کہ ہمارے قریب کچھ فاصلے پر ۵ ۔ ۷ آدمی جمع ہو گئے۔ کچھ پہلوان نما بڑی بڑی مونچھیں، پنجابی وضع کی لنگی باندھے اور ننگے سر۔ چند منٹ انھوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا پھر میری طرف بڑھے کہ چلیے ہم سامان لے چلیں۔ میں نے کہا میرے ساتھی باہر گئے ہیں۔ ابھی آتے ہوں گے تو چلیں گے۔ میں اپنی سادہ دلی میں سمجھا کہ قلیوں کی ہڑتال ہے اس لیے یہ شاید سیوا سمتی کے رضاکار ہیں۔ مسافروں کی مدد کے لیے آ گئے ہیں۔ میرے یہ کہنے پر وہ ٹھٹک گئے مگر چند لمحوں ہی میں ان کے سردار نے کہا ،، سامان چکو،، جس کے معنی غالباً ہیں

سامان اٹھاؤ۔ یہ پنجابی لغت اس وقت ذہن نشین ہوا تھا اور اب تک یاد ہے! چنانچہ سامان اٹھالیا اور دروازے کی طرف بڑھنے ہی کو تھے کہ میرے رفیق لوٹ آئے اور بولے "یہ سامان کہاں لے جارہے ہو۔ باہر تو غضب ہے، گاڑی ملی نہیں۔ ٹیلی فون کٹ گیا ہے" سردار نے بڑے اعتماد سے کہا۔ " سامان تو جائے گا" میرے مدہوش رفیق نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کے ایک چانٹا رسید کیا۔ مجھے ان کی یہ حرکت بہت بری لگی۔ مگر اس سے آنکھوں کے پردے ہٹ گئے۔ فوراً اس نے ایک بڑا چاقو نکالا اور فوجیوں سے کہا کیا دیکھتے ہو۔ دو فوجیوں نے اپنی بندوقیں میرے رفیق کے سینے پر تان دیں۔ سردار نے اپنا چاقو پھر کمر میں کھونس لیا۔ اب معلوم ہوا کہ ہم تو قیدی ہیں اور یہ فوج اس سردار کے حکم پر چلتی ہے۔ اب سامان تیز تیز آگے جارہا، اور ہم آہستہ آہستہ اس حلقے میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ سردار نے میرے قریب آکر کہا جو روپیا پاس ہو دے دو۔ میں نے کہا " روپیا میرے پاس نہیں۔ جو ہے بکس میں ہے! اس نے کہا " بکس تو قابو کر لیا ہے" یہ راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں اور قدم آہستہ آہستہ مقتل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے سامان والے تو غائب ہو گئے، صرف یہ جلوس رہ گیا۔ دروازہ کوئی بہت دور نہ تھا۔ ہوگا، دس گز فاصلے پر۔ مگر ایسا معلوم ہوا کہ بڑی مسافت طے کر لی ہے۔ جلوس دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ ایک ہندو صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور چلا کر کہا " ڈاکٹر صاحب، آپ کہاں جارہے ہیں؟" میں نے کہا " باہر جارہا ہوں، سامان تو گیا" انھوں نے کہا " باہر تو قیامت ہے، آپ ادھر آئیے" اور بلا مبالغہ مجھے اس قطار میں سے گھسیٹ لیا اور اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں جو سامنے ہی تھا لے گئے۔ اسٹیشن ماسٹر ایک سکھ صاحب تھے، ان ہندو دوست نے ان سے بتایا کہ یہ فلاں آدمی ہیں، مگر اس بندۂ خدا نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ مگر نندن لال کپور نے مجھے آفس کی ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود باہر گئے۔ وہ باہر نکلے ہی تھے کہ دو سکھ ملنگ دو دھاری تیغ لیے ہوئے آفس کے دروازے پر آکھڑے ہوئے۔ ایک ایک طرف ایک دوسری طرف اور جب میری آنکھ ان سے مل جاتی مجھے اشارہ کرتے کہ باہر آؤ۔ مگر میں " بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے" اتنے میں میں نے دیکھا کہ کپور صاحب کسی سکھ فوجی افسر سے گھبرا گھبرا کر باتیں کر رہے ہیں۔ پھر یہ دونوں دفتر میں آئے۔ افسر نے مجھ سے کہا " ڈاکٹر صاحب، میرے ساتھ آئیے" میں فوج کے سپاہیوں کا رویہ چند منٹ پہلے دیکھ چکا تھا۔ میں سمجھا کہ اب یہ اس کام کو باضابطہ طور پر انجام دینے کے لیے آئے ہیں۔ لیکن انھوں نے دو ایک جملے ہی کہے تھے کہ میں سمجھ گیا کہ میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرا ملازم، میرے ایک ساتھی اور ان کا لڑکا اور میرا سامان اگر مل جائے تو اچھا ہو۔ انھوں نے دو سکھ سپاہیوں کو میرے پاس میری حفاظت کے لیے کھڑا کیا اور خود ادھر ادھر دوڑے پھرے۔ تینوں

ساتھیوں کو لے آئے اور آکر کہا کہ سامان کو اب میں نہیں ڈھونڈوں گا۔ اس میں آپ کے لیے خطرہ ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ کو یہاں سے کسی محفوظ جگہ لے جاؤں۔ میں نے کہا بسم اللہ۔ اب وہ ہم ہم کے قافلے کو ساتھ لے کر باہر چلے۔ باہر کی رونق کا کیا کہنا۔ سیکڑوں مسلح آدمی جمع تھے۔ ایک شخص سفید وردی میں تھا جیسے ان کا سردار ہو۔ لاریوں میں لکڑیاں لدی کھڑی تھیں تاکہ لاشوں کو ساتھ کے ساتھ جلا دیا جائے۔ جگہ جگہ انگاروں اور راکھ کے ڈھیر تھے۔ اس مجمع کا ایک حصہ ہماری طرف بڑھا۔ آگے آگے وہ سفید پوش سردار۔ ہمارے مہربان کیپٹن گردھیان سنگھ نے اپنی اسٹن گن سنبھالی اور مجمع سے کہا قریب نہ آنا۔ لوگ رک گئے۔ البتہ اس سردار نے گفتگو جاری رکھی اور کہا "آپ انھیں یہاں لینے کیوں آئے؟" انھوں نے کہا کہ "میں لینے نہیں آیا تھا۔ میں ایک دوسرے کام سے آیا تھا۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو میں نے انھیں اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔" اس نے کہا "انھیں ہمیں دے دیجیے۔" انھوں نے کہا "تمھیں شرم ... نہیں آتی تم سکھ ہو اور ایک سکھ سے کہہ رہے ہو کہ ان شریف آدمیوں کو دھکا دو۔" اس نے کہا "اچھا تو آپ اپنا وعدہ پورا کر دیجیے۔ انھیں آگے شہر میں چوراہے پر چھوڑ دیجیے۔" انھوں نے کہا "میرا جہاں جی چاہے گا چھوڑوں گا۔" یہ گفتگو کرتے کرتے وہ ہمیں ساتھ لیے اپنی اسٹیشن ویگن کے پاس پہنچ گئے۔ ہمیں اس میں بٹھایا اور خود اس سردار کو اپنے ساتھ لے جاکر اس کے ساتھیوں تک پہنچا دیا۔ اس وقفے میں ویگن کے شوفر نے جو ایک بلوچی مسلمان تھا مجھ سے کہا "یہ آدمی ٹھیک ہے، آپ کو دھوکا نہیں دے گا۔" شاید خوف میں حواس کند ہو جاتے ہیں یا کیا، میں سب کچھ سن اور سمجھ رہا تھا لیکن کچھ ایسا لگتا تھا کہ یہ سب مجھ سے متعلق نہیں ہے۔
گردھیان سنگھ دوڑ کر واپس آئے اور شوفر سے کہا "چلو، تیز چلو۔" اب جو گاڑی چلی تو وہ ہمارے رفیق جن کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور ایسے سہم گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے بھی زیادہ بے حس ہیں، بولنے لگے "ادھر کہاں لیے جاتے ہو، میرا گھر تو دوسری طرف ہے، میری ماں نہ معلوم کس حال میں ہوگی، موٹر کو ادھر موڑ لو۔" گردھیان سنگھ نے کہا "بھائی صاحب، میں آپ کو جانتا نہیں ہوں۔ میں ان ڈاکٹر صاحب کو لے کر جا رہا ہوں، آپ ساتھ چلتے ہیں تو چلیے۔ ورنہ یہیں سڑک پر اتار دوں گا۔" بولے "اتار دو، اتار دو۔" میں نے روکا اور لڑکے سے کہا کہ انھیں اترنے نہ دینا۔ کچھ دور چلے تھے کہ رفیق پھر چونکے۔ "یہاں تو اتار دو۔ یہ تو میرے دوست کا گھر ہے۔" گردھیان سنگھ گھر کو پہچانتے تھے۔ وہ مسٹر بیدی کا گھر تھا جو جالندھر میں سیشن جج تھے۔ کہا اچھا "اتر جاؤ۔" لڑکے سے میں نے کہا کہ تم میرے ساتھ رہو۔ لڑکا نہیں اترا۔ وہ لڑکے کو چھوڑ چل کھڑے ہوئے۔ یہ بیدی صاحب کے پچھواڑے اترے تھے۔ گردھیان سنگھ نے مجھ سے کہا "نہ معلوم یہ اللہ کا بندہ بیدی صاحب تک پہنچے گا بھی یا نہیں۔ یہاں تو ادھر کھڑکیوں میں سے لوگ گولیاں چلا رہے ہیں۔" اور موڑ لے کر وہ گاڑی بیدی صاحب کے دروازے پر لے گیا۔ رفیق وہاں پہنچ چکے تھے اور میرا حال بیان کر رہے

تھے۔ بیدی صاحب مجھے جانتے تھے۔ ایک دفعہ جامعہ بھی آئے تھے اور تفصیل سے سب کام کو دیکھا تھا۔ وہ گاڑی کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئے اور مجھ سے کہا "آپ یہیں ٹھہریے"۔ گردھیان سنگھ نے کہا "بیدی صاحب، دوستی تو ٹھیک ہے۔ آپ کے پاس حفاظت کا سامان بھی ہے؟" انھوں نے کہا "میرے پاس فوج کا ایک دستہ ہے۔ یہ یہاں محفوظ رہیں گے"۔ گردھیان سنگھ نے مجھے، لڑکے اور ملازم کو وہاں اُتار دیا اور ہم سے رخصت ہو گئے۔ بیدی صاحب اور ان کی بیوی نے بہت خاطر کی اور کہا جب تک آپ ہمارے یہاں رہیے، وغیرہ وغیرہ۔ حضرت رفیق نے اب تو بہت ہی شور مچایا کہ مجھے گھر پہنچوائیے۔ بیدی صاحب نے تین فوجی سپاہیوں کو ساتھ کر کے اپنی گاڑی میں انھیں گھر بھیجا۔ ان کا لڑکا میرے ساتھ ہی رہا۔ بیدی صاحب کو جانتا تھا۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ اس بچے کو کہاں لے جاؤ گے۔ بیدی صاحب کی چھت پر سے عجیب ہولناک مناظر دیکھے۔ ہر طرف جلتے ہوئے مکان، ان کے قریب ہی بڑی بڑی کوٹھیاں جل رہی تھیں۔ بیدی صاحب دل سے شرمندہ اور رنجیدہ تھے مگر کہتے تھے کریں کیا۔ پاس ہی ایک کوٹھی تھی۔ کہا "اس میں پولیس کا افسر ہے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ۔ پرسوں لاہور سے آیا ہے۔ اس کے بھائی کو وہاں قتل کر دیا گیا۔ اس کا سب مال و اسباب لوٹ لیا اور یہاں بالکل ننگا مادر زاد پہنچا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے چارج لیا۔ اب یہ ان جلتے ہوئے مکانوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے آتش بازی ہو"۔ یہ سب دیکھنے کے بعد میرے غبی ذہن نے سمجھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ جب بیدی صاحب نے صبح پھر کہا کہ جب تک چاہیے یہاں رہیے تو میں نے کہا "بیدی صاحب، اگر کسی طرح ممکن ہو تو مجھے دہلی واپس کرا دیجیے"۔ انھوں نے کہا "تو پھر جلدی کرنا چاہیے، آج ہی واپسی ہو تو ٹھیک ورنہ نہ معلوم راستے کا کیا حال ہو"۔ میں نے کہا "ہاں، میں واپس جاؤں گا"۔ بیدی صاحب نے فوجی سپاہیوں کے ساتھ مجھے جالندھر چھاؤنی پر (شہر پر نہیں جہاں ایک دن پہلے ایک دل چسپ کام ناتمام رہ گیا تھا) پہنچوایا۔ ٹکٹ کے پیسے میرے ملازم کے پاس نکل آئے، اس لیے ان سے لینا نہ پڑے۔ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ جب تک گاڑی چلی نہیں وہ سپاہی دروازے پر پہرہ دیتے رہے۔ بالآخر گاڑی چلی۔ ساری گاڑی ان لوگوں سے بھری تھی جو لاہور اور نواح سے لُٹ کر بھاگ رہے تھے۔ اُن کی باتیں سُن کر رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ کسی کی بہن ماری گئی، کسی کا باپ، کسی کا بھائی۔ کسی کی بیوی بھگا لے گئے۔ میں سنتا تھا اور حیرت کرتا تھا کہ یہ مجھے مار کیوں نہیں ڈالتے۔ گفتگو میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے لاہور سے بھاگنے سے پہلے پروفیسر برج نرائن بھی قتل ہو چکے تھے۔ یہ معاشیات کے مشہور پروفیسر تھے۔ پاکستان کے حامی تھے اور مجھے ان سے شخصی نیاز حاصل تھا۔ بڑے نیک دل اور لائق آدمی تھے۔ میں سوچتا تھا کہ اگر یہ لوگ مجھے برج نرائن کے بدلے میں مار دیں تو میرے پاس تو کوئی معقول وجہ شکایت بھی نہ ہو گی۔ لدھیانہ گاڑی پہنچی تو وہاں اسٹیشن پر

ایک قیامت برپا تھی۔ مار دھاڑ تو نہ تھی لیکن ایسی وحشت اور ایسی نفسا نفسی کہ الامان۔ چند منٹ بعد میرے ملازم نے آکر میرے کان میں کہا "میاں، وہ لوگ جو کل جالندھر میں ملے تھے وہ یہاں پلیٹ فارم پر ہیں اور آپ کو دیکھ کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔" میں نے سوچا شاید کل کا غیر مکمل کام آج پورا کریں! لیکن ہماری گاڑی کھڑی ہی تھی کہ دہلی کی طرف سے گاڑی پہنچی اور وہ لوگ اس میں بیٹھ کر جالندھر کی طرف چلے گئے۔ غالباً یہیں لدھیانہ میں ٹرین کو دیکھ لیتے تھے اور نظر میں مسلمان مسافروں کو کر لیتے تھے۔ پھر جالندھر پر ان کا استقبال کرنے، سامان "چکانے" اور باہر لے جاکر "انتظام" کرتے تھے۔ خیر، وہ تو چلے گئے لیکن ہماری گاڑی کوئی گھنٹہ بھر وہیں کھڑی رہی۔ معلوم ہوا کہ آگے راستے میں گاڑیاں لٹ رہی ہیں، اس لیے اسٹیشن ماسٹر نے انبالہ سے فوج بلائی ہے۔ جب تک وہ نہ آجائے گی گاڑی نہ چلے گی۔ یہ ایک گھنٹہ کیا عرض کروں کتنا طویل تھا۔ چاروں طرف لوگ رو رو کر اپنا دکھڑا کہہ رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر کسی کو دیکھ لیتے تو چلا کر بلاتے اور پوچھتے ہماری ماں کہاں رہ گئی، بہن پر کیا گزری، بھائی بھاگ پایا کہ نہیں، اور اپنے سوالوں کے عجیب درد انگیز جواب پاتے۔ اتنے میں ایک نوجوان باہر سے میرے ڈبے میں آیا اور میرے پاس آکر پوچھا "آپ ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں؟" میں نے سمجھا طلبی آئی۔ میں نے کہا "جی ہاں"۔ اس نے جھک کر میرے قدم چھوئے۔ میں نے کہا "بھائی یہ کیا کرتے ہیں آپ"۔ بولا "آپ تو میرے استاد ہیں"۔ میں نے کہا "میں نے پہچانا نہیں"۔ کہا "جی ہاں، آپ مجھے نہیں جانتے، میں آپ کو جانتا ہوں، آپ میرے استاد کے استاد ہیں، میں سوریہ کنت شاستری جی کا شاگرد ہوں۔ وہ آپ کے شاگرد ہیں۔ اکثر آپ کا ذکر کیا کرتے تھے۔" پھر بولا "آپ نے غضب کیا۔ آپ اس ٹرین سے سفر کر رہے ہیں، یہ تو سب پنجاب کے نکالے ہوئے لوگ ہیں۔" میں نے کہا "بھائی دہلی جانا ہے اور یہی ٹرین وہاں جاتی ہے، کل جالندھر آیا تھا آج واپس جاتا ہوں۔" اس نے دریافت کرنے پر اپنا حال سنایا۔ ایک کالج میں لکچرر تھا۔ اس کا مکان لٹ گیا تھا، سامان میں صرف ایک بنڈل ہاتھ میں لے کر بھاگا تھا اور بنڈل امتحان کی کاپیوں کا تھا۔ اس کی محبت اور ہمدردی کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ افسوس کہ اب اس کا نام یاد نہیں۔ نہ کبھی اس نے بعد میں اپنا احسان جتایا۔ وہاں میرے پاس اپنے دو ساتھیوں کو بٹھا گیا اور کہا کہ "آپ ٹرین سے نہ اتریں، جو ضرورت ہو ان لوگوں سے کہیں، یہ سب کام کریں گے۔ کھانا پانی جس چیز کی ضرورت ہو یہ اتر کر لا دیں گے۔ گاڑی نہ جانے کب تک کھڑی رہے اور پلیٹ فارم کا کچھ ٹھیک نہیں۔" ان دونوں جوانوں میں ایک چھبرا دیو، نامی آج کل دہلی کے سرکاری دفتر میں کام کرتا ہے اور مجھ سے برابر ملتا رہتا ہے۔ خدا خدا کرکے گاڑی چلی اور ہم دہلی پہنچے۔ میں اور میرا ملازم اور اس کے ہاتھ میں ایک خالی حیدر آبادی ہٹی اور "شامل بدھنا"۔

خط بہت طویل ہوگیا۔ لیکن آپ نے نہ جانے کس تعلق خاطر سے یہ سوال کیا تھا! مجمل جواب لکھنے کو جی نہ چاہا، جب یہ واقعہ یاد آتا ہے یا کوئی یاد دلاتا ہے تو اپنی کند ذہنی پر تعجب ہوتا ہے مگر نہ جانے کیوں افسوس نہیں ہوتا۔ شاید کند ذہنی سے لوگوں پر بھروسا کرنا ذہانت سے ان پر شبہ کرنے کی بہ نسبت مجھے زیادہ مرغوب ہے۔ واپسی پر دہلی میں جو دیکھا اس کے سامنے جالندھر کس شمار قطار میں تھا۔ کمینہ پن، بربریت اور سفاکی کے عجب مظاہر دیکھے۔ لیکن ہوتے ہوتے سب کے نقش مٹتے جاتے ہیں۔ یاد ہے تو یہ کہ ایک اجنبی ہندو، کپور صاحب، کسی سے سن کر کہ میں کون ہوں، ایک اجنبی سکھ افسر نے کپور صاحب سے سن کر، میری جان بچانے کے لیے اپنے کو خطرے میں ڈالا، بیدی صاحب جنھوں نے بھائیوں کی طرح اپنے ساتھ رکھا، اور اس شاگرد اور اس کے رفیقوں نے سفر میں ساتھ دیا۔ اپنی جان کے بچنے پر نہیں کہہ سکتا کہ خوش ہوں یا شرمندہ۔ دوبارہ یہ نعمت دی گئی اور اس سے کچھ کام نہ لیا، اس پر ندامت ہی زیادہ ہے۔ دعا فرمائیے کہ جو باقی ہے وہ ٹھیک کٹے اور خاتمہ بالخیر ہو۔

میں نے یہ روداد ذاتی طور پر آپ کے لیے لکھ دی ہے۔ اسے اپنے ہی تک رکھیں تو اچھا ہو۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، والسلام

نیاز مند

ذاکر حسین

ایک جنگ جو ہم نے نہیں چاہی تھی

ہر قوم کی زندگی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کے سب ذرائع اور ساری قوتِ عمل کسی عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وقف کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور جب اس مقصد میں اپنے اعتقاد کی پھر سے جانتے بوجھتے تصدیق کرنا لازمی ہوتا ہے۔ ہماری فوج اس وقت میدان میں ہے، ہمارے سپاہی اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور بہادری کے کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ ان کی لگن غیر مشروط ہے اور وہ سوال بھی نہیں کرتے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو یقین دلائیں کہ ہم دل وجان سے ان کے ساتھ ہیں اور جس طرح ہم ان کی عظیم قربانیوں کی قدر کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ جب بھی جواب دہی کا وقت ہوگا کہ ہم نے کیا سوچا اور کیا کیا تو اس وقت آنے والی نسلیں بھی ان کی اتنی ہی قدر کریں گی۔

یہ جنگ جس میں آج ہم برسرِ پیکار ہیں، یہ ہم نے نہیں چاہی تھی۔ بلکہ یہ ہم پر زبردستی عائد کی گئی ہے۔ جتنا بھی کوئی قوم کر سکتی ہے اتنی ہم نے کوشش کی کہ ہم اپنے امن کے عہد پر قائم رہ سکیں۔ ہم تہہ دل سے امن چاہتے تھے اور اس کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی۔ ہم نہ ہی کسی کا برا چاہتے ہیں، اور نہ ہی کسی کے علاقے کا ایک بھی انچ، ہاں ایک بھی انچ کی حرص کرتے ہیں۔ لیکن ہم اپنے ان اصولوں کی قربانی نہیں دے سکتے جن پر ہماری قومی زندگی اور مشترکہ تہذیب کا پورا فلسفہ مبنی ہے۔ اور اس کی ہی ہم سے مانگ کی جا رہی ہے! لیکن کشمیر نہ صرف ہندوستان کا حصہ ہے اور ایک بنیادی حصہ ہے، اور ہندوستان کا حصہ ہونے کی حیثیت سے وہ نہ صرف ہماری تہذیب، بلکہ انسانیت کی تہذیب کے اعلیٰ اصولوں کی نشان دہی کرتا ہے وہ دن ہماری زندگی کے اندھیرے دن تھے جب ملک کے بٹوارے کا مطالبہ ہوا اور اس بٹوارے کو آزادی ملنے کی منحوس شرط مانا گیا۔ اس کے مانگنے والوں نے اس کے ہولناک نتیجوں کو نظرانداز کر دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں سے دروغ

آل انڈیا ریڈیو کی تقریر بھارت کے باشندوں کے نام

بیانی کا مطالبہ کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ اس جھوٹ کی حمایت کریں کہ چونکہ وہ مسلمان ہیں لہٰذا وہ اُس ملک کے شہری نہیں رہ سکتے جس میں وہ لوگ رہتے تھے اور جن کے ساتھ نہ صرف وہ اور ان کے بھائی بہن پیدا ہوئے، پلے بڑھے، بلکہ جن کے ملے جلے رسم ورواج اور تہذیب میں صدیوں انھوں نے قابلِ قدر شرکت کی تھی۔ ان سے کہا گیا کہ وہ اپنے کو اکھاڑیں، اپنے گھر، سازو سامان، دوستوں اور نیک خواہوں، ہمسایوں اور بھائیوں اور تہذیب کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیں۔ اور اب ہم ہندوستانیوں سے، ہندو اور مسلمان، سکھ اور عیسائی اور پارسی، ہم سب سے جن کے لیے ہندوستان ہمیشہ ایک ... ملک، ہمارا ملک، ہمارا مسکن رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، ہم سب سے تلوار کی نوک پر کہا جا رہا ہے کہ ہم کو ماننا پڑے گا کہ کشمیر کبھی جائز طور پر ہندوستان کا حصہ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ زیادہ تر کشمیری مسلمان ہیں لہٰذا ان کا پاکستان کا حصہ ہونا لازمی ہے۔ لیکن نہ ایسا ہے نہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ آئیے، یہ وقت ہے کہ ہم اپنے اعتماد اور یقین کو پھر سے مضبوط کریں اور یہ یاد رکھیں کہ ہمارے بہت سے بہادر جوان، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور عیسائی صرف یہ ثابت کرنے کے لیے اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ہیں اور اپنے مشترک مفاد اور خیالات میں متحد ہیں، اور ہماری یہ وحدت ہر امتحان میں پوری اترے گی۔ ہمارے درمیان جو مسلمان ہیں، ان کو سوچنا چاہیے کہ وہ جہاں بھی ہیں خدا کی مرضی سے ہیں۔ لہٰذا ان کی ہندوستانی شہریت ایک اخلاقی اور روحانی پابندی ہے۔ ان کو چاہیے کہ وہ اسلام کے سچے اور مخلص علم بردار ہوں اور ہر طرح کا ڈر اپنے دل سے نکال دیں۔ کیونکہ ڈر خود غرضی اور نفرت کی جڑ ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے سیاسی اور سماجی ہنگاموں کا خطرہ ہو سکتا ہے ان کو آپس میں بھروسہ اور خوشنودی پیدا کرتی ہے، خدمت کرنا ہے برائے خدمت اور اس فانی زندگی سے دور اس دن کا سوچنا ہے جب وہ اپنے ہر عمل کے لیے جوابدہ ہوں گے کہ انھوں نے کیا کیا، اور کیا نہیں کیا۔ لہٰذا انھیں لوگوں کے درمیان امن، تعاون اور سمجھ داری کا پرچار کرنا چاہیے۔ ساتھ ساتھ مسلمانوں کے ساتھ، شہریوں کو بھی اس کے اس عہد، کوشش اور ذمہ داری کو سراہنا چاہیے، اور اس کی قدر کرنا چاہیے۔ اور ان کو بھی چاہیے کہ وہ سب تعصب اور تنگ مٹا کر اپنے اکثریت کے عقائد اور روایات کی نمائندگی کرتے ہوئے سب لوگوں کو خوش حالی کے کام میں متحد کریں۔

کسی قوم کی طاقت اس کی اندرونی ہم آہنگی سے نمایاں ہوتی ہے نہ صرف اس کے واضح مقصدوں سے بلکہ اس کے احساسات سے بھی۔ احساس ہمیں فطرت سے حاصل ہوتا ہے جس کو ہم بدل نہیں سکتے لہٰذا ہم کو خود بخود صحیح کام کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ یہ وقت ایسا ہے جب ہم کو اپنے رہنماؤں کی تائید کرنا چاہیے اور ان میں پورا بھروسہ اور اعتقاد رکھ کر ان کو

عمل کی مکمل آزادی دینا چاہیے۔ یہ وقت ہے جب ہماری ملک سے وفاداری کی قدریں خطرے میں ہیں لہذا ہمیں اپنے آپ کو یہ ثابت کرنے کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ اگر ہماری قومی ذات کا بنیادی اصول، اور اس کے تحت زندگی گزارنے کی آزادی ہی خطرے میں ہے تو اس کو بچانے کے لیے کوئی قیمت ادا کرنا کم ہے کیونکہ ان کے بغیر زندگی کی اخلاقی بھیم بے معنی ہے اور زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب کہ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کی ہمت افزائی کریں کہ سب اپنی بہترین خدمات پیش کریں۔ اور ہمدردی، خوشنودی اور ہم آہنگی سے یہ بات پختہ کریں کہ نہ صرف وہ اصول جو ہم عزیز رکھتے ہیں اور وہ جیت جو ہم نے حاصل کی ہے، بلکہ ہمارے دلوں کی اندرونی ہم آہنگی اور مقاصد بھی ہماری آنے والی نسلوں کو ورثہ میں مل سکیں گے۔

آئیے ہم تہہ دل سے عہد کریں کہ ہم تب تک نہ رکیں گے نہ آرام کریں گے جب تک ہمارے اصولوں کی سچائی ثابت نہیں ہو جاتی اور ہماری مادر وطن کی آزادی بلا شک و شبہ ایک حقیقت نہیں بن جاتی۔

قوم سے عہد

"منصفانہ اور دلکش سماجی نظام"

میری قوم نے ملک کے سب سے بڑے عہدے کے لیے میرا انتخاب کرکے مجھ میں اپنے اعتماد کا جو اظہار کیا ہے مجھے اعتراف ہے کہ اس کی مسرت کا زبردست احساس مجھ پر چھایا ہوا ہے۔ میرا یہ احساس اس لیے دوبالا ہو گیا ہے کہ مجھے یہ عہدہ ہندوستان کے عظیم ترین سپوتوں میں سے ایک ـــ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے بعد ملا ہے، جو میرے لیے رہنما، دانا حکیم اور دوست کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی زیر نگرانی مجھے پانچ برسوں تک کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ اگرچہ میں اُن کی پیروی کروں گا لیکن میری یہ توقع محال ہے کہ میں اُن کی مثال پر عمل کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکوں گا۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے عہدہ صدارت کو وہ ذہنی لوازمات، تبحر علمی اور تجربے کی دولت عطا کی جو خال خال نظر آتی ہے۔ ساری زندگی علم کی تلاش اور سچائی کی جستجو میں گزارنے کے بعد انھوں نے شاید سب سے زیادہ ہندوستانی فلسفیانہ خیالات کی تشریح اس انداز سے کی کہ سچی روحانی اقدار کی وجدانی حیثیت کھل کر سامنے آ سکے۔ انسان کی بنیادی انسانیت میں ان کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوا اور انسان کی پُر وقار اور منصفانہ زندگی کے لیے جدّو جہد سے انھوں نے کبھی منہ نہیں موڑا۔ تعلیم کے کاز کو آگے بڑھانے میں ان کی خدمات انمول ہیں۔ بحیثیت صدر اپنی امتیازی خدمات انجام دینے سے قبل بحیثیت نائب صدر اور پارلیمنٹ کے ایوان اعلیٰ میں انھوں نے دس سال تک قوم کی مثالی خدمت کی ہے۔ اور اب اپنی سبک دوشی کے ساتھ وہ پوری قوم کا تشکر اور محبت اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ہم ان کے لیے مدت دراز تک صحت و مسرت کی تمنا کرتے ہیں۔

میں آپ کو صرف اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ میں اس عہدے کو عبادت آمیز انکساری اور مکمل جذبۂ خود سپردگی کے ساتھ سنبھال رہا ہوں۔ میں نے دستور ہند سے وفاداری کی ابھی قسم کھائی ہے۔ یہ دستور مقابلتاً ایک نئی ریاست کا دستور ہے جو اس کے آزاد شہریوں نے تاریخ میں پہلی بار اپنے آپ کو دیا ہے۔ یہ ایک قدیم قوم کی نئی

۱۳ر مئی ۱۹۶۷ء

ریاست ہے جس نے ہزاروں سال اور مختلف النوع نسلی و علاقائی عناصر کی مشترکہ جدوجہد سے ان اقدار کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنی مخصوص شکل میں امر ہیں۔ اگرچہ قدروں کے تازہ احساسات میں نقص پیدا ہو سکتا ہے، جو بدلتے ہوئے حالات کا لازمی نتیجہ ہے، لیکن بنیادی اور دائمی طور پر وہ اٹل اور اٹمنٹ ہیں اور نئے شعور و احساس کا تقاضا کرتے ہیں۔ ماضی نہ تو مرتا ہے اور نہ ساکت ہوتا ہے۔ یہ زندہ اور متحرک رہتا ہے اور ہمارے حال کے معیار اور مستقبل کی امیدوں کی تشکیل میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ٹیگور نے اپنے منفرد انداز میں کہا ہے:

میں نے تمہارے پوشیدہ قدم اپنے خون میں محسوس کیے ہیں
اے میرے سرمدی ماضی
میں نے تمہارا ناموش چہرہ اس دن کے دل میں دیکھا ہے، جو مصروف گفتگو رہا ہے۔
تم ہمارے باپ کی نامکمل کہانیوں کو تقدیر کے صفحات میں
ایسے رسم خط میں لکھتے آئے ہو جو نظر نہیں آتا،
تم زندگی میں اُن دلوں کو لوٹانے آئے ہو جنھیں یاد نہیں
کیا گیا۔ تاکہ نئی صورتوں کی تشکیل ہو سکے۔

اس کی مستقل تجدید دراصل قومی کلچر اور قومی کردار کی نشو و نما کا عمل ہے۔ اور تعلیم کا اصل کام بھی یہی ہے، جیسا کہ مجھے نظر آتا ہے — مستقل اور مسلسل تجدید کا کام انجام دینا۔ اور میرے اس مفروضے کو معاف کیا جائے کہ میرا اس اعلیٰ عہدے پر آنا، اگر پورے طور پر نہیں تو خاص طور پر، دراصل اپنی عوام کی تعلیم سے طویل وابستگی کا نتیجہ ہے۔ میرے نزدیک تعلیم قومی مقصد کے حصول کا ایک خاص آلہ ہے اور اس کے تعلیمی معیار کو قوم کے معیار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا میں اپنے ماضی کے کلچر سے پوری طرح وابستہ ہوں وہ جہاں سے بھی آئے اور جس کسی کے ذریعہ بھی آئے اور میں اپنے ملک کے مجموعی کلچر کی خدمت کا عہد کرتا ہوں میں عہد کرتا ہوں بلا امتیاز علاقہ یا زبان، پورے ملک سے وفاداری کا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ بلا امتیاز ذات، رنگ یا عقیدہ میں پورے ملک کی عوام کی ترقی و توانائی اور فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کا۔ پورا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے باشندے میرا خاندان ہیں۔ اس ملک کے عوام نے کچھ مدت کے لیے اپنے خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے میرا انتخاب کیا ہے۔ میری پوری کوشش ہو گی کہ میں اس گھر کو مضبوط اور خوب صورت بناؤں، اسے ایک لائق گھر بناؤں اور عظیم انسانوں کے لیے جو منصفانہ، ترقی پسندانہ اور دلکش زندگی کے لیے بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ خاندان بڑا ہے اور بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے میدان اور اپنے اپنے طریقے سے زندگی کی تعمیرِ نو کے لیے کام کرتا ہے۔

یہ ملک اتنا بڑا ہے اور اس اعتبار سے اس کے آگے اتنے سارے کام ہیں کہ ہم میں سے کوئی شخص خاموش نہیں بیٹھ سکتا اور نہ تو ملک میں مایوسی اور ناکامی کو جڑ پکڑتے ہوئے ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ سکتا ہے۔ حالات ہم سے کام کا تقاضا کرتا ہے— کام، کام اور زیادہ سے زیادہ کام۔ خاموشی کے ساتھ مخلصانہ کام — اپنے ملک کی عوام کی مادی و ثقافتی زندگی کی تعمیر کے لیے مستعدی کے ساتھ ٹھوس کام!

یہ کام جیسا کہ میں دیکھتا ہوں، دو پہلوؤں کا حامل ہے — ایک اپنی ذات پر کام کرنا اور دوسرے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی سوسائٹی کے لیے کام کرنا۔ اپنے لیے کام کرنے کا مطلب آزاد اشخاص کی طرح اپنے اندر خود نظم و ضبط پیدا کر کے اخلاقی ترقی کے لیے کام کرنا۔

— اور صرف اسی سے ترقی کا عمل ممکن ہے۔ اس کا ماحصل آزاد اخلاقی شخصیت ہے۔ ہم اس ماحصل کو نظرانداز کر کے خطرات کو دعوت دیں گے۔

یہ ماحصل اپنے آپ کو برقرار نہیں رکھ سکتا جب تک یہ سوسائٹی کی بہتری کے لیے کام نہ کرے تاکہ ایک منصفانہ اور زیادہ دلکش زندگی سامنے آسکے اور جب تک سماج اجتماعی طور پر آگے نہ بڑھے اس وقت تک فرد بھی درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا ہمیں پختہ ارادوں کے ساتھ دل و جان سے دو طرح کے کاموں میں مصروف ہو جانا چاہیئے — انفرادی اور سماجی۔ ان دونوں محاذوں پر ہماری کوششیں زندگی کو نئی لذتوں سے آشنا کر سکتی ہیں۔

ریاست ہمارے لیے صرف اقتدار کا ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی ادارہ بھی ہے۔ یہ ہمارے قومی مزاج کا ایک حصہ اور جنگ آزادی کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی کا ورثہ ہے کہ قوت کو صرف اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ ہم قومی تقدیر کا کوئی ایسا تصور نہیں رکھتے جس میں توسیع پسندی کی خواہشات ہوں۔ ہم قومی تفاخر کے جذبے کو مٹانا چاہیں گے۔ ہم پسند کریں گے کہ اپنے تمام شہریوں کو ضروریات زندگی مہیا کریں۔ ہم اپنے تصور کے اعتبار سے دانشورانہ کاہلی اور سماجی انصاف کے تقاضوں سے بے اعتنائی کے خلاف جنگ کریں گے۔ یہ تصور تمام قسم کی تنگ نظری اور خود غرضی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا اور یہ تصور یہ سب کچھ اخلاقی فرض کے بطور انجام دے گا اور اخلاقی کاموں کی انجام دہی میں خوشی محسوس کرے گا۔

ہمیں اپنی قومی زندگی میں قوت اور اخلاق کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا — تکنیک کے ساتھ اخلاق، عمل کے ساتھ غور و فکر، مشرق کے ساتھ مغرب، سیج فرائڈ کے ساتھ بودھ کو۔ ہمیں اپنے ذہن میں دونوں قطبوں کو ساتھ رکھنا ہوگا — دائمی اور دنیاوی، بیدار ضمیری اور اعلیٰ ہنرمندی، یقین اور حصول کامیابی۔

مجھے اپنی قوم پر اعتماد ہے کہ وہ اس دوگونہ کام کو پورا کرنے کے لیے اپنے اندر توانائی پیدا کرے گی۔

یہ میرا ترجیحی حق ہے کہ میں اس دلکش مہم میں حصہ لوں۔

راستہ جو مہاتما نے دکھایا

"گاندھی صدی تیاری ہفتہ" کا افتتاح میرا ایک ترجیحی حق ہے۔
قومی کمیٹی، اس کی ۱۴ ذیلی کمیٹیوں نے پروگرام کا جامع خاکہ تیار کر لیا ہے۔ آئندہ ہفتہ سے چند پروگراموں کا آغاز ہوگا۔ ہر روز ان پروگراموں میں سے کسی نہ کسی پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ یہ موقع ہے کہ ہم ان پروگراموں کو اس جذبے کے ساتھ عملی جامہ پہنائیں جس طرح گاندھی جی ہم سے چاہ سکتے تھے۔

گاندھی جی کی نگاہوں میں کسی تعمیری پروگرام کا اصل مقصد مکمل سماجی اور اقتصادی آزادی تھی جس کے بغیر محض سیاسی آزادی کی حیثیت عوام کے نزدیک کسی کھوکھلی شئے جیسی ہوگی۔

ہم نے اقتصادیات کی زراعتی بنیاد کو کم قیمت بنا کر رکھ دیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہم شدید غذائی قلت کے شکار ہیں۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ خود کفالتی کے لیے ہم ایک کی جگہ دو گھاس اگائیں۔

انھیں کھادی اور گاؤں کی دستکاریوں میں دیہاتی آبادی کی قلیل آمدنی کو بڑھانے اور انھیں عزت و تحفظ دینے کا راستہ نظر آتا تھا۔

بہت سارے گاؤں میں زندگی کی بنیادی سہولتیں مثلاً پینے کا پانی میسّر نہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ گاؤں سے شہر کی جانب بڑی تعداد میں ہجرت کو روکا جائے اور شدید عدم توازن کی روک تھام کی جائے تو گاؤں میں تبدیلی لانی ہوگی اور شہری اور دیہاتی زندگی کا امتیاز کم کرنا ہوگا۔

چھوت چھات کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اسے قانون کی کتابوں میں غیر قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ لیکن اس کے آخری نشانات کو بھی ہمارے دماغوں اور روزمرہ

گاندھی صدی تیاری ہفتہ کا افتتاح کرتے ہوئے ۲ راکتوبر ۱۹۶۷ء کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی گئی۔

کی زندگی سے باہر نکالنا ہوگا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ عوامی زندگی میں بہتری آئے تو ہر قیمت پر شراب خوری سے نمٹنا ہوگا۔ شراب بندی کے ساتھ سماجی شعور بیدار کرنے اور فلاحی ترقی کے ساتھ تفریحی سہولتیں فراہم کرنے کی ضرورت پڑے گی۔

ملک میں فرقہ پرستی کی لعنت اکثر و بیشتر مختلف شکلوں اور بہانوں سے اپنا سر ابھارا کرتی ہے لہٰذا اگر سیکولر ریاست ہونے کے ہمارے دعوے کی کوئی حقیقت و اہمیت ہے تو ہمیں قوم کے تمام فرقوں کے درمیان اتحاد و ہم آہنگی قائم کرنا ہوگی۔

ہمارے نوجوان کبھی کبھی قابو سے باہر نظر آتے ہیں۔ اُن میں مایوسی، بے چینی اور عدم تحفظ کا احساس نظر آتا ہے۔ اور بعض اوقات ان میں نظم و ضبط کی کمی بھی نظر آتی ہے اور وہ تشدد پر اتر آتے ہیں نوجوان ملک کی امید ہیں۔ لہٰذا اگر ملک کا مستقبل محفوظ رکھنا ہے تو ان کی طاقت و صلاحیت کی اس انداز میں پرورش ہونی چاہیے اور انھیں ایسے کاموں میں لگانا چاہیے جو مفید اور بامقصد ہوں۔

گاندھی جی کی ولولہ انگیز قیادت میں ہماری عورتیں مردوں کے شانہ بہ شانہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور انھوں نے قربانی اور بہادری کی نئی سربلندیاں سر کر لی تھیں۔ ملک کی تعمیر نو کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتیں پھر مردوں کے قدم سے قدم ملا کر چلیں۔

ہماری جمہوریت اندرونی خطرہ کا شکار ہو جائے گی اگر غلطیوں کی اصلاح کے لیے ہم تشدد کا راستہ اختیار کرنے لگیں۔ گاندھی جی نے ہمیں بتایا تھا کہ نظم و ضبط کی پابند جمہوریت دنیا کی بہترین شئے ہے۔ لہٰذا رائے عامہ کی مؤثر تشکیل اور اس کے مہذب اظہار کو ہماری جمہوریت کی بنیاد بننا چاہیے۔

آج دنیا کھڑی چٹان کے کنارے پہنچ چکی ہے اور انسان کا وجود داؤں پر لگا ہوا ہے۔ بڑی عالمی طاقتوں کے درمیان خوف کے توازن نے اب تک دنیا کو نیوکلیائی تباہی سے بچا رکھا ہے۔ اور عالمی تباہی کے ان مہلک ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی پیداوار کے نتیجے میں ذراسی غلطی سطح زمین سے زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔ چنانچہ انسانیت کی نجات اور پائیدار امن کے قیام کے لیے لازمی ہے کہ ہم مہاتما جی کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ محبت کی روحانی طاقت ہی ایٹم بم کا اصل تریاق ہے۔

بابائے قوم کا جشن صد سالہ منانے، انھیں یاد کرنے اور اُن کے لیے اظہارِ عزت کرنے کا بہتر طریقہ ہے کہ ان اصولوں کے لیے انتھک مخلصانہ جدوجہد کی جائے جس کے لیے وہ جیے، کام کیا اور اپنی جان دے دی۔ اس کے لیے حکومت سے زیادہ ذمہ داری عوام پر عائد ہوتی ہے، اس لیے کہ حکومت اور حکمت عملیوں کی تشکیل عوام ہی کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ انھیں گاندھی جی سے غداری نہیں کرنی چاہیے۔

مارٹن لوتھر کنگ

مجھے اس موقع پر اپنی موجودگی سے خوشی ہو رہی ہے جس کا تعلق عالمی سطح کی دو عظیم شخصیتوں ــــ جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ جونیئر سے ہے۔

جواہر لال نہرو عالم انسانیت کے پرستار تھے اور جن کا تعلق ساری انسانیت سے تھا وہ نہ صرف قومی آزادی اور اتحاد کے زبردست حامی اور جدید ہندوستان کے معمار خصوصی تھے بلکہ وہ عالمی امن اور بین اقوامی سمجھوتے کے کاز کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے تھے۔ وہ ساری زندگی انسانی آزادی اور وقار کے لیے مصروف جنگ رہے، نہ صرف اپنے ملک کی عوام کے لیے بلکہ دنیا کی تمام قوموں کے لیے انھوں نے کہا تھا: ''کسی انسان کی موت بھی میرے اندر کمی کا احساس پیدا کر دیتی ہے اس لیے کہ میرا ناطہ پوری انسانیت سے ہے۔''

نہرو کے دماغ میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ ہندوستان کا قومی مفاد بین اقوامی امن و سمجھوتے کے لیے جہد مسلسل میں ہے۔ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ نے کہا تھا: ''نہرو نے یہ مثال قائم کی ہے کہ اگر یہ امن و جودیت پر بہادری کے ساتھ یقین و عمل کیا جائے تو بنی نوع انسان کو نہایت روشن امید نصیب ہوگی۔''

ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ نے بھی یقین، وعمل کی جرأت کے ساتھ اپنی عوام اور ساری دنیا کے پامال انسانوں کے لیے سماجی انصاف حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مارٹن لوتھر کنگ کی شناخت اگرچہ گاندھی جی ہی کی طرح صرف اپنے ملک کی عوام کے لیے جدوجہد کرنے والے کی حیثیت سے رہی، لیکن اپنے ہندوستانی گرو کی طرح ایک ایسا دل و دماغ رکھتے تھے جو رنگ، نسل اور عقیدے کے دائرے سے باہر نکل کر اپنا فرض انجام دینا

بین الاقوامی سمجھوتے کے لیے جواہر لال نہرو انعام پیش کرتے ہوئے جسے مسز کوریٹا کنگ نے اپنے آنجہانی شوہر ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کی جانب سے نئی دہلی میں ۲۴ر جنوری ۱۹۶۹ء کو وصول کیا۔

تھا۔ وہ گہرا سماجی شعور رکھتے تھے اور اپنے آپ کو اہنسا کے ساتھ وابستہ کر دینے کے سبب وہ امن عامہ کے کاز سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ وہ گاندھی جی کی طرح مرے جو نفرت وتشدد کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے درمیان بھی امن و فلاح کی علامت بن گئے تھے۔

۱۹ برس کی عمر میں مارٹن لوتھر کنگ نے لکھا تھا: "ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ تنہا ذہانت کافی نہیں ہے۔ سچی تعلیم کا مقصد ذہانت کے ساتھ کردار پیدا کرنا ہے۔" ذہانت کے ساتھ کردار اور عام لوگوں کی فکر — ان الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ جواں سال کنگ نے صرف ۱۹ سال کی عمر میں کس طرح پختگی کی جانب قدم بڑھایا تھا۔ تاہم درسگاہ حیات میں ان کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی — نہ کبھی ایسا ہوتا ہے۔ انھیں ابھی یہ سبق سیکھنا تھا کہ مثلاً زندگی میں اصل موقف ہمیشہ منطق نہیں بلکہ طاقت ہوا کرتی ہے، اور کوئی شخص بھی اپنا ترجیحی حق بغیر شدید جدوجہد کے نہیں چھوڑتا اور یہ کہ نسلی امتیاز کا اصل مقصد صرف ایک طبقہ کو الگ تھلگ کر دینا نہیں بلکہ اس پر ظلم توڑنا اور اس کا استحصال کرنا ہے۔ یہ سبق انھوں نے اس واقعہ سے سیکھا جو اب مشہور "منٹگمری بس بائیکاٹ" کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس تجربہ گاہ سے وہ قومی رہنما کی حیثیت سے ابھرے اور انھیں ایسی گہری اور زبردست حمایت ملی جس کی مثال اس سے قبل امریکہ میں مفقود تھی۔ پھر اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔

منٹگمری کے تجربے نے عدم تشدد میں ان کے یقین کو مضبوط کیا۔ گاندھی جی کے اثر کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر کنگ نے کہا تھا: "بہت سارے لوگوں کی طرح میں نے بھی گاندھی کے بارے میں سُنا تھا، لیکن میں نے کبھی سنجیدگی سے ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا — لیکن جب میں نے انھیں پڑھا تو عدم تشدد کے ساتھ مزاحمتی جدوجہد سے میں گہرے طور پر متاثر ہوا اور گاندھیائی فلسفہ کی گہرائیوں میں جیسے جیسے میں اترتا گیا محبت کی طاقت میں میری تشکیک کم ہوتی گئی اور پہلی بار سماجی اصلاح کے میدان میں مجھے اس کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ گاندھی جی کے لیے محبت سماجی اور اجتماعی تبدیلی کا نہایت طاقتور آلہ تھی۔ اور محبت و عدم تشدد پر گاندھی کے زور نے سماجی اصلاح کا وہ طریقہ مجھے بتایا جس کی تلاش مجھے مہینوں سے تھی۔

ڈاکٹر کنگ اور ان کے ساتھ آپ مادام، کوئی دس سال قبل ہندوستان تشریف لائے تھے اور اس وقت انھوں نے جو کچھ کہا تھا ہم لوگوں کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ اور اس نے ہمارے دلوں اور دماغوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ انھوں نے کہا تھا "دوسرے ملکوں میں ایک سیاح کی حیثیت سے میں جا سکتا ہوں لیکن ہندوستان میں میں یاتری کی حیثیت سے آیا ہوں۔" وہ یاتری کی حیثیت سے ہمارے ہاں آئے ہوں لیکن ہم نے ان کا استقبال اپنوں کی حیثیت سے کیا تھا۔

ہندوستان انھیں کبھی نہیں بھول سکتا۔

"عالمی حقوق انسانی کا اعلان" تہذیبِ انسانی کی تاریخ میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے جس کا آغاز اس یقین کے ساتھ ہوتا ہے کہ "تمام انسان حقوق و وقار کے اعتبار سے آزاد اور برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں شعور اور ضمیر اس لیے عطا ہوئے ہیں کہ وہ جذبۂ اخوت کے ساتھ ایک دوسرے سے رشتہ رکھیں۔ سال ۱۹۶۸ء اس اعلان کی ۲۰ویں سالگرہ کے موقع پر حقوقِ انسانی کے عالمی سال کی حیثیت سے منایا گیا تھا، اس لیے کہ اس سال مساوات اور سماجی انصاف کے ایک مردِ مجاہد نے سماجی امتیاز کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی جان دے دی تھی۔ اس سال — شاید تصور اور حقیقت کے درمیان خلا کی جانب توجہ دلانے کے لیے — ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ نے۔ اپنی عوام، بلکہ ساری دنیا کی عوام کے لیے انسانی حقوق حاصل کرتے ہوئے یہ عظیم قربانی پیش کی تھی۔

تاریخ کی یہ عجیب و غریب حقیقت ہے کہ زیادہ تر عظیم انسان جنھوں نے پرامن طریقے پر انسانی رشتوں میں انقلاب لانے کے لیے جنگ لڑی وہ ان انسانوں کی تشدد پسند قدیم جبلّت کا شکار ہوئے جو اخلاقی میدان میں شکست سے دوچار ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی موت سے وہ شعلہ نہیں بجھ سکا جسے انھوں نے روشن کیا تھا اور جس مقصد کے لیے وہ جیے اور مرے اور وقت کے ساتھ وہ انقلاب کو پختگی عطا کرتا رہا۔ ایسے ہی انسانی رہنماؤں میں مہاتما گاندھی، ابرہم لنکن اور مارٹن لوتھر کنگ تھے جن کی وراثت کے ہم حصہ دار بنے تاکہ ساری دنیا کے انسانوں کے ضمیر کو ہم بیدار کر سکیں۔

تاریخی قوتوں کے سبب بنی نوع انسان مجبور سے مجبور تر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے سے قریب آئے اور وجودِ باہم کا سبق مساوات کی بنیادوں پر سیکھے انسان کی بنیادی اچھائی اور دانشمندی میں یقین نے ستم رسیدہ انسانیت کو ظلم و جور کی لمبی سیاہ راتوں میں بھی زندہ رکھا ہے۔ جواہر لال نہرو کے فصیح الفاظ میں: "جذبۂ انسانی بھی کتنی حیرت ناک شئے ہے۔ بے شمار ناکامیوں کے باوجود انسان نے ہر دور میں اپنے مخصوص تصور، سچائی اور یقین، ملک اور عزت کے لیے اپنے جانوں کی قربانیاں دی ہیں۔ وہ تصور بدل سکتا ہے، لیکن قربانی کا جذبہ موجود رہے گا اور صرف اسی سبب سے ہم انسان سے امید کا رشتہ ہرگز نہیں توڑ سکتے۔"

انسان کا دماغ اور اس کی روح ہمیشہ ایک جہانِ تازہ کی تلاش میں رہے ہیں علم کی پیاس اور انجانی دنیا کی مہم جوئیوں نے آواز و خلا کی بہت سی حدبندیوں کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ چاند پر اترنے کو پر تول رہا ہے اور خلا کی گہرائیوں میں سفر کے لیے بے قرار ہے۔ جو ابھی حال تک ایک خواب اور شاعرانہ تخیل کی پرواز سے زیادہ کچھ نہ تھا

اور وہ جامۂ حقیقت میں سامنے ہے ان زبردست اور حیران کن ترقیات میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ انسان کا ضمیر اور اس کی روح بلندیوں کی جانب پرواز کرے گی اور بالآخر انسان کی ذہنی حد بندیوں کو توڑ دے گی جس نے انسان کو انسان سے جدا کر رکھا ہے، جو اس کے ذات اور اس کے مستقبل کے درمیان حائل ہے بلکہ دراصل یہی ذہنی حد بندیاں انسانی بھائی چارہ اور کل کی پُرامن دنیا کی جانب ہمارے سفر کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ ہیں لیکن گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور مارٹن لوتھر کنگ کی دوراندیشی اور قوتِ یقین نے ہمیں بتایا ہے کہ جذبۂ انسانیت زبردست اسلحہ سے بھی زیادہ توانا شئے ہے بنی نوع انسان کی امید اسی سے وابستہ ہے۔

اختتام سے قبل میں اپنی اور اہلِ ہند کی جانب سے محترمہ کنگ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس موقع پر تشریف آوری کی زحمت گوارا کی۔ مسز کنگ اپنے شوہر کے لیے ایک اچھی بیوی اور بچوں کے لیے ایک اچھی ماں رہی ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ان کاز کے لیے وقف کر رکھی ہے جو اُن کے شوہر کو عزیز تھیں۔ نہایت مصروف زندگی جو وقت طلب بھی ہے اور صبر طلب بھی۔ وہ موسیقی اور سماجی خدمات کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔ ان کی راست بازی، یقین اور جرأت، جو اُن کے شوہر کے لیے بے پناہ قوت کا ذریعہ تھیں۔ ان کے ذاتی المیے میں ان کو سہارا دیتی رہی ہیں اور اپنے مشن کو نہایت قوت و توانائی کے ساتھ آگے بڑھاتی رہی ہیں۔

گرو نانک

اُس دور سے جب انسان نے اپنے وجود اور موزونیت پر غور کرنا شروع کیا، ہمارے ملک میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو عوام کی رہنمائی کرتی رہیں، اور پھر ان کے ذریعہ پوری انسانیت کی رہبری ہوئی۔ ایسے رشی آئے جن کے خیالات اور تعلیمات سے ہم اپنشدوں میں آشنا ہوئے۔ مہاتما بودھ اور مہاویرا اور اُن کے چیلے، جنوبی ہند کے الور، شنکراچاریہ اور رامانوج آچاریہ اور ان کے چیلے — اس کے بعد وہ آئے جو بھکتی مسلک کے دلفریب راستے پر چلتے رہے۔ کیا اُن سبھوں کا اور جو کچھ انھوں نے ہمیں دیا اس کا ذکر ممکن ہے؟ مغربی ایشیا سے داتا گنج بخش، شیخ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار، فرید شکر گنج، نظام الدین اولیا آئے — جنھوں نے خدا کی عبادت اور انسانی بھائی چارے کی اشاعت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اور سو دو سو سال کے اندر ہمارے پاس ایسے سادھو، صوفی اور یوگی ہر طرف نظر آئے جنھوں نے تمام بولیوں میں لوگوں سے منت و استدعا کی کہ وہ خدا کی عظمت اور بڑائی کو یاد کریں اور اپنے فرائض سے آشنا رہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے، مگر ہمارے ملک میں جو ہزاروں چراغوں نے روشنی پھیلائی، جن کی بتیاں اور تیل اپنے تھے۔ یہ چراغ اپنے اپنے وقت پر زندگی میں روشن ہوئے اور ان کے تیل میں ایسا خاص عنصر شامل تھا کہ وہ اپنی باری آنے پر خود بخود روشن ہوگئے۔ خدا کی خدائی تاریخ اور منطق کی پابند نہیں۔ گورو کی تعلیم میں سچائی ان کے دل کے اندرونی خانوں سے آئی تھی — یہ سنی سنائی بات نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔

جب گورو نانک پیدا ہوئے اس سے کوئی ڈھائی سو سال پہلے سے ہندو پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ اُن میں جو حکمراں تھے وہ دولت اور اقتدار کے پیچھے تھے۔ اُن کے حصول کے لیے انھوں نے جنگیں لڑیں اور پسماندہ و پامال طبقے کے غم و مصائب کا کوئی خیال نہیں کیا۔ بابر نے پنجاب پر پے در پے حملے کیے اور آخر مغل

---

۱۴ اپریل ۱۹۶۹ء کو نئی دہلی میں گورونانک کی پانچویں صد سالہ جشن کا افتتاح کرتے ہوئے۔

شمالی ہندوستان کے بادشاہ بن بیٹھے۔ سوسائٹی حاکم و محکوم کے درمیان تقسیم ہوکر رہ گئی۔ صرف چند افراد حاکم اور بقیہ تمام محکوم رہے۔ انھوں نے جو کچھ چاہا دوسروں پر تھوپ دیا، اور وہ ہندو ہوں یا مسلمان اُس میں کوئی اختیار نہیں رکھتے تھے۔ سوسائٹی کی دوسری تقسیم مذہب کی بنیاد پر تھی۔ ایک جانب ملّا اور دوسری طرف برہمن نے زبردستی یہ تقسیم عمل میں لائی۔ لہٰذا عام لوگوں کی یہ آرزو کہ وہ دوستوں اور بھائیوں کی طرح خوشگوار زندگی گزاریں گھٹ کر رہ گئی۔ مگر ہمیں یہ نہیں ماننا چاہیے کہ گورونانک کی شخصیت اور تعلیمات اُس دور کے مخصوص حالات کی دین تھی۔ یہ حالات گورونانک سے پہلے بھی موجود تھے اور بعد تک موجود رہے۔

گورونانک کی شخصیت میں حسن کرشمہ ساز تھا، بچپن ہی سے اُن کی پارسائی ظاہر ہونے لگی تھی اور ایسے خداداد بچے کو، دوسرے بچوں کی طرح کون ہدایت دے سکتا ہے؟ والدین کی شفقت بھی اتنا اختیار نہیں رکھتی تھی کہ اپنے بچے کو پارسائی کے راستے سے ہٹا کر دنیاوی امور پر توجہ دینے کے لیے مجبور کرسکتی۔ ۲۰ سال سے زیادہ عرصے تک وہ خدا کی عبادت میں مصروف رہے پھر کہیں انھیں روشنی نظر آئی۔ انھیں الہام ہوا جس کو ان کے غیر معمولی شعور نے دیکھا اور ادراک کے اس راستے پر چل کر وہ زیارت کے لیے روانہ ہوگئے عام انسانوں میں پرچار کرتے ہوئے کہ — "یہ خدا سے میری التجا ہے کہ جو روشنی میں دیکھتا ہوں اس میں تمام لوگ حصہ دار بنیں۔" وہ پنجاب سے گزرے۔ جنوب میں وہ لنکا گئے اور مشرق میں آسام تک اور مغرب میں بغداد تک ممکن ہے مکّہ تک — اور ہر چہار طرف انھوں نے خدا کی وحدانیت کا پیغام دیا اور ہر حال میں انھیں معلوم تھا کہ کس طرح عام لوگوں کی توجہ خدا کی جانب مبذول کرائی جائے۔ ان کی نگاہوں میں دنیا ایک تھی اور اسی طرح پوری انسانیت بھی، اس لیے کہ ایک ہی خدا نے تمام انسانوں کو پیدا کیا اور وہی انھیں رزق دیتا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ خالق نے انسان کو اس طرح پیدا کیا ہو کہ وہ فلسفے اور منطق کی تبدیلیوں کے ساتھ خود بھی بدل جائے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے انسان خدا کی ودیعت کردہ طبیعت و مزاج کو ناپاک سمجھتے ہوئے اصلاح کے لیے نفس کشی کی راہ اپنائے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دنیا کو ترک کردیا جائے۔ جو اُس کی عمل گاہ ہے — اور جس میں بسنے کے لیے وہ بھیجا گیا ہے؟ کیا وہ انسان جو صرف علمی مباحثے اور موشگافیوں میں مصروف رہتا ہو، لیکن اپنے روزمرّہ کے فرائض انجام نہ دیتا ہو، خدا کا احترام نہ کرتا ہو اور بنی نوع انسان سے مطلق ہمدردی نہ رکھتا ہو، وہ حلقۂ خداوندی تک کبھی پہنچ سکتا ہے؟ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے: "دو راہیں ہیں؛ یا تو خدا پرست بن جاؤ یا دنیا دار۔" اور ہم انسان یا تو لالچ کے جال میں پھنس جاتے ہیں یا

"مایا" کے سراب میں، اور غلط راہ پر جا پڑتے ہیں۔ گورو نانک نے اپنی پوری زندگی نہایت خلوص و پائداری کے ساتھ لوگوں کو اس بات کی تبلیغ کرنے میں گزار دی کہ یہی وہ بنیادی چیزیں ہیں جو دماغ کو روشن اور دل کو پاک کرکے انسان کو خدا پرست بناتی ہیں اور زندگی کو راہ راست دکھاتی ہیں۔

جب ایک خدا نے تمام مخلوق کو وجود بخشا، تو تمام انسانوں کو بھی برابری کی سطح پر رہنا چاہیے۔ گورونانک کی ابتدائی نصیحتوں میں ہے کہ: "نہ کوئی ہندو ہے اور نہ کوئی مسلمان" اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ کوئی سچا ہندو ہے اور نہ سچا مسلمان۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہندو اور مسلمان میں بنی نوع انسان کی تقسیم غلط ہے جو ایک ہی خدا کے بنچے ہیں۔ اس لیے کہ لوگ ظاہری صورت و شکل کو دیکھتے ہیں جو ایک دوسرے سے فرق کرتی ہیں جو اشتعال انگیز سوالات کھڑا کرتی ہیں۔ گورو نانک نے ایک ایسی پوشاک اختیار کی کہ انھیں ہندو بھی سمجھا جائے اور مسلمان بھی۔ کئی لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ تب انھیں اس بات کی تشریح کا موقع ملا کہ مذہب کی بنیاد پر انسان کی تقسیم اور یہ خیال کرنا کہ کسی ایک مذہب کے ماننے والے صحیح راہ پر ہیں اور دوسرے گمراہ ہیں، غلط ہے۔ تب یہ سوال اٹھا: کیا مختلف مذاہب میں واقعی کوئی فرق ہے؟ جواب میں گورونانک کہا کرتے تھے کہ پیغمبروں اور مختلف انسانی شکلوں میں آکر خدا انسان کی ہدایت کرتا رہا ہے، تو پھر وہ خود اپنی ہدایات کا انکار کیونکر کر سکتا ہے۔ لوگوں کو اس بات کا یقین بڑی مشکل سے دلایا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کی بات کرنا بھی جرم ہے۔ لہٰذا اس کو گورو نانک کی شخصیت کا جادو سمجھنا چاہیے کہ کٹر مذہبی لوگوں نے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

اگر تمام انسان برابر ہیں اور تمام لوگوں کو یکساں ہدایات ملی ہیں تو ان کی عبادت کا طریقہ اور طرز زندگی بھی ایک ہونی چاہیے۔ گورو نانک نے ایک طرف بت پرستی کی مخالفت کی اور ایسی رسوم انھیں خلافِ عقل معلوم ہوئیں، دوسری جانب انھوں نے ایسے اصولوں کی بنیاد ڈالی جو انسانی آرزوؤں اور امنگوں سے میل کھاتی ہیں: "اپنا فرض انجام دو، خدا کا نام لو اور اپنے کھانے میں دوسروں کو حصہ دار بناؤ" انسان کو صحیح راہ پر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنی روٹی کمانے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کا استعمال اور اپنے بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرنا چاہیے۔ لیکن ایک جفاکش انسان بھی اپنی راہ سے بھٹک سکتا ہے اور لالچ میں گرفتار ہو کر خدا کو بھول سکتا ہے۔ لہٰذا اس کو خدا کا "جاپ" کرنا اور اس کے نام کی مسلسل تسبیح پڑھنی چاہیے تاکہ اس (خدا) کی شبیہ اس کے دل پر منقش ہو جائے۔ اس کی خود غرضی کے علاج اور اس کی محنت کو ثمرآور بنانے کے لیے ضروری ہے کہ

اپنی کمائی پر ہر انسان کا حق تسلیم کرے۔ ایک انسان کے پاس کھانے کو جو کچھ بھی میسّر ہو اس میں وہ دوسروں کا حصہ تسلیم کرے۔ اس لیے اس کو سخت محنت، عبادت اور روزمرہ کی زندگی میں خیرات وصدقات کی راہ اپنانا چاہیے۔ صرف وہی لوگ جوان اصولوں پر عمل کرتے ہیں وہ سکھ کہے جا سکتے ہیں اور اگر وہ ان اصولوں پر اپنی زندگی میں کار بند ہو سکتے ہیں اور وہ بھی ایمان و خلوص کے جذبے کے ساتھ تو وہ اس امتحان میں پورے اتر سکتے ہیں جس کا نقشہ گورونانک نے تیار کیا:

"وہ جو سچا ہے، قناعت پسند ہے، ہر کسی پر مہربان ہے، لالچ اور نفرت سے الگ ہو، تعصب رکھتا ہو نہ خواہشات، جو اپنے آپ پر پورا قابو رکھتا ہو، صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہو، اپنے آپ کو جسمانی اور روحانی طور پر خدا کی مرضی پر چھوڑ سکتا ہو اور جس کو اس (خدا) کے احکامات پر چلنے کی عادت ہو — ایسا متوازن شخص ہی گورو کا پیرو (چیلا) بننے کے لائق ہے۔"

میں نہیں جانتا کہ میں نے مندرجہ بالا ترجمہ صحیح طور پر کیا ہے۔ مگر آپ نے اس کو ضرور سمجھا ہوگا۔ آپ گورو نانک کے پیرو ہیں۔ لیکن پیرو کار کا عقیدہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ توحید خداوندی پر مسلسل زور، دل اور زبان پر مسلسل اسی کا نام، سخت محنت اور اپنی محنت سے پوری سوسائٹی کو فائدہ پہنچانا ہی آپ کا مقصد ہونا چاہیے۔ گورونانک نے جو کام شروع کیا وہ ختم نہیں ہوا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کام کو جاری رکھیں جب تک کہ ہماری زندگی سادھوؤں، سنتوں اور بزرگوں کی محبت کے قابل نہ بن جائے۔

تعارف ابّو خاں کی بکری

یہ کہانیاں، بہت دن ہوئے، رقیہ ریحانہ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے انھیں نے سنائی تھیں اور یہ کہہ کر سنائی تھیں کہ کہیں پڑھی ہیں یا کسی سے سُنی ہیں، مگر یاد نہیں کہ کب اور کہاں میں نے ان سے پائی تھیں اس لیے انھیں کے نام سے پہلے شائع کیں۔ پھر رقیہ ریحانہ ہمیشہ کو رخصت ہو گئیں اور میں یہ بھی نہ پوچھ پایا کہ میں نے جس طرح ان کی کہانیوں کو لکھا ہے وہ انھیں پسند بھی ہے یا نہیں۔ لیکن لکھی چونکہ میرے ہاتھ سے گئی تھیں اور لوگ اسے جانتے ہیں اس لیے اب انھیں اپنے ہی نام سے شائع کرتا ہوں۔ کس کس کو بتاؤں کہ رقیہ ریحانہ کون تھیں اور کہاں چلی گئیں۔ سہل یہی ہے کہ کہانیوں کی ساری ذمّے داری اپنے سر لے لوں۔ کہانی اپنے کہنے والی کی اچھائی برائی کو بے تکلفی سے اپنے اندر لے لیتی ہے۔ یہ کہانیاں آپ کو پسند آئیں تو سچ یہ ہے ان کی ساری خوبی رقیہ ریحانہ کی دین ہے۔ اگر طبیعت کو نہ بھائیں تو سمجھیں کہ میرے بیان نے انھیں بگاڑ دیا ہے۔ مگر ایک بار پڑھ ضرور لیں۔ تھوڑی سی ہیں؛ زیادہ وقت ضائع نہ ہوگا۔

ان کہانیوں کا ذکر آیا تو میرے دوست شری ستیش گجرال نے کہا کہ تصویریں میں بنا دوں گا۔ میں سمجھا کہ بہت بڑھا نے کو کہہ رہے ہیں۔ مگر انھوں نے تصویریں بنا دیں۔ سچ یہ ہے کہ گجرال صاحب کو جو درجہ مصوّروں میں حاصل ہے وہ مجھے لکھنے والوں میں بھلا کیسے نصیب ہوگا۔ اس لیے ایسا لگتا ہے کہ اب یہ کتاب میری نہیں اُن کی ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے نصیب اچھے تھے۔ پڑھنے والے بھی پسند کر لیں تو کیا کہنا۔

نئی دہلی

۵ر فروری ۱۹۶۳ء

سعیدہ کی امّاں

سعیدہ کی اماں بہت دنوں سے بیمار تھی۔ بخار کھانسی، کبھی ہاتھ پاؤں میں درد، کبھی پیٹ میں، کبھی پیٹھ میں۔ بہت دنوں تک حکیموں کا علاج ہوتا رہا۔ کسی نہ کسی چیز کو تو فائدہ ضرور ہوتا تھا۔ لیکن بیماری کا سلسلہ تھا کہ چلا جاتا تھا۔ ایک چیز جاتی دوسری رہ جاتی۔ کمزوری بہت ہوگئی، چہرہ ایسا پیلا پڑ گیا تھا جیسے پیلی کٹئی کا پھول۔ حکیموں نے کھانا بس یوں سمجھو کہ بند ہی کر دیا تھا۔ گرمی اچھی خاصی تھی لیکن جن حکیم جی کا علاج تھا وہ ہوا سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لیے ایک چھوٹے سے کمرے میں رکھوایا تھا اور سب کھڑکیاں اور کواڑ بند رکھنے کی تاکید کر دی تھی۔

جب کمزوری برابر بڑھتی گئی تو عزیزوں، پڑوسیوں نے کہا کہ بھائی ڈاکٹر انصاری صاحب کا علاج کراؤ۔ مانا ان کی فیس زیادہ ہے۔ نسخے میں دوائیاں بھی بہت مہنگی لکھتے ہیں۔ مگر جان ہے تو جہان ہے۔ سعیدہ کی امّاں بے چاری غریب عورت تھی۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع سے نہ کیا تھا۔ مگر جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ کہا اچھا کچھ گہنا بیچوں گی اور ڈاکٹر صاحب ہی کا علاج کراؤں گی۔

ڈاکٹر صاحب کئی دن کے انتظار کے بعد آئے۔ کوئی آدھ گھنٹے تک حال سُنا اور دیکھا بھالا اور نسخہ لکھ کر چلے گئے۔ سعیدہ کی خالہ نے پوچھا "اور ڈاکٹر صاحب کھانے کو؟"، ڈاکٹر صاحب نے کہا "جو اُن کا جی چاہے کھلاؤ۔ پھلکا، شوربہ، دودھ، انار کا عرق، انگور کا عرق۔"

سعیدہ اندر سے پان لے کر آئی، چوکھٹ میں ٹھوکر لگی تو پان کی تھالی وہ جا کر گری۔ سعیدہ زور زور سے رونے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے سعیدہ کو اٹھا لیا اور چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سعیدہ کی خالہ نے اندر سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ذرا تشریف رکھیے اور پان بھیجتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا "میں تو پان کھاتا ہی نہیں ہوں۔ آپ پان کی تکلیف نہ کریں البتہ یہ جو آپ اس کوٹھری میں مریضہ کے ساتھ بند ہیں اور نہ معلوم آپ کے ساتھ کتنے تیمار دار اسی ڈبے میں قید ہیں، یہ ٹھیک نہیں۔ انھیں بڑے کمرے میں رکھیے، کھڑکیاں سب کھلی رہیں اور ۸ بجے سے ۹ بجے تک انھیں باہر دھوپ میں تکیے کی ٹیک دے کر بٹھایا کیجیے۔ روز۔

پیامِ تعلیم مئی ۱۹۳۰ء

دیکھیے بھوپے گا نہیں یہ دوا سے زیادہ ضروری ہے۔"
ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر چلے گئے۔ گھر میں اڑوس پڑوس کی نہ جانے کتنی بڑھیاں ہر وقت جمع رہتی تھیں۔ ان میں ایک سے ایک بقراط، کوئی کہتی ہے یہ موئے ڈاکٹر کیا جانیں۔ ہوا میں بٹھانے کو کہہ گئے۔ کھانسی کا یہ حال اور دروازے کھلے رکھو۔ بخار روز آتا ہے، دھوپ میں بیٹھو۔ سعیدہ کی ماں کو یہ بحث اچھی نہیں لگتی تھی۔ دو ایک مرتبہ اس کے ماتھے پر کچھ شکنیں پڑیں۔ پھر کراہ کر اس نے کروٹ بدل لی۔ لیکن بڑھیاں ڈاکٹر صاحب اور ان کے فن کے متعلق باتیں کیے گئیں اور برابر بستر کے پاس بیچ بیچ پیکیں تھوکتی رہیں۔ آخر سعیدہ کی ماں سے نہ رہا گیا۔ اس نے پھر کروٹ لی اور بولی۔ "اب میں چاہے مروں چاہے جیوں۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کہا ہے وہی کروں گی۔ بہن اب تم بڑے کمرے میں میرا بستر لے چلو اور صبح سے دھوپ میں ایک چارپائی بچھا دیا کرو۔" بہن نے فوراً بڑے کمرے کا انگڑ کھنگڑ ہٹانا شروع کیا، اور شام تک بستر اس کمرے میں پہنچ گیا۔ کھڑکیاں اور دروازے کھلے رہے۔ سعیدہ کی ماں کو خوب نیند آئی۔ اور صبح اٹھی تو طبیعت ہلکی ہلکی سی تھی۔ اب ۸ بجے کا انتظار شروع ہوا لیکن خدا کا کرنا ہے، ۸ بجے ہی سے سارے آسمان پر بادل چھا گئے۔ اور سارے دن دھوپ نہ نکلی۔ دوسرے دن بھی یہی حال رہا۔ سعیدہ کی ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "یا اللہ کیا میری وجہ سے اب تیرا سورج بھی نہ نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے دھوپ میں لیٹنے کو کہا ہے، دھوپ ہی نہ نکلے گی تو میں کیسے اچھی ہوں گی۔"

سعیدہ بھی کہیں پٹی کے پاس اپنی گڑیا کو لیے کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی۔ مگر بس سن لیا اور کچھ نہیں، اپنے کھیل میں لگ گئی۔ اس دن سہ پہر کو دھوپ نکلی تو سعیدہ آنگن سے دوڑی ہوئی آئی اور برآمدے ہی سے چلائی کہ "اماں اماں۔ دیتو۔ دوب نکلی۔" سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیکھو ذرا سی بچی اور اتنا دھیان! مگر شام کے وقت ڈاکٹر صاحب نے سعیدہ کی ماں کو باہر بٹھانے کو کہا نہ تھا۔ اس لیے لوگوں نے چارپائی نہ نکالی۔ سعیدہ نے بار بار دھوپ نکلنے کا اعلان کیا اس کے اصرار سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ لوگ اس کی ماں کی چارپائی دھوپ میں ڈال دیں۔ لیکن اس مطلب کو ادا نہیں کر سکتی۔ لوگ اپنے اپنے کام میں لگ گئے اور سعیدہ پھر آنگن میں جا کر کھیلنے لگی۔ لیکن کچھ اُداس اُداس سی رہی۔ تھوڑی دیر میں اپنی گڑیاں دیں زمین پر ڈال یہ مٹی ہی پر لیٹ گئی۔ سورج ڈوبنے کا وقت آ گیا تھا۔ سامنے والے آم کے پیڑ کی چوٹی پر سورج کی کرنیں کھیل رہی تھیں۔ سعیدہ کی نظر اسی چوٹی پر جمی تھی۔ ایک زبان ہے جسے بڑے نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں، لیکن بچے اسے خوب جانتے ہیں اور آپس میں یہ پیڑوں، پھولوں، جانوروں، سورج چاند اور تاروں بلکہ کوئی کوئی تو کہتا ہے کہ اللہ میاں تک سے باتیں کر لیتے ہیں۔ اسی زبان میں سعیدہ

نے سورج کی اس کرن سے جو سب سے آخر تک آم کی چوٹی پر کھیلتی رہی، باتیں کیں کہ بہن کل صبح ضرور آنا۔ اماں کے لیے دھوپ کر دینا۔ نہیں تو اماں کیسے اچھی ہوں گی؟" کرن نے سعیدہ سے وعدہ کر لیا کہ "میں ضرور آؤں گی، تو اداس مت ہو۔"

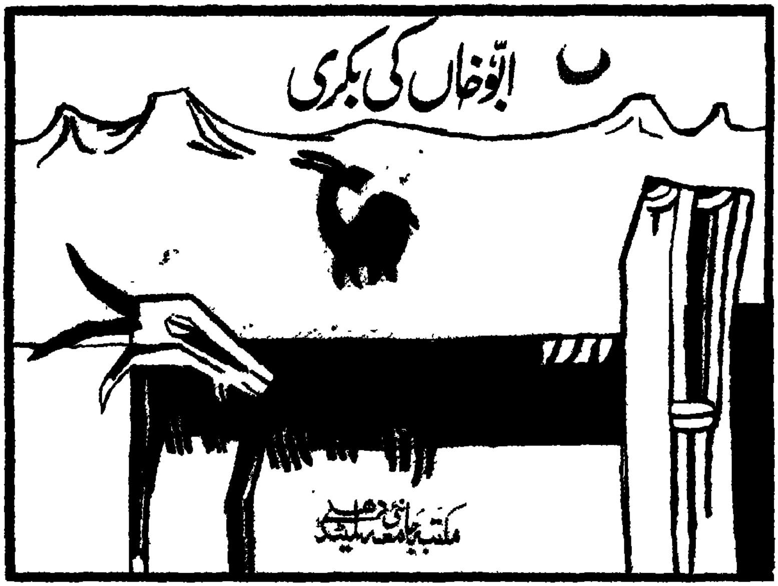
دوسرے دن جب کوئی چار بجے سے سورج کی کرنوں نے دنیا میں آنے کے لیے بنتا سنورنا شروع کیا تو سورج نے کہا "چلو آج بھی چھٹی ہے، آج پھر یہیں آسمان میں رہنا ہوگا۔ دنیا کا راستہ بادلوں کی فوج نے بند کر رکھا ہے۔"

کرنوں کو یہ بات اچھی تو نہ لگی کہ یہیں آسمان میں بند رہیں اور دنیا کی سیر کو نہ جائیں مگر کیا کرتیں چپ ہو گئیں۔ مگر وہ کرن جس نے ایک دن پہلے سعیدہ سے باتیں کی تھیں ذرا آگے کو بڑھی اور بولی "اور میں اب کیا کروں۔ میں تو کل سعیدہ کو زبان دے چکی ہوں کہ، صبح ضرور آؤں گی اور تیری اماں کے لیے دھوپ کر دوں گی۔ نہیں تو وہ اچھی کیسے ہوں گی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے ڈاکٹر نے۔ یہ کمبخت بادلوں کی فوج ختم ہی نہیں ہوتی۔ روز ادھر سے اُدھر، روز اُدھر سے ادھر۔ میرا بس چلتا تو سب کا سر توڑ کر زمین کو جاتی۔ بھلا اکیلی کرن کیسے بادلوں کی فوج میں سے آتی۔ دوسری بہنوں کو بھی خیال ہوا کہ اس کرن کی بات ہیٹی نہ ہو۔ سعیدہ کیا کہے گی کہ اب آسمان کے لوگ بھی جھوٹ بولنے لگے۔ سب کی سب سورج سے لپٹ پڑیں، کہ "آج تو ضرور دنیا کو جائیں گے، آج تو ضرور۔"

سورج نے کہا "اچھا تمہاری خوشی۔ چلو۔ مگر بادلوں کی فوج میں تمام کیچڑ ہوتی ہے تمہارے سارے کپڑے ناس ہو جائیں گے۔" مگر کرنیں پھر کہاں سنتی تھیں۔ سب نے کہا "ہم کپڑے بچا لیں گے۔ نہیں تو جلدی سے لوٹ کر دوسرے بدل لیں گے۔" خیر یہ کہہ کر انھوں نے زمین کا رُخ کیا، یہ ننھی کرنیں بادلوں کی فوج کو بھلا کیا ہٹاتیں مگر ان میں گرمی بھی تو ہوتی ہے ایک جگہ بادلوں کی فوج کے ایک ٹکڑے پر برابر گھنٹہ بھر جو چمکیں تو فوج کا یہ دستہ مارے گرمی کے گھبرا اٹھا اور ایک طرف کو ہٹ گیا۔ بس کیا تھا کرنوں کو راستہ مل گیا اور یہ دیکھتے دیکھتے دنیا کو پہنچ گئیں، اور سیدھی سعیدہ کی ماں کے آنگن میں اتریں۔ سعیدہ صبح کے بادلوں کو دیکھتی تھی اور اُداس بیٹھی تھی۔ کسی سے کچھ کہتی بھی نہ تھی۔ اب جو کرنوں کی سواری پہنچی تو اس کا چہرہ باغ باغ ہو گیا۔ اور یہ پھر چلائی "اماں اماں دیتو۔ دوب نتلی۔" بچّی کی اس بات سے ماں پر بڑا اثر پڑا اور اس کی آنکھوں میں محبت سے آنسو بھر آئے۔ سعیدہ کی خالہ نے آنگن میں ہارسنگھار کے پیڑ کے پاس دھوپ میں چارپائی ڈلوا دی کوئی گاؤ تکیہ تو گھر میں تھا نہیں، کئی چھوٹے چھوٹے تکیے اور دو بستر ایک جگہ کر کے سعیدہ کی ماں کی پیٹھ سے لگا دیئے اور یہ گھنٹے بھر تک دھوپ میں بیٹھی رہی۔ مہینوں بعد چھوٹے سے بند کمرے سے نکل کر دھوپ اور تازہ ہوا میں نکلی تھی۔ ایسا لگتا

تھا کہ نئی دنیا میں آ گئی ہے۔ چہرہ پیلا تھا لیکن اتنا اُداس نہ تھا۔ آنکھوں میں نئی روشنی سی آ گئی تھی۔ سعیدہ بھی معمول سے زیادہ خوش تھی۔ بیٹی کے پاس آ آ کر کھڑی ہوتی تھی۔ ماں نے ایک دفعہ اسے گود میں اٹھا لیا اور خوب چومے لیے۔ ہوا کے جھونکے سے اس وقت بارسنگھار کے بہت سے پھول سعیدہ کی ماں کی گود میں گرے۔ دیوار پر قمری نے حق سرہٗ کا گیت گایا۔ اسی دن سے سعیدہ کی ماں کی طبیعت اچھی ہونے لگی اور اب وہ اچھی بھلی چنگی ہے۔

ابو خاں کی بکری



ستیش گجرال

ہمالیہ پہاڑ کا نام تو تم نے سُنا ہی ہوگا۔ اس سے بڑا پہاڑ دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ہزاروں میل چلا گیا ہے۔ اور اونچا اتنا ہے کہ ابھی تک اس کی اونچی چوٹیوں پر کبھی کبھار کوئی ہمت والا آدمی پہنچ پایا ہے، وہ بھی جیسے بس ڈھیّا چھونے کو۔ اس پہاڑ کے اندر وادیوں میں بہت سی بستیاں بھی ہیں۔ ایسی ہی ایک بستی الموڑا بھی ہے۔

الموڑے میں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ ان کا نام تھا ابّو خاں۔ انھیں بکریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اکیلے آدمی تھے۔ بس ایک دو بکریاں رکھتے۔ دن بھر انھیں چراتے پھرتے۔ ان کے عجیب عجیب نام رکھتے، کسی کا کلّو، کسی کا منگلیا، کسی کا گوجری، کسی کا حکمہ۔ ان سے نہ جانے کیا باتیں کرتے رہتے اور شام کے وقت بکریوں کو لا کر گھر میں باندھ دیتے۔ الموڑہ پہاڑی جگہ ہے اس لیے ابو خاں کی بکریاں بھی پہاڑی نسل کی ہوتی تھیں۔

ابّو خاں غریب تھے بڑے بدنصیب۔ ان کی ساری بکریاں کبھی نہ کبھی رسّی تڑا کر رات کو بھاگ جاتی تھیں۔ پہاڑی بکری بندھے بندھے گھبرا جاتی ہے۔ یہ بکریاں بھاگ کر پہاڑ میں چلی جاتی تھیں۔ وہاں ایک بھیڑیا رہتا تھا وہ انھیں کھا جاتا تھا۔ مگر عجیب بات ہے نہ ابّو خاں کا پیار، نہ شام کے دانے کا لالچ، ان بکریوں کو بھاگنے سے روکتا تھا، نہ بھیڑیے کا ڈر۔ بس شاید یہ بات ہو کہ پہاڑی جانوروں کے مزاج میں آزادی کی بہت محبت ہوتی ہے۔ یہ اپنی آزادی کسی داموں دینے کو راضی نہیں ہوتے اور مصیبت اور خطروں کے باوجود آزاد رہنے کو آرام اور آسائش کی قید سے اچھا جانتے ہیں۔

جہاں کوئی بکری بھاگ نکلی اور ابّو خاں بیچارے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ ہری ہری گھاس میں انھیں کھلاتا ہوں، چھُپ چھپا کر پڑوسیوں کے دھان کے کھیت میں بھی انھیں چھوڑ دیتا ہوں، شام کو دانا دیتا ہوں، مگر یہ کم بخت نہیں ٹھہرتیں اور پہاڑ میں جاکر بھیڑیے کو اپنا خون پلانا پسند کرتی ہیں۔

جب ابّو خاں کی بہت سی بکریاں یوں بھاگ گئیں تو بیچارے بہت اداس ہوئے اور کہنے لگے "اب کبھی بکری نہ پالوں گا۔ زندگی کے تھوڑے دن اور ہیں، بے بکریوں ہی کے کٹ جائیں گے۔" مگر تنہائی بُری چیز ہے۔ تھوڑے دن تو ابّو خاں بے بکریوں کے رہے۔ آخر نہ رہا گیا۔ ایک دن کہیں سے ایک بکری مول لے آئے۔ یہ بکری ابھی بچہ ہی تھی، کوئی سال سوا سال کی ہوگی۔ پہلی دفعہ بیاہی تھی۔ ابّو خاں نے سوچا کم عمر بکری لوں گا تو شاید ہل جائے گی اور اسے جب پہلے ہی سے اچھے اچھے چارے دانے کی عادت پڑ جائے گی تو پھر یہ پہاڑ کا رخ نہ کرے گی۔ یہ بکری تھی بہت خوب صورت۔ رنگ اس کا بالکل سفید تھا۔ بال لمبے لمبے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کالے کالے سینگ ایسے معلوم ہوتے تھے کہ کسی نے آبنوس کی کالی لکڑی میں خوب محنت سے تراش کر بنائے ہوں۔ لال لال آنکھیں۔ تم دیکھتے تو کہتے کہ ارے یہ بکری تو ہم نے لے لی ہوتی۔ یہ بکری دیکھنے میں ہی اچھی نہ تھی، مزاج کی بھی بہت اچھی تھی۔ پیار سے ابّو خاں کا ہاتھ چاٹتی تھی۔ دودھ چاہے تو کوئی بچہ دودھ لے نہ لات مارتی تھی، نہ دودھ کے برتن گراتی۔ ابّو خاں تو اس پر لٹو ہو گئے تھے۔ اس کا نام چاندنی رکھا تھا اور دن بھر اس سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ کبھی اپنے چچا گھسیٹا خاں کا قصہ اسے سُناتے تھے، کبھی، اللہ بخشے، ماموں نتھو خاں کا۔

ابّو خاں نے یہ سوچ کر کہ بکریاں شاید میرے گھر کے تنگ آنگن میں گھبرا جاتی ہیں اپنی اس بکری چاندنی کے لیے نیا انتظام کیا تھا۔ گھر کے باہر ان کا ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ اس کے چاروں طرف انھوں نے نہ جانے کہاں کہاں سے کانٹے جمع کر کے ڈالے تھے کہ کوئی اس میں نہ آسکے۔ اس کے بیچ میں چاندنی کو باندھتے تھے اور رسّی خوب لمبی رکھی تھی کہ خوب

پیام تعلیم جون ۳۰ ۱۹ء

اِدھر اُدھر گھوم سکے۔ اس طرح چاندنی کو ابّو خاں کے یہاں خاصا زمانہ گزر گیا اور ابّو خاں کو یقین ہو گیا کہ آخر کو ایک بکری تو ہل گئی۔ اب یہ نہ بھاگے گی۔

مگر ابّو خاں دھوکے میں تھے۔ آزادی کی خواہش اتنی آسانی سے دل سے نہیں مٹتی۔ پہاڑ اور جنگل میں رہنے والے آزاد جانوروں کا دم گھر کی چار دیواری میں گھٹتا ہے تو کانٹوں سے گھرے ہوئے کھیت میں بھی انھیں چین نصیب نہیں ہوتا۔ قید قید سب ایک سی۔ تھوڑے دن کے لیے چاہے دھیان بٹ جائے مگر پھر پہاڑ اور جنگل یاد آتے ہیں اور قیدی اپنی رسّی تڑانے کی فکر کرتا ہے۔ ابّو خاں کا خیال ٹھیک نہ تھا کہ چاندنی پہاڑ کی ہوا بھول گئی۔

ایک دن صبح صبح جب سورج ابھی پہاڑ کے پیچھے ہی تھا کہ چاندنی نے پہاڑ کی طرف نظر کی۔ منہ جو جگالی کی وجہ سے چل رہا تھا رُک گیا اور چاندنی نے دل میں کہا "وہ پہاڑ کی چوٹیاں کیسی حسین ہیں۔ وہاں کی ہوا اور یہاں کی ہوا کا کیا مقابلہ۔ پھر وہاں اُچھلنا، کودنا، ٹھوکریں کھانا اور یہاں ہر وقت بندھے رہنا۔ گر دن میں آٹھ پہر یہ کم بخت رسّی۔ ایسے گھیروں میں گدھے اور خچر ہی بھلے چُگ لیں ہم بکریوں کو تو ذرا بڑا میدان چاہیے۔"

اس خیال کا آنا تھا اور چاندنی اب وہ پہلی چاندنی ہی نہ تھی۔ نہ اُسے ہری ہری گھاس اچھی لگتی تھی، نہ پانی مزا دیتا تھا، نہ ابّو خاں کی لمبی داستانیں اُسے بھاتی تھیں۔ دن پر دن دُبلی ہونے لگی۔ دودھ گھٹنے لگا۔ ہر وقت منہ پہاڑ کی طرف رہتا اور رسّی کو کھینچتی اور عجیب درد بھری آواز سے "میں"، "میں"، چلّاتی۔

ابّو خاں سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو کوئی بات ضرور ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہے۔ ایک دن صبح جب ابّو خاں نے دودھ دوہ لیا تو چاندنی نے ان کی طرف منہ پھیرا اور اپنی بکریوں والی زبان میں کہا "ابّو خاں میاں، میں اب تمہارے پاس رہوں گی تو مجھے بڑی بیماری ہو جائے گی مجھے تو تم پہاڑ ہی میں چلا جانے دو۔" ابّو خاں بکریوں کی بولی سمجھنے لگے تھے۔ چلّا کر بولے۔ "یا اللہ، یہ بھی جانے کو کہتی ہے، یہ بھی!" اور مارے صدمے کے مٹی کی لٹیا جس میں دودھ دوہا تھا ہاتھ سے گری اور پاش پاش ہو گئی۔

ابّو خاں وہیں گھاس پر بکری کے پاس بیٹھ گئے اور نہایت غمگین آواز سے پوچھا:

"کیوں بیٹی چاندنی۔ تو بھی مجھے چھوڑنا چاہتی ہے؟"

چاندنی نے جواب دیا: "ہاں ابّو خاں میاں۔ چاہتی تو ہوں۔"

"ارے تو کیا تجھے چارا نہیں ملتا؟ یا دانا پسند نہیں؟ بنیے نے گھُنے دانے ملا دیے ہیں کیا؟ میں آج ہی اور دانا لے آؤں گا۔"

"نہیں نہیں میاں مجھے دلنے کی کوئی تکلیف نہیں" چاندنی نے جواب دیا۔
"تو پھر کیا رسّی چھوٹی ہے۔ میں اور لمبی کر دوں گا۔"
چاندنی نے کہا "اس سے کیا فائدہ۔"
"تو آخر پھر کیا بات ہے؟ تو چاہتی کیا ہے؟"
چاندنی بولی "کچھ نہیں۔ بس مجھے تو پہاڑ میں جانے دو۔"
ابّو خاں نے کہا "اری کم نصیب۔ تجھے یہ بھی خبر ہے کہ وہاں بھیڑیا رہتا ہے۔ وہ جب آئے گا تو کیا کرے گی؟"

چاندنی نے جواب دیا "اللہ نے دو سینگ دیے ہیں۔ ان سے اسے ماروں گی۔"

"ہاں ہاں ضرور" ابّو خاں بولے "بھیڑیئے پر تیرے سینگوں ہی کا تو اثر ہو گا۔ وہ تو میری کئی بکریاں ہڑپ کر چکا ہے۔ ان کے سینگ تو تجھ سے بہت بڑے تھے۔ تو تو کلّو کو جانتی نہیں تھی، وہ یہاں پچھلے سال تھی، بکری کاہے کو تھی ہرن تھی۔ ہرن، کالا ہرن۔ رات بھر سینگوں سے بھیڑیئے کے ساتھ لڑی۔ مگر پھر صبح ہوتے ہوتے اس نے دبوچ ہی لیا اور کھا گیا۔"

چاندنی نے کہا "ارے۔ رے۔ رے۔ بیچاری کلّو۔ مگر خیر، ابّو خاں میاں اس سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو تم پہاڑ میں جانے ہی دو۔"

ابّو خاں کچھ جھنجلائے اور بولے "یا اللہ۔ یہ بھی جاتی ہے۔ میری ایک چہیتی بکری اور اس کم بخت بھیڑیئے کے پیٹ میں جاتی ہے۔ میری۔۔ مگر نہیں نہیں، میں اسے تو ضرور بچاؤں گا۔ کم بخت، احسان فراموش، تیری مرضی کے خلاف تجھے بچاؤں گا۔ اب تو تیرا ارادہ معلوم ہو گیا ہے۔ اچھا بس چل تجھے کوٹھری میں باندھا کروں گا۔ نہیں تو موقع پا کر چل دے گی۔"

ابّو خاں نے آکر چاندنی کو ایک کونے کی کوٹھری میں بند کر دیا اور اوپر سے زنجیر چڑھا دی۔ مگر غصّہ اور جھنجلاہٹ میں کوٹھری کی کھڑکی بند کرنا بھول گئے۔ اِدھر انھوں نے کنڈی چڑھائی، اُدھر چاندنی اُچک کر کھڑکی میں سے باہر۔ یہ جا وہ جا۔

چاندنی پہاڑ پر پہنچی تو اس کی خوشی کا کیا پوچھنا تھا۔ پہاڑ پر پیڑ اس نے پہلے بھی دیکھے تھے لیکن آج ان کا اور ہی رنگ تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب کھڑے ہوئے اُسے مبارک باد دے رہے ہیں کہ پھر ہم میں آملی۔ ادھر اُدھر سیوتی کے پھول مارے خوشی کے کھلا کھلا کر ہنس رہے تھے۔ کہیں اونچی اونچی گھاس اس سے گلے مل رہی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ سارا پہاڑ مارے خوشی کے مسکرا رہا ہے اور اپنی بچھڑی ہوئی بچی کے واپس آنے پر پھولا نہیں سماتا۔ چاندنی کی خوشی کا حال کوئی کیا بتائے۔ نہ چاروں طرف کانٹوں کی باڑھ، نہ کھونٹا، نہ رسی۔ اور چارا! وہ وہ جڑی بوٹیاں کہ ابو خاں غریب باوجود اپنی ساری محبت اور شفقت کے نہ لا سکتے۔

چاندنی کبھی اِدھر اُچھلتی، کبھی اُدھر، یہاں سے کودی، وہاں پھاندی، کبھی چٹان پر ہے، کبھی کھڈ میں، ادھر ذرا پھسلی پھر سنبھلی۔ ایک چاندنی کے آنے سے سارے پہاڑ میں رونق سی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابو خاں کی دس بارہ بکریاں چھوٹ کر یہاں آگئی ہوں۔

ایک دفعہ گھاس پر منہ مار کر جو ذرا سر اٹھایا تو چاندنی کی نظر ابو خاں کے مکان اور اس کانٹوں والے گھیر پر پڑی۔ انھیں دیکھ کر چاندنی خوب ہنسی اور دل میں کہنے لگی "یا خدا کوئی دیکھے تو۔ کتنا ذرا سا مکان ہے اور کیسا چھوٹا سا گھیر۔ یا اللہ، میں اتنے دن اس میں کیسے رہی؟ اس میں آخر سماتی کیسے تھی؟" پہاڑ کی چوٹی پر سے اس ننھی سی جان کو نیچے کی ساری دنیا ہیچ نظر آتی تھی۔

چاندنی کے لیے یہ دن بھی عجیب دن تھا۔ دوپہر تک اتنی اُچھلی کودی کہ شاید ساری عمر میں اتنی اُچھلی کودی نہ ہوگی۔ دوپہر ڈھلتے اسے پہاڑی بکریوں کا ایک گلّا دکھائی دیا۔ گلّے کی بکریوں نے اسے خوشی خوشی اپنے پاس بلایا۔ اور اس سے حال احوال پوچھا۔ گلّے میں کچھ جوان بکرے بھی تھے۔ انھوں نے بھی چاندنی کی بڑی خاطر تواضع کی۔ بلکہ اس میں ایک بکرا تھا ذرا کالے کالے رنگ کا جس پر کچھ سفید ٹپکے تھے وہ چاندنی کو بھی اچھا لگا۔ اور یہ دونوں بہت دیر تک اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ ان میں نہ جانے کیا کیا باتیں ہوئیں۔ اور کوئی تو تھا نہیں، ایک چشمہ پانی کا بہہ رہا تھا اس نے سنی ہوں گی۔ کبھی کوئی وہاں جائے اور اس چشمے سے پوچھے تو شاید کچھ بتا سکے۔ اور پھر بھی کیا خبر۔ یہ چشمہ بھی شاید نہ بتائے۔ ایک کی بات دوسرے سے کہنا کچھ اچھی بات نہیں۔

خیر۔ بکریوں کا گلّا تو نہ معلوم کدھر چلا گیا۔ وہ جوان بکرا بھی اِدھر اُدھر گھوم کر اپنے ساتھیوں میں جا ملا۔ چاندنی کو ابھی آزادی کی اتنی آرزو تھی کہ اس نے گلّے کے ساتھ ہو کر ابھی سے اپنے اوپر پابندیاں لینا گوارا نہ کیا۔ اور ایک طرف کو چل دی۔ شام کا وقت ہوا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سارا پہاڑ لال سا ہو گیا اور چاندنی نے سوچا "او ہو، ابھی سے شام؟" نیچے ابو خاں کا گھر اور وہ کانٹوں والا گھیر دونوں کہر میں چھپ گئے تھے۔ نیچے کوئی چرواہا اپنی بکریوں کو باڑے میں بند کرنے لیے جا رہا تھا۔ ان کی گردن کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چاندنی اس آواز کو خوب پہچانتی تھی اُسے سن کر اداس سی ہو گئی۔ ہوتے ہوتے اندھیرا ہونے لگا اور پہاڑ میں ایک طرف سے آواز آئی "خو خو"

یہ آواز سن کر چاندنی کو بھیڑیے کا خیال آیا۔ دن بھر ایک دفعہ بھی اس کا دھیان ادھر نہ گیا تھا۔ پہاڑ کے نیچے سے ایک سیٹی اور بگل کی آواز آئی۔ یہ بیچارے ابّو خاں تھے جو آخری کوشش کر رہے تھے کہ اُسے سن کر چاندنی پھر لوٹ آئے۔ اُدھر سے یہ کہہ رہے تھے "لوٹ آ۔ لوٹ آ"، اِدھر سے دشمن جان بھیڑیے کی آواز آ رہی تھی۔

چاندنی کے جی میں کچھ تو آئی کہ لوٹ چلے۔ لیکن اسے کھونٹا یاد آیا، رسّی یاد آئی، کانٹوں کا گھیر یاد آیا۔ اور اس نے سوچا کہ اس زندگی سے تو یہاں کی موت اچھی۔ آخر کو سیٹی اور بگل کی آواز بند ہو گئی۔ پیچھے سے پتّیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ چاندنی نے مڑ کر دیکھا تو دو کان دکھائی دیے۔ سیدھے کھڑے ہوئے اور دو آنکھیں جو اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ بھیڑیا پہنچ گیا تھا۔

بھیڑیا زمین پر بیٹھا تھا۔ نظر بیچاری بکری پر جمی تھی۔ اسے اطمینان تھا جلدی نہ تھی۔ خوب جانتا تھا کہ اب کہاں جاتی ہے۔ بکری نے جو اس کی طرف رُخ کیا تو یہ مسکرائے اور بولے "او ہو۔ ابّو خاں کی بکری ہے۔ خوب کھلا کھلا کر موٹا کیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی لال لال زبان اپنے نیلے نیلے ہونٹوں پر پھیری۔ چاندنی کو کلّو کا قصہ یاد آیا، جو ابّو خاں نے بتایا تھا اور اس نے سوچا کہ میں کیوں خواہ مخواہ رات بھر لڑ کر صبح جان دوں۔ ابھی کیوں نہ اپنے کو سپرد کر دوں۔ لیکن پھر خیال کیا کہ نہیں۔ اپنا سر جھکایا، سینگ آگے کو کیے اور پینترا بدل کر بھیڑیے کے مقابل آئی کہ بہادروں کا یہی شیوہ ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ چاندنی اپنی بساط نہ جانتی تھی اور بھیڑیے کی طاقت کا اندازہ اسے نہ تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ بکریاں بھیڑیے کو نہیں مار سکتیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنی بساط کے مطابق مقابلہ کرے۔ جیت ہار پر اپنا قابو نہیں۔ وہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ مقابلہ ضروری ہے۔ جی میں یہ سوچتی تھی کہ دیکھوں میں کلّو کی طرح رات بھر مقابلہ کر سکتی ہوں یا نہیں۔

کچھ دیر جب گزر گئی تو بھیڑیا بڑھا۔ چاندنی نے بھی سینگ سنبھالے۔ اور وہ وہ حملے کیے ہیں کہ بھیڑیے کا جی جانتا ہوگا۔ دسیوں مرتبہ اس نے بھیڑیے کو پیچھے ریل دیا۔ ساری رات اسی میں گزری۔ کبھی کبھی چاندنی اوپر آسمان کی طرف دیکھ لیتی اور ستاروں سے آنکھوں آنکھوں میں کہہ دیتی اے کاش اسی طرح صبح ہو جائے۔

ستارے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے۔ چاندنی نے آخری وقت میں اپنا زور دوگنا کر دیا بھیڑیا بھی تنگ آ گیا تھا کہ دور سے ایک روشنی سی دکھائی دی۔ ایک مرغ نے کہیں سے بانگ دی۔ نیچے بستی میں مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ چاندنی نے دل میں کہا اللہ تیرا شکر ہے۔ میں نے اپنے بس بھر مقابلہ کیا۔ اب تیری مرضی۔ مؤذن آخری دفعہ اللہ اکبر کہہ رہا تھا کہ چاندنی بے دم زمین پر گر پڑی۔ اس کا سفید بالوں کا لباس خون سے بالکل سُرخ تھا۔ بھیڑیے نے اسے دبوچ

لیا اور کھا گیا!

اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اس پر بحث ہو رہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی۔ سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی سی چڑیا ہے وہ مصر ہے کہ چاندنی جیتی۔

عقاب

پہاڑ کے دامن میں ایک ہری بھری لہلہاتی وادی ہے۔ جدھر دیکھو گھاس کا فرش، ننگے پاؤں بھی چلو تو ایسا معلوم ہو کہ پیر میں کسی ہوشیار کاری گر کا بنایا ہوا بہت نرم چمڑے کا جوتا ہے، بالکل ٹھیک، نہ ڈھیلا نہ تنگ۔ وادی میں چھوٹا سا دریا بہتا ہے۔ یہ پہاڑی چشمہ ہے۔ اس لیے پانی صاف ہے جیسے آئینہ، اور ٹھنڈا اولا۔ دریا سے کچھ ہٹ کر ذرا اونچے پر بستی ہے۔ بیچ میں چوڑی چکنی سڑک، اِدھر اُدھر سفید سفید مکان، چھتیں ڈھلوان سرخ سرخ، بازار بڑے سلیقے کا، دکانیں خوب سجی ہوئی، چوکھٹوں اور دروازوں پر ہرا ہرا رنگ جیسے ابھی کل ہی کسی نے کیا ہو۔ گاؤں کے اردگرد دھان کے ایسے لہلہاتے کھیت، کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ یوں کہنے کو تو سب کھیت ہرے ہیں، پر ہر ایک کا رنگ الگ الگ ہے، کوئی ہلکا انگوری، کوئی اس سے ذرا تیز مونگیا، کوئی گہرا کاہی، کسی میں پیلاہٹ جھلکتی کسی میں نیلاہٹ۔ ایسا لگتا کہ کسی پہاڑی پری کی شادی ہو اور بڑی برات آنے کو ہو۔ عزیز قریب پریوں کے یہاں سے ہرے قالین منگا کر محفل کے لیے بچھائے گئے ہوں۔ ہیں سب ہرے، پر ہر ایک کا ہرا پن اپنا اپنا ہے۔ کیسی بڑی برات ہوگی کہ جہاں تک نظر جاتی ہے یہ ہرا فرش بچھا دکھائی دیتا ہے۔

کھیتوں سے پرے بھی ہر جگہ سبزہ ہی سبزہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ گھاس کے دن بھی یہاں پھرے ہیں اور یہاں کا ہوا پانی اُسے خوب راس آیا ہے۔ مگر ذرا دیکھو تو اس کی شوخی، بیٹ کیا بھرا کہ لگی دُور کی سوجھنے۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، لگیں پہاڑ پر بھی چڑھنے۔ پہلے تو اس کی شوخی دیکھ کر یہ پُرانی پُرانی چٹیل چٹانیں، جنھوں نے بہتیرے نرم گرم سہے ہیں، مسکرائیں۔ ایک چٹان نے دوسری سے کہا: "اری بہن تم نے دیکھا، یہ نیچے ہرا ہرا سا کیا ہے جو ہر گھڑی میرے پیروں پر سُرسُر رینگتا ہے؟" دوسری بولی: "وہ ہے کون، بد تمیز ہے، تم نے خواہ مخواہ کو منہ لگایا ہے۔ کل میرے تلوے میں بھی تو گدگدی کر رہی تھی، بڑی آئی کہیں کی!" چٹانوں میں روز ایسی ہی باتیں ہوتیں مگر بی گھاس اپنا کام کیے گئیں۔

پیامِ تعلیم نومبر۔ دسمبر ۱۹۳۵ء

پہاڑ پر چڑھنے میں دم پھول پھول جاتا تھا مگر اُس نے جو ٹھان لی تھی وہ کر ہی گزری۔
چٹانوں کی بولی یہ خوب سمجھتی تھی۔ انھیں بُرا بھلا کہتے سُنتی تو جی ہی جی میں کہہ لیتی: "کیے جاؤ بک بک اور ہنسے جاؤ مجھ پر۔ مگر ہنسنا اسی کا جو آخر میں ہنسے۔ میں نے جو جی میں ٹھانی ہے وہ میں خوب جانتی ہوں اور دیکھنا، اللہ نے چاہا تو ایک دن کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ یوں ہی چھوٹے چھوٹے قدموں سے بڑی بڑی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔"

غرض ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُس نے کوئی آدھی آدھی چٹانوں کو بالکل ڈھک لیا۔ چٹانوں نے سوچا کہ یہ تو ہنسی ہنسی میں منہ کو آتی ہے۔ کچھ جھنجھلا کر سر جو ہلایا تو پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے اُس پر آکر گرے اور آگے جانے کا راستہ بند کر دیا۔

پتھروں کے گرنے کی جو آواز ہوئی تو بی کائی جو کہیں پڑی سو رہی تھیں جاگیں اور انگڑائی لے کر جو دیکھا تو چاروں طرف گھاس ہی گھاس کی عمل داری ہے۔ اس پر انھیں بھی کچھ طیش آیا۔ آگے بڑھ کر بولیں کہ "بس مذاق ہو چکا۔ اب آگے قدم بڑھایا تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ میرا علاقہ ہے۔ تیرے لیے تو نیچے سارا میدان چھوڑ دیا ہے۔ وہاں کیوں نہیں جاتی۔ ہمیشہ پرائی چیز ہی کو تکتی ہے۔ ندیدی کہیں کی، خبردار جو ادھر کا رُخ کیا۔" تھوڑے دنوں میں کائی نے ان سب لڑھکے ہوئے پتھروں کو اپنی کاہی وردی پہنا کر اپنے لشکر میں داخل کر لیا تو ان کے بھی ذرا پر نکلے۔ سوچا کہ گھاس کی طرح آگے قدم بڑھاؤں اور پہاڑ کی چوٹی پر بھی اپنا قبضہ جماؤں۔ مگر یہ چٹانیں ہیں کہ اللہ کی شان، انھیں کسی اور کا لباس نہیں بھاتا۔ ان کی اپنی آن بان کیا کم ہے جو رنگین کپڑوں سے اُسے بڑھانے کی کوشش کریں۔ یہ تو جسے اپنے اوپر بھروسا نہ ہو وہ بزاز اور درزی کے یہاں سے عزت مول لائے، بس انھیں تو اپنے چہرے کے سامنے بادلوں کا بھیگا بھیگا پردہ اچھا لگتا ہے۔ یا دن میں دھوپ کی ہلکی سی چادر اوڑھ لی اور شام کو شفق کا سُرخ اور سُنہرا دوشالا سر پر ڈال لیا۔

ہاں تو چٹان کے اس اوپر والے حصے میں ایک عقاب رہتا تھا۔ آدمیوں کی بستی سے دور اور اُن کے جھگڑوں ٹنٹوں سے الگ۔ صبح کو صاف صاف بھینی بھینی خوشبو والی ہوا جب اس کے گھونسلے پر آکر سلام کرتی تو یہ اپنے پروں کو ذرا ہلاتا، اپنے طاقتور بازوؤں کو پھیلاتا جیسے کوئی ہوائی جہاز والا سفر سے پہلے دیکھے کہ سب کل پرزے ٹھیک ہیں کہ نہیں۔ جب ذرا دھوپ نکل آتی اور نیچے کی دنیا اپنی روزی کے دھندوں میں لگ جاتی تو یہ بھی پر پھیلا چٹان سے اڑتا اور آہستہ آہستہ ساری وادی پر چکر لگا کر بستی کا، بستی والوں کا، کھیتوں کا اور تیز رو دریا کا معائنہ کرتا۔ کہیں کوئی کام کی چیز نظر پڑ گئی، کوئی خرگوش یا چوہا، کوئی کبوتر یا مرغی کا چوزا تو یہ بجلی کی طرح جھپٹتا اور آن کی آن میں اُسے اٹھا کر گھونسلے میں پہنچا دیتا۔ وہاں کھا پی کر پھر چٹان سے سنسار کا مطالعہ کرتا۔

یوں ہی نہ جانے کتنا زمانہ گزر چکا تھا۔ جب ہوا میں ننھے ننھے سفید روئی کے گالے سے ناچتے دیکھتا، یا برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چھتوں پر اس کے بازوؤں کا کالا سایہ اسے دکھائی دیتا تو یہ سمجھ جاتا تھا کہ اب سردی کا زمانہ آگیا۔ پھر پیڑوں کی کالی کالی ننگی شاخوں پر ہلکا ہلکا ہرا لباس دیکھتا اور چڑیوں کا چہچہانا اور مست ہو ہو کر گانا سنتا تو جان لیتا کہ بہار آگئی۔ میدان میں ہرنوں کے غول کے غول چوکڑی بھرتے دکھائی دیتے اور چٹان کے پاس سے دریائی پرندوں کے پرے کے پرے گرم ملکوں کے سفر کے قصد سے گزرتے تو یہ تاڑ جاتا کہ خزاں کی سواری آتے کو ہے۔ کوئی آئے، کوئی جائے، اس کی زندگی جیسی آج، ویسی کل، وہی چٹان، وہی تنہائی، وہی قوت کا احساس، نہ کسی کو سہارا دینے کا موقع نہ کسی سے مدد لینے کی ضرورت، بس اپنی دنیا آپ۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ عقاب اپنے صبح کے چکر پر نکلا تو بستی کے قریب ایک چھوٹا سا سفید جانور کھیلتا دکھائی دیا، یہ جھپٹا اور پلک کے ایک جھپکے میں اس ننھے سے سفید شکار کو اپنے پنجوں میں اٹھا لایا۔ اسے اِدھر سے دیکھا۔ اُدھر سے دیکھا۔ نہ خرگوش، نہ چوہا، نہ گلہری، نہ نیولا۔ اوہو، ننھا سا بلّی کا بچہ ہے اور "میاؤں میاؤں" کر رہا ہے۔ عقاب نے اُسے آہستہ سے اپنے بڑے سے گھونسلے کے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ جیسے پہلے بہتیرے جانوروں کو بٹھا چکا تھا، مگر اُسے مار کر کھانے کی ہمّت نہ ہوئی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ یہ خیال ہی دل میں نہ آیا۔

منّو ابھی بہت ہی ننھی سی تھی، سمجھ بوجھ بھی نہ تھی، شاید اسی لیے کسی کا ڈر خوف بھی دل میں نہ تھا۔ وہ کیا جانتی تھی کہ یہ عقاب چاہے تو اسے بھی چٹ کر جائے۔ یہ کچھ دیر تو کونے میں بیٹھی پھر اٹھ کر سارے گھونسلے میں گھومی، اِدھر اُدھر جو گوشت کے ٹکڑے پڑے تھے وہ کھائے۔ بس جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ لال لال زبان سے اپنا منہ پوچھا، اپنا سفید سفید بدن چاٹا، اور بن ٹھن کر گھونسلے کے دروازے پر آئی، اور چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔

عقاب منّو کو گھونسلے میں اکیلا چھوڑ کر پاس والی چٹان پر جا بیٹھا تھا۔ پہلے تو وہاں سے سب تماشا دیکھا کیا اور دل میں نہ جانے کیا کیا خیال آتے رہے۔ جب منّو چٹان کے سرے پر آئی تو اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ شاید مجھے ڈھونڈتی ہے! جھٹ اڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ "کیوں کدھر چلیں؟ یہ سن لو، میں جانے نہیں دوں گا۔" منّو ذرا پیچھے ہٹی، بیٹھ میں ایک کو بڑا سا بنایا، گھونسلے کی ایک دیوار سے بدن رگڑا اور گنڈلی منڈلی ہو کر بیٹھ گئی۔ عقاب بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور ذرا پیار سے اپنا سر جو منّو کی طرف بڑھایا تو منّو نے نہایت بے تکلفی سے اپنے مخمل جیسے ہاتھوں میں اس کا سر لے لیا اور لگی اس سے کھیلنے۔

تھوڑی دیر میں اُسے اپنے پنجوں سے کھجانے لگی۔ عقاب صاحب کو بھی یہ اچھا لگا تو حضرت نے آنکھیں بند کر لیں! مِنّو تھوڑی دیر تو سر سے کھیلی پھر اُٹھ عقاب کی پیٹھ پر جا بیٹھی وہاں سے اُتر اُس کی چونچ سے اپنا بدن رگڑا، پھر اس کے پروں تلے پہنچی اور سمٹ سمٹا کر اس کے دونوں پیروں کے بیچ کے بیچ میں جا بیٹھی اور لگی خُر خُر خُر کرنے۔

عقاب کے لیے یہ سب نئی باتیں تھیں۔ اس کے قریب بھی بھلا کون پھٹکتا تھا جو اس سے پیار کرتا اور کھیلتا۔ بس بیٹھے رہے جیسے دم بخود۔ پھر بولے: "مِنّو، سچ بتا، تو یہاں رہے گی؟ جی لگ گیا؟"

مِنّو بولی: "کیوں نہیں، رہوں گی کیوں نہیں؟ مجھے تمہاری چونچ اور تمہارے پر اور، ہاں، تمہاری آنکھیں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

عقاب اور یہ باتیں! بس حضرت ریشہ خطمی ہو ہو جاتے تھے۔ رات ہوئی تو مِنّو اس کے پروں میں گھس کر مزے سے گرم گرم سو گئی۔ عقاب کا یہ حال کہ نہ سوتوں میں نہ جاگتوں میں، بس ایک خواب کی سی حالت۔ "اتنے دن تو اکیلے کاٹے، نہ ساتھی نہ دوست، اب اس مِنّو کو اٹھا کر یہاں لا بسایا۔ دیکھو کیسی گزرے؟" بہت دیر اسی سوچ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جی چاہا کہ ذرا پروں کو اِدھر اُدھر کرے، مگر اس خیال سے کہ مِنّو جاگ جائے گی دیر تک ویسے ہی بیٹھا رہا۔ آخر کو اُس نے بھی اپنا سر پروں میں چھپا لیا اور سو گیا۔

غرض زندگی کے دن تو یوں بھی اچھے کٹتے تھے، اب ان میں ایک اور رنگ پیدا ہو گیا، کچھ گلابی گلابی سا۔ صبح صبح عقاب چلا جاتا، تھوڑی دیر میں شکار مار لاتا، گھونسلے میں آکر خود کھاتا اور مِنّو کو کھلاتا۔ دل ہی دل میں اکثر یہ سوچا کرتا کہ "میں چلا جاتا ہوں تو یہ میرا انتظار کرتی ہے کہ نہیں؟ ۔۔۔۔ مجھے یاد بھی کرتی ہے؟ نہ جانے میں اسے اچھا بھی لگتا ہوں؟"

شکار میں سے اچھا اچھا مال ہمیشہ مِنّو کو دیتا اور گھٹیا خود کھاتا۔ ایک زمانہ یوں کٹ گیا۔ مگر اب سُنیے۔ بی مِنّو کا دل لگا گھبرانے! ہر وقت "میاؤں میاؤں" کی رٹ، نہ عقاب کا سر کھجانا، نہ اُس سے کھیلنا۔ یہ کچھ چھیڑ چھاڑ کرے تو مخمل کے سے گدّوں میں سے لوہے کے سے کانٹے باہر نکل آئیں اور خُر خُر کی جگہ ناک چڑھا کر عجیب کھسیانی سی آواز۔ پہلے تو دو ایک دن مِنّو کی ان باتوں میں بھی عقاب کو بڑا مزا آیا۔ پھر کچھ گھبرایا۔ مگر سمجھ میں نہ آیا کہ بات کیا ہے اور عقاب بہت ہی اُداس رہنے لگا ایک دن نہایت سنجیدگی کے ساتھ مِنّو سے بولا "کیا تیرا جی اب یہاں نہیں لگتا؟ مِنّو، دیکھ تو سہی، ہماری زندگی کیسے مزے سے کٹتی ہے۔ یہاں اوپر رہتے ہیں۔ آدمیوں اور ان کی ساری گندگیوں سے دور، صاف ہوا اور سورج کی گرمانے والی روشنی۔ میری آنکھیں دیکھ، ان میں سورج کی ساری

گرمی چھپی ہے۔ میرے پر دیکھ، جی کہتا ہے کہ ایک دفعہ سارے سنسار کو ان پر لے اُڑوں۔ آ، اُن پر بیٹھ جا، تجھے ساری دنیا کی سیر کرا لاؤں۔ سمندر دکھلاؤں جس کی نہ تھاہ نہ چھور، پہاڑوں کے سروں پر برف کے تاج دکھلاؤں اور کہے تو صحرا کی تپتی ہوئی ریت کا نظارہ کرا دوں۔ نہیں، تیرا جی چاہے تو ان بازوؤں پر بٹھا کر تجھے آفتاب تک لے اُڑوں۔ منّو چپ چاپ سنتی رہی اور کچھ نہ بولی۔ عقاب کچھ دیر بعد پھر بولا: "پیاری منّو۔ دیکھ تو ہمارا گھر کیسا اچھا ہے؟ ایسی جگہ بھلا کس کو ملتی ہے؟ جب نیچے وادی میں اندھیرا گھپ ہوتا ہے تو ہم تم یہاں سے صبح کی پو پھٹتی دیکھتے ہیں۔ طوفان جس سے دنیا والے ڈرتے کانپتے ہیں ہمارے دروازے پر کیسے کیسے گیت گاتا ہے، کیا تجھے اس کا گانا اچھا نہیں لگتا؟ وادی والے آزادی کا مزا کیا جانیں۔ وہاں تو غلام بستے ہیں غلام۔ ننھے ننھے سے جی، ہر دم خوف، ہر دم ہراس، کسی کی ہمت بھی ہے جو یہاں آئے؟" مگر منّو کے چہرے پر وہی غم اور کھسیانا پن۔ عقاب نے کہا: "آخر بولتی کیوں نہیں؟" تو بولی: "بولوں کیا؟ مجھے اس سارے قصّے سے کیا مطلب! یہ رام کہانی کسی اور کو سناؤ، میں تو یہ جانتی ہوں بس کہ اگر یہاں رہوں گی تو جان سے جاؤں گی۔ تمہاری اس بلندی پر نہ جینے کا مزا نہ مرنے کا۔ میرا جی نہیں لگتا۔ مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔ چکر آتا ہے، دل دھڑکتا ہے۔ نہ یہاں کوئی ہے جس سے کھیلوں۔ نہ دودھ کی ہنڈیا، نہ گرم گرم چولہا۔ تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو؟ مجھے نہ صحرا درکار ہے نہ برفستان۔ اور تمہارے اتھاہ سمندر کے نظارے سے کہیں زیادہ مجھے دودھ کی بالائی کی چکناہٹ اچھی لگتی ہے۔ تمہارے سہارے اُڑوں تو چکّر کھا کر گر دوں۔ خود اپنے پر نہیں۔ مجھے تو نیچے وادی میں پہنچا دو، بس وادی میں پہنچا دو مجھے۔"

عقاب کو نہ جانے کیوں ایسا لگا جیسے کسی نے تاک کر ٹھیک دل پر تیر مارا ہو۔ گھونسلے کی لکڑیوں کو چونچ سے دبایا اور نہ جانے کتنے زور سے دبایا کہ سب چرچر ٹوٹ گئیں۔ منّو کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں یا خون ٹپک رہا ہے۔ پروں میں کچھ جنبش سی ہوئی اور سانس میں کچھ آواز سی پیدا ہو گئی۔ نہ جانے دل میں کیا کیا آیا۔ مگر منہ پھیر کر اڑ گیا اور دوسری چٹان پر جا کر ایک نہایت تاریک سی دراز میں منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ نہ دن کی خبر نہ رات کی سُدھ، نہ اُڑنے کی، نہ شکار کی۔ دو دن یوں ہی گزار دیے۔ مگر پیٹ بُری بلا ہے۔ اس کا تقاضا جینے کے تقاضے سے کم نہیں ہوتا۔ بھوک نے بیتاب کیا تو اٹھا لیکن اڑ کر سیدھا اپنے گھونسلے میں گیا۔ بے کہے سُنے منّو کو اٹھایا اور بستی میں جہاں سے اُسے لایا تھا وہیں جا کر چھوڑ دیا۔ منّو جھٹ پاس والے گھر میں گھس گئی۔ آنگن میں گھومی، برآمدے میں گئی۔ باورچی خانے میں ذرا ایک ہانڈی چاٹی اور پھر عقاب کی نظر سے جو پاس ہی ایک پیڑ پر بیٹھ گیا تھا اوجھل ہو گئی۔ عقاب کو بڑا ہی دکھ ہوا کہ منّو نے ایک مرتبہ بھی تو مڑ کر

اس کی طرف نہ دیکھا، نہ رخصت ہوئی، نہ دُعا، نہ سلام۔

کچھ غصّے میں، کچھ مایوس، یہ پیڑ پر سے اُڑا اور اُسی مکان کا چکّر لگا رہا تھا کہ آواز آئی "ٹھائیں" اور یہ پرشکستہ نیچے گر پڑا۔ کسان دوڑا ہوا اُس کے پاس آیا اور چلّایا "عقاب ہے عقاب"۔ اِدھر اُدھر سے بہت سے لڑکے بالے اور چار چھ کسان اور جمع ہو گئے گاؤں میں خبر ہوئی کہ منّا نے عقاب پکڑا ہے تو اُس کو دیکھنے سب ہی آئے۔ منّا نے اس کے پاؤں میں ایک مضبوط سا حلقہ ڈال کر زنجیر میں اُسے اٹکا دیا۔ منّو اتنی دیر میں باورچی خانے سے چھت پر جا پہنچی تھی وہاں بیٹھی اپنا بدن چاٹ رہی تھی اور کنکھیوں سے عقاب کو دیکھتی جاتی تھی۔ جب سب لوگ عقاب کو دیکھ دا کھ کر چلے گئے تو یہ پاس گئی اور بولی "کیوں نہ کہتی تھی کہ یہ اُڑنا کسی دن رنگ لائے گا؟ مگر تم سنتے ہو کسی کی؟ اب مزا چکھ لیا نا! اب بھی سمجھ جاؤ تو اچھا ہے۔ مگر خیر، فکر مت کرو۔ میں روز موٹے موٹے تازے چوہے مار لا کروں گی۔ تم اپنے آپ دیکھ لوگے کہ یہاں کی قید میں بھی کیا مزا ہے" یہ کہہ کر گئی اور ایک موٹا سا چوہا اس کے سامنے لا ڈالا۔ مگر عقاب نے اُسے چھوا بھی نہیں۔ اور اُن آگ بھری آنکھوں سے جو سورج تک سے نہ جھپتی تھیں منّو کو کچھ اس طرح دیکھا کہ یہ بھی گھبرا سی گئی اور بولی:۔ "معاف کرنا مجھے افسوس ہے۔ کیا درد بہت ہو رہا ہے؟" عقاب نے جواب دیا! "معلوم نہیں"۔ منّو بولی "خدا کا شکر ہے کہ تم نہیں جا سکتے اور جانے کا تو اب خیال ہی چھوڑ دو۔ مجھے تو اس چٹان کی تنہائی اور بلندی کا خیال آتا ہے تو کلیجا کانپتا ہے۔ تمہارا بازو ذرا ٹھیک ہو جائے تو میں سب کچھ تمہیں لے جا کر بتاؤں گی۔ پھر تم خود چوہے پکڑ لیا کرنا اور دودھ اور بالائی اور دہی دیکھ کر تو سچ کہتی ہوں تمہارا جی خود یہاں سے جانے کو نہ ہوگا۔ سردیوں میں ہم تم دونوں اسی پاس والے کمرے میں ساتھ ساتھ سو رہا کریں گے۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں ساتھ ساتھ چھتوں پر ٹہلا کریں گے۔ سچ کہتی ہوں یہاں بڑا مزا ہے۔ اب یہاں سے نہ جانا۔ تمہیں میری قسم ہے"۔ عقاب پھر چپ ہی ہو رہا۔ منّو کو یہ بات بہت ہی بُری لگی۔ بگڑ کر بولی "دماغ ابھی آسمان ہی پر ہے۔ یہاں بھی رعب جمانا چاہتے ہو۔ ہم تو خوشامد کیے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ مزاج ہی نہیں ملتا۔ ہاں اُن چٹانوں میں رہ کر کسی کو کہیں تہذیب آئی ہے بس معاف کیجیے۔ بہت دن تک آپ کے ساتھ مصیبت جھیلی۔ خدا حافظ" یہ کہہ کر وہاں سے چل دی اور پھر اِدھر کا رخ نہ کیا۔

جس دن عقاب کے گولی لگی ہے اس دن سے پانی کی ایسی جھڑی لگی کہ ساتویں دن جا کر کھلی۔ یہ ہفتہ بھر اسی زنجیر میں بندھا بیٹھا رہا۔ نہ کھانا، نہ پینا۔ دھوپ جو نکلی تو دن بھر اس میں بدن سینکا۔ شام قریب آئی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی سے پہاڑ کی چوٹیاں آگ کی طرح دمکنے لگیں تو اس کے دل کی کچھ عجیب حالت ہوئی۔ پہاڑ سے کسی نے اپنی طرف اُسے کھینچنا شروع کیا۔ اس نے پر پھیلائے تو وہ سیدھا بازو جس میں گولی لگی

تھی پورا کھل گیا، زخم بھر چکا تھا۔ اُسے پہلے تو یقین نہ آیا۔ پھر بازو پھیلا کر دیکھا۔ ایک بار، دو بار، تین بار۔ جب یقین ہو گیا کہ ٹھیک ہے تو کچھ نہ پوچھو کہ اس کے دل کی کیا حالت ہوئی۔ ایک چیخ ماری اس زور سے کہ متّو باورچی خانے میں سہم سی گئی۔ ایک جھٹکا دیا ایسا کہ زنجیر الگ ٹوٹ کر گری۔ پیر سے خون کی چند بوندیں زمین پر گریں اور یہ نہایت شاہانہ انداز سے اڑا، یہ جا، وہ جا۔ آن کی آن میں اتنا اونچا پہنچا کہ شام کے دھند لکے میں دکھائی بھی مشکل سے دیتا۔ بہت اوپر پہنچ کر، پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ سانس پھولا ہوا تھا۔ نیچے وادی تھی، متّو کا گھر اور انسانوں کی بستی۔ اس نے نیچے دیکھا، کچھ حقارت سے پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کر اوپر نظر کی۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر اب بھی آگ سی لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اندھیرا ہو گیا اور تھوڑی دیر میں پہاڑ اور جنگل اور ہوائیں سب سو گئیں، سارے سنسار پر خاموشی چھا گئی عقاب بھی چپ چاپ سناٹے میں بیٹھا تھا کہ یکا یک ایک عجیب درد بھری آواز سنائی دی۔ یہ آواز خود اسی کے سینے سے نکلی تھی۔ اس کے بعد پھر سناٹا ہو گیا: تاریکی سارے آسمان پر چھا گئی اور اس اندھیاری میں ستاروں کے سفید سفید چہرے چم چم کرنے لگے۔ ہر ایک اپنی اپنی بندھی ہوئی راہ پر چپ چاپ چل رہا تھا۔ نہ چیخ نہ پکار، نہ کسی سے جھگڑا نہ ٹنٹا۔ اپنے کام سے کام، ہر ایک کا اپنا اپنا دھرم اور اپنی اپنی تقدیر۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کی آنکھوں میں جو ذرا سی خشکی سی پیدا ہو گئی تھی تو اُس نے انھیں بند کر لیا۔ اور نہ جانے کتنی دیر یوں ہی بیٹھا رہا اور کیا کیا خیال اُس کے سر میں گزرتے رہے، جیسے کوئی خواب دیکھتا ہو۔ پھر آنکھ کھولی تو بولا "خدا کا شکر ہے۔ پھر آ پہنچا اپنے وطن میں، پھر پالیا اپنا دیس، تو اکیلا ہی رہنے کو بنا ہے۔ بس اکیلا ہی رہ۔ تیرے ساتھی اگر ہیں تو یہی ستارے اور یہی چٹانیں، یہی چاند، یہی سورج جو اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور کسی اور کے کام میں دخل نہیں دیتے۔"

پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی

گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا، اور اس کی بیوی۔ کسان کا نام تھا منسا اور اس کی بیوی کا گریا۔ ان کے پاس روپیہ پیسہ اچھا خاصا تھا مگر گھر میں کام کرنے والے آدمی کم تھے۔ اس لیے ہمیشہ دوسروں سے یا تو مزدوری پر کام لینا پڑتا تھا یا میٹھی بات کرکے۔

بیساکھ کا مہینہ تھا۔ منسا کے کھیتوں میں گیہوں کی فصل خوب ہوئی تھی۔ اور کھیت کٹ بھی چکے تھے۔ اب بالیوں پر دائیں چلا کر دانے نکالنا باقی تھا۔ دوسرے سب کسان بھی اپنے اپنے کام میں لگے تھے۔ تم جانو ان دنوں جب فصل کٹتی ہے تو سب ہی کو تھوڑا بہت کام ہوتا ہے۔ اس نے بہتیرا چاہا کہ کوئی مزدور ملے، مگر نہ ملا۔ ادھر آسمان پر دو ایک دن سے بادل آنے لگے اور ڈر تھا کہ کہیں پانی پڑ گیا تو سب دانے خراب ہو جائیں گے۔

بیچ میں ایک دن کوئی تہوار آگیا، سب کسانوں نے اپنے یہاں کام بند رکھا اس لیے گاؤں میں بہت سے آدمیوں کو چھٹی ہوگئی۔ منسا ان کے پاس گیا اور مشکل سے پانچ آدمیوں کو پھسلا پوٹ کر لایا کہ بھائی ہماری دائیں چلا دو۔ گھر میں آکر بیوی سے کہا کہ تہوار کا دن ہے یہ لوگ کام کو آئے ہیں دوپہر کو انھیں پوریاں کھلانا۔ کوئی گیارہ بجے بیوی نے چولھے پر کڑھائی چڑھائی۔ کئی پلی کڑوا تیل کڑھائی میں ڈالا۔ آٹے کی ایک چھوٹی سی ٹکیا بنا کر پہلے تیل میں ڈالی اور جب تیل گرم ہو کر خوب کڑکڑانے لگا تو یہ ٹکیہ نکال لی۔ اس سے کڑوے تیل کی مہک کم ہو جاتی ہے اب بیلن سے بیل بیل کر کڑھائی میں پوریاں ڈالنی شروع کیں۔ کچھ پوریاں پک گئیں تو باورچی خانے میں کسان کا بیٹا بدھو جانے کہاں سے آیا اور ادھر ادھر چیزیں کھکورنے لگا اور ناک سے برابر سڑ سڑ سڑ سڑ کرتا جاتا تھا۔ ہونٹوں پر ناک بہہ رہی تھی۔ ماں نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور پلو سے اس زور سے ناک پونچھی کہ بدھو ٹن ٹن کرتا ہوا باورچی خانے سے چل دیا۔ کڑھائی میں جو پوری پڑی تھی وہ اتنی دیر میں جلنے لگی اور اسے برا لگا کہ بدھو کی ماں نے اس کا ذرا خیال نہ کیا اور اتنی دیر جلتے ہوئے تیل میں رکھ کر اسے تکلیف دی۔ بدھو کی ماں نے جلدی سے جو اسے پلٹنا چاہا تو یہ اور چڑ گئی اور جھٹ کڑھائی میں سے کود کر بھاگ کھڑی ہوئی کہ تم بدھو کی ناک پونچھو میں تو جاتی ہوں۔

پیام تعلیم جون ۱۹۳۸ء

بدھو کی ماں نے بہت چاہا کہ اسے پکڑے مگر وہ کہاں ہاتھ آتی ہے۔ جھٹ گھر میں سے نکل کھیت کی طرف بھاگی۔ راستے میں منسا اور اس کے پانچوں دوست دالوں پر دایئں چلا رہے تھے۔ یہ پوری ان کے پاس سے گزری اور کہا کہ "میں بُدھو کی ماں سے بچ کر کڑھائی سے نکل کر آئی ہوں تم سے بھی بچ کر نکلوں گی، لو مجھے کوئی پکڑ دو تو۔" ان آدمیوں نے جب دیکھا کہ اچھی بھلی یکایک پوری یوں پاس سے بھاگی جا رہی ہے تو کام چھوڑ کر اس کے پیچھے ہو لیے مگر وہ بھلا کہاں ہاتھ آتی تھی۔ یہ سب دوڑتے دوڑتے ہانپ گئے اور لوٹ آئے۔

کھیت سے نکل کر پوری کو بنجر میں ایک خرگوش ملا۔ اُسے دیکھ کر پوری بولی۔ "میں تو کڑھائی سے نکل کر، بدھو کی ماں سے بچ کر، اور چھے جوان جوان آدمیوں کو ہرا کر آئی ہوں۔ میاں جھٹ دُمے خرگوش تم سے بھی نکل بھاگوں گی۔" خرگوش کو یہ سُن کر اور ضد ہوئی اور اس نے بڑی تیزی سے اس کا پیچھا کیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ بی پوری ایک بھٹ میں نہ گھُس گئی ہوتیں تو اس جھٹ دُمے نے پکڑ ہی لیا تھا۔ مگر بھٹ کے اندر یہ لومڑی کے ڈر سے نہ گیا۔

پوری بھٹ میں جو گھُسی تو اس کے اندر ایک لومڑی بیٹھی تھی۔ اس نے جو دیکھا کہ ایک پوری گھُسی چلی آتی ہے تو جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی کہ اب آئی ہے تو جائے گی کہاں۔ مگر پوری اُلٹے پاؤں لوٹی اور یہ کہتی ہوئی بھاگی۔ "میں تو کڑھائی میں سے نکل کر، بدھو کی ماں سے بچ کر، چھے جوان جوان آدمیوں کو ہرا کر، اور میاں جھٹ دمے خرگوش کو اُلّو بناتی آئی ہوں۔ بی مُٹ دُمی لومڑی میں تمہارے بس کی بھی نہیں۔"

لومڑی نے کہا "کہاں جاتی ہے ٹھہر تو۔ تیری شیخی کا مزا تجھے چکھاتی ہوں۔" اور پیچھے لپکی۔ مگر پوری تھی بڑی چالاک، اس نے جھٹ سے ایک کسان کے مکان کا رُخ کیا اور لومڑی بھلا کتوں کے ڈر کے مارے ادھر کیسے جاتی؟ لاچار رک گئی۔

کسان کے مکان کے قریب ایک دُبلی سی بھوکی کتیا اور اس کے پانچ بچّے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ انھوں نے بھی ارادہ کیا کہ اس پوری کو چٹ کریں۔ پوری نے کہا "میں کڑھائی میں سے نکل کر، بدھو کی اماں سے بچ کر، چھے جوان جوان مردوں کو ہرا کر، میاں جھٹ دُمے خرگوش کو اُلّو بنا کر اور بی مُٹ دُمی لومڑی کے چونا لگا کر آئی ہوں۔ اجی بی بی لپ لپ میں تمہارے بس کی بھی نہیں۔"

کتیا بڑی ہوشیار تھی۔ آگے کو منہ بڑھا کر، جیسے بہرے لوگ کرتے ہیں، کہنے لگی۔ "بی پوری کیا کہتی ہو، میں ذرا اونچا سُنتی ہوں۔" پوری ذرا قریب کو آئی اور کتیا نے بھی بہروں کی طرح اپنا منہ اس کی طرف اور بڑھایا۔

پوری پھر وہی کہنے لگی "میں کڑھائی میں سے نکل کر، بدھو کی ماں سے بچ کر، چھے چھے جوان جوان مسٹنڈوں کو تھکا کر، میاں چھٹ دُمے خرگوش اور بی مُٹ دُمی لومڑی کو اُلّو بنا کر آئی ہوں۔ اجی بی لپ لپ ۔ ۔ ۔ ۔" اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ کتیا نے مُنہ مارا "ہپ" اور آدھی پوری اس کے مُنہ میں آگئی۔ اب جو آدھی پوری بچی تھی وہ ایسی تیزی سے بھاگی اور آگے جا کر نہ معلوم کس طرح زمین کے اندر گھس گئی کہ کتیا ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئی مگر کہیں پتا نہ چلا۔ کتیا نے اپنے پانچوں بچوں کو بلایا کہ ذرا ڈھونڈو تو لیکن بی پوری کا کہاں پتا لگتا ہے اس کتیا نے اور اس کے بچوں نے ساری عمر اس آدمی پوری کو ڈھونڈا مگر وہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔ ابھی تک سارے کتے اسی آدھی پوری کی تلاش میں ہر وقت زمین سونگھتے پھرتے ہیں کہ کہیں سے اس کا پتا چلے تو نکالیں اس نے ہماری دادی امّاں کو دھوکا دیا تھا۔ مگر اس آدھی پوری کا کہیں پتا نہیں چلتا! ۔

آخری قدم

آؤ، آج تمہیں ایک بہت اچھے آدمی کا حال سنائیں جسے اس کے جیتے جی بہتیرے لوگ بُرا بُرا کہتے تھے اور مرنے کے بعد بھی اس کی نیکی کا حال بس وہی جانتے ہیں جن کے ساتھ اس نے بھلائی کی تھی۔ اور شاید بعضے تو ان میں سے بھی بھول گئے ہوں گے۔

اس نیک آدمی کے پاس بڑی دولت تھی۔ مگر یہ ان لوگوں میں تھا جو اپنے دھن دولت کو اپنا نہیں سمجھتے بلکہ اللہ میاں کی امانت جانتے ہیں۔ جو بس اس لیے ان کے سپرد کی جاتی ہے کہ اسے اس کے بندوں پر صرف کریں۔ خود ان کی اُجرت یہ ہے کہ اس میں سے یہ بھی بس موٹا جھوٹا پہن لیں اور دال دلیا کھا کر گزر کر لیں۔

ہاں، تو یہ نیک آدمی بھی اپنی دولت سے خود بہت کم فائدہ اٹھاتا تھا۔ ایک صاف سے، مگر بہت چھوٹے مکان میں رہتا تھا۔ گزی گاڑھے کے بہت معمولی کپڑے پہنتا تھا۔ اور کھانے کا کیا بتاؤں کبھی چنے چاب لیے، کبھی مکا کی کھیلیں کھا لیں۔ ایک وقت ہنڈیا چڑھی تو تین وقت کے کھانے کا انتظام ہو گیا۔ دوست احباب جنھیں اس کے حال کی خبر تھی طرح طرح سے اسے کھیل تماشوں میں، رنگ رلیوں میں، گھسیٹنا چاہتے تھے۔ مگر یہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بہانا کر کے ٹال دیتا تھا۔ آخر کو سب میں بڑا کنجوس مشہور ہو گیا۔ اس کے دوست اُسے "میاں مکھی چوس" کہا کرتے تھے۔ بعض دوست اس کی دولت کی وجہ سے جلتے بھی تھے۔ وہ اسے اور بھی چھیڑتے اور بدنام کرتے تھے۔ مگر یہ دُھن کا پکا تھا۔ برابر چھپ چھپ کر چپ چپاتے اپنی دولت سے کسی نہ کسی مستحق کی مدد کرتا ہی رہتا تھا۔ اور اس طرح کہ سیدھے ہاتھ سے دیتا تو اُلٹے کو خبر نہ ہوتی اور زبان پر ذکر آنے کا تو ذکر ہی کیا۔

نہ جانے کتنی بیوائیں اس کے روپے سے پلتی تھیں! کتنے یتیم اس کی مدد سے پڑھ پڑھ کر اچھے اچھے کاموں سے لگ گئے تھے۔ کتنے مدرسے اس کی سخاوت سے چل رہے تھے۔ کتنے قومی کام کرنے والوں کو اس نے روٹی کپڑے سے بے فکر کر دیا تھا اور وہ یک سوئی

پیام تعلیم ــــ بھگ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی)

سے اپنی اپنی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ کئی شفاخانوں، دوا کا سارا خرچ اس نے اپنے سر لے لیا تھا اور ہزاروں دکھی بیماروں کو جانے اس کے روپے سے روز آرام پہنچتا تھا۔ لیکن یہ مشہور تھا وہی "کنجوس، مکھی چوس، دنیا کا کتا، نہ اپنے کام آئے نہ کسی اور کے" کوئی اس پر ہنستا تھا، کوئی خفا ہوتا تھا۔ سب اسے برا سمجھتے تھے!۔

آدمی کتنا ہی نیک ہو، دوسروں کے ہر دم برا کہنے سے، جی دکھتا ہی ہے اس کے دل کو بھی کبھی کبھی بڑی ٹھیس لگتی تھی۔ جھنجلاتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر بھر آتے تھے۔ مگر پھر صبر کر لیتا تھا۔

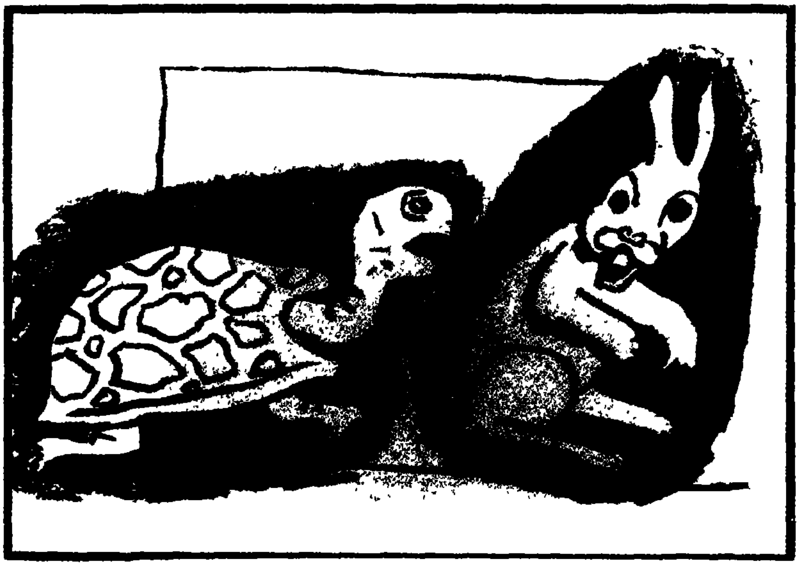
اس کے پاس ایک خوب صورت سی کتاب تھی۔ چکنا چکنا موٹا کاغذ۔ نیلے کپڑے کی سُبک سی جلد۔ پشتے پر سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا "حساب امانت"، اس کتاب میں یہ اپنا پیسے پیسے کا حساب لکھا کرتا تھا۔ جس کو کبھی کچھ دیا تھا سب اس میں درج تھا۔ کہیں کہیں کیفیت کے خانے میں بڑی دل چسپ باتیں لکھی تھیں۔ یہ سب بعد کو لکھی گئی تھیں۔ کسی یتیم کو پڑھنے کے لیے وظیفہ دیا ہے۔ ۱۵ سال بعد کی تاریخ دے کر کیفیت کے خانے میں درج ہے "اب احمد آباد میں ڈاکٹر ہیں۔ اور وہاں کے یتیم خانے کے ناظم"۔ کتابوں کے ایک کاروباری کو سخت پریشانی کے زمانے میں دو ہزار روپے دیے ہیں۔ کئی سال بعد کیفیت کے خانے میں لکھا ہے۔ "آج خط آیا ہے کہ انھوں نے رسول اکرمؐ کی سیرت پاک نہایت صاف اور سادہ زبان میں لکھوا کر ایک لاکھ نسخے طلبا میں مفت تقسیم کیے ہیں۔ خدا جزائے خیر دے" دلّی کے ایک مدرسے کو ایسے وقت کہ اس کا کوئی مددگار نہ تھا دس ہزار روپے دیے تھے۔ اندراج رقم کے سامنے کیفیت میں لکھا تھا، "سالانہ رپورٹ پڑھی۔ ہر صوبے میں اس کی ایک ایک شاخ قائم ہو گئی ہے۔ اس صوبے میں تو گاؤں گاؤں میں تعلیمی مرکز قائم کر دیے ہیں۔ یہ کام نہ ہوتا تو اس ملک میں مسلمانوں کی تمدنی ہستی کبھی کی ختم ہو چکی تھی"۔ اسی قسم کے بے شمار اندراجات تھے۔

اس کتاب کو یہ اکثر اٹھا کر پڑھنے لگتا تھا۔ خصوصاً جب کسی نادان دوست کی زبان سے دل دکھتا تو ضرور اس کتاب کی ورق گردانی کی جاتی تھی۔ اسے دیکھ کر کبھی کبھی مسکراتا بھی تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ مرتے وقت یہ کتاب ان لوگوں کے لیے چھوڑ جاؤں گا جو عمر بھر مجھے پہچانے بغیر میرا دل دکھاتے رہے۔ اس ارادے سے اسے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ سو سنار کی ایک لوہار کی انھوں نے ہزار دفعہ میرا جی خون کیا ہے۔ میں ایک دفعہ انھیں ایسا شرماؤں گا کہ بس سر نہ اٹھے گا۔ یہ سوچتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ ہوتے ہوتے بڑھاپا آن پہنچا۔ بدن جواب دینے لگا۔ روز کوئی نہ کوئی بیماری کھڑی ہے۔ ایک دفعہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سخت بیمار ہوا۔ بخار کھانسی۔ ایک دن دو دن۔ تیسرے دن سینے میں سخت درد شروع ہوا۔ کوئی پہر غفلت رہی۔ ہوش آیا تو سانس لینے میں بھی تکلیف ہوتی تھی۔ نمونیا کا حملہ تھا سخت حملہ۔ شام سے حالت غیر ہونے لگی۔ بار بار غفلت ہو جاتی۔

تھوڑی دیر کو ہیں آتا، پھر غفلت۔ کوئی چار بجے کے قریب ہوش آیا تو اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ وقت آن پہنچا ہے جو سب کے لیے آتا ہے اور جس سے کوئی بھاگ کر نہیں جا سکتا۔ چارپائی کے پاس ہی میز پر وہ نیلی خوب صورت کتاب "حساب امانت" بھی رکھی جسے ابھی بیماری میں بھی دو دن پہلے اٹھا کر پڑھا تھا۔ چند لمحے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایسے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ کتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کر اُسے اٹھانا چاہا۔ کئی مرتبہ کی کوشش میں اسے مشکل سے اٹھا پایا۔ پھر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ عظیم الشان گھڑی اور یہ چھوٹا خیال۔ ۔ ۔ ۔ان کو شرما کر تجھے کیا ملے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔تو اپنا کام کر چلا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔اپنے کام سے کام ۔ ۔ ۔ ۔ منزل آپہنچی ۔ ۔ ۔ ۔آخری قدم کیوں ڈگمگائے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔'' دونوں ہاتھوں میں کتاب تھامی ہاتھ تھر تھرا رہے تھے۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ اُٹھایا ہو۔ بڑی مشکل سے تکیے پر سے سر بھی کچھ اٹھایا اور ناتوان جسم کی ساری آخری قوت صرف کر کے کتاب کو اس پاس والی بڑی انگیٹھی میں پھینک دیا جس میں کوئی ڈھائی بجے نوکر نے بہت سے کوئلے ڈالے تھے اور میاں کو سوتا جان کر دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔

کتاب جلنے لگی۔ اس کی نظر اسی پر جمی تھی۔ جلد کے جلنے میں دیر لگی۔ پھر اندر کے کاغذوں میں آگ لگی تو ایک شعلہ اٹھا۔ اس کی روشنی میں اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ دکھائی دی اور چہرے پر ایک عجیب اطمینان، اُدھر مؤذن نے اشہد ان محمد الرسول اللہ کہا۔ اور نیکیوں کے اس کارواں سالار کی رسالت کے اعلان کے ساتھ ساتھ اس کی اُمّت کے اس نیک راہ رو نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

کچھوا اور خرگوش



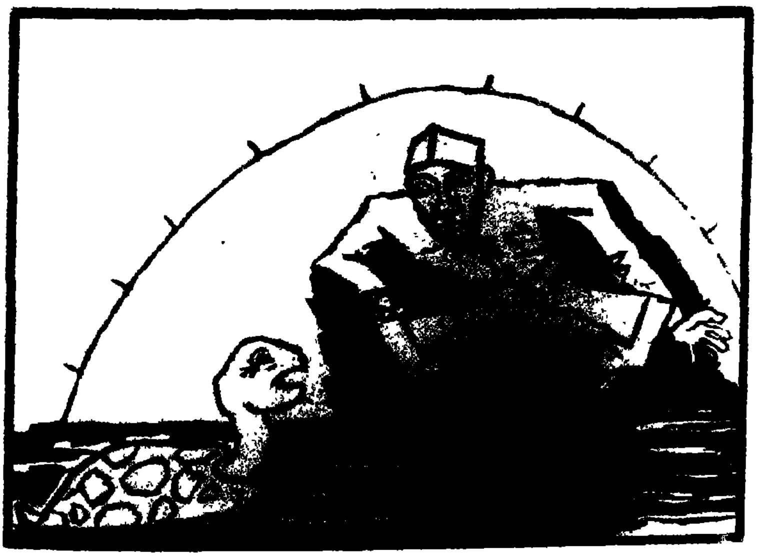
لیم ۔ ایف جین

راجدھانی دلّی سے کوئی پانچ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اوکھلا۔ جمنا سے لگا ہوا سمجھو۔ پہلے لوگ دلّی سے مچھلیاں پکڑنے آتے تو یہی اُن کا ٹھکانا تھا۔ پھر کوئی بیس پچیس برس ہوئے کچھ سرپھرے دیوانے دیوانے سے لوگ یہاں آکر بسنے لگے اور ایک مدرسہ سا بنانے لگے۔ ناسمجھ سے تو تھے ہی پر نہ جانے کیا لگن تھی کہ بے سروسامان اس گاؤں کے پاس ایک کھُلے میدان میں انھوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ پلّے نہ پیسہ نہ کوڑی، اور بڑے بڑے مکان بنانے شروع کر دیے۔ پورے کیسے ہوتے۔ برسوں ایسے مکانوں میں آپ بھی رہے اور مدرسے کے بچّوں کو بھی رکھا جن کے دروازوں میں کواڑ تک نہ تھے۔ ہوا ایک طرف سے اس بڑی

پیام تعلیم (۱۹۷۰ء میں پہلی مرتبہ نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہوئی)

عمارت میں گھستی تو دوسرے سرے تک گاتی سیٹیاں بجاتی چلی جاتی۔ مگر بہ تھے کہ ڈٹے رہے۔ دیکھنے میں بھولے بھولے ناداں سے لگتے تھے یہ لوگ پر تھے دُھن کے پکّے اور مست مگن۔ جمے رہے، تو ان کا کام بھی جمتا گیا، بڑھتا گیا۔ اب وہاں بہت بڑا مدرسہ کھڑا ہو گیا ہے۔ دُور دُور سے لڑکے اور لڑکیاں پڑھنے آتے ہیں۔ بڑے بڑے عالم اور ماہر اس میں پڑھاتے سکھاتے ہیں کتابیں لکھتے ہیں، لکچر دیتے ہیں۔ فرصت میں پُرانے دنوں کا ذکر آ جاتا ہے تو ہنس لیتے ہیں۔ کوئی کوئی دو ایک فقرے بھی کس دیتا ہے۔ دیوانوں پر فرزانے بھی نہ ہنسیں تو کون ہنسے اور وہ بھی اُن پر فقرے نہ کسیں تو کون کسے۔ سچ ہے ہر آدمی کی دنیا الگ الگ ہوتی ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی دنیا میں خوش رہتا ہے۔ پُرانے زمانے میں بھی لوگ ان پر ہنسا کرتے تھے۔ دیوانوں پر کون نہیں ہنستا۔ اور یہ خود ایسے مست تھے کہ آپ بھی اپنے اوپر اور اپنی بے سرو سامانی پر جی کھول کر ہنس لیتے اور دوسروں کو بھی ہنسا لیتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کچھ لوگ کہیں باہر سے ان کا حال سن کر ان کا کام دیکھنے آئے کام وام تو ایسا کیا تھا اور ہوتا بھی تو کام کوئی ایسے چلتے پھرتے کیسے دیکھے۔ یہ لوگ اصل میں یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کچھ پونجی پیسا ہے کہ نہیں۔ مدرسے کی عمارت ہے کہ نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ کسی دن یہ مست "ہو" کرکے اٹھ کھڑے ہوئے تو بس مدرسہ و درسہ سب ختم۔ تم جانو لوگ تو پائداری چاہتے ہیں۔ اور سُنا ہے کہ پائداری بڑے بڑے مکانوں اور بہت سے روپے سے ہوتی ہے۔ ہاں۔ تو کچھ لوگ اس مدرسے کو دیکھنے آئے۔ مدرسہ دکھانے کے لیے اس مدرسے کے ایک استاد اُن کے ساتھ تھے، جن پر دیوانگی اور سرمستی کا رنگ دوسرے ساتھیوں سے کچھ چوکھا ہی تھا۔



ایم۔ ایف۔ حسین

یہ عینک لگائے، کندھے پر اپنا لمبا سا رومال لٹکائے، کھدر کی صدری پہنے جدھر سے نکل جاتے ان کی مسکراہٹ دیکھ کر پھول، پتے، جانور، آدمی سبھی کھل جاتے۔ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے۔

کہاں کی بات کہاں پہنچی جاتی ہے۔ ہاں۔ تو یہ مست قلندران لوگوں کو مدرسہ دکھانے دلی سے ان کے ساتھ ہو لیے۔ تانگے پر آئے تھے۔ مدرسے کے سامنے اترنے کی جگہ یہ ساتھیوں کو اوکھلے کی نہر کے پل پر لے گئے۔ بڑی پر فضا جگہ ہے۔ ایک طرف جمنا، ایک طرف اس کی پانی سے لبریز نہر، ایک چھوٹا سا پل، اس کے آگے پانی روکنے کو لکڑی کے تختوں کی لمبی قطار، ارد گرد چمن۔ وہ سب اس جگہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بڑی تعریفیں کیں۔ انھیں خوش دیکھا تو مست نے کہا:

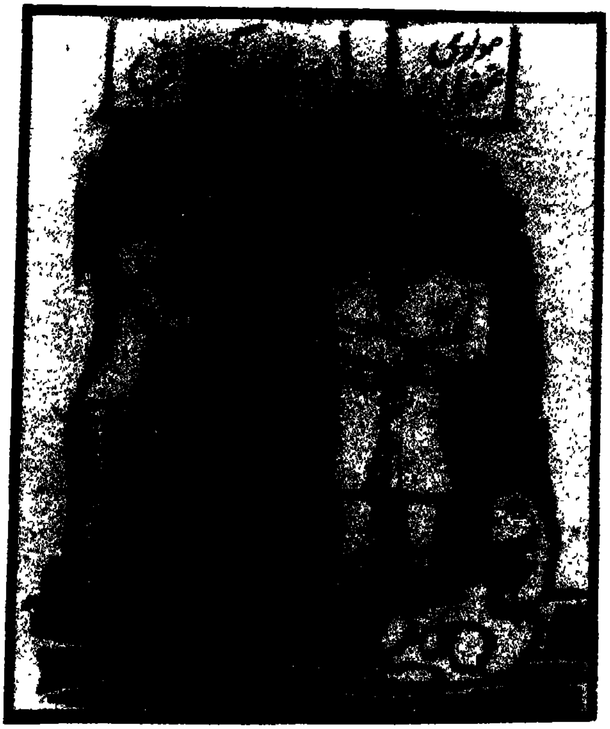
”یہی تو ہوا صاحب، کہ ہمارے شیخ نے پہلے اس پر فضا جگہ پر سارا سرمایہ لگا دیا اور مدرسے کی عمارت کے لیے کچھ نہ بچا۔ خیر اچھا ہوا۔ یہ جگہ تو بن گئی۔ وہ بھی آپ دوستوں کی مدد سے بن ہی جائے گی۔“

خیر۔ وہ زمانہ تو گزر گیا۔ ہر زمانہ گزر ہی جاتا ہے۔ اب وہاں عمارتیں بھی ہیں۔ کتابیں بھی ہیں۔ بڑے بڑے استاد بھی ہیں۔ ضابطہ اور قانون بھی ہے۔ ڈھنگ ہے، سلیقہ ہے، کام ہے۔ کوئی بیس برس سے اوپر اس مدرسے کو وہاں ہو گئے ہیں۔ سب اسے جان پہچان گئے ہیں۔ آدمی پہچانتے ہوں کہ نا پہچانتے ہوں، کہ آدمی کا کچھ ٹھیک نہیں، پر جانور، پیڑ، جمنا کی مچھلیاں، جن میں سے بعض ان کے استادوں سے باتیں کرنے پل کے ستونوں پر چڑھتی ہوئی بھی دیکھی گئی ہیں، دریا کے کچھوے، پاس کے کھیتوں کے تیتر، خرگوش، سب انھیں جان گئے ہیں اور ان کے دوست بن گئے ہیں۔ اس وقت آپ کو سنانا انھیں دوستوں کا ایک قصہ ہے۔

برسات کے موسم میں اوکھلے میں جمنا کے کنارے جہاں تک نظر جاتی ہے پانی ہی پانی پر پھیلتی چلی جاتی ہے۔ مگر جب پانی اتر جاتا ہے تو پل پار کر کے چلے جائیے تو لکڑی کے تختوں کے نیچے نیچے ریت کا ایک میدان ہوتا ہے اور پل کے اس سرے سے نیچے کو اتریے تو دریا کے کنارے کنارے دور تک جا سکتے ہیں۔ یہاں اس مدرسے کے استاد، کوئی کبھی کبھی، کوئی روز صبح صبح ٹہلنے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مدرسے کے بچے بھی ادھر سیر کو نکل جاتے ہیں۔ یہیں دریا میں ایک کچھوا، بہت بڑا سا کچھوا، اپنے خول میں بند، جیسے ایک مضبوط قلعے میں ہو، رہتا ہے۔ اور جب دیکھتا ہے کہ میدان خالی ہے تو یہ بھی پانی سے نکل کر ہلکے ہلکے چہل قدمی تو کیا، کہ چالیس قدم تو بہت ہوتے ہیں، آٹھ دس قدم چل لیتا ہے۔ ایک دن مولوی غفران ادھر ٹہلنے گئے۔ انھیں کچھوا کئی بار دیکھ چکا تھا۔ مولوی صاحب یوں بھی کم آمیز آدمی تھے۔ اس لیے کچھ پوری جان پہچان کی

نوبت نہیں آئی تھی۔ کچھوا انھیں دیکھتا تو آدھا پانی میں اور آدھا کنارے پر ہوتا اور مولوی صاحب اس خیال سے کہ جتنا تیز چلوں گا اتنا ہی وزن گھٹے گا تیز تیز اس کے پاس سے نکل جاتے تھے۔ اور چلتے بھی اس شان سے تھے کہ "نظر بر قدم" نہ ادھر دیکھنا نہ اُدھر کہ کہیں قدرت کے دل بہلاؤ فریب ان کی خودی کو کمزور نہ کر دیں۔ وزن کا گھٹانا اور خودی کا مضبوط رہنا بہر حال مقدم ہیں۔ وہ کچھوا ان کا چہرہ دیکھتا، کالی کالی ڈاڑھی کی چمک دیکھتا، اور سوچتا کہ بڑا نورانی چہرہ ہے۔ دھیان گیان والا منش دکھائی پڑتا ہے۔ اسے خیال ہوا کہ وہ جو ایک بات اتنے دن سے ستا رہی ہے وہ اُن سے پوچھوں۔ اس خیال سے ایک دن کنارے کے پاس باہر کو نکل آیا کہ مولوی صاحب پاس سے گزریں گے تو پوچھوں گا۔ مولوی غفران ٹھیک وقت پر گزرے۔ مگر کچھوے کی ہمت نہ پڑی۔ کچھ نہ بولا۔ اور یہ اسے دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے۔ دن بھر کچھوا اداس اداس رہا کہ ہم بھی کیسے بھسنڈی ہیں کہ ملّاجی سے ایک بات پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دوسرے دن تہجد ہی کے وقت سے کنارے پر آن بیٹھا کہ کہیں سویرے ہی ملّاجی نہ نکل جائیں۔ مولوی غفران تو کنجی دی ہوئی گھڑی کی طرح وقت کے پابند تھے۔ اپنے ٹھیک وقت پر وہاں سے گزرے۔ مگر وہی بے بدھ سرپٹ۔ کچھوا اپنے پوپلے منہ سے ایک بول بھی نہ نکال پایا کہ یہ گزروں آگے بڑھ گئے۔ مگر ہمت کر کے کچھوے نے اپنی بیٹھی بیٹھی بھرائی ہوئی آواز میں چلّا کر پکارا "ملّاجی، ملّاجی" مولوی غفران چلتے چلتے مراقبہ کرتے تھے۔ آواز جو آئی تو سمجھے غیب سے کوئی ندا ہے۔ جی دھک سے ہو گیا۔ عادت کے خلاف اِدھر اُدھر دیکھا، سامنے پیچھے، دائیں بائیں۔ مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ سمجھے کوئی شیطانی وسوسہ ہو گا۔ پھر آگے بڑھے تو کچھوے نے زور سے پکارا، اور چلّانے میں آواز اور بھی پھٹ گئی تھی "ہے ملّاجی شما کرو، ذرا تھمو۔ ایک پرشن پوچھنا ہے۔" ملّاجی ٹھٹکے، مڑ کے پیچھے دیکھا تو ایک بڑا سا کچھوا، ایک سخت خول سے ڈھکا ہوا، جیسے فولاد اور سینگ ملا کر جنگی ٹینکوں کا کوئی چھوٹا نمونہ بنایا ہو، آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ غریب کا سانس پھول گیا ہے۔ چہرے کے نیچے گردن بار بار ہوا سے پھول جاتی، پھر دب جاتی۔ مولوی غفران مڑ کر کچھوے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ فاصلہ کئی گز کا ہو گیا تھا۔ کچھوا جو خشکی پر آ کر ہمیشہ "آہستہ خرام بلکہ مخرام" کا وظیفہ سنسکرت شبدوں میں جپا کرتا تھا بڑی ہمت کر کے اس لمبی مسافت کو طے کرنے کا نشچے کر چکا تھا۔ اِدھر مولوی غفران کو وقت کا خیال، بولے "کیا بات ہے کہونا، بولتے کیوں نہیں،" کچھوا رُک گیا۔ جیسے رکنے کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہا ہو، پھر بولا "نمستے ملّاجی، نمستے! ایک پرشن پوچھنا ہے آپ سے۔ کرپیا ذرا تھمو۔ ابھی پالاگن کو آتا ہوں۔" مولانا بولے "تسلیم تسلیم۔ بھئی ہمیں تو دیر ہو رہی ہے۔ جو پوچھنا ہو پوچھیے۔ مگر یہ پرشن کیا ہوتا ہے؟" کچھوا بولا "ملّاجی۔ جو پوچھتے ہیں اس کو پرشن کہتے ہیں۔ اپنی اپنی بھاشا ہے، ملّاجی؟" "اچھا تو پوچھیے نا" مولانا نے کہا۔" ملّاجی، تُرت جو جھپٹا ہوں آپ کے پیچھے تو ہانپ گیا ہوں۔ آتے آتے ہی آپ تک

آپاؤں گا۔ آپ ہی دو ڈگ بھر کر نیک اِدھر کو آ جاتے تو بڑی کرپا ہوتی۔ پرشن میرے لیے اُدھک مہتو کا ہے۔ سوریہ نمسکار کے بعد سے آپ کی پرتیکھا میں ہوں۔" "پرتیکھا کیا چیز ہوتی ہے؟" "ملا جی میں نے کہا پرتیکھا میں ہوں۔ اتھوا آپ کے مارگ پر آنکھیں جمائے بیٹھا ہوں۔" "میری مرگ پر، میرے مرنے پر آنکھیں جمائے بیٹھے ہو۔ بہت اچھی رہی۔ واہ بھائی واہ۔ پنڈت کچھو رام، بہت اچھی رہی۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے، پنڈت جی، جو آپ کو میری موت کا اتنا انتظار ہے؟" کچھوا بولا۔ "ٹھیک ٹھیک۔ یہی جو آپ نے کہا انتجار میں سمجھتا ہوں پرتیکھا یہی ہے۔ شبدوں کا پھیر ہے۔ ملا جی بات ایک ہے۔" "اچھا پرتیکھا انتظار ہے تو آپ کو میری مرگ کا۔ میرے مرنے کا ایسا انتظار کیوں ہے۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے پنڈت جی؟" "ملا جی" کچھوا بولا "سب شبدوں کا پھیر ہے۔ آپ گرم نہ ہوں ملا جی۔ میں نے مارگ جو کہا تو مارگ اتھوا پتھ" اور "پتھ اتھوا۔" ملا جی نے پوچھا "پتھ اتھوا" "پتھ اتھوا۔ ہاں، پتھ اتھوا رستہ" ملا جی کچھ شرمندہ ہوئے کچھ مطمئن اور بولے "اچھا سمجھا۔ تو مطلب آپ کا یہ فرمانا تھا کہ آپ میری راہ تک رہے تھے۔ میرا انتظار کر رہے تھے۔ خیر کہیے۔ پوچھنا کیا ہے آپ کو۔ بس سوال کیجیے تو جواب دوں اور آگے چلوں۔" کچھوے نے کہا "ملا جی، سوال اتھوا اور جواب اتھوا۔" ملا جی بولے "بھئی یہ تو بڑی دیر ہو رہی ہے۔ جانتا تو لغت ساتھ لیتا آتا۔" "اور لُگت اتھوا" کچھوے نے کہا "بھائی دیکھو سوال تو وہ جو پوچھتے ہیں جس کو تم نے پرشن کہا تھا جواب وہ جو بتایا جائے



ایم۔ ایف۔ حسین

سے پوچھتے ہیں۔ اور لغت وہ جس میں لفظوں کا، بولوں کا، مطلب لکھا ہوتا ہے۔" "سمجھا سمجھا" کچھوے نے کہا۔ "سوال اتھوا پرشن۔ جواب اتھوا اتر۔ مطبل سو یہ شبد ہم نے اپنے بڑکھوں سے سن رکھا ہے۔ جب جمنا ندی ادھر نیلوی کھیری کے پاس بہتی تھی اور بڑے بڑے مسلمان سنت وہاں سوریہ نکلنے سے پہلے آکر منہ ہاتھ دھوتے کلا کرتے تھے، ان کی باتیں ہمارے بڑکھے سنا کرتے تھے۔ اس میں سے کچھ شبد یاد رہ گئے تھے۔ سو مطبل، تو ہم جانتے ہیں۔ مطبل، اتھوا ارتھ۔ ہاں اور لگت اتھوا شبد کوش جس میں شبدوں کا ارتھ لکھا ہوتا ہے۔ سمجھے ہم سمجھ گئے۔"

"اچھا ہوا آپ سمجھ گئے۔ مگر پھر کل لغت یا آپ کا شبد کش لاؤں گا تو آپ سے باتیں ہوں گی،" ملاجی نے کہا۔

"نہیں نہیں" کچھوا بولا "ایسی بھی کیا بات ہے۔ دیکھیے تھوڑے سے سمے میں ہم نے ایک دوسرے کے کتنے شبد جان لیے۔ بات چیت چلے گی تو میں آپ کا مطبل سمجھ لوں گا۔ میرے شبدوں کا ارتھ آپ سمجھ لیں گے۔"

"اچھا تو کچھو رام جی کہیے تو کہ سوال۔ نہیں آپ کا پرشن کیا ہے۔"

"پرشن یہ ہے ملاجی۔ کہ آپ کی اتہاس کی پستکوں میں کیا لکھا ہے؟ کہیں یہ لکھا ہے کہ پراچین کال میں کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی تھی۔ اور بھلا کیا لکھا ہے کہ کون جیتا تھا؟"

مولوی غفران کو ہوتے ہوتے کچھو رام کی بھولی بھولی باتیں کچھ اچھی لگنے لگی تھیں۔ پھر کچھ لفظ بھی نئے سیکھے تھے۔ پنڈت جی کے پوپلے پوپلے منہ سے باتیں اور بھلی لگتی تھیں۔ مگر کیا کرتے۔ سوال ایسا تھا کہ جس کا تعلق تاریخ قدیم سے تھا اور ان کا میدان تھا دینیات اور الٰہیات۔ اس میں کتے بلی، خرگوش اور کچھوے کا کیا کام۔ پھر آدمی دیانت دار بھی تھے۔ فرمایا "پنڈت جی، سچ بات یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں۔ یہ بات تو تاریخ کا کوئی ماہر ہو تو بتائے۔ ایسا ہی ہوگا تو کل اپنے ساتھ مدرسے کے تاریخ کے ماہر کو لیتا آؤں گا۔ ان سے آپ جو پوچھنا چاہیں پوچھ لیجیے گا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ ملاجی شما کریں۔ میں کل انتجار کروں گا۔ ٹھیک ہے نا۔ یہ شبد انتجار۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ جو سمجھ میں آجائے وہی ٹھیک ہے۔ میں کل ضرور آؤں گا۔"

کچھو رام تھوڑی دیر تو کچھ دھیان میں وہیں کھڑے رہے۔ پھر ہلکے ہلکے پانی کی طرف بڑھے اور اس میں پہنچتے ہی یہ جا وہ جا۔ ایسا لگا جیسے سب باتیں بھول گئے ہوں اور جی بس جی آگیا ہو۔

دوسرے دن صبح ہی گجر دم کچھو رام کنارے پر آن بیٹھے۔ مولوی غفران ٹھیک اپنے معین وقت پر آئے۔ ان کے ساتھ آج پروفیسر کیچاق بھی تھے۔ دُبلے پتلے۔ ہاتھ میں ایک کبڑی لکڑی۔ اُسے

برابر گھماتے جاتے یا چلتے چلتے جوتے کی نوک سے اس پر ٹھوکر لگاتے جاتے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے گردن کو ایک خاص انداز سے خفیف سا جھٹکا بھی دیتے رہتے۔ جیسے اپنے آپ سے دل ہی دل میں بحث کر رہے ہوں اور جہاں کہیں کوئی زوردار لفظ اس اندرونی مکالمے میں آجاتا ہو وہیں گردن کو خود بخود جنبش ہو جاتی ہو۔ کھڑے ہوتے تو چھڑی کے مونٹھ پر ان کی انگلیاں ایسے چلتیں جیسے ہارمونیم بجا رہے ہوں۔ غرض بڑے مزے کے آدمی تھے۔ آج مولوی غفران کی آنکھیں خلاف معمول پہلے سے پنڈت کچھورام کی متلاشی تھیں۔ وہ بھی پرتیکھا میں چشم براہ تھے۔ دیکھتے ہی مولانا کے منہ سے نکلا۔ السلام علیکم، اور پروفیسر کپچاق نے کہا۔ "تسلیم پنڈت جی"۔ پنڈت کچھورام بولے "نمستے۔ کلیان ہو۔ کلیان۔ آپ آگئے گُر جی ادھک پرسن ہوا۔"

"اوہو"، مولانا غفران بولے "لعنت وہی آپ کا شبد کُش تولانا بھول ہی گیا۔ خیر یہ تو دعا سلام تھا۔ سمجھیے کہ سمجھ ہی لیا۔ اب آپ اپنا سوال ہاں وہی اپنا پرشن کیجیے۔ پروفیسر کپچاق تاریخ کے بڑے ماہر ہیں۔ یہ آپ کا جواب یعنی اُتّر دیں گے۔"

"پرفیسر کشیپ جی۔ ایک بات ہمیں بہت دن سے ستا رہی ہے۔ کل ملّا جی سے پوچھی تھی تو انھوں نے کہا ہم نہیں جانتے۔ پرفسر جی کو ساتھ لائیں گے۔ سو اب آپ سے وہی بات پوچھنی ہے۔ بات یہ ہے کہ پراچین کال میں کیا کبھی خرگوش جاتی اور کچھوا جاتی کے لوگوں میں کوئی دوڑ ہوئی تھی۔ اور ہوئی تھی تو جیت کس کی ہوئی تھی اور ہارا کون تھا۔ ہمارے یہاں پرکھوں سے یہ بات چلی آتی ہے کہ دوڑ ہوئی تھی اور کچھوا جیتا تھا۔"

پروفیسر کپچاق کو ایسا لگا کہ پنڈت جی نے انھیں کوئی بچوں کی کہانیاں لکھنے والا اٹ پونجیا سمجھ لیا ہے اور صبح کی ہوا کے سرور میں ان کی طبیعت کچھ پھر پھرا رہی ہے اور یہ مجھ سے مذاق کرنے چلے ہیں۔ سخت ناخوش ہوئے۔ انھیں ویسے بھی ناخوش ہونے میں کچھ زیادہ جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بولے "حضت، کچھوے اور خرگوش سے میرے فن کو کیا علاقہ۔ میں تو تاریخ کا استاد ہوں۔ اقوام و مِلل کے عروج و زوال کے عمل مسلسل پر تفکر و تفحّص میرا کام ہے۔ قوائے دولت آفریں کی مخصوص اشکال کے تقاضوں کا تفحص اور ہئیت اجتماعیہ انسانیہ پر ان کے اثرات کی توضیح، معاشرے میں طبقاتِ معاشی کے تصادم کے ناگزیر عواقب و نتائج کی تشریح، محرکاتِ انقلابی کے ظہور و بلوغ کے اسرار و غوامض کو تحقیق و عقیدت کے آمیزے سے قابلِ فہم بنانا، استعمار اور استحصال کے داخلی تضادوں کی روشن بصیرت اور ان عفریتوں کے مفتوح و معدوم ہونے پر انسانیت کی حقیقی تاریخ کا ایک عقلی و معروضی نقشہ مُرتّب کرنا۔ یوں کہ ماضی سے مستقبل منطقی لزوم کے ساتھ مستخرج ہو۔ یہ میرا کام ہے۔ یہ کچھوے اور خرگوش سے متعلق استفسار آپ نے مجھ سے خوب فرمایا۔"

کچھوے بیچارے کا سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ گھبرا کر جو اندر کو دم کھینچا تو

جھرّیوں والے چہرے کے نیچے گردن میں گھینگے کی طرح کچھ پھول سا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ بیٹھ گیا تو ایسا لگا کہ ان کی جان میں جان آئی۔ پروفیسر صاحب سے کچھ کہنے کی ہمت کہاں تھی، کچھ سہمے سہمے ڈرتے ڈرتے ملا جی سے بولے ”ملا جی، کیا بات ہوئی۔ کیا پروفیسر جی ہم سے کچھ روٹھ گئے۔ یہ اتنی ڈھیر سی گالیاں ہمیں کیوں دے ڈالیں۔ ہم نے انجان ہونے کے کارن ایک بات پوچھی تھی۔ وہ تو برس ہی پڑے۔ سمجھے تو ہم کچھ نہیں اور آپ شبد کوش بھی لے آتے تو کہاں تک مجھے سب شبدوں کا ارتھ بتاتے اور گالیوں کا ارتھ شبد کوش میں بھی کہاں تک ملتا۔ پر یہ تو بتائیے کہ یہ ایسے روٹھ کیوں گئے۔ میں ان سے شما مانگتا ہوں اب کچھ نہیں پوچھوں گا۔ بس چپ ہی بھلی۔“

مولوی غفران جنھیں لڑکے آپس میں غفر غٹ کہا کرتے تھے اس نام میں سامی اور آریائی زبانوں کی دو ثقیل آوازوں کی یکجائی سے گمان ہوتا تھا کہ سخت قسم کے آدمی ہیں مگر سچ یہ ہے کہ بڑے نرم مزاج بھلے مانس تھے۔ انھیں کچھو رام غریب پر ویسے ہی ترس آرہا تھا۔ اور پروفیسر صاحب کے ذہن مبارک سے لفظوں کا جو آبشار رواں تھا اس پر یہ خود تعجب اور حیرت میں تھے۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ پروفیسر سے رات کوئی رجعت پسند نوجوان الجھ گیا تھا جس سے ان کی طبیعت بہت بدمزہ ہوگئی تھی۔ خون کا دباؤ ویسے ہی کچھ زیادہ رہتا تھا شاید کچھ اور بڑھ گیا تھا، پھر رات بھر سوئے نہیں تھے۔ سویرا ہوتے آنکھ لگی تھی کہ ملا جی فجر کی نماز اول وقت پڑھ کر ان کے کمرے پر پہنچ گئے اور اٹھا دیا۔ رات بھر جاگنے کے بعد صبح سوتے ہوئے پکڑا جائے تو آدمی بہت کھسیانا ہوتا ہے۔ ملا جی نے کواڑ کھٹکھٹائے تو پروفیسر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اس ڈر سے کہ ملا جی یہ نہ کہیں کہ صبح کی نماز نہیں پڑھی بولے ”ابھی نماز پڑھ کر لیٹ گیا تھا کہ آنکھ لگ گئی۔“ ملا جی نے کہا ”آج ذرا ٹہلنے ساتھ چلیے۔ آپ کو ایک بوڑھے پنڈت سے ملائیں، وہ آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں۔“ پروفیسر رات والے نوجوان سے ایسے ناخوش ہوئے تھے کہ بوڑھے پنڈت سے ملنے کی طرف طبیعت راغب ہوگئی۔ ورنہ معمولاً یہ بوڑھوں سے بہت تنگ اور ان کی طرف سے خاصے بدگمان رہتے تھے۔ پھر مولانا سے ان کے مراسم بھی بہت محبت اور خلوص کے تھے، ساتھ چلے آئے۔ لیکن کچھوے کے اس سوال پر، کہ ان کے نزدیک اس میں ان کے فن محترم کی ہنسی اڑانی مقصود تھی، بپھر پڑے۔ ورنہ یوں باوجود اعصابی امراض کے یہ بھی بڑے نرم گفتار اور ملنسار آدمی تھے۔

ملا جی نے چاہا کہ صفائی ہو جائے۔ کچھو رام سے کہا ”پنڈت جی آپ کو بالکل غلط یہ گمان ہوا کہ پروفیسر صاحب نے آپ کو گالیاں دیں۔ یہ تو اپنے علم کے، جسے آپ ودیا کہتے ہیں، حدود اربعہ بتا رہے تھے۔“

”ہدود اربا۔ اتھوا“ کچھوے نے بے سوچے پوچھ لیا۔

”حدود اربعہ اتھوا چوحدی یعنی یہ ودیا چاروں طرف کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔“

"اتھوا اپنی ودیا کی سیمائیں بتا رہے تھے۔ سمجھے، ہم سمجھے" کچھوے نے کہا۔

"اور بھائی پروفیسر صاحب" ملاجی نے کہا "آپ کو بڑی غلط فہمی ہوگئی۔ پنڈت جی کا مقصد ہرگز آپ کی ہنسی اڑانا نہ تھا۔ یہ بات تو ان کے سان گمان میں بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ بیچارے تو کئی دن سے اس بات کا پتہ چلانا چاہ رہے تھے کہ کبھی کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی ہے یا نہیں۔ اور ہوئی ہے تو کون جیتا اور کون ہارا۔ یہ بات ان کے جی کو لگی ہوئی ہے۔ مجھ سے بھی پوچھ چکے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ یہ کوئی دینیات کا مسئلہ تو ہے نہیں کہ میں بتا سکوں۔ اس لیے تاریخ کے ایک بڑے ماہر کو اپنے ساتھ لے آؤں گا۔ پچھلے زمانے میں جو کچھ ہوا ہے اس کا کھوج یہی لگاتے ہیں اور یہی اس کا حال جانتے ہیں۔ غلطی ہوئی تو مجھ سے ہوئی، ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

"شما چاہتا ہوں پرفیسر جی۔ شما دے دیجیے۔ میں بھلا آپ کی ہنسی کیسے اڑاتا۔ آپ جیسے ودوانوں کے درشن کب کب ہوتے ہیں۔ یہ خرگوش اور کچھوے کی دوڑ کا پرشن مجھے نہ جانے کب سے ستا رہا ہے۔ کبھی پانی میں جاتا ہوں۔ کبھی دھرتی پر آتا ہوں۔ نہ وہاں چین ملتا ہے نہ یہاں۔ جی کو ایسی بے کلی ہے کہ نیند نام کو نہیں آتی۔ ویسے ہی بڑھاپے کے کارن نیند کم ہوتی ہے۔ پر ادھر تو سپتھوں سے پلک نہیں جھپکی۔ میری باتوں میں کوئی اونچ نیچ ہوگئی ہو تو شما چاہتا ہوں۔"

ملاجی اور کچھو رام یہ سب کہہ رہے تھے اور پروفیسر کیچاق تھے کہ اپنی چھتری گھمائے جاتے تھے اور چپ تھے۔ آخر کو بولے — "مولانا۔ بہت نادم ہوں کہ اس کم بخت بے خوابی نے اعصاب کی یہ حالت کر دی ہے۔ میں تو آیا ہی تھا پنڈت جی کی مدد کرنے لیکن ان کا سوال مجھے کچھ ایسا لگنے لگا کہ میں سمجھا کہ یہ میری اور، میں تو خیر کیا چیز ہوں، میرے مضمون کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ اپنی ہنسی کا تو میں خیال نہیں کرتا مگر میرا مضمون! نہیں مضمون کی شان میں کسی کی بے ادبی مجھے گوارا نہیں۔ مضمون، کیسا مضمون؟ تقدیرِ کائنات اس سے وابستہ کہ شہنشاہِ کائنات انسان کے ماضی کی تفسیر اور مستقبل کی نشان دہی اس کے سپرد ہے۔ نہیں۔ مضمون کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کی جاسکتی۔ میں سمجھا یہ میرے مضمون کو کتے، بلی کچھوے، اور خرگوش کی کہانی، سمجھتے ہیں۔ اس لیے میرا فرض تھا کہ انھیں بتا دوں اور میں نے بتایا۔ ہاں ذرا تفصیل سے اور ذرا شدت سے کہ میرے مضمون کا موقف یہ نہیں ہے۔ مولانا۔ میرا حال کچھ یہ ہے کہ ناگواری میں کلام میں طوالت اور زور دونوں پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ غریب سمجھے کہ میں گالیاں دے رہا ہوں۔ گالیاں۔ مورخ اور گالیاں۔ مفسّر تقدیرِ انسانی اور گالیاں۔ شاید یہ میری زبان بھی نہیں سمجھتے۔ اس لیے مولانا آپ انھیں پوری طرح اطمینان دلا دیجیے کہ میں نے کوئی گالی نہیں دی۔ میرا کام یہ نہیں ہے۔ گالیاں دیتے ہوں گے اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے اہلِ سیاست، اپنے اخباروں کی بکری کے لیے اہلِ صحافت یا ناخوشی اور بدمزاجی میں ادیب اور شاعر۔ مورخ کو گالیاں دینے کی فرصت کہاں۔ ہاں تو تسلی دیدیجیے انھیں

کہ میں نے کوئی گالی نہیں دی اور یہ مجھے معاف کر دیں کہ میں نے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کچھوے اور خرگوش کے معاملے میں ممکن ہے کہ ادب کا پروفیسر آپ کے دوست کی مدد کر سکے۔ مجھے معذور جان کر معاف فرما دیجیے اور ہاں۔ واپس نہیں چلیے گا۔ بہت وقت ہوگیا۔"

ملّا جی نے کہا، "یار پروفیسر، بہت بہکنے لگے ہو۔ چلتے چلتے یہ اہل سیاست اور صحافیوں کو ادیبوں اور شاعروں کو بھی لپیٹ لیا۔ خیر جھگڑا ختم کریں۔"

پھر مسکرا کر کچھوے سے کہا "یہ شما مانگتے ہیں۔ میرے دوست کی باتوں میں کچھ ایسا زور تھا کہ آپ سمجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ گالیاں تو ہوتی ہی ہیں زوردار۔ مگر اور بول بھی تو زور والے، شور والے، ہوتے ہیں، سب گالیاں نہیں ہوتے۔ آپ تو سہم گئے۔ ان کا مطلب انقوا وہی مطلب پُرانہ تھا۔ اور اب انھوں نے صلاح بہت ٹھیک دی ہے کہ کسی ادب کے ماہر سے آپ کا پرشن پوچھا جائے۔ کل ہو سکا تو انھیں ساتھ لیتا آؤں گا۔

"یہ ادب کیا ہوا، ملّا جی؟" کچھوے نے پوچھا۔

"کیسے بتاؤں۔ ادب وہ ہوتا ہے جس میں بڑے سُندر شبدوں میں آدمی کے دل کی باتیں کہی جاتی ہیں۔ شبدوں میں کبھی ایسی مٹھاس گھول دیتے ہیں کہ گڑ سے زیادہ میٹھے لگتے ہیں۔ کبھی وہ روانی دے دیتے ہیں کہ لگتا ہے دریا امنڈ آیا ہے۔ وہ زور بھر دیتے ہیں کہ شبد دلوں کو ہلا دیں، پہاڑوں کو چیر دیں۔ اس میں کہانیاں لکھتے ہیں جو لوگ پیڑھیوں تک یاد رکھیں۔ اس میں شبدوں کو ایسے جوڑتے ہیں کہ وہ سنتے ہی جی میں اُتر جائیں۔ لوگ انھیں گاتے ہیں۔ گنگناتے ہیں، اور مزا لیتے ہیں۔ اس میں آدمی کو اپنا حال دکھائی دیتا ہے جیسے آئینے میں کوئی اپنی صورت دیکھے۔ ادب ہنساتا ہے، رُلاتا ہے، جی کو گرماتا ہے، ہمت دلاتا ہے، حوصلہ بڑھاتا ہے، اور ہمارے ہنر اور عیب سب ہم پر کھول دیتا ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے اس میں۔ میں تو دینیات کا استاد ہوں پوری بات نہیں جانتا مگر یہی سب ہوتا ہے ادب۔"

کچھوا بہت غور سے سنتا رہا اور بولا، "ملّا جی تم نے بتایا اس سے تو ہمیں ایسا لگتا ہے ادب ساہتیہ کو کہتے ہوں گے۔"

"ہاں ہاں۔ ٹھیک کہتے ہو پنڈت جی۔ ساہتیہ ہی کو کہتے ہوں گے ادب۔ اس لیے کہ وہ جو ہماری دلّی میں ساہتیہ اکادمی ہے وہ ادب ہی کا ادارہ تو ہے۔ ٹھیک ہے ادب انقوا ساہتیہ۔"

"اچھا تو ملّا جی۔ کل ساہتیہ کے پنڈت کو اوش لانا۔ ادھک سمے بیتا جاتا ہے، اور میری بے کلی دن پر دن بڑھ رہی ہے۔ مجھ پر دیا کر کے کل ہی انھیں ساتھ لے آنا، ملّا جی۔"

"بہت اچھا پنڈت جی۔ کل ہی ساتھ لاؤں گا انھیں۔ بس اب چلے۔ آداب۔"

"نمستے۔ ملّا جی ادھ پر فسٹر جی۔ روٹھے تو نہیں ہو پر فسٹر جی۔"

"سب ٹھیک ہے" ملا جی نے کہا اور مولوی غفران اور پروفیسر کیچاق دونوں پل کی طرف چل پڑے۔

"اچھے جھمیلے میں پھنس گئے ہم تو" کچھوے نے کہا "اب دیکھیں سادھو والا کیا کہے۔ کہیں وہ بھی گرم نہ ہونے لگے۔ ایک سیدھی سی بات پوچھتے ہیں اور کوئی پتہ نہیں دیتا، نہ جانے کیسی ودیا ہے ان ودوانوں کی۔ اب دیکھیں کل کیا ہوتا ہے"



ایم۔ ایف حسین

گلِ عباس

میں ایک چھوٹے سے کالے کالے بیج میں رہتا تھا۔ یہی میرا گھر تھا۔ اس کی دیواریں خوب مضبوط تھیں اور مجھے اس کے اندر کسی کا ڈر نہیں تھا۔ یہ دیواریں مجھے سردی سے بھی بچاتی تھیں اور گرمی سے بھی۔ کچھ دن تو میں اِدھر اُدھر رہا لیکن میرا گھر کالی مٹی میں دبا دیا گیا کہ کوئی اٹھا کر پھینک نہ دے اور میں کسی شریر لڑکے کے پاؤں تلے نہ آجاؤں۔ زمین کی مدھم گرمی مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور میں نے یہ سوچا تھا کہ بس اب ہمیشہ مزے سے یہیں رہوں گا۔ مگر میرے کان میں اکثر میٹھی میٹھی سریلی آواز آتی تھی۔ یہ آواز مجھ سے کہا کرتی تھی: "اس گھر سے نکل، بڑھ، روشنی کی طرف چل"۔ لیکن میں زمین میں اپنے گھر کے اندر ایسے مزے میں تھا کہ میں نے اس آواز کے کہنے پر کان نہ دھرا اور جب اس نے بہت پیچھا کیا تو میں نے صاف کہہ دیا: "نہیں میں تو یہیں رہوں گا۔ بڑھنے اور گھر سے نکلنے سے کیا فائدہ۔ یہیں چین سے سوتے میں مزا ہے۔ نہیں میں تو یہیں رہوں گا۔"

یہ آواز بند نہ ہوئی۔ ایک دن اس نے ایسے پُراثر انداز سے مجھ سے کہا: "چلو روشنی کی طرف چلو، روشنی کی طرف چلو"۔ مجھے پھُریری سی آگئی اور مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے سوچا کہ اس گھر کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکل ہی آؤں۔ مگر دیواریں مضبوط تھیں اور میں کمزور۔ اب جب وہ آواز مجھ سے کہتی تھی کہ بڑھو، چلو، تو میں پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا اور مجھے معلوم ہوتا تھا کہ میں بہت طاقت ور ہو گیا ہوں۔ آخر کو اللہ کا نام لے کر جو زور لگایا تو کھٹ دیوار ٹوٹ گئی اور میں ہرا کِلّا بن کر اس سے نکل آیا اس دیوار کے پاس زمین تھی، مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور اس کو بھی ہٹا یا۔ اب میں نے اپنی جڑوں کو نیچے بھیجا کہ خوب مضبوطی سے جگہ پکڑ لیں۔ آخر کو ایک دن میں زمین کے اندر سے نکل ہی آیا اور آنکھیں کھول کر دنیا کو دیکھا۔ کیسی خوب صورت اور اچھی جگہ ہے۔ کچھ دنوں بعد تو خوب اِدھر اُدھر پھیل گیا اور ایک دن اپنی کلی کا منہ جو کھولا تو سب لوگ کہنے لگے: "دیکھو یہ کیسا خوب صورت لال لال گلِ عباس ہے۔" میں نے بھی جی میں سوچا کہ اس تنگ گھیرے کو چھوڑا تو اچھا ہی کیا، آس پاس اور بہت سے گل عباس تھے، میں ان سے خوب باتیں کرتا اور ہنستا بولتا تھا۔ دن بھر ہم سورج کی کرنوں سے کھیلا کرتے تھے

---

* سن اشاعت درج نہیں ہے۔

اور رات کو چاندنی سے۔ ذرا آنکھ لگتی تو آسمان کے تارے آکر ہمیں چھیڑتے اور اٹھا دیتے تھے۔ افسوس! یہ مزے زیادہ دن نہ رہے۔ ایک دن صبح ہمارے کان میں ایک سخت آواز آئی "گل عباس چاہیے ہیں گل عباس" "اچھا جتنے چاہیے لے لو" ہماری سمجھ میں یہ بات کچھ نہ آئی اور ہم حیرت ہی میں تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے اور ارادہ کر رہے تھے کہ ذرا جل کر اپنے دوست ستاروں سے کہیں کہ دوڑو ہماری مدد کرو۔ یہ کیسا معاملہ ہے کہ اتنے میں کسی نے قینچی سے ہمیں ڈنٹھل سمیت کاٹ لیا اور ایک ٹوکری میں ڈال لیا۔

اب یاد نہیں کہ اس ٹوکری میں کتنی دیر پڑے رہے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ میں اوپر تھا نہیں تو گھٹ کر مر جاتا۔ شاید میں سو گیا ہوں گا کیوں کہ جب اٹھا ہوں تو میں نے دیکھا کہ پانچ چھ اور ساتھیوں کے ساتھ مجھے بھی ایک خوب صورت تاگے سے باندھ کر کسی نے گل دستہ بنایا ہے۔ آس پاس نظر ڈالی تو باغ کی روشیں تھیں نہ چڑیوں کا گانا۔ سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی میلی کچیلی دکان تھی۔ ہزاروں آدمی اِدھر سے اُدھر جا رہا ہے۔ اکے گاڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ فقیر بھیک مانگ رہے تھے اور کوئی ایک پیسا نہ دیتا تھا۔ میرا جی ایسا گھبرایا کہ کیا کہوں۔ ستاروں کو ڈھونڈا تو ان کا پتا نہیں۔ چاند کو تلاش کیا تو وہ غائب۔ سورج کی کرنیں بھی سڑک تک آکر رک گئی تھیں اور میں پکارتے پکارتے تھک گیا کہ مجھے جانتی ہو۔ روز ساتھ کھیلتی تھیں۔ ذرا پاس آؤ اور بتاؤ کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ مگر وہ ایک نہ سنتی تھیں۔ شام ہونے کو آئی تو ایک خوب صورت لڑکی دکان کے پاس سے گزری۔ ہماری طرف دیکھا۔ پھول والے نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس زور سے جھٹکا دے کر لڑکی کے سامنے رکھا کہ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ پھول والے نے کہا: "بیٹی! دیکھو۔ کیسے خوب صورت گل عباس ہیں ایک آنے میں گل دستہ، ایک آنے میں!"

لڑکی نے اکنی دی اور ہمیں ہاتھ میں لے لیا۔ اُس کے ہاتھ ایسے نرم نرم تھے کہ یہاں آکر ذرا جان میں جان آئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد شاید میں بے ہوش ہو گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ پانی نہیں ملا تھا اور پیاس بہت لگی تھی۔ لڑکی نے شیشے کے ایک گل دان میں پانی بھر کر ہمیں پلایا، تو ذرا طبیعت ٹھیک ہوئی اور میں نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اب میں ایک صاف سے کمرے میں تھا جس میں کئی بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف سے ایک بیمار لڑکی کی آواز سنی: "ڈاکٹر صاحب کیا میں اچھی نہیں ہوں گی، کیا اب کبھی چل پھر نہ سکوں گی اور کیا اب کبھی گل عباس دیکھنے کو نہ ملیں گے" یہ کہتے کہتے بچی کی ہچکی بندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو پونچھ کر اس نے تکیے پر کروٹ لی تو اس کو میں اور میرے ساتھی گل دان میں رکھے ہوئے دکھائی دیے۔ لڑکی خوشی سے کھل گئی اور اپنے ننھے منے ہاتھوں

سے تالیاں بجانے لگی۔ پاس جو نرس کھڑی تھی اس نے ہمیں اٹھاکر اس لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس پیاری بچی نے ہمیں چوما اور اپنے گورے گالوں سے لگایا اور میں نے دیکھا کہ اس کے گورے گورے گالوں میں ہماری سُرخی کی ذرا سی جھلک آگئی۔

اس وقت سمجھ میں آیا کہ بیج کے گھر چھوڑ کر روشنی کی طرف بڑھنے کی غرض یہی تھی کہ ایک دکھیاری بیمار بچی کو کم سے کم تھوڑی دیر کی خوشی ہم سے مل جائے۔

حصّہ دوم

ذاکر صاحب کے معاصرین کا ان کی خدمت میں خراج عقیدت

محمد مجیب

ڈاکٹر ذاکر حسین

برلن کے قریب شلاختن زی (Schlachtensee) میں شوانیر کے مکان پر پہلی دفعہ ان سے میری ملاقات ہوئی جہاں میں اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب خود کفیل مہمان کی حیثیت سے مقیم تھے۔ وہ قد آور، گداز جسم، نہ گٹھا ہوا اور نہ ڈھیلا، بال کسی قدر پر خم اور بڑی اچھی ترشی ہوئی داڑھی کے حامل تھے۔ مگر ان تفصیلات پر بعد میں نظر پڑی۔ ان کی آنکھیں ہی ایسی تھیں جو دیکھنے والے کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں اور جن کی پراسرار گہرائی اپنی ہی زبان میں اپنے گہرے جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتی تھی۔ جو لوگ ان کی آنکھوں کی زبان کو سمجھنے اور اسے اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے ان پر وہ سب مسکراتے اور معاف کر دیتے تھے بات کرنے کی باری بعد میں آتی۔ وہ دراصل سمجھتے تھے کہ انسان احساس کی زبان کے باب میں اکثر بے ذوق ہوتا ہے مگر یہ سمجھنے میں بھی اتنا مزہ آتا تھا کہ ان کی بات چیت میں دلکشی پیدا ہو جاتی تھی اور سننے والوں پر جادو کا کام کرتی تھی وہ جس قدر بے اندازہ ذہنی قوت کے حامل تھے اسی قدر جسمانی اعتبار سے کاہل بھی تھے غیر ضروری محنت کے بوجھ سے بچنے اور دوسروں کو اپنی مدد پر آمادہ کرنے کا ان کے یہاں ایک ذریعہ بے بسی کی ایک ادا تھی جو ان کی کاہل شخصیت سے اس قدر مختلف ہوتی تھی کہ ہنسی آتی تھی۔ یہ ادا ایک جال کا کام کرتی تھی جس کے اندر مجھ جیسے غیر محتاط لوگ اکثر پھنس جایا کرتے تھے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ باوجود اپنی زبردست اعلیٰ شخصیت کے ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی شخص ان کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دے اور آگے لے چلے لیکن یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ ان میں ہمت، آغاز کار کا حوصلہ، لوگوں سے معاملہ کرنے کا سلیقہ اور معاملات کی گتھی سلجھانے کی مہارت ان لوگوں سے بھی زیادہ ہے جو اپنے آپ کو اس فن کا بڑا ماہر سمجھتے ہیں۔

ذاکر صاحب ڈائری نہیں رکھتے تھے۔ انھیں زندگی کے نظم و ضبط سے ایک طرح کی چڑ تھی اور یہ عادت انھیں غالباً علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانہ میں پڑی تھی، جس پر وہ بعد میں قابو نہ پا سکے تھے۔ وہ دوسروں میں نظم و ضبط پاکر تعریف کرتے تھے۔ اور استاد ہونے کی حیثیت سے وہ اس کی خوبیاں بیان کرنے سے کبھی تھکتے نہ تھے لیکن جہاں تک اپنی ذات کا تعلق تھا وہ اس کو اپنی آزادی میں مخل سمجھتے تھے۔ یہ صریح طور پر ایک کمزوری ہوتی اگر کوئی یہ محسوس نہ کرتا کہ صرف

پانچ منٹ کی گفتگو میں بھی ان کا ذہن اور تخیل مسلسل گردش کرتا رہتا ہے اور اس کا دائرہ عمل کبھی محدود نہیں رہتا۔ قدرتی طور پر ذاکر صاحب نہ ڈائری رکھ سکتے تھے اور نہ اپنی نقل و حرکت کا کوئی پروگرام بنا سکتے تھے۔ ان کا ذہن ایک ہی وقت میں اتنی مختلف سمتوں سرگرم سفر رہتا تھا کہ وہ صرف آگے کی طرف ہی دیکھ سکتے تھے۔

ان کی سرگرمیوں اور میدان عمل کو تاریخ وار پیش کرنا بھی فائدہ مند نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر موقع کو اس کے بہترین استعمال کے لیے اختیار کر لیتے تھے۔ ہندوستانی طلبا جو غیر ممالک میں پڑھتے ہیں، اپنے مقالے اور تھیسس اگر شائع کر سکیں تو اس سے انھیں بڑی مسرت ہوتی ہے اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے غالب کے دیوان کا ایک ایڈیشن شائع کیا، صرف اس لیے کہ برلن میں ایک ایرانی چھاپہ خانہ تھا جس میں بہت ہی نفیس فارسی ٹائپ موجود تھا۔ انھوں نے چھاپہ خانہ کے مالک اور نورین سے راہ و رسم بڑھائی بڑھائی۔ بات پکی کی اور چونکہ چھاپہ خانہ میں کمپوزیٹروں کی کمی تھی اس لیے اس کام کے ایک حصہ کو بھی خود ہی انجام دیا۔ وہ چند بہت اچھی جلد ساز کمپنیوں میں سے ایک کے مالک سے بھی متعارف ہوئے اور نتیجے کے طور پر "دیوان" کا وہ پاکٹ ایڈیشن ہمارے سامنے ہے جو اب تک شائع ہونے والے تمام ایڈیشنوں میں سب سے بہتر ہے۔ انھوں نے قریب قریب اپنی تمام نقد پونجی اور وہ سب جو مجھ سے اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب سے قرض لے سکتے تھے اس کام میں لگا دی اور ہم لوگوں کو یہ بات ماننی پڑی کہ جامعہ کے شعبہ اشاعت یعنی مکتبہ جامعہ کی طرف سے، جس کے مفاد کی خاطر یہ کام کیا گیا تھا، اس رقم کی رفتہ رفتہ ادائیگی مناسب رہے گی۔ اس مہم کی وجہ سے انھیں اور ان کے دوستوں کو مالی دشواریوں کا سامنا تو کرنا پڑا لیکن یہ دشواریاں انھیں اپنی سرگرمیوں سے باز نہ رکھ سکیں اور انھوں نے ایک اور موقع سے پھر فائدہ اٹھایا۔

ذاکر صاحب کو دماغی اور کلچرل فضا اور ماحول میں راہ پانے میں یونیورسٹی کے علاوہ گرڈا فلیپس بورن نے سب سے زیادہ مدد دی چٹو کی سب سے چھوٹی بہن نمبیار شام کی پارٹیوں کا اہتمام کیا کرتی تھیں اور کوشش کرتی تھیں کہ اچھے اور معقول جرمنوں اور ہندوستانیوں کو یکجا کر دیں۔ ایسی ہی ایک پارٹی میں گرڈا فلیپس بورن سے ہم پہلی مرتبہ ملے۔ مسز نمبیار نے ان پارٹیوں کا سلسلہ موقوف کر دیا اور ہماری سماجی زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز شام کو میں ذاکر صاحب کے ساتھ تھا کہ اچانک ذاکر صاحب کو تنہائی کا احساس پیدا ہوا انھوں نے مسز نمبیار کو یہ معلوم کرنے کے لیے فون کیا کہ اب وہ اپنی پارٹی کب کر رہی ہیں۔ ان کے جواب سے وہ اس درجہ بے کیف ہوئے کہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں انھیں بتادوں گا کہ وہ کم سے کم میرے لیے جزو لاینفک نہیں ہیں۔ "میں فلیپس بورن کو فون کیوں نہ کروں؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے جواب دیا، "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم ان سے بخوبی واقف ہیں؟" "یہ ہم دیکھ لیں گے" یہ کہتے ہی انھوں نے فون اٹھایا اور بات کی۔ فلیپس بورن گھر پر تھیں اور

انھوں نے کہا کہ وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ یہ دوستی کی ابتدا تھی جس کی گہرائی کسی کو معلوم نہ ہو سکی تاآنکہ گرڈا فلیپس بورن کا ۱۹۴۲ء میں جامعہ ملیہ میں انتقال ہوگیا۔

ان کا تعلق برلن کے ایک مالدار یہودی گھرانے سے تھا۔ ان کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اور وہ بہت چوٹی کے ماہرین تعلیم، موسیقاروں، ڈرامہ نویسوں اور فن کاروں سے ذاتی طور پر واقف تھیں۔ انھوں نے شادی کیوں نہیں کی اس کے بارے میں نہ مجھے بتایا گیا اور نہ میں نے جاننے کی کوشش کی۔ وہ ایک خاص قسم کی اونچی رومانیت کی حامل تھیں جسے جرمن Begeisterungs Fahigkeit کہتے ہیں ساتھ ہی ساتھ وہ دولت مند تھیں اور انھیں سماج میں اونچا مقام بھی حاصل تھا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے اور ان کی دلچسپیوں کو سمجھ لینے کے بعد انھیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ وہ جو کچھ ذاکر صاحب کے لیے کر رہی ہیں وہ کم ہے۔ ان کی صحبت میں ذاکر صاحب نے بہت سے بہترین اوپیرا، ڈرامے، آرٹ کی نمائش اور اسکول دیکھے۔ لیکن اس قدر قربت کے باوجود دونوں ہی جداگانہ زندگی گزارتے تھے۔ ذاکر صاحب کے رویہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انھیں ان سے کوئی رومانی لگاؤ نہ تھا اور ان کی شستہ اور دانش ورانہ گفتگو سے بھی کسی قسم کے رومانی لگاؤ کا اظہار نہ ہوتا تھا۔

باوجودیکہ اس موضوع پر ذاکر صاحب سے میری کبھی گفتگو نہیں ہوئی لیکن پھر بھی میں برسوں یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ رومانی دوستی کے بارے میں ذاکر صاحب کا کیا خیال ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے طرز عمل پر ہر اعتبار سے اسلامی اخلاقیات کے "تصور حیا" کی چھاپ ہو۔ حیا ایک ایسے احساس شرم کا نام ہے جو ضمیر کے ان تمام احکامات کا احاطہ کرتا ہے جو ہمارے طرز عمل کو نفاست اور موزونیت کے اعلیٰ معیار تک پہنچاتے ہیں اور کسی کم تر معیار کو اپنانے سے روکتے ہیں۔ مسلمانوں کی روایت کے مطابق حیا کا تقاضا تھا کہ مرد عوت کی نہ صرف ہم نشینی بلکہ دیکھنے سے بھی گریز کرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اگر غیر سماجی نہیں تو ناخوش گوار میلانات ضرور پیدا ہوگئے۔ گوکہ ذاکر صاحب اسی روایتی ماحول کے پروردہ تھے، یورپ جانے سے پہلے انھیں عورتوں اور مردوں کی ملی جلی صحبتوں میں شرکت کا اتفاق نہ ہوا تھا، پھر بھی وہاں کی ملی جلی سوسائٹی میں انھیں کسی قسم کی الجھن نہ ہوتی تھی۔ انھیں جلد ہی اس بات کا احساس ہوگیا ہوگا کہ ان کی شخصیت کچھ اس قسم کی ہے جسے مہذب یوروپین عورتیں پسند کرتی تھیں اور یہ پسندیدگی صرف مہذب عورتوں ہی تک محدود نہیں تھی۔ مجھے برلن میں ۱۹۲۴ء کے جشن مئی کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ چاروں طرف پیڑ پودوں میں ایک نئی زندگی رواں دواں تھی۔ اور فطرت اپنے دامن میں انبساط کے پیغام سمیٹے دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ دن کچھ اس قدر خوب صورت تھا کہ روز کی طرح گھر میں مقید رہنا ناممکن تھا۔ ہم میں سے چار پانچ احباب اشٹاٹ بان (Sladtbaahn) کے اسٹیشن ام زو am zoo پر

یک جا ہوئے ۔ ذاکر صاحب اس موسم بہار سے سب سے زیادہ متاثر نظر آرہے تھے ۔ وہ کھلے کالر کی قمیض پہنے تھے ، ان کی داڑھی ترشی ہوئی تھی ، بادنسیم ان کے بالوں سے اٹھکھیلیاں کررہی تھی اوران کی آنکھوں میں ایک رومانی چمک تھی ۔ ہم سب ہی کہیں جانا چاہتے تھے اور جب کسی خاص جگہ کا تعین نہ ہو سکا تو ہم نے جنگلوں اور جھیلوں کی سرزمین وان زے (Wannsee) کے لیے ٹرین پکڑی جس میں ہمیں صرف کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی ۔ ذاکر صاحب دروازہ ہی پر رہے ۔ اک مضافاتی اسٹیشن پر کام کرنے والی کچھ لڑکیاں نظر آئیں جو شاید ٹرین یا اپنے دوستوں کا انتظار کررہی تھیں ۔ انھوں نے ذاکر صاحب کو دیکھا اور حسب عادت اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کھل کھلاکر ہنس پڑیں ۔ خلاف توقع جب ان کے چہرہ پر کسی قسم کی مسکراہٹ نظر نہ آئی تو وہ اور بھی زیادہ کھل کھلاکر ہنسیں ۔ میں ذاکر صاحب کے قریب ہی تھا اور ان کے ردعمل کو دیکھ رہا تھا ۔ لڑکیوں کی ان حرکتوں کو بخوبی سمجھتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے جھنجلاہٹ اور بے چارگی کے آثار نمایاں تھے اور جیسے ہی ٹرین لڑکیوں کے قریب سے گزری انھوں نے خاص فرانسیسی انداز میں ، بڑی شوخی سے ان کا ایک ہوائی بوسہ لےلیا ۔

گراڈ فلپس بورن کے علاوہ اور بھی بہت سی خواتین سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے ۔ کبھی کبھی میں انھیں یہ کہہ کر چھیڑا کرتا تھا کہ وہ اپنی خاتون دوستوں کے معاملہ میں گوئٹے کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور جن سے میں واقف تھا ان کے نام گنانا شروع کردیتا تھا ۔ ایسے موقعوں پر اپنے موڈ کے مطابق کبھی تو وہ تیوریاں چڑھا لیتے تھے اور کبھی میری فہرست میں دو ایک ناموں کا اور اضافہ کردیتے تھے ۔ ان کی بیشتر دوست یہودی خواتین تھیں ۔ ان میں سے ایک خاتون فرائی لائن ہشت Fraulein Hecht جو غیر شادی شدہ تھیں اور جن کی عمر کا تعین کرنا مشکل تھا ، تیس کے مقابلہ میں چالیس سے زیادہ قریب لگتی تھیں ۔ ان کے بال گھنے تھے اور سر بھی خاصا بڑا تھا اور شاید ان کے جسم میں نمایاں خم ہونے کی یہی وجہ تھی ۔ ان کی آنکھیں بھی بڑی بڑی اور سیاہ تھیں جن میں صدیوں کے دکھ کی جھلک تھی ۔ میرے لیے ان سے نظریں ملانا بڑے حوصلہ کی بات تھی اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان سے کبھی بات کی ہو ۔ انھوں نے اپنے آپ کو ذاکر صاحب کے لیے وقف کردیا تھا اور ہمیشہ یہی سوچا کرتی تھیں کہ وہ ذاکر صاحب کے لیے کیا کرسکتی ہیں ۔ دوسرے متفرق کاموں کے علاوہ انھوں نے ذاکر صاحب کے تھیسس کا ترجمہ کیا اور اسے ٹائپ بھی کیا ۔ بس یہی کچھ تھا جو وہ ان کے لیے کرسکتی تھیں لیکن وہ اسے قطعی کافی نہیں سمجھتی تھیں اور محض اس خیال کی بنیاد پر کہ اس لاعلاج درد دل کی وہی تنہا شکار نہیں ہیں انھیں کوئی تسلی نہیں ہوسکتی تھی ۔ وہ تین سال کا عرصہ جو ذاکر صاحب نے جرمنی میں گزارا یقیناً ان کی زندگی کا سب سے خوش گوار دور کہا جا سکتا ہے ۔ ان پر کوئی ذمہ داری نہ تھی اور نہ کوئی پابندی انھیں یہ احساس تھا کہ وہ ایک ایسی قوم کے درمیان رہ رہے ہیں ۔

جو جنگ میں ہونے والے زبردست نقصانات کے ازالہ کی جدو جہد کر رہی تھی۔ وہ اپنے مسائل سے باخبر تھے۔ نئے نئے خیالات پر توجہ دیتے تھے اور ان میں نئے نئے انکشافات اور تخلیق کرنے کا جذبہ جنون کی حد تک تھا۔ جزئیات کے سلسلہ میں وہ بہت زیادہ محتاط تھے اور اسی کو انھوں نے اپنے کمال فن کے تصور کی بنیاد بنایا۔ کام کرنے میں انھیں تکان کا احساس نہیں ہوتا تھا اس لیے کہ ان کے لیے جی لگا کر کام کرنا خودی کے عرفان کا سب سے اعلیٰ طریقہ تھا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سب ہی لوگ جنھوں نے اس دور کی جرمن زندگی کا مطالعہ کیا، ان ہی باتوں پر زور دیں بہر کیف یہ یقینی ہے کہ چونکہ جرمنوں کا یقین اپنی اقدار کے سلسلہ میں متزلزل ہو چکا تھا۔ اس لیے اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنے کی بجائے خود اپنے دائرہ خیال کی توسیع کے متمنی تھے۔ گاندھی جی کے متعلق رومارولا Romain Rolland کی کتاب کثیر تعداد میں فروخت ہوئی اور تقریباً ہر معقول ہندوستانی طالب علم کو اس بات کا احساس تھا کہ جرمنی کے لوگوں میں ہندوستان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش ہے۔ ایک ایسی خواہش جو نہ صرف اعلیٰ اقدار کی تلاش کے لیے تھی بلکہ جس میں خود شناسی کی آرزو بھی مضمر تھی۔ ذاکر صاحب جیسا حساس ہندوستانی ان تمام دانش ورانہ اور جمالیاتی سرگرمیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ انھوں نے غالب کی مانند محسوس کیا ہوگا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ان میں ایک نیا نقطۂ نظر پیدا ہوا۔ انھوں نے تخیل کو آزاد چھوڑ دینا سیکھا، ان میں دنیا کو ایک بہتر روپ میں ڈھالنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ایک ایسی دنیا کی خواہش جس میں انسان مقلد اور غلام ہونے کی بجائے خود خالق بنے اور اب تک کے بیکار پڑے تہذیبی سرمایہ سے زندگی سنوارے ان میں وہ اضطراب اور بے چینی پیدا ہوئی جس سے تخلیقی جذبہ کی عام طور پرورش ہوتی ہے۔ لیکن اس زمانہ کے بوئے ہوئے بہت سے تخم اس وقت بار آور ہوئے جب انھوں نے اپنے تعلیمی نظریات کی تبلیغ کی

جامعہ۔ ذاکر صاحب کا شہر آرزو

ظاہر ہے کہ جامعہ سے ملنے والی رقم پر ہی ان کا دار و مدار نہیں ہو سکتا تھا۔ باوجودیکہ قائم گنج میں ان کی کچھ آراضی تھی جس کی دیکھ بھال ان کے عزیز صرف اپنے مفاد کے لیے کرتے تھے لیکن ذاکر صاحب انھیں کبھی بھی اس بات پر آمادہ نہ کر سکے کہ وہ اس آراضی سے ہونے والی آمدنی کا کچھ حصہ انھیں بھی دیدیں۔ حساب کتاب کچھ یوں رکھا جاتا تھا کہ آمدنی اور اخراجات برابر کر دیے جاتے تھے۔ انھیں ہمیشہ روپے کی قلت رہتی لیکن یہ بات جامعہ کے خازن تک کو معلوم نہ ہو

تھی کیونکہ ذاکر صاحب کبھی بھی تنخواہ کا تقاضہ نہ کرتے تھے۔ جب انھیں پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بڑی مسکینی سے اپنی بیوی کے سامنے جاکر کھڑے ہوجاتے تھے اور کہتے تھے کہ انھیں پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے موڈ کے لحاظ سے کبھی تو اس بات پر احتجاج کرتی تھیں اور کبھی ٹھنڈی سانس لے کر نوکر کو قریب ہی کے ایک بنئے ستا کی دکان پر یا اپنے پڑوسی کلو خاں ٹھیکیدار کی بیوی کے پاس قرض لینے کے لیے بھیج دیتی تھیں۔ بیگم ذاکر حسین کو اپنے دادا جان کی جائیداد سے ہونے والی آمدنی میں سے دس روپے ملتے تھے اور اپنے گھر کا خرچ چلانے کے لیے وہ صرف اسی آمدنی پر بھروسہ کرسکتی تھیں۔ لیکن اس وقت بھی ذاکر صاحب اتنا صاف ستھرا لباس پہنتے تھے جتنا کسی کھدر پوش کے لیے ممکن تھا اور اپنی فطری وجاہت کے باعث انھیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے امرا اور شرفا کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے بالکل سادہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا ہو۔ اگر کوئی شخص ان سے قرض لینا چاہتا تھا تو وہ انکار نہ کرسکتے تھے اس لیے کہ کوئی یہ ماننے کو تیار ہی نہ ہوتا کہ ان کے پاس قرض دینے کے پیسے نہیں ہیں۔ اپنے کنبہ کو قائم گنج سے دلی لانے سے پہلے انھوں نے اس مکان کے لیے جسے وہ کرایہ پر لینے کا ارادہ رکھتے تھے کچھ فرنیچر خریدا تھا۔ لیکن جامعہ کے ایک ملازم کے والد شاہ صاحب جو محکمۂ ڈاک کے ایک معمولی سے ریٹائر آدمی تھے بعد کی وہ تمام کرسیاں جو ذاکر صاحب نے خریدی تھیں ان سے مانگ لے گئے اور پڑوسیوں اور ملنے والوں سے کہا کہ وہ کرسیاں ذاکر صاحب نے ان سے خاص تعلق کے پیش نظر انھیں تحفتہً دی ہیں۔ اگلے مہینہ ذاکر صاحب نے کچھ اور کرسیاں خریدیں اس زمانہ میں میں ان کے برابر والے کمرہ میں رہتا تھا اور مجھے پہلے والے فرنیچر کا انجام معلوم تھا۔ ایک صبح ذاکر صاحب نے مجھے بتایا کہ شاہ صاحب ان کرسیوں کو بھی لے جانا چاہتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ شاہ صاحب دو مزدوروں کے ہمراہ تشریف لا رہے ہیں۔ میں جھنجھلا اٹھا اور کہا کہ ذاکر صاحب کے پاس جو کچھ ہے سب اٹھالے جائیے گا؟ شاہ صاحب سکتہ میں آگئے اور مایوس اور سنجیدہ ہوکر واپس چلے گئے۔ اس بات سے ذاکر صاحب کو بہت تکلیف ہوئی، ”مجیب صاحب! آپ نے یہ کیا کیا“ لیکن مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس کے بعد پھر کبھی بھی کوئی ان سے ”فرنیچر“ مانگنے ”نہ آیا۔

۱۹۲۷ء کے موسم خزاں سے لے کر جامعہ کے اوکھلا منتقل ہونے تک ذاکر صاحب اپنے کنبہ کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ اس مکان میں سڑک کے رخ پر ایک تنگ سا برآمدہ تھا اور مختلف سائز کے تین کمرے تھے۔ یہ تینوں کمرے ایک خاصے چوڑے اندرونی برآمدے میں کھلتے تھے جس کے سامنے صحن تھا۔ صحن کے ایک طرف باورچی خانہ اور بیت الخلا تھا اور دوسری طرف دو کمرے تھے، بیچ میں ایک دروازہ تھا جو پیچھے گلی میں کھلتا تھا۔ اس زمانہ میں قرول باغ کا مضافاتی علاقہ جہاں جامعہ واقع تھی دہلی کا ایک ویران حصہ تھا جہاں نہ تو نل تھا، نہ بجلی اور نہ تحفظ کا کوئی معقول انتظام۔ ان لوگوں کے لیے جو صفائی اور آرام پسند تھے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ بہتر وقتوں کا انتظار کریں۔

ذاکر صاحب اور ان کی بیگم کے معمولات مختلف ہوتے تھے۔ وہ صبح چار بجے جیسے ہی ان کی بکری ممیانا شروع کر دیتی، اٹھ جاتی تھیں، پہلے اپنی بکری کو چارہ دیتیں اور پھر خود ناشتہ کرتی تھیں۔ میرا نمبر بعد میں آتا۔ وہ جو چاہتی تھیں کھاتی تھیں اور وہ ان کے خیال میں صرف ان ہی کے لیے ٹھیک تھا۔ جب میں تیار ہو جاتا تو اپنا ناشتہ اس ڈلیا کے نیچے سے نکال لیتا تھا جہاں وہ بلیوں سے محفوظ رکھا رہتا تھا۔ بیگم ذاکر حسین فطرتاً سلیقہ مند تھیں۔ میں دو دفعہ خاصے لمبے عرصے تک ان کے ساتھ رہا لیکن کبھی بھی ایسا نہ ہوا کہ کھانے میں دیر ہوئی ہو۔ جب کھانے کا وقت ہوتا تھا تو ملازم بغیر بلائے مجھے دیکھنے آ جاتا تھا اور اگر میں موجود ہوتا تھا تو فوراً ہی کھانا چن دیا جاتا تھا۔ پٹھان گھرانوں میں یہ ایک رواج تھا کہ مرد اور عورتیں کھانا الگ الگ کھاتے تھے اور بیگم ذاکر حسین شاید اس رواج کو ختم کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ بہر حال اگر ذاکر صاحب وقت پر آ جاتے تھے تو گرما گرم کھانے سے ان کی خاطر ہوتی تھی۔ بیگم صاحبہ چونکہ عام عورتوں کی طرح سیدھی سادھی نہ تھیں اس لیے وہ اپنے معمول کے مطابق کام کرتی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے جب مجھ سے پردہ کرنا چھوڑ دیا تو میں نے ان کی گفتگو میں بھی اسی بے پروائی کی جھلک پائی۔ اکثر و بیشتر وہ آپس میں کچھ اس طرح باتیں کرتے تھے جیسے لڑ رہے ہیں اور جیسے گفتگو کا صحیح طریقہ یہی ہو۔

ذاکر صاحب کا ناشتہ جو وہ آٹھ بجے کرتے تھے ایک یا دو پلیٹ کھچڑی پر مشتمل ہوتا تھا۔ اگلا کھانا قریب ساڑھے چار یا پانچ بجے ہوتا تھا جو اوندھی ڈلیا کے نیچے سے نکال کر کھا لیا جاتا تھا۔ پھر تھوڑی دیر آرام کے بعد وہ یا تو کسی کے یہاں ملنے چلے جاتے تھے یا ان لوگوں سے گپ شپ کرتے تھے جو شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتے تھے۔ یہ بات چیت کبھی سنجیدہ موضوعات پر ہوتی تھی اور کبھی ہلکے پھلکے موضوعات پر، کبھی کسی کمرے میں اور کبھی سر راہ۔ ان کے ساتھی ان ملاقاتوں کے متمنی رہتے تھے۔ خود ذاکر صاحب کے نزدیک آڑی ترچھی باتیں کرنا بالعموم ایک ذہنی ورزش سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

ذاکر صاحب کے شام کے معمولات میں اس وقت تبدیلی آ گئی جب ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے طبیہ کالج کے کیمیائی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ایک عہدہ سنبھال لیا۔ وہ ایک ہونہار ماہر کیمیا، مصور اور موسیقار تھے۔ ان کی باتیں بہت مزیدار ہوتی تھیں اور ان کے انداز میں ایک عجیب دلنشیں لاپروائی تھی، جس سے محفل میں شریک کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

ان کی جرمن بیوی ٹلی کا تمام مسائل کو سمجھنے کا انداز منطقی ہوتا تھا، وہ منطق جس کے لیے جرمن مشہور ہیں۔ وہ ان سے کسی بھی بات میں اتفاق نہ کرتی تھیں لیکن اس کے باوجود ان کے معاملات میں وہ رخنہ انداز نہیں ہوتی تھیں۔

جب ان دونوں نے قرول باغ میں سکونت اختیار کی تو ذاکر صاحب کی صحبت کسی نعمت سے کم نہ تھی جہاں تک ذاکر صاحب کا سوال ہے انھیں بھی ان لوگوں کے ساتھ شامیں گزارنے کی وجہ سے جامعہ ملیہ کی الجھنوں اور گھسی پٹی باتوں سے فرصت مل گئی. لیکن ان کی غذا نے جس میں خاص طور پر جامع مسجد کے چٹ پٹے مسالہ دار کباب شامل تھے. ان کے ہاضمہ پر برا اثر ڈالا اور شاید یہی ان کی بیماریوں کی وجہ رہی ہو جن سے وہ بعد میں پریشان رہے. وہ خود یہ کہتے تھے کہ "بھئی اتنے مزے دار کبابوں کے لیے سب کچھ گوارا ہے"

دسمبر ۱۹۳۲ میں ہندوستان نہ آنے کے مشوروں، نصیحتوں اور تنبیہوں کے باوجود گرڈا فلپس بورن آ ہی گئیں اور وہ کرنیں بھی کیا. جرمنی میں حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کر لیا تھا جو یہودیوں کے حق میں کچھ اچھا نہ تھا. ان کے کنبہ کی بیخ کنی کی جا رہی تھی اور ان کی جلا وطنی کا بھی اندیشہ تھا. وہ پہلے فلسطین گئیں اور وہاں کچھ دنوں کام کرنے کے بعد ذاکر صاحب کو اطلاع دی کہ وہ ہندوستان آ رہی ہیں. انھیں سفر خرچ بھیجا گیا اور ذاکر صاحب انھیں بمبئی لینے گئے جہاں وہ جہاز سے آ رہی تھیں. جامعہ ملیہ میں ان کا باقاعدہ تقرر یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو ہوا.

آنے کو تو وہ آ گئیں لیکن اب سوال یہ تھا کہ وہ کریں کیا. انھیں نرسری کی تعلیم میں کچھ دخل تھا. لیکن اس کے لیے جامعہ میں اب تک کوئی انتظام نہ تھا. لہٰذا انھیں مدرسہ ابتدائی کے سب سے چھوٹے بچوں کے ہوسٹل سے منسلک کر دیا گیا. مدرسہ ابتدائی کے نگراں عبدالغفار مدھولی ویسے تو بہت ہی منکسر مزاج تھے لیکن باقاعدگی اور وقت کی پابندی کے معاملہ میں بہت ہی سخت واقع ہوئے تھے. ذاکر صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ مدھولی صاحب ہی نے انھیں وقت کی پابندی سکھائی ہے. ایک دفعہ انھیں مدرسہ کے ایک جلسہ میں صدارت کے لیے مدعو کیا گیا تھا جس میں وہ دو تین منٹ تاخیر سے پہنچے تھے، انھوں نے دیکھا کہ جلسہ شروع ہو چکا ہے اور اس کی صدارت کوئی اور صاحب کر رہے ہیں. عبدالغفار مدھولی صاحب کسی شخص کا انتظار نہیں کر سکتے تھے یہاں تک کہ ذاکر صاحب کا بھی نہیں. گرڈا فلپس بورن کے لیے، ایک خاتون ہونے یا ذاکر صاحب کی دوست ہونے کی وجہ سے کسی خاص رورعایت کا سوال نہ پیدا ہوتا تھا.

جہاں تک گرڈا فلپس بورن کا سوال تھا وہ یہ محسوس کرتی تھیں کہ روزمرہ کا کام انھیں صرف اصولی طور پر دے دیا گیا ہے. اصل میں ان کا مشن تو ذاکر صاحب کی دیکھ بھال کرنا، ان سے تعلیمی پالیسی کے سلسلہ میں تبادلہ خیال کرنا اور یہ محسوس کرنا تھا کہ انھوں نے خود کو ذاکر صاحب کی ہم نشینی اور حوصلہ افزائی کے لیے وقف کر دیا ہے. مجھے یاد ہے کہ ذاکر صاحب عبدالغفار مدھولی صاحب سے باقاعدہ تحریری شکایتیں پا کر کہ مس فلپس بورن کلاس میں دیر سے پہنچیں یا انھوں نے کلاس نہیں لی کس قدر جھنجھلا جاتے تھے جب کہ ان کے دیر سے پہنچنے یا نہ پہنچنے کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ وہ ذاکر صاحب کے ساتھ کسی موضوع پر بحث کر رہی ہوتی تھیں یا کوئی پلان

بنا رہی ہوتی تھیں، جوان کے خیال میں کلاس لینے سے زیادہ اہم تھا۔
تناؤ کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ ذاکر صاحب کے فرصت کے اوقات پر گرڈا فلپس بورن اپنا پورا حق سمجھتی تھیں اور جامعہ والوں کے علاوہ ان کے اوقات میں کسی کو شریک کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھیں۔ صدیقی صاحب اور ان کی بیوی کے لیے یہ بات نہایت تکلیف دہ تھی کیونکہ بہر حال ان کی صحبت کہیں زیادہ پر لطف تھی، اور جس کی انھیں خواہش بھی تھی اور ضرورت بھی لیکن وہ ذاکر صاحب کے وقت اور توجہ پر گرڈا فلپس بورن کی گرفت کو ڈھیلا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، نہ وہ ان کی ذات اور جامعہ کے لیے خود کو مساوی طور پر وقف کر دینے کا دعویٰ کر سکتے تھے اور نہ ہی آنسوؤں کا استعمال لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں بھی شک نہیں کہ ان کے ذاتی آرام کے لیے وہ بہت فکر مند رہتی تھیں اور جامعہ ملیہ میں ان کی دل چسپی بھی بہت پر خلوص اور سچی تھی۔
نمک کی ستیہ گرہ اور اس کے نتیجہ میں سول نافرمانی کی تحریک مارچ ۳۰ ۱۹ء میں شروع ہوئی تھی۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور طلبا سیاسی واقعات کا بہت گہرا اثر قبول کرتے تھے اور ان میں جو لوگ زیادہ جوشیلے اور با اثر تھے وہ گاندھی جی اور کانگریس کی سیاست کے دل و جان اور پورے جوش و خروش کے ساتھ حامی تھے۔ گاندھی جی کے سوراج فنڈ میں سب سے پہلے جامعہ کے اساتذہ اور طلبا ہی نے چندے دیئے تھے۔ "قومی ہفتے" (۷ اپریل تا ۱۳ اپریل) کے موقع پر ہر سال جلسے ہوتے تھے اور ان میں سخت جذباتی اور ہیجان انگیز تقریریں ہوتی تھیں۔ "ہفتے" کے آخری دن ۱۳ اپریل کو دار الاقاموں کے ملازموں، چپراسیوں، باورچیوں اور بہشتیوں کا تمام کام اراکین عملہ اور طلبا اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے اور دن بھر کے پروگرام کے آخر میں رات کے کھانے کی دعوت ہوتی تھی جس میں سب لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے سال تک تو قرول باغ کے پورے علاقے کی صفائی کا کام بھی ہاتھ میں لے لیا جاتا تھا اور مقامی باشندوں کو اس میں شریک ہونے کے لیے آمادہ کیا جاتا تھا۔ نمک کی ستیہ گرہ نے بڑی گرما گرمی پیدا کر دی تھی۔ شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب اور حافظ فیاض احمد صاحب سول نافرمانی کی تحریک میں عملی حصہ لینے کا پہلے ہی اعلان کر چکے تھے اور دیو داس گاندھی نے جو اس زمانہ میں جامعہ کے عملہ میں شامل تھے اور سی۔ کے۔ نائر، سی کے ڈیکا اور حسین حسان نے بھی جو طالب علم تھے تحریک میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
یہ بات ہر شخص، یہاں تک کہ شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب پر بھی واضح تھی کہ اگر جامعہ ملیہ قومی تحریک میں حصہ لینے کی غرض سے تعلیمی کام ملتوی کرتی ہے جیسا کہ

گجرات یا کاشی ودیا پیٹھ نے کر رکھا تھا، تو پھر از سر نو کام کا... آغاز کرنا یہ نہ کرنا سیاسی جدو جہد کے انجام پر منحصر ہوگا۔ اگر آزادی حاصل ہو جاتی ہے، تو جامعہ ملیہ کو مسلمانوں کے سب سے مقبول اور ہر دل عزیز ادارے کی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو قوم پرستی پر یقین دا یمان رکھنے والے کرڑسے کٹر قوم پرست مسلمان بھی اُسے گھاٹے کا سودا سمجھ کر بند کر دیں گے۔ ہندوستانی مسلمان کے اندر اتنا استقلال نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا کام جسے اس سے زیادہ اہمیت کے کسی کام کی خاطر ترک کر دیا گیا ہو، از سر نو شروع کر دے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کو فیصلہ کرنا تھا کہ آیا جامعہ ملیہ کو اپنا کام جاری رکھنا چاہیئے یا ختم کر دینا چاہیے۔ اور انھوں نے اس اندیشہ کے باوجود کہ اس سے غلط فہمیاں ضرور پیدا ہوں گی بغیر کسی لاگ لپیٹ کے فیصلہ کیا کہ کام جاری رکھنا چاہیے۔ انھوں نے اس زمانہ کی ایک تقریر میں کہا تھا "جامعہ کا کام یہ ہوگا کہ نوجوانوں کی تربیت کر کے انھیں شہری بنالے جو آزادی کی جدو جہد کو جاری رکھیں اور جب وہ حاصل ہو جائے تو اسے با معنیٰ اور آسودہ حال بنانے کے لیے کام کریں" اپنا یہ منصب بدلنے کا اس سے مطالبہ بھی نہیں تھا۔ اس کے برخلاف اگر کچھ لوگ ایسے تھے جو سول نافرمانی کی تحریک میں عملاً حصہ لینے کو اپنا فرض تصور کرتے تھے تو انھیں ایسا کرنے کی آزادی تھی اور بس اتنا کرنا تھا کہ اپنے ارادہ کی مناسب اطلاع دے کر طویل مدت کی رخصت لے لیں تاکہ جامعہ کے تعلیمی کام کا نقصان نہ ہو۔ ۱۳ ر اپریل ۱۹۳۰ء کے جلسہ میں شفیق الرحمٰن صاحب نے سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینے کے لیے اپنے ارادہ کا اعلان کیا۔ ذاکر صاحب نے انھیں ان کے اس فیصلہ پر مبارک باد پیش کی اور کہا کہ انھیں یقین ہے کہ ان کا فیصلہ احساس فرض پر مبنی ہے اور ہر شخص کو اس کا احترام کرنا چاہیے۔ چنانچہ جہاں ایک طرف جامعہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہی۔ وہاں دوسری طرف شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب، حافظ فیاض احمد صاحب اور سی، کے نائر صاحب نے حکومت کے خلاف ہونے والی مقامی کارروائی میں آگے بڑھ کر پہل کی۔

خصائل:

۱۹۳۶ء کے موسم خزاں میں ایک دن وہ کوئی گیارہ بجے دن کو دفتر سے بھوکے آئے۔ ان کے لیے جلدی جلدی یونہی کچھ الٹا سیدھا کھانا تیار کرایا گیا جو انھوں نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ کوئی بارہ بجے قریب علی گڑھ سے ایک دوست آن پہنچے ان کے لیے پھر کھانا تیار کرایا گیا اور ظاہر ہے ذاکر صاحب نے بھی ان کا ساتھ دیا اور ساتھ ہی نہیں دیا، ساتھ دینے کا پورا حق ادا کیا، یہ کھانا ابھی ختم ہوا ہی تھا کہ نئی دہلی کے ایک دوست جن کے یہاں وہ دن کے کھانے پر مدعو تھے، اپنی کار لے کر انھیں لینے

کے لیے آگئے ذاکر صاحب کو اس دعوت کی بات بالکل یاد نہیں رہی تھی اور انھوں نے ان سے معذرت چاہی لیکن وہ حضرت جن کی بیوی نے ذاکر صاحب کی پسند کی تمام چیزیں بڑی محنت اور جاں سوزی سے تیار کی تھیں، انھیں چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ چلے گئے اور اس اصول کے حسب منشا کہ اگر کوئی شخص کام کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ اسے دل و جان سے پورا کرے، انھوں نے صرف یہی نہیں کہ کھانا کھایا بلکہ خوب مزے لے لے کر کھایا اور میزبان خاتون نے ان کے لیے جو جو چیزیں تیار کی تھیں ان کے لیے ان کی تعریف کے پل باندھ دیے۔ دوسرے دن ان کے اوپر گلوکوما کا نہایت شدید دورہ پڑا اور وہ گھنٹوں بے چینی کی حالت میں پڑے تڑپا کیے۔ اتنی بے چینی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی[1]

یہ وہ جو کچھ کرتے تھے، یہ ان کی کم اندیشی تھی، لیکن اس جرم کو منشاء فطرت کی خلاف ورزی اور اپنے آپ میاں مٹھو بننے پر محمول کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ دراصل مسلمانوں کا تمدن اچھی غذا کو انسان کے حق میں نعمت خداوندی تصور کرتا ہے جس کے لیے اسے اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مسلمان کی مہمان نوازی صرف اس قدر نہیں ہے کہ وہ مہمانوں کی آؤ بھگت کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ انھیں ان کا محبوب و مرغوب کھانا کھلائے دوسری طرف مہمان کو چاہیے کہ اس کے سامنے جو کچھ اور جیسا کچھ کھانا آئے اسے وہ مزے لے لے کر اور شکم سیر ہو کر کھائے تاکہ میزبان کی تشفی ہو جائے۔ کم کھانے اور ناک بھویں سکوڑ کر کھانے سے میزبان کی دل شکنی ہوگی اور اس سے مہمان کو پرہیز کرنا چاہیے گویا مروت اور دل داری کا مسلمہ اصول مہمان کی خوش کلامی اور کھانا کھانے کی خواہش اور اس کی تعریف و توصیف سے عبارت ہے۔ ذاکر صاحب جو کچھ کھاتے وہ ان کو مرغوب بھی نہ ہوتا، پھر بھی وہ جذبہ مروت جو ان کی طبیعت کا خاصہ اور ان کے تمدن کا مقتضا تھا، اس کے زیر اثر وہ ظاہر یہی کرتے تھے کہ کھانا بہت عمدہ ہے اور اس اظہار پسندیدگی کا ثبوت اس طرح دیتے کہ کھانا خوب سیر ہو کر کھاتے جو لوگ ان کے مداح تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی صحبت اٹھائیں وہ موقع آنے پر انھیں کھانے پر مدعو کرتے، اپنے حسب مقدور لذیذ سے لذیذ کھانے

---

[1] دہلی میں تھوڑے بہت ابتدائی علاج کے بعد ذاکر صاحب آنکھوں کے ایک جرمن سرجن ڈاکٹر کیوے Keiwe سے بیمار آنکھ کا آپریشن کرانے کی غرض سے بمبئی گئے۔ انھیں چونکہ زکام اور کھانسی کی شکایت تھی اس لیے آپریشن ملتوی کرنا پڑا تھا۔ وہ ترنگ میں آکر چندہ جمع کرنے کے لیے سفر پر نکل گئے اور اس حال میں واپس آئے کہ کھانسی بڑھ چکی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپریشن کو ممکن کرنے کی غرض سے کھانسی دور کرنے کی نہایت تیز تیز دوائیں دینی پڑیں۔ آنکھوں کے علاج اور آپریشن کے لیے ذاکر صاحب ڈاکٹر کے۔ اے حمید کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس دوران میں ڈاکٹر حمید اور بیگم حمید نے جس محبت اور دیکھ بھال کے اہتمام کے ساتھ ان کی پذیرائی کی تھی، اس کا ذکر وہ بڑے تشکر و امتنان کے ساتھ کرتے تھے۔

تیار کراتے اور چاہتے کہ ذاکر صاحب ہر کھانا جی بھر کر کھائیں۔ میں' جامعہ میں اپنے ساتھیوں کو اس وقت بھی جب یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ذاکر صاحب کو ذیابیطس کی شکایت ہے اور انھیں چاول میٹھے اور مرغن کھانوں کا پرہیز بتایا گیا ہے' اس بات پر آمادہ نہ کر سکا کہ جب وہ ذاکر صاحب کو کھانے پر مدعو کریں تو کھانے کی مروایاتی اشیا کا اہتمام نہ کریں۔ صرف سادہ کھانے تیار کرائیں' ایسے کھانے جن سے ان کی صحت کو نقصان نہ پہنچے۔ بات یہ نہیں تھی کہ انھیں ذاکر صاحب کی صحت کا مجھ سے کچھ کم خیال تھا بلکہ وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ ان کے یہاں ذاکر صاحب جیسا شخص مہمان ہو اور کھانا اس کے لیے روکھا پھیکا اور بے آب و نمک تیار کرایا جائے۔

یہ بات ذاکر صاحب کو بے قصور ثابت کرنے کی نیت سے نہیں کہی جا رہی ہے کہ وہ کھانے کی لذت سے اپنے آپ کو محروم رکھنے کے لیے اپنی قوت ارادی سے کام لے ہی نہیں سکتے تھے[1] لیکن انھوں نے اپنے آپ کو جس کردار کا اپنے یقین و ایمان کی بنا پر بھی صبر و شکر کے ساتھ کھاتے تھے جس کی نوعیت ظاہر ہے ان کی حقیر سی آمدنی پر منحصر تھی۔ ایک مرتبہ گرڈ انلیپس بورن نے ان

---

[1] ایک بار اس زمانہ میں جب کھانے پینے کے معاملے میں ذاکر صاحب کو سخت پرہیز بتایا گیا تھا مجھے ان کے ساتھ حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے سفر شروع ہونے سے پہلے ہی انھیں آگاہ کیا تھا کہ وہ وہی کھانا کھائیں گے جو میں ریستوران کار سے ان کے لیے منگاؤں گا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا۔ "جو مزاج میں آئے کیجیے" انھوں نے جواب دیا "آپ کے رحم و کرم پر ہوں" چوبیس گھنٹے تک تو حکم امتناعی برقرار رہا۔ واردھا کے اسٹیشن پر ایک لڑکا ریوڑیاں بیچتا ہوا آیا اور ہمارے ڈبہ کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "کچھ لے لیجیے سرکار" د
میں نے اس سے کہا "آگے جاؤ۔" ذاکر صاحب چڑھ کر بولے "ذرا تو خیال کیجیے یا رحم کا جذبہ آپ کے دل سے کافور ہو گیا ہے؟ ایک غریب لڑکا کچھ بیچتا پھر رہا ہے اور آپ اتنے سنگ دل ہو گئے ہیں کہ اس سے دو پیسے کی چیز بھی نہیں خرید سکتے؟ مجھے اپنے کیے پر پچھتاوا آیا اور میں نے اس سے دو پیسے کی مٹھی بھر ریوڑیاں خرید لیں مگر میں ریوڑیوں کی تھیلی ہاتھ میں زور سے پکڑے رہا۔ ذاکر صاحب یہ بھانپ کر کہ میں انھیں ریوڑیاں پیش نہیں کروں گا بولے "یہ کیا مذاق ہے؟ آپ یا تو ریوڑیاں خریدتے ہی نہیں، لیکن جب خرید لیں تو یہ کیا بات ہوئی کہ وہ کھائی نہ جائیں۔" میں نے چھوٹی چھوٹی دو ریوڑیاں نکالیں اور ذاکر صاحب کو پیش کر دیں۔ اس کے بعد میں نے موقع پا کر ریوڑیوں کی تھیلی کو اپنے بستر کے نیچے چھپا دیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے ریوڑیوں کا خیال آیا اور میں نے چاہا کہ دیکھوں وہ محفوظ ہیں یا نہیں۔ میں نے بستر پلٹ کر دیکھا تو وہاں صرف کاغذ کی تھیلی پڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ جس وقت میں باتھ روم گیا تھا اسی وقت ریوڑیاں صاف ہو گئی تھیں۔ میں نے مشتبہ نظروں سے ذاکر صاحب کی طرف دیکھا، آپ بالکل معصوم چہرہ بنائے بیٹھے تھے

کے رات کے کھانے کے لیے کلیجی اور پیاز کی ایک چیز جرمن طرز پر تیار کی۔ ذاکر صاحب کھانے پر نہ آسکے تھے اس لیے گرڈا نے اسے اٹھا رکھا تھا کہ دوسرے دن دوپہر کے کھانے پر انھیں دیں گی۔ گرمی کا موسم تھا اور دوسرے دن دوپہر کے کھانے کا وقت ہوتے ہوتے کلیجی خراب ہو گئی تھی۔ ذاکر صاحب دوپہر کے کھانے پر اپنے ایک رفیق کار حامد علی خاں کو لیتے آئے تھے۔ انھوں نے کلیجی چکھی اور حامد علی خاں سے کہا۔ "آپ کو اس میں سے حصہ نہیں ملے گا" گرڈا فلپس بورن اور حامد علی خاں نے تازہ پکی ہوئی سبزی کھائی اور ذاکر صاحب کلیجی کی پوری پلیٹ صاف کر گئے۔ آگے چل کر جب انھیں یقین ہو گیا کہ اب خطرہ سے نکل گئے ہیں تب انھوں نے حامد علی خاں کو بتایا کہ کلیجی بالکل خراب ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے انھوں نے سب کی سب خود کھائی تھی۔

ذاکر صاحب کے اس کردار کا مجھے جو سب سے حیرت انگیز واقعہ یاد ہے وہ اس زمانہ سے متعلق ہے جب ان پر گلوکوما کا دورہ پہلی مرتبہ پڑا تھا۔ وہ بستر پر تھے اور آنکھ میں شدید درد تھا۔ کمرے کے دروازے بند کر دیے گئے تھے اور ان کے کچھ احباب چوکیداری کر رہے تھے کہ کوئی شخص ان کے آرام میں خلل نہ ڈالنے پائے۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ پنجاب کے کسی مقام کا رہنے والا ایک مسلمان آیا اور ذاکر صاحب سے ملنے کی درخواست کی اس کو بتایا گیا کہ ذاکر صاحب بیمار ہیں اور کسی سے مل نہیں سکتے مگر وہ شخص اڑ گیا اور کہنے لگا کہ وہ پنجاب سے اتنی دور چل کر آیا ہے اور اب ذاکر صاحب سے ملے بغیر واپس نہیں جا سکتا۔ اس نے جب دیکھا کہ لوگ اسے ذاکر صاحب سے ملنے دینا نہیں چاہتے تو زور زور سے باتیں کرنے لگا۔ آخر کار اس بحثا بحثی کا شور ذاکر صاحب کے کانوں تک پہنچا۔ انھوں نے پوچھا یہ کیا ہنگامہ ہے؟ انھیں بتایا گیا کہ ایک جٹو قسم کا شخص ملنے آیا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ کچھ تو خیال کرے۔ ذاکر صاحب نے کہا اسے اندر لائیے۔ جب ان کے احباب نے انکار کیا تو بہت جز بز ہوئے اور دھمکی دے کر کہنے لگے کہ اگر اس کو اندر نہ آنے دیا گیا تو وہ بستر سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور باہر جا کر خود اس سے ملاقات کریں گے۔ احباب اب مجبور ہو گئے اور اسے اندر بلایا۔

ذاکر صاحب کے اسی کردار کا ایک پہلو یہ تھا جو ۱۹۳۳ء میں اس وقت ظہور پذیر ہوا جب ان کی ننھی سی بچی ریحانہ کا انتقال ہوا۔ ریحانہ قدرت کی بڑی پیاری تخلیق تھی، گلاب جیسے گال، بھورے بھورے سنہرے بال اور بڑی بڑی جوبا آنکھیں۔ ذاکر صاحب اسے بہت چاہتے تھے۔ وہ مدرسہ ابتدائی کے بچوں کو جنھوں نے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی، مٹھائی تقسیم کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک چپراسی آیا اور ان کے کان میں کچھ کہا۔ ذاکر صاحب حسب معمول مٹھائی بانٹتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چپراسی پھر آیا اور اسی طرح کان میں کچھ کہا۔ ذاکر صاحب پیلے پڑ گئے مگر مٹھائی بدستور بانٹتے رہے۔ اسی دوران مدرسہ میں گھنٹی بجنی شروع ہوئی اور دیر تک بجتی رہی جسے سن کر لوگ حیران و پریشان پوچھنے لگے کہ کیا ماجرا ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ ریحانہ کا

اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ جامعہ کا سارا کاروبار بند ہو گیا اور جامعہ برادری کے ارکان ذاکر صاحب کے مکان پر جمع ہونے لگے۔ وہ خود سب سے آخر میں آئے۔ ان سے دیر سے آنے کا سبب پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ "خبر تو مجھے پہلے ہی ہو گئی تھی مگر میں مدرسہ کی ایک تقریب میں شریک تھا اور بچے اس قدر خوش تھے کہ میں ان کی خوشی میں خلل ڈالنا نہ چاہتا تھا۔ وہ کسی قدر خاموش تھے مگر اور باتوں کے لحاظ سے معمول پر تھے۔ انھوں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ جس بچی سے انھیں بے حد محبت تھی اس کی تجہیز و تکفین کی رسوم ادا کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ دنوں بعد بیگم ذاکر حسین سے معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ تک روزانہ صبح کو ان کا تکیہ بھیگا ہوا ملتا تھا۔ گویا بیگم صاحبہ کو بھی راتوں کو رونے کا حال صرف اس ذریعہ سے معلوم ہوا تھا۔

جب ذاکر صاحب کسی آزمائش میں مبتلا اور مغموم ہوتے تھے تو ان لمحات میں کس چیز کا سہارا لیتے تھے۔ یہ سوال اگر ان سے کیا جاتا تو اس کا جواب وہ نہ دیتے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتے تھے کہ جو دن گزر جائے اس کے لیے انھیں شکر گزار ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی یہ کہتے کہ اگر ان کی زندگی کسی مقصد کے لیے گزر رہی ہے تو یہی ان کے لیے کافی ہے ورنہ ہر پہلو پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی زندگی ہے ہی کس کام کی؟ ان کی طبیعت میں مزاح کا ایک عنصر تھا جس سے صرف یہی نہیں کہ وہ جس مجلس میں بھی ہوتے اسے گرما دیتے تھے بلکہ اس کی بدولت وہ اپنے روزمرہ کے افکار سے اس قدر بلند ہو جاتے تھے کہ خود ہی اپنا مذاق اڑا کر جی ہلکا کر لیتے تھے۔ ان کی زندگی کے رکھ رکھاؤ میں گاندھی جی کی شخصیت کا بڑا زبردست اثر تھا۔ انھوں نے ایک بار نہیں کئی بار کہا کہ گاندھی جی کی شخصیت کا جو پہلو انھیں سب سے زیادہ پسند آیا وہ یہ تھا کہ ان کے اندر آپ اپنا مذاق اڑانے کی بڑی صلاحیت تھی۔

مگر یہاں سوال یہ ہے کہ ذاکر صاحب کی روحانی اور اخلاقی توانائی کا اصل سرچشمہ کیا تھا۔ اس سوال کا جواب میں دینا چاہتا ہوں وہ اگرچہ روایتی اور غیر مفکرانہ معلوم ہوگا مگر میرے نزدیک وہی اس کا صحیح جواب ہے۔ ان کی قوت و توانائی کے سرچشمے تھے قرآن مجید اور فارسی شاعری۔

جامعہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد دس سال کا زمانہ ایسا تھا جب جامعہ ملیہ سے دلچسپی لینے کی امید صرف مسلمانوں سے کی جا سکتی تھی۔ اور ان کی دلچسپی کو ابھارنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کے مذہبی جذبے کو برانگیختہ کیا جاتا۔ لیکن اس زمانہ کی اپنی زوردار سے زوردار تقریروں میں بھی ذاکر صاحب نے اپنے مذہبی عقیدہ کا کبھی براہ راست اظہار نہیں کیا۔ وہ مذہبی خیال کے لوگوں کی طرح کبھی بات نہیں کرتے تھے اور نہ نماز کی ادائیگی میں پانچوں وقت کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ نماز وہ ضرور پڑھتے تھے، مگر بیشتر راتوں کو اور علی الصباح۔ قرآن وہ پابندی سے پڑھتے تھے۔ اور رمضان کے مہینہ میں پورا قرآن ختم کرتے تھے اور جتنی مرتبہ ہو سکتا تھا، اتنی مرتبہ ختم کرتے تھے۔ یہ ان کا روایتی معمول تھا۔ اسی طرح روزے بھی وہ پابندی سے رکھتے تھے

ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کٹر مذہبی نہیں ہیں اور نہ یہ کہ کٹر مذہبی ہیں۔ لیکن ایک مرتبہ مجھے یاد ہے کہ جب ہم لوگ مسلمان کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو انھوں نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس میں متقی کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ثابت قدم، سچے اطاعت گزار اور نیکی کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہونے والے اور اس کی مغفرت کے طلبگار ہیں[1] ذاکر صاحب متقی کی جس صفت پر بہت زور دیتے تھے وہ یہی آخری صفت تھی۔ کہنے لگے "اب آپ خود ہی نتیجہ اخذ کر لیجئے۔"

جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے یہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ذاکر صاحب کی پرورش ایک ایسے معاشرے میں ہوئی تھی جس میں شاعری کو جمالیاتی اور ذہنی آزادی کی علامت اور بہ حیثیت انسان اس کی خودی کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا ہے اور جہاں اسے انسانی ذہن کو تحریک میں لانے والی ہر چیز پر، خواہ وہ مذہب ہو یا کتابی علم دنیاوی مصالح ہوں یا عقل سلیم تفوق حاصل رہا ہے۔ اور یہ اس بنا پر کہ شاعری محبت کی نمایندگی کرتی ہے اور تمام قوانین و ضوابط سے بالاتر ہے۔ ہر تحریک اور ہر اہم واقعے کے ساتھ اس کے اپنے شاعر اور شعر وجود میں آتے رہے ہیں۔ جامعہ کے یوم تاسیس کا آغاز نظم سے ہوتا تھا اور وہ نظم ہر موقع پر جب جوش پیدا کرنا ہوتا، پڑھی جاتی تھی۔ جامعہ کے شعرا میں ایک مولانا محمد علی تھے اور دوسرے شاعر دینیات کے عالم اور محقق مولانا اسلم جے راجپوری تھے اور یہ وہ لوگ تھے کہ ان کے بارے میں شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ شعر و نغمہ کی دیوی ان پر سایہ فگن ہے۔ ذاکر صاحب ان لوگوں میں نہیں تھے جو جذبات کی رو میں بہ جانا پسند کرتے ہیں: وہ ایرانی اور ہندوستانی شعرا کا کثرت سے مطالعہ کرتے تھے اور ان کے اشعار بڑے موثر انداز میں سناتے تھے۔ لیکن شاعری کے موضوع پر وہ ادیب کی حیثیت سے بحث نہیں کرتے تھے۔ ان کے اپنے چند محبوب شاعر تھے اور ان کے کلام میں سے وہ وہی چیزیں منتخب کرتے تھے جن سے ان کے باطن کو توانائی حاصل ہوتی تھی۔ شاعر کے وہی لمحات جب وہ ابدیت میں ڈوب جاتا ہے اور پھر بھی اس الہامی لمحے کی پوری قوت کا حامل ہوتا ہے۔

فارسی کے صوفی شاعر سرمد کی ایک رباعی ہے جسے ذاکر صاحب نے جامعہ کے ماہر خطاط استاد علی محمد خاں سے فرمائش کر کے اپنے لیے لکھوایا تھا اور جو آج بھی آرائشی خطاطی کا ایک شاہ کار ہے رباعی یہ ہے۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد   یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن بہ رضای دوست می باید داد   یا قطع نظر ز یار می باید کرد

---

[1] قرآن۔ سورہ ۳، آیت ۱۵۔ ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد

اردو میں اس رباعی کا ترجمہ کچھ یوں ہوگا۔
سرمد شکوہ شکایت چھوڑو، تمہارے سامنے دو کام ہیں ان میں سے ایک اختیار کرلو، یا تو اپنے آپ کو دوست (بمعنی اللہ) کے حوالہ کردو، یا پھر سرے سے اس کی طرف سے منہ موڑلو۔

تعلیم کے تصورات اور نصب العین

ذاکر صاحب کی مدح و ثنا کے طور پر اس زمانے میں جب وہ نائب صدر اور صدر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، کہا جاتا تھا کہ وہ غیر مذہبی (سیکولر) آدمی ہیں۔ اگر وہ لوگ جو اس طرح ان کی مدح کرتے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ذاکر صاحب اتنے مسلمان نہیں تھے کہ انھیں صدارت کے اعلیٰ ترین عہدہ پر بجا طور مامور کیا جا سکتا تھا، تو ان کا خیال سرے سے غلط تھا۔ وہ جامعہ ملیہ کے سربراہ کی حیثیت میں جتنے مسلمان تھے اس سے کہیں زیادہ مسلمان صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت میں تھے۔ دوسری جانب وہ مسلمان بھی اسی قدر غلطی پر تھے جو سمجھتے تھے کہ چونکہ ذاکر صاحب نے اپنے متعلق ذہنوں میں یہ نقش بٹھا دیا تھا کہ وہ کسی حیثیت سے بھی مسلمان نہیں ہیں اس لیے اس اعلیٰ عہدے پر فائز ہو گئے تھے۔ مذہبی اور غیر مذہبی کی اصطلاحوں پر اس احمقانہ انداز میں بحث کی جاتی ہے کہ ان کا مطلب خبط ہو کر رہ گیا ہے اور جب ہم صرف اپنے حقوق ہی کے بارے میں سوچتے اور باتیں کرتے ہیں اور فرائض کو یکسر بھول جاتے ہیں تو یہ صورت حال بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔ ذاکر صاحب کو کسی عہدے نے خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ وارفع تھا، ان کے ایک اچھا اور اچھا ہی نہیں سچا اور دیندار مسلمان ہونے کے حق سے محروم نہیں کیا اور ہر عہدے پر فائز ہونے کے بعد ان کے اوپر اخلاقی پابندی آجاتی تھی کہ عہدہ دار ہونے کی بنا پر جو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار ان کے ذہن میں آسکتا تھا اس کے مطابق اپنے فرائض انجام دیں فرائض کی انجام دہی کے یہ اعلیٰ معیار ان کے نزدیک اسلامی معیار تھے۔ جو انھیں تمام عمر محبوب رہے، خواہ وہ معیار دوسروں کی نظروں میں پرکھ کے اس معمولی پیمانے سے مختلف ہی کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں جسے ہم ایک دوسرے کو ایک مخصوص مذہبی اور روایتی تمدن کے علمبردار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کی غرض سے استعمال کرتے ہیں۔

انھوں نے ایک غیر مسلم مجمع کے سامنے اپنے تصورات کا اظہار پہلی مرتبہ شاید اس موقع پر کیا جب ۱۹۲۸ء میں میسور میں مذاہب عالم کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس موقع پر جہاں انھوں نے بہ تاکید یہ بات کہی کہ مسلمانوں کو اپنے تشخص کو محفوظ رکھنے کا حق ہے، وہاں ان کو

متنبہ بھی کیا تھا کہ اسلام اسی حالت میں باقی رہ سکتا ہے کہ جب وہ ایک متحرک تخلیقی قوت کی حیثیت سے اپنا منصب — یا اپنا وہ فرض پورا کرے جو اس کی ابتدا اور تاریخ اس کے اوپر عائد کرتی ہے۔

"اگر کچھ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک شخصی ریاست کے سربراہ کو اس کی مسند سے ہٹا دینے یا عورتوں کو غیر صحت بخش مکانوں کی چہار دیواریوں سے باہر نکالنے سے اسلام ختم ہو جائے گا تو وہ یقیناً ختم ہو جائے گا اور جن لوگوں کو امید ہے کہ وہ اس اسلام کو بچا لیں گے، وہ مستقل مغالطے میں ہیں۔ لیکن اگر اسلام ایک ایسے مذہب کا نام ہے جس نے بے دینوں کو دیندار اور وحشیوں کو مہذب بنایا، جس نے عورتوں کو اپنے سماج میں وہ مرتبہ اور مقام بخشا جو انھیں اس سے پہلے کبھی کسی سماج میں حاصل نہیں تھا جس نے انسانی برادری میں صرف کردار کی اشرافیت کو تسلیم کیا — تو میرا ایمان ہے کہ وہ اسلام زندہ رہے گا اور بنی نوع انسان کے ترقع میں مسلسل اپنا کردار ادا کرتا رہے گا۔" [1]

پوری مسلمان قوم کو مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقے سے تعبیر کرنے کے سیاسی اعتبار سے بڑے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ قوم کے عوام یعنی دستکاروں، کسانوں، مزدوروں کی تعلیم کو نظر انداز کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے اور باتیں بنانے والے طبقۂ اعلیٰ کے اوزار بنے رہے۔ جامعہ ملیہ ان معدودے چند اداروں میں سے ہے جو طبقہ واریت کے حلقے کو توڑنے میں کامیاب ہوئے اور مسلمانوں عوام اور ان سے بھی آگے بڑھ کر ہندوستانیوں تک پہنچے۔ اس کام کا سب سے بڑا وسیلہ شعبہ تعلیم بالغان تھا جسے مقامی طور پر بڑی شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ ایک بالواسطہ مگر نہایت کارگر وسیلہ اس کا قوم پرستانہ مزاج بھی تھا جس کے اثر سے وہ ان لوگوں سے الگ رہے جو تعلیم کا اولین مقصد سرکاری ملازمت کی اہلیت پیدا کرنا سمجھتے تھے اگرچہ اس کے اساتذہ میں اچھی خاصی تعداد متوسط طبقہ کے لوگوں کی تھی، تاہم اسے معاشرتی امتیازات کی پابندی کو اصولاً اور عملاً دونوں حیثیتوں سے ختم کرنے میں کامیابی ہوئی۔ اس کے نچلے عملے کو جسے سرکاری اصطلاح میں چوتھے درجے کے ملازموں کا عملا کہا جاتا ہے، انجمن (کورٹ) اور مجلس منتظمہ میں نمائندگی دی گئی اور ضوابط ملازمت میں اس بات کی رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ جامعہ کی تعلیمی سہولتوں سے استفادہ کر سکیں۔

---

[1] وی، ایس، ماتھر : مرتب
آریہ بک ڈپو نئی دہلی، صفحہ : ۵۹۔

ذاکر صاحب کو اس پر اصرار تھا کہ مسلمانوں کو مع ان کے روایاتی مذہب اور مخصوص تمدن کے اپنے قومی تشخص کو محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء ہی میں کاشی ودیا پیٹھ کے خطبۂ تقسیم اسناد میں اس کا اعلان کر دیا تھا:

"کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم ان مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا کہ وہ اپنے تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لیے کتنا اہم ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لیے مضر ہے مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کر لیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضہ ہے آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز اجتماع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز ہندوستانی متحدہ قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے۔ اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں تنگ نظری اور دیس کے صحیح مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں ہوں۔"

اب ہر فرقے کے لیے اپنے مخصوص تشخص کو قائم رکھنے کی آزادی ہندوستانی آئین میں محفوظ کر دی گئی ہے اور تمام صاف ذہن اور معقولیت پسند اشخاص اس کو اصولاً تسلیم کرتے ہیں لیکن معلم کے سامنے اس سے بڑے سنجیدہ اور مشکل مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جس کی بہترین مثال جامعہ ملیہ ہے۔ اسے اپنے بانیوں کے حسب منشا اور گاندھی جی کی تائید و حمایت سے ایک ایسا ادارہ بننا تھا جو تعلیم کے لیے اپنی غذا اسلام اور مسلمانوں کے روایتی تمدن سے حاصل کرے مگر اسی کے ساتھ اس کے بانیوں کا منشا یہ بھی تھا کہ یہ اپنے غیر مسلم طلبا کو ان کے اپنے مذہب اور تمدن کی تعلیم کے مواقع فراہم کرے گی اس حالت میں اس کے لیے یہ کسی حالت میں ممکن نہیں تھا کہ اپنے وسیع المشرب اور ہمہ گیر مزاج کے باوجود اپنے بنیادی اصول پر قائم رہے۔ اپنی تاسیس کے کوئی تین سال کے بعد اس نے اپنا سیاسی جامہ اتار دیا جب روایتی تمدن کی وفاداری نے سیاسی مفہوم اختیار کر لیا، جو جامعہ ملیہ کے وسیع المشربی اور ہمہ گیریت کے دعوے اور عمل کے منافی تھا، تو پھر یہ تنہا رہ گئی اور اسی تنہائی کی حالت میں کام کرنے پر مجبور ہوئی۔ ذاکر صاحب

نے ۱۹۳۷ء کے اواخر میں بنیادی تعلیم کی تبلیغ کی ذمہ داری قبول کرلی۔ اس سے وہ اور جامعہ ملیہ دونوں مسلمانوں کے اس حلقے میں کافی بدنام ہوئے جو کانگریس کی مخالفت میں ہونے والے پروپیگنڈے کا شکار ہوگیا تھا اور یہ سمجھنے لگا تھا کہ بنیادی تعلیم کے نصاب میں ایسی باتیں شامل ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے تمدن کے منافی ہیں۔ ذاکر صاحب کی ہوشیاری اور فراست نے بنیادی تعلیم کی مخالفت کو عام نہیں ہونے دیا، مگر اس واقعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی ادارہ اپنے آپ کو کسی فرقے کے مذہب اور روایتی تمدن سے مشخص کرے تو ہو سکتا ہے اس فرقے کے سیاسی پہلوان اور متشدد عناصر اس ادارے اور روایتی تمدن سے متعلق اس کے نظریات و معمولات کے خلاف صف آرا ہوجائیں۔ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ روایتی تمدن کے اوپر عمل اکثر و بیشتر فرقے کی اکثریت کے عادات وخصائل اور مفادات و مصالح سے مطابقت نہیں رکھتا جو نصب العین سے عموماً بہت دور ہوتے ہیں۔ جامعہ ملیہ نے اسلامی روایات اور تمدن کی نمایندگی کرتے ہیں مسلمانوں کی اکثریت کے تعصبات کو راہ نہیں دی اور نہ اسلام کی تعلیمات کی رسمی یا سیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کیا۔ سچ پوچھیے تو اس نے اپنا ایک الگ اسلامی کردار پیدا کیا اور اس عمل میں مسلمانوں کی رسمی روایات اور نظریات کی پابندی کرنے سے زیادہ ان سے گریز کیا۔ ذاکر صاحب نے اس کے باوجود کہ جاندار چیزوں کی تصویر کشی مسلمانوں کے نزدیک عقیدے کی رو سے ناجائز ہے، مدرسے کے نصاب میں مصوری کے مضمون کو داخل کیا۔ ڈرامے لکھوائے اور اسٹیج کرائے۔ مدرسہ ابتدائی میں بچیوں کو داخل کرکے مخلوط تعلیم کے رواج کے لیے راستہ ہموار کیا۔ غرض مذہبی تشدد کو کسی حالت میں راہ نہیں دی۔ قرآن کی آیت "لا اکراہ فی الدین" کے مطابق رواداری سے متعلق ان کے عمل سے ایسا ماحول پیدا ہوگیا تھا جس میں لوگ آزادی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر ظاہر کرتے تھے اور ایک دوسرے کی رائے اور عقیدے کے باب میں افہام و تفہیم سے کام لیتے تھے۔

سلور جوبلی:

جامعہ ملیہ کا جشن سیمیں ۱۹۴۵ء میں ہونے والا تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ اس موقع پر کانگریس اور لیگ کے لیڈروں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ جس انداز سے انھوں نے اس میں کامیابی حاصل کی وہ حقیقت میں منصوبہ بندی کا ایک شاہکار تھا۔ جامعہ ملیہ نے پہلے ایک تعلیمی نمائش ترتیب دی جس کا ایک چکر ذاکر صاحب کے ساتھ لگانے کے بعد ہر شخص یقین کرلیتا تھا کہ ایک تعمیری تصور اور خالص عملی جذبہ یہاں کارفرما ہے۔ نمایاں اور اہم لوگوں کو مدعو کیا گیا کہ وہ یہاں آئیں اور دیکھیں۔ انہی لوگوں میں فیلڈ مارشل آکن لیک بھی تھے۔ اس نمائش

سے کوئی تجارت یا تاجرانہ عجلت مقصود نہیں تھی اور نہ کوئی چیز فروخت ہو رہی تھی۔ ممتاز لوگوں کو وقت اور موقع دیا گیا کہ وہ اپنی نج کی ملاقاتوں میں نمائش کے متعلق تبادلہ خیال کریں۔ قائداعظم جناح تک چونکہ رسائی دشوار تھی اس لیے ان سے ملاقات کے لیے ذاکر صاحب نے ان روابط سے کام لیا جو انھیں حاصل تھے۔ مسٹر جناح نے بڑے روکھے پن سے ان سے صاف کہہ دیا کہ وہ ہر اس بات کی مخالفت کریں گے جو کانگریس کی طرف سے پیش کی جائے گی، یا جس کی کانگریس حمایت کرے گی۔ اور یہی سبب ہے کہ وہ بنیادی تعلیم کے مخالف ہیں مجھے یہ معلوم نہیں کہ اور کن امور پر گفتگو ہوئی لیکن کچھ ہی دن بعد مس فاطمہ جناح جامعہ ملیہ کی تعلیمی نمائش دیکھنے آئیں۔ انھوں نے بہت اچھی رپورٹ پہنچائی ہوگی۔ چند روز کے بعد مسٹر جناح نے اطلاع دی کہ وہ جوبلی کے جلسہ میں شریک ہوں گے۔

جامعہ کے اسٹاف میں سے ایک صاحب نے باورچی خانہ کا کام اپنے ذمے لے لیا اور ساری جنس گوشت و ترکاری وغیرہ کا بندوبست کر لیا۔

اس افواہ پر کہ کچھ مسلم لیگی دیوانوں نے یہ طے کیا ہے کہ مسٹر آصف علی جو گورنمنٹ کے وزیر ہیں اگر جشن میں شریک ہوئے تو وہ ان کی توہین کریں گے، جامعہ والے سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اگر کوئی ناگوار بات نہ بھی پیش آتی تب بھی سرکاری نگراں عملے کو ایسے جلسہ کی نگرانی جس میں جواہر لال نہرو، مسٹر جناح، مولانا آزاد اور لیاقت علی خاں جیسے معزز مہمان ہوں، بڑے سے بڑے نگراں کو حواس باختہ کر سکتی تھی لیکن ہر کام بخیر و خوبی ہو گیا اور چار روز کے نہایت مصروف پروگرام میں کوئی شق چھوٹنے نہیں پائی۔

ذاکر صاحب ہر جگہ موجود تھے اور ہر چیز کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی مخصوص خدمت یہ تھی کہ وہ مہمانوں کا خیر مقدم کریں اور ممتاز مہمانوں کے ساتھ رہ کر ان کو سیر کرائیں جن میں نواب بھوپال بھی تھے جنھوں نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی نواب رامپور جنھوں نے نمائش کا افتتاح کیا تھا۔ ڈاکٹر کے۔ اے۔ حمید، مولوی عبدالحق اور سر عبدالقادر جنھوں نے کانووکیشن ایڈریس پڑھا۔ شیخ الجامعہ کو وائس چانسلر کی حیثیت سے کئی تقریریں کئی موقعوں پر کرنا تھیں۔ یہ سب برجستہ اور پر مغز تقریریں تھیں۔ انھوں نے اپنی لکھی ہوئی تقریریں ان سب تقریروں کا خلاصہ بھی دیا تھا جو وہ پہلے کر چکے تھے اور جوبلی کے جلسہ کی یہ تقریر غالباً ان کی زندگی کی سب سے زیادہ فصیح، دل گداز اور پر اثر تقریر تھی۔ ان کے دائیں اور بائیں وہ لوگ بیٹھے تھے۔ جن کے ہاتھ میں اس وقت ہندوستان کے عوام کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ انھوں نے ماہر تعلیم کی حیثیت سے جس نے بیس سال سے زیادہ کام کیا تھا اور مصائب جھیلے تھے اور جو اپنے اور دوسرے ماہرین تعلیم کی امیدوں پر پانی پھرتا دیکھنے کا خطرہ محسوس کر رہا تھا، اپنے الفاظ سے بہت سی آنکھوں کو پرنم بنا دیا اور اگر لوگ عادتاً اپنے ذاتی اغراض پر اعلیٰ مقاصد کو قربان کر دینے کے خوگر نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ ان کے

رویہ میں ایسا انقلاب پیدا ہوتا جو ہندوستان کی تاریخ میں نہایت اہم اور عظیم الشان ہوتا۔ قومی رہنماؤں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک، اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے لیے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے۔ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے بہت سخت لفظ بھی نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے آپ سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھایئے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھایئے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجئے۔"

خلاصہ:

مجھے اعتراف ہے کہ جن دنوں ذاکر صاحب سے میرا تعلق بہت قریب کا تھا، اس زمانے میں میں اپنے فیصلوں کے معاملے میں اکثر خود سری کی طرف مائل رہتا تھا، میں جاننا چاہتا تھا کہ

جب وہ منظم کام کو اس قدر اہم سمجھتے ہیں تو پھر ان کے اپنے روزانہ کے معمولات میں تنظیم کیوں نہیں ہوتی اور جب کہ وہ "یک در گیر و محکم گیر" کی نصیحت کرتے ہیں تو خود اپنے آپ کو بہت سے کاموں میں کیوں الجھا لیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب انھیں خود بہت سے کام رہتے ہیں تو اپنے آپ کو مروت کا اس قدر پابند کیوں کر لیا ہے کہ ہر کس و ناکس ان کی طرف سے اس بات کو صلائے عام سمجھتا ہے کہ ان کے پاس بے تکلف چلا آئے اور ان کا وقت ضائع کرے۔
اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا نقطہ نظر غلط تھا۔ مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ جن طریقوں کے اوپر تعلیم اور تعلیم یافتہ اشخاص سے متعلق ذاکر صاحب کے نصب العین کی بنیاد تھی، وہ انسان کو اس منزل یا "معراج" پر پہنچا دیتے ہیں جہاں وہ اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا اور جو کام حالات اس کے اوپر عائد کر دیتے ہیں ان کی انجام دہی کو وہ چپ چاپ اپنے اوپر آپ عائد کیے ہوئے فرائض کی شکل میں منتقل کر لیتا ہے، اور جب ہم کسی ایسے شخص کے بارے میں رائے قائم کر رہے ہوں جو کوئی مبلغ نہیں، صرف معلم ہو، تو یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیے، کیونکہ معلم اپنے آپ کو کلیتہً صرف انہی باتوں کی تعلیم تک محدود نہیں رکھ سکتا جن پر وہ خود عامل ہو، اسے اپنے طالب علموں کی ناکامی اور شکست کے غم میں اور ہر ناکامی کے بعد تازہ دم ہو کر از سر نو سعی کرنے کے عزم و ارادے میں شریک رہنا پڑتا ہے۔
لیکن میں اس قدر گم گشتہ راہ نہیں تھا کہ ذاکر صاحب کے طرز زندگی پر صرف غلط زاویے ہی سے نظر کرتا۔ میں دیکھتا تھا کہ جہاں تنظیم اور منصوبہ بندی ضروری اور ممکن ہوتی تھی، وہاں وہ منصوبہ بندی ضرور کرتے تھے اور حتی الوسع کوئی چیز اتفاق پر نہیں چھوڑتے۔ جب کبھی کسی تقریب کا موقع ہوتا تو وہ ذرا ذرا سی بات کو ذہن میں رکھتے تھے۔ جب انھیں کسی ایسے شخص سے ملنا ہوتا جس کی ملاقات نتیجہ خیز ہو سکتی تھی، تو وہ پوری پوری گفتگو کا نقشہ پہلے سے سوچ لیتے تھے لہجے میں لکنت یا الفاظ کے چھوٹ جانے کے اندیشہ سے وہ اس قدر گھبراتے تھے کہ لکھی ہوئی تقریر کو پڑھنے کی باضابطہ مشق کرتے تھے۔ اس میں تو شک نہیں کہ قلم دوات لے کر لکھنے کے عمل سے انھیں ہول اٹھتا تھا، مگر جب انھیں ریڈیو پر نشر ہونے والی کوئی تقریر لکھنی ہوتی یا کوئی عالمانہ لکچر تیار کرنا ہوتا تو جو کچھ انھیں لکھنا ہوتا اس کا شروع سے لے کر آخر تک پورا نقشہ سوچ لیتے تھے اور جب ہر چیز صفائی اور ترتیب کے ساتھ ان کے ذہن میں مرتب ہو جاتی تو اسے قلمبند کرنے کے لیے بے چین ہو جاتے تھے۔ مجھ جیسے لوگوں کو جو لکھنا وقت پر شروع کرتے اور وقت پر ختم کر دیتے ہیں اور لکھتے وقت سوچتے ہیں وہ حیوان کاتب کہا کرتے تھے یعنی جانور جو لکھتا جاتا ہے۔ ان کی اس ادا کو لکھنے کا کام جب تک ٹال سکتے تھے ٹال دیا کرتے تھے اس بات پر محمول نہیں کرنا چاہیے کہ انھیں صحیح طریقہ کار سے گریز

تھا، بلکہ اس کے اوپر صرف تقاضائے بشریت کے طور پر نظر کرنی چاہیے۔[1] ان کے دفتر یا مکان میں استاد علی محمد خاں کے لکھے ہوئے آرائشی خوش نویسی کے چند نہایت عمدہ شہ پاروں کو چھوڑ کر، سالہا سال تک کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے معلوم ہوتا کہ انھیں ہندوستانی تہذیب کے نوادر کا بھی کچھ ذوق تھا۔ یہ استاد علی محمد خاں فن خطاطی کے یکتائے روزگار ماہر اور جامعہ کے مدرسہ ابتدائی کے استاد تھے۔ چند قدیم شہ پاروں کے فوٹو حاصل بھی کیے گئے مگر اتنے پیسے نہیں تھے کہ انھیں چوکھٹے میں جڑوا کر آویزاں کیا جاتا۔ ذاکر صاحب نوادر کا اپنا کوئی نجی ذخیرہ جمع کرنے کا خیال بھی اس وقت تک نہیں لا سکتے تھے جب تک اس کے اوپر آنے والے خرچ کے ان کے گھر کی منصوبہ بند معیشت میں کھپ جانے کا امکان نہ پیدا ہوتا۔ وہ جو کچھ پس انداز کرتے اسے اپنی بڑی بیٹی سعیدہ کے لیے شادی کا جوڑا بنانے پر خرچ کرتے یہ سوچ کر کہ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچے گی تو جہیز میں دینے کے کام آئے گا۔ انھوں نے اپنے لیے نوادر کا جو پہلا ذخیرہ جمع کیا تھا وہ بانس کی چھڑیوں کا تھا۔ انھوں نے مجھے جب ان کے اولین نمونے دکھائے تو میں نے ان سے پوچھا کہ ان چھڑیوں میں انھیں کون سی ندرت نظر آئی۔ انھوں نے

---

[1] ایک مرتبہ جب جامعہ ابھی قرول باغ ہی میں تھی، میں نے سہ پہر میں شہر جا کر کچھ خریداری کرنے کی غرض سے دفتر کی کار کرائے پر لی۔ میں اور میری بیوی روانہ ہونے والے ہی تھے کہ ذاکر صاحب آ گئے اور کہنے لگے "کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟ ہم بہر حال بیحد خوش تھے کہ ذاکر صاحب بھی ساتھ چل رہے ہیں۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد جب ہم واپس لوٹے تو وہ میری طرف مخاطب ہوئے اور کہنے لگے "آپ کو معلوم ہے میں آپ کے ساتھ کیوں گیا تھا؟" "آپ کو بھی کچھ خریداری کرنی ہو گی" وہ بولے "جی نہیں، مجھے خرید و فروخت سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ مجھے فوری طور پر کچھ لکھنے کا کام کرنا تھا۔" ان کے لہجے میں کسی قدر تیزی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں اور اس بات کی تکلیف ہے کہ بھاگنے کی خواہش انھیں زک پہنچا گئی انھیں جو تقریر لکھنی تھی وہ انھوں نے بہت رات گئے تک محنت کر کے بہر حال پوری کی۔

ان کی بیٹی سعیدہ نے مجھے بتایا کہ وہ انھیں کبھی کبھی باتوں یا کسی بحث میں لگا لیتے تھے اور کچھ دیر کے بعد پوچھتے تھے کہ "تمھیں پتہ ہے میں نے تمہارا وقت کیوں ضائع کیا؟ صرف اس لیے کہ مجھے فوری طور پر کچھ لکھنے کا کام کرنا ہے۔"

گھر پر لکھنے کا زیادہ تر کام وہ بستر پر بیٹھ کر اور تکیے سے میز کا کام لے کر کرتے تھے۔ میں انھیں اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے کئی سال تک کوشش کرتا رہا کہ دفتر میں کرسی پر بیٹھیں اور ایک اچھی سی میز لگائیں، مگر اس پر وہ راضی نہیں ہوئے۔ آخر کار ایک مرتبہ فرشی نشست اور فرشی میز کے بجائے ایک کرسی اور ایک میز لگا دی مگر یہ تبدیلی انھیں پسند آئی نہیں۔

مجھے سمجھایا کہ چیڑی کی عمدگی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کتنی گاؤدم ہے۔ اس کی گانٹھیں کتنی متناسب ہیں، اس کا وزن کتنا ہے، اور ایک عرصہ تک اس کے اوپر سرسوں کا تیل ملنے سے اس کا رنگ کتنا پختہ اور گہرا ہوا ہے۔ ان کا دوسرا ذخیرہ خوشنویسی کے نمونوں پر مشتمل تھا۔ کچھ ایسی چیزیں بھی تھیں جو ادھر ادھر سے بس اتنی قیمت میں خرید لی گئی تھیں جو ان کے حدودِ امکان سے باہر نہ ہوں۔ مجھے پیتل کا بنا ہوا ایک پیالہ یاد ہے جو انھیں بیحد پسند تھا۔ وہ بہت حسین پیالہ تھا اور جب میں اس کی افادی حیثیت پر اس بنا پر تنقید کرتا کہ اس کے کنارے اندر کو مڑے ہوئے ہیں تو وہ بہت بدمزہ ہوتے۔ جب تک وہ جامعہ میں رہے اس وقت تک ان کی برائے نام آمدنی نے انھیں اپنے ذوقِ جمال کی تسکین کا سامان کرنے سے باز رکھا۔ لیکن اس وقت بھی جب ان کے پاس خرچ کرنے کے لیے پیسے کی کمی نہیں تھی، وہ سستی اور معمولی اشیا ہی کے اندر حسن و جمال کی تلاش میں رہتے تھے۔

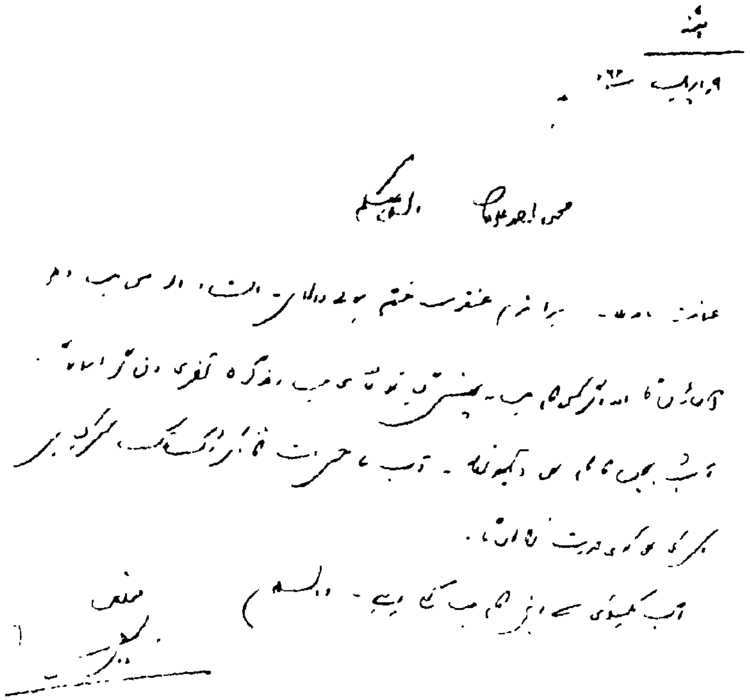
معلم کی حیثیت سے ذاکر صاحب کی زندگی کا المیہ یہ تھا کہ ان کے اندر جو جوہر تھا یعنی، صحت و باقاعدگی اور کمال سے انھیں جو عشق تھا اس کی ان کے سماجی ماحول نے داد نہیں دی۔ ان کے جامعہ ملیہ کے ساتھی کچھ عرصے کے بعد سمجھنے لگے تھے کہ ان کو مطمئن کرنا ممکن نہیں ہے، وہ حد سے زیادہ بے قرار طبیعت کے آدمی ہیں اور بے انتہا کام چاہتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ذاکر صاحب کے بغیر ان کا کام نہیں چل سکتا چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کر لیا تھا کہ ان سے بحث یا تو کی ہی نہیں جائے یا کی بھی جائے تو یوں ہی تھوڑی سی بات چیت کے بعد ان کی بات مان لی جائے تاکہ ان کا سامنا کرنے کی کم سے کم نوبت آئے۔ ان کے منشا کے مطابق خواستہ ناخواستہ کام کرتے رہیں، اور اگر کام میں نقائص رہ جائیں تو اس کے عذر کے طور پر ایک نہ اک مشکل پیش کر دی جائے عذر کے طور پر پیش کی ہوئی یہ مشکل ہوتی بھی بالعموم ناقابل انکار تھی۔ مدرسہ ابتدائی میں تعلیم کا منصوبی اور ثانوی میں تفویضی طریقہ شروع کیا گیا تھا مگر یہ دونوں طریقے چند سال کے بعد بے جان ہو کر رہ گئے۔ استادوں کے مدرسے میں حرفے کے ذریعہ تعلیم دینے کی ٹریننگ کا منصوبہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ شروع ہوا تھا، مگر اس مقصد کے لیے اس کے پاس ایسے استاد نہیں تھے جو اسے دکھاوے سے زیادہ کوئی ٹھوس شکل دے سکتے۔ اوکھلا میں مدرسہ ابتدائی کے باغیچہ کا منصوبہ بنا اور جن لوگوں نے اسے بنایا تھا وہ سمجھتے تھے کہ وہ باغبانی کا فن ذاکر صاحب سے زیادہ جانتے ہیں۔ ۴۴-۱۹۴۳ء میں اسی طرح کے کچھ اور منصوبے اس وقت شروع کیے گئے تھے جب جامعہ کی آمدنی اس قدر محدود بھی نہیں تھی۔ وہ بھی نااہلیت یا دلچسپی کے فقدان کی وجہ سے ناکام رہے۔ ایک واحد شخص فقیرا مالی تھا جس کے کام اور کام کی لگن سے ذاکر صاحب خوش اور متاثر تھے اور ایک مرتبہ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ان کا بس چلتا تو فقیرا مالی کو اپنا جانشین مقرر کر دیتے۔ جامعہ برادری کے لوگوں

نے ان کی اس بات کو کسی رائے پر محمول نہیں کیا بلکہ اسے مجذوب کی بڑ سمجھا جس کے ذاکر صاحب بہت عادی تھے۔

جامعہ کے کام کے باب میں ذاکر صاحب کا اندازہ جامعہ کو باہر سے دیکھنے والوں کی رائے سے بالعموم مختلف تھا۔ جامعہ برادری کو دور سے دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ یہ معلموں اور کارکنوں کی ایک جاندار، مستعد اور دھن کی پکی ایک جماعت ہے جو تعلیم اور تہذیب کے روایتی نصب العین کا علم اٹھائے ہوئے ہے۔ خود ان کا اندازہ وقت اور موقع کی مناسبت سے کبھی کچھ کبھی کچھ رہتا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جامعہ برادری کو جب کبھی کوئی غیر معمولی کام درپیش ہوتا تو پیچھے نہیں رہتی تھی۔ لیکن جیسا کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے، تعلیم کا کام جوش وجذبہ اور استقلال، دونوں کا متقاضی ہے۔ جامعہ برادری کے اندر جوش اور جذبے کی کمی تو نہیں تھی، کمی تھی تو استقلال کی۔

ذاکر صاحب جب جامعہ ملیہ کے محدود حلقے سے باہر نکلے تو وہاں بھی انھیں کچھ زیادہ داد نہیں ملی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جس حساب سے راحت اور آسایش کے مواقع بڑھتے گئے، اسی حساب سے ان کے غم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

BIHAR GOVERNOR'S CAMP



Bihar Governor's Camp
Patna

9th April, 1962

Dear Ahmed Ali Sahib,

As Salam Alekum Received your kind letter My term is about to end Inshallah I will come to Delhi in May, and if I don't get stuck in some work I will spend the last days of my life in Jamia I will also see the work of your children The matter you have raised with such hesitation, I will try to find a way out for it

You should continue to do your work as usual

With salaams

Sincerely,
Zakir Husain

*Ahmed Ali was a teacher in the Jamia Primary School

رشید احمد صدیقی

ہمارے ذاکر صاحب

ذاکر صاحب میں ایک خاصہ یا خوبی اپنے قبائلی اجداد کی ملتی ہے، یعنی صوفیہ، فقرا، اور اہل اللہ سے ارادت اس فرض کے ساتھ کہ وہ ان نفوش قدسیہ کے کشف و کرامات پر اتنی نظر نہیں رکھتے، جتنی ان کے پاکیزہ کردار پر اس سے ان کی اخلاقی و ذہنی در و بست میں توانائی اور نظر میں رفعت و رانت آئی ہے۔ معلم و مرشد کا قران ذاکر صاحب میں آج سے نہیں، بہت دنوں سے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس قران کو ہر سطح اور ہر موقع پر ملحوظ رکھنا کبھی کبھی فتنے اور فتور کا بھی باعث ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو کر اوج طور سے اپنے ساتھیوں میں واپس تشریف لائے، تو سامری کی فتنہ پردازی اور گئو سالہ کی گرم گفتاری پر بے قرار ہو گئے اور حضرت ہارون پر، جن کے سپرد کیمپ کا ڈسپلن کر گئے تھے، پیش دستی کر بیٹھے۔ رسالت پر سرفراز ہونے سے پہلے بھی ایک قبطی کو بنی اسرائیل پر ظلم کرتے دیکھ کر حضرت نے ایک گھونسے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ پیغمبروں میں یہ روایت صرف حضرت موسیٰ کے حصّے میں آئی۔ اس پر کسی ستم ظریف نے یہ کہا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار میں سے صرف ایک پیغمبر پٹھان تھے، یعنی حضرت موسیٰ۔ ذاکر صاحب کے سامنے قائم گنج کے ہم وطنوں کی اس طرح کی کتنی روایات تھیں، لیکن انھوں نے اپنے وطن، اپنے سرحدی قبائلی اجداد، اور حضرت موسیٰ کی روایات نیز اقبال کے مشہور مقولہ "عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بےبنیاد" کو نظر انداز کر کے حضرت مسیح کے مصلوب ہو جانے کی روایت کو کس طرح ترجیح دی، تعجب سے خالی نہیں۔

بنیادی تعلیمی اسکیم کی رپورٹ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں میرے ہی مکان پر ایک کمرے میں بیٹھ کر شاید ایک ہفتہ کے اندر مرتب کر ڈالی۔ کمرہ بھی جو بیک وقت سونے بیٹھنے، کھانے پینے، لکھنے پڑھنے اور دُند مچانے کا کام دیتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، کچھ دیر تک تعلیمی مسائل پر بحث رہی اسی سلسلہ میں کچھ دوست ملنے آ گئے تو ان سے خوش گپی ہونے لگی، کتابوں، رپورٹوں، فائل وغیرہ کا انبار ہے کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ کالج کے لوگ آ گئے تو ان سے تعلیمی مسائل پر بحث چھڑ گئی۔ کوئی خوانچہ والا آ گیا تو جو کچھ اس کے پاس رہا اسی سے شغل شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آ گئے

تو امراض و علاج کے لطائف چھڑ گئے، شعر و شاعری کا شائق آ گیا تو شعر خوانی کی مجلس گرم ہو گئی۔ کوئی اچھا طالب علم آ نکلا تو اس کے مضمون پر باتیں ہونے لگیں، غرض جو آیا اسی کے مذاق کے مطابق گپ ہونے لگی۔ اس تمام بحث و مباحثے میں ذاکر صاحب اسی خلوص و خوبی سے حصہ لیتے جیسے تمام عمر اسی شغل میں زندگی بسر ہوئی ہے۔ جو آتا بہت کچھ سیکھ جاتا اور ایسا خوش ہو جاتا جیسے اس نے اس دن کوئی بڑا کام کیا تھا۔ ذرا مہلت ملتی تو پھر رپورٹ کی ترتیب شروع ہو جاتی۔ وہ ہر شخص کے سامنے اپنے خیالات اور نتائج پیش کرتے۔ اس کا مشورہ طلب کرتے، اپنی سمجھاتے اس کی سنتے اور پھر آخری رائے قائم کرتے۔

ایک دن میں نے تنگ آ کر کہا، "مرشد یہ کہاں کا کھڑاگ پھیلا یا جب دیکھیے بچوں کی عمر، بچوں کے مشاغل، گلی ڈنڈے اور سوت کپاس کی بحث چھڑی ہے۔ تمام دن خدائی خوار دن یا حق بخشوائے ہوئے لوگوں کا مجمع رہتا ہے" فرمایا، "سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ آج اتفاق سے پنسل بنانے کے لیے کسی کے پاس چاقو نہ ملا ورنہ بقیہ مراحل بھی طے ہو جاتے۔ اب کل کوئی سبیل ایسی نکالیے کہ مجھے چند گھنٹے یکسوئی کے مل جائیں سارا خاکہ ذہن میں ہے رپورٹ مکمل ہو جائے گی۔

دوسرے دن میں نے اپنے پرانے مکان کے بالاخانے پر ذاکر صاحب کو مقفل کر دیا۔ مقفل اس لیے نہیں کیا کہ کوئی ملاقاتی بار نہ پائے بلکہ اس کا خطرہ تھا کہ خود مرشد نہ نکل جائیں۔ ہوا وہی جس کا خطرہ تھا۔ صبح بالاخانے پر مقفل ہوئے دو گھنٹے گزرے ہوں گے ایک صاحب ملنے آئے۔

نوکر نے کہا۔

"ذاکر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

انھوں نے نقد و جرح شروع کی۔

مرشد کے کان تک آواز پہنچی۔ روشندان کچھ اونچا نہ تھا۔ اسٹول رکھ کر غرفہ سے بولے۔ "ارے میں یہاں مقفل ہوں۔ کنجی رشید صاحب کے پاس ہے۔ لیکن کوئی مضائقہ نہیں، آپ اس بات کا پتا لگا لائے۔"

انھوں نے کہا "ہاں، رپورٹ نقل کر لایا ہوں۔"

فرمایا، "سنائیے۔"

انھوں نے سنانا شروع کیا۔ میں یونی ورسٹی سے آیا تو رومیو جولیٹ کا یہ ڈراما نظر آیا۔

میں نے کہا، "مرشد یہ کیا ہے؟"

فرمایا، "ذرا ٹھہریے گا بس ایک منٹ۔"

افسانہ ختم ہو گیا۔

میں نے بالا خانہ پر پہنچ کر قفل کھولا تو مرشد سارا کام کیے ہوئے چاروں شانے چت کچھ گنگنا رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو لیٹے ہی لیٹے ایک زقند بھری اور سرو قد کھڑے ہو گئے فرمایا "ذرا پانی پلوا دیجیے۔ کام ختم ہو گیا۔"

میں نے کہا، "یہ آپ کیا گُن رہے تھے؟"

کہنے لگے، "فلاں رپورٹ کا حوالہ دینا تھا، ایک جگہ شبہ ہوتا تھا، اس لیے ان صاحب سے کہا تھا کہ اصل رپورٹ دیکھ آئیں۔ اُنھوں نے جو سُنایا تو اطمینان ہو گیا کہ جو دیا تھا وہ ٹھیک تھا۔"

میں نے کہا، "اب تو جب تک آپ کا قیام ہے کوئی زق زق نہ ہوگی؟"

فرمایا، "ہرگز نہیں۔" میں نے کہا، "اللہ کا شکر ہے، آج ڈاکٹر اصغر کے ہاں چائے پی جائے تو کیسی رہے گی؟" کہا، "ضرور، ان سے بلّی کا بچہ بھی لینا ہے۔"

میں نے کہا "بلّی نے تو بچہ نہیں دیا ہے، کتے نے البتہ دیا ہے۔" کہنے لگے "اسی کا سہی! سعیدہ (ذاکر صاحب کی بچی) کے لیے کچھ نہ کچھ لے جانا ضروری ہے گھر پہنچنے پر دو ہی تو سوال کیے جاتے ہیں۔ بیوی کہتی ہیں کیا کھویا اور سعیدہ پوچھتی ہے کیا لائے۔

۱۹۲۰ء میں ہم سب "صاحب باغ" میں ام۔ اے پریوس اور قانون کے طالب علم تھے قانون کے امتحان میں مشکل سے ۱۵ دن باقی تھے اور کورس سارے کا سارا کورا تھا۔ کئی دن سے ہم لوگوں کی توجہ اس مصیبت پر مرکوز تھی۔ ذاکر صاحب کہتے تھے پڑھنا تو ہے ہی۔ چاہے امتحان سے پہلے پڑھا جائے چاہے بعد میں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ناشتہ اور کھانے کا مکمل پروگرام بنا لیا جائے۔

نصیر مرحوم نے پوچھا۔ "پروگرام سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

ذاکر صاحب نے کہا۔

"آپ نے دو باتیں ایک ہی سانس میں کیوں پوچھ لیں۔ آپ پروگرام کے بارے میں میری ہدایت چاہتے ہیں یا صرف مطلب دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے دونوں ایک نہ ہوں!"

نصیر صاحب نے ذرا چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "ذاکر تم پڑھائی میں کھنڈت ڈالتے آئے ہو اور اب بھی اسی کے درپے ہو، اچھا بتاؤ، پروگرام اور مطلب میں کیا فرق ہے؟"

ذاکر صاحب نے کہا۔

"پروگرام تو عوام کے لیے بنایا جاتا ہے اور مطلب اپنا ہوتا ہے! پروگرام تو یہ بتائے گا کہ کون کون سی چیزیں کس کس وقت کھانے پر موجود ہوں گی اور مطلب یہ ہے کہ کس کو کیا

اور کتنا ملے گا پر پھر بھی تو دیکھیے کھانا تو ہر حال میں ڈائننگ ہال ہی میں ہوگا۔ لیکن پروگرام کے ساتھ سے ذرا کھانے والوں کی آبرو بڑھ جاتی ہے!"

بڑی ردّو قدح کے بعد پروگرام بھی بنا اور مطلب کی بھی رعایت رکھ دی گئی۔ پڑھائی شروع ہوئی۔ ہم تین چار آدمی ساتھ پڑھنے تھے۔ ذاکر صاحب، میں، سید نصیرالدین علوی مرحوم اور خلیل الدین مرحوم۔ بحث اس پر چھڑی کہ باآواز بلند کون پڑھے۔ اس پر کوئی نہیں تیار ہوتا تھا۔ نصیر مرحوم ہکلاتے تھے ان کو پڑھنے سے معاف کر دیا گیا تھا اور بحث کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ خلیل مرحوم پڑھنے سے شرماتے تھے۔ ان کا کالج کا نام بھی گلفام ہے۔

میں نے کہا "میں پڑھنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن ذاکر صاحب نے قائم گنج سے جو گھی منگوایا ہے وہ دوپہر اور شام کو دال میں ڈالنے کے لیے دو چمچے زائد لوں گا۔"

نصیر صاحب طیش میں آکر بولے "...... ہر..... ہر...... ہر..... ہرگز..... نہیں.. میں ..... پ پ پ ..... پڑھوں گا۔"

میں نے کہا "تو پھر تین چمچے لوں گا۔"

ذاکر صاحب بولے "وہ کیوں؟"

میں نے کہا "نصیر صاحب پڑھیں گے تو مجھے ایک چمچہ سر میں بھی ڈالنا پڑے گا۔"

ذاکر صاحب نے کہا "میں پڑھنے کو تیار ہوں لیکن صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ سب سے تین منٹ پہلے کھانا شروع کر دوں گا۔ اس کے بعد آپ لوگ شروع کریں۔" اس پر ہر شخص بیک وقت چیخ پڑا۔

"ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ ہم پڑھنے کے لیے آئے ہیں بھوکوں مرنا نہیں چاہتے۔"

غرض پڑھائی شروع ہوئی۔ علوی مرحوم اور ذاکر صاحب میں کبھی کبھی قانونی نکتوں پر بڑے لطف کی اور بڑے زور وشور کی بحث ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ بحث طوالت پکڑ گئی تو علوی مرحوم نے جھنجھلا کر کہا "اس قانون کو بناتے وقت واضع نے غالباً آپ سے مشورہ کر لیا تھا۔"

ذاکر صاحب نے فرمایا "اس نے تو مشورہ نہیں کیا لیکن آپ کو میرا مشورہ یہی ہے!" اس جملے پر مرحوم کا فرطِ مسرت سے ناچنا کودنا اور قہقہے لگانا اب بھی یاد آتا ہے۔

دوسرے دن ہی طالب علموں کا ایک ہجوم صاحب باغ پہنچا معلوم ہوا کسی مسئلہ پر طلبہ نے اجتماعی طور پر احتجاج کیا ہے۔ اور ذاکر صاحب سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ وہ ان کی سربراہی کریں۔ ذاکر صاحب فی الفور ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ تین چار دن تک ان کا کوئی پتا نہ چلا۔ ایک دن یونین کے دارالمطالعہ میں مل گئے۔

میں نے پوچھا "کیسی رہی؟"

بولے "دو بخیر بت گزشت۔"

میں نے کہا۔ "اور جناب پڑھائی؟"
فرمایا "اس ہنگامے میں جو دل و جان سے منہمک رہا۔ اس کا کچھ تو اجر ملنا چاہیے تھا۔ اللہ نے آپ سے نجات دلائی۔"
"اور کھانا پینا" میں نے پوچھا۔
بولے "قوم کا کام کرنے والا کبھی بھوکا نہیں مرتا"
میں نے کہا "ذرا احتیاط رکھیے گا۔ قومی کام کرنے والے بھوک سے تو نہیں مرے لیکن ہیضہ میں اکثر مرے پائے گئے ہیں۔"
میں بدحظ ہو کر چلنے لگا تو لپک کر سامنے آ گئے۔ کہنے لگے۔ لِلّٰہ میرا کہا مان لیجیے۔"
میں نے کہا "وہ کیا؟"
فرمایا "چلیے دلی چلیں۔"
میں اکتا گیا۔ اور بولا۔ "ذاکر صاحب ہوش میں آئیے۔ امتحان کے کے دن رہ گئے ہیں"
اس بات کو اس طور سے ٹال گئے جیسے اس کی ذرہ برابر بھی اہمیت نہ تھی کہنے لگے۔ "پڑھ کے کیا کیجیے گا۔ کھانے کمانے بھر کا پڑھ لیا ہے۔ احمقوں کو مرعوب کرنے کے لیے بی۔ اے کافی ہے۔ بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے لیے ہنسنے بولنے کی عادت ڈالنی ہے، اس کے لیے دلی کا سفر ضروری ہے۔
میں نے کہا، اور سفر خرچ کہاں سے آئے گا؟
بولے۔ "اس کی پروا نہ کیجیے۔ خالو صاحب کو لکھ دیا تھا کہ کالج میں دق کی شکایت پھیل گئی ہے۔ کچھ روپے اور دیسی گھی بھیج دیجیے۔ گھی تو پہلے آ گیا۔ روپیا آج آیا ہے۔ بس دلی چلے چلیے، شاہجہاں پوری والے کے ہاں ڈٹ کر کھانا کھایا جائے گا۔ ہندوستانی دواخانہ سے دوائیں خریدی جا سکتی ہیں۔ رات کو واپس آ جائیں گے۔"
میں نہ مانا، ذاکر صاحب بھی دلی نہ گئے صرف کالج میں جہاں تہاں کھاتے یا گپ کرتے پائے گئے۔ امتحان سے تین چار دن پہلے صاحب باغ کی افق پر پھر سے نمودار ہوئے۔ ہم نے ان کی پذیرائی اس طور پر کی جیسے وہ سب کچھ کھو آئے تھے اور ہماری ہمدردی کے مستحق تھے۔ اور وہ اس طور سے ملے جیسے انھوں نے ہمارے گناہوں کو معاف کر دیا ہو۔
امتحان ہوا۔ نتیجہ نکلا۔ ہم سب فیل۔ صرف ذاکر صاحب پاس!

ذاکر صاحب وہ سب کر سکتے تھے اور پا سکتے تھے جو آج کل کے ہمارے بڑے آدمیوں کو نصیب ہے۔ ان کو بڑی سے بڑی نوکری مل سکتی تھی، وہ عوام کو بہکا کر یا بھڑکا کر شریفوں پر دنیا تنگ کر سکتے تھے۔ اور رشوت لے یا دے کر دولت و اقتدار حاصل کر سکتے تھے۔ خدا اور

رسول کے نام پر خانقاہیں یا یتیم خانے قائم کرکے غریبوں کی کمائی اور ناموس لوٹ سکتے تھے۔ وہ ہر طرح کے فسق و فجور میں مبتلا رہ کر بھی اپنی قوم کے آخری نجات دہندہ قرار دیے جاتے۔

ذاکر صاحب کی ذہنی استعداد جس پایہ کی ہے۔ اس سے ان کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ وہ اس استعداد کو اپنے نفس کی خاطر بے لگام کرکے وہ تمام باتیں حاصل کر سکتے تھے جن کو ہم رشک و حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن وفات پا جاتے ہیں! نفس کے اس بے پناہ عفریت کو جس کے ادنا اشارے پر ہم اپنی ہی نہیں دوسروں کی بھی قیمتی سے قیمتی متاع تلف کر دینے پر آمادہ رہتے ہیں اور اسے نفیسے کی یاوری یا قوم کی بیداری سمجھتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے کس طرح زیر کیا اور کیوں کیا اسے کون سمجھے گا اور کیوں سمجھے گا، جب اس کے سمجھنے سے نجس مقاصد اور ملعون نیتیں بے نقاب ہوتی ہیں!

ذاکر صاحب نے سب سے الگ ہو کر لیکن سب کے لیے جامعہ کی بنیاد ڈالی۔ محنت سہی بے کسی دیکھی، گالیاں سنیں، رسوائی اٹھائی، انتظار جھیلا، لیکن منہ نہ موڑا۔ مسکرانے سے باز نہ آئے۔ دشمن سے نہ ڈرے نہ اسے دھتکارا، اس نے مانگا تو دیدیا، اس نے چرا لیا تو جانے دیا۔ خود سہتے رہے جامعہ کو سپر نہ بنایا، اس کو صرف سنوارا، وہ انتظار کرنے سے گھبرائے نہیں۔ اس لیے کہ اچھے اور بڑے کام کرنے میں انتظار کی منزل سرے سے مفقود ہوتی ہے، انجام کا ڈر نہیں ہوتا۔ کام و انجام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ انجام یا انعام کا جویا وہ ہوتا ہے جس کو اپنے کام پر نہ ایمان ہو نہ اطمینان سب سے بڑا اور سب سے اچھا انعام وہ ہے جو ہم خود اپنے آپ کو دے سکیں نہ وہ جو دوسرے سے ملے۔

ذاکر صاحب جامعہ کو پچیس سال سے چلا رہے ہیں۔ اس دوران میں جامعہ اور جامعہ میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں دونوں پر مسلسل اور بے پناہ غیر شریفانہ حملے ہوئے۔ لیکن یہاں نہ کوئی اسٹرائک ہوئی نہ کوئی بد دل ہوا نہ جامعہ کو چھوڑ کر شہرت یا روزی کمانے کہیں اور گیا۔ یہاں ایسے لوگ بھی نہ تھے جن پر رزق اور موت کے دروازے بند رہے ہوں اور جامعہ کے علاوہ کہیں اور ٹھکانا نہ ہو بلکہ ان میں سے اکثر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں ان کی پذیرائی احترام کے ساتھ ہو سکتی تھی یہ صرف ذاکر صاحب کی بلند و برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے تار و پود کو نہ صرف بکھرنے سے بچایا بلکہ اس کو مربوط و مستحکم کر دیا۔

جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ سارا تصفیہ اسی ترازو میں تل کر ختم ہو جاتا۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا۔ ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی فضائل کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں

میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و نجابت یا سوشل یا سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سردار خاندانی اعتبار سے بھی زرِ خالص ہے اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وقیع زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں۔ محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برآ ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنت شاقہ کرنے والا اور اپنے فرائض پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقہ میں ان جیسا کوئی اور نہ تھا کسی کو اپنے ذوق، ذہانت و فطانت کا دھیان ستاتا تو وہ دیکھتا کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہی ہیں کلرک یہ دیکھتا ہے کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں، جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں اور بوڑھا یہ دیکھتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا ہے تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے۔

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے فائدے کے لیے جان کھپاتے ہیں۔ اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی عزت و فراغت کو اپنی عزت و فراغت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذاکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش گوارا کرتا۔

طالب علم ذاکر صاحب سے مل کر آتا ہے تو ان کے اور جامعہ کے بارے میں ایسے خیالات تاثرات کا اظہار کرتا ہے جیسے زندگی میں اُسے کوئی اچھی اور غیر متوقع چیز مل گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے ان طلبہ سے مذہب اور سیاست پر کبھی گفتگو نہ کی۔ وہ کہتے تھے کہ ان مباحث پر مولوی اور لیڈر بحث کرنے کے لیے کیا کم ہیں۔ میں تو صرف دیکھتا ہوں کہ طالب علم کے قویٰ ذہنی کس نوعیت کے ہیں۔ اس کے ذہن و اخلاق میں کسی نوعیت کا ربط ہے۔ اس نے کیا پڑھا ہے، کن چیزوں سے متاثر ہے، اس میں کیا صلاحیتیں پوشیدہ ہیں وہ اپنی صلاحیتوں کے بس میں ہے یا اُن صلاحیتوں کو اپنے بس میں رکھ سکتا ہے۔ اس پر میں اپنا ٹھپّا نہیں لگاتا بلکہ اس کو اپنا ٹھپّا متعین کرنے میں اس کی مدد کرتا ہوں۔ اور میں جانتا ہوں مرشد کا "کھل سمسم" یہی ہے!

الہ آباد کا سفر تھا، ہندوستانی اکیڈمی یو پی سے ذاکر صاحب نے معاہدہ کر لیا تھا کہ معاشیات پر وہ ایک مقالہ پڑھیں گے۔ ذاکر صاحب دلی سے روانہ ہوئے۔ میں علی گڑھ سے ساتھ ہو لیا۔ انٹر کلاس میں ذاکر صاحب ملے میں بھی جا بیٹھا۔ بڑی بھیڑ تھی۔

بولے۔ "رشید صاحب معاملہ دگرگوں معلوم ہوتا ہے۔ مقالہ لکھا نہیں ہے خیال تھا رات بھر کا سفر ہے۔ ریل میں بیٹھ کر لکھ ڈالوں گا اب تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح تک زندہ

ہی نہ رہیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟"

میں نے کہا۔"مرشد! فکر کی بات نہیں ہے چلیے سیکنڈ کلاس میں چلیں۔"

بولے۔"اور کرایہ؟"

میں نے کہا۔"روپے تو میرے پاس بھی نہیں ہیں۔ لیکن یہ علی گڑھ ہے۔ آپ اُترے تو روپے کا کوئی انتظام کر لیا جائے گا۔

ہم دونوں اسباب اتروا کر سیکنڈ کلاس کی طرف چل نکلے پلیٹ فارم پر پہلے شناسا کو میں نے دونوں ٹکٹ دیے اور یہ کہہ کر کہ اسے بدل کر سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ لائیے اور روپے میرے گھر جا کر لے لیجیے گا۔ ہم دونوں سیکنڈ کلاس میں جا بیٹھے۔ ٹکٹ مل گئے تو مرشد نے کہا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے کچھ زائد روپے بھی تو درکار ہوں گے۔ سفر میں ٹکٹ کلکٹر ہی نہیں ہوتے خوانچے والے بھی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔"کھانا میرے ساتھ ہے۔"

اُکتا کر بولے۔" وہ تو میں جانتا ہوں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ خوانچہ والے کی بھی تو دلداری کرنی پڑے گی۔"

میں نے کہا۔"اس کی ذمہ داری بھی میں لیتا ہوں لیکن ایک شرط ہے۔"

بولے۔" وہ کیا؟"

میں نے کہا" دہی بڑے نہیں خریدے جائیں گے۔ کابلی چنے والا پاس نہ آئے گا کتاب اور اخبار والے کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیے گا اور سب سے بڑی اور پہلی شرط تو یہ ہے کہ آپ کمپارٹمنٹ میں نہ چھوٹے بچوں سے یارانہ کریں گے اور نہ کسی احمق سے اس طور پر گفتگو کریں گے کہ عمر بھر وہ اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا رہے۔"

بولے۔" سب منظور۔"

تھوڑی دیر بعد بولے۔" رشید صاحب کھانا تو کھا ہی لیا جائے۔ ورنہ دھیان بٹا رہے گا۔ ایسی حالت میں سنجیدگی اور خلوص سے گفتگو نہیں کی جا سکتی۔" کھانا نکالا گیا۔ اتنے میں ہاتھرس کا اسٹیشن آگیا۔ چاقو بیچنے والا گزرا تو بولے۔" ایک چاقو کیوں نہ خرید لیا جائے۔"

میں نے کہا۔" یہ کیوں؟"

بولے۔" ہاتھرس کے چاقو ہاتھرس سے باہر تو اکثر خریدنے کا اتفاق ہوا خود ہاتھرس میں خریدنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔"

میں نے کہا۔" یہ نہیں ہو سکتا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ٹونڈلہ آگیا۔

میں اوپر کی برتھ پر بستر درست کر کے نیچے آیا۔ کیا دیکھا کہ مرشد دال موٹھ اور پیٹھے والے سے سودا چکار رہے ہیں۔

میں نے کہا ،، یہ کیا ؟"

بولے ،، کچھ نہیں۔ معلومات میں اضافہ کر رہا ہوں۔ آپ بھی آجائیے "

یہ سماں دیکھ کر میرا دل بھی پسیجنے لگا۔

مرشد بھانپ گئے۔ بولے ،، سفر طویل ہے۔ معلوم نہیں کیسے کیسے نامعقول لوگوں سے راستہ میں سابقہ پڑے۔ ایسی حالت میں اعتماد و تقویت کا کچھ نہ کچھ سامان کر لینا چاہیے، میں کب کہتا ہوں کہ ہر چیز کھا لینے ہی کے لیے خریدی جاتی ہے۔ لطف ہمرہی کے لیے بھی تو خریدی جاسکتی ہے "

دال موٹھ اور مٹھائی خریدلی گئی۔

پھر بولے ،، آپ تھوڑا سا ان کو جھوٹا بھی کر دیں۔ ورنہ ارواح خبیثہ کا ان پر سایہ ہو جائے گا"

یہ مرحلہ بھی طے ہوا تو میں نے کہا ،، مرشد! مزید خرافات ختم اب مقالہ لکھنا شروع کیجیے۔

بولے ،، بیٹھیے بھی، آرام کی جگہ ملی ہے۔ خوب کھا پی لیا ہے۔ موسم کتنا معتدل اور سماں کتنا متوازن ہے "

میں نے کہا ،، تو پھر "

بولے ،، جی میں آتا ہے کہ کنجشک بنوں! ،،

اس پر ہم دونوں ہنس پڑے، دیر تک اس زمانے کی یاد کرتے رہے۔ جب یہ اشعار خاص خاص موقعوں پر پڑھے جاتے تھے اور لطف اٹھایا جاتا تھا۔ بالآخر میں نے کہا ،، مرشد! اب تفریح ہو چکی بس مقالہ لکھنا شروع کر دیجیے۔ اور میں جا کر سوتا ہوں "

مرشد نے کہا ،، یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ سوئیں اور میں جان کھپاؤں اچھا میں لکھتا جاؤں اور آپ پڑھتے جائیں "

میں نے کہا ،، اس سے کیا فائدہ ؟ "

بولے ،، اس سے میرا لکھنے کا مومینٹم (Momentum) قائم رہے گا۔ موقع موقع سے جہاں تہاں آپ ،، اندو گینیاں ،، وغیرہ بڑھا دیجئے گا۔

اس پروگرام پر تھوڑی دیر تک عمل رہا پھر میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو مرشد غالباً دس صفحے فل اسکیپ کے لکھ چکے تھے۔ میں اسے پڑھ گیا۔

کہنے لگے ،، آج کے لیے کافی ہو گیا۔ کل کے لیے پھر لکھوں گا "

پھر بولے ،، آپ نے دیکھ لیا۔ کیسا پایا ؟ "

میں نے کہا ،، مرشد! کیا کہنے، کمال کیا ہے "

بولے "نہیں سچ بتائیے۔ کیسا رہا۔ کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کیجیے"
میں نے کہا۔ "نہیں مرشد! ایمان سے کہتا ہوں خوب لکھا ہے دوران مطالعہ میں اکثر مقامات ایسے آئے جہاں میں نے بڑی حسرت سے یہ محسوس کیا کہ بس میرے میں ذرا سی عقل اور ہوتی تو میں یہ بھی سمجھ جاتا۔"
الہ آباد میں اس مقالہ کی دھوم مچ گئی۔ بڑے سے بڑا افلاطون جمع تھا ہر ایک یہ کہتا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو جیسا سنا تھا اس سے بھی اونچا پایا۔

صبح ہوئی یونین میں جلسہ ہوا۔ میں اور مرشد بھی ایک طرف بیٹھ رہے۔ مولانا محمد علی نے حسب معمول بڑی پُرزور تقریر کی۔ لیکن حاضرین پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ ان کے بعد مولانا شوکت علی آئے دوپہر ہونے والی تھی۔ دونوں بھائی ٹرین سے کہیں باہر جانے والے تھے۔ تقریر کی آخری اور کمزور موجیں کنار ساحل سے ہم آغوش ہونے والی ہی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک مایوسانہ وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر

ہر دم بہ تو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

پڑھا اور کھلے ہوئے انداز سے جاکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ مڑکر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ دم بہ خود ہو گیا۔ مجمع قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ مرشد کو کھینچتا ہوا باہر لایا۔ پوچھا، یہ کیا ہوا؟
فرمایا "رشید صاحب الوداع، زندگی کا آغاز بخیر ہوا، انجام کے بھی بخیر ہونے کی دعا کیجیے گا۔ میرے پاس جو کچھ میرا ہے وہ یوسف اور محمود کے (دو چھوٹے بھائی) کے حوالے کر دیجیے گا، کالج کے کاغذات ہوں گے ان کو واپس بھیج دیجیے گا"۔ میں نے کہا مرشد! اس تحریک سے متعلق اکثر گفتگو رہی۔ آپ اس طریقۂ کار کے کچھ ایسے مؤید بھی نہ تھے آخر یہ کیا ہوا؟
فرمایا، تحریک غلط ہو یا صحیح۔ اس کے بارے میں یقین اور صحت کے ساتھ کچھ کہنا ناممکن بھی ہے اور قبل از وقت بھی۔ مجھے جس بات نے بے دست و پا کر دیا وہ یہ خیال تھا کہ کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڑھ نے ایسی تحریک میں حصہ نہ لیا جس میں مصائب کا سامنا تھا۔ مجھے تو یہ بتلانا ہے کہ فرزندانِ علی گڑھ رزم اور بزم دونوں کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں۔ آپ مزاحم نہ ہوں۔ پانسا پھینکا جا چکا ہے۔ انجام جو کچھ ہو۔ اچھا خدا حافظ۔

ذاکر صاحب کے اس اطمینان و استقامت کے ذکر کے ساتھ ایک اور حادثہ یاد آتا ہے، جو آنکھوں کے سامنے گزرا۔ جب وہ یہاں وائس چانسلر کی حیثیت سے تشریف لائے، ان پر قلب کا دورہ پڑا اور وہ سب گزر گیا جو ایسے میں گزرا کرتا ہے، اس کا ذکر نہ کرتا۔ اگر کچھ دنوں بعد خود اس حادثہ سے دوچار نہ ہوا ہوتا اور یہ نہ معلوم ہوتا کہ اس کے شدائد کیا ہوتے ہیں، اور ایسے

ہیں نفس کی کمتری یا روح کی برتری کب، کہاں اور کس طرح اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ہم دونوں شام کو تھوڑی دور ٹہل کر واپس آئے تھے۔ ذاکر صاحب مہمان کے کمرے میں ٹھہر گئے۔ میں اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس گیا تو کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھی، سوا اس کے موصوف شیروانی سمیت چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ دن میں وہ شیروانی شاید ہی اتارتے ہوں۔ آرام کرنا ہوا تو اچکن سمیت لیٹ رہیں گے۔ اور بلا تامل اشارہ یا اطلاع اس طرح اٹھ کھڑے ہوں گے، جیسے ایمرجنسی وارڈ کے ڈاکٹروں کے آرام کرنے اور اٹھ کھڑے ہونے کا طریقہ ہے۔ چاہا کہ ادھر اُدھر کی کوئی بات چھیڑوں۔ ذاکر صاحب نے بڑے ہموار اور استوار لہجے میں فرمایا ” قلب کا دورہ پڑ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے آخری وقت ہے۔ چاہا کہ آپ کو آواز دوں۔ پھر خیال آیا کہ جلدی کیا ہے، جو ہونے والا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ آپ بھی آتے ہی ہوں گے۔ ذاکر صاحب کے اس اطمینان قلب پر دم بخود رہ گیا۔ موصوف نے بالکل نہیں کہا کہ ڈاکٹر کو بلایا جائے گھر پر اطلاع کی جائے وہاں پہنچا دیا جائے۔ ڈاکٹر بلائے گئے۔ گھر پر اطلاع کی گئی موٹر آئی اور بڑے اطمینان سے اس میں بیٹھ کر کوٹھی پر آگئے، جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ذاکر صاحب پر وہ سب حادثے گزر گئے سوا زندگی کے آخری حادثہ کے۔ میرا ہر وقت کا آنا جانا رہتا تھا۔ ذاکر صاحب پر چاہے جو گزرتی ہو، لیکن بات چیت یا چہرے بشرے سے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ہر لمحہ کتنے سنگین امکانات کی زد میں تھے۔ ہمیشہ اسی لطف و شگفتہ روئی سے گفتگو کی، جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ جالندھر میں قاتلوں اور ان کی ننگی تلواروں اور چھروں کا سامنا اور کس درجہ غیر طبعی الم ناک موت سے صرف چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا دوسری طرف علی گڑھ میں قلب کا شدید دورہ پڑا اور یہ طبعی موت بالعموم جیسی غیر طبعی ہوتی ہے کسے معلوم نہیں، لیکن دونوں آزمائش وہ اس طرح جھیل گئے جیسے ” اک موج خوں وہ بھی!“

خالدہ ادیب خانم

جامعہ، اشخاص اور خیالات

ہندوستان میں نظم وضبط کی کون کون سی طاقتیں اثر پزیر ہیں ان کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے جامعہ کے بارے میں جاننا ضروری ہوگا۔ اس ادارے کے دو اہم مقاصد ہیں —— اول تو یہ کہ ہندوستانی مسلم نوجوانوں کی اس طور پر تربیت کی جائے کہ اسے پتہ ہو کہ ہندوستانی شہری ہونے کے ناطے اس کے فرائض اور حقوق کیا ہیں؛ دوئم یہ کہ ہندوؤں کے ساتھ رہ کر اسلامی فکر اور طور طریقوں روایتوں کو ہم رتبہ بنانا۔ عام مقصد یہ ہے کہ ایک ہم آہنگ ہندوستانی قومیت ابھر کر سامنے آئے جہاں مسلمان اپنی پہچان برقرار رکھیں۔ اپنے مقاصد میں، بھلے ہی ان کی ضابطگی مختلف ہو، جامعہ گاندھی تحریک سے بہت ملتے جلتے ہیں برخلاف کسی اسلامی حکومت کے، جہاں تک میں نے دیکھے ہیں۔

جامعہ کا علی گڑھ کالج سے پہلے ذکر ایسا ہی کہ جیسے کسی گھوڑے کے آگے چارہ ڈال دیا جائے اس لیے کہ جامعہ ہے تو علی گڑھ کی اولاد بھلے ہی باغی سہی۔ علی گڑھ پہلا ادارہ ہے جس نے اسلامی طرز تعلیم اپنایا اس کے بعد جامعہ کا نمبر آتا ہے۔

جامعہ کے نگراں ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں۔ کوئی بھی دانشور ایسا نہیں کہ جس نے مجھ سے یہ نہ پوچھا ہو کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ گویا ذاکر حسین خود اپنے ہی ملک کے لوگوں کے لیے پہیلی ہیں۔ اُن جیسا بے لاگ انسان ملنا مشکل ہے۔ ایک عام حیرانی کی بات یہ ہے کہ ان پر کسی قسم کا سیاسی شبہہ نہیں لگا ہے۔ ان کے کاموں میں کسی بھی پارٹی سے بے جا رجحان کی رنگ آمیزی نہیں ہے۔ وہ اپنا سارا وقت اور طاقت تعلیمی اور علمی کاموں پر صرف کرتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر کام تعمیری اور کسی حد تک تجرباتی ہوتے ہیں۔

وہ ایک پٹھان ہیں —— سرحد کا لمبا چوڑا انسان —— ایک بڑا آدمی جو بلند ہمت بھی ہے۔ ان کے والد کا پیشہ وکالت تھا وہ ہجرت کرکے حیدرآباد چلے آئے جہاں انھوں نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ جوانی ہی میں وفات پائی لیکن اپنے سات بیٹوں کے لیے کافی اثاثہ چھوڑ گئے تھے جو ان کے بیٹوں کی تکمیلِ تعلیم کے لیے بہت کافی تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سب سے بڑے تھے اور

اس زمانے میں ایک مشرقی خاندان میں اس کی بھی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی۔ حالات نے ان میں ایک احساسِ ذمہ داری پیدا کر دیا تھا اور جب ان کو احساس ہوا کہ وہ خاندان کی مناسب طریقے سے کفالت نہیں کر سکتے تو انھوں نے باہر کی دنیا میں کسی مقصد کے تحت قدم نکالا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ابتدائی تعلیم کٹر اور اخلاق و مذہب میں سخت محتاط حالات میں ہوئی۔ ان کا مدرسہ بہت ہی دقیانوسی تھا۔ ابھی نوعمر لڑکے ہی تھے گھر پر طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ خبطی قسم کے لوگ بھی آتے تھے اور ساتھ ہی کچھ صوفی منش انسان بھی آیا کرتے تھے جن کے لیے انھوں نے لاتعداد مسودّے نقل کر ڈالے۔ وہ بے حد خوش خط تھے، قابلِ ستائش تھی ان کی قوتِ برداشت اس لیے کہ تصوّف سے ان کو بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ علی گڑھ سے انھوں نے اقتصادیات میں سند حاصل کی اور یونیورسٹی ہی میں لکچرر ہو گئے۔ اس زمانے میں علی گڑھ کی حیثیت ایک انگریزی ادارے کی تھی، جس کے تمام سماجی اور ادبی (جس میں مستند کام نمایاں طور پر) کا اس کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کی خوش شکلی، حسنِ گفتار، حسنِ تقریر اور ان کی رہ نمائی کی صلاحیت کے سبب وہ بہت کامیاب اور مقبول ہو گئے تھے۔ وہ لوگوں کو اپنی ہمہ گیر لیاقت کا تاثر دیتے تھے مگر ساتھ ساتھ غیر ذمہ دارانہ رویہ بھی تھا جو اس زمانے کے اوسط درجے کے علی گڑھ کے طالب علم کی ہندوستانی ذہنیت کا خاصہ تھا۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں جب ایک نئی تحریک نے علی گڑھ کی روایات سے ٹکر لی تو ذاکر حسین نے نئی تحریک کا ساتھ دیا۔ اس نئی تحریک کے سربراہ ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علی گڑھ مسلمانوں کی صحیح طور پر سمت افزائی اور خیالات کی صحیح طور پر ترجمانی بھی نہیں کرتا۔ اس کو نہ مسمار کیا جا سکتا ہے اور نہ بدلا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں انھوں نے نئے مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ یعنی مسلم قومی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جس میں چھوٹے بچوں کی باقاعدہ کلاسز لے کر تربیت کی جاتی تھی۔ گویا یہ فوربل اور مانٹیسری دونوں کا مجموعہ تھی۔

۱۹۲۲ء میں ذاکر حسین نے پڑھائی کے سلسلے میں چھٹی لی اور تعلیم مکمل کرنے کے سلسلے میں جرمنی چلے گئے اور ڈاکٹری کی سند لی۔ اسی سال جب وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ چھٹیاں منا رہے تھے، میری ان سے ملاقات میونخ میں ہوئی۔ عمر ہو گی لگ بھگ ۳۰-۲۵ سال اور اتنی کم عمری میں ان کے داڑھی تھی جو کسی بھی طرح سے ان کے نوجوان ہونے کا تاثر نہیں دیتی تھی۔ اس پُروقار شخصیت کی وجہ سے وہ ایک معمر شخص لگ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان طالب علم بھی تھا جس کا نام مجیب تھا۔ تیکھے نقوش، منحنی ساخت، سنجیدہ، منتشر نگاہیں جو ذاکر صاحب سے جسمانی ساخت کے لحاظ سے بالکل ہی الٹ تھا مگر اس کے رکھ رکھاؤ سے اور چہرے سے اس کی آرٹسٹک صلاحیت نمایاں تھی۔ بظاہر خاموش، ثابت قدم تاثر دیتا تھا اپنے دوست کی طرح۔ ان دو نوجوان ہندوستانی طالب علموں نے مجھے بہت

حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ خوش گفتار، ہمہ گیر فطرت لیے مع اپنے پُرزور اور جوشیلے ردعمل کے ساتھ بڑے مختلف لگے یقیناً یہ لورڈکس اور لیٹن کم سخن نوجوانوں سے الگ تھے۔

۱۹۲۶ء میں ذاکر حسین ہندوستان واپس آگئے۔ برلن یونیورسٹی کا اقتصادیات میں ڈاکٹری کی ڈگری لیے ہوئے نوجوان ؛ وہ جامعہ کے پرنسپل بن گئے۔ اپنے اسی فطری شعور اور محرکات کو لیے انھوں نے اپنے نئے مرکز کو قائم کرنے کے لیے مناسب لوگوں کا انتخاب کیا اور مجیب ان میں سے ایک تھے۔ جب میں دلی گئی تو پچھلے نو سال سے ذاکر حسین جامعہ کے پرنسپل تھے۔ ان کی داڑھی اب بھی اور ویسا ہی گول چہرہ۔ وقت نے اپنا کوئی نشان ان کی شگفتگی پر نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ ایک اندرونی فکر کا عکس ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ پوزیشن کی گوناگوں مشکلات اور ساتھ ہی ناآسودہ حالات میں اپنے پر قابو پائے رکھنا، ان سب باتوں کا اثر ان کے چہرے سے آشکارا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے اپنے آپ کو ہلینشر اُتر کر رکھا ہوا ور ایسی صورت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی صرف ایک ہی مقصد کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے۔ پھر بھی میں نے ان کے جذبات سے خالی نقاب کے باوجود ان کے مزاج کے اتار چڑھاؤ دیکھے۔ میں نے ان کو شدید غصے میں بھی دیکھا اور آنسو بہاتے بھی دیکھا! لیکن انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ پر قابو رکھا۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ مغرب کی ترقی اور معلومات نے اپنے ملک واپسی پر ان میں کسی قسم کا احساس کمتری نہیں پیدا کیا اور نہ انھوں نے اپنے رویے سے یہ بات ظاہر کی۔ جب الڈوس ہکسلے ہندوستان تشریف لائے تو لوگوں کے جی حضوری اور آگے پیچھے گھومنے کے انداز سے بہت جھنجھلائے تھے۔

اس صیم الطبع انسان کو سب سے زیادہ جو باتیں دکھ پہنچاتی تھیں جیسے کم ظرفی، جھوٹ اور مطلب پرستی۔ "کچھ لوگ یہاں صرف جھوٹ کو بڑھاوا دیتے ہیں اور اپنی من گھڑت باتوں پر یقین رکھتے ہیں"۔ یہ بات انھوں نے بار بار غصے میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اور دانت پیس کر دہرائی ہے۔ لیکن یہ بات صرف ہندوستان ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ جھوٹ اس وقت کارگر ثابت ہوتا ہے جب یقین کلی کے تحت بولا جائے، ورنہ قابلِ سزا ہے۔

سچائی سے سمجھوتہ کرنے میں ڈاکٹر ذاکر حسین بالکل ڈاکٹر انصاری کے نقش قدم پر تھے۔ ڈاکٹر انصاری کے ساتھ میرے قیام کے دوران ہم لوگوں نے سیاست اور ہندوستانی سیاست دانوں کے ہر پہلو پر گفتگو کی۔ وہ کبھی سچائی کے راستے سے نہیں ہٹے۔ وہ ان لوگوں کا دوست ہونا پسند کرتے تھے جو کامیابی پر ناکامی کو ترجیح دیتے تھے واقعی اگر کامیابی کا مطلب اصولوں کی قربانی ہو۔ وہ اپنے آپ کو کبھی ان لوگوں سے وابستہ نہیں کرتے تھے جو وفادار نہ ہوں یا گھٹیا طریقوں کو اپنا کر کامیابی حاصل کی ہو یا اپنا مقصد پورا کیا ہو۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی فکر کی دوسری نوعیت تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی انسان کی استعداد اور شخصیت کی تربیت کی جائے اور لوگ بلکہ درست کی جائے آگے چل کر کوئی

بھی آدمی ناکام نہیں ہو سکتا۔ یہی بنیاد تھی ان کی کامیابی کی جس نے انھیں ایک کامیاب مدرّس اور ایک جوشیلا رہنما بنایا۔ ان کا تصور تھا کہ کسی بھی مقصد کی حصول کامیابی کے لیے ایک صحیح انداز یا رویہ اپنانا چاہیے لہٰذا انھوں نے جن لوگوں کی اس طرح تربیت کی تھی انھوں نے انھیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ بارہا انھوں نے دہرایا کہ سیاست میں ناکامیاں ان لوگوں کی وجہ سے ہوئی جو سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کی معلومات سے نابلد تھے۔ ان کا یہ ایک معتبر اور معقول نظریہ تھا کہ اس سے پہلے کہ لوگ سیاست میں داخل ہوں ان کی تربیت لازم ہے اور اس تربیت کا تعلق ہے سماجی مسئلوں اور مدّعوں سے۔

خواتین کی آزادی کے بارے میں ہمیشہ انھوں نے یہی کہا: "تعلیم بہر حال لازم ہے ان کو ان کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ان کو اپنی زندگی جینے دینا چاہیے۔ جدید طرزِ زندگی اپنانے پر جبر کرنا ایسے ہی جیسے ان کو پردہ کرنے پر مجبور کرنا۔" جبراً آگے چل کر یا ایک مجہول اور سست رَو یا مشرقی یا تیز روشنی سماج کی تشکیل کرنا ہے۔ جامعہ کے تمام پروفیسروں نے اپنی بیویوں کے تئیں یہ طریقہ اپنایا تھا۔ کچھ خواتین تو عبوری حالت میں تھیں پردے میں رہتی تھیں یا نیم پردہ تھیں اور کچھ ایسی بھی تھیں جنھوں نے بالکل ہی پردہ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن یہ ساری خواتین بے پناہ مضبوط شخصیت کی مالک تھیں۔ مگر لڑکیوں کو بہت محتاط ہو کر تعلیم دی جاتی تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا کہ جامعہ میں ابتدائی کے استادوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے، کیونکہ یہ اس لیے ضروری ہے کہ وہ بھی ہم جیسے ہی عام انسان ہوتے ہیں جن میں بہت سی کمیاں ہوتی ہیں اور ان کی اس طرح لوک پلک درست ہو جاتی ہے۔ ریاستی یونیورسٹی کا گریجویٹ مشکل ہی سے ابتدائی تعلیم کا استاد بننا پسند کرتا ہے اس لیے کہ وہ اس کو کسرِ شان سمجھتا ہے اور اس طرح کے لوگوں کو نوکری دلوانے میں کافی دشواریاں آتی ہیں جب کہ جامعہ کا تربیت یافتہ ابتدائی استاد نہ صرف قابل ہوتا ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے، لہٰذا نوکری ان ہی لوگوں کو ملتی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین، مجھے لگتا تھا، اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے ہندوستان میں تعلیم کو فوقیت دی جانی چاہیے اور یہی وقت ہے کہ ابتدائی تعلیم پر توجہ دی جائے۔

"آپ کے گریجویٹ لوگوں کو نوکری ملنا کیوں دشوار ہوتی ہے؟"

"دراصل ہمارے یہاں تعلیم اُردو میں دی جاتی ہے اور انگریزی ایک مضمون کی طرح پڑھائی جاتی ہے۔ یہ ایک نئی بات ہے اس لیے کہ ایسے ادارے بہت کم ہیں جہاں تعلیم مقامی یا مادری زبان میں دی جاتی ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے اس لیے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو کو فروغ حاصل ہو تو ہمیں اس کا لازم طور پر استعمال کرنا چاہیے اور ایک سائنسی نظریہ دینا چاہیے۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ ہم اردو پڑھاتے ضرور ہیں مگر ہمیں ریاستی سے محروم

کر دیا جاتا ہے اور گریجویٹ طلبا جن کی سرپرستی ریاست نہیں کرتی ان کو نوکری ملنے میں یقیناً دشواری ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم ریاستی امداد یا کوئی بھی ادارہ مدد دے تو یقیناً ہم اس کا استقبال کریں گے بشرطیکہ وہ ہمارے طریقہ تعلیم میں دخل اندازی نہ کرے۔ پرنسپل سمیت جامعہ کے تمام اساتذہ ۷۵ روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے جس میں وہ بڑی مشکل سے گزارہ کرتے تھے۔

میں لڑکوں کی کلاس میں گئی جہاں تاریخ پڑھائی جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ طلبا میں کچھ تو استاد سے بھی عمر میں بڑے تھے لیکن اس نوجوان استاد کی خود اعتمادی قابل تحسین تھی۔ سب لوگ مع استاد کے زمین پر دریوں پر بیٹھے تھے سامنے لکڑی کے ڈسک رکھے تھے۔ سبق چونکہ اردو میں دیا جا رہا تھا وہ تو میں نہیں سمجھ سکی مگر بلیک بورڈ پر جو نقشے اور خاکے بنے تھے ان کو دیکھ کر یہ میں تجوبی سمجھ گئی کہ وہ ہندوستانی تاریخ کے ایک خاص دور سے متعلق تھیں۔ استاد مختلف ادوار کے رجحان کے مطابق اپنے موضوع کی تکمیل کرتا تھا۔ شاگرد اور استاد دونوں مل کر بڑی ذہانت کے ساتھ اور پوری آزادی سے مفروضات کو سامنے رکھ کر بامقصد سبق کا اصول بناتے تھے۔

یہ ایک اخلاقیات کی کلاس ہے پوسٹ گریجویٹ طلبا کی۔ یہ پروفیسر ایک ہندوستانی عیسائی ہے۔ اس نے ایک قابل تعریف سبق تیار کیا ہے۔ جب بھی وہ انسانی آزادی اور خصوصیات کی بات کرتا ہے تو مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کبھی اچھوت رہا ہوگا یا ان پر اس کا مطالعہ وسیع ہوگا وہ انگریزی بولتا ہے اور کہتا ہے کہ بغیر قوت فیصلہ اور قوت ارادی کے اخلاقیات پنپ نہیں سکتی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ جیسے یہ ایک جنگ کا نعرہ ہے چھوت چھات کی ذہنیت رکھنے والوں کے لیے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ باہری تقلید کرنا بالکل فضول ہے۔ یہ آگے چل کر انسان کے فیصلے کو ان ہی لوگوں کے رنگ میں رنگ دیتا ہے جن کی وہ تقلید کر رہا ہے۔ مگر غلط ہے اس لیے کہ یہ تقلید ایسے فرقے کی طرف لے جائے گی جہاں انسان کی اپنی ذہنی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ جرمن یونیورسٹی کا پڑھا ایک قابل آدمی ہے۔ لوگوں کے شکست اندازِ فکر نے چھوت چھات سے نفرت کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ اس حد تک کہ وہ گاندھی کیپ پر بھی معترض ہے جو تمام طلبا پہنتے ہیں۔ اس کے مطابق یہ ایک علیحدہ ذات کا تاثر دیتے ہیں ــــ "گاندھی ـ ذات"۔ مگر وہ طلبا جنھوں نے اپنی مرضی سے ٹوپی لگائی ہے، وہ احتراماً سنیں گے ضرور مگر ٹوپی پہننا ترک نہیں کریں گے۔ یہاں ذہنی پختگی کی آمیزش ہے، قوتِ ارادی اور قوتِ برداشت کی آزادی ہے جو صرف اس قسم کی تعلیم اور تربیت سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

میں نے ایک پوری سہ پہر بچوں کے ساتھ گزاری۔ پہلے ان کے نشست کے کمرے میں، جہاں فرنیچر نہیں تھا بلکہ فرش تھا جس پر استاد اور طلبا سب بیٹھے تھے۔ زیادہ تر لڑکے تھے ویسے کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ ان سب کی عمریں ۹ ـ ۷ سال کے درمیان ہوں گی۔ یہ بات

صاف ظاہر تھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین سب کے پسندیدہ استاد تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے کھسک کھسک کر ان تک پہنچ گئے تھے۔ وہ ایک درخت کی مانند تھے جن کو چھوٹی چھوٹی بیلیں چاروں طرف سے گھیرے تھیں۔ کچھ کے چہرے ان کے شانوں پر جھکے ہوئے تھے، کچھ ان کے بازوؤں کو تھامے ہوئے تھے۔ انھوں نے بغیر کسی جھنجھلاہٹ اور بجائے ان کو ہٹانے کے اپنے بیٹھنے کا زاویہ بدل لیا کہ سب بچے ان کو دیکھ سکیں اور وہ ان کو دیکھ سکیں۔

مجھے یہ دیکھ کر ہیمپسٹیڈ میں ایک ٹیکسی ڈرائیور یاد آگیا۔ جس کو میں ہر روز بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ گلہری جو تمام جانوروں میں سب سے زیادہ شرمیلا جانور ہے۔ تو بہت سی گلہریاں اس کے جسم پر چاروں طرف اس طرح گھوما کرتی تھیں جیسے اس کا جسم کوئی کھیل کا میدان ہو۔ میں سوچا کرتی تھی کہ دنیا نے ٹیکسی ڈرائیور کی شکل میں ایک بہترین استاد کھو دیا!

بچوں کو چونکہ انگریزی نہیں آتی تھی لہذا ڈاکٹر ذاکر حسین نے میرے سوالوں کا ترجمہ کر دیا۔ وہ بہ نسبت دوسرے بچوں کے بہت ذہین بچے تھے۔

"آپ لوگ بڑے ہو کر کیا بنیں گے؟" میں نے ان سے پوچھا۔

زیادہ تر نے جواب دیا تاجر ـــ پھر ڈاکٹر ـــ اور ایک ملاح بننا چاہتا تھا۔ یہ لڑکا جب کہ وہ تھا جس نے سمندر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کوئی بھی آفیسر یا سپاہی نہیں بننا چاہتا تھا، جو میں سمجھتی ہوں کہ ایک اچھی علامت تھی۔ ان کا پسندیدہ ہیرو کون ہے، ان کے جواب سے میں بہت متاثر ہوئی۔ کسی نے بھی کسی بادشاہ، یا کمانڈر یا کوئی اور نام نہیں لیا جب کہ ہندوستانی تاریخ مشہور لوگوں سے بھری پڑی تھی! حضرت عمرؓ، دوسرے خلیفہ سب کی پسند تھی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سب سے زیادہ مناسب انسان تھے۔ اس کے علاوہ پسندیدہ ہیرو ایک ہندوستانی تھا جس نے اپنے دوست کے لیے اپنی زندگی کی قربانی دی اور آخری وقت تک اس کا ساتھی رہا۔

"کیا یہ لوگ نظم وغیرہ بھی پڑھتے ہیں؟" "زیادہ نہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھے بتایا کہ عام جگہوں پر پڑھنا عام طور سے منع ہے۔ کیا ہندوستان میں کوئی نوجوان نہیں جو مقرر بن کر کسی اسکول سے نکلا؟ لیکن ان کو اداکاری پسند تھی اور اس میں ان کو بڑھاوا دیا جاتا تھا۔

وہ لوگ مجھے اپنے باغیچے میں لے گئے۔ وہ بہت خوب صورت باغیچہ تھا ـــ آدھا پکّا اور آدھا ہری گھاس کا۔ جس پر درختوں کا سایہ تھا ایک چھوٹی سی حوض تھی جس کے چاروں طرف درخت لگے ہوئے تھے۔ ہر ایک نے مجھے اپنا پسندیدہ جانور دکھایا اور اس کی پسند اور ناپسند سمجھائی۔ وہ سب عام سے پالتو جانور تھے جن میں ایک بھورے رنگ کا خر۔

بندر بھی شامل تھا۔ انھوں نے مجھے حوض ہی کے چاروں طرف ایک ڈرامہ دکھایا۔ گو کہ وہ اردو میں تھا میں سمجھ نہیں پائی لیکن بہر حال نقلیں بہت اچھی تھیں۔ اس ڈرامے میں ہر ایک بچہ ایک جانور بنا تھا۔ ایک بچہ ایک جانور بنا تھا، دیکھا بہت سے بڑے جانور اس کا پیچھا کر رہے ہیں تو وہ فوراً درخت پر چڑھ گیا، میں نے فوراً بتا دیا کہ وہ بندر ہے۔ اس کے بعد دو انسانی چڑیوں نے بہت خوب صورت گیت گایا۔ صرف یہ ایک ڈرامہ ہی نہیں تھا جو انھوں نے میرے سامنے کیا ہو بلکہ ہر بار جب بھی ان کو اداکاری کرتے دیکھا یہ احساس ہوا کہ وہ اس وقت تماش بینوں کو بھول جاتے تھے اور یہ ان کی خود اعتمادی کا ثبوت تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ مجھ سے "سلام ہاؤس" میں تین اور چار کے گروپ میں آکر ملے۔ ان کے ساتھ مس فلپس، ایک خوب صورت جرمن خاتون تھیں، جنھوں نے بڑی اہلیت اور محنت سے ان بچوں کو یہ سب سکھایا تھا۔ وہ میرے کمرے میں بہت مطمئن اور دوستانہ انداز میں اشاروں کنایوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ وہ پھر خود ہی کھیلنے بھی لگے۔

لیکن جیسے ہی اذان کی آواز آئی، پہلے ہی کتنی سنجیدہ بات کر رہے ہوں، یا کوئی دلچسپ کھیل کھیل رہے ہوں فوراً نماز کے لیے تیار ہو جاتے تھے اور ایک پٹھان کی سربراہی میں، جو ان کا لیڈر تھا، مارچ کرتے ہوئے چلے جاتے تھے اور بیگم انصاری کے ساتھ نماز پڑھنے چلے جاتے تھے۔ وہ پٹھان لڑکا امام کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اسلامی اصولوں کے مطابق یہ بچے پانچوں وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ قرآن کی جو احادیث یا آیات پڑھی جاتی تھیں تو ان کا بہت سہل بھی مذہبی انسان تھے، حالانکہ وہ اس کا بہت چرچا نہیں کرتے تھے مگر وہ پوری طرح سے پابندِ اسلام تھے۔ انھوں نے کبھی سود نہیں کھایا اور نہ ہی شراب پی۔ وہ روزانہ پانچوں وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ انھوں نے کہا: "تمام کام عقیدے پر مبنی ہیں۔" ان کے خیال میں ہر انسان کو چاہیے کہ پہلے اپنے آپ کو منظم کرے جو بغیر عقیدے کے ممکن نہیں۔ جتنے بھی ہندوستانی مصلح آئے، کمیونسٹوں کو چھوڑ کر سب کا یہی اندازِ فکر تھا اور اشتمالیت بھی بذات خود ایک سماجی عقیدہ ہے۔

یہ مذہب کے تئیں اٹل رویہ محض اسلام اور ہندوازم کی وجہ سے ہی نہیں ہے بلکہ، میرا خیال ہے کہ یہ کسی حد تک اس وجہ سے بھی ہے کہ ہندوستان نے مغربی طرز فکر اور تہذیب کو، اینگلو سیکسن سے زیادہ اپنایا ہے۔ بہ نسبت فرانسیسی خلیج کے۔ اینگلو سیکسن کے یہاں انقلاب پسندی کی وجہ سے کوئی مذہبی یا سماجی توڑ پھوڑ نہیں ہوئی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین بھی ڈاکٹر انصاری کی طرح مذہبی آدمی تھے۔ اس کے باوجود ان لوگوں کا معلومات اور علم کے بارے میں ایک سائنسی نظریہ تھا۔ آخری صدی میں جو سائنسی دریافت یا ایجادات ہوئی ہیں اس کے جواز کے لیے ان لوگوں نے قرآن سے تصدیق نہیں کی اور نہ قرآنی معلومات کو ان سے ملایا۔

آخری بار میں جامعہ اس وقت گئی جب دلّی کے باہر سب لوگ اکٹھا ہوئے اور نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ ان کے پاس کافی زمین تھی اور وہ اس ادارے کو وسیع پیمانے پر مکمل کرنا چاہتے تھے۔ یہ تقریب ایک بہت بڑے شامیانے میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری نے صدارت کی اور خاص خاص ہندو مسلم لیڈروں کو مدعو کیا۔ سب سے زیادہ رقم ہندوؤں نے دی، بہ نسبت بڑے بڑے نامور مسلمانوں کے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے جامعہ کی تعلیمی اہمیت کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن بہرحال مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے چندے دئے۔ بھلے ہی انھوں نے اپنی قلیل آمدنی سے پیسہ پیسہ بچا کر رقم جمع کی ہو۔ اس سے ان کی نیک خواہشات کا اظہار ہوتا ہے۔

سنگ بنیاد سب سے چھوٹے بچے نے رکھا۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا اپنے آپ کو بڑے لوگوں کے درمیان عجب سا محسوس کر رہا تھا پلیٹ فارم کے بالکل سامنے سب بچے بیٹھے تھے اور بے حد مستقل مزاجی سے بزرگوں کی تقریریں سن رہے تھے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ان میں چلبلاہٹ شروع ہوگئی اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اساتذہ اگرچہ ان بچوں کے ساتھ ہی بیٹھے تھے مگر انھوں نے بھی زیادہ ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک سات سال کی بچی نے سب کو خاموش کرا یا۔ وہ نازک سی، تیکھے نقوش اور سیاہ آنکھوں والی بچی تھی جس کی آنکھیں چمک رہی تھیں جو کہنیوں سے چپکے چپکے لوگوں کو خاموش کرا رہی تھی۔ اس کے بعد پھر کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ مجھے نئے دور کی ہندوستانی عورت کی علامت لگی جس نے اپنے حق کا پورا استعمال کرتے ہوئے مردوں کو خاموش کر دیا۔

یوسف حسین خان

فخر خاندان

اعلیٰ انسانوں میں کون سی ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جن کے باعث ہم ان کی عظمت کے آگے جھکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سب سے اول تو یہ کہ ان کے دل انسانی ہمدردی سے معمور ہوتے ہیں۔ انسانیت دنیا کے کسی کونے میں دکھی ہو ان کے دل میں ٹیس ہوتی ہے۔ اس میں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ دکھی کا مذہب، یا اس کی قومیت کیا ہے اور اس کا کس نسل سے تعلق ہے یہ دل سوزی کی صفت قدر مشترک ہے جو دنیا کے اعلیٰ پائے کے انسانوں میں ملتی ہے۔ یہ دلسوزی محض زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں ہوتی بلکہ انھیں خدمتِ خلق کے لیے ابھارتی ہے۔ یہ بے غرضی اپنوں اور پرایوں میں فرق وامتیاز نہیں کرتی۔

ذاکر میاں کی طبیعت میں دو اور اوصاف ہیں جن سے ان کی انسان دوستی کا خمیر بنا ہے۔ یہ ہیں صداقت اور جرأت۔ اگرچہ وہ بے حد خلیق اور منکسر مزاج ہیں اور کبھی کسی کی دل آزاری یا توہین نہیں چاہتے، بایں ہمہ جب ضرورت ہو تو حق بات کہنے میں تامل بھی نہیں کرتے۔ چند سال ہوئے دہلی میں قومی یک جہتی کی کانفرنس (نیشنل انٹیگریشن کانفرنس) ہوئی تھی جس میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے وزیر اور کانگریس کے سب بڑے بڑے نیتا شریک تھے۔ قومی یک جہتی پر بہت سی تقریریں ہوئیں، بعض نے بڑی دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی۔ گفتگو دلچسپ مگر حقیقت سے دور تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مرض کا جو علاج تجویز کیا جا رہا ہے وہ اوپری ہے۔ اندرونی بیماری پر نظر نہیں گئی۔ لوگ دیدہ و دانستہ نظر بچا گئے، تاکہ خود فریبی کو ٹھیس نہ لگے۔ ذاکر میاں کو تقریر کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہماری قومی یک جہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ذات پات کا نظام ہے جس کی جڑیں ہماری زندگی میں اتنی گہری پیوست ہیں کہ آزادی حاصل ہو جانے کے باوجود وہ اپنی جگہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ ہمارا دستور اساسی اسے مانے نہ مانے وہ بھی ان رسم و رواج کو یکایک نہیں بدل سکتا جو ہزارہا سال سے سماجی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں، جب تک کہ خود معاشرہ اپنے اخلاقی ارادے کی قوت سے انھیں نہ بدلے۔ انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگریس نے اپنے حلقۂ انتخاب سے

منتخب کرایا جہاں مسلمان رائے دینے والے اکثریت میں تھے۔ مولانا اس ملک کی سیاست میں کوئی غیر معروف شخص نہ تھے: تاہم ان کے ساتھ یہ صورت اختیار کی گئی دوستوں کا تو ذکر ہی کیا ہے ۔ جب ذاکر صاحب نے اپنی تقریر ختم کی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ تالیاں ایک حق بات پر پسندیدگی کے لیے تھیں۔

صبر و تحمل کی صفت بڑے ریاض کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ذاکر میاں بعض اوقات نہایت خود غرض، جھوٹے اور منافق لوگوں کو انگیز کرتے ہیں حالانکہ وہ ان کی بد طینتی سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ ان کی فراست بلا کی ہے۔ کوئی چاہے کہ جھوٹی سچی باتوں یا للّو پتّو سے انھیں رام کرلے تو وہ بڑی غلطی میں ہے۔ خوشامد سے انھیں نفرت ہے۔ وہ ہر ایک کی تہہ تک بہت جلد پہنچ جاتے ہیں۔ جنھیں اچھا نہیں سمجھتے ان کے ساتھ بھی اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ احمقوں اور کوڑ مغزوں کو بھی بڑے صبر سے جھیلتے ہیں۔ میں نے انھیں بعض اس قسم کے لوگوں سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ یہ لوگ اس غلط فہمی میں گھر واپس جاتے ہیں کہ ہم نے اپنی لیاقت کا کیسا سکہ بٹھا دیا ہے وقوف کہیں کے! ذاکر میاں چاہتے ہیں کہ وہ اپنی اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں اور ازالۂ وہم کی نوبت نہ آئے۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ کسی کا دل نہیں دکھانا چاہتے۔

اعلیٰ سیرت کی تعمیر میں جہاں اقدارِ عالیہ سے گہرا لگاؤ ضروری ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ فکر کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہو: تاکہ تمام معاملات کی نسبت جن کا تعلق اپنی ذات سے یا جماعتی زندگی کے مسائل سے ہو، آدمی صحیح نتائج اخذ کر سکے۔ قدرت نے ذاکر میاں میں غیر معمولی فراست اور فکری قابلیت ودیعت کی ہے۔ وہ جلد اپنی رائے قائم کر لیتے ہیں اور اکثر و بیشتر وہ صحیح ہوتی ہے۔ ان کی ہر بات میں سنجیدگی، متانت اور وزن ہوتا ہے۔ جو رائے قائم کر لیتے ہیں، اس پر عمل کرتے ہیں۔ ذہن کی تیزی اور سلامتی طبع ایک جگہ کم جمع ہوتی ہیں۔ لیکن ذاکر میاں میں دونوں موجود ہیں۔ اسی طرح عقلی اور وجدانی صلاحیت ایک جگہ کم ملتی ہے۔ لیکن غیر معمولی اشخاص میں ان دونوں کے جمع ہونے سے بڑے بڑے کام ظہور میں آتے ہیں۔ جن سے پوری سوسائٹی فائدہ اٹھاتی ہے۔

ذاکر میاں کی انسان دوستی خاص کر اسلام کی تعلیم سے اپنا نور اور بصیرت حاصل کرتی ہے۔ ویسے ان کا زندگی کا نقطۂ نظر عالمگیر ہے۔ ذہنی طور پر وہ عقل پسند اور جذباتی طور پر مذہبی انسان ہیں۔ جس کسی نے انھیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے سنا یا دیکھا ہے وہ ان کے خشوع و خضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی دینداری کو چھپاتے ہیں۔ اپنے قریب ترین عزیزوں سے بھی۔ نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی انھیں عبادت کرتے ہوئے دیکھے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ان کے اخلاص و عقیدت اور بے ریا اور بے تصنع زندگی کا اقتضا ہے۔ ان کی عبادت نمائش کے لیے نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اظہارِ عبودیت کے لیے ہے۔ جس طرح ان کے پالے پوسے ہوئے

ادارے جامعۂ ملیہ اسلامیہ میں قومیت اور اسلامیت کے اصول کو ملا کر بطور نصب العین رکھا گیا ہے اسی طرح ذاکر میاں کی زندگی میں یہ دونوں اصول تحلیل ہو کر ایک ہو گئے ہیں اور ان کی ہم آہنگی ہی سے ان کی سیرت کے خدوخال نمایاں ہوئے ہیں۔ نہ قومیت ان کی اسلامیت پر انگشت اور نہ اسلام قومیت کو راندۂ درگاہ اور مردود ٹھہراے۔

نوجوانی میں ذاکر میاں کی سیرت و کردار پر ایک صوفی اور درویش حسن شاہ کا گہرا اثر پڑا جو ہمارے دادا کے دور کے عزیز ہوتے تھے۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے اور اپنے رنگ میں منفرد تھے۔ گرمیوں کی تعطیل میں ہم سب بھائی قائم گنج آتے تو حسن شاہ دن بھر ہمارے یہاں رہتے تھے۔ صبح آتے اور شام کو جاتے لیکن کھانا ہمارے یہاں نہیں کھاتے تھے۔ بھیجی پور میں ان کا قیام رہتا تھا۔ صبح نو دس بجے وہاں سے کچھ کھا کر آتے اور شام کو واپسی پر وہیں جا کر کھاتے۔ ہمارے یہاں دن میں چائے ضرور پی لیتے تھے اور پان شوق سے کھاتے تھے۔ وہ فرخ آباد کے شاہ حسین مجیب کے ارشد خلفا میں سے تھے اور اپنے شیخ کے ساتھ عقیدت اور وارفتگی بدرجہ کمال رکھتے تھے۔ مزاج میں جذب غالب تھا اس لیے کبھی کبھی اپنے معمولات میں شدت اختیار کر لیتے تھے۔ حضرت مجیب کے عقیدت مندوں میں کثرت سے ہندو صاحبان بھی تھے چونکہ آپ نومسلم تھے آپ کے اکثر و بیشتر عزیز کاشتھ تھے۔ ایک دفعہ حسن شاہ کسی ہندو عقیدت مند کے ماتھے پر قشقہ دیکھ کر بھری محفل میں اعتراض کر بیٹھے، جو حضرت مجیب کے صلح کل مشرب کے خلاف تھا۔ چنانچہ حضرت نے حسن شاہ کو اسی محفل میں سب کے سامنے حکم دیا کہ قشقہ لگا کر پہلے یہاں سے کشمیر اور پھر وہاں سے جنوبی ہند میں رامیشورم پیدل جاؤ اور وہاں سے بڑے پروہتوں کی چٹھیاں لا کر دو جن میں تمہاری وہاں حاضری کی تصدیق ہو۔ حسن شاہ نے بلا تامل اپنے شیخ کے ارشاد کی تعمیل کی اور سفر کی تکمیل کر کے تین سال کے بعد فرخ آباد واپس آئے۔

حسن شاہ ہم سب بھائیوں میں ذاکر میاں کو بہت چاہتے تھے۔ ان سے اپنی فارسی کی کتابیں جو تصوف پر تھیں نقل کرواتے۔ ذاکر میاں کا کہنا ہے کہ اس نقل کرنے کے سبب سے میرا اردو کا خط اچھا ہو گیا۔ ایک مرتبہ ذاکر میاں بیمار پڑ گئے تو روزانہ صبح آ کر خود اپنے ہاتھ سے ان کا قارورہ حکیم احمد شبر خاں کے یہاں لے جاتے تھے جو سبحان پور میں ہمارے مکان سے کوئی پون میل پر رہتے تھے۔ کبھی انھیں روپے دیتے تھے کہ قریب کے محلے میں فلاں غریب آدمی کو دے آؤ۔ کبھی کسی بیوہ کے یہاں روپے بھجواتے۔ برسوں اسی طرح ان کا معمول رہا۔ کتابیں نقل کروانے کے علاوہ ذاکر میاں کو ان کے مطالب و معانی بھی سمجھاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے ذاکر میاں کی روحانی تہذیب کی اور انھیں تصوف کی اعلیٰ قدروں سے روشناس کیا۔

ذاکر حسین

انسان کی سیرت کو پرکھنے کے لیے اس کی نجی زندگی کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ کیسی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محراب و منبر یا آج کی اصطلاح میں پبلک پلیٹ فارم پر تو بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں لیکن ذرا ان کی نجی زندگی کو دیکھئے تو وہاں ان سب بلند آہنگ دعووں کی نفی ملتی ہے۔ ذاکر میاں کی نجی زندگی ہمیشہ سے آئینے کی طرح پاک صاف رہی ہے۔ اس میں ہر بات ظاہر ہے، کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں۔ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ ان کی سیرت کے اوصاف پبلک زندگی اور نجی زندگی میں یکساں ہیں۔ وہی سادگی، وہی بے ساختگی، وہی نمائش سے گریز، وہی ملنساری محبت کا نبھاؤ، وہی وضع داری، اپنوں سے بھی اور پرایوں سے بھی۔ وہ ایک شفیق باپ ایک دردمند بھائی، ایک مخلص دوست ہیں۔ ہر حالت میں آدمی ان پر پورا بھروسا کرتا ہے۔ امانت و دیانت کی یہ شان اس زمانے میں کم لوگوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اگر کسی سے وعدہ کرلیں تو اسے پورا کریں۔ وہ ہر ایک کا کام نکالنے کو تیار رہتے ہیں، بشرطیکہ وہ جائز اور درست ہو۔ میرے علم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ذاکر میاں کی طرح دوسروں کی خوش دلی سے مدد کرتے ہوں۔ اگر وہ کسی کا کام نہیں کر سکتے تو بڑے اخلاق سے اس کا اظہار کر دیتے ہیں اور اہلِ غرض کو پوری بات سمجھا دیتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں نہیں کر سکیں گے۔ وہ کبھی کسی کو غلط اور موہوم امید نہیں بندھاتے۔ جیسا کہ بعض دوسرے با اختیار لوگوں کا شیوہ ہے جسے وہ اپنی دانست میں بڑی حکمت عملی سمجھتے ہیں۔ خاک حکمت عملی ہے۔ جھوٹ کو چاہے کسی برگزیدہ نام سے پکارو، وہ جھوٹ رہے گا۔ ایک حق گو اور صداقت شعار انسان کبھی کسی کو غلط بات باور کرانے کی کوشش نہیں کرے گا اور نہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔ سچائی انسان کو بہت ساری آلائشوں سے بچاتی ہے۔ ذاکر میاں کی صداقت کو بڑے چھوٹے سب مانتے ہیں۔ اپنے پرائے سب اس کی گواہی دیتے ہیں، اس سے ان کے کردار کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

دہلی میں ذاکر میاں کی زندگی کا بڑا حصہ گزرا ہے۔ یہاں ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو انھیں جانتے ہیں اور ان سے عقیدت رکھتے ہیں۔ وائس پریسیڈنٹ کی کوٹھی کا منظر عید کے دن دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ سیکڑوں آدمی موٹروں میں، آٹو رکشا میں اور پیدل، جوق در جوق عید کی مبارک باد دینے آتے ہیں۔ ان میں دولت مند بھی ہوتے ہیں اور غریب بھی۔ کوئی ایسا نہیں جس سے مصافحہ اور معانقہ نہ کریں۔ عملے والے اور چپراسیوں سے بھی اسی طرح اخلاق سے ملتے ہیں جیسے دوسروں سے۔ پرانے جاننے والوں سے ہمیشہ جیسے ملتے تھے اسی طرح اب بھی ملتے ہیں۔ سب کی خاطر و مدارات کرتے ہیں۔ پٹنہ میں جب گورنر تھے تو کسی تہوار کے موقع پر راج بھون کے سارے عملے کو دعوت دی، وہاں جو بھنگی رہتے ہیں انھیں بھی دعوتی رقعہ پہنچا۔ وہ بھی اوروں کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن دعوت میں شرکت

کے لیے آئے۔ جب چائے پانی کے بعد تقریب ختم ہوئی تو ذاکر میاں نے باری باری سب سے مصافحہ کیا۔ بھنگیوں سے بھی ہاتھ ملایا۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی اور ان کی سچی انسان دوستی کا یہی تقاضا تھا۔ لیکن بہار والوں کے لیے یہ عجیب بات تھی جس کا چرچا میں نے وہاں کی اعلیٰ سوسائٹی میں خود سنا۔ ابھی حال میں ایک بہاری دوست نے بتایا کہ اس کا چرچا ابھی ختم نہیں ہوا۔ گویا کہ یہ ان ہونی بات تھی جو اتفاق سے ہو گئی۔ اب نہ ہوگی۔ یہ اس ملک کا حال ہے جس کے دستورِ اساسی میں اونچ نیچ اور ذات پات کے فرق و امتیاز کو خلافِ آئین قرار دیا گیا ہے۔ خالی دستور میں لکھ دینے سے کیا ہوتا ہے۔ جب تک لوگوں کے دل نہ بدلیں، معاشرتی فرق و امتیاز مٹنے والا نہیں۔ اور جب تک یہ نہیں مٹے گا، ہماری جمہوریت کی بنیادیں کمزور رہیں گی۔

انسان کی سیرت کے اندرونی رجحانوں کا پتہ اس کے تفریحی مشاغل سے لگتا ہے۔ ذاکر میاں کے تفریحی مشاغل کتب بینی کے علاوہ دو ہیں۔ باغبانی اور پرانے پتھر جمع کرنے کا شوق۔ ایک ماہرِ تعلیم کے لیے جو نئی نسل کے ذہن اور جذبات کی نشوونما اور تہذیب چاہتا ہو باغبانی کے مشغلے میں خاص مناسبت مضمر ہے۔ جس طرح تعلیم و تربیت کے ذریعے سے وہ ایسا ماحول فراہم کرتا ہے جس میں شخصیت اپنے کمال کو پہنچے اسی طرح باغبانی میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ قدرت نے پودے میں جو صلاحیت پوشیدہ رکھی ہے اس کا پوری طرح سے اظہار ہو۔ پھول کھلے تو ایسا کھلے جو کھلنے کا حق ہے، نہ کہ مرا ہوا، مرجھایا ہوا، جھلسا ہوا باغبانی کے شوقین بیجوں کو ملانے سے ان کے رنگ اور جسم بدل دیتے ہیں اور یہ تبدیلی اٹکل پچو نہیں ہوتی بلکہ کسی خیال، کسی منصوبے کے مطابق ہوتی ہے۔ اس طرح باغبانی بھی تعلیم کی طرح ایک تخلیقی فن ہے۔

جب ذاکر میاں علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تو وہاں ہر طرف خاک اڑتی تھی عمارتیں نئی نئی بنتی تھیں لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ چمن بندی کر کے گردوپیش کو جاذبِ نظر بنایا جائے۔ پرانی عمارتوں پر ویرانی برستی تھی۔ ذاکر میاں کی توجہ سے نہ صرف نئی عمارتوں کے چاروں طرف چمن بندی ہوئی بلکہ تمام پرانی عمارتوں کے گردوپیش کو کیاریوں، پودوں اور پھولوں سے خوب صورت بنایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ طالب علم بجائے خاک پھانکنے کے کیاریوں اور لانوں پر آکر بیٹھیں، وہاں پڑھیں ہنسیں بولیں اور اس طرح ان کا دل لگے اور یونیورسٹی کی رونق میں اضافہ ہو۔ سات آٹھ سال میں یونیورسٹی کی صورت بدل گئی۔ جنھوں نے کچھ عرصہ قبل یونیورسٹی کو دیکھا تھا اب دیکھ کر تعجب کرتے تھے۔

پھولوں میں ذاکر میاں کو گلاب بہت پسند ہے۔ ہے بھی وہ پھولوں کا بادشاہ

انھوں نے یونیورسٹی کے ہر گوشے میں گلابوں کی کیاریاں لگوائیں۔ ہر رنگ کے گلاب، لال پیلے، گلابی اور سفید۔ اسٹاف کے بعض لوگوں کو بھی اپنے گھروں میں گلاب باغ لگانے کا شوق ہوا۔ یونیورسٹی میں ہر سال گلابوں کی جو نمائش ذاکر میاں کی وائس چانسلری کے زمانے میں شروع ہوئی وہ اب بھی ہوتی ہے۔ اس میں نارنجی، ارغوانی، سیاہ، سبز اور فاختئی رنگ کے گلاب بھی دیکھنے میں آئے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا گلاب باغ خاص کر دیکھنے کے لائق ہے۔ ہر سال دو ایک انعام ان کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ علی گڑھ کی زمین ویسے بھی گلاب کے لیے موزوں اور سازگار ہے۔ یونیورسٹی میں کہیں بھی نکل جائیے گلابوں کی بہار دکھائی دے گی۔

گلابوں کے علاوہ ذاکر میاں کے زمانے میں یونیورسٹی میں بوگن ویلیا کا بھی کثرت سے رواج ہوا۔ ہر طرف اس کی باڑھ نظر آتی ہے۔ جب بوگن ویلیا بہار پر آتی ہے تو بڑا دلفریب منظر ہوتا ہے۔ خاص طور پر ایس۔ ایس ہال کے باہر کمروں کی دیواروں کے متوازی یہ منظر دیکھنے کے لائق ہے۔ بوگن ویلیا کی بہار کے زمانے میں باہر کے جو سیاح علی گڑھ آتے ہیں وہ ایس ایس ہال کے باہر کے منظر کی ضرور تصویریں کھینچتے ہیں۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن نے بوگن ویلیا کے مختلف رنگ تخلیق کیے جن کی شہرت علی گڑھ کے باہر بھی پہنچی۔ قدرت نے پودے اور پھول پیدا کیے، انسان اپنی تخلیقی صلاحیت سے ان کے رنگ روپ اور ان کی جسامت میں تبدیلی کرتا ہے۔ چنانچہ اس وقت انسانی تصرّف کی وجہ سے ہزاروں قسم کے گلاب اور بوگن ویلیا موجود ہیں۔ ہر ملک میں رنگ برنگی تخلیق جاری ہے اور بوگن ویلیا کی اقسام میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ذاکر میاں کا تخلیقی ذہن انسانوں کے علاوہ نباتات کو بھی خوب سے خوب تر اور بہتر سے بہتر بناتا ہے۔ جب بہار کے گورنر تھے تو پٹنہ کے راج بھون میں تین سو سے اوپر مختلف گلابوں کی قسمیں تھیں۔ ان میں سوائے چند کے جو باہر سے منگوائے تھے سب وہیں کے گلاب باغ کے تھے۔

دیوگڑھ میں ایک بڑے مشہور گلابوں کی تخلیق کے ماہر ہیں جن کا نام مسٹر بھٹاچارجی ہے انھوں نے مختلف گلابوں کے میل سے نئے نئے رنگ تخلیق کیے ہیں۔ وہ پٹنہ کے راج بھون میں آئے تو ذاکر میاں کے گلابوں کے شوق اور ان کے انہماک کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ پٹنہ سے واپس جاکر انھوں نے اپنی ایک تخلیق کا نام "ذاکر حسین" رکھا ہے جو ہندوستان بھر میں اور ہندوستان کے باہر بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن نے بھی بوگن ویلیا کے ایک تخلیق کا نام "ذاکر یانا" رکھا جس میں گلابی اور نارنجی رنگوں کی آمیزش سے لطیف تدریجی کیفیت پیدا کی ہے۔ دونوں رنگ الگ الگ رہتے ہوئے ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔ بنگلور میں کروٹن نہایت عمدہ ہوتے ہیں۔ وہاں کے ایک ماہر نے ذاکر میاں کے شوق کو دیکھ کر جو پودوں اور پھولوں سے انھیں ہے اپنی ایک تخلیق کا نام "ذاکر حسین" رکھا ہے جس کی رنگا رنگی

میں لطیف ہم آہنگی ہے۔ جو ذوقِ نظر کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ راجہ صاحب بھدری نے جو پہلے ہماچل پردیش کے گورنر تھے اور گلے ڈیولس کے بڑے ماہر اور شوقین ہیں اپنی ایک تخلیق کا نام "ذاکر حسین" رکھا ہے۔ یہ ایک پھولدار درخت ہے جس کے پتے تلوار کی شکل کے ہوتے ہیں۔

اس وقت دہلی میں وائس پریسیڈنٹ کے گلاب باغ میں گلابوں کی چار سو سے زائد قسمیں موجود ہیں۔ دوست احباب ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے گلاب تحفتاً بھیجتے ہیں اس لیے کہ انھیں معلوم ہے کہ ذاکر میاں کو اس سے جو خوشی ہوتی ہے، وہ اور کسی تحفے سے نہیں ہوتی چنانچہ انگلستان، فرانس اور جرمنی سے گلاب تحفے میں آئے جو وائس پریسیڈنٹ کے گلاب باغ کی رونق ہیں۔ جب گلاب کا موسم ہوتا ہے تو اس گلاب باغ کی ہر کیاری اپنی بہار دکھاتی ہے۔

ذاکر میاں کو دوسرا شوق پرانے پتھر جمع کرنے کا ہے۔ ایسے پتھر جو کسی زمانے میں نباتاتی یا حیوانی زندگی سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعد میں کروڑوں سال زمین کے نیچے دبے پڑے رہنے سے کیمیاوی عمل کے باعث پتھر میں بدل گئے۔ ذاکر میاں کے پاس سب سے پرانا پتھر (فاسل) ۲۵ کروڑ سال پہلے کا ہے۔ اس پر ان درختوں کی پتیوں کا عکس ہے جن سے کوئلہ بنتا ہے۔ الجیریا سے ایک پتھر لائے ہیں جو ہو بہو گلاب کی شکل کا ہے۔ ویسی ہی گلاب کی سی پنکھڑیاں لیکن پتھر کی۔ اسے وہاں ریگستان کا گلاب کہتے ہیں۔ آسٹریلیا کے گورنر جنرل لارڈ کیسی نے ایک دودھیا پتھر بطور تحفہ بھیجا ہے جو نیلگوں رنگ کا ہے۔ یہ بھی کروڑوں سال پرانا ہے۔ روسی اکیڈمی کے رکن ونا گروڈاف نے ذاکر میاں کے فاسلوں کے ذخیرے کو دیکھا تو روس واپس جاکر یورال پہاڑ میں جو بلوری پتھر ہوتے ہیں ان کا ایک مجموعہ تحفے کے طور پر بھیجا جس میں رنگ برنگ کے کرسٹل ہیں۔ یہ بلوری پتھر بھی قدرت کا عجیب و غریب کارنامہ ہے۔ جماداتی فطرت کے انبار میں صرف کرسٹلوں میں نظم و ترتیب اعلیٰ درجہ کی ملتی ہے۔ یہی نظم و ترتیب (آرڈر) جمادات کے مقابلے میں نباتات میں بڑھتا ہے اور پھر انسان میں اس کا کمال نظر آتا ہے۔ کرسٹل میں ارتقا کے قانون کا ہمیں پہلا قدم دکھائی دیتا ہے۔

بلاشبہ ذاکر میاں فخرِ خاندان تو ہیں ہی لیکن اس سے بڑھ کر بہت کچھ ہیں۔ ان کی شخصیت کی حدود خاندان کے باہر بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی روح کی روشنی سے بہت سارے دل اور بہت سی محفلیں منور ہیں۔ اگر انھیں فخرِ قوم کہا جائے تو بہ زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا۔

سید عابد حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مردِ مومن، مردِ حق

ذاکر صاحب ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے طوفانی دور میں پلے اور بڑھے۔ اس طوفان و ہیجان کے زمانے میں جہاں بحرِ زندگی کی سطح پر ساحل سے ٹکر لینے والی تند و پرشور موجیں ابھریں وہاں قعرِ دریا میں اُن موتیوں نے بھی پرورش پائی جن میں بقول غالب دریا کا اضطراب محو ہوگیا تھا۔ ایک ایسا موتی جس کے سکون میں طوفانوں کی خاموش قوت چھپی ہوئی تھی، نوجوان ذاکر حسین تھا جو ۱۹۲۰ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے ایم۔ اے فائنل میں پڑھ رہا تھا۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کے ارتقا کی کہانی ۱۹۲۰ء سے شروع کرنے کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ یہ سال ان کی عمر کا نہایت نازک اور اہم موڑ تھا، جہاں سے ان کی ایک نئی زندگی شروع ہوئی اور ان کی شخصیت کی ایک نئی شان نظر آئی۔ اسی زندگی اور اسی شخصیت کا مجھے ذکر کرنا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی سال میری ملاقات ان سے ہوئی اور دوستی اور رفاقت کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو نصف صدی تک جاری رہنے کے بعد اب سے چار ہفتے پہلے ختم ہوگیا اور میری زندگی میں ایک اداس، سنسان خلا چھوڑ گیا۔ اس سارے عرصے میں ان کے نشو و نما کا حال میں قریب قریب شاہدِ عینی کی حیثیت سے بیان کر سکتا ہوں۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب میں میور سنٹرل کالج الٰہ آباد سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انگریزی ادب میں ایم۔ اے کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل ہوا تو سارا کالج ذاکر حسین کی شہرت سے گونج رہا تھا۔ وہ ایم۔ اے معاشیات کے دوسرے سال کے طالب علم تھے اور شعبۂ معاشیات میں جونیر لکچرر بھی۔ مجھے پہلی ملاقات میں نہیں تو دو چار ملاقاتوں میں اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ میں نے ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی صفات اور دلکش شخصیت کے بارے میں جو افسانوی روایتیں سنی تھیں وہ بڑی حد تک صحیح تھیں۔ مجھے ان کی ذہانت میں ایک طرف ادراک و وجدان کا اور دوسری طرف تفکر و تخیل کا ایک ایسا مرکب نظر آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آپ ان سے گفتگو کریں تو چشم زدن میں وہ بات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ ابھر کر سطح پر آتے تھے۔ وہ خود کسی

مسئلہ پر غور کریں تو اُن کی قوتِ فیصلہ بجلی کی طرح کوند کر صحیح حل کے مرکزی نقطے کو روشن کر دیتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ پورے دائرے میں پھیلتی تھی۔ ان کی تقریر میں بھی یہ خصوصیت تھی کہ پہلے سیدھی دل میں اتر جاتی تھی اور پھر استدلال کے ذریعے دماغ کو قائل کرتی تھی۔ ان کی شخصیت میں بڑی دلکشی تھی مگر یہ دلکشی اس وقت تک ہمہ گیر نہ تھی۔ جو لوگ ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے ان کے ہم جنس اور ہم رنگ تھے وہ بے اختیار ان کی طرف کھنچتے تھے مگر ناجنس ان سے بہت گھبراتے تھے اور ڈرتے تھے۔ بڑے بڑے زبردست حریفوں کو جب مقابلے اور مباحثے میں ان سے پالا پڑتا تو ان کے چبھتے ہوئے طنز و مزاح اور بے پناہ قوتِ مناظرہ کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہو جاتا سرسری نظر سے دیکھنے والے کے لیے ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک خوش باش، لااُبالی مزاج رکھتے ہیں، زندگی ان کے لیے کوئی گہرا، وزنی، سنجیدہ مقصد نہیں بلکہ ایک ہلکا پھلکا دلچسپ مشغلہ ہے۔

مگر چند ہی روز بعد ذاکر صاحب کی شخصیت کا ایک نیا پہلو جو اب تک دبا اور چھپا ہوا تھا ابھر کر نظروں کے سامنے آیا اور معلوم ہوا کہ اس بظاہر بے تہ، بے پروا نوجوان کے سینے میں ایک پرخلوص، پُرسوز اور پُرجوش دل ہے اور اس دل میں محکم ایمان، اٹل ارادہ اور اتھاہ ہمت و حوصلہ ہے۔

شروع اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طالب علموں کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کی دعوت دی تو لبیک کہنے والوں کے سربراہ ذاکر صاحب تھے۔ یہ منچلے معلم اور طالب علم سرکاری امدادی کالج کو خیرباد کہہ کر ایک آزاد تعلیم گاہ میں داخل ہو گئے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم کی گئی اور ہندوستانی مسلمانوں میں قومی تحریک کی ہراول بن گئی۔

اپنے دوست اور رفیق کار خواجہ عبدالحمید کے اصرار سے ذاکر صاحب اعلا تعلیم کے لیے جرمنی پہنچے جہاں وہ برلن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور مجیب صاحب آکسفورڈ سے بی۔اے کی آنرز کی ڈگری لینے کے بعد فن طباعت میں مہارت حاصل کر رہے تھے۔ برلن میں تین سال سے کچھ اوپر قیام کے دوران میں ذاکر صاحب کو وہ سازگار ماحول ملا جس میں نئی صلاحیتوں کے ابھرنے اور نئی قدروں کے نشو و نما پانے سے ان کی شخصیت میں بڑی وسعت گہرائی، اور پختگی پیدا ہو گئی۔ شعر و ادب سے انھیں پہلے ہی سے لگاؤ تھا۔ یہاں رہ کر فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری، ڈراما اور فن تعمیر کا ذوق پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ یونیورسٹی میں ان کا میدان مطالعۂ معاشیات تھا، لیکن اپنے خاص مضمون سے کہیں زیادہ دلچسپی وہ علم تعلیم اور فن تعلیم سے رکھتے تھے۔ انھیں میرے استاد پروفیسر ایڈوارڈ اشپرانگر سے جو فلسفۂ تعلیم کے جید عالم سمجھے جاتے تھے، گہری عقیدت تھی، بڑے شوق سے ان کے لکچر سنتے تھے۔ اور ان کی کتابیں

پڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ جرمنی کے مختلف حصّوں میں جو مدرسے تعلیم کے جدید ترین تصورات اور طریقوں کا تجربہ کرتے تھے انھیں وہاں جاکر غور و تحقیق کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تعطیل کے زمانے میں انھوں نے جرمنی کے مختلف علاقوں کے علاوہ انگلستان، فرانس، ڈنمارک، ناروے اور سویڈن کا سفر بھی کیا اور مغربی تہذیب کے مادّی، ذہنی اور روحانی مظاہر کو مختلف صورتوں میں دیکھا اور سمجھا۔ اپنے ذہن کو مغربی علم و عقل کی روشنی سے منور کرنے کے باوجود انھوں نے اپنے دل میں نورِ ایمانی کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔

ہندوستان واپس آکر ذاکر صاحب نے جامعہ ملّیہ کی قیادت کی باگ سنبھالی اور چند سال کے اندر اسے قومی تعلیم کی ایک خانقاہ بنا دیا جہاں وہ اور ان کے رفیق، گاندھی جی کے فیضان سے نئے زمانے کے سادھوؤں کی طرح صاف ستھری فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے اور بچّوں اور نوجوانوں کو خدا پرستی، انسان دوستی اور وطن پروری کی تعلیم دیتے تھے۔ اگلے تیئیس ۲۳ سال میں ذاکر صاحب نے جامعہ ملّیہ کے اندر تعلیم کو جس اصول کے مطابق چلایا وہ "کام کے ذریعے سیکھنے" کا اصول تھا۔ "کام" کا تصور ان کے یہاں محض ذہنی نہیں بلکہ بڑی حد تک روحانی تھا۔ اس کا ذہنی عنصر انھوں نے جدید مغربی ماہرینِ تعلیم خصوصاً کیرشن اشٹائنر سے لیا تھا اور روحانی عنصر مہاتما گاندھی سے اور ان دونوں کے امتزاج سے خود اپنے نظریۂ تعلیم کی تشکیل کی تھی۔ اسی نظریے کے سانچے میں انھوں نے بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم ڈھالی تھی جو ذاکر حسین اسکیم کے نام سے مشہور ہوئی۔

اگر ہم اس نظریے کو چند لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم نام ہے کسی قوم کی روحانی اور تہذیبی قدروں کو اس کی نئی نسل تک اس طرح پہنچانے کا کہ وہ اس کی زندگی کا جز بن جائیں۔ یہ قدریں مجسم شکل میں قوم کی تہذیبی میراث کے مختلف شعبوں میں موجود ہوتی ہیں جیسے مذہب، اخلاق، علم، آرٹ وغیرہ۔ معلّم کا کام یہ ہے کہ ان قدروں کو پہلے خود اپنا لے اور پھر اپنے شاگرد بچّوں اور نوجوانوں کو ان کے حاصل کرنے میں مدد دیں۔ قدروں کے حصول کا موثر ذریعہ صرف "کام" ہے۔ یعنی مذہب صرف مذہبی عمل سے اخلاق صرف اخلاقی برتاؤ سے، علم صرف علمی تجربے سے اور آرٹ صرف آرٹ کی مشق سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ذاکر صاحب نے جامعہ کو ایک نمونے کے "کام" کا مدرسہ بنا دیا تھا جہاں کتابی درس کم سے کم ہوتا تھا اور تعلیمی قدر و قیمت کی حامل عملی سرگرمیاں زیادہ سے زیادہ دکھائی دیتی تھیں۔ کام ـــ مفید منظم ماہرانہ کام ـــ ذاکر صاحب کے نزدیک صرف تعلیم و تعلّم کا آلہ ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ کہیں بلند و برتر شے ہے۔ اسی سے انسان زندگی کا لطف اٹھا سکتا ہے اسی سے بحیثیت فرد کے اور بحیثیت سماج کے رکن کے اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کر سکتا ہے اور اسی سے نجاتِ روحانی اور معرفتِ الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔

ہمیں اسی فلسفۂ زندگی کی طرف جو ذاکر صاحب بحیثیت معلم کے رکھتے تھے اس وجہ سے اشارہ کرنا پڑا کہ وہ اپنے کام اور اپنی ذات کو ایک سمجھتے تھے اس لیے ان کی زندگی بحیثیت انسان کے بامعنی طور پر صرف اسی فکر و نظر کے پس منظر میں دکھائی جا سکتی ہے جو بحیثیت معلم کے ان کی خصوصیت تھی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت میں جو وسعت اور رنگارنگی یورپ کے قیام سے پیدا ہوئی تھی اس کو وحدت اور ہم آہنگی اس ریاضت سے نصیب ہوئی جو انھوں نے جامعہ کی تعلیمی خانقاہ کے مرشد کی حیثیت سے کی تھی۔ مختلف انسانوں کی وضع نفسی کے اس نقشے کے مطابق جو ایڈوآرڈ اشپرانگر نے ترتیب دیا ہے، ذاکر صاحب "ایک سماجی انسان" بن گئے یعنی ایک ایسے شخص جس کی وضع نفسی میں غالب رجحان خلق خدا کی خدمت اور محبت کا ہو۔ اگرچہ ان کی شخصیت کے مرقع میں مذہبی عقیدت، فکر و نظر، ذوقِ جمال کے گہرے رنگ موجود تھے لیکن اس کی ساری زمین انسان دوستی کے رنگ میں رچی ہوئی تھی۔ اس کی دو بڑی علامتیں تھیں، ایک یہ کہ ان کے لیے انسان سے خواہ وہ فرد کی شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کرنا محض مذہبی یا اخلاقی فرض نہ تھا جس کے لیے شعور اور ارادے کی ضرورت ہو بلکہ ان کی فطرت کا قانون تھا جو بلا شعور اور بلا ارادہ کام کرتا تھا۔ میرے علم و یقین میں انھیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی زندگی کو قومی خدمت کے لیے وقف کیا ہے اور اس میں کسی قسم کے ایثار یا قربانی سے کام لیا ہے اگر احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود ایک سمت بہہ رہا ہے اور انھوں نے کہا کہ اچھا ہے، بہنے دو۔ ان میں "خودی" اور "بےخودی" اس طرح گھل مل کر ایک ہوگئی تھی کہ کسی انسان کے مقابلے میں خواہ وہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کا ہو انھیں احساسِ کمتری اور احساسِ برتری کی کش مکش سے گزرنا، خود نمائی اور خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑا۔ نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے تھے کہ جیسے برسوں کا دوست ہو۔ انسان کو وہ کتاب سمجھ کر اس کی تنقید یا تحلیل نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی طرح بحرِ وجود کا ایک قطرہ جان کر جیسا بھی ہو سارے کا سارا لے لیتے تھے اور اپنے آپ کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے تھے۔

ذاکر صاحب جامعہ ملیہ میں معلموں اور طالب علموں کو بہت جانچ اور پرکھ کر لیتے تھے۔ جانچ اور پرکھ ان کی ذہانت اور قابلیت سے کہیں زیادہ ان کی شرافت اور انسانیت کی ہوتی تھی۔ دو ڈھائی سو اشخاص کا یہ گروہ ایک متحد، ہم آہنگ خاندان تھا۔ افسرِ خاندان کی طرح ذاکر صاحب ہر چھوٹے بڑے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے اور ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیتے تھے۔ ان کا ہر شخص کے ساتھ ایک مخصوص طریقہ تھا جو نہ صرف ان کی فطرتِ انسانی کے ادراک پر بلکہ ایک حد تک ان کی وجدانی بصیرت پر بھی مبنی تھا۔ کسی کو وہ کڑی تنقید سے اکساتے تھے۔ کسی کی تعریف و تحسین سے ہمت بڑھاتے

تھے، کسی کی قدم قدم پر رہنمائی کرتے تھے اور کسی کو تنہا چھوڑ دیتے تھے کہ جاؤ اپنی راہ خود ڈھونڈو۔

ان کی ہمدردی اور محبت کا یہ حال تھا کہ کسی رفیق یا شاگرد کو ذرا سی بھی تکلیف ہو تو بے چین ہو جاتے تھے اور ہر امکانی طریقے سے خواہ وہ کتنا ہی مشکل اور صبر آزما کیوں نہ ہو اسے دور کر کے رہتے تھے۔ مگر اسی محبت کا ایک روپ بظاہر بے دردی کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا تھا۔ اگر ان کا کوئی عزیز ساتھی ان مصیبتوں اور مشکلوں سے جن کا جامعہ کے لوگوں کو ایک چوتھائی صدی تک مقابلہ کرنا پڑا۔ گھبرا کر جامعہ کو چھوڑنا چاہتا تھا تو وہ ان اخلاقی بندھنوں کو جنھوں نے اسے ان کی ذات اور ان کے ادارے سے وابستہ کر رکھا تھا اس طرح کس دیتے تھے کہ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ مگر یہ صورت بہت کم پیش آتی تھی۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا تھا کہ جب کوئی رفیق نیم فاقہ کشی کی زندگی سے تنگ آ کر ان کے پاس جاتا کہ فریاد، شکایت یا طنز و طعن کے ذریعے اپنے دل کا بخار نکالے تو وہ خود ان کی حالت دیکھ کر اور ان کے صبر و حلم سے شرمندہ ہو کر یا ان کی محبت اور اعتماد سے خوش ہو کر لوٹتا۔ وہ اسے روٹی کے بدلے "کام" دیتے تھے اور وہ فخر و مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا۔

میں نے کہا تھا کہ طالب علمی کے زمانے میں جہاں ذاکر صاحب کی شخصیت کی موہنی اچھوں کو ان کی طرف کھینچتی تھی وہاں ان کے بحث و استدلال کی کاٹ اور طنز و مزاح کی دھار بُروں کو ان سے دور رکھتی تھی۔ مگر اب تو کچھ معلمی کے پیشے کے روحانی تقاضے سے، کچھ صوفیۂ کرام کی تعلیم سے اور کچھ گاندھی جی کی مثال سے ان میں بے حد برداشت اور رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ معلم کی حیثیت سے وہ ہر شخص کی سیرت کے بُرے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اچھے پہلو ڈھونڈ نکالتے تھے اور ان کی قدر اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی کے پیرو کی حیثیت سے وہ بُرے آدمی اور اس کی برائی میں اسی طرح فرق کرتے تھے جیسے بیمار اور اس کی بیماری میں۔ برائیوں سے اور خصوصاً کمینہ پن اور بے وفائی سے انھیں نفرت تھی مگر بُرے کام کرنے والوں سے اس قدر درگزر، محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کرتے تھے کہ اگر اس میں ذرا بھی انسانیت ہوتی تو اس کی سیرت کی کایا پلٹ ہو جاتی۔

فیاضی اور سیرچشمی میں ان کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اس بائیس تیئیس برس کے عرصے میں جب وہ جامعہ ملیہ میں پچھتر روپے ماہوار پاتے تھے اور اس تنخواہ کے ساتھ نجی جائداد کی تھوڑی سی آمدنی ملا کر تنگی سے بسر کرتے تھے، نہ صرف مستحق طالب علموں کی مدد کرتے تھے بلکہ کسی مستحق یا غیر مستحق سائل کے سوال کو نہیں ٹالا خواہ ان کو اس کی وجہ سے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔

ذاکر صاحب کی خوشی اور کامیابی کی زندگی اسی روز سے ختم ہو گئی جب وہ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے اصرار سے جامعہ ملیہ کو چھوڑ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر گئے ۔ انھوں نے خوف وہراس اور غم و غصے کے اس کابوس کو جو تقسیم ہند کے بعد سے یونیورسٹی پر مسلط تھا ، دور کیا ، بدخواہی اور مخالفت کے اس طوفان کو جو اس کی سمت چاروں طرف سے امڈ رہا تھا روکا ، اور اس کی مالی اور تعلیمی حالت کو بہت کچھ درست کیا ، مگر ان کی یہ سعی کہ جس طرح جامعہ ملیہ میں انھوں نے اتحاد اور یک جہتی کی روح پھونک دی تھی اسی طرح مسلم یونیورسٹی کو ایک ہم رنگ اور ہم آہنگ ادارہ بنا دیں ۔ مشکور نہ ہو سکی ۔ علی گڑھ میں انھیں جامعہ ملیہ جیسی کامیابی نہ ہونے کی دو وجہیں ہیں ، ایک وہاں پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد ان پر قلب کا شدید دورہ پڑا اور ان کی صحت جو پہلے بھی کچھ بہت اچھی نہ تھی ، نہایت کمزور ہو گئی اس لیے وہ اس قدر محنت اور لگن سے جو اتنی بڑی اقامتی یونیورسٹی کو چلانے کے لیے درکار تھی ، کام نہ کر سکے ، دوسرے جن رفیقوں سے انھیں واسطہ تھا وہ ان کے منتخب کیے ہوئے نہ تھے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرنی تھی وہ ان کا بنایا ہوا نہ تھا ۔

اس کے بعد جب وہ قومی خدمت کے تقاضے سے پہلے بہار کے گورنر ، پھر ہندوستان کے نائب صدر اور آخر میں صدر بنے تو ان کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا ۔

دنیا نے پبلک زندگی کے پیمانے سے ناپ کر ان کی عظمت کا اعتراف کیا اور ان کے سر پر کامیابی کا تاج رکھا ۔ مگر ان کے دل کی دنیا میں بے حاصلی اور ناکامی کے احساس سے افسردگی چھائی رہی ۔ ذاکر صاحب بنیادی طور پر ایک معلم تھے مگر یہاں انھیں سابقہ سیاست کاروں سے تھا ۔ جنھیں تعلیم دینا بہت مشکل کام ہے ۔ معلم صرف اخلاقی اثر ڈال سکتا ہے اور سیاست کار ، ہر اثر سے تو متاثر ہو سکتے ہیں مگر (استثنائے چند) اخلاقی اثر کو قبول نہیں کرتے ۔ پھر بھی چونکہ ذاکر صاحب نے اس آخری دور میں بھی عوام کی تعلیم کے لیے اتنا کچھ کیا کہ ملک کی تاریخ میں بہت کم لوگوں نے کیا ہوگا ۔ اس لیے وہ خواہ کتنے ہی بددل کیوں نہ ہوں ، مایوس ہرگز نہ تھے ۔ انھیں یقین تھا کہ جب ملک کے عوام تعلیم پا جائیں گے تو وہ خود اپنے سیاسی رہنماؤں کو حسب ضرورت سبق پڑھا سکیں گے ۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا ذاکر صاحب میں اقبال کے مردِ مومن اور گاندھی جی کے مردِ حق ، دونوں کی شان نظر آتی تھی ۔ انھوں نے " فقیری میں بھی شاہی " اور

شاہی میں بھی فقیری کی۔ انھوں نے کبھی "تلوار پر بھروسا" نہیں کیا، عمر بھر "بے تیغ" لڑتے رہے۔ انھوں نے کبھی تقدیر کی آڑ نہیں لی، بلکہ خود "تقدیر الٰہی" بن کر اپنی قوم کا مقدر بدلنے کی کوشش کی۔ خدا ان کی روح کو سکون ابدی بخشے اور ہم سب کے دل میں وہ مبارک بے چینی اور بے تابی پیدا کرے جو سکون ابدی کی راہ دکھاتی ہے۔

خواجہ غلام السیّدین

مردِ مومن

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے آوارہ نہ کر اپنی خودی کو کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ (ان کی تعداد بے شمار ہے) جو ہوا کے رُخ کو دیکھ کر چلتے ہیں اور پانی کے بہاؤ کو دیکھ کر تیرتے ہیں اور دوسرے وہ (اور یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں لیکن زندگی میں انھیں کے وجود سے نمکینی ہے) جو اپنی عقل اور ضمیر کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرتے ہیں اور باوجود مخالفت اور مشکلات کے اس راہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ دنیاوی کامیابی اور عیش و آرام اکثر پہلوں کے حصّے میں آتے ہیں لیکن حقیقی نیک نامی اور خدمت کی سعادت دوسروں کے قدم چومتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے زمانے کو نئی قدروں سے آشنا کرتے ہیں۔ اور انھیں کے طفیل زندگی کی نبض زیادہ تیز، اس کے امکانات زیادہ وسیع اور اس کی معنویت زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ ذاکر صاحب کا شمار ایسے ہی خلّاق لوگوں میں ہے۔

قدرت انسانوں کے معاملے میں کبھی اپنی جز رسی کا اظہار کرتی ہے کبھی فیاضی کا۔ بیشتر انسان تو دل و دماغ کے اعتبار سے اس قدر گھٹیا ہوتے ہیں کہ ان کے وجود کی مصلحت کو سمجھنا ہی مشکل ہے لیکن کبھی کبھی قدرت بعض انسانوں کو ایسی فیاضی کے ساتھ نوازتی ہے اور اپنے خزانے ان پر اس قدر بے دریغ نچھاور کرتی ہے کہ عقل حیرت میں رہ جاتی ہے اور ایمان کی لو زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ "اچھے انسان" کی جھلک ایسے لوگوں کی ذات ہی میں دکھائی دیتی ہے اور اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت کے سامنے "انسان" کا کس قدر بلند تصور ہے جس شاعر نے نیازمندانہ گستاخی سے دستِ قدرت کو طعنہ دیا تھا کہ مٹی کے کھلونے بنانا تیرے شایانِ شان نہیں۔ (لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را!) اس نے بے صبری اور مصلحت ناشناسی کو یہ کہہ کر تسکین بھی دی تھی کہ

شو لو میدز یں مشت غبارے پریشاں جلوۂ ناپائیدارے



مصر کے جمال عبدالناصر کے ہمراہ



یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو کے ہمراہ



ہندوستان کے نائب صدر کی حیثیت سے حلف لیتے ہوئے۔



سعودی عرب کے شاہ فیصل کے ہمراہ



خان عبدالغفار خاں کے ہمراہ



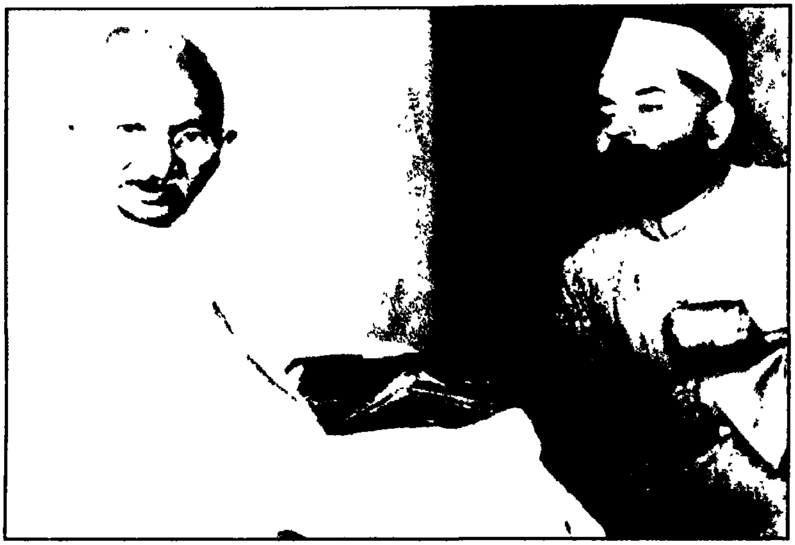
کٹھمنڈو میں نیپال کے راجہ مہندر کے ہمراہ



ونوبا بھاوے کے ہمراہ



جامعہ کے یوم تاسیس ۱۹۶۴ء کے موقع پر محمد مجیب اور اختر حسن فاروقی کے ہمراہ



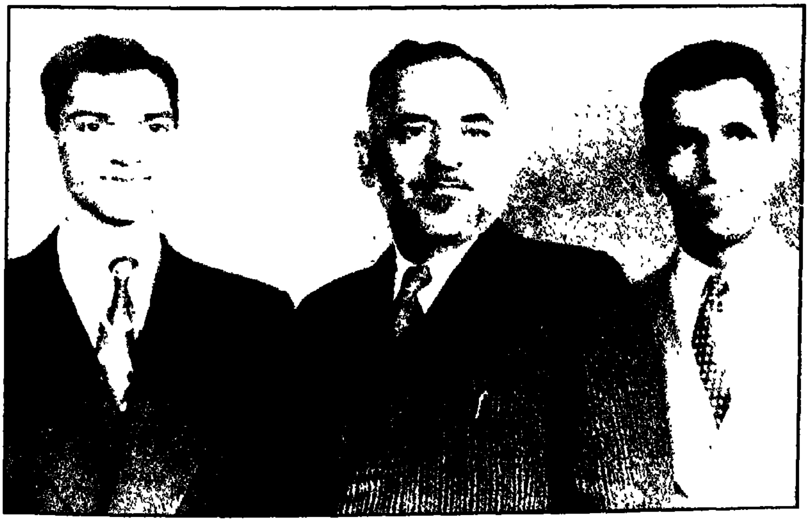
مہاتما گاندھی کے ہمراہ



جواہر لال نہرو کے ہمراہ



دوسری بیسک ایجوکیشن کانفرنس، جامعہ ۱۹۴۱ء
راجندر پرساد، عبدالمجید خواجہ، خواجہ غلام السیدین، ذاکر حسین، جی، سی، چٹرجی



دوستوں کے ہمراہ — عبدالرؤف، اکرام خاں



علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر
کرنل بشیر حسین زیدی (شیخ الجامعہ) اور نواب چھتاری (امیرِ جامعہ) کے ہمراہ



جامعہ ملیہ اسلامیہ: پہلا جلسۂ تقسیم اسناد ۱۹۲۱ء (جلسہ کا ایک منظر:)
حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ابوالکلام آزاد، ٹی۔ اے۔ کے شیروانی، مولانا شوکت علی



تین بھائی۔ ذاکر حسین، یوسف حسین، محمود حسین

چو فطرت می تراشد پیکرے را تمامش می کند در روزگارے

جس طرح ہلال کی تنگنائے میں بدر کامل کا جمال جہاں آرا پوشیدہ ہے اسی طرح اس کم مایہ انسان میں وہ حیرت ناک امکانات موجود ہیں جن کا جلوہ ہمیں کبھی کبھی بعض خاصان خدا کی ذات میں نظر آجاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر ہمیں اس مہ و افلاک سے بلند تر منزل کا سراغ ملتا ہے جس کی طرف بڑھنے کی کوشش انسان ٹمٹماتی آنکھوں اور لڑکھڑاتے قدموں سے کرتا رہا ہے۔ لیکن یہ راستہ اس قدر صبر آزما اور دشوار گزار ہے کہ ہزاروں مسافر ہر ہر قدم پر تھک کر رہ جاتے ہیں۔ صرف وہ تھوڑے سے لوگ اس منزل کے قریب پہنچ پاتے ہیں جن کو تائید الٰہی حاصل ہے۔ . . . ذاکر صاحب کا شمار انھیں گنے چنے لوگوں میں ہے۔ ان پر قدرت نے صورت اور سیرت، دل اور دماغ، شرافت اور ذہانت، دوستی اور قیادت کی غیر معمولی صفات ارزاں فرمائی ہیں لیکن وہ ان کو اس استغنا اور خود اعتمادی اور سادگی کے ساتھ برتتے ہیں کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کا اندازہ نہیں ہوتا اور گہری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کی بلندی اور عظمت گراں نہیں گزرتی! یہ چیز بجائے خود انسانی شرف کے لیے ایک بڑی سخت کسوٹی ہے۔ ذاکر صاحب ان لوگوں میں نہیں جو اپنی بزرگی کی دوکان لگا کر بیٹھتے ہیں اور خریداروں کو باصرار وہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو شاید خود بھی اپنی قدر و قیمت کا پورا احساس نہیں یا اگر ہے تو ایسا ہی جیسا گلاب کے پھول یا شب ماہتاب کو ہوتا ہے یعنی ان کے لیے خوشبو دینا اور روشنی پھیلانا عین فطرت ہے۔ اس کے لیے کسی تعریف یا معاوضہ کا مطالبہ ان کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا!

میرا خیال ہے اور غالباً ذاکر صاحب کے بہت سے دوست اور جاننے والے اس سے اتفاق کریں گے کہ وہ جس شعبۂ زندگی کو اپنے لیے اختیار کرتے اس میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت شہرت، مقبولیت، اور کمال حاصل کر سکتے تھے۔ ایک اتفاق تھا کہ وہ ڈاکٹر ہوتے ہوتے رہ گئے، طب کی تعلیم شروع کر کے چھوڑنی پڑی۔ ورنہ عجب نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کا زخم مندمل کر دیتے۔ فطرت کی ستم ظریفی نے ان کو ہندوستان کے غلام آباد میں پیدا کیا۔ اگر وہ کسی آزاد اور قدر شناس ملک میں پیدا ہوتے تو اس کی سیاسی زندگی میں ان کے لیے مقام اعزاز مخصوص ہوتا اور وہ ملک کی سیاست اور اخلاق کا ٹوٹا ہوا ناتہ جوڑنے کا فرض انجام دیتے۔ اگر وہ وکالت کا دولت آفریں پیشہ اختیار کرتے تو ان کی تقریر کی قابلیت ان کی نکتہ رسی، ان کی حاضر جوابی، حشو و زوائد سے گزر کر بنیادی امور کی گرفت ان کو صف اول میں جگہ دلاتی۔ ان میں سمجھ داری ہے، خلوص ہے، ذاتی کشش ہے، اور یہ تینوں صفات مل کر انسان کو

ایسی قوت بخشتی ہیں کہ وہ جس کام کو ہاتھ میں لے اسے ایک امتیازی شان کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ سمجھداری راستہ دکھاتی ہے۔ خلوص کا انعام تائیدِ الٰہی ہے اور ذاتی کشش کی وجہ سے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کی رفاقت، وفاداری اور اعتبار کی دولت میسر آتی ہے اور کام کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ . . . تعلیم کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اپنی ذات کے لیے اس کو اختیار کیا۔

لیکن کسی غیر معمولی قابلیت کے شخص کے لیے اس میدان کو پسند کرنا بجائے خود ایک خلاف توقع سی بات ہے کیونکہ اس میں بڑے صبر اور ایثار کی ضرورت ہے، انسان دوستی اور جذبۂ خدمت کی ضرورت ہے اور نفس کو مار کر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صفات بالعموم ایسے لوگوں میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ اپنی ذہنی قابلیت کی بہت اونچی قیمت لگاتے ہیں اور اسے بہت جلد دولت، قوت رسوخ، شہرت اور لیڈری کے سکوں میں وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے لیے عام طور پر سیاست یا وکالت یا ملازمت کا میدان پسند کرتے ہیں جہاں یہ تمام چیزیں آسانی سے ہاتھ آ سکتی ہیں یا کم سے کم ایک دل کش سراب کی طرح دیتر س کے اندر معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے بیشتر لوگ ان چمک دار نگینوں کی خاطر اپنا سب کچھ بیچ دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل کی گرمی اور دماغ کی روشنی جو شاید ان کے ہم جنسوں کی شبِ تاریک کو سحر کرتی محض ان کی زندگی کی تنگ کوٹھری کو گرم اور روشن رکھتی ہے۔ لیکن ذاکر صاحب ان غیر معمولی لوگوں میں سے ہیں جن کا خیال ہے کہ قوموں کے بنانے میں معلم کے خاموش اور جاں کاہ کام کی اہمیت ارباب سیاست کی تگ و دو اور شور و غل سے زیادہ ہے یعنی ان کو آتش بازی اور تاروں کی ٹھنڈی روشنی کا باریک فرق معلوم ہے! معلم انسانوں کے دل و دماغ میں ان بنیادی صفات کا بیج بو سکتا ہے جن پر نہ صرف پائدار سیاسی کامیابی کا انحصار ہے، بلکہ جن کے بغیر سچی انفرادی اور جماعتی شرافت کا حصول ناممکن ہے۔ اگر افراد میں یہ صفات موجود نہ ہوں تو سیاست کی ساری کش مکش اور جد و جہد ایسی ہے جیسے ریت میں ہل چلانا یا سمندر کے پانی کو بلو کر اس میں سے دودھ نکالنے کی کوشش! ذاکر صاحب کا یہ انتخاب کار بجائے خود ان کی سیرت کے ایک روشن اور مرکزی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب انسان کے سامنے بہت سی راہیں کھلی ہوں اور ہر ایک زندگی کی کامرانیوں کو پیش کرتی ہو اور وہ تکلیف کو راحت پر، خدمت کو حکومت پر، ایثار کو دولت پر ترجیح دے تو وہ عقل دنیادار کی نگاہ میں عقل کا دشمن ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ اور انسان کی ترقی میں ایسے جنون کا مقام عقل سے کہیں بلند ہے:

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے جس نے سئے ہیں اور اک کے چاک

کو روپیہ کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے اور کس طرح اس فکر میں ان کا دن کا آرام اور رات کی نیند جاتی رہتی ہے۔ جامعہ پر بارہا ایسے کٹھن وقت آئے ہیں جب بے زری کی پریشانی ایمان کی قوت سے ٹکرائی ہے۔ لیکن یہ مردِ مومن کبھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوا کہ روپیہ کی خاطر جامعہ کے مخصوص اور آزاد نصب العین پر آنچ آنے پائے۔ ایک دفعہ ذاکر صاحب جامعہ جوبلی کے سلسلہ میں چندہ کرنے کے لیے رامپور گئے تھے۔ اس موقع پر انھوں نے جلسہ عام میں جو تقریر کی اس میں (دلچسپ بات ہے نا؟) چندہ مانگنے سے زیادہ اہل دولت کی تعلیم مدنظر تھی اور انھیں ان کے فرائض کا احساس دلانا۔ تقریر کا بے پناہ اثر ہر کسی کے چہرے پر نظر آتا تھا۔ بلکہ کسی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر جامعہ کا کام اچھا نہیں ہے اگر چھان بین کرنے کے بعد آپ کو اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہے تو کسی سعی و سفارش سے آپ اسے ایک پیسہ نہ دیجئے لیکن اگر اس کی پچیس سالہ جدوجہد کو آپ نے دیکھا ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کام ملک اور قوم کے لیے مفید ہے تو جامعہ کے کارکنوں کا فرض نہیں کہ دست سوال آپ کے سامنے دراز کریں۔ آپ کا اپنا کام ہے کہ آپ اس کی امداد کے لیے ہاتھ بڑھائیں جو قوم اپنے ایثار پیشہ خادموں کی قدر نہیں کرتی اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں نہیں سوچتی اسے بشارت ہو کہ اس میں اس قسم کے کام کرنے والے پیدا ہی نہ ہوں گے اور اس کی زندگی محض کاروبار، دولت آفرینی یا باہمی جنگ وجدل کے دلدل میں پھنس کر رہ جائے گی۔ عام طور پر لینے والے کا ہاتھ نیچے اور دینے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے لیکن دولت مند کی سعادت یہ ہے کہ وہ علم اور تعلیم کی امداد کرتے وقت اپنا ہاتھ نیچے رکھے اور لینے والوں کا ہاتھ اوپر رہے۔ ذاکر صاحب کے فقر میں بھی یہ انوکھی شان ہے کہ اگر خانہ کعبہ کا دروازہ نہ کھلے تو وہ الٹے واپس آجاتے ہیں اور اسی کا فیضان ہے کہ ارباب دولت اور مشاہیر سیاست ان سے جھک کر ملتے ہیں۔ انھیں مرعوب نہیں کرسکتے۔ ایک موقع پر جامعہ کا اصول سیاست خود انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "مستقل سرمایہ جامعہ کا نہ ہے نہ کبھی ہوگا۔ اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمت اور ایثار اور قوم کی ہمدردی ہے۔ ممکن ہے آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں مگر میرے نزدیک تو یہ سرمایہ لازوال سرمایہ ہے اگر جامعہ ملک و قوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی۔ لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانون قدرت اسے زندہ رکھے گا اور دنیا کی کوئی قوت اسے فنا

ذاکر صاحب کے تعلیمی خیالات اور منصوبوں اور زندگی کے اصولوں پر مفصل بحث کرنے کے لیے ایک مفصل کتاب درکار ہے۔ اس وقت میرا مقصد محض چند ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہے جن کا تعلق ان کے تعلیمی کام اور ان کی ذات دونوں سے ہے۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے اصول اور عمل، عقیدہ اور پالیسی میں ہم آہنگی ہے جن کا دل ان کے دماغ سے مصروف پیکار نہیں رہتا اور زبان دل کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کی تمام شخصیت میں وہ توازن جاری اور ساری ہے جو یونان کے فلاسفہ اور اسلام کے معلمین اخلاق کی نظر میں انسانیت کا بہترین جوہر ہے۔ اس لیے ذاکر صاحب کی شخصیت کو سمجھ لینے سے ان کے تعلیمی خیالات کی کنجی بھی ہمارے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

میرے خیال میں ذاکر صاحب کی سب سے نمایاں صفت انسانی زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ ہے۔ وہ کاموں اور مقصدوں کی اضافی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگاتے ہیں بہت سی چیزیں جو دوسرے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں ان کی نگاہ اور ان کے دل کو کبھی مرعوب نہیں کر سکتیں۔ یہ بظاہر معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل ایک کمیاب صفت ہے اور خوش نصیب ہے وہ انسان جو آزمائشوں اور تحریصوں کی یورش میں اپنے نظام اقدار کو درست رکھے اور اس کی حفاظت کر سکے۔ دراصل تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ انسانوں کو قدروں کی پرکھ سکھائے۔ اس لیے ایک اچھے معلم کے ذہن میں انسان اور اس کی دنیا کی صحیح تصویر ہونی چاہیے تاکہ وہ اہم اور غیر اہم، اصلی اور نقلی، سچی اور جھوٹی باتوں میں تمیز کر سکے۔ اگر اس کے خیال اور عمل میں غلط اور کم عیار چیزوں کی عزت اور محبت بسی ہوگی تو اس کے شاگرد بھی خود بخود انھیں چیزوں کا احترام کریں گے۔ ذاکر صاحب کی عظمت بحیثیت ایک معلم کے دراصل اس وجہ سے نہیں کہ ان کو موجودہ اور قدیم تعلیمی اصولوں اور طریقوں سے بہت اچھی واقفیت ہے یا انھوں نے ایک بہت مشہور درسگاہ کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کو پروان چڑھایا ہے بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات ہماری بہترین اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی حامل ہے اور عصر حاضر کے شیطانی ہیجان میں انھوں نے اپنے مذاق سلیم اور احساس صالح کو قائم رکھا ہے اور یہ چیز علم اور عمل کے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ وقیع ہے!

ذاکر صاحب کی قدروں کا اندازہ آپ کو دو مثالوں سے ہو جائے گا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تعلیم کے میدان میں دولت کو علم کا خادم ہونا چاہیے۔ علم کو دولت کا دست نگر نہیں بنانا چاہیے۔ اگر ارباب دولت و حکومت اپنی دولت یا قوت کے بل پر تعلیم گاہ یا تعلیمی نظام

پر قابض ہو جائیں اور اس کی آزادی کو چھین کر اپنا آلۂ کار بنا لیں تو تعلیم کی روح مردہ ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنے اصل مقصد کو پورا نہیں کر سکتی۔ ہندوستان میں تعلیم پر حکومت کا، مغربی ممالک میں دولت اور حکومت دونوں کا تسلط رہا ہے اور اس کے نتائج نگاہ عبرت نے بار بار دیکھے ہیں لیکن ذاکر صاحب کی طرح کم لوگوں کو توفیق ہوئی کہ زبان سے نہیں (وہ تو آسان ہے!) عمل سے اس خطرے کے خلاف آواز بلند کرنے کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے انھیں ہمیشہ چندہ کرنے کی ضرورت رہتی تھی۔ ہندوستان میں کسی حساس شخص کے لیے یہ کام بہت مشکل اور صبر آزما ہے کیونکہ اس میں مانگنے والے کو مجبوراً اپنی خودداری کو آلودہ کرنا پڑتا ہے لیکن ذاکر صاحب کا چندہ جمع کرنے کا ایک نرالا انداز ہے اور اس کوئلوں کی دلالی میں بھی انھوں نے اپنے ہاتھوں کو پاک اور صاف رکھا ہے اور جامعہ کی روح کی عفت کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ابتدا میں تو انھوں نے اس مقصد کے لیے ارباب ثروت کی طرف رجوع ہی نہیں کیا بلکہ غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کا ایک ایسا حلقہ "ہمدردان" قائم کیا جو تھوڑا تھوڑا چندہ باقاعدگی کے ساتھ دیتے تھے اور رسالہ ہمدرد جامعہ کے ذریعے درسگاہ کے حالات اور اس کی ترقی اور مشکلات سے آگاہ رہتے تھے۔ اس طرح ابتدا سے جامعہ کا تعلق عوام کے ساتھ قائم ہو گیا جو ہر قومی ادارے کی صحت کے لیے ایک شرط لازم ہے۔ ورنہ اندیشہ یہ ہوتا ہے (جیسا بعض اداروں میں ہوا) کہ وہ ایک مخصوص اور غیر ذمہ دار گروہ کی اجارہ داری بن کر رہ جائے گا اور زندگی کی صالح تحریکیں اس پر اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔ وہ جامعہ کے لیے ارباب دولت سے امداد کے خواہاں ہوتے ہیں تو ان کے انداز سوال میں عاجزی نہیں ہوتی گویا وہ کسی کا احسان اٹھا رہے ہیں۔ وہ دولت کے سامنے جھکنا جانتے ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دولت کی نجات اور سعادت اسی میں ہے کہ وہ علم کی خدمت کرے اور نیک کاموں کے قدم چومے ورنہ وہ اہل دولت کے گلے میں لعنت کا طوق ہے! ایک دفعہ ایک رئیس نے امداد کا وعدہ کر کے پورا نہیں کیا۔ رقم اچھی خاصی تھی اور اس کے نہ ملنے سے ان کے رفقائے کار کو پریشانی ہوئی اور انھوں نے مشورہ دیا کہ دوبارہ ملیے اور تقاضہ کیجیے۔ لیکن ذاکر صاحب کی پیشانی استغنا پر شکن نہ پڑی اور انھوں نے صرف اتنا کہا کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ لوگ خود خوشامد کریں گے اور چندہ دیں گے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ اگر نہ دیں گے تو؟ ذاکر صاحب نے فوراً اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا جس کی ظرافت میں بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی گہری حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے: "نہ دیں گے تو خود ان کی ہوا خیزی ہو جائے گی!" یہ بات نہیں کہ ان کو روپیہ کی قدر یا اس کی پروا نہیں۔ جن لوگوں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر اداروں کو چلایا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے کارکنوں

نہیں کر سکے گی۔"

شاید ذاکر صاحب ان الفاظ کو کہتے وقت شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن شریف کے اس اٹل اصول کی تفسیر کر رہے تھے کہ:

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ

اسی قسم کی ایک دل میں چبھنے والی بات انھوں نے اس یادگار موقع پر کہی تھی جب اوکھلے میں جامعہ کی شاندار عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا (ذاکر صاحب کے ندرت تخیل کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ انھوں نے سنگ بنیاد مشاہیر ہند میں سے کسی سے نہیں رکھوایا بلکہ یہ عزت جامعہ کے سب سے کم سن طالب علم کے حصّے میں آئی۔ دکھانا یہ مقصود تھا کہ ان کی نظر مستقبل کی طرف ہے جس کی تعمیر اس نثراد نو کا کام ہے جو آج مدرسوں میں تعلیم پا رہی ہے!) اس موقع پر انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا (الفاظ کی صحت کی ضمانت نہیں کرتا لیکن مفہوم یہی تھا) "بڑی بڑی شان دار عمارتوں کے بنانے میں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں تعلیم کی روح ان میں اسیر ہو کر نہ رہ جائے اور ساز و سامان کی فراوانی تعلیم گاہ کے نصب العین کو دبا کر فنا نہ کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جامعہ کو چھوٹی چھوٹی کچی عمارتوں اور جھونپڑیوں میں شروع کیا گیا تھا اور اس کے کارکنوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اس مادی بے سرو سامانی کی حالت میں اس کی آزادی اور بلند نظری کو قائم رکھا جائے۔ اگر ان نئی عمارتوں کے بننے سے یہ اندیشہ ہو کہ جامعہ اپنے بلند نصب العین پر قائم نہ رہ سکے گی تو میں دعا کروں گا کہ یہ عمارتیں تیار ہونے سے پہلے ہی برباد ہو کر زمین میں مل جائیں!" جس زمانے میں افراد کی عظمت کا اندازہ ان کے لباس اور نمائشی شان سے اور درسگاہوں کی حیثیت کا اندازہ ان کی عمارتوں اور ساز و سامان سے کیا جاتا ہو، اس قسم کا خیال ایک غیر معمولی صاحب نظر انسان کے دماغ میں ہی بیدار ہو سکتا ہے جس درسگاہ کے کارکنوں کو اس اندیشہ کا احساس ہو اور جس کا راہبر ذاکر حسین جیسا شخص ہو، اس کو یہ مصیبت پیش نہیں آسکتی۔ ایک درسگاہ میں وہی روح، وہی جذبہ اور وہی نظر کام کرتی ہے جو اس کے کارکنوں کے دل اور دماغ میں جلوہ گر ہے۔ ذاکر صاحب کے حریم ذات میں جو چراغ روشن ہے وہ صرف جامعہ ہی کو نہیں بلکہ تمام ملک اور قوم کو روشن رکھنے کی امنگ اور صلاحیت رکھتا ہے!

ذاکر صاحب کے دل میں عالموں اور علم کے خادموں کی بہت قدر ہے وہ اس بات کو گوارا نہیں کر سکتے کہ درسگاہوں میں انتظامی جماعت یا اہل ثروت ان کے ساتھ تنخواہ یاب ملازموں کا سا سلوک کریں۔ ایسا کرنا نہ صرف ان کی شان کے خلاف ہے بلکہ تعلیم

کے کام میں بھی اس سے خلل پڑتا ہے۔ کیونکہ کارکنوں کو جس اطمینان خاطر، آزادی اور عزت نفس کے احساس کی ضرورت ہوتی ہے وہ انھیں میسر نہیں آتا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ درسگاہوں کا نظم ونسق زیادہ تر اس کے استادوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی عمدہ انتظامی جماعت ہو تو اسے اپنے معلمین کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جو معزز کائے کار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ہر موقع پر ہمیشہ اس بارے میں سٹاف کے جائز حقوق کی علم برداری کی اور جہاں کہیں خمار دولت یا خمار قوت کے زیر اثر اساتذہ کے ساتھ شایانِ شان سلوک نہیں ہوا۔ انھوں نے نہایت دلیری کے ساتھ ان کی حمایت میں آواز بلند کی۔ وہ چاہتے ہیں کہ تعلیم گاہوں میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں استاد فکر معاش سے بے نیاز ہوں (گو خود انھیں اور اہل جامعہ کو اپنے ایثار کی وجہ سے یہ بات کبھی نصیب نہیں ہوئی)۔ اپنا کام وقت اور توجہ تعلیم وتعلّم میں صرف کر سکیں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں ترقی کرنے کے لیے جس تگ ودو اور ریشہ دوانی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے محفوظ رہیں۔ کس قدر مختلف ہے یہ تصور اس فضا سے جو آج کل عام طور پر ہمارے بیشتر مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پیدا ہو گئی ہے جہاں ذاتی اغراض ومقاصد، ذاتی ترقی اور تنخواہ، ذاتی اثر ورسوخ کی کشمکش میں تعلیم کی روح پنپ نہیں پاتی ہے۔ جامعہ کو جو کامیابی اور نیک نامی نصیب ہوئی اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس میں ذاکر صاحب نے قابل مستعد اور پرخلوص کارکنوں کی ایک ایسی جماعت اکٹھی کی تھی جس کے ساتھ وہ احترام، خلوص اور رفاقت کا برتاؤ کرتے تھے اور جس کو ان کی ذات کے ساتھ عقیدت تھی۔ ان کی ذاتی کشش کا فیض ہے کہ وہاں مدت تک بہت سے ایسے معلم کام کرتے رہے جن کو باہر بہترین مواقع مل سکتے تھے لیکن ان کے دل میں انھیں قدروں کی لگن تھی اور اسی عشق کا چراغ روشن تھا جو ذاکر صاحب کے سینے میں فروزاں ہے۔ اس لیے وہ جامعہ کو چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انھیں کبھی معاش کی طرف سے اطمینان نصیب نہیں ہوا لیکن اس کے بدلے انھیں اعتماد، رفاقت، عین پسندی کی دولت میسر تھی جو بعض مصلحت ناشناس لوگوں کے نزدیک مالی فراغت سے زیادہ قابل قدر چیز ہے!

اگر ذاکر صاحب کی شخصی کشش ان کے دلوں کو جامعہ کی طرف نہ کھینچتی تو اس درسگاہ کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان درجنوں قومی درسگاہوں کا ہوا جو ۱۹۲۰ء کی سیاسی تحریک کے بعد قائم ہوئی تھیں۔ قوم کے جوش اور ولولے نے ان کو وجود بخشا تھا اور قوم ہی کی غفلت اور استقلال کی کمی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۹۲۷ء میں ذاکر صاحب نے جامعہ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ اس وقت وہ تقریباً نیم جان تھی اور اس کے بانیوں اور کارکنوں

تک کے ذہن میں اس کا کوئی واضح تصور اور نصب العین نہ تھا۔ بعض اس کو ایک تعلیمی درسگاہ بنانا چاہتے تھے۔ بعض کی خواہش تھی کہ اس میں سیاسی کارکنوں کی تربیت کی جائے لیکن جہاں تک اس کی مالی اور انتظامی ذمہ داریوں کا تعلق ہے کوئی شخص بھی (سوائے دو تین بندگان خدا کے جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس کی مدد کی) اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا بلکہ حکیم اجمل خاں کے بعد ایک وقت آزمائش کا ایسا آیا تھا جب تمام عمائدین ملک کی یہ رائے تھی کہ اس ادارے کے چلنے کا امکان نہیں ہے اس کو بند کر دینا چاہیے لیکن ذاکر صاحب کی اولوالعزمی اور بلند نظری اور ان کے ساتھیوں کے ایثار نے اس شکست خوردہ رائے کو نہیں مانا اور گاندھی جی کی ہمت افزائی کے طفیل خود اپنے بل بوتے پر وہ نہ صرف سخت کڑیاں جھیل گئے بلکہ جامعہ کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں اس نے ہند اور بیرون ہند کے اہل الرائے ماہرین تعلیم سے خراج تحسین وصول کیا۔

کارکنان جامعہ کی نظر میں جامعہ کا تعلیمی تصور اور مسلمانوں کی قومی زندگی میں اس کا وظیفہ کیا ہے؟ اس سوال کا مفصل اور واضح جواب دینا انھیں کا کام ہے۔ میں تو صرف ایک جھلک جامعہ کے اس نصب العین کی دکھانا چاہتا ہوں جو ذاکر صاحب کے ذہن میں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک نے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت کی اور ان کے متوسط اور اعلیٰ طبقے کو نئی تعلیم اور علوم جدیدہ کی طرف مائل کر کے ان کو ازمنہ متوسط کے جھٹپٹے سے نکالا اور عصر حاضر کا راستہ دکھایا۔ لیکن سر سید کے وقت سے اب تک زمانہ بہت بدل گیا ہے اور تعلیم اور تہذیب، سیاست اور معاشرت کے مسائل کو نئے انداز نظر اور نئی تفسیر کی ضرورت ہے۔ اُس وقت تعلیم کا مسئلہ ایک محدود سا مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔ یعنی اعلیٰ طبقے کے افراد کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کر دیجیے، ان کو اچھی نوکریاں دلا دیجیے، انگریزی نصاب اور مغربی علوم کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی تعلیم دینیات کی دیدیجیے اور بس، دین و دنیا دونوں کے مسئلوں کا حل ہو جائے گا! لیکن عصر حاضر کے مسائل اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اب کسی خاص جماعت کی تعلیم اور تہذیب کا سوال نہیں، عوام کی تعلیم کا سوال ہے اب چند تعلیم یافتہ لوگوں کو نوکریاں دلانے کا سوال نہیں بلکہ قوم کی تمام افراد کی علمی عملی اور فنی صلاحیتوں کی تربیت کر کے انھیں افراد کا سبہ بنانا ہے۔ زندگی کے تقاضے اس قدر شدید اور اس کا مقابلہ اس قدر سخت ہو گیا ہے کہ محض امتحان پاس کر لینے سے صلاحیت عمل کی سند نہیں ملتی۔ ضرورت ہے کہ ایک بہت بہتر اور مناسب تعلیم کے ذریعے ان کی ذہنی تربیت کا انتظام کیا جائے۔ درسی تعلیم کی کچی پکی عمارت بنا کر اس پر دینیات کی سفیدی کا ایک ہاتھ پھیر دینے سے کام نہیں چلے گا بلکہ دنیا کو "ادب

خوردہ دین" بنا کر زندگی کی گہرائیوں میں سے نصاب تعلیم کے لیے مواد فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ ماضی کی فرسودہ روایات اور قدامت پرستی کے آثار نے اس کھلی ہوئی حقیقت کو، اس بیّن انقلاب کو نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا لیکن ذاکر صاحب کی تیز اور نکتہ رس نگاہ نے اس کو بے نقاب دیکھا اور اس کی روشنی میں انھوں نے اپنے تعلیمی تصورات کو مرتب کیا۔ ان کی درسگاہ ایک معمل یا تجربہ گاہ ہے جہاں عوام، بالخصوص عام مسلمانوں کے لیے صحیح اور اچھی تعلیم کا پیکر تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ استاد، طالب علم اور منتظمین سب مل کر آزادی کی فضا میں تعلیم کے حقیقی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب وہ ان بندشوں اور ذہنی پابندیوں سے آزاد ہوں جس میں ہندوستانی تعلیم نے گزشتہ سو سال میں نشو و نما پائی ہے اور جن کی وجہ سے استادوں کی نظر امتحان اور نتائج کی بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ طلبار کا تخیل حصول ملازمت کے چکر سے باہر نہیں نکلتا اور منتظمین افسران محکمہ کو خوش رکھنا اور ان سے مالی امداد حاصل کرنا اپنا مقصود اعلیٰ سمجھتے ہیں! ذاکر صاحب نے انگریزی حکومت کے دور میں جامعہ کی آزادی کو قائم رکھنے کے لیے پہلا بنیادی اصول یہ قائم کیا کہ اس کے لیے نہ حکومت کی امداد قبول کریں نہ اس کا چارٹر، جس کے جلو میں مختلف قسم کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ ان کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے بقول شخصے "چوری کا کھٹکا" نک نہ رہا اور وہ علم کو علم کی اور تعلیم کو تعلیم کی خاطر حاصل کرنے کا مطلب سمجھنے لگے۔ دوسری طرف استادوں کو یہ موقع ملا کہ تعلیم کے ان پہلوؤں پر زور دیں جو قومی سیرت کی تعمیر کرتے اور عوام کی زندگی کو بناتے ہیں۔

اسی طرح قومی تعلیم کے میدان میں ذاکر صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اس کو ایک محدود اور روایتی تنگنائے سے نکال کر زندگی کے سمندر میں لائے تاکہ وہ ان تحریکوں سے متاثر ہو سکے جو زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہو کر اس کو نئے تقاضوں سے مالا مال کرتی رہتی ہیں۔ نظری طور پر ہندوستان میں دوسرے لوگ بھی اس اصول کی تبلیغ کر رہے تھے۔ لیکن زبانی اور تحریری تلقین کی سہل پسندی کی بجائے ذاکر صاحب نے اپنے لیے عمل کا دشوار گزار میدان پسند کیا۔ اسی لیے میں نے کئی سال ہوئے اپنی ایک کتاب "مستقبل کے مدرسہ" کو ذاکر صاحب کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کیا تھا۔

"ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے نام جو خاموشی کے ساتھ مدرسہ مستقبل کی تشکیل کر رہے ہیں جب کہ دوسرے لوگ زیادہ سے زیادہ اس کے متعلق محض تقریر، کرتے یا مضمون لکھتے ہیں!"

ذاکر صاحب نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جامعہ ملیہ کو قومی تعلیم کے لیے ایک نمونے کی درسگاہ بنائیں جہاں ایک سازگار ماحول میں مختلف قسم کے تعلیمی تجربے کیے جائیں اور ان کی روشنی میں قومی تعلیم کے اصول اور مقاصد اور اس کے نصاب اور منہاج کا تعین کیا جائے۔ اسی وجہ سے جامعہ کی توسیع کی جو اسکیم ان کے پیش نظر تھی اس میں مختلف درجے کی درسگاہوں کے لیے گنجائش رکھی گئی تھی۔ مثلاً ایک چھوٹے بچوں کا سکول۔ ایک مثالی بنیادی مدرسہ ایک ثانوی مدرسہ جس میں تنوع تعلیمی نصاب رائج کیا جائے۔ ایک ٹکنکل سکول، ایک کالج، ایک تصنیف و تالیف کا ادارہ، چند تحقیقاتی ادارے جو ملک کی تہذیب کے مختلف عناصر کا ماہرانہ مطالعہ کریں۔

یہ تو ہوا ان کی جامعہ کا نصب العین۔ لیکن جب تک کسی تعلیمی نصب العین کو قوم اور ملت کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے اس وقت تک اس میں معنویت اثر اور گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس بحث کے ساتھ ساتھ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے ذہن میں مسلمانوں کی سیاست کا کیا تصور ہے اور وہ ہندوستان میں ان کے لیے کس مقام کی توقع رکھتے ہیں؟ اس نازک اور ناروادار دور میں جب لوگوں نے اختلاف رائے کو مخالفت اور مخالفت کو جرم اور غداری سمجھ لیا ہے، ذاکر صاحب نے جس جرأت کے ساتھ اپنے خیال اور عقیدہ کی علم برداری کی وہ بجائے خود ایک دل چسپ نفسیاتی مطالعہ ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ اکثر جب کسی ملک میں سیاسی سیلاب آتا ہے تو ہر شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ہی جماعت کے وقتی خیالات اور جذبات اور تعصبات کو ایک اٹل حقیقت مان کر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ چنانچہ جس وقت ہندو اور مسلمان، چپ و راست کی سیاسی پارٹیاں، انگریز دوست اور انگریز دشمن سب ہی اس نامبارک ذہنیت میں گرفتار تھے ذاکر صاحب نے اپنا سوچا سمجھا راستہ نہیں بدلا اور مخالفت کی آندھیاں ان کے عقیدے کا چراغ نہیں بجھا سکیں۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ!

یہ عقیدہ کیا ہے؟ ذاکر صاحب کو اس تہذیب و تمدن سے گہری اور سچی محبت ہے جو ہندوستان میں اسلام کے حیات بخش اثر سے پیدا ہوئی اور ان کے دل میں اس فلسفۂ حیات کا، اس علم و ادب کا اس معاشرتی نظام کا زبردست احترام ہے جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں اس تہذیب و تمدن اور اس معاشرت اور فلسفے کے اصولوں اور قدروں کو پرکھنے اور ان کی مبصرانہ تفسیر کرنے

کی غیر معمولی صلاحیت بھی ہے۔ وہ ایک صاحب نظر مفکر کی طرح لفظوں کی سطح سے نیچے اتر کر معنی کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے اسلامی تصور حیات میں جہاں ایک سچے اور راسخ مسلمان کا عقیدہ جھلکتا ہے۔ وہاں اس میں عصر حاضر کی تحریکوں اور تقاضوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ عقیدہ ان کو بتاتا ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول چودھویں صدی ہجری میں بھی ایسے ہی سچے اور قابل عمل ہیں جیسے وہ پہلی صدی میں تھے لیکن عقل اور تجربہ اور حالات حاضرہ کا گہرا مطالعہ انھیں یہ بھی بتاتا ہے کہ چودھویں صدی میں ان اصولوں کا اعلان اور ان کی تفسیر چودھویں صدی کے مسائل اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہیے۔ اس وجہ سے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل میں وہ "ترقی پسند" ہیں لیکن یہ وہ "ترقی پسندی" نہیں جو مستقبل کے لیے بے صبری میں ماضی کے سرمائے کو ٹھکرا دیتی ہے بلکہ یہ تو جرأت کے ساتھ ماضی اور حال دونوں کا محاسبہ کرتی ہے اور اپنی تمدنی میراث کے بہترین عناصر لے کر ان سے مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتی ہے اسی راہ وسط کو اختیار کرنے کی وجہ سے ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ جامعہ کو کسی خاص سیاسی پارٹی کے ساتھ وابستہ کریں اور شاید کوئی منظم سیاسی پارٹی ان کو اطمینان کے ساتھ ہضم بھی نہیں کر سکتی! پارٹی تنقید اور انفرادیت کی بجائے اطاعت اور پیروی چاہتی ہے، اسے حق سے زیادہ طاقت کی تلاش ہوتی ہے اور بدقسمتی سے ذاکر صاحب کی افتاد طبع ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ حق کو طاقت پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ یہ ستم کرتے ہیں کہ حق ہی کو طاقت سمجھتے ہیں!

ان کا سیاسی عقیدہ یہ ہے کہ قوم کی ترقی کے لیے تمام جماعتوں کو اپنی مخصوص صلاحیتوں کی مکمل نشو و نما کا موقع ملنا چاہیے۔ انھیں کی ہم آہنگ تربیت میں قومی فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔ ہندوستانی تہذیب ایک مشترک کارنامہ ہے۔ اس کی نشو و نما میں مختلف جماعتیں اور قومیں اور مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ شریک ہیں۔ اس اجتماعی کارنامے میں، جو ایک ہزار برس کے میل جول کا نتیجہ ہے، مسلمانوں نے بہت نمایاں اور قابل قدر حصہ لیا ہے اور ذاکر صاحب اس مشترک ورثہ کو قائم رکھنے اور مالامال کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لیے یہ پوزیشن ہرگز شایان شان نہیں کہ وہ اپنی گزشتہ تاریخ اور روایات سے بے تعلقی اختیار کر لیں اور جس ملک میں انھیں جینا اور مرنا ہے اسی کی سماجی اور سیاسی خدمت میں پیش پیش نہ رہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں ظلم ہے، بے انصافی ہے، جہالت ہے، توہمات ہیں، انسانوں میں نسل و رنگ کا امتیاز رائج ہے اس کو دور کرنا مسلمان کا مذہبی اور ملی فریضہ ہے۔ خدمت اس کی سب سے بڑی سعادت ہے اور اس خدمت

میں ہندو اور مسلمان کی، مشرق اور مغرب کی، سیاہ و سفید کی تمیز کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسی لیے انھوں نے جامعہ کی تعلیم کا مقصد اعلیٰ بنی نوع انسان کی خدمت کو قرار دیا ہے۔ اگر جامعہ کے صدر دروازے پر کوئی حسب حال موٹو لگانا ہو تو میرے خیال میں اس کے نصب العین کی بہترین توضیح اقبال کا یہ شعر ہوگا۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر   فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

ذاکر صاحب کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ مسلمان ہندوستان کے مستقبل میں ایک نمایاں اور قابل فخر حصہ لیں اور اس مقصد کے لیے اپنے مذہب اور تہذیب و تمدن کے بہترین عناصر کو نہ صرف اپنی قومی خودی میں جذب کریں بلکہ ان کے ذریعہ ہندوستانی تہذیب کو بھی مالا مال کریں۔ مانا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کمزور ہے (گو میں سمجھتا ہوں کہ جو جماعت ذاکر حسین پیدا کر سکتی ہے اس کی خاک میں ابھی بہت بجلیاں پوشیدہ ہیں) لیکن اسلام کے کیسے ، اخلاق اور عمل کے بے نظیر نمونے ہیں جن کی اس دنیا کو، جو ظلم و جور سے بھر گئی ہے، بہت ضرورت ہے۔ یوں تو ہر جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرے لیکن مسلمان پر جو دنیا میں حق کے مبلغ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، یہ فرض خاص طور پر عائد ہوتا ہے۔ اسی طرح ذاکر صاحب چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستانی انصاف اور انسانیت کی اس جنگ میں کھلے دل سے حصہ لیں جو ہر ملک اور قوم میں مختلف شکلوں اور اندازمیں ہو رہی ہے۔ وہ تنگ نظر قومیت، مذہبی ناروا داری، نسلی تعصب، جغرافی حد بندیوں غرض ان تمام چیزوں سے بیزار ہیں جو انسان کو انسان سے جدا اور ان کی وحدت کو پاش پاش کرتی ہیں۔ افراد اور جماعتوں میں جو مختلف قسم کے تاریخی اور تمدنی فرق ہیں وہ ایک اچھی چیز ہے کیونکہ دنیا کی گوناگونی انھیں سے عبارت ہے۔ لیکن جب اختلاف مخالفت اور تعصب کی شکل اختیار کرلیں تو فتنہ کا باعث بن جاتے ہیں جو قتل سے بدتر ہے۔ اسی لیے ان کے نزدیک رواداری اور انصاف کی تلقین اچھی تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے۔ ذاکر صاحب ہی کے الفاظ میں اس فرض کی پرجوش تفسیر سنئے جو اس کے مذہب نے مسلمان کو سونپا ہے۔

"اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں۔ اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مامور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی سیاسی تنظیم چاہتے ہیں جس میں امیر اور غریب کا فرق انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کردے۔ اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں تو ان فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے اپنے پیارے وطن میں ہے جس کی مٹی سے

ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم واپس جائیں گے . . . . ہمارے نوجوان روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے۔ پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی بلکہ اپنے دین کی اور وطن کی خدمت ہوگی جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہ بجھے گی دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی یہ اپنے نصب العین ہی کی وجہ سے اپنے دیس کی، کہ کبھی دنیا اسے جنت نشان کہتی تھی سیوا کریں گے۔ اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے بیمار، بے کس، بے امید غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمان ورحیم، رزاق وکریم، حی وقیوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا، کہ انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے بعض کے ظلم اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ ان کا وجود محدود ننگا ہوں کو اس کی شان ربوبیت پر ایک دھبہ سا معلوم ہوتا ہے۔"

ان الفاظ میں نہ صرف جامعہ ملیہ بلکہ تمام اچھے اداروں کے نصب العین کی روشن جھلک نظر آتی ہے۔

ذاکر صاحب کے نزدیک وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اس جذبۂ خدمت کو محدود کر کے مسلمانوں کے اسلامی اور پیغمبرانہ فرض کی حد بندی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے عمل اور اصول دونوں کا سرچشمہ قرآن شریف کی یہ آیت ہے کہ "تم میں ایک ایسی امت وسط ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے۔ انھیں نیک کام کرنے کی ترغیب دے اور برے کاموں سے روکے۔" یہ بڑا مشکل کام ہے کیونکہ نیکی کی طرف بلانے اور بدی کو روکنے میں اکثر دوستوں اور عزیزوں اور جاعت کی مخالفت مول لینی پڑتی ہے لیکن اسلامی زندگی اور انسانی شرف دونوں کا تقاضا یہی ہے اور ذاکر صاحب کو قدرت نے جرائت اور دشوار پسندی کی دولت سے مالا مال کیا ہے!

ذاکر صاحب چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف جماعتیں اپنی مخصوص انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک منظم، روادار اور فراخ دل قومیت کی بنیاد ڈالیں اور اپنے مخصوص تمدنی ورثے اور صلاحیتوں سے ہندوستانی تہذیب وتمدن کو فروغ بخشیں۔ اسی لیے انھوں نے جامعہ میں بیک وقت قومیت اور اسلامیت کی قدروں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ بے شک غلط قومیت اور اسلام، ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ لیکن سچی قومیت میں، جو وطن کی محبت اور اس کی خدمت کو ایمان کا جزو سمجھتی ہے (حُبُّ الوطنِ مِنَ الایمان) اور مذہب کی حقیقی روح میں کوئی بنیادی تناقض نہیں۔

انھوں نے عمل سے اس بات کو ثابت کر دکھایا ہے کہ بیک وقت ایک اچھا مسلمان اور اچھا ہندوستانی ہونا نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ دونوں چیزیں دراصل

ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جو شخص واقعتاً ایک اچھا مسلمان ہوگا اس میں یقیناً وہ صفات ہونی چاہئیں جو ایک اچھے شہری کے لیے ضروری ہیں وہ نہ غلط اور تنگ نظر قومیت کے لیے اپنے مذہب کا سودا کرے گا۔ نہ مذہب کو اپنی تنگ نظری اور ناروا داری کی آڑ بنا کر تاریخی ارتقا کے سلسلے میں حارج ہوگا۔

لیکن جہاں وہ ایک طرف اس بات کے مخالف ہیں کہ مسلمان خود کو قومی زندگی کی دھارے سے علیحدہ کرلیں وہاں وہ سختی اور خلوص کے ساتھ اس اندھی تحریک پر بھی احتساب اور تنقید کرتے ہیں جو ہندوستان کی زندگی اور تہذیب میں سے ان قابلِ قدر عناصر کو نکال دینا چاہتی ہے جو مسلمانوں نے گزشتہ ہزار برس میں ہندوستان کو بخشے ہیں۔ میں نے انھیں مسلمانوں کے مجمع میں وہ سچی اور کڑوی باتیں کہتے سنا ہے جن سے ہر دل عزیزی کے بھوکے لیڈر جان بوجھ کر پرہیز کرتے ہیں۔ میں نے انھیں افتراق اور اختلاف کی یورش میں اتحاد اور ہم آہنگی کی نامقبول تائید کرتے دیکھا ہے جس کی وجہ سے شاید بعض کوتاہ بیں اور سطحی لوگ جو عوام کی کمزوریوں کے ساتھ کھیل کر ان کے جذبات سے فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں، یہ سمجھتے رہے کہ ذاکر صاحب کے دل میں مسلمانوں کے لیے وہ تڑپ نہیں جو خود ان بزرگانِ ملت کے دل میں ہے! لیکن وہی ذاکر جب کسی غیر مسلم مجمع کو خطاب کرتا ہے یا کسی غیر مسلم لیڈر سے گفتگو کرتا ہے تو اسے اپنے مسلمان ہونے پر جو فخر ہے وہ اس کی ہر بات اور ہر انداز سے ٹپکتا ہے اور وہ ان سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت حیثیت کو تسلیم کریں۔

کاشی ودیا پیٹھ میں تقسیم اسناد کا جلسہ ہے جس میں تقریباً تمام مجمع ہندو حضرات کا ہے۔ اس جلسے میں خطبہ دینے کے لیے ذاکر صاحب کو مدعو کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں اس زمانے میں بہت سے مسلمان جانے سے بھی کتراتے کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ ایسے موقع پر کیا کہنا چاہیے! اور بعض شاید وہاں پہنچ کر اپنی اسلامی ذہنیت کو بالارادہ پوشیدہ رکھتے۔ کیونکہ انھیں یہ چیز غیر متعلق معلوم ہوتی لیکن ایک بندۂ خدا ایسا بھی نکلا جو

کہتا ہے وہی بات سمجھتا ہے جسے حق ۔۔۔۔۔ وہ ابلہ مسجد ہے نہ تہذیب کا فرزند

چنانچہ اس اہم جلسے میں انھوں نے ایک غیر مسلم مجمع کو مسلمانوں کا نقطۂ نظر ان واضح اور بے باک لیکن دل نشین لفظوں میں سمجھایا،

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم

کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصّہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں بیتے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

گرچہ مثلِ غنچہ دل گریم ما　　گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے تو نعات کی وجہ سے اپنے ملّی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لیے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کا جزو بننے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے! ہندوستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے۔ وہ ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔"

لیکن جب وہ مسلمانوں کی کسی جماعت کو مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ شعار نہیں کہ جھوٹی تعریفوں اور لوریوں سے ان کی خود پسندی کو بیدار کر کے ان کی قوت احتساب کو سلا دیں یا دوسروں کی عیب جوئی کر کے ان کی انانیت کو جھوٹا استحکام بخشیں۔ وہی بیدار مغزی اور روشن ضمیری جو اسلام کی حیات بخش قدروں کو بے نقاب دیکھتی ہے مسلمانوں کی چھپی اور کھلی ہوئی کمزوریوں کا محاسبہ بھی کرتی ہے اور انھیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ ان کے موجودہ مقام اور ان کے نصب العین میں کتنا زبردست فاصلہ ہے۔ لہٰذا اس خطبے کے بھی یہ جملے قابل غور ہیں جو ذاکر صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس جو بلی میں دیا تھا۔ یہاں مخاطب تمام تر مسلمان ہیں اور انھیں کی ثانوی تعلیم کا مسئلہ پیش نظر ہے:

"ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لیے بنائے ان کو دیکھیے۔ ہم کس معنی میں انھیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں۔ ۔ ۔ کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے؟ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام

اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے؟ نہیں اور ہزار بار نہیں! . . . ایک ایسی دنیا جو نسل وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لیے جہنم بن گئی ہے پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرماں روائی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہے جو ایک نبی اُمّیؐ نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملت اسلامی اس نقد پر اس موقع اور اس ذمہ داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی؟ . . . . ایک بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک خود دار آزاد جماعت کی طرح زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی قومی زندگی کے پچھلے پچھتر سال پر سختی سے محاسبہ کرنا ہوگا اور پچھلی مساعی کی تہ میں جو نصب العین کارفرما تھا اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔"

یہ نظر ثانی، یہ تنقید جو انسان کو ماضی پرستی اور روایات کہنہ کی غلامی سے بچاتی ہے ہر بیدار مغز مفکر کا فرض ہے۔ لیکن ہمارے بیشتر تعلیمی مفکر جزئیات اور غیر اہم مقاصد کے ایسے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ نہ بنیادی چیزوں کی طرف توجہ کر سکتے ہیں نہ ان میں غالباً اس کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے۔ بیسوی صدی میں کم سے کم ہندوستانی مسلمانوں میں شاید ذاکر صاحب ہی ایسے عملی معلم اور تعلیمی مفکر ہیں جنھوں نے اس "فرض کفایہ" کو ادا کیا ہے۔ زمانہ کی ناسازگاری کی وجہ سے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اس وقت ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہو لیکن ایک مضبوط اور اچھے درخت کی طرح سچی بات میں یہ صفت ہے کہ وہ آہستہ آہستہ شور سرزمین سے سر نکالتی ہے اور کبھی نہ کبھی اپنا اثر پیدا کر کے دم لیتی ہے۔ گو یہ بات یقینی ہے کہ بالآخر حق کا بول بالا ہو کر رہے گا، لیکن تقاضائے بشریت سے کبھی کبھی انھیں اس بات کا بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ملک کی سیاسی مخالفتیں اور چپقلش اس تعلیمی اور تہذیبی کام کو بار آور نہیں ہونے دیتیں جو وہ اور ان کے ہم خیال اس قدر صبر اور ایثار کے ساتھ سالہا سال سے کرتے آئے ہیں۔ ایک دفعہ بنیادی تعلیمی کانفرنس میں خطبہ دیتے ہوئے اس جذبہ کا اظہار بہت چبھتے ہوئے انداز میں کیا تھا:

"میں ان تعلیمی کام کرنے والوں کی ایک التجا اپنے ملک کے سب سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھار دیئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم، قوم پر بھروسہ کر سکے۔ کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے، جس میں تمدن، تمدن، امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں . . . مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں آنی ہے جتنی پہلے

کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر، کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر، کچھ منوا کر، ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں۔ کب تک شبہے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی؟ ہمارا کام بھی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں۔ اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں، اکثر دل ٹوٹتا ہے۔ پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جہاں بھائی یک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی، جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں۔ کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں۔ کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں۔ کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجئے اور جلد کیجئے۔ اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔''

کہنے والا کہتا رہا، اپنی سی کرتا بھی رہا، تحریر سے، تقریر سے، اپنی زندگی کی روشن مثال سے، اپنی مثال کے اثر سے، لیکن بہت سے سننے والوں نے ایک کان سے سنا، دوسرے کان سے نکال دیا۔ یا کان تھے لیکن ان سے سنا نہیں، آنکھیں تھیں لیکن ان سے دیکھا نہیں، دل تھے لیکن ان سے محسوس نہیں کیا اور اس کی پاداش دو ملکوں کے کروڑوں بندگانِ خدا آج تک بھگت رہے ہیں۔ لیکن ذاکر صاحب کی بتائی ہوئی قدروں اور اصولوں اور انسانی شرافتوں کا عَلم اسی طرح بلند رہا اور ہے اور رہے گا!

ذاکر صاحب کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ جہاں تعلیم کے بنیادی اصولوں اور قدروں کی غیر معمولی پرکھ رکھتے ہیں وہاں ان میں یہ صلاحیت اور سلیقہ بھی ہے کہ وہ ان کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ ہمارے تعلیمی کارکنوں میں فکر و عمل نظم و نظر کا یہ امتزاج مشکل سے ملتا ہے۔ ایسے ماہرینِ تعلیم ہیں جو خواب دیکھ سکتے ہیں، اپنے تخیل کی دنیا میں حسین محل تعمیر کر سکتے ہیں۔ لیکن عمل کی سنگلاخ زمین پر نہیں اتر سکتے۔ مگر ذاکر صاحب ان ''مردانِ حر'' میں سے ہیں جن کی بابت شاعر نے کہا ہے:

مردِ حر سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر — خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نو کی تصویر
اور جب بانگِ اذاں کرتی ہے بیدار اسے — کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر!

یہاں ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریوں سے مفصل بحث مقصود نہیں صرف ان کے چند بنیادی تصورات کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ان کا ایک بنیادی اصول ہے کہ فرد اور جماعت میں ایک نہایت گہرا رشتہ ہے اور انسانی ذہن کو اپنی تربیت کے لیے جس غذا کی ضرورت ہے وہ اسے جماعت کے تمدن اور اسی کی مادی اور غیر مادی تحصیلات ہی سے حاصل

ہو سکتی ہے یعنی "اس کے علم سے، اس کی زبان سے، اس کے ادب سے، اس کی صنعت و دستکاری سے، اس کے نظام اخلاق سے، اس کے رسم و رواج سے، اس کی سماجی زندگی کے نمونوں سے اس کے گاؤں شہروں اور قصبوں کی تنظیمات سے، اس کی موسیقی سے اس کی مصوری سے اس کی تعمیرات سے، اس کی دکانوں سے، اس کے کارخانوں سے اس کی بڑی شخصیتوں کی زندگی کے نمونوں سے، غرض اس کی تمام رنگا رنگ تحقیقات سے۔" لہذا "جب کوئی تربیت طلب ذہن ان چیزوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان میں سوئی ہوئی توانیاں اس میں جاکر بیدار ہو جاتی ہیں، اور اس کے لیے یہ دفینے اپنے منہ کھول دیتے ہیں۔" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو تعلیم ان تمدنی خزانوں سے بیگانہ اور ذہن اجتماعی کی ان زندہ تخلیقات سے بے نیاز ہوگی اس میں نہ حقیقت کا جلوہ دکھائی دے گا نہ زندگی کا شرارہ۔ وہ موجودہ ہندوستانی تعلیم کی طرح بالکل سطحی اور رسمی ہو کر رہ جائے گی۔ ہندوستانی تعلیمی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے اس ملک کی متنوع تہذیب کے سرچشموں سے کام نہیں لیا گیا بلکہ مغرب کی سطحی تقلید کی کوشش کی گئی۔ اس کی وجہ سے قوم کے تخلیقی سوتے خشک ہو کر رہ گئے اور تعلیم دفتری کاروبار سکھانے کے علاوہ کچھ بھی نہ کرسکی اور قومی زندگی کا دھارا اس سے متاثر نہ ہو سکا۔ اسی لیے ذاکر صاحب نے اپنے خطبات میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ تعلیم کو جماعتی تہذیب و تمدن اور اس کے مادی اور غیر مادی خزانوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ساتھ ہی انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ افراد کی ذہنی اور جمالی اور علمی صلاحیتیں بہت مختلف ہوتی ہیں۔ اس لیے مختلف ذہنوں کو ایک ہی غذا راس نہیں آسکتی۔ ہر ذہن کو "وہی چیز بھاتی ہے جس کی ذہنی ساخت اس کی اپنی ذہنی ساخت سے مطابق ہو۔" اس حقیقت کو بھولنا (بقول ان کے) ایسا ہے "جیسے اندھے کو رنگ سے اور بہرے کو آہنگ سے تربیت دینے کی کوشش" ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بہت سی تحریکیں جنھوں نے مغرب کی تعلیم میں جان ڈالی ہے اسی اصول کی تفسیر ہیں۔

ایک اور اہم تحریک جس کے ساتھ ذاکر صاحب کا نام نمایاں طور پر وابستہ رہے گا تعلیم میں ہاتھ کے کام کی اہمیت اور اس کے مقام کا تعین ہے۔ بہت سے دوسرے ملکوں میں علم و عمل، کتاب اور کام کی یہ "جنگ" بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ لیکن ہندوستان میں جو روایتی علم کا پجاری رہا ہے۔ جہاں ہاتھ کے کام کو اکثر ذلیل سمجھا گیا ہے جہاں ذات پات کی تقسیم ایک حد تک کام کی نوعیت کی بنا پر کی گئی ہے، ابھی تک تعلیم کتاب اور لفظوں کے گورکھ دھندے میں گرفتار ہے اور بچوں کو ایک ایسے ناقص اور نامکمل نصاب کی پابندی کرنی ہوتی ہے جس میں نسل انسانی کے بعض نہایت اہم اور بیش قیمت تجربات کے لیے گنجائش

ہی نہیں ذاکر صاحب نے پہلے جامعہ کی تعلیم میں اور اس کے بعد بنیادی قومی تعلیم کی سکیم کے ذریعہ یہ انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا کہ جو تعلیم ہاتھ کے کام کو اس کا صحیح درجہ نہیں دیتی اور اس کو انسانی تربیت کا ذریعہ نہیں بناتی وہ سراسر ناقص ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ نظریہ ذاکر صاحب کا ذاتی اجتہاد نہیں۔ اس کی ترتیب میں ان کے بہت سے نامور تعلیمی پیش رو شریک ہیں اور ہندوستان میں بھی جس وقت انھوں نے اس خیال کو پیش کیا۔ ان کے بہت سے ہم عصر اس کے موافق تھے۔ لیکن کسی نظریہ کو بیان کر دینا ایک بات ہے اور اس کا علمی، عملی اور فلسفیانہ پس منظر سمجھنا اور سمجھانا اور تعلیم کے عمل میں اس کی چولیں ٹھیک بٹھانا اور بات ہے۔ اس خیال کی وضاحت اور علم اور تجربے کے رشتے کی تفسیر جس انداز سے ذاکر صاحب نے کی۔ اس سے ہماری تعلیمی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

" ایک واقفیت وہ ہوتی ہے جس کے لیے دوسرے کام کرتے ہیں، ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے خبر کی حیثیت سے۔ ایک واقفیت ہوتی ہے جو ذاتی کاوش اور ذاتی تجربے سے حاصل ہوتی ہے، جز و ذہن بنتی، ذہن کو روشن کرتی، اس میں نظر پیدا کرتی ہے۔ . . روایتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے نور، اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے، نہ روح کو بالیدگی، اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لیے ایک خوش نما پردہ ہوتا ہے یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا۔ آواز بہت دیتا ہے اور اندر سے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربے سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار ذہن کو تربیت دیتا ہے۔ روح کو پرورش کرتا ہے اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے۔ . جس جماعت میں بہت بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے اس کی تعلیم گاہوں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا کہاں کی دانش مندی ہے سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اسی وقت ممکن ہے جب یہ مدرسے گنتی کے چند خود غرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی جماعت کے سواد اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں۔"

اور پھر کام کی اخلاقی، سماجی اور عملی اہمیت کو جس خوب صورتی اور زور کے ساتھ انھوں نے اپنے بنیادی تعلیم والے خطبے میں بیان کیا ہے اس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی:

" جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنر مند ضرور ہو جاتا ہے مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کام کا حق ادا کرتا ہے اپنا مزہ نہیں ڈھونڈھتا۔ اس سے وہ آدمی بنتا ہے، اپنا اخلاق سنوارتا ہے۔ کام کی یہ صفت ہاتھ کے کام میں ہو سکتی ہے اور دماغ کے کام میں بھی اور ہاتھ کا کام بھی

اس سے خالی ہو سکتا ہے اور دماغ کا بھی، کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیے کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا، کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام خالی دل لگی نہیں۔ کام کھیل نہیں، کام کام ہے، با مقصد محنت ہے۔ کام دشمن کی طرح اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ پھر اس میں پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔"

یہ خیالات اور جذبات خواہ کسی کے قلم سے نکلیں ان کے سحر سے متاثر ہونا ناگزیر ہے لیکن جب یہ اس شخص کے قلم سے نکلیں جس نے پہلے ان کو اپنے دماغ میں سمویا ہو پھر اپنے دل میں جگہ دی ہو، پھر اپنی زندگی میں برتا ہو، اس وقت ان میں عقیدہ اور عمل کے خلوص کا بے پناہ اثر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کی عظمت کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے عمر بھر کام کیا ہے اور اعلیٰ قدروں کی سیوا میں کام کیا ہے اور اس وجہ سے ان کے کام کی اہمیت بہت بلند ہو گئی ہے۔ ورنہ صرف کام کرنے سے خواہ کتنا ہی ان تھک کیوں نہ ہو کوئی انسان اخلاقی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔

ذاکر صاحب کی نظر میں تعلیم کا سب سے بڑا، سب سے اہم، سب سے بلند مقصد یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو سیوا کی زندگی کے لیے تیار کرے اور اس غرض پرستی اور تنگ نظری کے خلاف جہاد کرے جو عصر حاضر کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو گئی ہے وہ اس بات کو کافی نہیں سمجھتے کہ تعلیم افراد کی صلاحیتوں کی نشوونما کرنے کے بعد انھیں آزاد چھوڑ دے کہ وہ جس طرف چاہیں ادھر کا رُخ کریں اور ان کی سعی و عمل کی کوئی منزل کوئی رُخ معین نہ ہو۔ دراصل صحیح مقصد کا تعین ہی انسان کی صلاحیتوں اور ہنرمندیوں کو فرد اور سماج دونوں کے لیے برکت کا باعث بناتا ہے۔ ورنہ محض ذہانت اور چالاکی کا اظہار سٹے بازی میں بھی ہو سکتا ہے اور سائنس کے کمالات جس زور شور سے جنگ کی غارت گری میں دکھائے جا رہے ہیں ان کی مثال کسی امن کے شغل میں نہیں ملتی۔

ذاکر صاحب نے ایک دفعہ اپنے خطبے میں جو انھوں نے پنجاب کی ایجوکیشن فیلوشپ کے سامنے دیا تھا۔ جامع اختصار کے ساتھ سماج کی کھلی ڈھکی چوریوں کو ایک ایک کر کے گنوایا تھا اور ان کا سبب اسی بنیادی خود غرضی کو قرار دیا تھا جس نے ہماری ساری انفرادی اور جماعتی زندگی کو کھوکھلا اور اخلاقی اعتبار سے ناقص کر دیا ہے۔

خدمت کے نصب العین پر ذاکر صاحب کو اس قدر اصرار کیوں ہے؟ نہ صرف اس لیے کہ اخلاقی زندگی کی عمارت اس صالح بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان میں اپنے ملک کی بے شمار محرومیوں اور بد نصیبیوں کا، اس کے جہل اور افلاس کا، اس کی بیماری اور بیکاری کا اور اس کی تمام پستیوں کا نہایت شدید اور گہرا احساس

ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس روشن مستقبل تک پہنچنے کا، جس کی تصویر ان کے نہاں خانۂ دل میں سجی ہوئی ہے صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے خدمت کا پل جو ہمارے حال کو ہمارے مستقبل سے ملائے۔ جب تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان تمام خرابیوں کے خلاف جہاد نہیں کرے گا اور قومی زندگی کو صدیوں کی غلاظت سے پاک نہ کرے گا، اس میں صفائی، فراخی اور شرافت پیدا نہ ہو سکے گی۔ جو شخص باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اس جہاد سے جی چراتا ہے، سماج سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن اس کی خدمت نہیں کرتا، جو شخص لینے کے لیے ہر وقت تیار ہے، دینے کو آمادہ نہیں وہ نظر حقیقت شناس میں ایک ذلیل سماجی مجرم ہے۔ یہ امتحان گویا افراد اور جماعتوں دونوں کے لیے حساب اور میزان ہے یا ایک پل صراط ہے جس پر ذرا لغزش ہوئی اور دوزخ کی گہرائی میں جا پہنچے۔

ایک دفعہ ذاکر صاحب کو جن کی گوناگوں شخصیت ہر موقع کو خوب صورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نباہ سکتی ہے، ایک طبیہ کالج کے تقسیم اسناد کے جلسے میں مدعو کیا گیا۔ اس اجنبی ماحول میں بھی انھوں نے طلبہ سے فن طب اور اس کے وسیع سماجی علائق کے متعلق ایسی نکتہ رس باتیں بیان کیں جو شاید کسی ماہر فن کے خیال میں بھی مشکل سے آتیں۔ اس موقع پر انھوں نے خاص کر کے خدمت کے آئیڈیل پر زور دیا اور اس کی وجہ سے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کی:

"یوں تو کوئی اپنی آنکھوں پر ٹھیکریاں رکھ لے تو کوئی اس کا کیا کر سکتا ہے، پر آپ کے چاروں طرف جو بیماری پھیلی ہوئی ہے، افلاس اور فاقے نے عام صحت کا جو حال کر رکھا ہے۔ ... اس کا احساس آپ کو ہوگا تو آپ چین کی نیند نہ سو سکیں گے۔ زندگی کی بپتا دکھ اور بیماریاں ہم سے اتنی قریب ہیں کہ اکثر ہم ان سے غافل ہو جاتے ہیں۔ آہیں اتنے سینوں سے نکلتی ہیں کہ ساری فضا ان سے بھر جاتی ہے اور ہم انھیں سن نہیں سکتے اور شاید اپنی زندگی گزارنے کے لیے یہ ٹھیک ہی ہوگا۔ اس لیے کہ اگر احساس قوی ہو، ہر آہ سنائی دے اور ہر دکھ دکھائی دے تو ایسا ہو جائے جیسے کوئی گھاس کے اگنے اور بڑھنے کی آہٹ سننے لگے اور ہر جان دار کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگے اور شاید ہم اس ہیبت ناک شور کی تاب نہ لا سکیں جو بپتا کے اس سناٹے میں چھپا ہوا ہے۔ ....

میری التجا آپ سے یہ ہے کہ اس دکھ کو دور کرنے کے لیے آپ کمر باندھیں۔ ... آپ کے سامنے ایک مہتم بالشان کام ہے۔ مضبوط دل اور بلند ہمت لوگوں کے کرنے کا کام ہے خود غرضوں کے لیے پیسے کمانے کا موقع رکھی)، ہے مگر ان کے سینے پر ہمیشہ یہ بوجھ رہے گا کہ انھوں نے اپنے بنی نوع، اپنے ہم قوموں کے افلاس، جہل، غلامی، بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ دھات کے سکے جمع کر لیے اور اپنی قوم کو اس سے نجات دلانے کے مبارک کام میں

ہاتھ نہ بٹایا . . . . دولت کے رنگ سے قومی زندگی کے جوہر کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی چیز اتنی موثر نہیں ہوتی جتنا کہ بے غرض کام کرنے والوں کا ایسا گروہ جو اس کے طوق زریں کا آرزو مند نہ ہو بلکہ جس کی ساری توجہ حق کی تلاش، سچ کے پرچار اور انسانوں کی خدمت کے لیے وقف ہو۔"

اس ضمن میں اس عظیم الشان کارنامے کا ذکر بھی ضروری ہے جو ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کے میدان میں انجام دیا۔ اس طریقہ تعلیم کا خیال اپنی ابتدائی شکل میں مہاتما گاندھی کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ سیاست اور سماجی اصلاح کے سلسلے میں جو کام کر رہے ہیں اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک تعلیم کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں اور زندگی کے صالح تقاضوں کے ساتھ اس کا صحت مند رشتہ قائم نہ کیا جائے۔ گزشتہ دو سو برس سے یہ رشتہ ٹوٹ گیا تھا اور تعلیم کتاب اور لفظوں کے گورکھ دھندوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کام جو اس میں جان ڈالتا ہے، جو شخصیت کی تربیت کرتا ہے سکول کی چار دیواری کے اندر بار نہ پا سکتا تھا۔ اس لیے انھوں نے قوم کے سامنے تعلیم کا ایک ایسا تصور پیش کیا جو علم اور عمل میں، ہاتھ کے کام اور کتابی تعلیم میں جسم اور دماغ میں فرد اور سماج میں اور سماج کے مختلف طبقوں میں جو تضاد پیدا ہو گیا ہے دور کر کے ان میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ جب ان کی بلائی ہوئی کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی تو اس کے ایک ممبر ذاکر صاحب بھی تھے۔ ان کی ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد قابلیت اور خلوص اور خوبی تقریر سے ہر کمیٹی اور کانفرنس پر چھا جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی وہی حادثہ پیش آیا۔ کانفرنس بحیثیت مجموعی ان کے خیالات سے کافی متاثر ہوئی اور اس لیے گاندھی جی کی نظر انتخاب نے ذاکر صاحب کو اس کمیٹی کی صدارت کے لیے چنا جو اسکیم کو مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی۔ چنانچہ ان کی قیادت میں قومی تعلیم کی وہ اسکیم تیار ہوئی جو بنیادی تعلیم کے نام سے مشہور ہے اور خواہ اس میں کتنی ہی ترمیم اور تبدیلی ہو، مجھے یقین ہے کہ اس پر ان کی چھاپ قائم رہے گی۔ انھوں نے اپنی دوراندیشی اور تعلیمی نظر سے کام لے کر اس اسکیم کو، جو اس وقت تک سرکاری حلقوں میں مردود اور عام تعلیمی حلقوں میں مشتبہ تھی، بڑی حد تک حشو و زوائد اور افراط و تفریط کی آمیزشوں سے پاک کیا اور اپنی قوت استدلال سے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کے ممبروں اور دوسرے ماہرین تعلیم کو اس کی تائید پر آمادہ کیا۔ گاندھی جی کے خیالات تو ایک خلاق ذہن اور زندگی کے نبض شناس کے خیالات تھے۔ ذاکر حسین کمیٹی نے ان کو تعلیمی تصورات اور جانی بوجھی تعلیمی اصطلاحوں کے سانچوں میں ڈھالا اور اس کی معنویت کو اجاگر کیا اور اس طرح ایک تعلیمی صناع کی تراش و خراش

کے بعد وہ اس شکل میں قوم کے سامنے آئی کہ فنی نقطۂ نظر سے اس پر جو بنیادی اعتراض کیے جا رہے تھے وہ بڑی حد تک بند ہو گئے۔ لیکن بعض اعتراض، باوجود اس تمام کوشش کے جاری رہے جن کی تشریح اور تنقید کا نہ یہاں موقع ہے نہ ضرورت۔ ان میں ایک اعتراض یہ تھا (زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے جن کی اپنی زندگی کتاب اور لفظی تعلیم کے طلسم میں اسیر رہی تھی) کہ اس میں ہاتھ کے کام کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اس کو ابتدائی تعلیم کے ایوان میں مقام اعزاز دیا گیا تو مدرسے کارخانے بن کر رہ جائیں گے۔ تعلیم کے حقیقی اصولوں اور مقصدوں کو اسکیم کے اقتصادی اغراض پر قربان کر دیا جائے گا، بچوں کی ذہنی تربیت ناممکن ہو جائے گی اور ہمارا نیا نظام تعلیم اقبال اور ٹیگور جیسے افراد پیدا نہ کر سکے گا!

ذاکر صاحب نے گزشتہ پچیس برس میں یعنی جب سے اس اسکیم نے جنم لیا مختلف طرح سے بڑے دل کش اور دل نشین انداز میں اس حقیقت کو سمجھایا کہ انسان کی زندگی میں کام کا کیا مقام ہے وہ کام جو دیانت داری اور صداقت، مستعدی اور ذہانت کے ساتھ کیا جائے۔ اور خود جامعہ کے تعلیمی نظام اور اس کے مختلف اداروں میں وہ عملاً دس بارہ سال پہلے سے اسی اصول پر عمل کرتے رہے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ بچوں کے ذہن کی بیداری، سیرت کی پختگی، تخلیقی قوتوں کے آغاز اور جماعتی زندگی سے صالح رشتہ قائم کرنے کا بہترین ذریعہ کام ہی ہے۔ اجتماعی تہذیب و تمدن کے بہترین عناصر کو فرد اسی طرح اپنی ذات کا جزو بنا سکتا ہے کہ وہ مختلف طرح کے کام کرے، ان میں نظر اور مہارت پیدا کرے اور ان کی قدروں کو اپنے اندر جذب کرے۔ انھوں نے کام کو، جو اس سپرٹ میں کیا جائے ریاضت اور عبادت کا درجہ دیا جائے۔ اس بارے میں ان کا قول میں درج کر چکا ہوں خیال نیا نہیں، مذہب اور فلسفہ نے اور بعض ماہرین تعلیم نے بھی اس کو وقتاً فوقتاً مختلف انداز سے پیش کیا ہے لیکن ہمارے سماج میں جو ذات پات کے بندھنوں میں گرفتار ہے اور جہاں بہت سی سماجی اور اقتصادی وجوہ سے ہاتھ کے کام کو ذلیل سمجھا گیا ہے، اس صداقت کو، اس عقیدے کو از سر نو مضبوطی اور قابلیت کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ ذاکر صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا۔

انھوں نے بنیادی تعلیم کی محض تفسیر اور تعبیر ہی نہیں کی بلکہ اس کے مشکل اور دشوار گزار راستے میں جہاں بار بار غلطیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں، قدم قدم پر اس کی رہنمائی بھی کی۔ جب اندیشہ ہوا کہ یہ تحریک ایک عقیدے کی سی عصبیت اختیار کرے گی تو انھوں نے استادوں کی آزادی رائے اور عمل اور تجرباتی ذہنیت کی تائید کی۔ جب

بقول ان کے "دودھ میں اس قدر پانی ملایا گیا" کہ سکیم میں صرف پانی کا مزہ باقی رہ گیا تو انھوں نے اس کے بنیادی اصولوں کی یاد کو تازہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہاتھ کے کام کو محض خانہ پری کے طور پر شامل کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ کام کو اس کے تمام آداب اور شرائط اور احترام کے ساتھ کرنا لازم ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بچے سکول میں جو چیزیں بنائیں وہ ہر لحاظ سے اتنی اچھی ہونی چاہئیں جتنی وہ انھیں بنا سکیں اور اس قابل کہ انھیں بازار میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے۔ جب تک وہ اس طرح کام نہ کریں گے نہ ان کی شخصیت کی تربیت ممکن ہے۔ نہ ان میں صحیح قدروں کی لگن پیدا ہوگی۔ یہ بات ضروری ہے خواہ بعد میں انھیں فروخت کرنے کی بجائے سمندر ہی میں کیوں نہ پھینک دیا جائے! جب کبھی بنیادی تعلیم کو ناسمجھ اور تخیل سے عاری استادوں اور "ماہرین تعلیم" نے اس طرح چلایا کہ ڈھانچا رہ گیا اور روح نکل گئی انھوں نے جرأت کے ساتھ انھیں ٹوکا کہ اس طرح کے مدرسے چلانا ریاکاری ہے یا انھیں صحیح اصولوں پر چلاؤ ورنہ بند کر دو۔ ابتدا سے اب تک ان کا رویہ اس تحریک کے ساتھ انصاف کا رہا ہے جنبہ داری کا نہیں!

یہ خیال غلط ہوگا کہ ذاکر صاحب کو اپنے کام میں مخالفتوں اور بدگمانیوں کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ ان کی دیانت خلوص اور قابلیت پر شاید ان کے بدترین مخالفوں اور نقادوں نے بھی شبہ نہیں کیا۔ لیکن جامعہ کے کام اور اس کے بعد بنیادی تعلیم کی سرگرمی کے سلسلے میں ان پر بہت سی بدگمانیاں اس وجہ سے کی گئیں کہ وہ اس وقت ایک لحاظ سے مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے جدا تھے وہ جانتے تھے کہ کانگریس اور لیگ میں جو رسہ کشی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہر سوال کو ایک خاص فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کسی چیز کو انصاف کی ترازو میں نہیں تولا جاتا۔ مثلاً ان پر ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ انھوں نے خود کو ایک ایسی تحریک کے ساتھ وابستہ کیا جو گاندھی جی سے منسوب تھی۔ اس کا ایک مختصر جواب تو یہ ہے کہ "حکمت تو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے جہاں کہیں وہ اسے مل جائے وہ اس کا حقدار ہے۔" اگر حکمت کا کوئی پہلو تعلیمی صداقت کی کوئی کرن ذاکر صاحب کو گاندھی جی کے سرچشمۂ فیض سے ملے تو وہ اس کو کیوں قبول نہ کریں؟ ناواقفوں اور ناسمجھوں کے اعتراض کی وجہ سے کسی چیز کو مسترد کرنا دانشمندی کا ثبوت نہیں، تعصب کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ بھی یاد رہے کہ اس خاص تعلیمی تحریک میں ذاکر صاحب نے گاندھی جی سے جس قدر لیا اس سے بھی زیادہ دیا اور بنیادی قومی تعلیم کے تصور پر ان کا نقش اس طرح ثبت ہے کہ اس طرح مٹایا نہیں جاسکتا رہے محض جہالت کی گود میں پلے ہوئے اعتراض، تو ان کی ذاکر صاحب نے کبھی پروا نہیں کی۔ آخر جاننے والوں کے لیے نہ جاننے والوں کی رائے تو سند نہیں ہو سکتی۔

ایک دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جب اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کے لیے گنجائش نہیں تو انھوں نے کیوں اس کی تائید کی۔ اس اعتراض کا جواب تو وقت اب تک کافی وضاحت کے ساتھ دے چکا ہے اور اعتراض کرنے والوں پر یہ بھی حقیقت روشن ہوئی ہے کہ ایک غیر مذہبی (سیکولر) ریاست کے سرکاری مدرسوں میں باقاعدہ "مذہبی تعلیم" کا انتظام کرنے میں کیا کیا اور کس قدر خطرے ہیں۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ارباب اقتدار نے مذہب اور مذہبی تعلیم اپنے مفاد مخصوص کے لیے استعمال کیا ہے اور ذاکر صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کے نظام تعلیم میں سرکاری طور پر مذہبی تعلیم کا انتظام کر کے یہ خطرہ مول لیا جائے۔ اس لیے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ مسلمان جو مذہب سے شغف رکھتے ہیں خود مذہبی تعلیم کا ایک آزاد نظام قائم کریں اور اس کو ایک جماعت کی حیثیت سے چلائیں۔ لیکن اس وقت کی مخالفت تو زیادہ تر محض مخالفت کی خاطر تھی اور ان کی اس مناسب تجویز پر کوئی موثر اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ ایک دفعہ حکومت ہند کے مرکزی تعلیمی بورڈ کی ایک کمیٹی میں مذہبی تعلیم کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ ہوسکتی ہے یا نہیں ہوسکتی؟ ہونی چاہیے یا نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے کیا فوائد ہیں اور کیا خطرے؟ ذاکر صاحب نے مضبوطی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، اس کی اہمیت جتائی اور بتایا کہ کسی نہ کسی مناسب تشکل میں اس کا انتظام ضروری ہے۔ لیکن بالآخر کثرت رائے سے یہ طے ہوا کہ مشترک مدرسوں میں تمام مذہبوں اور فرقوں کی تعلیم کا انتظام نہیں ہوسکتا۔ جلسہ ختم ہوتے پر ایک ممبر جو مذہبی تعلیم کی حمایت میں بہت سرگرم تھے ذاکر صاحب کے پاس آئے اور بولے "ذاکر صاحب آپ نے تجویز پیش کر کے مسلمانوں کے لیے مختصر سا ایک رسالہ دینیات کا نصاب میں رکھا دیا ہوتا تو مسلمان بھی خوش ہو جاتے اور کوئی مشکل بھی پیش نہ آتی کوئی نہ کوئی استاد اسے پڑھا ہی دیتا۔ آخر ہر مدرسے میں اردو کا مدرس تو ہوگا ہی!" ذاکر صاحب نے غالباً دل ہی دل میں انا للہ پڑھ کر ان کی سمجھداری اور سنجیدہ مذہبیت کی داد دی ہوگی۔

لیکن ذاکر صاحب کی مذہبیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا تصور دوسرا ہے۔ ان کے دل و دماغ میں مذہب کی گہری محبت اور عقیدت ہے اور اس کی قدروں کی سچی پرکھ چنانچہ مروجہ اسلامی درسگاہوں کی ناقص تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے اپنے "تعلیمی خطبات" میں لکھا ہے اور ان کی نظر اس مقام پر پہنچی جہاں معترضین کے طائر خیال نے پر نہیں مارا۔

"مذہب کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا چھوٹتا تو کیسے مگر اس طرح قائم رکھا جائے کہ دوسرے ارادوں میں بھی مانع نہ ہو اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے! معاملات پر کہ اہل دنیا سے متعلق ہیں اس کی تعلیمات اور حکمتوں کو زیادہ نہ ابھارا

جائے۔ چپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہل دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے۔ البتہ عقائد و عادات پر زبانی زور رہے اور عملاً رخصت! اور ہاں، احساس مذہبیت کے باب میں خود فریبی کے لیے مذہب کے ان حصوں پر جو ماوراء عقل ہیں، عقلی بحثیں بھی ہوتی رہیں تو مضائقہ نہیں یعنی بقول اقبال ؎

محو ذکر و فکر صبح گاہی ہیں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

ذاکر صاحب اس قسم کی مذہبی تعلیم کے قائل نہیں۔ ان کی نظر میں مذہب اس قدر اہم اور بنیادی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں زندگی کی تمام دوسری قدریں، دوسرے اغراض، دوسری مصلحتیں بے وزن ہیں اگر وہ روح مذہب کی نفی کریں۔ وہ مذہب کے معاملے میں کسی خود فریبی کو کسی دھاوے کے انتظام سے اطمینان حاصل کرنے کو نہ صرف ذہنی بد دیانتی سمجھتے ہیں بلکہ گناہ۔ اسی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ مذہبی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ وہ افراد کی زندگی کے ہر پہلو پر نظر انداز ہو اور دین و دنیا دونوں کے معاملات میں افراد اس کے اصولوں پر کار بند ہونا سیکھیں۔ اس کے ذریعہ لوگوں میں روا داری، فراخ دلی، اقدار اعلیٰ کے ساتھ وابستگی پیدا ہو اور وہ زندگی کی نعمتوں اور خود زندگی کو امانت سمجھیں۔ ان کے مذہب کے تصور میں کسی قسم کی تنگی اور تنگ نظری کو بار حاصل نہیں۔ چنانچہ بنیادی اسکیم میں اخلاقی تعلیم اور سماجی علوم کی تعلیم کا جو نصاب تجویز کیا گیا اس میں ہندوستان کی مختلف مذہبی جماعتوں کے تہذیبی کارناموں اور ان کے خیالات اور عقائد کو جگہ دی گئی ہے تاکہ ان میں گزشتہ سیکڑوں برس سے جو باہمی داد و ستد رہی ہے اور ان کے فقیروں، سنتوں، صوفیوں، رشیوں اور دوسرے مردان خدا نے محبت اور ہمدردی کا جو پیغام اس سرزمین میں پھیلایا ہے وہ سب طلبہ کی ذہنی اور جذباتی میراث بن سکے۔ اس قسم کی تعلیم نہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن کی نقیض نہیں بلکہ روح اسلام کے عین مطابق ہے۔ ممکن ہے یہ بات مذہب کے ان ٹھیکیداروں کی سمجھ میں نہ آئے جو اس کی معنویت سے ناواقف ہیں یا باہمی مخالفتوں اور تعصب کو ہوا دے کر اپنی پوزیشن کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن آزاد اور اقبال، ذاکر اور ٹیگور اور گاندھی اور رادھا کرشنن کا مذہب کا تصور یہی ہے اور یہ کوئی بُرے مفسر نہیں ہیں مذہب کے! اسی لیے اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے مخالفت اور بدگمانی کا سودا کیا اور جان بوجھ کر کیا۔ کسی فوری سیاسی غرض یا سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے وہ حق پسندی کے جوہر کو کس طرح قربان کرتے؟ ان کی رگ احتساب ہمیشہ اس وقت خاص طور پر بیدار ہوتی ہے جب کم عیار لوگ جذبات کی لہروں میں بہہ جاتے ہیں اور پاسبان عقل سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ تعلیم کا اصلی مقصد شریف، سچے اور دلیر افراد پیدا کرنا ہے جو بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے سربکف ہیں، اگر ایک اچھے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تہذیب اور تمدن، اپنے مذہب اور فلسفے اپنے ادب اور آرٹ کے خزانوں سے انسانی تہذیب کے کیسے کو مالا مال کرے اگر ایک اچھے ہندوستانی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک روادار، فراخ دل اور سچے معنی میں مہذب انسان ہو، اگر تعصب تنگ نظری، خود غرضی افراد اور جماعتوں دونوں کے لیے بری ہیں، اگر حق کی حمایت انسان کا فرض ہے خواہ اس میں اپنوں کا ساتھ چھوڑنا پڑے، اگر باطل سے جنگ کرنا ضروری ہے خواہ سارا زمانہ اس کی تائید کرتا ہو، اگر انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنا اور غیروں کا احتساب سختی اور غیر جانب داری سے کرے اور حق کے معاملے میں نہ اپنا اپنا ہو نہ غیر غیر، اگر یہ سب باتیں صحیح ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ تعلیم کے ذریعہ ذاکر صاحب جن قدروں کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے لیے بلکہ عام انسانیت کے لیے قابل احترام ہیں اور ذاکر صاحب کا شمار ان تخلیقی اثرات میں ہے جنھوں نے ہماری تعلیم اور ہماری نئی نسل کی ذہنیت کو ایک بہتر سانچے میں ڈھالا ہے۔ اس خاموشی اور صبر اور خوش دلی کے ساتھ جس طرح سورج کی روشنی مٹی کی تاریکی میں بیج کو پالتی ہے اور بارش کا پانی نازک پودوں کو پروان چڑھاتا ہے اور انھیں تازگی بخشتا ہے۔

ایک انگریز مصنف کا قول ہے کہ بعض لوگ پیدائشی بڑے ہوتے ہیں۔ بعض اپنی کوشش سے بڑائی حاصل کرتے ہیں اور بعض پر بڑائی زبردستی عائد کر دی جاتی ہے۔ دنیا میں اکثریت تیسرے قسم کے بڑے لوگوں کی ہے اور یہی گروہ ہے جو دوسرے انسانوں پر عافیت کے راستے بند کر دیتا ہے دوسری قسم کے لوگ بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ وہ اپنی محنت سے پھل حاصل کرتے ہیں اس لیے قابل تعریف ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ جن کی پیشانی پر بچپن ہی سے بلندی کا ستارا روشن ہوتا ہے شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ قدرت، جو اوسط اور گھٹیا نمونے بنانے میں بہت مشاق اور فیاض واقع ہوتی ہے اعلیٰ نمونوں کی تشکیل میں بہت جزرسی سے کام لیتی ہے۔ لیکن سچی عظمت حاصل کرنے کے لیے ایک سخت شرط یہ ہے کہ فرد میں بڑا بننے کی فطری صلاحیت ہو اور پھر وہ اپنی محنت اور کوشش سے ان صلاحیتوں کے جوہر کو ابھارے۔ جب وہب اور کسب کا قرآن السعدین ہو جاتا ہے اس وقت انسان برتر کی تشکیل وجود میں آتی ہے۔ ذاکر صاحب کی ذات میں یہی امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے قدرت سے غیر معمولی صفات پائی ہیں لیکن وہ اس میراث پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ گئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم، محنت اور جفاکشی

تفکر اور تدبر کے ذریعہ اپنی فطرت کے سونے کے کندن اور اپنے دماغ کی روشنی کو شعلہ برق بنا دیا۔ میں نے ان کے بعض بڑے بڑے کاموں اور خیالات کا ذکر کیا ہے لیکن ذاکر صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کارناموں سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ آپ ان کے تمام کارناموں کو گنا دیجئے، ان کی تمام دماغی قابلیتوں کی فہرست تیار کر لیجئے اگر جی چاہے تو اس میں ان کا سراپا بھی شامل کر دیجئے لیکن ذاکر صاحب کی تنوع اور شاداب شخصیت ان تمام چیزوں کے مجموعے سے بھی بڑی ثابت ہوگی جس طرح ایک چابک دست مصور کا شاہکار اس کے رنگوں، لکیروں اور دائروں سے بڑھ کر کوئی چیز ہوتا ہے جیسے اس میں اپنی ایک انفرادی روح پیدا ہو گئی ہے جو اس کو حسن اور کشش بخشتی ہے۔ ان سے مل کر انسان ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی میں کچھ زیادہ فراخی زیادہ گہرائی زیادہ گرمی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی شخصیت ایک "دینے والی" شخصیت ہے۔ ایک فیض جاری ہے، ایک چشمہ رواں ہے جس سے لوگ آتے ہیں اور مستفید ہوتے ہیں لیکن "دینے" کے انداز میں ایسی شرافت، دلکشی اور انکسار ہے کہ لینے والے پر گراں نہیں گزرتا۔ اس میں کچھ دخل ان کے اس گہرے خلوص کو ہے جو ان کی زندگی کے ہر پہلو پر رحمت کی طرح چھایا ہوا ہے اور کچھ انداز گفتگو کا کمال ہے، جس میں صداقت، ظرافت وضاحت خیال، شفقت، جوش اور سادگی کا ایسا حسین امتزاج ہے جو آج کل بہت شاذ دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک زمانے میں لوگ گفتگو کو فن لطیف سمجھتے تھے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے بزرگوں یا اہل فن کی صحبت میں بیٹھ کر باقاعدہ کسب کرتے تھے۔ اب بھی کہیں کہیں پرانے مہذب خاندانوں میں آپ کو ایسے لوگ مل جاتے ہیں جنھوں نے گفتگو کے آرٹ کو زندہ رکھا ہے اور ان کی باتوں میں اب تک وہی چاشنی اور گھلاوٹ اور فرحت کا احساس موجود ہے جو پرانے لوگوں میں پایا جاتا تھا۔ لیکن زمانے کی تبدیلی نے زندگی کی نبض اور حرکت تیز کر دی ہے، فرحت کا احساس باقی نہیں رہا اور باہمی داد و ستد اور بات چیت تک میں بھی کاروباری رنگ غالب آگیا ہے۔ لہٰذا چیخ چیخ کر بحث اور بے مزہ گپ کرنے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن زبان کو دل کے خیالات کا مخلص ترجمان بنا کر، شیرینی اور بے تکلفی سے گفتگو کرنے والے نہیں ملتے۔ ذاکر صاحب کا انداز گفتگو ان کا اپنا ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف پرانے لوگوں کا آرٹ ہے وہاں دوسری طرف وہ جوش اور سرگرمی بھی ہے وہ ذہنی جودت اور بیساختہ ظرافت بھی ہے، دلیل میں وہ تلوار کی سی کاٹ بھی ہے جس کے بغیر اس دور میں کسی ذہین، طباع اور باخبر شخص کا کام نہیں چل سکتا۔ پرانے لوگوں کی بات چیت زیادہ تر عشق و محبت، آرٹ اور فلسفہ، ادب اور تہذیب کی لطیف

بچوں تک، آپ بیتی اور جگ بیتی کے واقعات اور تجربات تک محدود تھی۔ لیکن ذاکر صاحب کی گفتگو میں مذہب، سیاست، معاشرت، رومان، قصے کہانیاں، لفظی کارٹون، طب دنیا کا انجام، انسان کا آغاز غرض ہر قسم کے مباحث آجاتے ہیں اور ڈاکٹر اقبال کی طرح انھیں ہر موضوع پر کچھ کہنا ہوتا ہے اس میں مضمون اور انداز بیان دونوں کے اعتبار سے ایک خاص تازگی، جدت اور دل بستگی کا سامان ہوتا ہے۔ ان کا علم بہت وسیع ہے لیکن اس کا بار نہ ان کی شخصیت پر پڑتا ہے، نہ ان کی تحریر پر، نہ ان کی تقریر اور گفتگو پر۔ ان کے آرٹ اور خلوص اور بے ساختگی کی سبیل ان کی علمیت کی سبیل کو تھام لیتی ہے۔ ان کی انسانیت اس قدر وسیع ہے کہ اس میں چھوٹے اور بڑے کا کوئی امتیاز نہیں خواہ وہ جامعہ کے کسی بڑھئی یا معمار سے گفتگو کر رہے ہوں یا وائسرائے کی کونسل کے کسی ممبر سے مخاطب ہوں یا مدرسے کے بچوں کو کوئی بات سمجھاتے ہوں یا کسی قومی مجمع کے سامنے خطبہ دے رہے ہوں، ہر موقع پر ان کی شخصیت میں ایک مخصوص سادگی اور خلوص، معقولیت اور خوداعتمادی، سچائی اور شرافت کا جلوہ نظر آتا ہے جو مخاطب کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی بحث کا ایک دل چسپ انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے مخالف کی تمام باتیں تسلیم کر کے اس کے ہتھیار رکھا لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کے تمام مبادیات سے وہ نتائج نکال کر دکھا دیتے ہیں جو اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں! جب ان پر اطمینان اور فرصت کی کیفیت طاری ہو (جو غم عشق اور غم روزگار کی بدولت ذرا کم ہوتا ہے، عشق بھی دوسروں کی خاطر اور غم روزگار بھی!) اس وقت ان کی گفتگو ان کے دوستوں کے لیے ایک بے بہا ذہنی نعمت ہوتی ہے۔ اس وقت وہ ایسی ایسی باتیں نکالتے ہیں، ایسے نکتے پیدا کرتے ہیں، مذاق مذاق میں ایسی گہری حقیقت آشکار چیزیں بیان کر جاتے ہیں جو دوسرے ذہین اور طباع لوگ مغز کھپا کر بھی نہیں کر سکتے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اگلے روز صبح آپ ان سے کہیں کہ ذاکر صاحب کل جو اسکیم آپ نے بیان کی تھی وہ بہت خوب تھی ذرا اس کے فلاں پہلو کی تشریح تو کر دیجیے تو وہ نہایت سادگی سے جواب دیں گے "وہ تو مجھے یاد نہیں۔ آپ کہیں تو ایک اور اسکیم پیش کر دوں!"

اس مضمون پر نظر ڈالتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید ذاکر صاحب کو اچھی طرح نہ جاننے والے یہ کہیں کہ اس شخص نے ان کے بارے میں مبالغہ سے کام کیا ہے اور غالباً ذاتی مراسم قوت تنقید پر غالب آگئے ہیں۔ دوسری طرف یہ اندیشہ دامن گیر ہے کہ ان کو قریب سے جاننے والے کہیں گے کہ اس شخص نے اتنا لکھا لیکن ان کی جیتی جاگتی حساس اور روشن، نرم و گرم، با اصول اور گداز شخصیت کو "قلم بند" نہیں کر سکا۔ ان

دوستوں کو میرا جواب یہ ہے کہ آپ خود یہ کوشش کر دیکھیے اور اگر آپ زیادہ کامیاب ہوں تو شاید مجھے آپ سے کم خوشی نہ ہوگی۔ مبالغہ کا الزام لگانے والوں کی خدمت میں یہی معذرت پیش کر سکتا ہوں کہ یہ ایک ایسے شخص کے تاثرات ہیں جو طبعاً بیشتر نام نہاد "بڑے آدمیوں" سے متاثر نہیں ہوتا جس کو بارہا یہ اندازہ ہوا ہے کہ عوام جن مقدس یا طلائی بتوں کو پوجتے ہیں ان کے قفس میں اکثر خود غرضی اور تنگی چھپی ہوئی ہوتی ہے اور ان کے پاؤں گندی مٹی کے ہوتے ہیں۔ میں اس کا کیا علاج کروں کہ ذاکر صاحب کو قدرت نے جس سانچے میں ڈھالا ہے اور ان کو جن ذہنی اور اخلاقی صفات سے مالا مال کیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ اگر ایک شخص بہترین مقرر بھی ہو اور مصنف بھی، ماہر تعلیم بھی ہو اور ماہر اقتصادیات بھی، شفیق دوست بھی اور راہبر بھی، اگر وہ میر کارواں کی "نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز" رکھتا ہو لیکن لیڈری کی تنگ نظری اور خود پسندی سے پاک ہو، اگر اس کی اصول پسندی اس کی انسانیت کے گداز اور دردمندی کو کُند نہ کر سکے اور اس کی مروت اور دوستی اس کی اصول پسندی کے راستے میں حارج نہ ہو۔ اگر وہ اپنی بیشتر زندگی فقر و ایثار کی حالت میں گزار دے اور قوم کو اس کی سزا نہ دے۔ قوم پر اس کا احسان نہ رکھے، اگر ایک شخص میں یہ تمام باتیں جمع ہو جائیں تو تنقید کیا کرے؟ جب اقبال کے وہ اشعار پڑھتا ہوں جس میں انھوں نے مردِ مومن کی شان بیان کی ہے تو ان کی ذہنی تفسیر ذاکر صاحب کے خد و خال سے کرتا ہوں۔ یہ بہت بڑی تعریف ہے لیکن ان کے استحقاق سے بڑھ کر نہیں!

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز!
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم — اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز!
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز!
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز!

محمد مجیب

بنیادی تعلیم کی مہم

گاندھی جی نے ہریجن کے ایک شمارے میں جو کانفرنس کی تاریخ سے بیس دن پہلے شائع ہوا تھا، لکھا تھا:

"میں ۱۹۲۰ء میں تعلیم کے موجودہ نظام کے خلاف بڑے زور شور سے بولتا رہا تھا اور اب جب کہ مجھے سات کانگریسی صوبوں کے وزیروں کے اوپر، تھوڑا ہی سہی، اپنا اثر ڈالنے کا موقع ہاتھ آیا تو میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میرے اوپر یہ کہنے کے بعد کہ تعلیم کا موجودہ ڈھنگ بنیادی طور پر نیچے سے اوپر تک غلط ہے جو ذمہ داری آئی ہے اسے پورا کروں اور ان صفحات میں جو بات کہنے کی میں تھوڑی سی کوشش کرتا رہا تھا وہ اب ایک تجلی کی شکل میں میرے اوپر وارد ہوئی ہے، اور اس کی سچائی مجھے بے چین کیے دے رہی ہے۔ اس لیے میں اس ملک کے ماہرین تعلیم سے یہ درخواست کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ وہ میری دو تجویزوں پر غور فرمائیں اور غور کرتے وقت موجودہ تعلیمی ڈھرے سے متعلق اپنے پہلے سے سوچے اور دماغوں میں جمائے ہوئے خیالات کو اپنی عقل و فہم کی روانی میں خلل انداز نہ ہونے دیں۔۔۔

۱۔ "آج پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کی تعلیم کے نام سے جو چیز رائج ہے اس کی جگہ ابتدائی تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم ہو جو سات سال یا اس سے زیادہ کی مدت پر مشتمل ہو جس میں میٹرک تک کے معیار کی سوائے انگریزی زبان کے تمام مضامین کی تعلیم دی جائے اور اسی کے ساتھ ایک حرفہ بھی ہو۔ جسے لڑکوں اور لڑکیوں کے ذہن کی نشو ونما کے لیے گاڑی کے پہیئے کے طور پر استعمال کیا جائے۔

۲۔ ”اس طرح کی تعلیم بہ حیثیت مجموعی خود کفیل ہو سکتی ہے، اور اسے خود کفیل بنایا جانا چاہیے اور سچ پوچھیے تو اس کا یہی خود کفیل کا پہلو اس کے حقیقی ہونے کا اصل معیار ہے۔“ [1]

ہریجن کے اسی شمارے میں انھوں نے اپنے خود کفیلی کے تصور کی یہ کہہ کر وضاحت کی تھی کہ حرفوں کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ طلبا اپنے کام کے معاوضے سے اپنی تعلیم کی فیس ادا کر سکیں۔ جو حرفے یا پیشے آسانی سے سیکھے اور اختیار کیے جا سکتے ہیں، ان میں سے گاندھی جی نے حسب ذیل چیزوں کا ذکر کیا تھا: ”روئی اون اور ریشم کے اول سے لے کر آخر تک کے تمام عمل، بنائی، زینت کاری، خیاطی، کاغذ سازی، کٹائی، جلد سازی، کھلونا سازی، صندوقچہ سازی، گڑ سازی۔“ [2] کانفرنس میں بھی جہاں ایک طرف انھوں نے یہ پیش کش کی کہ اس سلسلہ میں دوسری مناسب دستکاریوں پر بھی غور کیا جا سکتا ہے وہاں یہ بھی کہا کہ ”لیکن ملک کی افسوس ناک معاشی حالت کو دیکھتے ہوئے میرا ایمان ہے کہ ہمارے مسئلے کا واحد عمل حل تکلی ہے۔ کھادی کا تعمیری پروگرام جو ۱۹۲۰ء سے جاری ہے، یہ اسی کا فیض ہے کہ سات صوبوں کے اندر کانگریسی وزارتیں قائم ہو گئی ہیں، اور اب ان کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ وہ اس تعمیری پروگرام کو کس حد تک جاری رکھتی ہیں۔ ”میں نے وزیروں کے سامنے اپنی اسکیم پیش کر دی ہے۔ اب یہ ان کے اوپر منحصر ہے کہ اسے منظور کریں یا رد کر دیں۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہی ہے کہ ابتدائی تعلیم کا محور تکلی ہی کو بنانا چاہیے۔ پہلے سال ہر چیز کی تعلیم تکلی کے ذریعہ ہو۔ دوسرے سال اس کے پہلو بہ پہلو دوسرے عمل بھی سکھائے جا سکتے ہیں۔ ۔“ [3] اسی تقریر میں پہلے گاندھی جی کہہ چکے تھے: ”مثال کے طور پر تکلی چلانا سکھاتے وقت ہم طالب علم کو بتائیں کہ روئی کی کون کون سی قسمیں ہوتی ہیں، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں کس کس طرح کی مٹی پائی جاتی ہے، کپڑے کی صنعت کو ہندوستان میں کب سے اور کیوں زوال ہوا۔ ہندوستان میں برطانوی راج کب اور کیسے قائم ہوا اور انہی باتوں کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا حساب وغیرہ۔“ [4]

---

[1] Educational Reconstruction مطبوعہ ہندوستانی تعلیمی سنگھ سیواگرام، واردھا، طبع ششم ۱۹۵۶ء، ص ۲۸۔۲۷

[2] ایضاً ص ۲۸۔۲۷

[3] ایضاً ص ۴۹

[4] ایضاً ص ۴۹

اس وقت کی جذباتی فضا کو سمجھنے والا کوئی بھی شخص سمجھ سکتا تھا کہ جو لوگ اصولاً اور عملاً گاندھی جی کے پیرو تھے، وہ ان کی شخصیت کے جادو سے مسحور تھے اور خود گاندھی جی تکلی کے کرشمے سے گاندھی جی کی تقریر سے حقیقت شناس نظروں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کا مجوزہ نظام تعلیم اُن کے دیہی صنعتوں کو بحال کرنے کے پروگرام کی ایک توسیعی شکل تھی اور وہ نئی نئی بنی ہوئی کانگریسی وزارتوں سے فرمائش کر رہے تھے کہ وہ اس پروگرام کو اپنی حکومتوں کی پالیسی کے ایک جزو کی حیثیت سے اختیار کرلیں۔ کانفرنس کے شرکا پر اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ صرف یہی نہیں کہ گاندھی جی کے خیالات کو تسلیم کر لینے کے حق میں تھے۔ بلکہ ان کا یہ عقیدہ بھی ہو گیا تھا کہ ان خیالات میں ایک نیا تعلیمی نظام بھی مضمر ہے۔ ذاکر صاحب نے یہ سب کچھ بھانپ لیا تھا، اور جونہی گاندھی جی نے اپنی تقریر ختم کی انھوں نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور تقریر کرنے کھڑے ہو گئے گویا کسی چنوتی کا جواب دینے جا رہے ہوں:

"مہاتما جی سمجھتے ہیں کہ جو اسکیم انھوں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے، وہ بالکل انوکھی اور نئی اسکیم ہے، اور اسے صرف وہی لوگ تسلیم کرسکتے ہیں جو عدم تشدد اور دیہی تمدن پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ تعلیم کے میدان میں کام کر رہے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ یہ بالکل نئی اسکیم نہیں ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ سچی تعلیم صرف کام کے ذریعہ ہی دی جا سکتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بچوں کو مختلف مضامین ہاتھ کے کام کے ذریعہ پڑھائے جا سکتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ کوئی دیہی تہذیب پر ایمان رکھتا ہے یا شہرائی تہذیب پر، تشدد پر ایمان رکھتا ہے یا عدم تشدد پر۔ . . . .

یہی سبب ہے کہ بہت سے ماہرین تعلیم ہاتھ کے کام کو تعلیم کا مرکز بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں امریکہ میں اس طریقہ کو منصوبی اور روس میں جو مکھی طریقہ کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہم اپنے بچوں کو تکلی، چرخہ اور دوسرے مناسب حرفوں کے ذریعہ تعلیم دے سکتے ہیں۔"

"کسی مضمون کے کچھ ایسے پہلو بھی ہو سکتے ہیں جو تکلی کے ذریعہ نہیں پڑھائے جا سکتے تو کیا انھیں سرے سے چھوڑ ہی دیا جائے؟ جی نہیں تکلی کے ذریعے ان مضامین کے جتنے پہلو پڑھائے جا سکتے ہیں، پڑھائے جائیں گے۔ باقی پہلوؤں کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا۔ عقل کی نشو ونما ہاتھ کے کام کے ذریعے کرنا اپنا اصول تو ضرور بنانا چاہیے لیکن اسی کے

میں ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔ لہٰذا ہمیں اس کام کو اس حالت میں ہاتھ میں لینا ہوگا۔ عدم تشدد کے اوپر کامل ایمان ہو اور دلوں میں یہ عقیدہ کہ یہ اسکیم اس دماغ کی پیداوار ہے جس نے عدم تشدد کو تمام برائیوں کا واحد علاج قرار دیا ہے۔ [۱]

یہ بات یہ کہنے کی مرادف تھی کہ ذاکر صاحب اس مجمعے میں اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں اور گاندھی جی کی اسکیم کے سربستہ راز سے ناواقف، وہ گاندھی جی کی بے ادبی کر رہے ہیں لیکن خود گاندھی جی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جو ان کے ما فی الضمیر کی اصلیتوں کو سمجھ لے اور اسے صفائی اور جرأت مندی کے ساتھ کوئی شکل دیدے، اور انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ذاکر صاحب وہ شخص تھے جس کی انھیں جستجو تھی، انھوں نے ان کو پوری کانفرنس کی کمیٹی کا صدر نامزد کر دیا اور ان سے کانفرنس کی قراردادیں مرتب کرنے کی فرمائش کی۔ ذاکر صاحب نے اپنا جوہر دکھایا اور کمیٹی کو چار باتیں تسلیم کرنے پر راضی کر لیا۔ یہ چاروں باتیں اگلے دن کانفرنس نے منظور کر لیں، البتہ پروفیسر کے، ٹی، شاہ ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے ایک قرارداد سے اختلاف ظاہر کیا۔ قراردادیں یہ تھیں:

۱۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ پورے ملک میں سات سال تک تعلیم مفت اور لازمی تعلیم کے طور پر رائج کی جائے۔

۲۔ اس کا ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔

۳۔ یہ کانفرنس مہاتما گاندھی کی اس تجویز کی تصدیق کرتی ہے کہ اس پوری مدت تک تعلیم کے عمل کا محور کسی شکل میں کوئی ہاتھ کا پیدا آور کام ہونا چاہیے۔ اور دوسری تمام صلاحیتوں کو نشو و نما دینے یا ٹریننگ دینے کا سب کام، زیادہ سے زیادہ جہاں تک ممکن ہو، کسی مرکزی صرفے سے مربوط ہونا چاہیے جس کا انتخاب بچے کے ماحول کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے۔

۴۔ کانفرنس کو یہ امید ہے کہ یہ نظام تعلیم بتدریج اس قابل ہو جائے گا کہ استادوں کی تنخواہوں کا خرچ خود نکال لے۔

یہ چند اہم تبدیلیوں کے ساتھ گاندھی جی کے تصورات کا جدید اسلوب میں اظہار تھا۔ کانفرنس کے بعد ذاکر صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس کا کام اس تعلیم کا ایک نصاب مرتب کرنا تھا۔ اس کمیٹی نے اس نظام تعلیم کو جدید شکل میں مستحکم کر دیا اور اسکیم کا نام "بنیادی قومی تعلیم" قرار پایا۔ اس کے بعد جو کچھ واقع ہوا

---

[۱] "Educational Construction" ص۔ ۸۲-۸۱

ساتھ بندھ کے نہیں رہ جانا چاہیے۔

"چند باتیں میں تعلیم کے خود کفیلی کے پہلو کے باب میں کہنا چاہتا ہوں۔ اس طریقہ کا جہاں کہیں بھی تجربہ کیا گیا ہے، وہاں یہی دیکھا گیا ہے کہ تعلیم کو خود کفیل بنانا ممکن نہیں ہے۔ امریکہ میں پروفیسر ڈیوی نے بھی اسی قسم کا منصوبہ بنایا تھا جس کا بڑا پرجوش استقبال ہوا تھا لیکن انھیں چند سال کے بعد اپنے اسکول کو بند کر دینا پڑا۔ امریکہ مالدار ملک ہے اور وہاں سرمائے یا سرکاری امداد کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جب یہ تجربہ وہاں کامیاب نہ ہو سکا تو ہم اپنے جیسے ایک غریب ملک میں کامیابی کی کیا امید کر سکتے ہیں؟ آپ کہیں گے کہ ہمیں خود کفیل مدرسوں کی اس لیے ضرورت ہے کہ ہم غریب ہیں۔ . . . . لیکن یہ بھی سمجھ لیجیے کہ تعلیم کے خود کفیلی کے پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دینے میں ایک خطرہ ہے ہو سکتا ہے معلم غلاموں کو ہانکنے والے افسروں کی حیثیت اختیار کر لیں اور غریب بچوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگیں۔ اگر ایسا ہوا تو تکلی کتابوں سے بھی بُری ثابت ہوگی اور ہم اپنے ملک میں اپنے ہاتھوں پوشیدہ غلامی کی بنیاد رکھ رہے ہوں گے۔" [1]

ذاکر صاحب نے بھی ضرور دیکھا ہوگا، جیسا کہ میں نے دیکھا کہ لوگ ان کو تیز تیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کی کرشمہ کاری پر شبہ کیا تھا اور اس کے طلسم کو توڑ دیا تھا۔ شریمتی آشا دیوی نے کہا کہ ہمیں تعلیم کے تمام "بتوں" سے انکار کرنا ہوگا اور اس مسئلے پر ایک بالکل نئے نقطۂ نظر سے غور کرنا ہوگا یاد رہے کہ ہمیں ایک نئے دور کی تخلیق کرنی ہے اور ایک نیا سماجی نظام بروئے کار لانا ہے اور اس لیے ہم نے اب تک جو کچھ سیکھا تھا اسے بھلا دینا ہوگا اور "گروکل" کے اپنے قدیم تعلیمی نصب العین کی طرف مراجعت کرنی ہوگی جو تمام کا تمام ہاتھ کے کام کی ٹریننگ پر مبنی تھا [2] مہادیو بھائی ڈیسائی نے اعلان کیا کہ "خود کفیلی تعلیم کے تصور کو عدم تشدد کے فلسفیانہ پس منظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور جب تک ہم یہ بات ذہن میں نہیں رکھیں گے کہ اسکیم کا منشا ایک نئے دور کی تخلیق کرنا ہے جس کے اندر طبقاتی اور فرقہ وارانہ منافرت اور استحصال کا نام و نشان نہ ہوگا، اس وقت تک اس

---

[1] "Educational Construction" ص ۵۵-۵۳

[2] ص ۶۷

اس کا سمجھنا اس وقت تک مشکل ہے جب تک یہ نہ مان لیا جائے کہ اس اسکیم کی دو مختلف تعبیریں کی جاتی رہیں، کوئی اسے گاندھیائی نظام تعلیم کہتا تھا اور کوئی جدید۔ ذاکر صاحب نے گاندھی جی کے تئیں اپنی گہری عقیدت اور اپنے تدبر کی بنا پر ان دونوں تعبیروں کو کوئی متعین شکل اختیار کرنے سے باز رکھا۔ لیکن اختلاف اس کے باوجود قائم رہا اور اسکیم کی نوعیت سے متعلق عوام کے ذہنوں میں جو گنجلک پیدا ہو گئی تھی اس کا خاص سبب تعبیروں کا یہی اختلاف تھا۔

"بنیادی قومی تعلیم" کا دوسرا ایڈیشن مئی ۱۹۳۸ء کے اواخر میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کے دیباچے میں گاندھی جی نے لکھا تھا کہ اسکیم کا "زیادہ صحیح نام، اگرچہ وہ دل کش کم ہے، دیہی دستکاریوں کے ذریعے دی جانے والی قومی تعلیم ہوگا۔ ان کا اصل منشا ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ تعلیم سے ان کی مراد دیہی دستکاریوں کو سائنٹفک ڈھنگ پر اختیار کیے جانے والے پیشوں کی ٹریننگ تھی۔ اس کے لیے وہ سمجھتے تھے کہ تھوڑی سی عام معلومات کا ہونا لازمی ہے، خصوصاً ایسی معلومات جن سے نوجوان اپنے پیشوں کو ملک کے معاشی اور سیاسی پس منظر میں دیکھنے کے قابل ہو جائیں اور اپنے وطن کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر سکیں انھیں حصول علم کے مسئلے سے دل چسپی نہیں تھی اس لیے کہ دیہی قومی تعلیم کو خود کفیل ہونا تھا۔ چنانچہ جو ریاست اس طرح کے دیہی مدارس، قائم کرے اسے بھی انھیں خود کفیل ہی بنانا تھا یا بہ الفاظ دیگر ان کے یہاں کی بنی ہوئی مصنوعات کو خرید کر انھیں معاشی حیثیت سے مضبوط بنیاد پر کھڑا کرنا تھا۔ واردھا کانفرنس میں کانگریسی صوبوں کے وزیروں اور محکمۂ تعلیم کے ڈائریکٹروں کو جو مدعو کیا گیا تھا، وہ اسی نیت سے تھا کہ ریاست کو اس تعلیمی مہم میں ماخوذ کیا جائے۔ گاندھی جی نے ان سے کہہ دیا تھا کہ انھیں آزادی ہے کہ وہ ان تصورات کو تسلیم کریں یا رد کر دیں۔ لیکن کانگریس کے تری پورہ کے اجلاس نے جب بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم کو باضابطہ منظور اور اختیار کر لیا تو پھر اس کے بعد اس کا کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ کانگریسی حکومتیں اسے رد کر دیں گی۔ یہ اسکیم اب کانگریس کی پالیسی کا ایک جزو لاینفک تھی، ایک عقیدہ جس کے اوپر کانگریسی کے لیے ایمان لانا اور اس کی تبلیغ کرنا فرض تھا غرض یہ اسکیم صحیح اور سچی قومیت کی علامت بن گئی۔

لیکن محض اس بنا پر کہ ریاست نے اتنی عقیدت کے ساتھ اس اسکیم میں اپنے آپ کو ماخوذ کر لیا تھا اس کے اوپر عام طور پر اور بیشتر سیاسی رنگ میں نکتہ چینیاں چل پڑیں ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ کے شائع ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ نے اپنی جنوری ۱۹۳۸ء کی بیٹھک میں مسٹر بی۔ جی۔ کھیر کی صدارت میں جو اس

وقت بمبئی کے وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم تھے، ایک سب کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ وہ وڈ ایبٹ رپورٹ Wood Abot Report اور دوسری تعلیمی دستاویزوں کی روشنی میں اس بات کی جانچ کرے کہ واردھا اسکیم کے اندر تعلیمی تعمیر نو کا عنصر کہاں تک ہے ذاکر صاحب بھی اس کمیٹی کے ایک رکن تھے اور ان کی حیثیت وہاں اس امیدوار کی تھی جو اپنے مقالہ کی اس طرح وکالت کرے کہ اس کے ممتحنوں کو اس کی صحت اور حیثیت کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ بنیادی قومی تعلیم کا دوسرا نام واردھا اسکیم بھی پڑ گیا۔

مشاورتی بورڈ کی اس کمیٹی میں بیان کیا گیا ہے کہ "ذاکر صاحب کا کہنا ہے کہ اگر وہ پہلے یہ واضح کر دیں کہ واردھا اسکیم کیا نہیں ہے، تو بحث مختصر ہو جائے گی۔ اس اسکیم پر خصوصی اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ یہ اسکیم تمام تر اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی ہے کہ طالب علموں کی بنائی ہوئی مصنوعات کو فروخت کر کے تعلیم کو خود کفیل بنایا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیدا آوری کی ایک اسکیم ہے جس میں مزدوری کرنے کے لیے بچوں کی جبری بھرتی کی جائے گی۔ یہ خیال سرے سے غلط خیال ہے، یہ تعلیمی اسکیم ہے، پیدا آوری کی اسکیم نہیں ہے۔ اسکیم میں شروع سے آخر تک صرفہ اور سرگرمی کی تعلیمی قدر و قیمت پر زور دیا گیا ہے، اور معاشی مسئلے کی حیثیت بالکل ثانوی ہے۔ واردھائی اسکولوں میں تعلیم صرفے کے کام اور اصل زندگی کے ان مسائل کے توسط سے دی جائے گی جو بچے کے مادی اور سماجی ماحول میں جاری و ساری ہوں گے۔ عمل اور سرگرمیوں کے توسط سے تعلیم دینے کے اصول کو اب تمام اساتذہ نے مکمل اور ہمہ جہتی تعلیم کے مسائل کا سب سے موثر حل تسلیم کر لیا ہے۔

"واردھا اسکیم اسکولوں میں صرف پیدا آوری کی غرض سے کرائی جانے والی میکانکی مزدوری کے سخت خلاف ہے اور اس بات کو تعلیم کی ایک لازمی شرط قرار دیتی ہے کہ مرکزی صرفہ یا پیدا آور کام ایسا منتخب کیا جائے جو تعلیمی امکانات سے بھرپور ہو اور اس کے اندر اہم انسانی سرگرمیوں اور دلچسپیوں سے قدرتی ربط کے عناصر موجود ہوں۔

"ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس اعتراض کو کہ اسکیم اس کے جوشیلے مگر گم گردہ راہ مصنفوں کے بیانات کا نتیجہ ہے ناواقفیت پر مبنی قرار دیا۔ انھیں اس بات سے انکار ہے کہ اس اسکیم سے بے روزگاری دور ہو جائے گی اور سچ پوچھا جائے تو ان کی رپورٹ میں بے روزگاری کے مسئلہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے، اگرچہ ان کا خیال ہے کہ واردھا اسکولوں کے طلبہ مروجہ اسکولوں کے طالب علموں کے مقابلے میں "کام پر

لگائے جانے والے بہتر مال ثابت ہوں گے کیونکہ اسکیم کا نقشہ یہ سوچ کر بنایا گیا ہے کہ اس کے فیض سے ایسے کارگزار نکلیں گے جو ہر قسم کے کارآمد کام کو عزت کا کام سمجھیں گے اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے کے قابل ہوں گے اور اس کے لیے رضامند بھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسکیم میں نہ کہیں اس بات کا ذکر ہے اور نہ کہیں سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ کورس کے ختم ہونے پر حکومت فارغ التحصیل طلبہ کو روزگار فراہم کرے گی اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ تمام کے تمام موجودہ اسکولوں کو فوراً کے فوراً واردھائی اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے۔

"اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس اعتراض کا جواب دیا جو کسی نہ کسی شکل میں خاص کر مسلم حلقوں میں اٹھایا گیا تھا۔ اور جو یہ تھا کہ واردھائی اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی طرف سے بے اتفاتی برتی گئی ہے اور ان کا رنگ روپ غیر مذہبی (سیکولر) ہوگا۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ مذہبی تعلیم کا کوئی نصاب نہیں مرتب کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس سلسلے کی دشواریاں اظہر من الشمس ہیں، مگر یہ اسکیم جن بنیادوں پر قائم کی گئی ہے ان میں ایک بنیاد تمام مذاہب کا ادب واحترام بھی ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی تعلیم سے متعلق جو موجودہ طریقہ کار رائج ہے یعنی یہ کہ ہر فرقے کو اجازت ہے کہ وہ اپنے خرچ پر سرکاری اور مقامی حکومتوں کے اسکولوں کے طلبا کے لیے اسکول کے اوقات کے بعد مذہبی تعلیم کا انتظام کرے، اس میں نہ کہیں کسی تبدیلی کا ذکر ہے اور نہ کسی پہلو سے کسی تبدیلی کا مفہوم نکلتا ہے۔

"پھر مخلوط تعلیم کا ایک مسئلہ ہے اس کے بارے میں بھی لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ واردھا اسکیم میں کسی بھی عمر تک مخلوط تعلیم لازمی نہیں قرار دی گئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس اسکیم میں اس باب میں کوئی رائے ہی نہیں ظاہر کی گئی ہے کہ آیا مخلوط تعلیم پسندیدہ ہے یا غیر پسندیدہ۔

"ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس الزام کا بھی ذکر کیا کہ واردھا اسکیم کے تحت یونیورسٹیاں محض امتحان لینے والے ادارے ہوں گے اور اس اعتبار سے انھیں حکومت سے کوئی امداد نہیں ملے گی۔[1] اس قسم کے الزام کے خلاف

[1] گاندھی جی نے یہ بات کہی تھی۔ ملاحظہ ہو "Educational Reconstruction" ص ۳۱،۳۲ - ۱۵۳ - ۱۵۸ - ۱۶۵، ۱۶۴۔

مقابل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی رپورٹ میں ۱۴ سال کی عمر سے آگے کی ثانوی تعلیم کا کہیں کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ اگر وار دھا اسکیم کو منظور کر لیا جاتا ہے تو وار دھا اسکیم کی تنظیم سے مربوط کرکے اعلیٰ تعلیم کا ایک نظام الگ سے مرتب کرنا ہوگا۔"

وار دھا اسکیم یا بنیادی قومی تعلیم کی یہی شکل جو ذاکر صاحب نے پیش کی تھی ان لوگوں کے لیے قابل قبول ہو سکتی تھی جو گاندھی جی کے پیرو تو نہ تھے مگر نظام تعلیم میں اصلاح کی سنجیدگی کے ساتھ فکرمند تھے، اور اسکیم کو جس انداز میں ذاکر صاحب نے پیش کیا تھا اس کے کسی پہلو پر خود گاندھی جی کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ البتہ گاندھی جی اس میں کچھ باتوں کا اضافہ ضرور کرتے۔ یہ واضح کرنے کی غرض سے کہ اسکیم سے متعلق اُن کے ذہن میں جو بات تھی وہ گاؤں کے لوگ تھے جنھیں تعلیم کی راہ سے معاشی اور اصولی طور پر خود مکتفی بنانا تھا تاکہ شہروں کی ترقی اور جدید صنعتیں گاؤں کے نوجوانوں کو یکسر اپنی طرف کھینچ کر اور انھیں اصلاً طفیلی قسم کے روزگار اختیار کرنے پر آمادہ کرکے یہی ہندوستان کو تباہ نہ کر ڈالیں۔ بنیادی قومی تعلیم کے پیچھے جو خیال کارفرما تھا اس میں اس اضافے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ماہرین تعلیم اور وہ لوگ جو تعلیم کو ایک نیا رنگ دینے کے خواہش مند تھے یا تو اس سے الگ ہو جاتے یا اس کی طرف سے بے التفاتی برتتے۔ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ نے سب کمیٹی سے فرمائش کی تھی کہ وہ وڈ۔ ایبٹ رپورٹ اور دوسری تعلیمی دستاویزات کی روشنی میں وار دھا اسکیم کی جانچ کرے۔ چند سال کے بعد سارجنٹ اسکیم سامنے آئی جو جامع تو اس سے زیادہ تھی لیکن بالآخر تعلیمی تنظیم نو کے موضوع پر ایک نظریاتی کاوش ثابت ہوئی۔ ذاکر حسین کمیٹی کی پیش کردہ بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم سرکاری رقیبوں کے مقابلے پر آنے کی دعویدار تھی لیکن جس چیز نے اس کی اہمیت کو ختم کر دیا وہ تھیں بنیادی تعلیم کے موجودہ سانچے میں جڑنے والی ردوبدل کی اسکیمیں۔

مرکزی مشاورتی بورڈ کی سب کمیٹی نے اور آگے چل کر خود بورڈ نے ذاکر صاحب کی پیش کی ہوئی بنیادی تعلیم کی اسکیم کو منظور کر لیا مگر اسی کے ساتھ ان سوالات پر بھی غور کرنے کی سفارش کی جو ابتداء سے پہلے کی تعلیم سے متعلق تھے اور یہ بھی کہا کہ ان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جو اپنی تعلیم کو آگے بھی جاری رکھنا چاہتے ہوں، ثانوی اسکولوں میں داخلہ لینے کی گنجائش رکھی جانی چاہیے۔ بنیادی تعلیم کی مدت کو سات سال سے بڑھا کر آٹھ سال کا کر دیا گیا اور پھر اسے پانچ اور تین سال کی دو میعادوں میں تقسیم کر دیا گیا جو آگے چل کر پانچ سال کے "جونیر" اور تین سال کے "سینیر" بیسک اسکولوں کے نام سے موسوم ہوئیں۔ اس کے علاوہ یہ اختیار بھی دیا گیا کہ جو طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں وہ معمولی

ثانوی اسکولوں میں داخلہ لے لیں۔ جہاں انھیں انگریزی بھی سیکھنی ہوگی کیونکہ یونیورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہی تھی۔ جو لوگ بنیادی تعلیم کی پوری مدت پر مصر تھے، انھیں اس سفارش پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ مدت آٹھ سال کر دی گئی تھی اور ثانوی اسکولوں میں داخلہ لینا اختیاری قرار دیا گیا تھا، اور اس سے بنیادی تعلیم کے مسلسل کورس کی اسکیم میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا تھا۔ جہاں تک اسکیم کے خود کفیل ہونے کا تعلق تھا، تو اس پہلو کے اوپر کامل ایمان رکھنے والوں کو بھی شروع کے دو یا تین سال تک کسی قسم کی پیدا آوری کی امید نہیں تھی۔ سینیر بیسک اسکول میں ان کے حسب منشا یہ ثابت کرنے کا موقع مل سکتا تھا کہ پیشے کی تعلیم تعلیمی بھی ہو سکتی ہے اور پیدا آور بھی، تکلی کی کتائی کے ابتدائی تعلیم کے حاکموں کے اس اعلان پر کہ انھیں بنیادی اسکولوں میں تکلی کی کتائی کے علاوہ کسی دوسرے مرکزی صرفے کو اختیار کرنے پر اصرار نہیں ہے۔ ان کے ہاتھوں میں خوب کھیلے۔ تکلی کی کتائی سستی پڑتی تھی اور اس کی تعلیمی اہمیت کے اندازہ کرنے کا بار بڑی آسانی سے ان لوگوں پر ڈالا جا سکتا تھا جو اس کی تعلیمی قدر و قیمت پر ایمان رکھتے تھے۔ بنیادی اسکولوں کی تعداد میں صرف تکلیاں اور روئی فراہم کرکے اضافہ کیا جا سکتا تھا اور اگر وہ بنیادی تعلیم کے ادارے نہ ثابت ہوں تو اس کا الزام محکمۂ تعلیم یا ڈایرکٹر بہٹ کے اوپر نہیں آسکتا تھا۔ مجھے یاد ہے ذاکر صاحب شری بی۔ جی۔ کھیر سے اس بات پر بڑا احتجاج کرتے تھے کہ انھوں نے اسکول کی تعلیمی مدت کو پانچ اور تین سال کی دو میقاتوں میں منقسم کر دیا تھا۔ یہ بھی یاد ہے کہ وہ متعدد موقعوں پر کہتے رہتے تھے کہ انھیں خاص طور پر چودہ سال کی بڑی عمر اور سات سال کی پوری مدتِ تعلیم سے دل چسپی تھی۔ لیکن جن کمیٹیوں کی بحثوں میں وہ شریک ہوئے تھے ان میں ان کے اختلاف رائے کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ ان کمیٹیوں میں جو عام رائے تھی اس کا بوجھ ان کے خلاف پڑتا تھا اور عافیت اسی میں تھی کہ وہ اکثریت کے نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیں۔ انھوں نے یہ بات یقیناً محسوس کی ہوگی کہ انگریزی زبان کا سرے سے اخراج ایسی بات تھی جس پر اصرار کرنا دانش مندی نہیں ہے۔ بنیادی تعلیم کا نظام کتنا ہی جامع اور خود کفیل کیوں نہ ہو، دیہی علاقوں کے طلبا کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع سے محروم نہیں کیا جا سکتا تھا، اور جب تک اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان تھی، اسے سیکھنے کے لیے اسکول کی تعلیم کی کسی نہ کسی منزل پر بندوبست لازماً کرنا ہوگا۔

واردھا اسکیم کے خلاف مسلمانوں کے حلقوں میں بڑا شدید جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور اس کا سبب ایک تو کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی اختلافات تھے، اور دوسرے

بنیادی تعلیم کے نصاب سے مذہبی تعلیم کا اخراج، اور سی۔ پی۔ کے وزیر اعلیٰ پنڈت آر۔ ایس شکلا کا اپنے قائم کیے ہوئے اسکولوں کو " ودّیا مندر" کے نام سے موسوم کرنا تھا۔ جن لوگوں نے اس کے مسلمان دشمن ہونے کا فتویٰ صادر کیا تھا، اگر وہ اس کے نصاب پر غور کرنے کی زحمت گوارا فرماتے تو دیکھتے کہ اسلام کی تعلیمات کو جتنا نمایاں مقام اس نصاب میں دیا گیا تھا، اتنا ابتدائی درجوں کے کسی دوسرے نصاب میں نہیں دیا گیا تھا۔ مگر یہ زحمت گوارا کرنے کی کسی کو توفیق نہ ہوئی۔ ذاکر صاحب نے اپنے نصاب سے جو مذہبی تعلیم کو خارج کیا تھا تو اس کے بہت معقول اسباب تھے۔ اگر مذہبی تعلیم دینے کا اصول اختیار کر لیا جاتا تو مسلمان کو دیہی علاقوں کے اسکولوں میں اسلام کی تعلیم دینے والے معلم نہ ملتے، اور اگر مل بھی جاتے تو وہ مسلمان ہونے سے زیادہ سرکاری ملازم ہوتے اور ذاکر صاحب نے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ ایسے معلموں کے ہاتھ میں اسلام محفوظ نہیں رہے گا۔ لیکن ایک ایسی فضا میں جہاں مسلم لیگ کی ناعاقبت اندیشانہ قیادت کے زیر اثر مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اگر انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے والے مسلمانوں پر بھروسہ کیا تو وہ تباہ ہو جائیں گے۔ ذاکر صاحب کی پیش بینی اس شاطرانہ فریب نفس کا شکار ہو گئی۔ دوسرا معاملہ جس پر مسلمان بہت زیادہ بے قابو ہو رہے تھے، زبان کا معاملہ تھا۔ ذاکر صاحب اس ہندی کے عاید کیے جانے کے حامی نہیں تھے جو گاندھی جی کے تصور کی قومی زبان بننے والی ہندی نہیں تھی۔ ان کی پوزیشن بہت نازک تھی۔ وہ نہ تو اس اصول کو نظر انداز کر سکتے تھے کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان کے توسط سے دی جانی چاہیے اور نہ اس بات کو کہ بنیادی اسکول کے حلقے میں پڑنے والے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں بھی ایسے بچے مل سکتے ہیں جن کی مادری زبان بالکل مختلف ہو۔ وہ جس پوزیشن میں آگئے تھے اس کی وہ وکالت نہیں کر سکتے تھے۔ رہا اردو کے دیوانوں کا نامعقول قسم کے حملوں میں ساتھ دینا تو یہ ان کی طبیعت کے خلاف تھا اور اُن کے معیارِ تہذیب کے بھی۔

مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق ذاکر صاحب کی مشہور و معروف فدائیت اور وہ خلوص اور خیر اندیشی جو اُن کی شخصیت میں دمکتی تھی، اس نے اس مخالفت کا نشانہ بننے سے محفوظ رکھا تھا لیکن خود انھوں نے اپنے تحفظ کی کوئی تدبیر سوچے بغیر اپنے آپ کو اس غل غپاڑے میں جھونک دیا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم کے مسئلے پر غور کرنے اور اپنی رپورٹ مرتب کرنے کی غرض سے ایک سب کمیٹی مقرر کی۔ چونکہ اس اقدام سے دراصل واردھا اسکیم کی جانچ پڑتال مقصود تھی۔ اس لیے کمیٹی کے غور و بحث میں شرکت کرنے کے لیے ذاکر صاحب

کو مدعو کیا گیا۔ اسکیم کے خلاف جذبات بہت شدید اور بھڑکے ہوئے تھے اور اس کا بڑا سبب زبان کے معاملہ میں یوپی، بہار اور سی۔پی حکومتوں کی پالیسی، سی۔پی میں پنڈت آر۔ ایس شکلا کے قائم کیے ہوئے 'ودیا مندر' اور یہ مشہور عام شبہ تھا کہ اکثریتی فرقہ خالصتہً غیر مذہبی تعلیم نافذ کر کے مسلمانوں کے تمدن کو خاک میں ملانے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ سب کمیٹی میں ہونے والی بحثوں کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے لیکن ذاکر صاحب نے اس سے ایک طرح کا سمجھوتہ منوا ہی لیا جس سے کم سے کم یہ مترشح ہوتا تھا کہ سب کمیٹی اسکیم کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کرنے کی سفارش کرتی ہے یعنی یہ کہ تعلیم مادری زبان کے توسط سے دی جانی چاہیے کم سے کم سات سال کی مدت پر محیط ہونی چاہیے اور کارآمد قسم کے ہاتھ کے کسی کام کے محور پر منظم کی جانی چاہیے۔ ذاکر صاحب کے مخالفوں نے اپنی تسلی کے لیے رپورٹ میں ایک دیباچہ جوڑ دیا جس میں کہا گیا تھا کہ واردھا اسکیم کو اس کی موجودہ شکل میں مسترد کر دینا چاہیے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں جو پہلی، دوسری اور تیسری اکتوبر ۱۹۳۸ء کو پٹینہ میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ضیاالدین نے وہ تجویز پیش کی جس میں سب کمیٹی کی سفارشات مرقوم تھیں۔ ذاکر صاحب اجلاس میں موجود نہیں تھے [1] اور اجلاس میں جس وقت اس تجویز پر بحث ہو رہی تھی بے انتہا غل غپاڑہ ہوا اور کھلی غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا گیا۔ لیکن بایں ہمہ تجویز کثرت رائے سے پاس ہو گئی ۱۹۳۸ کے پورے سال اور ۱۹۳۹ء کے نصف اول میں بنیادی تعلیم کے اصولوں کی تشریح و توضیح اور ان کے اطلاق کے معاملے میں رہنمائی کرنے کی غرض سے ذاکر صاحب کی بڑی مانگ تھی۔ جب وہ دہلی سے باہر کسی کام میں مصروف نہیں ہوتے تھے نو دہلی میں ان سے ملاقات کرنے والے افسروں اور انتظام کاروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ لوگ اتنی باتیں کرتے تھے کہ طبیعت جھلا جھلا اٹھتی تھی۔ اور چونکہ ذاکر صاحب کا وقار اور کسی قدر اثر بھی تھا اس لیے قریب قریب ہر شخص جسے بنیادی تعلیم سے دلچسپی ہوتی، ان سے یہ درخواست بھی کرتا کہ وہ اس کے تقرر یا ترقی کے معاملے میں دلچسپی لیں۔ یہ اس لیے کہ ہر ریاست میں جہاں بنیادی تعلیم رائج کی جانے والی تھی، بہت سے عہدے قائم کیے جا رہے تھے۔ جہاں تک میری یادداشت کام

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کو کانفرنس کی صدارت کرنے کے لیے مدعو کیا جانے والا تھا۔ لیکن پٹینہ کے منتظموں نے اصرار کیا کہ کانفرنس کے صدر بنگال کے وزیر اعلیٰ اے۔ کے فضل الحق بنائے جائیں۔ کانفرنس کے انعقاد کے وقت ذاکر صاحب کشمیر میں تھے۔

کرتی ہے، یہ تمام کام ذاکر صاحب بغیر کسی سکریٹری کے انجام دیتے تھے۔ جامعہ ملیہ کے پاس اتنے وسایل نہیں تھے کہ وہ ان کے لیے کسی سکریٹری کا بندوبست کرتی، اور نہ کوئی صوبائی حکومت یا اور کوئی جماعت ایسی تھی جو اپنے قواعد وضوابط کے ماتحت یہ انتظام کر سکتی۔ ۱۹۳۹ء کے وسط میں ان کی آنکھ کی بیماری (گلوکوما)، نے انھیں پھر تنگ کرنا شروع کر دیا، اور انھیں محسوس ہوا کہ اگر انھوں نے دم نہ لیا تو دھم سے نیچے آ رہیں گے۔ وہ اپنی آل انڈیا ریڈیو کی پندرہ روزہ تقریروں کے لیے بین الاقوامی معاملات کا برابر مطالعہ کرتے رہے تھے اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ جنگ نہیں ہوگی۔ لہذا وہ آرام کرنے اور علاج کرانے کی غرض سے جرمنی چلے گئے۔

ذاکر صاحب کبھی ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے سیوا گرام جاتے تو ان کے ساتھ میں بھی ہمیشہ جایا کرتا تھا۔ جلسہ کے بعد بالعموم گاندھی جی سے ملاقات کا ایک دن رکھا جاتا تھا جس میں ذاکر صاحب گاندھی جی کو جلسے میں ہونے والی بحثوں کی روداد پیش کرتے تھے۔ یہ ملاقات بہت مزیدار اور دلنواز ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب گاندھی جی کی صحبت میں بیٹھے حیرت انگیز طور پر منکسر نظر آتے، اور ان کا انداز اس نوجوان کا سا ہوتا جو کسی بزرگ سے باتیں کر رہا ہو اور جسے بزرگ کی شفقت اور اعتماد کا کامل یقین ہو۔ ادھر گاندھی جی کے بھی انداز و اطوار سے اس شخص کے تئیں اعتماد و یقین کا نور دمکتا جسے انھوں نے اپنے عزیز ترین تصور کو جامۂ تکمیل پہنانے کا کام سپرد کر رکھا تھا۔ کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف ہے۔ اختلافات تو دونوں کے درمیان تھے مگر تصور پرست نہ گاندھی جی تھے اور نہ ذاکر صاحب۔ مجھے ایک واقعہ یاد ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کو تعلقات کو نبھانے کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ ہندوستانی تعلیمی سنگھ جامعہ ملیہ کے استادوں کے مدرسے کو مبلغ تین ہزار سالانہ کی امداد دیتا تھا اور اس حیثیت سے اس کا مجاز تھا کہ اس کے پاس مدرسہ کی سالانہ کارگزاری کی رپورٹ پہنچتی رہے۔ لیکن پہلے ہی سال مدرسے کے پرنسپل نے آخری وقت میں اپنی معذوری کا اظہار کیا کہ رپورٹ تیار نہیں ہو سکی ہے۔ میں اس مجلس میں موجود تھا۔ ذاکر صاحب نے بجائے اس کے کہ کسی سے شکوہ شکایت یا تنبیہہ کرتے چپکے سے کاغذ کے چند پرزے لیے اور رپورٹ کا مسودہ تیار کرنے لگے۔ سنگھ کے جلسے میں انھوں نے وہ رپورٹ پڑھ کر سنائی، اپنے اردگرد ایک نظر ڈالی اور کہا۔ "اچھی خاصی رپورٹ ہے، کیوں؟" سنگھ کے اراکین رپورٹ سے بہت خوش ہوئے۔ رپورٹ، اس میں شک نہیں، تھی بھی نہایت عمدہ۔ ایک ایسے شخص سے جو کسی کام کا سہرا جو اس نے خود انجام دیا ہو، خوشی سے اپنے رفیق کار کے سر رکھ دیے،

یہ امید کیوں کر ہو سکتی ہے کہ وہ گاندھی جی سے کتائی کے کام کی تعلیمی قدر کے معاملے میں جھگڑا کرے گا۔

لیکن جب کبھی ڈاکر صاحب بنیادی تعلیم کے اصولوں کے باب میں اپنا ذاتی نقطۂ نظر ظاہر کرتے، تو صاف صاف کہہ دیتے تھے کہ حرفے سے ان کی مراد 'کام' ہے۔ اور ان کے تصور کا بنیادی اسکول ایک ایسا مقام ہوگا جہاں سیکھنے کا عمل 'کام' کے ذریعہ انجام پذیر ہوگا۔ کام کے مدرسہ کی سب سے جامع تعریف وہ ہے جو انھوں نے بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں پیش کی تھی۔ یہ کانفرنس جامعہ ملیہ میں اپریل ۱۹۴۱ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس خطبے میں انھوں نے کہا تھا:

"جب ہم تعلیم کے سلسلے میں کام کا ذکر کریں تو ہمیں وہی کام دھیان میں رکھنا چاہیے جس سے تعلیم ہو۔ ذہن کی تربیت ہو، آدمی اچھا بنے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کا ذہن اپنے کیے کو پرکھ کر اس کے اچھے برے پر نظر کرکے، ترقی کرتا ہے اور آدمی جب کچھ بناتا ہے یا کوئی کام کرتا ہے چاہے یہ کام ہاتھ کا ہو، چاہے دماغ کا تو اس کام سے اسے ذہنی تعلیمی فائدہ اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ اس کام کا پورا پورا حق ادا کرے۔ اس کام کے لیے اپنے کو ذرا نیچے اپنے اوپر قابو پائے۔ کام سے تعلیمی فائدہ وہی اٹھاتا ہے جو اس کام کا حق ادا کرنے میں اسی کام کے ڈسپلن کو اپنے اوپر اوڑھ لے۔ اس لیے ہر کام تعلیمی جبھی ہو سکتا ہے کہ اس کے شروع میں ذہن کچھ تیاری کرے۔ جس کام میں ذہن کو دخل نہ ہو، وہ کام مردِ مشین بھی کر سکتی ہے۔ اور اس سے ذہن کی تعلیم یا تربیت نہیں ہوتی۔ کام سے پہلے کا نقشہ، کام کا خاکہ ذہن میں بنانا ضروری ہے۔ پھر دوسرا قدم بھی ذہنی ہوتا ہے، یعنی اس نقشے کو پورا کرنے کے ذریعہ سوچنا، ان میں سے کسی کو لینا، کسی کو چھوڑ دینا۔ تیسرا قدم ہوتا ہے کام کو ان چنے ہوئے ذریعوں سے کر ڈالنا اور چوتھا قدم ہے کیے ہوئے کام کو پرکھنا کہ جو نقشہ بنایا تھا جو کرنا چاہا تھا وہی کیا اور جس طرح کرنے کا ارادہ کیا تھا اسی طرح کیا یا نہیں اور نتیجہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اسے کیا جاتا۔ یہ چار منزلیں نہ ہوں تو تعلیم کا کام ہو ہی نہ سکے گا۔ لیکن یہ چاروں ہوں تب بھی ہر کام تعلیمی نہیں ہو جاتا۔ ہر ایسے کام سے کچھ ہنرمندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، چاہے ہاتھوں کی ہنرمندی ہو چاہے ذہن کی چاہے زبان کی۔ لیکن ہنرمندی تعلیم نہیں ہے۔ تعلیم پائے ہوئے آدمی کی جو تصویر ہم سب کے سامنے

آتی ہے اس میں صرف ہنرمندی کا لنگ نہیں ہوتا۔ ہنرمند چور بھی ہوتے ہیں، ہنرمند دھوکے بھی دیتے ہیں، ہنرمند سچ کو جھوٹ بھی کر دکھاتے ہیں۔ ایسی ہنرمندی تو تعلیم کا مقصد نہیں ہو سکتی۔ تعلیمی کام وہی کام ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت کرے جو ہماری خود غرضی سے پرے ہو اور جسے ہم مانتے ہوں۔ جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنرمند ضرور ہو جاتا ہے مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کام کا حق ادا کرتا ہے، اپنا مزہ نہیں ڈھونڈھتا۔ اس سے وہ آدمی بنتا ہے، اپنا اخلاق سنوارتا ہے، اس لیے کہ اخلاق اور ہے کیا اس کے سوا کہ جو قدریں ماننے کی ہیں ان کی سیوا میں آدمی اپنی خواہشوں، اور لالچوں اور مزوں کو دبائے اور اس قدر کی پوری پوری سیوا کرے، اور اس سیوا کا جو حق ہے، وہ پورا پورا ادا کرے۔ کام کی یہ صفت ہاتھ کے کام میں بھی ہو سکتی ہے، اور دماغ کے کام میں بھی، اور ہاتھ کا کام بھی اس سے خالی ہو سکتا ہے اور دماغ کا کام بھی سچے کام کا مدرسہ وہی ہے جو بچوں میں کام سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالے تاکہ کام سے اس بات کی عادت سی ہو جائے کہ جب کبھی کوئی کام کریں، ہاتھ کا یا دماغ کا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔"

بنیادی تعلیم کی مہم ذاکر صاحب کے لیے اس وقت ختم ہو گئی جب انھوں نے ہندوستانی تعلیمی سنگھ سے ۱۹۴۸ء میں استعفیٰ دے دیا۔ اس کے دس سال کے بعد انھوں نے وگیان بھون (نئی دہلی) میں بارھویں، تیرھویں اور چودھویں دسمبر کو پٹیل میموریل لکچر کے خطبے دیے۔ اس میں انھوں نے بنیادی اسکولوں کے بارے میں اپنا آخری فیصلہ صادر کر دیا۔ انھوں نے کہا: "ہم نے اپنے ملک میں بنیادی اسکولوں کے نام جو کام کے مدرسے قائم کرنے کی کوشش کی تھی، ان کے بارے میں میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی رائے صفائی سے ظاہر کر دینی چاہیے۔ میں کچھ کہوں گا وہ میرے مشاہدوں اور ان تاثرات پر مبنی ہو گا جو ان مدرسوں نے میرے ذہن پر قائم کیا ہے۔ میرے یہ خیالات کسی باقاعدہ اور بے لاگ مطالعے کا نتیجہ نہیں ہیں۔ وہ پورے ہندوستان کا بھی احاطہ نہیں کرتے۔ مگر اس بنیاد پر کہ بنیادی اسکولوں کے مقاصد اور اس سے نکلنے والے نتائج کے باب میں میرے کچھ خیالات ہیں، اور میں نے ادھر ادھر کے اچھے خاصے نمونے دیکھے ہیں، مجھے آپ کے سامنے یہ کہنے کی جرأت

ہو رہی ہے کہ کام کے ایک خوش تنظیم مدرسے کو آسانی سے جتنی کامیابی حاصل ہو سکتی تھی، وہ حاصل نہیں ہوئی۔ اس صورت حال کے بہت سے اسباب ہیں۔ جن میں سے بیشتر تنظیمی نوعیت کے ہیں۔ لیکن ایک نہایت اہم سبب تعلیمی سبب بھی ہے اور وہ یہ کہ ان اسکولوں میں ہم نے بالعموم کام کی لازمی تعلیمی شرطوں کو ملحوظ نہیں رکھا ہے جس طرح ہم کتابی علم کے نام نہاد علمی اسکول کو حافظے کی میکانکی تربیت کے اسکول کی شکل میں تبدیل کر سکتے ہیں، اور خدا کے فضل سے اب تک سیکڑوں ہزاروں اسکولوں کی تعداد میں چپ چپاتے تبدیل کر دیا ہے اور اب بھی ان کی دن دونی رات چوگنی ترقی پر کوئی روک نہیں لگا سکے ہیں، ٹھیک اسی طرح اپنے کام کے مدرسہ یعنی بنیادی اسکول کو بھی میکانکی کام کے اسکول کی شکل میں تبدیل کر سکتے ہیں اور خاصی تعداد میں ایسا کیا بھی ہے۔ ان اسکولوں میں کام باہر سے اور یکساں طور پر عاید کیا جاتا ہے جس کے لیے بچے میں شوق اور رغبت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، اور نہ اسے اس بات کا کوئی علم ہوتا ہے کہ اس کام کے پیچھے مقصد کیا ہے، جب وہ کام شروع کرتا ہے تو اس سے اُسے مطلق کوئی دل چسپی نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ عام ڈگر سے ہٹ کر یہ ایک عجیب قسم کا کام ہوتا ہے یا یہ کہ اپنے ہاتھ سے کچھ کام کرنے کو اس کا جی چاہتا ہے۔ وہ کام اسی طرح کرتا ہے جس طرح اسے بتا دیا جاتا ہے۔ کام شروع کرتے وقت اس کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا جسے اسے کام کے ذریعہ حل کرنا ہو۔ اسے قدرتاً اپنے مسائل پر کچھ سوچنے یا غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا اس لیے کہ سچ پوچھیے تو، اس کے سامنے مسئلہ کوئی ہوتا ہی نہیں اور اگر کوئی مبہم سا مسئلہ ہو بھی تو اسے حل کرنے کے لیے کوئی متبادل طریقہ اختیار کرنے کا اسے موقع نہیں ہوتا۔ ایک بندھا ٹکا طریقہ ہوتا ہے اور اسی کے مطابق اُسے کام کرنے کو کہا جاتا ہے، اسے اس کا بھی حق نہیں دیا جاتا کہ اپنے استاد سے مل کر کوئی دوسرا طریقہ دریافت کرے اور اس دریافت کے لطف سے لطف اندوز ہو۔ اُسے کام کبھی ہی کبھی کرنے کو کہا جاتا ہے۔ جس میں عموماً کوئی التزام نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ اس سے کام لیتے ہیں، ان کے سامنے اس کا کچھ بھی نتیجہ آجائے وہ اس سے مطمئن ہو جاتے ہیں، آپ جانتے ہیں، کبھی کبھی کام کرنے کی خصوصیت بھی یہی ہوتی ہے اور تعلیم کا منصب جیسا کہ میں ذکر کر آیا ہوں، کام کو سچے کام کی شکل میں تبدیل کرنا ہے اور سچا کام بہترین نتیجہ اور پھر اس سے بھی بہتر، اور اس سے بھی بہتر نتیجہ کا مقتضی ہوتا ہے، یہاں تک کہ کمال کا درجہ حاصل ہو جائے۔

"اگر کچھ بنیادی اسکول دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں جو اسی عمر کے بچوں کی تعلیم کا کام کرتے ہیں، اب بھی تعلیم کے بہتر ادارے نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا رشتہ اپنے اردگرد کی زندگی سے دور کا رشتہ نہیں ہے اور ان کا رجحان چھوٹی چھوٹی تعلیمی برادریوں کی شکل اختیار کرنے کی طرف ہے جن کے سامنے کچھ مشترک قدریں ہیں۔ ان کا عملی کام، خواہ اس کے اندر تعلیمی نقائص کیوں نہ ہوں، ان کی نمایاں ذہنی ساخت سے قریب تر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ اسکول کچھ قطعی اوصاف پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان اسکولوں کی اس حیثیت سے بھی ہمیں مطمئن نہیں ہونا چاہیئے جب تک ہم انھیں صحیح معنی میں کام کے ذریعے تعلیم دینے والے ادارے نہ بنا دیں۔"

حبیب الرحمٰن

تعلیمی دور

ذاکر صاحب کو میں ۱۳ ء سے جانتا ہوں، جب وہ اور میں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں پڑھتے تھے، ذاکر صاحب کو ان کے پُرانے ایم اے، او کالج کے ساتھی مرشد کہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں، لیکن ذاکر صاحب اسکول کے زمانے میں بھی اپنے اسکول کے ساتھیوں کے مرشد تھے، ہر طالب علم ان کی بے انتہا عزت کرتا تھا اور ان کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ جس زمانے میں ذاکر صاحب اور میں اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں پڑھتے تھے، ترکی اور اٹلی میں جنگ ہو رہی تھی، ذاکر صاحب کی تحریک پر ہم لوگوں نے گوشت کھانا بند کر دیا، تاکہ جو روپیہ بچے وہ ترکوں کی مدد کو بھیجا جائے۔ مرشد کو اس زمانے میں بھی انگریزی اخبار پڑھنے کا شوق تھا، "پانیر" معیاری اخبار سمجھا جاتا تھا انھیں جلد سے جلد خبریں معلوم کرنے کی اتنی فکر اور اس قدر اشتیاق رہتا کہ وہ "پانیر" روزانہ خریدنے کے لیے اٹاوہ کے اسٹیشن جاتے، آگے وہ ہوتے پیچھے میں اسٹیشن پر اخبار اترتے ہی، ذاکر صاحب اسے حاصل کرتے اور پھر وہ اور میں تقریباً بھاگتے ہوئے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں واپس آتے، وہاں طالب علم منتظر ہوتے، ہمارے واپس آتے ہی، وہ ہمارے چاروں طرف حلقہ بنا لیتے۔ ذاکر صاحب انھیں خبروں کا نہ صرف ترجمہ کر کے سناتے، بلکہ ان پر تبصرہ بھی فرماتے ہمارے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین صاحب ذہین اور ہونہار طالب علموں کو اپنی ذاتی توجہ کا مرکز بنا لیتے تھے، یہ طالب علم جن میں ذاکر صاحب سب سے زیادہ نمایاں تھے، اپنا کافی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کے مکان پر صرف کرتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب مختلف سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پر ان طالب علموں کے ساتھ ایسے دل چسپ انداز میں گفتگو کرتے تھے کہ ان میں ان مسائل کے متعلق کافی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی اور ان کے علم اور واقفیت میں کافی اضافہ ہوتا تھا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی ان مجلسوں اور بحثوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ذاکر صاحب کی عام واقفیت سیاسی مسائل کے متعلق اتنی وسیع ہوگئی کہ بیشتر اعلیٰ تعلیم حاصل کیے ہوئے لوگ جوان سے دوگنی عمر کے تھے، ان مسائل کے متعلق، ان جیسی بصیرت نہ رکھتے تھے، اس بصیرت کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ ان میں بین الاقوامی اور قومی معاملات کے متعلق صحیح جذبات اور رجحانات بھی پیدا ہوگئے۔ اور ہندوستان کے باہر دوسرے مسلم ممالک سے ان کی گہری ہمدردی بھی راسخ ہوگئی۔

اس ہمدردی کا مظاہرہ مختلف طریقوں سے ہوتا تھا۔ گوشت کا ترک اور دوسرے طالب علموں کو بھی اس پر آمادہ کرنا اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ نماز جمعہ کے بعد ذاکر صاحب نمازیوں سے مظلوم ترکوں کے لیے چندہ وصول کرتے۔ ایک مرتبہ اٹاوہ کی ایک مسجد میں ذاکر صاحب نے ایک تقریر کی، اس کے بعد انھوں نے اپنی بے پھندنے کی ترکی ٹوپی میں چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ چندہ وصول کرتے وقت انھوں نے فرمایا۔ "لائیے لائیے حضرات! جو تانبے کے پیسے اس ٹوپی میں ڈالیں گے، وہ پیسے کی گولیوں میں تبدیل ہوکر دشمن کے سینے کے پار ہوں گے۔" ایک سفید ریش بزرگ پر اس جملے کا یہ اثر ہوا کہ وہ چیخ چیخ کر رونے لگے اور اپنا پورا بٹوہ ذاکر صاحب کی ٹوپی میں الٹ دیا۔ ہر مرتبہ اچھی خاصی رقم جمع ہوجاتی اور پھر ذاکر صاحب ڈاک خانے کا رُخ کرتے اور اس رقم کو منی آرڈر کے ذریعے سے ترکوں کی مدد کے لیے بھیج دیتے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت سے میں اتنا متاثر تھا کہ مغرب کی نماز کے بعد دعا کیا کرتا تھا کہ میں بھی ان جیسا ہوجاؤں۔ چند سال ہوئے میں نے ایک دن ان سے کہا کہ ذاکر صاحب میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ میرا دماغ آپ کے دماغ جیسا ہوجائے، لیکن دعا قبول نہ ہوئی۔ فوراً ہنس کر فرمایا "واہ دعا تو قبول ہوگئی۔ خدا نے آپ کو مجھ سے بھی اچھا دماغ دے دیا۔"

ذاکر صاحب اسکول میں مجھ سے ایک جماعت اوپر تھے، میں نویں میں تھا وہ دسویں میں۔ انٹرمیڈیٹ میں انھوں نے بھی سائنس اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیا اور میں نے بھی، لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ میں کامیاب ہونے کے بعد ایک سال کے لیے پڑھائی چھوڑ دی اور بی۔ اے میں وہ اور میں ہم جماعت ہوگئے، ہم دونوں کے مضامین ایک ہی تھے، یعنی انگریزی ادب، فلسفہ اور معاشیات۔ میں ان تین مضامین کے علاوہ اور کسی مضمون کی کوئی کتاب نہ پڑھتا تھا امتحان

میں کامیابی حاصل کرنا میرا مقصد ہوتا، ذاکر صاحب درسی کتابوں کو مطلق اہمیت نہ دیتے، لیکن ان کے علاوہ مختلف مضامین کی کتابیں خوب پڑھتے، امتحان سے چند روز قبل مجھ سے کہتے کہ میں نے جو درسی کتابوں کے خلاصے تیار کیے ہیں ان کو دے دوں، کسی اور طالب علم کو میں یہ خلاصے ہرگز نہ دیتا، لیکن ذاکر صاحب کو بہ خوشی دے دیتا، ہفتہ دو ہفتے ان خلاصوں میں بنیادی اور اہم نکات وہ فوراً نکال لیتے اور انھیں اس خوبی کے ساتھ ذہن نشین کر لیتے کہ میرے ذہن میں تو مواد کی زیادتی کی وجہ سے بعض مسائل الجھ جاتے، لیکن ان کے ذہن میں صرف ضروری چیزیں نہایت منظم شکل میں محفوظ ہو جاتیں۔ تھرڈ ایر میں انھیں میرے خلاصے پڑھنے کے لیے تقریباً ایک ہفتہ ملا، اس لیے تھرڈ ایر کے سالانہ امتحان میں تو میں ان سے آٹھ نمبر زیادہ حاصل کر کے اتفاق سے اوّل رہا اور وہ دوم، لیکن فورتھ ایر میں انھیں میرے تیار کردہ خلاصوں کا مطالعہ کرنے کے لیے تقریباً پندرہ دن مل گئے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے بی۔ اے کے امتحان میں میں اور وہ اوپر کے ان پانچ طلبہ میں تھے، جنھیں یونیورسٹی کا وظیفہ ملا، لیکن وہ مجھ سے اوپر تھے اس لیے الٰہ آباد یونیورسٹی کا اقبال میڈل انھیں ملا اور ہرچند کہ امتحان کی میری تیاری ان سے بہت زیادہ تھی میں دیکھتا رہ گیا۔ خدا نے انھیں ایسا دماغ عطا کیا ہے کہ فوراً بہت سے مواد کا تجزیہ کر کے اس میں سے اہم عناصر نکال لیتے ہیں، اور دماغ میں ان کی بہترین تنظیم کر لیتے ہیں۔ تعلیم کے مضمون پر میں نے ان کے مقابلے میں بہت زیادہ کتابیں پڑھی ہیں، لیکن مجھے اس کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ تعلیم کے مختلف مسائل کے متعلق جس قدر سلجھے ہوئے اور صحیح خیالات ان کے ہیں، میرے نہیں۔

طالب علمی کے زمانے کے بیسیوں واقعات ایسے ہیں جن سے ان کے ذہن کی بلندی اور گہرائی اور ان کی شخصیت کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں ان کا بیان کرنا نہ ممکن ہے نہ ضروری۔ ان کے دوسرے ساتھی ان کی زندگی کے بیسیوں ایسے واقعات بیان کریں گے، جن سے ان کی ذہنی اور اخلاقی خصوصیات پر روشنی پڑے گی۔

ذاکر صاحب نے عدم تعاون کے زمانے میں ایم۔ اے۔ او کالج کو چھوڑ دیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شریک ہو گئے اور اس کے کچھ عرصے کے بعد جرمنی تشریف لے گئے۔ جامعہ کے قیام میں انھوں نے جو جد و جہد کی اس کے متعلق جامعہ کے لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کی ان تعلیمی کوششوں کو میں دور سے دیکھتا رہا ہوں۔ وقتاً فوقتاً جب ان سے ملنے کا موقع ملا، ہمیشہ

بڑی محبت سے ملے۔

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے پر میں مبارک باد دینے کے لیے گیا، کہنے لگے، آپ لوگوں نے وائس چانسلری کی اہم ذمے داریاں مجھ پر عاید کی ہیں لیکن میری کامیابی آپ لوگوں کے تعاون پر منحصر ہے۔

ذاکر صاحب وائس چانسلری کے زمانے میں چند اصولوں پر سختی اور پابندی سے عامل رہے (۱) جہاں تک ممکن ہو اساتذہ اور طلبا کا تعاون حاصل کیا جائے (۲) دوسرے لوگوں کے نظریوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان نظریوں کے متعلق ہمدردانہ رویّہ رکھا جائے۔ (۳) جن لوگوں میں عیوب ہیں ان کے متعلق مایوسی کا رویّہ نہ رکھا جائے، بلکہ دوستی اور محبّت کے ذریعے ان کی اصلاح کی جائے۔ (۴) اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں کا اعتبار کیا جائے۔ (۵) جہاں تک ممکن ہو کسی کو ذہنی ایذا نہ دی جائے۔

مندرجہ بالا اصولوں پر عمل کرنے کی مجھے بہت سی مثالیں ملیں۔ ایک دن ان کے ساتھ میں ان کے باغ میں ٹہل رہا تھا، میری نظر چند گلاب کے پودوں پر پڑی جو اچھے نہ تھے، میں نے کہا کہ "ذاکر صاحب! ان گلابوں کو کھدوا کر پھینک دیجیے اور عمدہ قسم کے گلاب کے پودے لگوائیے۔" ہنس کر فرمایا "بھائی، مجھ سے یہاں کے اسٹاف کے بعض لوگوں کے متعلق لوگ یہی کہتے ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ جو لوگ موجود ہیں وہ تو رہیں گے، ان سے اچھے لوگ جو ملیں گے انھیں بھی یونیورسٹی میں جگہ ملے گی۔" ذاکر صاحب کا مستقل نظریہ یہ رہا ہے کہ بُروں کی طرف سے مایوس نہ ہوا جائے، اگر ان کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا رویّہ رکھا جائے گا تو وہ اپنی اصلاح خود کر لیں گے۔ اسی اصول پر کاربند رہ کر انھوں نے کسی کو نقصان پہنچنے نہ دیا۔ جن لوگوں میں کسی قسم کی خامی تھی، وہ ان کی شرافت سے متاثر ہو کر اپنی اصلاح کی خود کوشش کرتے تھے۔

اکثر مواقع پر میں نے بعض لوگوں کے متعلق بے زاری اور مایوسی کا اظہار کیا، اور شروع میں مجھے کسی قدر مایوسی ہوتی تھی جب میں دیکھتا تھا کہ ذاکر صاحب میری بے زاری سے متاثر نہیں ہوتے تھے، لیکن کچھ عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ انسانی فطرت کی اصلاح پذیری پر مجھ سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے، اگر آپ کو میرے متعلق رپورٹ لکھنے کا موقع ملے تو آپ بڑی سخت رپورٹ لکھیں گے۔ ان کے اس جملے پر کئی دن تک غور کرتا رہا اور ان کے اور اپنے نظریے کے فرق کو محسوس کیا، یعنی انسانی فطرت کے درست ہونے کے امکان کے متعلق

اپنا عدم اعتماد اور ان کا مکمل اعتماد، آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کا نظریہ صحیح اور میرا غلط۔

ذاکر صاحب اور میرے درمیان بعض موقعوں پر اختلاف رائے ہوا، جو وقتی کبیدگی کا باعث ہوا۔ لیکن یہ کبیدگی ہمیشہ سطحی رہی، ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنے پرانے ساتھیوں کے لیے ہمیشہ محبت اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ موجزن رہا ہے اور انھوں نے آسانی کے ساتھ ان کی تمام لغزشیں اور خامیاں نظر انداز کی ہیں۔ نہ صرف ان کے پرانے ساتھیوں کو بلکہ ان تمام لوگوں کو جنھیں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، ہمیشہ یہ زعم رہا ہے کہ اگر ہم سے کوئی غلطی ہوگی تو ذاکر صاحب ہم سے اتنی سختی سے حساب فہمی نہ کریں گے کہ ہماری زندگی دوبھر ہو جائے۔

خواجہ عبدالحمید

یادِ ہمدمِ دیرینہ

ڈاکٹر ذاکر حسین نے مہاتما گاندھی کی اپیل پر تمام گورنمنٹ سے امداد یافتہ اداروں کا بائیکاٹ کر دیا اور جب مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کو چھوڑا تو وہ تنہا نہیں تھے بلکہ ان کے ہمراہ تقریباً ایک ہزار طلبا کا گروپ بھی تھا۔ میں نے ان کی پیروی کی اور الٰہ آباد کے میور سنٹرل کالج کو چھوڑ دیا اس وقت میرے ساتھ چار سو طلبا تھے۔ میں اپنے آبائی وطن علی گڑھ آگیا۔ جہاں عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی۔

ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور علی برادران نے مہاتما گاندھی کی مدد سے ۱۹۲۰ء میں ایک قومی یونیورسٹی کا آغاز کیا، جس کا نام جامعہ ملیہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سے میں اس وقت قریب آیا جب میں جامعہ ملیہ بہ حیثیت مدرس سو روپے ماہوار تنخواہ پر آگیا۔ مجھے اچھی طرح وہ دن یاد ہیں جب آزادی کی جدوجہد جاری تھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے رفقا اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔

۱۹۲۱ء میں جامعہ کا پہلا جلسۂ تقسیم اسناد علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ جس میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، ابوالکلام آزاد، ٹی۔ اے۔ کے شیروانی، مولانا شوکت علی اور دیگر حضرات، جن کا تعلق تحریک عدم تعاون اور خلافت تحریک سے تھا سب کونوکیشن کے جلوس میں شامل ہوئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور میں ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کانگریس میں شریک ہوئے اور ایک ہفتے سابرمتی آشرم میں گاندھی جی کے ساتھ رہ کر ان کے قرب کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۲۲ء میں جب گاندھی جی نے تحریکِ عدم تعاون ملتوی کر دی اور ڈاکٹر ذاکر حسین اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلے گئے۔ اگلے سال مجھے بدقت تمام پاسپورٹ مل سکا اور میں بھی جرمنی چلا گیا اور برلن یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین پہلے ہی سے زیر تعلیم تھے۔ ایک دوسرے سے مل کر ہم کس قدر خوش ہوئے تھے۔ اس کی مسرت ناقابلِ بیان ہے۔

جرمنی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی بہت سے لوگوں سے دوستی ہو گئی جن میں برلن یونیورسٹی

کے پروفیسر اور کچھ ممتاز ہندوستانی شخصیتیں، خاص طور سے وہ لوگ جن کا تعلق سیاسی بغاوت سے تھا سب شامل تھے اور اس زمانے میں برلن ہی میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور بہت سے ہندوستانی طلبا اکثر و بیشتر یکجا ہوا کرتے تھے اور ہندوستان کی آزادی کے مسائل پر بحث و مباحثے کیا کرتے تھے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں قیصر ولہم کے تحت شاہی سلطنت کا دور ختم ہوا اور وائمر آئین نافذ کیا گیا۔ اب یہ آزاد ملک تھا جہاں دنیا کے تمام سیاسی باغی آ کر مل سکتے تھے۔ ہندوستانی باغیوں میں سروجنی نائیڈو کے بڑے بھائی جناب چٹوپادھیائے، جناب ایم این رائے، پروفیسر برکت اللہ، راجہ مہندر پرتاپ سنگھ، خیری برادران اور جناب نمبیار شامل تھے۔

راجہ مہندر پرتاپ سنگھ اور جناب رائے کو جنگ کے بعد ہندوستان آنے کی اجازت مل گئی۔ پروفیسر برکت اللہ، فرنسیسکو چلے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ راجہ مہندر پرتاپ سنگھ لوک سبھا کے رکن بن گئے اور دہرہ دون رہے۔ جناب نمبیار "بون" میں ہندوستان کے سفیر مقرر ہوئے جناب رائے واپس آئے اور دہرہ دون میں وفات پائی۔ جناب چٹوپادھیائے روس چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین اور ہم سب لوگ اُن سیاسی باغیوں کو بہت محترم اور قابلِ تحسین سمجھتے تھے۔ ہم لوگ ان لوگوں سے بات چیت کرتے اور مشورے لیتے کہ کیسے ہم اپنے ملک کو آزاد کرائیں۔ گو کہ ڈاکٹر ذاکر حسین جو مہاتما گاندھی کے مرید تھے اور عدم تشدد میں یقین رکھتے تھے، اُن باغیوں کی جوڑ توڑ سے پوری طور پر متفق نہیں ہوئے تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین بے حد ذہین دانشور تھے۔ انھوں نے جرمن نژاد طلبا اور پروفیسروں میں اپنی پہچان بنالی۔ پروفیسر جو غیر ملکی زبانوں کے ادارے کے ڈائرکٹر تھے جنھوں نے ہم لوگوں کو جرمن پڑھائی تھی۔ اکثر اپنے گھر چائے پارٹی اور کرسمس کی تقریب پر مدعو کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین بہت خوش شکل طالب علم تھے اور ان کی فرنچ کٹ داڑھی نے ان کی شخصیت کو ایک پُروقار شخصیت بنا دیا تھا۔ جرمن دوست ان کو "جنٹیس" کے نام سے مخاطب کیا کرتے تھے۔

دوسرے ہندوستانی طلبا ہمارے گروپ میں شامل ہوئے جیسے ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر ٹوپا، ڈاکٹر قریشی۔ ہم سب نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی سرداری قبول کر لی اور عہد کیا کہ ہندوستان کی واپسی پر جامعہ ملیہ کے لیے کام کریں گے۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری جو کانگریس اور تحریک عدم تعاون کے درخشاں ستارے تھے، انھوں نے جامعہ کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد ۱۹۲۵ء میں یورپ

تشریف لے گئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ان حضرات سے ملنے پیرس گئے۔ اپنی اور اپنے دوستوں کی طرف سے یقین دلایا کہ ہم لوگوں نے اپنی تمام زندگی جامعہ کے لیے وقف کر دینے کا حلف اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھ سے، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور بھی چند دوسرے حضرات سے کہا کہ ہم لوگ بذاتِ خود، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے پاس جاکر حلف اٹھائیں۔ ہم چاروں ویانا گئے اور ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں سے ملے اور کانگریس اور جامعہ ملیہ کے تئیں اپنی وفاداری کا حلف اٹھایا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین اور ہم ان کے دوست، اکثر مل بیٹھ کر ہندوستان کے مسائل پر بات کرتے تھے۔ ہم لوگ اکثر پکنک پر جایا کرتے تھے۔

۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا اور تمام ہندوستانی طلبا کی طرف سے برلن کے پروفیسروں کو مدعو کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے پروفیسروں کے استقبال پر بہترین تقریر کی تھی۔ اس کے بعد پروفیسر ہیز، مشہور نوبل لور ئیٹ نے بھی جواب میں بے حد خوب صورت تقریر کی اور ہندوستانی طلبا کو ہندوستان کو آزاد کرانے کی کامیاب کوششوں کی دعا کی اور جرمنی کے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۲۶ء میں اکنومکس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی اور اسی سال کے آخر میں ہندوستان واپس آگئے۔ میں نے مع ٹوبا جس سے بعد میں میں نے شادی کر لی، ان کو اسٹیشن پر خدا حافظ کہا۔ ۱۹۲۹ء میں میری ہندوستان واپسی پر میری بیوی ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ پہلی بار ملیں اور بیگم ذاکر حسین کی بے حد گہری دوست بن گئیں۔ میری سالگرہ کے موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے تقریر کرتے ہوئے میری بیوی سے محبت اور احترام کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا تھا: ”ڈاکٹر حمید ٹوبا سے جرمنی میں ملے۔ زندگی بھر کی رفاقت کی کہانی سب سے بہتر طریقے سے وہ خود بیان کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ مجھے ان کے روپ میں ایک بہن مل گئی۔ مجسم محبت جو آج کی دنیا میں ملنا آسان نہیں۔ میرا خیال تھا کہ سرجری ایک بے حد بے درد پیشہ ہے اور بیمار ہونا بہر حال ایک ناخوشگوار فعل ہے۔ لیکن ٹوبا کے سلسلے میں یہ بات بالکل غلط ثابت ہوئی ہے۔ ٹوبا کی قابلیت، ان کی محبت اور ان کی نرم گفتاری اور دل کو موہ لینے والے رکھ رکھاؤ، آج بھی میرے دل پر نقش ہیں اور میری زندگی کا حصہ ہیں۔“

۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے میرے انکل محترم عبدالمجید خواجہ صاحب سے جامعہ کا چارج لے لیا، جو ان کی واپسی تک جامعہ کو بہ حسن خوبی چلا رہے تھے۔

اس کے بعد سے ڈاکٹر ذاکر حسین اس یونیورسٹی کو چلاتے رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی جامعہ کو وقف کر دی اور اس کو ایک مثالی درسگاہ بنایا اور سب سے بڑھ کر ایک قومی یک جہتی کا مرکز!

۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کا جشن سیمیں بڑے پیمانے پر منانے کا فیصلہ کیا۔ وہ شفیق الرحمٰن کے ساتھ چندہ اکٹھا کرتے بمبئی آئے اور میرے ساتھ دو مہینے رہے۔ محمد حارث جہانگیر، پٹیل اور بہت سے لوگوں نے ان کے ساتھ مل کر ڈھائی لاکھ روپے چندہ اکٹھا کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین وہ واحد شخص تھے جنھوں نے بیک وقت تین بہت اہم شخصیتوں پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور جناح کو ایک ساتھ اسٹیج پر لے آئے اور انھوں نے سامعین کو مخاطب کیا۔

آخری بار وہ بمبئی ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء میں میری سالگرہ کے موقع پر تاج محل ہوٹل تشریف لائے۔ یہ ان کی شخصیت کی عظمت تھی کہ انھوں نے میرا دعوت نامہ قبول فرمایا اور اس موقع پر صدارت کے فرائض انجام دیے۔ صدرِ ہند کے اعلیٰ عہدے کا خیال کیے بغیر انھوں نے ذاتی طور پر ایک دوستانہ سماجی تقریب میں شرکت کی۔ اس موقع پر ان کی تقریر یادگار تھی جو ایک عظیم انسان کی اپنے پرانے رفیق کے لیے یادگار نذرانہ تھی۔ وہ دوست جو زندگی بھر کا ساتھی تھا، تمام کاموں میں برابر کا شریک تھا۔ ہندوستان میں بھی اور بیرونِ ممالک میں بھی۔ میں ان کی تقریر کے بس ابتدائی جملے کو دُہرانا چاہتا ہوں: "مجھے اس بات کا شرف حاصل ہے کہ ڈاکٹر حمید کے دوستوں میں ایک میں بھی ہوں ان کی دوستی کے حصول کے بعد میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایک اچھے دوست سے بڑھ کر کوئی خدا سے اور کون سی نعمت مانگ سکتا ہے۔"

محمد حفیظ الدین

کیمیا گر

کہتے ہیں اگلے زمانے میں ایسی جڑی بوٹیاں ہوتی تھیں کہ ان سے لوہا، تانبا اور پیتل جیسی گھٹیا دھاتیں سونا بن جاتی تھیں۔ جو لوگ ان بوٹیوں کو جانتے تھے وہ کیمیا گر کہلاتے تھے۔ اسی طرح ایک "پارس پتھر" بھی ہوتا تھا۔ اس سے لوہا چھو جائے تو سونا بن جائے۔

مشہور ہے کہ نربدا دریا کے کنارے کنارے ایک بادشاہ کے ہاتھی جا رہے تھے۔ اُن میں سے ایک ہاتھی کی زنجیر زمین سے گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔ اتفاق کی بات کسی "پارس پتھر" سے چھو گئی اور سونا ہو گئی۔ تمام میں غل مچ گیا۔ پھر کیا تھا، اس راستے سے ہاتھی پہ ہاتھی ہزاروں بار گزارے گئے مگر ایک کڑی بھی سونے کی نہ بنی۔

اس پتھر کی یہ شہرت ایسی مان لی گئی ہے کہ کسی آدمی کے بہت اچھا ہونے کی تعریف کی جاتی ہے تو کہتے ہیں: "اس کا کیا کہنا، وہ تو پارس ہے۔"

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ اکبر کا وزیرِ اعظم عبدالرحیم خانِ خاناں بہت خوبیوں کا انسان تھا۔ دینے دلانے میں تو لکھ لٹ تھا۔ اس لیے لوگ اُسے پارس کہتے تھے ایک جگہ اس کے آنے کی خبر مشہور ہوئی تو ایک بھولی بھالی دیہاتن بڑھیا اس تاک میں رہی کہ کسی طرح اس کے پاس پہنچ جائے خان خاناں پروگرام کے مطابق اس جگہ پہنچا تو یہ غریب بڑھیا موقع پاکر، آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک توا لے کر دوڑی اور اس کے جسم سے رگڑنے لگی۔ سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے۔ اس نے کسی کی نہ سُنی۔ اس معمے کو کوئی نہ سمجھا، پر خان خاناں بات تاڑ گئے۔ اپنے ملازموں سے کہا "اسے توے کے برابر ایک سونے کا توا لا دو، یہ مجھے پارس سمجھ کر ایسا کر رہی ہے۔"

پچھلے زمانے میں بڑے بڑے باکمال لوگ ہوئے ہیں۔ کوئی کیمیاگر تھا تو کسی کے پاس پارس پتھر تھا۔ کوئی علاء الدین کا کراماتی چراغ رکھتا تھا۔ یہ سب باتیں قصے کہانیوں میں پڑھی ہیں۔ خدا جانے ایسا تھا بھی یا نہیں۔

لیکن آج کل بیسویں صدی میں ایسی ایسی چیزیں دیکھنے اور سننے میں آ رہی ہیں کہ نہ کبھی دیکھیں نہ سنیں۔ انسان ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر مہینوں کا سفر ہفتوں اور ہفتوں کا گھنٹوں منٹوں میں طے کرتا ہے۔ چندا ماموں ہمیشہ دور بیٹھے مسکراتے رہے۔ نہ خود کبھی آتے نہ کسی کو اپنے پاس بلاتے تھے۔ لاکھوں کروڑوں بچے نہ جانے کتنے عرصے سے یہ کہتے کہتے تھک گئے۔

چندا ماموں دور کے ہم کو دیکھیں گھور کے

کتنے بچے بوڑھے ہو گئے اور سو گئے۔ پر چندا ماموں ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مگر اب اس زمانے کے شریر بچے خود ان کی چندیا پر مسالہ پیسنے جا رہے ہیں۔ یہ زمانہ بڑا عجیب، چنچل اور انوکھا ہے۔

ہم نے بھی اس زمانہ میں ایک کیمیاگر دیکھا تھا۔ شاید اس کے پاس کیمیا بنانے کے عجیب نسخے بھی تھے۔ "پارس پتھر" بھی تھا اور علاء الدین کا کراماتی چراغ بھی تھا اس کے چراغ سے بہت سے چھوٹے بڑے دیئے روشن ہو گئے۔ کوئی روشنی کا مینار بن گیا۔ کوئی بھولے بھٹکوں کو راہ دکھا رہا ہے۔ کوئی اپنے چھوٹے سے حلقے میں نور کی جوت جگائے بیٹھا ہے۔

غرض اس کے کرشمے بہت ہیں اور انمٹ ہیں۔ کہاں تک کوئی گنوائے۔ وہ جدھر سے گزر جاتا تھا کرشموں کی ایک دنیا پیدا کر دیتا تھا۔ ہم صرف نمونے کے طور پر دو چار کا یہاں ذکر یں گے۔ جیسے اناج کے بہت بڑے ڈھیر میں سے نمونے کے مٹھی بھر دانے۔

کتنا ہی بڑا انسان کیوں نہ ہو کامیاب اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے لیے کوئی اچھا کام چن لے اور اس پر جم جائے۔ اپنے مقصد کے لیے اپنا تن، من دھن جی جان سے لگا دے، یہ بات ہمارا کیمیاگر اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے اس نے اول دن ہی سے طے کر لیا تھا کہ وہ ایک اچھا معلم بنے گا اور زندگی اسی کام میں کھپا دے گا۔

سچ پوچھو تو قدرت نے ایک اچھے استاد کی تمام خوبیاں اس میں جمع کر دی تھیں اور وہ پیدائشی معلم تھا۔ اس نے اپنے کیمیا کے نسخے ہونہار اور گدھے بچوں، مہذب اور ان گھڑ لوگوں سب پر آزمائے اور ہر ایک کو کندن بنا کر چھوڑا۔

اس کیمیا گر کو دیکھنے کے لیے کس کا جی نہ چاہے گا۔ ہم نے تو اسے کل تک دیکھا ہے۔ پر اب تم کو نہ دکھا سکیں گے۔ ہاں تم اس کی خاموش تصویریں دیکھ سکتے ہو۔ اس کی لکھی ہوئی تحریریں پڑھ سکتے ہو۔ اس کی کی ہوئی تقریریں اگر ریکارڈ میں محفوظ ہوں تو سن سکتے ہو، اور اس کے بنائے ادارے اور آدمی دیکھ سکتے ہو۔ ان سب میں اس کی جھلک تو نظر آجائے گی۔ مگر وہ پوری طرح نظر نہ آئے گا۔

اسی مئی کی ۳ تاریخ کو وہ ہم سے جدا ہو گیا۔ کوئی اسے صدر مملکت کی حیثیت سے، کوئی نائب صدر کی حیثیت سے، کوئی گورنر کے روپ میں، کوئی وی سی (وائس چانسلر) کے طور پر جانتا ہے۔ مگر وہ ہر پردے میں ایک اچھا استاد اور ایک بہت اچھا انسان تھا۔ جسے اپنے پرائے ذاکر صاحب کہتے تھے اور اس نام سے ایک روحانی قوت اور ڈھارس محسوس کرتے تھے۔

ذاکر صاحب ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے تعلیم و تربیت کے ہر موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ ظاہری تعلیم میں یورپ کی سب سے اونچی ڈگری پی۔ ایچ۔ ڈی کی حاصل کی روحانی ترقی انسانیت کے اس درجے تک پہنچ گئی تھی کہ مجموعی طور پر ان سے بہتر انسان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

بچپن میں خدا کا دیا سب کچھ تھا نہ جانے کتنے لوگ ان کے والد کی ڈیوڑھی پر پلتے تھے مگر وہ اپنے والد کی پیار اور محبت کی بخششوں کے علاوہ اپنے بڑوں سے کچھ کام اجرت پر لے کر شوق سے کیا کرتے تھے۔ بڑے بھی اسے بچے کا کھیل سمجھ کر دل چسپی لیتے۔

ان کے اردو، انگریزی سب خط بہت اچھے تھے۔ یہ چھوٹا مزدور بزرگوں کی تحریروں کی نقل سے جو اجرت پاتا تھا پائی پائی جوڑ کر رکھتا تھا۔ آس پاس میں کسی دکھی کی خبر پاتا تو اپنی محنت مشقت کی ساری کمائی اور جوڑی ہوئی پونجی اس کے سپرد کر آتا، وہ بھی اس طرح کہ ایک ہاتھ سے دیا دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوئی۔

اس کے ساتھی نادان یا شیخی خورے بچے جی میں سمجھتے کہ اتنے بڑے گھر کا لڑکا کتنا کنجوس مکھی چوس ہے۔ کبھی کبھی اس کی بھنک اُس کے کان میں بھی پہنچ جاتی تھی۔ جی میں آتا کہ سب راز کھول دے پھر تو یہ ساتھی بہت جھینپیں گے مگر انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ وہ اس رحمت عالم کے دل سے پیرو تھے جس نے کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔

وہ بچوں کو خدا کی امانت اور قوم کی پونجی سمجھتے تھے۔ ان کی بہتری کی تدبیریں رات دن سوچا کرتے۔ یتیم بچوں کو دیکھ کر ان کا دل بھر آتا تھا۔ دلی کے ایک محلے دریا گنج

میں ایک یتیم خانہ قائم کیا گیا۔ انھوں نے اس کی بھرپور سرپرستی کی۔ سب سے پہلے تو اس کا پیارا نام "بچوں کا گھر" رکھا گھر میں ہر قسم کے آرام کا انتظام پھر اس کے چلانے والے دو ایسے مخلص کارکنوں کو چنا جن سے بہتر انتخاب ہو نہیں سکتا۔ یہ بزرگ عبدالشکور صاحب اور فاروقی صاحب ہیں۔ جو تقریباً تیئس سال سے اس گھر کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں کچھ لوگ تو ان کا کام جانتے ہوں گے نام شاید بہت کم لوگ جانتے ہوں ایسے بے نام و نمود کام کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ جس حسنِ انتظام سے یہ گھر چل رہا ہے جیسی محنت اور گھریلو پن وہاں موجود ہے وہی لوگ اس کی قدر جان سکتے ہیں جنھوں نے کبھی اس گھر کو دیکھا ہے۔ اس گھر کے بچوں کے لیے یتیمی رحمت بن گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے اس گھر کو اور اس کے سنوارنے والوں کو کبھی نہیں بھلایا۔ بات لمبی ہو جائے گی ورنہ یہاں کے حالات لکھے جائیں تو بہت سے اداروں کے لیے نمونہ اور سبق کا کام دے سکتے ہیں۔

ذاکر صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے اسے اس نہج پر انھوں نے پروان چڑھایا کہ وہ صحیح معنوں میں اسلامی، قومی اور تعلیمی ادارہ بن گئی۔ خامیاں کوتاہیاں کہاں نہیں ہوتیں مگر آج بھی اس کی فضا میں اسلامی خوشبو، قومی یگانگت و محبت، تعلیم و علم کے چرچے پھیلے ہوئے ہیں۔

گھر اور سماج میں سب سے کمزور مخلوق بچہ ہے۔ اس لیے والدین، استاد، محلے پڑوس کے لوگ اس کی تھوڑی سی خطا پر بھی سزا دینے سے چوکتے نہیں، اکثر اپنا غصہ بلاوجہ اس پر اتارتے ہیں۔ ذاکر صاحب سزا کے سخت خلاف تھے۔ سزا میں انتقام، بدلہ، غصہ شامل ہو جائے تو اس سے بری کوئی چیز نہیں اس لیے جامعہ کے استادوں سے اکثر کہا کرتے کہ بچہ محبت کرنے کے لیے ہے غصہ اتارنے کے لیے نہیں۔

جامعہ کے ابتدائی مدرسے میں ایک بہت شریف اور ہر دلعزیز مولوی صاحب تھے۔ سب ان کی عزت کرتے تھے وہ افغانستان کے رہنے والے تھے۔ بڑے نیک، بردبار اور ہنس مکھ تھے۔ بعض اوقات جامعہ کے استاد بچوں کو ہلکی پھلکی سزا دے دیا کرتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح بات ذاکر صاحب تک پہنچ جاتی وہ اچھے انداز میں استادوں کو سمجھا دیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان مولوی صاحب نے بھی ایک بچے کو سزا دے دی اور ذرا سخت سزا دی۔ ذاکر صاحب کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا آرڈر دینے کے وہ عادی نہ تھے۔ پھر بھی ایک تحریر گشت کرائی "جامعہ میں بچوں کو

سزا دینا سخت منع ہے۔ اگر سزا کی ضرورت ہی محسوس ہو تو ادارے کے افسر کی اجازت لینا اور بہت سوچ سمجھ کر سزا دینا چاہیے۔ جو لوگ اس طریقے کو اپنا نہ سکیں گے میں سمجھوں گا کہ وہ میرے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتے۔

اس تحریر کے بعد برسوں تک کوئی ایسی شکایت سننے میں نہیں آئی۔ نہ صرف یہ بلکہ استادوں نے اس روش کو اتنا اپنایا کہ ذاکر صاحب دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔

جب جامعہ قرول باغ میں تھی جامعہ کے استادوں کے ایک بہت معزز خاندان میں سے ایک صاحب نے گھر پر اپنے بچے کو کسی بات پر سخت سزا دی۔ وہ خود استاد نہ تھے۔ ان کا یہ بچہ جامعہ کا طالب علم تھا۔ بچہ بہت کم عمر، بھولا بھالا خوب صورت اور نازک تھا۔ سزا سے اس کے جسم پر نیل کے نشان پڑ گئے تھے۔ چہرے پر بھی ایک نشان نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ اس حالت میں بچہ دوسرے روز پڑھنے آیا تو وہ سزا بھول چکا تھا۔ ہنستا کھیلتا آیا لیکن استادوں کی نظر پڑی تو سب نے محسوس کیا اور اپنی تعلیمی کمیٹی کا جلسہ طلب کیا۔ ایک تجویز میں والد کی اس روش کی سخت مذمت کی اور اس تجویز کی نقل انھیں بھیج دی۔ وہ بہت برافروختہ ہوئے۔ مگر ذاکر صاحب شاداں و فرحاں تھے کہ انھوں نے اپنی آرزو کو یوں پھلتے پھولتے دیکھ لیا۔ جہاں ذاکر صاحب بچوں کا بہت خیال رکھتے تھے وہاں، والدین، استاد، ملازمین سب کی عزت و وقعت دل سے کیا کرتے تھے۔

قرول باغ میں سب سے چھوٹے بچوں کا بورڈنگ خاکسار منزل تھا جس زمانہ کی یہ بات ہے اس وقت ارشاد صاحب اور مولانا سعد مرحوم وہاں کے اتالیق تھے۔ ایک چھوٹا سا ایسا بچہ اس بورڈنگ میں داخل ہوا جس کے والدین میں جھگڑا تھا۔ اور مقدمہ بازی ہو رہی تھی۔ والد نہیں چاہتا تھا کہ ماں یا ننھیال کا کوئی بھی شخص بچے سے ربط رکھے۔ مولانا سعد مرحوم بڑے نیک دل اور بہت شریف انسان تھے ایسے لوگ اب چراغ لے کر ڈھونڈو تو نہیں ملیں گے۔ اس لیے جب کبھی غریب ماں آجاتی تو اس ماتنا کی ماری پر ترس کھا کر بچے سے ملنے کی اجازت دے دیتے۔ وہ اپنے لال کو دیکھ کر خوش ہو جاتی۔ گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر کچھ کھلا پلا کر بہت حسرت و یاس کے ساتھ لوٹ جاتی۔ مولانا کے اس اخلاق سے ننھیال والوں کے حوصلے بڑھے۔ ایک دن بچے کے ماموں نے آکر بچے کو کسی تقریب میں گھر لے جانے کے لیے مولوی صاحب سے اصرار کیا، معاملہ نازک تھا۔ مولوی صاحب اتنی ڈھیل دینے کے لیے تیار نہ ہوئے، اس لیے انھیں معمولی مولوی سمجھ کر جو منہ میں آیا بک،

طیش میں اول فول باتیں کرکے اس زعم میں کہ ذاکر صاحب سے آرڈر لے آئے گا ان کے مکان پہنچا۔

اِدھر اللہ بخشے مولوی سعد ایسے خوددار اور جوشیلے انسان کے لیے یہ سلوک انتہا درجے تکلیف دہ تھا، ملا کی دوڑ مسجد تک وہ بھی ذاکر صاحب کے ہاں پہنچے۔ اب دونوں صاحب ایک جگہ جمع تھے، ذاکر صاحب کچھ ماموں کی زبانی سن کر سمجھ چکے تھے۔ کچھ مولوی صاحب کو غیض و جلال کی حالت میں دیکھ کر تاڑ گئے۔ بچے کے ماموں ایک ذی رتبہ اور بڑی پوزیشن کے آدمی تھے۔ ان سے مخاطب ہو کر کہا: حضرت! اس وقت آپ میرے غریب خانہ پر ہیں مشرقی آداب کے لحاظ سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ مگر اتنا سن لیجیے کہ "جس شخص کی جانب میں آپ نے یہ بے ادبی کی ہے۔ وہ میرا ایسا ساتھی ہے کہ میں اس کی جوتیاں اٹھا کر سر پر رکھ لوں تو یہ میرے لیے باعث فخر ہوگا۔"

ذاکر صاحب کسی کام کو حقیر نہیں سمجھتے تھے۔ جب جامعہ، جامعہ نگر آگئی۔ اور سب لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے تو کام روز بروز بڑھنے لگے۔ ملازمین جامعہ کی تعداد بھی بڑھی۔ ان کی ایک انجمن بنائی گئی جس میں بھنگی، مالی، چوکیدار سے لے کر چپراسی اور ڈرائیور تک شامل تھے۔ سب سے پہلے جلسے میں ذاکر صاحب (شیخ الجامعہ) آئے۔ انھوں نے بڑی پیاری تقریر کی۔ اپنی تقریر میں نہایت صفائی سے کہا کہ "ہمارے کام الگ الگ ہیں جو کام ہم جانتے ہیں وہ کرتے ہیں۔ اس سے کسی کے رتبے میں فرق نہیں آجاتا۔ فضیلت صرف اس کو حاصل ہے جو اپنا کام فرض شناسی اور ذمہ داری سے انجام دیتا ہے۔ اور کام کا حق ادا کرتا ہے۔ تم میں سے ہر شخص صلاحیت پیدا کرکے شیخ الجامعہ بھی بن سکتا ہے۔ اپنے آپ کو یہاں کے انتظامات میں برابر کا شریک سمجھ سکتا ہے۔"

وہ انجمن اب تک قائم ہے اس کے نمایندے کو یہ اعزاز دیا گیا کہ کانووکیشن کے جلوس کے معزز جبہ پوشوں میں اس انجمن کا ایک جبہ پوش نمائندہ بھی ہوتا ہے۔ یہ کیسی بے نظیر بات ہے، آج کل کے ترقی یافتہ زمانے میں دنیا کے کسی ادارے میں نہیں مل سکتی۔

اب ایک آخری بات پر یہ تحریر ختم ہوتی ہے۔ جب اوکھلے (جامعہ نگر) میں جامعہ کا سنگ بنیاد رکھا جانے لگا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ کن ہاتھوں سے یہ کام انجام پائے کسی نے علما کی طرف نظر دوڑائی۔ کسی نے قوم کے مشہور لیڈروں کی طرف دیکھا۔ کوئی رؤسا اور معززین کی صفوں میں ڈھونڈنے لگا لیکن ذاکر صاحب

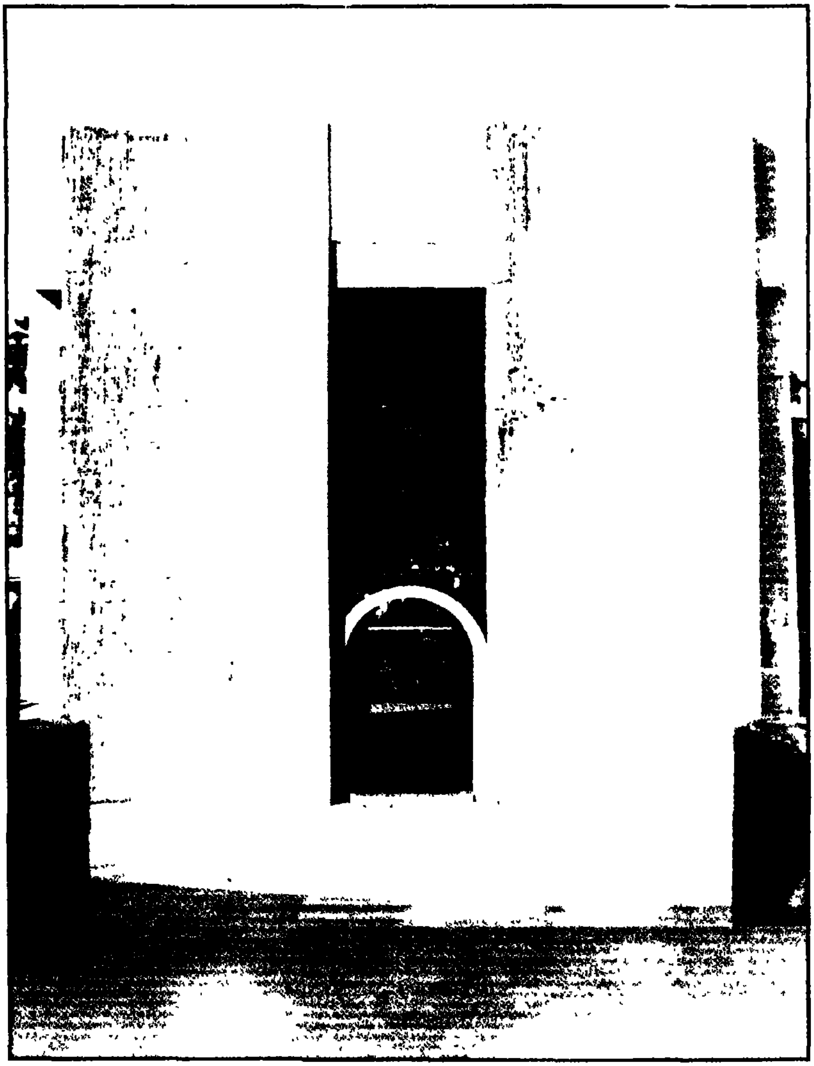
کی تجویز سب سے انوکھی تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ "اس کام کا اہل اور مستحق تو بچہ ہے جس کے لیے یہ عمارت کھڑی کی جا رہی ہے پھر ہم اِدھر اُدھر کیوں دیکھیں" اس پر بہت بحث مباحثے ہوئے۔ آخر یہی طے ہوا کہ جامعہ کا کوئی معصوم بچہ یہ نیو رکھے گا۔ قرعہ فال جس بچے کے نام نکلا وہ جامعہ کے استادوں کے استاد مولانا شرف الدین کے بھانجے ٹونکی صاحب کے ننھے بچے کا تھا۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے یہ بڑا کام انجام دیا۔ کتنا عظیم الشان خیال تھا۔ جو رہتی دنیا تک بچے کی عظمت اور بڑائی کی گواہی دیتا رہے گا۔

ذاکر صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے، ۳ رمئی ۱۹۶۹ کو یہ سورج ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ لیکن اس کی نورانی کرنیں فضا کو منور کرتی رہیں گی۔ اس کے کیے کام اور کہے بول ہمیں اپنے فرض کی یاد دلاتے رہیں گے۔ جب یہ بری خبر کانوں میں پڑی تو لوگ بے تحاشہ راشٹرپتی بھون کی طرف دوڑے مگر وہاں کیا تھا وہ پاک روح تو نورانی فضا میں اڑ چکی تھی۔ لاش کو محفوظ رکھنے سے پہلے جنھوں نے وہ گلاب سا کھلا ہوا چہرہ دیکھا بے اختیار کہہ اٹھے۔ "مرنے والے تجھ پر خدا کی رحمت ہو تیرے چہرے پر وہ نور برس رہا ہے جو خدا کے نیک بندوں اور صالحین کی نشانی ہے۔" میرٹھ کے قاضی شہر مولانا زین العابدین ایسے عالم و بزرگ کے قلم اور زبان سے بھی یہ جملے نکل کر رہے۔ کیوں نہ ہو جانتے ہیں مرحوم نے جب کسی کام کے لیے قدم اٹھایا تو سب سے پہلے رضائے الٰہی کی جستجو رہی اور اپنے پیارے نبی کے نقش قدم ڈھونڈتے رہے اُن کی رہنمائی میں سفر کی منزلیں طے کیں۔ خدا نے اس کا یہ آخری سفر بھی آسان کر دیا اور آخری منزل و آرام گاہ پر اپنی رحمت کے شامیانے تان دیئے۔

اب وہ اپنے لگائے ہوئے چمن کے ایک گوشے میں سکھ کی نیند سو رہا ہے۔ کیسا مبارک کونہ نصیب ہوا ہے۔ جس کے سرہانے مسجد ہے رات دن گل بانگ اذان سے کان محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک طرف مجوزہ کتب خانے کی علمی فضا ہو گی۔ پائیں باغ قومی یگانگت اور محبت کے نظاروں سے بھرپور اور قومی ترانوں سے فضا گونجتی رہے گی۔

اے لوگوں کی نظروں سے چھپ کر آخری آرام گاہ میں سونے والے! تجھے زندگی میں ہم نے بہت جھنجھوڑا تیری راتوں کی نیندیں حرام کر دیں، دن کا چین چھین لیا، تجھے ہم نے بہت ستایا۔ اب تو قیامت تک

آرام سے سو۔ ظاہری مرقد کی حفاظت اور نگرانی حکومت کے کارندے کریں گے روحانی سرحدوں کی پاسبانی رحمت کے فرشتے کر رہے ہوں گے۔
اب نہ کوئی بے ادب ہاتھ تیرے دامن کی طرف بڑھے گا۔ اور نہ کوئی گستاخ آواز تیرے کانوں تک پہنچ سکے گی۔



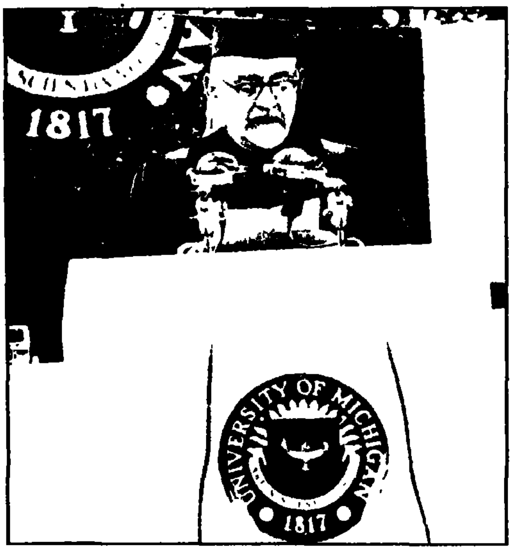
جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مقبرہ



ہندوستان کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن بھارت رتن، کا ایوارڈ دیتے ہوئے



دیرینہ دوست مصنفہ صالحہ عابد حسین کے ہمراہ



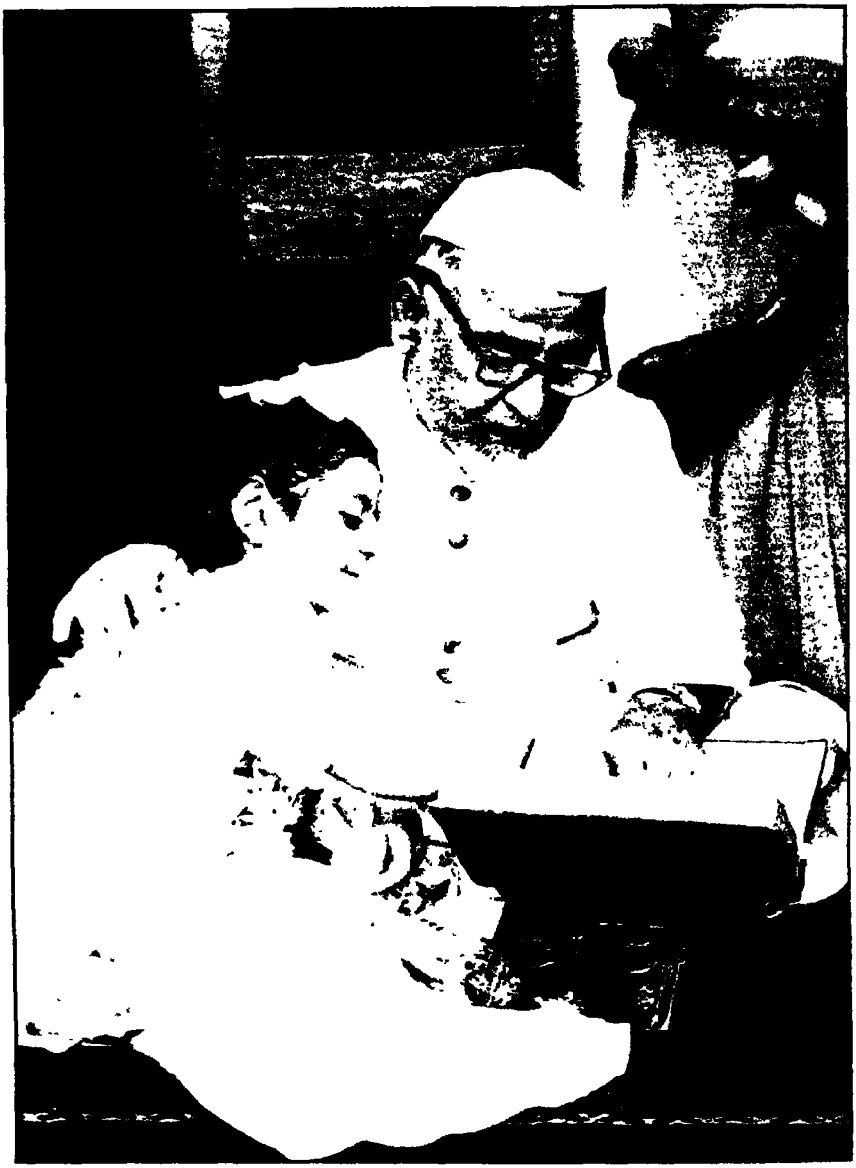
مشی گن یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے



سعیدہ خورشید اور بیگم ذاکر حسین کے ہمراہ
نواسی ہُما کو گود لیے ہوئے۔



اپنے پیارے نواسے نواسیوں نیلوفر، سلمان، آسیہ اور انجم کے ہمراہ



نواسی رابعہ کو قرآن کا درس دیتے ہوئے



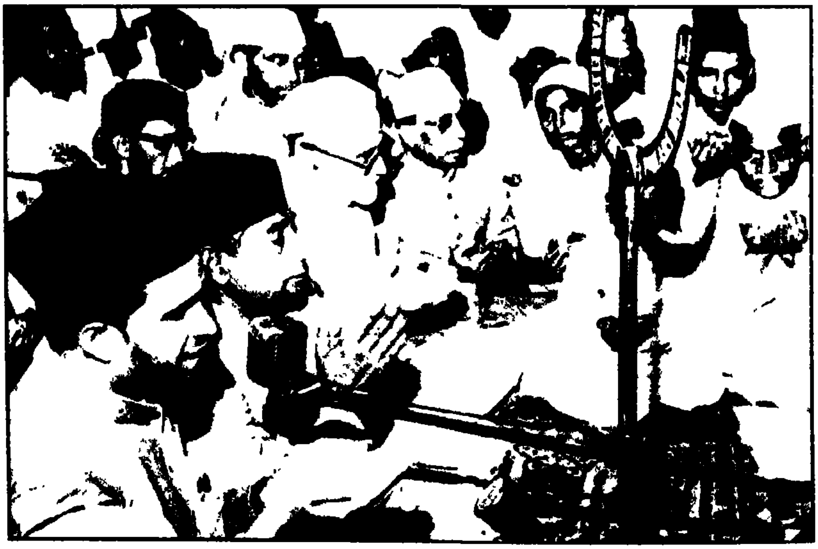
مطالعے کے کمرے میں



اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، سونیا گاندھی اور وی. وی گری کے ہمراہ



مکہ میں حج کی ادائیگی کے دوران احرام میں



حضرت نظام الدین میں خواجہ حسن ثانی نظامی، مستحسن فاروقی، شوکت علی فہمی
اور حافظ ابراہیم۔



راج بھون پٹنہ
بیٹھے ہوئے: وجے لکشمی پنڈت، رابعہ دلواسی، جواہر لال نہرو، ذاکر حسین، اندرا گاندھی
کھڑی ہوئی: انجم دلواسی



لال بہادر شاستری کے ہمراہ

سعیدہ خورشید عالم

میاں

گھر میں ہم سب انھیں میاں کہا کرتے ہیں۔ یہاں بھی میں اسی نام سے ان کا ذکر کروں گی۔ میرے دادا کا نام فدا حسین خاں تھا۔ وہ ایک کامیاب اور ہونہار وکیل تھے۔ ان کا انتقال تقریباً انتالیس سال کی عمر میں ہو گیا۔ ان کے سات بیٹے تھے۔ یعنی میاں کے علاوہ چھ بھائی اور تھے۔ میاں اپنے بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔

والد کے انتقال کے بعد بچوں کی پرورش کی پوری ذمہ داری والدہ پر تھی۔ یہ بڑی وضع دار منکسر مزاج اور سخی خاتون تھیں۔ ان کی خدا ترسی اور سخاوت کا ذکر اب بھی قایم گنج (ہمارا آبائی وطن) کی بڑی بوڑھیاں کہا کرتی ہیں۔ میاں بھی اکثر بڑی محبت سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے انتقال کا واقعہ بہت آبدیدہ ہو کر سناتے ہیں۔

میاں کی والدہ کا انتقال طاعون سے ہوا تھا۔ اس سال طاعون کی وبا ایسی پھیلی تھی کہ بستیاں کی بستیاں ویران ہو گئی تھیں۔ میاں کے گھر میں اس وقت ان کی نانی والدہ۔ دو چھوٹے بھائی اور کچھ ملازم تھے۔ ان میں سے سب سے چھوٹے بھائی کو چھوڑ کر سب اس وبا کا شکار ہو گئے۔ سب سے آخر میں والدہ پر بیماری کا حملہ ہوا۔

میاں اور ان کے دوسرے بھائی اس وقت اٹاوہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ لوگوں نے آپ کی والدہ سے کہا بھی کہ بچوں کو بیماری کی اطلاع دے دی جائے لیکن انھوں نے بچوں کو وبا کی جلتی ہوئی آگ میں بلانا پسند نہیں کیا اور کہا کہ انھیں اطلاع کرنے سے کیا فایدہ بچے پریشان ہوں گے ان کے امتحان ہونے والے ہوں گے۔ غرض چھٹیوں

پیامِ تعلیم، ستمبر ۱۹۶۷ء میں یہ مضمون شائع ہوا۔

ہیں جب یہ سب بھائی گھر آئے تو گھر میں تالا لگا ہوا پایا گھر کے سب رہنے والے وباکی نظر ہو چکے تھے۔ صرف ایک سب سے چھوٹا بھائی بچا تھا جسے ان کی چچی اپنے گھر لے گئی تھیں۔

والدہ اور والد کے انتقال کے بعد ان بے سہارا بچوں نے اپنی زندگی کے سفر کو شروع کیا اور پڑھنے میں جی جان سے جٹ گئے۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ میاں کی شخصیت کو سنوارنے کا کام قادرِ مطلق نے خود اپنے ذمہ لے لیا اور اپنے کچھ نیک بندوں کو ان کی اتالیقی کا کام سونپ دیا۔ یہ زمانہ ان کی اٹاوہ کی طالب علمی کا تھا۔ جہاں انھیں الطاف حسین صاحب جیسے مشفق استاد ملے۔ گھر پر ایک بزرگ صوفی حسن شاہ کی اتالیقی میسر ہوئی۔

یہ حسن شاہ میاں کے دور کے عزیز بھی ہوتے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد وہ ان بچوں کے پاس برابر پھیرا کرتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ انھیں میاں میں خاص دل چسپی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے شاید میاں کے جوہروں کا پتہ لگا لیا تھا۔ انھوں نے میاں کی روحانی تربیت شروع کی۔

وہ چھبیلوں کھرا اپنے ساتھ ساتھ رکھتے فقر و استغنا کا سبق شاید میاں نے حسن شاہ ہی سے سیکھا۔ حسن شاہ کو کتابیں رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ فقیر آدمی تھے۔ ہر کتاب خرید نہ سکتے تھے۔ خود نقل کرتے تھے اور میاں سے بھی یہ کام لیتے تھے۔

میاں کہتے ہیں انھوں نے بیسیوں کتابیں انھیں نقل کر کے دی تھیں۔ اس طرح ایک تو ان کا خط روز بروز بہتر ہوتا گیا۔ دوسرے مختلف قسم کے علوم سے واقفیت اور انھیں حاصل کرنے کا شوق بھی بڑھتا گیا۔ حسن شاہ اکثر میاں کو روپیے دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ انھیں بانٹو۔ اس طرح وہ فراخ دستی کی عادت ڈالتے تھے اور ان کی یہ عادت آج ہماری نظر کے سامنے ہے۔ وہ کسی ضرورت مند کی کبھی بغیر مدد کیے نہیں رہ سکتے۔

میاں کو بچوں سے بڑی دل چسپی ہے۔ میرے اور میری بہن کے بچوں سے بہت لگاؤ ہے۔ ان کی شرارتوں اور شور غل سے کبھی تنگ نہیں آتے اور اپنی انتہائی مصروف زندگی میں بھی بچوں کی معمولی معمولی خواہشوں کو بھی پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

موجودہ مصروف زندگی میں گھر والوں کے ساتھ اطمینان سے مل کر بیٹھنے کا موقع انھیں زیادہ تر کھانے کے وقت ہی ملتا ہے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے۔ جب ہم میاں سے ہر قسم کی گفتگو اطمینان کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ وہ کھانا کھاتے جاتے ہیں اور لطیفے سناتے جاتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی مخصوص چیز پکی ہو یا پرہیزی کھانا ہو۔ وہ اپنے ہاتھ سے سب

کو تقسیم کر دیتے ہیں اور خود وہی کھانا جو سب کے لیے پکا ہو کھاتے ہیں۔ آموں کے زمانے میں آم بھی خود تراش تراش کر سب کو کھلاتے ہیں۔ آم انھیں بہت مرغوب ہیں آموں کی قسموں ان کے بونے اور توڑنے کے طریقوں باغ کی نگہداشت پر جس وقت گفتگو شروع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے عمر بھر یہی کام کیا ہے۔ آم کھاتے وقت یہ شعر اکثر پڑھا کرتے ہیں۔

آنگبیں کے بحکم رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

کھانے پر باتیں کرنے میں انھیں بڑا لطف آتا ہے اور اس لطف کے لیے اکثر وہ اپنا آرام بھی تج دیتے ہیں۔

میرے بچے اپنے معمولی معمولی مسئلے جنھیں گھر میں کوئی دوسرا قابل اعتنا نہیں سمجھتا ان کے پاس لے کر جاتے ہیں اور ہمیشہ مطمئن اور مسرور لوٹتے ہیں۔ وہ ان کے لیے ریاضی کے سوالات بھی حل کرتے ہیں اور انگریزی نظم کے رمز بھی سمجھاتے ہیں۔ ان کی سالگرہ کی تاریخیں کبھی نہیں بھولتے۔ ان کی توقع سے بڑھ کر تحفہ دے کر انھیں اچنبھے میں ڈالتے ہیں انھیں بڑا لطف آتا ہے۔ بچے بھی ان سے بہت مانوس ہیں خاص طور پر میری بڑی لڑکی ریحانہ کو تو ان سے والہانہ محبت ہے۔ ایک مرتبہ جب وہ آٹھ یا نو سال کی تھی کہنے لگی، "امی جب میں سوچتی ہوں کہ اللہ میاں کیسے ہوں گے تو مجھے لگتا ہے وہ بالکل میاں جیسے ہوں گے۔"

میاں کی گفتگو کا طریقہ نہایت سلجھا ہوا ہوتا ہے وہ بڑی آسانی سے انسان کو اپنی بات ذہن نشین کرا دیتے ہیں اور اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ ان کی باتوں میں ایسا سحر ہے کہ ایسے حضرات جنھیں ان کے خیالات سے سخت اختلاف ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ ان سے گفتگو کرنے کے بعد اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

وہ نہ زیادہ زور سے ہنستے ہیں نہ زیادہ زور سے بولتے ہیں۔ میں نے کبھی انھیں قہقہہ مار کر ہنستے نہیں دیکھا۔ ملازمین سے بہت نرمی سے بات کرتے ہیں اور عام طور پر نام کے ساتھ میاں یا صاحب ضرور لگاتے ہیں۔

اپنے اعمال کی بڑی سخت نگرانی کرتے ہیں لیکن دوسروں کی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتے ہیں۔ کئی واقعات تو ایسے ہیں جن میں انھوں نے لوگوں کے بڑے بڑے اخلاقی گناہوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ بلکہ دوسروں کی غلطی کو اپنے اوپر اوڑھ لیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے عقیدت مند بھی ان سے بدظن ہو گئے ہیں لیکن انھوں نے اپنی یہ روش ترک نہیں کی۔

میاں کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی بے تعصبی ہے۔ ہم نے کبھی انھیں

کسی مذہب یا کسی پالیسی کو برا کہتے نہیں سنا۔ ان کے معصوم دل میں کسی تفریق کی گنجایش نہیں۔ تعصب کی مذمت اکثر بچّوں کے سامنے کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں اپنے مرشد شاہ صاحب کا ایک واقعہ سناتے ہیں۔ حسن شاہ پٹھان آدمی تھے۔ ایک روز غصّہ میں کسی ہندو کی شان میں گستاخانہ جملے کہہ گئے۔ ان کے پیر کو معلوم ہوا تو کہنے لگے حسن شاہ صوفیوں کو یہ زیبا نہیں۔ تمہارے دل کو ابھی طہارت (پاکیزگی) کی ضرورت ہے اس میں ابھی میل ہے اور وہ دور اس طرح ہوگا کہ سزا کے طور پر تم کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک پیدل سفر کرو۔ اس حالت میں کہ سر پر ٹوپی ہو اور ماتھے پر قشقہ تاکہ اس حالت میں تمہیں زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھ لیں اور حسن شاہ نے واقعی اپنے دل کو پاک کرنے کی خاطر ایسا ہی کیا۔

میاں حسن کے شیدائی ہیں۔ پھول پتھر آرٹ زندگی ہر چیز میں اس کے متلاشی رہتے ہیں بدنمائی اور بگاڑ کو ان کے دل نے کبھی قبول نہیں کیا۔ آج کل پھول پتھر اور ماڈرن (نئے) آرٹ کی تصویریں جمع کرنا ان کی ہابی (مشغلہ) ہے۔ وہ ان سب چیزوں کا بہت اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ نایاب پتھروں کا ایک بہت بڑا مجموعہ ان کے پاس ہے۔ پتھروں کے سلسلے میں ایک مرتبہ فرمانے لگے "مجھے پھول بہت پسند ہیں۔ لیکن پتھر ان سے بھی زیادہ اس لیے کہ پتھر مایوس نہیں کرتے پھر ہنس کر کہنے لگے اور اگر ضرورت پڑ جائے تو مارنے کے کام بھی آجاتے ہیں۔ اور حیدرآباد کے ایک مجذوب بزرگ کا قصہ سنایا کہ وہ اپنے پاس پتھروں کا ڈھیر رکھتے تھے اور ہر آنے والے کی اس سے تواضع کرتے تھے۔ بہت کم خوش نصیب پتھر کھائے بغیر ان تک پہنچ پاتے تھے۔

لباس کے معاملے میں میاں نہایت نفاست پسند ہیں تنگی ترشی کے زمانے میں بھی ہمیشہ انھوں نے اس کا خیال رکھا ان کا لباس ہمیشہ کھدر کا رہا۔ لیکن صاف اور سجل۔ یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ ان کی اچکن میں کہیں جھول ہو یا ٹوپی چھوٹی بڑی ہو۔

کھانے پینے میں بھی نفاست کا یہی حال ہے۔ وہ ایک طرف تو بُرے سے بُرا کھانا کھا سکتے ہیں اور دوسری طرف چاہتے ہیں کہ کھانا اچھے سے اچھا پکایا جائے صرف اپنے ذائقہ کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ پکانے والے کے کمال فن کی خاطر۔ خود اچھا کھانا کھا کر اتنی فرحت محسوس نہیں کرتے جتنی دوسروں کو کھلا کر کرتے ہیں۔

بُرا کھانا کھا لینے کے کئی واقعات ہیں جن میں ایک اٹاوہ کی طالب علمی کے زمانے کا ہے جب اسکول کے منیجر جناب بشیرالدین صاحب نے میاں اور ان کے کچھ ساتھیوں کے کھانے میں ایک ایک گلاس پانی ملا کر کھانے کو دیا۔ سب ساتھی ایک لقمہ لے کر

اٹھ گئے لیکن انھوں نے نہایت اطمینان سے پورا کیا اور اس طرح اٹھ گئے گویا بہت لذیذ کھانا کھایا ہو۔

بشیر الدین صاحب یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بلاکر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "میں نے صرف تم لوگوں کو آزمانے کے لیے جان بوجھ کر کھانے میں پانی ملایا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سے کون زبان کی لذت کو قربان کرسکتا ہے میرا خیال تھا کہ تم ہی کامیاب ہوگے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا خیال صحیح نکلا۔

بہار کی گورنری کے زمانے کا بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے ایک جگہ کھانے پر مدعو تھے بہت بڑی دعوت تھی۔ سکریٹری صاحب نے میزبان کو ہدایت کردی تھی کہ پرہیز کا خیال رکھا جائے۔ اس لیے کہ گورنر صاحب کو ذیابطیس کی شکایت ہے میٹھا نہیں کھا سکتے۔ سکرین استعمال کرتے ہیں میزبان صاحب نے بڑی محبت سے سکرین کا میٹھا بنوایا۔ لیکن بنانے والے نے سکرین کی مقدار بھی غالباً شکر کے برابر ڈال دی جس سے وہ کڑوا ہوگیا۔ کھانے کے بعد میٹھا آیا منھ میں دیا تو نہایت کڑوا بڑی مشکل سے کسی طرح ختم کیا۔ میزبان کا اصرار کہ اور لیجیے۔ میزبان کی دل شکنی کیسے کرتے اور لیا اور اسی ذوق شوق سے کھایا۔ گھر آکر سب واقعہ مزے لے لے کر سنایا۔ ہم لوگوں نے کہا آپ نے چھوڑ دیا ہوتا۔ کہنے لگے: بھائی میزبان بے چارے نے محبت سے بنوایا تھا۔ کتنی خفت اٹھانی پڑتی لیکن یہ ضرور ہے کہ تم لوگ کھانا پکا کر ضرور چکھ لیا کرو۔"

بہر حال یہ کچھ چھوٹی چھوٹی جھلکیاں تھیں جو میں نے میاں کی شخصیت کی آپ کو دکھائیں پوری تصویر تو آپ کو دوسرے مضامین پڑھ کر ہی نظر آسکے گی۔ میری نظر میں تو اقبال کے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ:

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

نئی دہلی
۱۴ر فروری ۱۹۶۹ء

میری پیاری ریحانہ

مجھے تمہارا خط ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ مجھے ڈاکٹر نے دس دن کے لیے مکمل آرام کی ہدایت کی ہے۔ میں اس کی ہدایت پر عمل کر رہا ہوں۔ اس دوران مجھے انفلوئنزا بھی ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے خیال تھا کہ اس کا اثر میرے دل پر ہوگا۔ مگر اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کل سے اپنے معمول کا کام شروع کر دوں گا۔ بس سفر کرنے اور تقریر کرنے میں تھوڑی احتیاط برتوں گا۔

مسز فورسٹر اور ان کے بیٹے ضرور آئیں۔ بہت خوشی ہوگی۔ کوشش کریں گے کہ انھیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ نیلو اور انجم ان کا ہر طرح سے خیال رکھیں گی۔ تمہاری امّی یہاں سے ۱۸ کو چلیں گی اور ۲۰ کو تمہارے پاس پہنچیں گی۔

ہُما اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے۔ کیسی لگتی ہوگی۔ میرا اسے دیکھنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ ہما میں نئے مہمان کی آمد سے جلن کا جذبہ پیدا نہ ہو اس کی کوشش کرو۔

مہرا اور ہما کو پیار

تمہارا چاہنے والا
میاں

نوٹ: مسز فورسٹر کے آنے کی تاریخ اور وقت سے مطلع کرو۔

عبیدالحق

ذاکر صاحب

ایک شاگرد کی نظر میں

دنیا میں ہر چیز کی قسمیں ہوتی ہیں، پھولوں کی، درختوں کی، انسانوں کی، اسی طرح استادوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک اسکول کے انسپکٹر صاحب نے ایک لڑکے سے پوچھا "دیوان غالب کس نے لکھا ہے؟" لڑکے نے ڈر کر کہا "سچ کہتا ہوں میں نے نہیں لکھا" اس کے استاد نے انسپکٹر کو سمجھاتے ہوئے کہا "دیوان غالب اِسی نے لکھا ہوگا۔ اس وقت قبول نہیں رہا ہے۔ مان جائے گا۔"

ٹیچروں کی ایک قسم وہ ہے جن کو ایک بوڑھا جج چالیس سال تک نہیں بھول سکا۔ ایک ٹیچر کسی جرم کے سلسلے میں عدالت میں پیش کیا گیا تو جج کو اپنا چالیس سال پہلے اسکول کا زمانہ یاد آگیا چلا کر حکم دیا "پہلے اس کو بنچ پر کھڑا کر اور مرغا بناؤ۔"

لیکن ایسے بھی استاد ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے زندگی پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں اور ایسی باتیں سکھا دیتے ہیں جن کو نہ صرف ہم آپ یاد رکھتے ہیں بلکہ اپنی اولاد کو ورثے میں دے جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے جامعہ میں ایسے استادوں کی کبھی کوئی کمی نہ رہی۔

ہم نے نمازیں نہ پڑھنے پر اپنے عیسائی استاد کیلاٹ صاحب کی مار کھائی ہے اور کڑکڑاتی سردیوں میں اپنے گھر سے ہوسٹل تک آکر انھیں فجر کی نماز کے لیے جگاتے دیکھا ہے۔ مذہب کو قرآن وحدیث میں مقید رکھنے اور نماز و روزہ تک محدود رکھنے پر مولانا اسلم جیراجپوری کی کڑی تنقید سنی ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی بہت سی باتوں

نوٹ: انجمن اتحاد جامعہ کالج کے "ذاکر ہاؤس" کے سالانہ جلسہ میں اس وقت یہ مضمون پڑھا گیا تھا جب ذاکر صاحب حیات تھے۔

کو صحیح طور سے نہ برتنے پر اپنی جرمن آپا جان مس گردا فلپس بورن کی نصیحتیں سنی ہیں، اور پھر ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی کلاس میں ادب و احترام کے باوجود اپنی ناسمجھی کی بنا پر ہنسے ہیں اور بعد میں شرمندہ بھی ہوئے ہیں مگر جن کے ذہنی سلجھاؤ کی مثال ملنی مشکل ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جامعہ کا ایک طالب علم اوکھلے کی نہر میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ ہم سب لوگ عابد صاحب کے پاس پہنچے اور یک زبان ہوکر کہا "پانی خطرناک چیز ہے۔ لڑکوں کا نہر میں تیرنا بند کر دینا چاہیے" ڈاکٹر صاحب سب کی باتیں سنتے رہے پھر کہنے لگے "تیرنا بند کیوں کرتے ہیں۔ تیرنا سب کو سکھا دیجیے نا۔"

پھر ہم مجیب صاحب کی صحبت میں رہے ہیں جو سگار کا دھواں تک ہونٹوں کے کونے سے نکالتے ہیں کہ سامنے والے کو تکلیف نہ پہنچے۔ جو چور کو چور کہنا تک پسند نہیں کرتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری زندگی کے بعض دھندلے خاکوں میں جو پائدار رنگ پیدا ہوئے ہیں وہ سب انھیں کے لطف و فیض کا نتیجہ ہے۔

جامعہ کے ان غیر معمولی صلاحیتوں کے اساتذہ کی فہرست میں سب سے پہلے جو نام آتا ہے وہ ذاکر صاحب کا ہے جن کی تعلیمات چراغ سے چراغ روشن کرتی ہیں، اور لوگوں کو زندگی سے مقابلے کا گر سکھاتی ہیں۔

ذاکر صاحب سے میری سب سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا اور قرول باغ میں جامعہ کے ایک ہوسٹل خاکسار منزل میں رہتا تھا۔ اختر حسین صاحب فاروقی جن کو میں چچا کہتا تھا اور میرے والد ارشاد اسحق صاحب اتالیق تھے۔ یہ دونوں ایک دن ایک مولانا صاحب کو ہماری بورڈنگ میں لائے ان کے ساتھ ایک میم صاحب بھی تھیں۔ ہم سب کو جمع کر کے مولانا صاحب نے بتایا کہ یہ تمہاری آپا جان ہیں جو جرمنی سے آئی ہیں تمہارے ساتھ رہیں گی اور تم سب کی دیکھ بھال کریں گی۔ ہم بہت خوش ہوئے مگر کھدر کی ٹوپی، شیروانی اور پاجامے میں ان مولانا صاحب کو نہ پہچان پائے۔ ان کے جانے کے بعد اختر صاحب نے بتایا کہ یہ ذاکر صاحب تھے ہمارے شیخ الجامعہ۔

شیخ الجامعہ کا لفظ میرے لیے اتنا ہی مشکل تھا جتنا تحتانیہ یا وسطانیہ، یعنی پرائمری اسکول یا ہائی اسکول، رفتہ رفتہ ان سب لفظوں سے مانوس ہوگیا اور شیخ الجامعہ سے زیادہ ذاکر صاحب سے اس لیے کہ وہ اکثر ہمارے ہوسٹل آتے اور ہماری جرمن آپا جان انھیں ذاکر صاحب ہی کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔

ایک دن ذاکر صاحب نے ہم سے کہا کہ آپا جان کو تم لوگ اچھی اردو بولنا سکھاؤ اور تم ان سے انگریزی سیکھو اور جرمن بھی۔ آگے چل کر ان کی نصیحت اب بھی یاد ہے کہ زیادہ

سے زیادہ زبانیں سیکھو، کچھ نہیں تو اُن سے واقفیت ضرور پیدا کرو۔ نہ سیکھنے سے محرومی رہتی ہے جس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا اور سیکھنے سے علم کے دروازے کھلتے ہیں۔

آپا جان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے یہ فائدہ ہوا کہ بول چال کی کچھ انگریزی آ گئی اور جرمن الفاظ بھی سیکھ لیے تھے۔ ایک دن صبح صبح ناشتہ کے وقت ذاکر صاحب آ گئے اور ان کے ساتھ آپا جان بھی تھیں۔ ہم نے "گوئن مارگن" کہہ کر ان کا استقبال کیا پھر ہم نے اُن سے پوچھا "وائن زی ملش ہابن؟" یعنی کیا آپ دودھ پئیں گی؟ آپا جان نے اردو میں کہا نہیں، شکریہ۔" ہماری زبان سے جرمن اور آپا جان سے اردو سن کر ذاکر صاحب کو تعجب بھی ہوا اور بہت خوش ہوئے وہ ہر اچھی تبدیلی پر خوشی کا اظہار کرتے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت کی ہر چھوٹی بڑی خوشگوار تبدیلی میں ذاکر صاحب کا براہ راست یا بالواسطہ دخل ضرور ہوتا۔

ساتویں کلاس میں ذاکر صاحب کی براہ راست شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ انگریزی بول چال کے ابتدائی آداب سب سے پہلے انھیں سے سیکھے۔ نیسفیلڈ کی گرامر اور پارزنگ کرتے کرتے طبیعت اُکتا چکی تھی کہ ایک دن کلاس میں ذاکر صاحب تشریف لائے اور کتاب پڑھانے کے بجائے انگریزی میں باتیں شروع کر دیں۔ نام پوچھے، مزاج پوچھا، گھر کے بارے میں دریافت کیا اور ہمارے محبوب مشغلے معلوم کیے۔ وہ پہلا دن تھا جب ہمیں معلوم ہوا کہ "How do you do?" کب کہتے ہیں اور اس کا صحیح جواب "Fine thank you" نہیں بلکہ "How do you do?" ہی ہے۔ اس دن انھوں نے ہم کو بہت سے جرمن اور انگریزی لطیفے سنائے۔ لطیفے سنانے کا انھیں بہت شوق ہے۔ کلاس کا وہ دن ہمارے لیے اتنا خوشگوار تھا جس کا لطف میں آج تک نہیں بھولا۔

کالج میں بھی ذاکر صاحب کے پڑھانے کا یہی انداز تھا۔ مشکل لفظوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے اور اپنی بات کو اس طرح سمجھاتے جیسے اس وقت ہم ہائی اسکول میں پڑھتے ہوں۔ "میری قابلیت اور میرا علم بے معنی ہے اگر اس کو آپ تک نہ پہنچا سکوں؟" "میری کامیابی تو اس پر ہے کہ آپ میری بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں۔" طالب علموں کو بھی یہی ہدایت کرتے کہ امتحان میں جواب دیتے وقت وہ اپنی بات کو اس طرح سمجھائیں گویا امتحان لینے والا جاہل مطلق ہے یا وہ ایک بچہ ہے جس کی سمجھ کم ہے۔

فرسٹ ایر میں معاشیات کیا ہے؟ کے عنوان سے ہمیں ایک مضمون لکھنے کے لیے دیا گیا۔ کلاس میں کئی ہفتے پڑھنے کے بعد بھی اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا تھا بہرحال

مضمون لکھ کر لے گیا مگر اتفاق سے اس دن ہمارے استاد بیمار پڑ گئے اور ان کی جگہ پر ذاکر صاحب خود تشریف لے آئے۔ حسبِ عادت اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھا "معاشیات کا مضمون پسند ہے؟" سب خاموش تھے میں نے کہہ دیا "جی ہاں۔ پسند ہے"۔ "مضمون تو لکھ لیا" "جی ہاں"، "تو پھر بسم اللہ، سنائیے"۔ مجھے تکلف تھا مگر ان کے حکم سے پڑھنا شروع کر دیا۔ دو صفحے سننے کے بعد جب ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو فرمایا "مضمون کی ابتدا تو بہت اچھی ہے۔ زبان بھی فصیح و بلیغ ہے۔ کن کن کتابوں سے استفادہ کیا؟" میں اس کا جواب کیا دیتا۔ کاٹو تو میرے جسم میں لہو نہیں۔ میری پریشانی دیکھ کر خود ہی فرمانے لگے "آپ نے تو ایک ہی کتاب پڑھ کر اس مضمون کو اتنا سمجھ لیا اور اس کتاب کے مصنف نے تو بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں جب بھی وہ جاہل ہے"۔ میری شرمندگی کی کوئی انتہا نہ تھی اس لیے کہ جس کتاب کے دیباچے کو نقل کر کے لے گیا تھا اس کے مصنف خود ذاکر صاحب ہی تھے۔

دوسرے دن وہ کلاس تشریف نہیں لائے، مگر سالانہ امتحان سے دو مہینے پہلے وہ ہمیں معاشیات ضرور پڑھاتے تھے اُن کا دفتر ہماری کلاس تھی۔ وہیں بلا لیتے اور فرش پر بیٹھے بیٹھے پڑھاتے۔ دوسرے مضمونوں کی طرح معاشیات بھی ایک لازمی مضمون تھا۔ اگر اختیاری ہوتا تو اس طرف توجہ نہ کرتا مگر ذاکر صاحب نے اس میں ایسی دل چسپی پیدا کر دی کہ امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گیا۔ خشک اور مشکل مضمون کو دل چسپ اور سہل انداز میں پڑھا دینا ذاکر صاحب کا بہت بڑا فن تھا۔

ہم اپنے استادوں کا بہت ادب کرتے تھے خواہ کالج کے ہوں یا مدرسہ ابتدائی کے، استاد سے بدتمیزی یا گستاخی کا ہمیں تصور ہی نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی جھوٹ ضرور بول دیتے تھے۔ ذاکر صاحب کو اس سے بھی بڑی نفرت تھی۔ ان کو اس سے تکلیف ہوتی کہ وہ اپنا قیمتی وقت دے کر کلاس آئیں اور ہم میں سے کوئی غیر حاضر ہو۔ میرے ایک پٹھان دوست چار روز کے بعد جب کلاس میں آئے تو ذاکر صاحب نے غیر حاضری کی وجہ پوچھی معلوم ہوا کہ وہ شدید بخار میں مبتلا تھے۔ "تو آپ نے کسی ڈاکٹر کو بھی دکھایا؟" "جی ہاں کل ڈاکٹر شرما کو دکھانے شہر گیا تھا اور اس کے بعد نماز پڑھنے جامع مسجد چلا گیا"۔

"تو کیا ڈاکٹر شرما نے وہی بڑے بھی لکھے تھے جسے آپ گھنٹہ گھر پر بیٹھے کھا رہے تھے؟ اور اس سے فائدہ نہ ہوا تو ڈاکٹر سینما کو دکھانے جامع مسجد چلے آئے اور نماز تو آپ نے سیڑھیوں پر ہی ادا کر دی تھی۔ کتنی قلفیاں کھائیں؟" ذاکر صاحب

کے ہر انکشاف پر میرے دوست مسلسل انکار کیے جاتے۔ جب جھوٹ برداشت نہ ہوا تو ان کو کلاس سے باہر نکال دیا۔ جب ذاکر صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو بتایا کہ انھوں نے خود انھیں مسینا کباب والے کی دکان سے نکلتے اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر قلفیاں کھاتے دیکھا تھا۔

وہ کبھی کبھی فرماتے سب سے بدقسمت وہ ہے جو اپنے استاد کی عزت نہ کرے۔ جھوٹ بولنا بھی اسی کے برابر ہے۔ جھوٹ بول کر طالب علم اس رشتے کو کمزور کر دیتا ہے جو استاد اور طالب علم کے درمیان ہوتا ہے۔ اور یہ عادت تو اللہ کی برکتوں سے بھی محروم کر دیتی ہے۔

"جو کام اس قابل ہے کہ کیا جائے وہ اس قابل ہے کہ اسے اچھی طرح کیا جائے" ذاکر صاحب کا یہ قول کس کو یاد نہیں۔ اپنے ساتھیوں سے وہ یہی امید رکھتے اور طالب علموں کو بھی یہی نصیحت کرتے "کام سے انکار کر دو یہ کہیں بہتر ہے اس سے کہ ذمے داری لی جائے اور پوری نہ کی جائے۔"

ذاکر صاحب کام لینے کے ڈھنگ سے خوب واقف تھے اور اس کا ایک راز تھا۔ وہ ہر ایک سے ہر طرح کے کام کی امید نہ رکھتے بلکہ جس میں جو صلاحیت دیکھی اسے ویسا کام دے دیا۔ کسی میں انتظامی صلاحیت ہے تو اُسے اس کام کا موقع دے دیا۔ کسی میں تعلیمی صلاحیت دیکھی تو اُسے اُس طرف متوجہ کر دیا۔ اس طرح کام کرنے والا بھی خوش رہتا اور کام لینے والے کو بھی اطمینان رہتا۔ اور پھر ان کے نزدیک ہر کام کی عزت تھی۔ کام کرنے والوں میں وہ کوئی تفریق نہ کرتے اگر ایسا کرتے تو وہ پچیس برس تک اپنے ساتھ سب کو لے کر کیسے چلتے۔ ایک طرف وہ مطبخ کے باورچی اور دفتر کے چپراسی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے تو دوسری طرف نگراں صاحبان کی ہمت افزائی میں بھی کوئی کمی نہ آنے دیتے۔

استادوں اور طالب علموں کی ہمت افزائی کے عجیب عجیب طریقے تھے۔ تقریر بھی، تحریر بھی، مگر سب سے زیادہ عمل۔ جب ہماری کوتاہیوں کی طرف توجہ دلاتے تو اس کا بھی ایک انداز تھا۔ ضرورت پڑتی تو بے دھڑک ایسے کام بھی کر دکھاتے جن کو ہم سماجی اعتبار سے گھٹیا سمجھتے ہیں۔ اس طرح دیکھنے والے کے دل پر ایسا اثر ہوتا کہ زندگی بھر بھلائے نہ بھولتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانے میں جب وہ مدرسہ ثانوی کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے ایک بورڈنگ کے پاخانوں کی صفائی بھنگی کی بڑی جھاڑو اٹھا کر خود اپنے ہاتھوں سے کی اور دیکھنے والے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد صبح کے ترانے میں جو تقریر کی اس کا موضوع پاخانوں کی صفائی تھا۔ "اگر ہم ان کو صاف

نہیں رکھ سکتے تو ہمیں یہ عمارتیں چھوڑ کر جنگل میں بس جانا چاہیے۔"

جوبلی سے پہلے ذاکر صاحب نے کچھ دنوں کے لیے مجھے مدرسہ ابتدائی میں اتالیق بنا دیا اور پڑھانے کا کام بھی سونپ دیا۔ ایک دن صبح کو کلاس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اک بارگی شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اوپر سے جھانک کر دیکھا تو ذاکر صاحب ہاتھ میں ایک پتھر لیے ڈائننگ ہال کی ایک کھڑکی کے شیشے توڑ رہے تھے۔ کچھ ملازم بھی جمع ہو گئے تھے۔ ذاکر صاحب نے اطمینان سے ہاتھ صاف کیے، جیب میں رکھے اور آگے بڑھ گئے۔ ناظم مطبخ سے صرف اتنا کہا کہ "یہ شیشے بہت گندے تھے، اب آپ کو زحمت نہ کرنا پڑے گی، میں نے انھیں اب بالکل صاف کر دیا ہے۔" "چیزوں کو اگر سلیقے سے نہ رکھا جائے اور ان کی حفاظت نہ کی جا سکے تو ان کے استعمال کا ہمیں کوئی حق نہیں۔" بورڈنگ میں چارپائیاں ٹیڑھی دیکھ کر مرزا مظہر جان جاناں کی یاد دلاتے کہ جب وہ سڑک پر چلتے ہوئے کسی چارپائی کو ٹیڑھی بچھی دیکھتے تو اسے سیدھا کر دیتے کیوں کہ ان کے نزدیک ٹیڑھی چارپائی سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ پھولوں خاص طور سے گلاب سے ذاکر صاحب کو جو شیفتگی ہے وہ کون نہیں جانتا۔ اس شوق کو انھوں نے اپنی ہی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ دوسروں میں بھی پیدا کیا۔ جب پہلی مرتبہ انگلستان سے گلاب کے پودے لائے تو جامعہ میں ان کا بہت چرچا تھا۔ چھوٹے چھوٹے چنبیلی کے پھول کے برابر۔ اس کو دیکھنے روز ایک چکر لگاتے۔ ایک دن پوچھ لیا، "پسند ہیں؟" میں نے کہہ دیا کہ "یہ تو بہت چھوٹے ہیں۔" فرمایا "ہر چیز کا اپنا حُسن ہوتا ہے۔ چھوٹے ہیں مگر ان کی بھی اپنی خوب صورتی ہے جو بڑے پھولوں میں نہیں۔" اس کے بعد میری شیروانی کے کھلے ہوئے بٹن اپنے ہاتھ سے بند کیے اور آگے چل دیئے۔ "بٹن صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ انھیں لگایا جائے۔"

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بمبئی جا کر آرٹ کی تعلیم حاصل کروں۔ مجھے اپنے دفتر بلا کر اس خواہش کی وجہ پوچھی میں نے کہا "روپیہ پیدا کرنا چاہتا ہوں" "تو پھر ڈاکہ کیوں نہیں مارتے، یا پھر کسی فلم ایکٹریس سے شادی کر لو۔ پیسے کمانے کے تو اور بھی طریقے ہیں۔" میں چپ رہا، میری آزمائش کے لیے مشورہ دیا کہ استادوں کے مدرسے میں ٹریننگ لے لوں۔ مگر مجھے چرخے اور باغبانی سے دل چسپی نہ تھی اور بنیادی تعلیم کا استا بننا نہیں چاہتا تھا۔ چرخے پر گاندھی جی کا حوالہ دیا اور باغبانی پر استاد محترم مجیب صاحب کے شوق کا ذکر کیا کہ اپنے ہاتھ سے باغبانی کرتے ہیں کتنے اچھے پھول لگائے ہیں اور ترکاریاں پیدا کی ہیں۔

آخر کار میری خواہش کو مان گئے مگر ایک نصیحت کی "آرٹ ضرور سیکھئے مگر اس

سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا ہے۔ آرٹسٹ بن جانا آسان ہے لیکن یہ نہ بھولیے کہ تعلیم
ہر منزل پر آرٹ کی ضرورت ہوتی ہے"۔

پھر ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے اور جامعہ تشریف لائے تو خوشخبر
سنائی کہ مزید تعلیم کے لیے امریکہ جا رہا ہوں فرمایا "مگر بھائی اب جامعہ میں رہ کر بھ
کچھ کام کر ڈالیے۔ کہاں تک پڑھئے گا۔ کام کرنے والے ڈگریوں کے بغیر بھی کا
کر لیتے ہیں"۔

جامعہ میں جوبلی کے موقع پر استادوں اور طالب علموں نے جس خلوص اور انہما
سے کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا۔ تعلیم
ساتھ مزدوروں کی طرح کام کیے، سڑکیں بنائیں، سر پر مٹی ڈھوئی۔ پنڈال میں زمین
ہموار کرنے سے لے کر فرش اور کرسیاں بچھانے تک کا کام کیا۔ ایسے موقعوں پر ذا
صاحب کی حیثیت کسی افسر یا نگراں کی سی نہ رہی بلکہ ہر کام کو کرنے میں وہ سب
ساتھ برابر کے شریک رہے۔ کام کو عبادت سمجھ کر کرنا اور دوسروں کے سامنے ا
کی مثال پیش کرنا ان کا ہمیشہ سے ایک وطیرہ اور شعار رہا ہے۔

ملک میں ہر طرف فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے، دہلی کی فضا بھی بہت خراب
تھی، جوبلی کی تاریخیں قریب آئیں تو دلی کے بیشتر علاقوں میں کرفیو تھا۔ عام خیال تھا
دوسرے دن افتتاحی جلسہ نہ ہو سکے گا۔ ذاکر صاحب کا وہ جملہ اب تک یاد ہے "فکر
کیجئے۔ آپ کی محنت رائیگاں نہ جائے گی۔ کوئی نہ ہوگا تو ہم آپ تو ہوں گے۔ میں ان خالی
کرسیوں کے سامنے تقریر کروں گا"۔ مگر دوسرے دن شاندار جلسہ ہوا۔ ہر سیاسی پارٹی
کے چوٹی کے لیڈر موجود تھے۔ مولانا آزاد، پنڈت نہرو، راجہ جی، محمد علی جناح، لیاقت علی
خاں، اس جلسے میں ذاکر صاحب نے اس وقت کی چھوٹی سی جامعہ کے کاموں کا تعارف
کرایا اور ان رہنماؤں کے سامنے جو آسمان سیاست کے ستارے تھے جس درد
بھرے انداز میں فسادات اور معصوم بچوں کے قتل کا ذکر کیا اُن کے الفاظ کی گونج
آج بھی اپنے کانوں میں محسوس کرتا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ ذاکر صاحب کی شخصیت بہت پیاری ہے اور وہ سچ ہی کہتے
ہیں۔ لیکن آخر وہ کونسی بات ہے جس سے وہ ہر ایک کا دل موہ لیتے ہیں۔ شخصیت کو خانو
خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت کی بنیاد عمل ہے۔ ا
کو قدرت نے اس وصف سے مالا مال کر دیا ہے کہ وہ ہر ایک کو ساتھ لے کر کام کر سکے
جامعہ کی زندگی میں انھوں نے مختلف خیال کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا
کر دیا جن میں مسلمان، ہندو، عیسائی، کانگریسی، مسلم لیگی، کمیونسٹ، آزاد خیال اور کٹر

کٹر مذہبی سب ہی طرح کے لوگ تھے۔ ان تمام لوگوں کو لے کر اتنا خوب صورت گلدستہ بنائے رکھا جس کی رنگینی، جس کی دلکشی اور جس کی خوشبو آج بھی باقی ہے۔

آپ شاید میری ان باتوں کو میرے جذبات پر محمول کریں۔ اس لیے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے، جامعہ بہت بڑی ہوگئی ہے، جامعہ اب ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ ہے، اچھی عمارتیں ہیں، اچھی تنخواہیں بھی، مگر ان سب کے ساتھ ایک سچائی یہ بھی ہے کہ ہم پہلے سے بھی زیادہ بے چین ہیں اور اب ذرا ذرا سی بات پر شکایتیں کرتے ہیں۔ چند دن ہوئے کچھ طالب علموں نے ایک مضمون کے مشکل ہونے کی شکایت کی۔ مجھے اس وقت ذاکر صاحب یاد آگئے۔ ان کے پاس کچھ طالب علم گئے اور کہا انگریزی بہت مشکل مضمون ہے۔ کچھ کیجیے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ "یہ شکایت میں چار پانچ سال سے سن رہا ہوں۔ اس تمام عرصے میں اگر آپ چاہتے تو انگریزی کا صرف ایک لفظ روز اور یہ بھی توفیق نہ ہوتی تو دو دن میں ایک لفظ یاد کر لیتے اور اس کا استعمال سیکھ لیتے تو مجھ سے اچھی انگریزی ہو جاتی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ آئندہ دس برس تک اسی طرح شکایت کرتے رہیں گے۔"

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جس چمن کی آبیاری میں لیاقت سے زیادہ خلوص، شخصیت سے زیادہ ایثار اور مروت سے زیادہ محبت کارفرما رہی ہے آنے والے لوگ اس چمن کی بہار قائم رکھ سکیں گے؟

ضیا الحسن فاروقی

شہیدِ جستجو

ذاکر صاحب دہلی اسٹیشن پر ۳ بجے صبح پہنچے۔ انھوں نے منظور کو (جو اس سفر میں ذاکر صاحب کے ساتھ تھے) اسٹاف کار کو منگوانے کے لیے فون کرنے سے منع کر دیا کیونکہ اس سے جامعہ میں بلا وجہ پریشانی ہوتی۔ وہ ویٹنگ روم گئے کہ شاید وہاں بیٹھنے کی جگہ مل جائے۔ سب کمرے بھرے ہوئے تھے۔ دربان نے کہا کہ وہ برآمدے میں اپنا بستر بچھا لیں۔ لیکن ذاکر صاحب کے پاس بستر ہی کہاں تھا۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ کیا کوئی سستا سا ہوٹل وہاں کہیں قریب ہے۔ دربان نے ایک ہوٹل کا نام بتا دیا۔ ذاکر صاحب وہاں گئے اور انھیں کوٹھری دے دی گئی جس میں نہ پنکھا تھا نہ روشن دان۔ انھوں نے منظور سے کہا کہ چھت پر دیکھو کوئی جگہ ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ وہاں جگہ ہی نہیں بلکہ ایک چارپائی بھی ہے۔ جب وہ منظور کے ساتھ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ساری چھت پر بکریاں پھیلی ہوئی ہیں۔ منظور نے ان سب کو ایک طرف ہانک دیا۔ اور ذاکر صاحب چارپائی پر دراز ہو گئے۔ ذاکر صاحب نے اوکھلا جانے والی پہلی بس پکڑی اور ٹرمینس پر اتر گئے اور اپنے گھر کو اس طرح کھیتوں سے ہو کر چلے کہ راستے میں کوئی انھیں دیکھ نہ لے۔"[1]

اسی دن یا دوسرے روز وہ وزیراعظم اور وزیرِ داخلہ سے ملے، اور جو کچھ ان پر گزری تھی اور جو کچھ انھوں نے جالندھر میں دیکھا تھا اس سے انھیں مطلع کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت تک پنڈت نہرو کو پنجاب کی صورتِ حال سے کچھ زیادہ باخبر نہیں رکھا گیا تھا کیونکہ وہ ذاکر صاحب کی روداد سن کر دم بخود رہ گئے۔ اس کے دوسرے دن وہ ہوائی جہاز سے جالندھر پہنچے اور پھر تو سب کو معلوم ہو گیا کہ وہاں کیسا المیہ واقعہ ہوتے ہوتے

---

[1] محمد مجیب۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ اے بایوگرافی، ص ۱۴۳۔

رہ گیا تھا۔ لیکن تشدد اور مصائب اتنے بڑھ گئے تھے کہ کسی ایک واقعے کا دیرپا اثر قائم نہیں رہ سکتا تھا، اور اب تو خود دہلی اس کی زد میں تھی، مصائب و آلام اور مظلوم برباد اور دلوں اور جسموں کی جراحتوں سے چور چور انسانوں کے جذبات و احساسات کا ایک سیلاب تھا جو دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا اور جس پر کسی طرح قابو نہیں حاصل کیا جا سکتا تھا۔

طویل شب غلامی کے بعد آزادی کی صبح کا اُجالا کتنا داغ داغ تھا، اس کی ایک دلدوز جھلک ہم نے ذاکر صاحب کے خط میں ابھی دیکھی بیگم انیس قدوائی کی کتاب[1] آزادی کی چھاؤں میں اس "شب گزیدہ سحر" کو کئی رنگ میں پیش کرتی ہے جن میں کئی خونیں ہیں اور کئی ایسے جو حالات کی اس ہولناکی میں بھی امید دلاتی تھیں کہ انسان ابھی مرا نہیں ہے، انسانیت زندہ ہے۔

ذاکر صاحب جب جالندھر سے بچ کر دہلی واپس آئے تو وہ وزیر اعظم پنڈت نہرو وغیرہ کو پنجاب کی صورت حال سے باخبر کرنے کے بعد چند دنوں کے لیے جامعہ نگر میں مجیب صاحب کے مکان میں گوشہ نشین ہو گئے۔ منظور پیچھے کے دروازے سے ان کے لیے کھانا اور ناشتہ لے جاتے۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ ذاکر صاحب کی یہ گوشہ نشینی کیا آرام کے لیے تھی جس سے وہ محروم رہے تھے؟ لیکن جن حالات سے وہ گزرے تھے ان کا تجربہ ایسا روح فرسا تھا کہ آرام کہاں نصیب ہو سکتا تھا! تو پھر کیا یہ گوشہ نشینی جگر لخت لخت کو جمع کرنے کے لیے تھی، یا ان خوابوں کے ماتم کے لیے تھی جو بکھر گئے تھے؟ جامعہ ملیہ اسلامیہ جوان کی امیدوں، حوصلوں اور ارادوں کا مرئی پیکر تھی، وہ بھی منتشر ہوتی نظر آتی تھی، کیا مجیب صاحب کے مکان میں دھیان گیا ان کا یہ مرحلہ کسی پیمانے پر سہی، اسے انتشار و تباہی سے محفوظ رکھنے کی تدبیروں پر غور و فکر کے لیے تھا یا پنجاب کے حالات کے پیش نظر دہلی کے مسلمانوں کی بربادی کے اندیشوں، مسلمانوں کی آئندہ کی مشکلوں، اس ملک میں اسلام، گنگا جمنی ہندو مسلم تمدن اور پھر پوری قومی زندگی کو پیش آنے والے خطروں کے تجزیے اور ایسے میں جو کچھ بچ سکے اسے بچا لینے کے عزم و ارادے کے لیے تھا؟ — ان تمام سوالوں کا جواب ذاکر صاحب ہی دے سکتے تھے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ جب دہلی میں آتش و خون کا سلسلہ شروع ہوا تو ذاکر صاحب اپنے 'حجرہ' سے نکل آئے اور پھر انھوں نے ہمت اور عزیمت کی ایک مثال قائم کر دی۔ وہی نیشنلسٹ مسلمان۔ عارضی حکومت کی کابینہ میں جس کو شامل کرنے

---

[1] قومی ایکتا ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

کی تجویز ابھی کوئی ایک سال پہلے مسلم انڈیا کے لیے ناقابل برداشت تھی، آج مسلم انڈیا کے قافلوں کے لیے پھٹے خیموں کی جلی ہوئی طنابیں اس عزم کے ساتھ جمع کر رہا تھا کہ ان کے قافلے کو ایک بار پھر جادہ پیما ہونا تھا: اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل۔

جامعہ ملیہ کے وہ شعبے جو ابھی قرول باغ ہی میں تھے، آتش و خون کی زد میں تھے۔ اس کے ایک کارکن کام آچکے تھے اور شفیق الرحمٰن قدوائی اور حامد علی خاں قتل ہونے سے بال بال بچے تھے۔ ادھر جامعہ نگر کے آس پاس گاؤں میں باہر سے آنے والوں نے منظم طور پر قتل و غارت گری شروع کر دی تھی۔ شہر میں مسلم محلوں اور علاقوں میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا ذکر اب اس لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ سب کچھ مرقوم ہو چکا ہے۔ ان بُرے دنوں میں ذاکر صاحب نے جامعہ والوں کو جانے، شہر دلی اور ہمایوں کے مقبرے کے کیمپ[1] میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے مسلمانوں کی خدمت کرنے، کسٹوڈین جے۔ ایم۔ بولو پر بھو کے مشیر کی حیثیت سے مکمل غیر جانب داری کا ایک ریکارڈ قائم کرنے، اور پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کے زخم خوردہ دلوں کو ہاتھ میں لینے کے سلسلے میں جو کچھ کیا، اس کی داستان بھی بہت طویل ہے۔ ہاں، ان دنوں انھوں نے جو تقریریں کیں، جس ہمت اور جواں مردی سے کام کیا اور ان کی شخصیت اقدامی صلاحیت کے جو جوہر دیکھنے میں آئے، اس سب سے ایک بندۂ مومن کی دلآویز تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ یہ بندۂ مومن اگر ایک طرف مصاف زندگی میں فولاد کی صورت صلابت و استقامت کی مثال ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کا دل زخموں سے چور، اور آنکھیں آنسوؤں سے بوجھل ہوتی ہیں کہ ابھی انسان اپنی وحشت پر قابو نہیں حاصل کر سکا ہے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں دلی کے حالات ہی ایسے تھے کہ عام انسان ایک گہری بے یقینی اور بے پناہ خوف و ہراس میں مبتلا تھا۔ جامعہ میں بھی یہی کیفیت تھی ــ بے بسی کا سکوت اور خوف کا سناٹا۔ ذاکر صاحب نے ۲ اکتوبر کو گاندھی جی کے جنم دن کے موقع پر جامعہ والوں کی چھوٹی سی جماعت کو خطاب کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب شمال کی طرف سے مشین گنوں کی آواز آ رہی تھی، جنوب کی طرف سے مسلح بلوائیوں کا خطرہ تھا، مشرق کی طرف سے سنائے ہوئے سہمے ہوئے دیہاتی آ آ کر جامعہ میں پناہ لے رہے تھے اور مغرب کی طرف ہمایوں کے مقبرے کا اور وہاں سے پاکستان کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب نے جامعہ والوں کو جامعہ سے گاندھی جی کے گہرے تعلق اور ان دنوں کی یاد دلائی جب گاندھی جی مسلمانوں کے سچے دوست اور محسن سمجھے جاتے تھے، پھر اس زمانے کا ذکر کیا جب مسلمانوں کے نئے دوست اور محسن پیدا ہو گئے جنھوں نے

---

[1] دیکھیے بیگم انیس قدوائی کی کتاب آزادی کی چھاؤں میں۔ اس میں ایک باب ہمایوں کے مقبرے کے کیمپ سے متعلق ہے۔ یہ کیمپ ذاکر صاحب کی نگرانی میں جامعہ والے چلا رہے تھے۔

ان کو بتایا کہ گاندھی تمہارا نمبر ایک دشمن ہے " یہ جھوٹ اس قدر پھیلا کہ مسلمانوں کے دلوں کے دروازے گاندھی جی پر بند ہو گئے۔ مگر گاندھی جی کے دل کا دروازہ ان کے لیے ہمیشہ کھلا رہا . . . " ذاکر صاحب نے کہا: " آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کا سچا پکا، دلی دوست ایک ہی ہے جو آپ کا پشت پناہ اور سینہ سپر ہے۔ آج مسلمان گاندھی جی کو مان گئے ہیں، اس لیے کہ مسلمان اور جا ہے جو کچھ ہوں، احسان فراموش ہرگز نہیں ہیں۔"

ذاکر صاحب نے دہلی میں فسادات کو روکنے اور امن و امان کی بحالی کے لیے گاندھی جی کی کوششوں اور حکومت وقت کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے یقین دلایا کہ گاندھی جی کی آواز اثر کر کے رہے گی، حکومت کو حالات پر قابو حاصل ہوگا، وحشت اور بربریت کے دن جلد ہی بیت جائیں گے اور ہندوستان جو تنا گر گیا ہے ایک بار پھر اٹھے گا اور دنیا کی قومیں پوری انسانیت ہندوستانی قوم کے مصلح گاندھی جی پر فخر کرے گی۔ انھوں نے اہل جامعہ کو بتایا کہ "کسی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ ایک دم سے یہ قیامت ٹوٹ پڑے گی، فسادات کے پہلے ریلے نے اچانک آلیا" لیکن اب حکومت سنبھل گئی ہے اور پوری قوت سے اس فتنے کا سر کچلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور پھر اپنے مخصوص لہجے میں سچائی کی پوری قوت کے ساتھ کہا:

" مگر آپ لوگ یہ نہ سمجھ لیجیے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ خطرہ ابھی سر پر منڈلا رہا ہے اور جو کچھ اب تک ہوا ہے اس سے بھی بدتر حالات پیش آ سکتے ہیں۔ یہ آگ سارے ملک میں پھیل سکتی ہے، اپنے کو دھوکے میں نہ رکھیے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو بے فکری کا اطمینان دلایا جائے۔ میں آپ کو وہ اطمینان دلانا چاہتا ہوں جو خطرے کا پورا احساس رکھنے کے باوجود ہوتا ہے . . . قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے نازک موقعے آتے ہیں، یہ وقت قدرت کی طرف سے آزمائش کا ہوتا ہے۔ اب آپ کے سامنے یہ سوال ہے کہ آپ اس آزمائش سے گزرنا چاہتے ہیں یا اس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا فیصلہ بھاگنے کا ہے تو بسم اللہ . . . پاکستان کا راستہ کھلا ہوا ہے جو جانا چاہے شوق سے جائے، مگر یاد رکھیے موت آپ کا پیچھا وہاں بھی نہ چھوڑے گی کتنے ہوں گے جو راستے میں مارے جائیں گے۔ کتنے ریل کے بند ڈبوں میں گھٹ کر مر جائیں گے۔ لیکن اگر آپ کا فیصلہ اس آزمائش سے گزرنے کا ہو تو پھر یہاں ڈٹ جائیے۔ یہ یاد رکھیے کہ بہت ممکن ہے کہ آپ مار ڈالے جائیں، لیکن آپ کا یہ قتل رائیگاں نہیں جائے گا بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جن پر قاتل شرماتے ہیں اور مقتول فخر کرتے ہیں، بعض قتل ایسے ہوتے ہیں جو پوری زندگیوں پر بھاری ہوتے ہیں، بعض قتل گرتی ہوئی قوموں کو سنبھال لیتے ہیں، گری ہوئی قوموں کو اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جامعہ کے لوگ اگر ایسے مقتولوں میں شامل ہو جائیں

تو وہ کام کر جائیں گے جو پچھلے سب کاموں پر بھاری ہوگا۔

"جو لوگ موت کے استقبال کے لیے تیار رہتے ہیں ان کے لیے زندہ رہنے کی راہیں بھی نکل آتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی جس کو غلط رہنمائی نے اس بھنور میں ڈال دیا ہے، آپ کے کمزور ہاتھوں سے پار لگ جائے! کیا عجب ہے کہ خدا آپ ہی کے ہاتھ سے مسلمانوں کی تنظیم کا کام لے جس کی بنا خدا کے خوف اور خلق خدا کی محبت وطن کی وفاداری اور اہل وطن کی خدمت پر استوار ہو! اور کچھ نہ سہی تو آپ اپنی مثال سے اس وقت دہلی کے لوگوں کی ہمت بندھا ئیں گے۔ اب بھی جو مسلمان اپنے اپنے محلوں میں ڈٹے ہوئے ہیں وہ بھاگنے والوں سے زیادہ آرام میں ہیں۔ ان ہی لوگوں کی وجہ سے دہلی بچ جائے گی۔ آپ اس کے بچانے میں حصہ لیجیے۔"[1]

ادھر ذاکر صاحب نے ساتھیوں میں ایک جوش، ہمت اور امید پیدا کی، اور اُدھر ان کی شخصیت کی وجہ سے وزیر اعظم اور دہلی ایڈمنسٹریشن نے جامعہ ملیہ اور اوکھلا گاؤں کی حفاظت کا خاص خیال رکھا، ایک رات خود دہلی کے ڈپٹی کمشنر جامعہ آئے اور تقریباً ایک درجن بندوقوں کے لائسنس تقسیم کیے۔ ایک دن کوئی آدھی رات کو وزیر اعظم خود پہنچے، حفاظتی انتظامات کا معائنہ کیا اور اس وقت گئے جب رات ختم ہونے والی تھی۔ جنرل کیری اپا نے مدراس رجمنٹ کا ایک دستہ جامعہ نگر کی حفاظت کے لیے متعین کر دیا۔ گاندھی جی نے ۹ ستمبر کی صبح کو دہلی اسٹیشن پر پہنچتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا: کیا ذاکر حسین خیریت سے ہیں؟ کیا جامعہ ملیہ محفوظ ہے؟ دوسرے دن وہ اپنے اطمینان کی خاطر جامعہ آئے۔

---

[1] ذاکر حسین "قرار یا فرار" نئی روشنی (جامعہ نگر، نئی دہلی) ۲۴، جون ۴۸ء

حصّہ سوم

ذاکر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلو

بمل پرساد

ذاکر حسین کی مہاتما گاندھی سے خط و کتابت

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک

میں ۱۹۸۲ء میں تقسیم ہند کے پس منظر کا مطالعہ کرنے کے لیے کراچی قائدِ اعظم اکادمی میں ریسرچ کرنے گیا تھا۔ وہاں جناح کے کاغذات میں جو مائکروفلم پر موجود ہیں، مجھے اتفاقاً ایک نایاب مجموعہ گاندھی جی اور ذاکر حسین کی خط و کتابت کا دیکھنے کا موقع ملا (ریل نمبر ۱۵ - فائل ۱۶۹) یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ خط کس طرح وہاں پہنچے۔ لیکن ان کی اہمیت میں کوئی شک نہیں۔ اس میں سے دو خط گاندھی جی کے کاغذات میں شامل ہیں۔ لیکن باقی کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ذاکر صاحب کے لکھے ہوئے خط بھی کہیں اور نہیں ملے۔ اس کے علاوہ اِن خطوں کی تاریخی اہمیت بھی ظاہر ہے۔ کیونکہ ان سے نہ صرف گاندھی جی اور ذاکر حسین صاحب کے گہرے ذاتی تعلق کا پتہ چلتا ہے بلکہ ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۸ء کے زمانے میں ذاکر صاحب کی سوچ اور فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ان کے ذہن میں ہماری سماجی زندگی کے مختلف مسئلوں کے بارے میں تھی۔

پہلا خط قابل غور ہے وہ گاندھی جی کے کاغذات میں موجود ہے یہ خط گاندھی جی کی اپنی تحریر میں ہے اور ۲۵ مارچ ۱۹۳۶ء کا لکھا ہوا ہے (۲۲۴۴ - ۱ھ ۴ صفحہ ۶۲) یہ خط ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے ۱۵ دن بعد کا لکھا ہوا ہے ڈاکٹر انصاری کانگریس کے صدر اور اس کی پارلیمنٹری بورڈ کے چیرمین رہ چکے تھے اور دنیا بھر میں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے آخر کے کانگریس کے نیشلسٹ مسلمانوں میں سب سے زیادہ قابل اور عظیم لیڈر مانے جاتے تھے۔ تعجب تو یہ ہے کہ حالانکہ مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت کانگریس اور قومی سیاست میں بہت پیش پیش تھے اور کانگریس کے صدر بھی رہ چکے تھے، لیکن گاندھی جی کی نظر، ہندو مسلم سوال حل کرنے کے لیے اپنا مشیر چننے میں ذاکر صاحب پر پڑی کہ وہ اس خلا کو پُر کریں جو انصاری صاحب کی موت کی وجہ سے ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی گاندھی جی نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ

ان کی رائے میں "ڈاکٹر انصاری کے پائے کے بے مثل رہنما کی برابری کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ یہ قابلیت کا سوال نہیں، بلکہ بھروسے کا سوال ہے" لیکن پھر بھی انھوں نے ذاکر صاحب کو ڈاکٹر انصاری کی قائم مقامی کا درجہ سونپا۔ اور لکھا۔۔

"میں آپ سے سوال کرنا چاہتا تھا اور اب بھی کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ میرے لیے وہ بن سکتے ہیں جو ہندو مسلم مسئلے پر ڈاکٹر صاحب تھے؟ میرے لیے سب سے بڑی پریشانی کا سبب اپنے مخلص دوست۔ یا ایک خدا ترس اور خدا پرست انسان کی جدائی کا ہی نہیں ہے بلکہ ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں ایک صحیح رہنما کی غیر موجودگی ہے۔ اس وقت ہندو مسلم سوال پر میری خاموشی کی وجہ میری بے حسی نہیں ہے، بلکہ یہ اس گہرے یقین کی علامت ہے کہ یہ اتحاد ہو کر رہے گا۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ ڈاکٹر انصاری کا نعم البدل نہیں گے! اس کے جواب میں آپ اپنے سماجی رتبے کا خیال نہ کیجیے گا۔ اگر آپ میں خود اعتمادی ہے تو آپ "ہاں" کر دیجیے۔ لیکن اگر نہیں ہے تو آپ ضرور "نا" کہہ دیجیے۔ مجھے آپ کی طرف سے کوئی غلط فہمی نہیں ہوگی میں آپ کی اتنی قدر اور محبت کرتا ہوں کہ اس میں غلط فہمی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"

اس کے جواب میں ذاکر صاحب کا خط موجود نہیں ہے۔ لیکن گاندھی جی کے اگلے خط سے (جو ان کے مجموعے میں نہیں ہے) جو انھوں نے ۸ یا ۹۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں ذاکر صاحب کو لکھا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے "ہاں" کر دی تھی۔ گاندھی جی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی جب وہ لکھتے ہیں:

"میری تجویز پر آپ کی فراخ دلی اور پوری رضامندی سے منظوری پر مجھے اپنی بے تحاشہ پریشانیوں سے کچھ نجات ملی۔ یہ امر اُن پانی کی بالٹیوں کے مانند ہے جو انسان ہمیشہ بھری رکھتا ہے چاہے انھیں استعمال کرنے کی نوبت نہ ہی آئے۔ لیکن اس سے یہ اطمینان رہتا ہے کہ اگر کبھی آگ لگ جائے تو اِن بالٹیوں کی مدد سے فوراً بجھائی جا سکتی ہے۔ یہ ہی فرض ڈاکٹر انصاری بہت خوبی سے انجام دے رہے تھے۔ اور اب آپ میرے لیے یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے ان کے اس خاص فرض کی زیادہ تر ضرورت نہیں پڑی تھی اور ہو سکتا ہے کہ آپ کو بھی تکلیف دینے کی نوبت نہ آئے کہ آپ کا وقت ضائع ہو لیکن یہ یقین کہ نازک حالات میں آپ میری مدد کرنے کے لیے موجود ہیں، میرے لیے نہایت اطمینان کا باعث ہے۔

یہ سب لکھنے کے بعد گاندھی جی "ہندی۔ ہندوستانی" بحث کا ذکر کرتے ہیں جو اس وقت ملک میں بڑے زوروں سے جاری تھی۔ جب سے کچھ ہفتے پہلے گاندھی جی نے اتفاق سے ناگپور کی ایک ادبی کانفرنس میں "ہندی یا ہندوستانی" (اردو کا ذکر کیے بغیر) کا جملہ

استعمال کیا تھا۔ اس کی وجہ سے بہت سے اردو کے حمایتیوں کو سخت شکایت تھی کہ گاندھی جی دراصل ہندوستانی کے بھیس میں ہندی کو بڑھاوا دینا چاہتے ہیں اور اردو کے خلاف ہیں۔ گاندھی جی نے اپنے پہلے خط میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میرے نزدیک اس اختلاف رائے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوا ہے تو ہمیں اس کو دور کرنا پڑے گا۔"

ہمارے پاس گاندھی جی کے دونوں خطوں کے جواب میں ذاکر صاحب کے خطوں کی کوئی کاپی نہیں ہے۔ لیکن گاندھی جی کے دوسرے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے بنیادی نظریہ میں اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ اختلاف یا غلط فہمی ضرور تھی۔ گاندھی جی اپنے دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے سکریٹری مہادیو دیسائی سے کہا ہے کہ وہ ذاکر صاحب کو ۹ رمئی اور ۱۹ رمئی ۱۹۳۶ء کے "ہریجن" رسالے کی کاپیاں بھیج دیں جس میں اس مسئلے کے بارے میں گاندھی جی کے مضمون شائع ہوئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت وہ اس بارے میں کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے ہیں کیونکہ اس وقت تک ذاکر صاحب نے ان کے یہ مضامین نہیں پڑھے تھے۔ وہ لکھتے ہیں؛

"اگر آپ کو میری رائے سے پوری طرح اتفاق نہیں ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ کھل کر میری مخالفت کریں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے درمیان مروت یا عارضی صلح ہو۔ کیونکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

زبان کے بارے میں اپنا نظریہ واضح کرتے ہوئے گاندھی جی لکھتے ہیں:

"میں سمجھتا ہوں کہ ہندی اور اردو کے میل سے کوئی نئی زبان ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی زبان موجود ہے چاہے اسے کسی نام سے پکارا جائے اور یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں ہزاروں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں۔ یعنی وندھیا چل کے شمال میں جو صوبے ہیں۔ سوائے ان چند صوبوں کے جہاں ہندی، ہندوستانی اور اردو کے علاوہ جو چاہے دیوناگری تحریریں ہو یا فارسی میں، اردو زبانیں بھی بولی جاتی ہیں بہرحال یہ سب اس لیے لکھا جارہا ہے کہ اگر کچھ اور اختلاف رہ گئے ہوں تو ان کی مزید تشریح ہوجائے۔ ہمارے درمیان اس سوال پر پورا اتفاق رائے ہونا چاہیے جو میرے نزدیک کافی آسان ہے۔ کم از کم جہاں تک اصول کا تعلق ہے۔"

گاندھی جی کا اگلا خط (جوان کے کاغذوں میں کہیں نہیں ملا) ۷، جون ۱۹۳۷ء کا لکھا ہوا ہے جس کا ذکر صاحب نے ایک لمبا جواب بھیجا (جس کی ہاتھ کی لکھی کاپی جناح کے کاغذات میں موجود ہے)۔ اس خط میں گاندھی جی لکھتے ہیں کہ وہ ذاکر صاحب کو ڈاکٹر انصاری کا "روحانی وارث" مانتے ہیں۔ اس خط کے لکھنے کی وجہ تھی ہندو مسلمان فسادات کے بارے میں حال ہی

میں بمبئی میں ہوئے تھے، ذاکر صاحب کے تاثرات جاننا اور اردو کی بابت بھی۔ یعنی اس اختلاف رائے کے بارے میں جو مدراس کے ایک منسٹر نے کیا تھا۔ اور تیسرا اس اعلان کے بارے میں جو بہار کی حکومت نے کیا تھا جس کے تحت بہار کے دو صوبوں میں کورٹ کی کارروائی میں اردو اور ہندی دونوں کی لکھائی کی اجازت منظور ہو گئی تھی۔ گاندھی جی ذاکر صاحب کی رائے حال ہی میں شروع کی گئی کانگریس کی "مسلمانوں کا عوام ملن" تحریک کے بارے میں بھی جاننا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں بمبئی میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو جانے پر گاندھی جی کی پریشانی اور تشویش خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

" یہ فساد مجھے بہت پریشان کر رہے ہیں۔ جہاں تک میری سمجھ میں آتا ہے۔ اس بمبئی کے فساد کی بظاہر کوئی وجہ نہیں دکھتی ہے۔ اب کیا کیا جائے! یہ معاملہ سیاسی معاہدوں کی حد سے بہت باہر نکل چکا ہے . . ."

ذاکر صاحب کے جواب میں کافی تاخیر ہوئی۔ کیونکہ جب گاندھی جی کا خط آیا تو جامعہ میں گرمی کی چھٹیاں تھیں اور وہ دہلی سے باہر تھے۔ اس لیے جواب وہ صرف جولائی کے آخر میں ہی دے پائے۔ جناح کے کاغذات میں جو ان کے جواب کی کاپی ہے اس پر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ لیکن اندازے کے قیاس گاندھی جی کو ذاکر صاحب کا جواب ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء سے پہلے ہی ملا تھا، کیونکہ اسی تاریخ کا لکھا ہوا ایک گاندھی جی کا خط جواہر لال نہرو کے نام کا ہے جس میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ وہ نہرو کو ذاکر حسین کے "ایک سمجھ بوجھ کر لکھے ہوئے خط" کی کاپی بھیج رہے ہیں۔ جس میں ان کے (ذاکر صاحب کی) بمبئی کے فساد، اور "افسوس ناک اردو ہندی بحث" کے بارے میں خیالات کا اظہار ہے (مجموعۂ کاغذات Vol ۶۵، صفحہ ۴۴۵)۔ جناح کے کاغذات میں بھی گاندھی جی کا ذاکر حسین کے نام ایک خط شامل ہے جہاں اس بات کا تذکرہ ہے۔ حالانکہ گاندھی جی نہرو سے اس کا ذکر کرنا شاید بھول گئے لیکن ذاکر صاحب کے اس خط کی اہمیت ان کی "مسلمانوں کا عوام ملن" (Muslim mass contact) تحریک کے بارے میں ان کی رائے اور اس پر تبصرہ کرنے کی وجہ سے بھی ہے

چونکہ ہمارے پاس ذاکر صاحب کے اپنے زمانے کے اہم ہم عصروں کے بہت کم خط موجود ہیں۔ اور اس خط میں خاص طور پر اس عہد کے کئی اہم مسئلوں پر ان کی رائے کا اظہار ہے اس لیے یہ پورا خط (سوائے تھوڑے سے جملوں کے جو پڑھے نہیں جاتے) ضمیمہ ۱ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اور ساتھ میں گاندھی جی کو لکھا ہوا ذاکر صاحب کا ۲۷ جون ۱۹۳۸ء کا لکھا ہوا خط بھی پیش کیا جا رہا ہے جس کی کاپی فی الحال صرف جناح کے کاغذات میں ہے۔ اس میں ذاکر صاحب

نے اپنے رائے لکھی ہے نہرو اور جناح کی بات چیت کے بارے میں، اور ان شرائط کے بارے میں جو جناح نے کانگریس اور مسلم لیگ سے بات چیت کی ابتدا کرنے کے لیے رکھی تھیں یہ پورا خط ضمیمہ II میں دیا گیا ہے۔ تذکرۃً یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اس خط کے جواب میں ۱۱ر جولائی ۱۹۳۸ء کو گاندھی جی لکھتے ہیں :

"آپ کے خط پر پوری توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ مسئلہ بہت مشکل ہے خلیق (الزماں) سے خط و کتابت جاری ہے۔ اگر صرف رنبیہ کی وضاحت ہی پر بات چیت لوٹ گئی تو یہ سب افسوس ناک حادثہ ہوگا۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں حتی الامکان یہ کوشش کروں گا کہ کوئی بھی بات عجلت یا غصے میں نہ کی جائے۔"

جیسا سب کو معلوم ہے یہ سب احتیاط دھری رہ گئی اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسی سوال پر یہ بات چیت ختم ہوگی۔ بلکہ زیادہ مناسب ہوگا اگر کہا جائے کہ یہ گفت و شنید کبھی شروع ہی نہیں ہوئی۔ اور دونوں پارٹیاں ایک دوسرے سے دور سے دور تر ہوتی گئیں۔

ضمیمہ I

۳۰ر جولائی ۱۹۳۷ء سے پہلے کی کوئی تاریخ۔

ذاکر حسین کا مہاتما گاندھی کے نام

آج کل ہمارے ہاں گرمی کی چھٹیاں ہیں۔ اس لیے میں زیادہ تر دہلی سے باہر رہا اور واپسی پر آپ کا خط ملا۔ جب آپ مجھے ڈاکٹر انصاری کا "روحانی وارث" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ یہ گھبراہٹ اس ذمہ داری کی وجہ سے ہے (تین لفظ پڑھے نہیں جاتے) اس قدر شدید ہے۔ اور ساتھ ساتھ اس ندامت اور افسوس کے بوجھ سے کہ ڈاکٹر انصاری کے مجھ سے زیادہ قابل اور موزوں وارث کیوں نہیں ہیں۔

آپ نے مجھ سے ہندو مسلمان فسادات کے بارے میں پوچھا ہے۔ میری ان فسادات کے بارے میں ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ ان کی بنیاد مذہبی کم ہی ہوتی ہے، چاہے مذہب کے بدترین مطلب لیے جائیں۔ یہ فساد تو ان لوگوں کی ایجاد ہیں جن کا کوئی چھپا ہوا مقصد ہوتا ہے اور وہ ہی شروع کرواتے ہیں۔ اور اس کے لیے وہ ان عوام کے مذہبی تعصب کو کام میں لاتے ہیں جو ان کے اس پوشیدہ مقصدوں سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں اور بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ ان کا قیاس غلط نہیں ہوتا اور اپنے مقصد میں یہ لوگ زیادہ تر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عام طور پر لوگوں میں سطح کے نیچے ایک قسم کا شک یا بدگمانی چھپی ہوتی ہے جس کا غلط استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان فسادات کو شروع کروانے

والوں کا مقصد عموماً معاشی یا سیاسی ہوتا ہے، لیکن جس شک و شبہ کے جذبات کو وہ اس کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ نفسیاتی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے پلان کو رد کرنے کے لیے یہ سب ضروری ہے کہ اقتدار کو غیر جانبدارانہ اور موثر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ لیکن یہ استعمال واقعی پوری دیانت داری سے غیر جانب دارانہ ہونا ضروری ہے ورنہ نفسیاتی بدگمانی اور بھی بڑھ جائے گی۔ یہ میں خاص طور پر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے آپ اس وقت بھی ایسا فیصلہ کر رہے ہوں جس کی وجہ سے حکومت کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھ میں آسکتی ہے۔ اور دوسرے مرحلہ کو حل کرنے کے لیے صرف دونوں طرف کے لیڈروں کی مستقل کوشش ہی کامیاب ہو سکتی ہے، اگر وہ خاص طور پر آگے بڑھ کر ایسا عمل کر دکھائیں جس سے لوگوں کا شک اور بدگمانی دور ہو سکے۔ اور ان میں یقین اور بھروسہ پیدا ہو جائے۔ میں "آگے بڑھ کر" جان بوجھ کر کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ صرف یہ ہی کافی نہیں ہے کہ آپ صحیح کام کر رہے ہیں۔ کیونکہ صرف صحیح ہونا نہ نفسیاتی الجھنوں کو سلجھاتا ہے اور نہ ہی سلجھا سکتا ہے۔ لیکن ہے کون جو آگے بڑھ کر ایسا کرے گا؟ ہر انسان اپنی جگہ پر، اپنے چھوٹے سے حلقے میں ایسا کر سکتا ہے، مگر میرے ذہن میں ایسے بہت لوگ ہیں جو مل کر ایک بڑے پیمانے پر ایسا کر سکیں۔ مسلمانوں میں سوائے خان عبدالغفار خاں صاحب کے، اور ہاں مولانا ابوالکلام آزاد کے جن کا اثر باوجود ان کے ریٹائرمنٹ کے کافی ہے، اور کون ایسا ہے۔ لیکن عملی طور پر یہ کام وہ صرف اس وقت کر سکتے ہیں جب وہ مسلمانوں کی موجودہ ضروریات اور جائز حق کے مطالبہ کو پوری طرح سمجھ سکیں اور اپنا سکیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے نیشنلسٹ مسلمانوں میں سے زیادہ تر نے اپنے آپ کو اپنی قوم کے مرحلوں سے الگ تھلگ رکھ کر اپنے آپ کو مسلمانوں کی گہری نفسیاتی الجھنوں کو حل کرنے سے بے اثر کر لیا ہے۔ حالانکہ ان کی قوم پرستی پر کوئی شک نہیں کر سکتا لیکن ان کی عقل مندی پر ضرور شبہ ہوتا ہے کیونکہ صرف مسلمانوں کی سچی خدمت کر کے ہی وہ ملک اور قوم کی بہترین خدمت کر سکتے ہیں۔

میں اس دو طرفہ وفاداری کی مشکلات سمجھتا ہوں۔ اور مجھے ان لوگوں کی افسوسناک حالت سے دلی ہمدردی ہے جو اس مسئلہ کو آسان سمجھ کر اس سے فرار پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تو انسان کی، جو اخلاقی بندہ ہے، قسمت ہے کہ اسے ان الجھنوں سے کوئی مفر نہیں۔ اس کی سرشت ہی ایسی ہے کہ وہ پہلے کھوتا ہے اور پھر اپنا توازن پاتا ہے کیونکہ یہ توازن بظاہر مختلف اور متضاد کشمکشوں سے گزرنے کے بعد ہی قائم ہو سکتا ہے جو ایک نئی زندگی کی علامت ہے۔ الگ تھلگ رہنا آسان طریقہ ضرور ہو سکتا ہے مگر آسان طریقہ ہمیشہ بہتر طریقہ نہیں ہوتا۔

یہ میں تفصیل سے اس لیے لکھ رہا ہوں ہوں کہ شاید مسلمانوں کی عوامی میل جول کی تحریک اس نقطہ کو نظرانداز نہ کردے۔ کانگریس کے مسلمان کارکنوں کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ صرف نام کے مسلمان ہوں اور جان بوجھ کر ایمانداری سے ہر وہ علامت، عقیدہ اور رسم ورواج کو ختم کرنا چاہتے ہوں جن کی وجہ سے ان کو مسلمان کہا جاتا ہے . . . . (آگے کے دو جملے پڑھے نہیں جاتے . .) اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ کانگریس بلا وجہ ان لوگوں کو نہ چھیڑے جو بظاہر مسلمانوں کے رہنما ہیں۔ یہ پالیسی بری ہے۔ چاہے ان لیڈروں کی کوئی خاص اہمیت ہو یا نہ ہو اور وہ کوئی خاص کام انجام نہ دے پائیں مجھے یہ خوش فہمی بالکل نہیں ہے کہ ان میں اچھا کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن ان کی نقصان پہنچا سکنے کی صلاحیت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ نیکی آہستہ آہستہ اثرانگیز ہوتی ہے اور برائی آگ کی طرح بھڑکتی ہے جو خدا مدتوں میں بنا پاتا ہے وہ شیطان منٹ بھر میں تباہ کر سکتا ہے مجھے ڈر یہ ہے کہ ان رہنماؤں کو جو آج خاص مرتبہ رکھتے ہیں، اگر بے وجہ چھیڑا جائے گا تو ہم ان کو اس شک اور بدگمانی کو استعمال میں لانے میں مدد دیں گے جو لوگوں میں ایک بڑی حد تک پل رہی ہے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ جب اگلا چناؤ ہوگا اور اگر اس میں کانگریس مسلمانوں کی کچھ سیٹیں پانے کی امیدوار ہوئی تو چناؤ کے جوش وخروش کے ساتھ ساتھ فسادات بھی شروع ہو سکتے ہیں۔ اقتدار کوئی اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا، خاص طور پر شر پسند لوگ۔ لیکن اگر کانگریس نے بلاوجہ ان لیڈروں کو پریشان نہ کیا تو لوگ سمجھ جائیں گے یہ ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے ہیں اور پھر وہ خود ہی ہتھیار ڈال دیں گے۔ اس وقفہ کو کم کرنے کا پورا انحصار کانگریس کے رہنماؤں کی سیاسی سوجھ بوجھ اور عقل مندی پر ہے۔

لہٰذا رہنماؤں کا یہ فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس شک اور شبہ کو ہر قیمت میں دور کرے۔ یہ میں ایک مسلمان ہوے کے ناطے سے نہیں بلکہ ایک مخلص قومی کی حیثیت سے کہتا ہوں۔ ہم ایک متحدہ قومیت کی امید کس طرح کر سکتے ہیں اگر ہمارے مسلمان بھائی شک اور غیر یقینی کا شکار ہوں۔ غیر مسلم لوگوں میں کس کے پاس یہ جادو ہے جو اس شک اور شبہ کو بھروسے میں بدل سکتا ہے۔ آپ اور پنڈت جواہر لال جی۔ (کچھ الفاظ پڑھے نہیں جاتے) جواہر لال جی کا سوچنے کا طریقہ ہی کچھ اور ہے۔ وہاں لوگوں کے نظریہ کو خاطر میں نہیں لاتے جو دوسروں کے طریقۂ عمل اعتقاد، پسند وناپسند، رسم ورواج اور وحدت کو تسلیم کرنے کے ان مخصوص طریقوں کو اہمیت دیتے ہیں جن کو مذہب کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کا نظریہ سہل پسندی کا ہے اور

اس سے فوری طور پر اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کسی بڑے پیمانے پر اس اندازِ فکر سے مشکلوں کا حل نکلنا مشکل ہے۔ لیکن آپ جو خود مذہبی آدمی ہیں۔ آپ یہ کرشمہ کر سکتے ہیں بلکہ آپ نے کر دکھایا ہی تھا۔ پچھلے چند سالوں میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ لگتا ہے اس کا وقت ابھی نہیں آیا۔ لیکن میرے دل میں یہ امید چھپی ہے کہ آپ ضرور یہ کرشمہ کر دکھائیں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے۔ لیکن یہ تو اپنے یقین کا معاملہ ہے۔ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ کو یہ حالات دیکھ کر کس قدر تکلیف پہنچتی ہے۔ مگر احساس اور دکھ اٹھانا اس کا مقدر ہوتا ہے جو انسان کی روح کے بہترین عناصر کا مجسمہ ہے۔ اور چونکہ آپ خود ایسے ہیں اسی لیے مجھے امید ہے کہ آپ اس روح کے مختلف تصادم کو ہم آہنگ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔ اس کا نتیجہ اتنا بلند ہے کہ اس کے لیے کوئی بھی قیمت ادا کی جا سکتی ہے۔

آپ نے مجھ سے بہار اور مدراس میں اردو اور ہندی کے بارے میں کیے ہوئے اعلانوں کے بارے میں بھی پوچھا ہے۔ مدراس کے بارے میں تو مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں، اور پچھلے دو دنوں میں، جب سے آپ کا خط ملا ہے کچھ خاص معلوم کر بھی نہیں پایا۔ بہار کے بارے میں جو اخباروں میں نکلا ہے وہ میں نے پڑھا ہے۔ اگر بہار کے منسٹر نے چند صوبوں میں جہاں اب تک عدالت میں صرف ہندی استعمال ہو رہی تھی، اردو کے استعمال کی بھی اجازت دے دی ہے۔ میں چاہوں گا کہ ہر کانگریس منسٹری، ہر صوبے میں حکومت کے سب دفتروں میں اردو اور ہندوی دونوں کی لکھائی کی سرکاری طور پر اجازت دے دے تاکہ دونوں استعمال کی جا سکیں۔ یا تو ان صوبوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اردو کی لکھائی پڑھ سکے گا تو اس صورت میں یہ اجازت بے کار ہو جائے گی اور کسی کا اس سے کوئی حرج نہ ہوگا۔ یا ہو سکتا ہے کہ چند شہری، یا ایک بھی شہری اردو پڑھنا اور لکھنا چاہے تو ہماری متحدہ ہندوستانی قوم کی نشو و نما اور ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی فروغ کے لیے یہ بہت نقصان دہ بات ہوگی کہ اس کو یہ موقع نہ مل سکے اب یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کرنے سے خرچہ زیادہ ہوگا یا دقت ہوگی لیکن جہاں ملک کی دو اتنی اہم قوموں کا سوال ہے وہاں کسی خرچ یا دقت کے بارے میں سوچنے کا سوال اٹھنا ہی نہیں چاہیے: اردو کے استعمال کی ممانعت کو زیادہ تر مسلمان دشمنی کا دخل مانیں گے اور بہت سے غیر مسلم بھی اس کو بالکل پسند نہیں کریں گے۔ نہیں باپوجی۔ زبان اور تحریر کے اس مسئلے پر ہم کو ایمانداری سے وہ رویہ قائم کرنا پڑے گا جو ایک دفعہ کانگریس نے اختیار کیا تھا۔ ہندوستانی سب کی زبان اور دیوناگری اور اردو دونوں سرکاری منظور شدہ رسم الخط۔ یہ تجویز پوری طرح لاگو ہونا چاہیے چاہے مضحکہ خیز ہی کیوں نہ لگے۔ کیونکہ یہ اس سے بہتر ہے کہ بھائی بھائی ایک دوسرے پر شک کریں۔

میں اتنا ہی لکھ پایا تھا کہ مجھے ایک دم علی گڑھ جانا پڑا۔ اس لیے یہ خط نہیں بھیج سکا۔

اور مجھے یہ بھی خیال ہوا کہ آپ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں بہت مصروف ہوں گے۔ اسی لیے یہ خط اتنے دن یہاں پڑا رہا۔

اس خط کی درازی کی معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میں اتنے کم خط لکھتا ہوں کہ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کریں گے کہ میں نے آپ کا اتنا قیمتی وقت لیا۔ اب ختم کرتا ہوں۔

ادب کے ساتھ۔ آپ کا

مخلص۔

ضمیمہ II

شملہ۔ ۳۰ر جون ۱۹۳۸ء

مہاتما جی

پچھلی دفعہ جب میں آپ سے ہندوستانی تعلیمی سنگھ کی پہلی میٹنگ کے موقع پر ملا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہندو مسلم سوال پر آپ کو بہت ذہنی اذیت ہو رہی ہے۔ اور آپ اپنے مخصوص انداز میں دعاؤں کے ساتھ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں جس کی تلاش کسی بھی ہندوستانی سیاست داں کا سب سے پہلا مسئلہ ہے۔ اسی دن میں نے وہ بیان بھی پڑھا جو آپ نے مسٹر جناح سے ملاقات کے دن دیا تھا وہ بالکل آپ کی سوچ کی طرح تھا۔ میں آپ کی اور مسٹر جناح کی آپس کی گفتگو کی سب رپورٹ بھی پڑھتا رہا جو ضرورتاً مختصر اور غیر واضح تھیں اور پھر تقریباً سانس روک کر بوس اور جناح کی بات چیت بھی پڑھی اور خدا سے دعا کی کہ وہ ان سب گفت وشنید کو کامیاب کرے جو ہمارے ملک کے مستقبل کے لیے اتنے بھرپور امکانات رکھتی ہیں۔ اب سے پہلے میں نے آپ کو خط نہیں لکھا کیونکہ مجھے ایسا لگا کہ میں بے کار آپ کا قیمتی وقت ضائع کروں گا۔ لیکن اب اس لیے لکھ رہا ہوں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب لکھنا ہی چاہیے۔

نہرو اور جناح کی خط وکتابت کی اشاعت بالکل بے موقع تھی۔ اس وقت تو ایسا لگا گویا بات چیت بالکل ختم ہی ہوگئی ہے۔ مگر بعد میں جو کچھ ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی کچھ امید باقی ہے۔ اس بارے میں میری اپنے کچھ دوستوں سے بات ہوئی اور ان سے پتہ چلا کہ یہ بات چیت تمہید کے مسئلے پر ٹوٹ سکتی ہے۔ حالانکہ سب کا خیال یہ ہے کہ معاہدے کی اصلی شرائط پر اس کے ٹوٹنے کا امکان نہیں ہے۔ تو یہ تو بہت افسوس کی بات ہوگی کہ جب سمجھوتہ اتنا نزدیک ہے تو کانگریس اور لیگ میں اس بات پر علیحدگی ہو جائے اور پھر نہ جانے کب ملیں۔

اگر میری اطلاع صحیح ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جناح صاحب تمہید میں ہی یہ واضح کر دینا

چاہتے ہیں کہ کانگریس اور لیگ ہی کیا۔ وہ کانگریس کو ہندوؤں کا نمایندہ جماعت اور لیگ کو مسلمانوں کی معتبر اور نمایندہ پارٹی مانتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ کانگریس کے لوگ اس بیان کو تسلیم نہیں کریں گے کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے کیونکہ اس کا مطلب تو ہوگا ایک بنیادی نظریہ کو چھوڑنا۔ اگر جناح صاحب کانگریس کی یہ وضاحت نہ کریں تو میرا خیال ہے کہ وہ جس طرح لیگ کا ذکر کرنا چاہیں، اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ کانگریس جو لیگ سے بات چیت کرنا چاہتی ہے اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ لیگ کے اس رویہ کو تسلیم کرتی ہے، اور کوئی اور اسلامی جماعت اس کام کو انجام نہیں دے سکتی ہے کانگریس کے مسلمان اپنی برادری کو اپنے ساتھ نہیں ملا سکتے۔ اگر وہ ایسا کر سکتے تو کانگریس کو اپنے علاوہ کسی اور اسلامی جماعت سے گفتگو کرنے کی کیا ضرورت پڑتی۔

میں ان مشکلات سے واقف ہوں جو آپ کو پیش آرہی ہیں۔ اگر لیگ کو مسلمانوں کی واحد جماعت مان لیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا ان مسلمان لوگوں اور پارٹیوں کو نظر انداز کرنا جنھوں نے کانگریس کے ساتھ کام کیا ہے۔ میں اخباروں میں ایسی مسلمان جماعتوں کے بیان پڑھتا رہا ہوں جنھوں نے کانگریس سے درخواست کی ہے کہ وہ لیگ کی اس پوزیشن کو تسلیم نہ کریں جو اس نے خود کو دے رکھی ہے۔ (یعنی مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت) لیکن حالات کی سچائی کیا ہے کیا یہ جماعتیں اس کی امید کر سکتی ہیں کہ وہ ایک مناسب وقفہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو ملک کی آزادی اور ہندوستان کے مستقبل کی نشو و نما کے لیے استعمال کر سکتی ہیں؟ ان جماعتوں کو بالکل نظر انداز کرنا بھی مناسب نہیں ہوگا۔ لیکن ہندو مسلمان مسئلے پر اس پیمانے پر پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کی کوشش میں ہم یہ نہیں سوچ سکتے کہ کیا مناسب ہے اور کیا نامناسب ہے۔ صرف ایک نڈر اور بے باک عمل یا اشارہ ہی اس مرحلے کو سلجھا سکتا ہے۔ یہ اشارہ کہاں سے آسکتا ہے اگر آپ کی طرف سے نہ آیا اور آپ کی صلاح پر کانگریس کی طرف سے؟ مناسب اور صحیح کام تو ہر ایک کر سکتا ہے لیکن اب ضرورت ہے ایسے عمل اور برتاؤ کی جس سے مدتوں کا منجمد شک اور شبہ دور ہو سکے اگر بلا وجہ لیگ اس پر اصرار کرتی ہے کہ صرف وہ مسلمانوں کی نمایندہ جماعت ہے تو کانگریس کا کیا بگڑے گا کہ وہ اس کو مان لے اور اس کا اعلان کردے۔ بلکہ اس سے تو کانگریس نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو اس کا قومی کردار کمزور پڑ جائے گا اور مسلمان بھی اس سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں کہ اگر موجودہ بات چیت

اس مسئلے پر ٹوٹ گئی کہ کانگریس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمایندہ جماعت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تو کیا نتیجہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے لیگ اور بھی زیادہ مسلمانوں کی نمایندہ بن جائے گی۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ لیگ کی موجودہ طاقت براہ راست پنڈت جی کے اس بے سوچے بیان سے تعلق رکھتی ہے جو انھوں نے جناح سے لفظی جنگ کے دوران دیا تھا اور کہا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو ہی پارٹیاں ہیں۔ کانگریس اور انگریز۔ مجھے بعد میں خود ان سے پتہ چلا کہ اس سے ان کا مطلب مسلمانوں کی ذات سے انکار کرنا نہیں تھا۔ لیکن کسی بھی طرح کی وضاحت بھی مسلمانوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب نہ ہوئی کہ ایسا نہ تھا۔ اور وہ سب تقریباً ایک ایک آدمی جناح کے ساتھ ہو گئے۔ تاکہ ان کو یہ یقین ہو سکے کہ وہ بھی ایک قابل تسلیم جماعت ہیں اور دوسروں کو بھی یہ علم ہو جائے کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، چاہے اشارتاً ہی کیوں نہ ہو۔

اگر اب بھی کانگریس لیگ کے نمایندہ کردار کو ماننے سے انکار کرے گی تو اس پر پھر الزام لگے گا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور مسلمانوں میں پھوٹ پیدا کر رہی ہے اور کسی طرح کی مصالحت کی گفتگو کرنے کے سلسلے میں مخلص نہیں ہے۔ مجھے یہاں ان الزامات کے صحیح یا غلط ہونے سے غرض نہیں ہے، مگر یہ الزام لگائے جائیں گے اور خلوص سے لگائے جائیں گے۔ فرقہ وارانہ جذبات ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو ان الزاموں سے اور بھڑکے گی اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا یہ سوچنے کے قابل بھی نہیں ہے۔

یہ اصرار کیا جا سکتا ہے جیسا میں سمجھتا ہوں کہ کیا گیا ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی کانگریس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمایندہ جماعت تسلیم کر لے تو پھر وہ لیگ کی کسی مطالبے یا بات کو بھی آسانی سے رد نہیں کر پائے گی۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے مطالبوں کو آسانی سے نامنظور نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ قومی مفاد کے خلاف ہوں تو ان کو رد کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے۔ اور دیکھا جائے تو جب کانگریس ورکنگ کمیٹی آپ کے مشورہ پر لیگ کے ساتھ بات چیت کر رہی تھی تو کیا اس وقت اس کو یہ یقین نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کے ساتھ گفتگو کر رہی ہے؟ کیا اس وقت وہ اس پر تیار نہیں تھی کہ اس جماعت کی معقول تجاویز منظور کر لیں۔ اور ان تجاویز کو رد کر دیں جو قومی مفاد کے خلاف ہوں۔ اور اب بھی کانگریس ایسا ہی کر سکتی ہے۔

میں اور آپ کا وقت نہیں لوں گا۔ مہربانی سے میری دخل اندازی کو معاف کیجیے گا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ میری تشویش سمجھ پائیں گے۔

یہاں سنٹرل ایڈوائزری کاؤنسل کی میٹنگ بخیر و خوبی ختم ہوگئی۔ مجھے امید ہے کہ کمیٹی کی رپورٹ واردھا اسکیم کے حمایتیوں کی پوزیشن اور مضبوط کرے گی۔ غیر کانگریسی صوبوں میں بھی۔۔۔

ادب کے ساتھ

سلامت اللہ

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ یادوں کے کوچے میں

ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام سے پہلی بار میں ۱۹۲۴ء میں آشنا ہوا۔ ہائی اسکول امتحان پاس کرنے کے بعد میں گورنمنٹ کالج اٹاوہ میں داخل ہوا تھا۔ اس زمانے میں اٹاوہ کا اسلامیہ ہائی اسکول کئی لحاظ سے شمالی ہندوستان میں بہت مشہور تھا۔ یہ اسکول علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرح ہمہ جہتی تعلیم و تربیت کا ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی اسکول میں ذاکر صاحب نے تعلیم پائی تھی۔ اس کے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین صاحب نہ صرف ایک نامور استاد اور اچھے منتظم تھے بلکہ ایک نیک دل اور خدا ترس انسان کی حیثیت سے مقبول تھے۔ یہی وہ برگزیدہ شخص تھے جن کا ذکر راشٹرپتی کا عہدہ سنبھالنے کے بعد پہلے ہی جلسے میں ذاکر صاحب نے نہایت احترام کے ساتھ کیا تھا کہ میری سیرت کی تعمیر میں میری ماں کی مانند اُن کا بڑا ہاتھ ہے۔ اُن ہی کی طرح اسکول کے منیجر مولوی بشیرالدین صاحب بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی شخصیت میں کچھ ایسی کشش تھی کہ نہ صرف دور دراز کے علاقوں سے اسلامیہ ہائی اسکول میں طالب علم ہی آئے تھے بلکہ شہر اور بیرون شہر سے اہل علم و دانش مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کے لیے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کے سرپرستوں نے اتنی شہرت کی وجہ سے انھیں اس اسکول میں داخل کرایا تھا۔ اگرچہ مجھے یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم انٹرمیڈیٹ تعلیم کے دوران مجھے ان بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ ان کے اخلاق اور مشفقانہ رویے نے ایسی خود اعتمادی پیدا کر دی تھی کہ اپنے ذاتی مسائل بھی اُن کے سامنے پیش کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کر لیا تو آگے کی تعلیم کے معاملہ میں ہدایت حاصل کرنے کی غرض سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس موقع پر مولوی بشیرالدین صاحب نے ذاکر صاحب کا ذکر کیا۔ فرمایا کہ تمہاری طرح ایک ہونہار طالب علم ہمارے اسکول میں بیس پچیس سال ہوئے پڑھتا تھا۔ قائم گنج سے آیا تھا۔ ذاکر حسین خاں۔ جب اس نے ہمارے اسکول کی تعلیم مکمل کر لی تو میں نے اسے اپنے یہاں کھانے پر بلایا اور یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ اس نوجوان میں کتنی قوت برداشت ہے اس کی پلیٹ کے

سالن میں کچا پانی ملوا دیا۔ میں غور سے دیکھتا رہا کہ بدمزہ کھانا کھاتے ہوئے اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوتے ہیں یا نہیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ حسب معمول کھانا کھاتے رہے۔ اس طرح ذاکر خاں صبر و تحمل کے امتحان میں پورا اترا۔ اس پر میں نے اُسے شاباشی دی اور کہا کہ بیٹا تو ایک دن بڑا آدمی ہوگا۔ میری یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ آج وہی لڑکا ایک نامور معلم اور ایک بے مثل قومی تعلیمی ادارے کا سربراہ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مجھے ایسا لگا کہ اس قصے کے ذریعے مولوی صاحب مجھے صبر و تحمل کی تلقین کرنا چاہتے تھے۔

ذاکر صاحب کی ابتدائی زندگی کے اس واقعہ کا مجھ پر بہت اچھا اثر پڑا۔ اور ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے اور ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ مسلم یونیورسٹی میں داخلے کے بعد ایک دن شعبہ ہمدردانِ جامعہ کے ایک کارکن سے ملاقات ہوئی جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے مالی امداد حاصل کرنے اور جامعہ کے مشن سے لوگوں کو واقف کرانے کی غرض سے ہر مہینے ایک بار علی گڑھ کا دورہ کرتے تھے۔ میں نے اُن سے جامعہ سے متعلق لٹریچر حاصل کیا اور ہمدردانِ جامعہ کا باضابطہ رکن بن گیا۔ اس لٹریچر سے جو معلومات حاصل ہوئی، اس نے ذاکر صاحب سے ملاقات کے شوق کو دوبالا کر دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ وقتاً فوقتاً علی گڑھ کسی نہ کسی کام سے آتے رہتے ہیں اور اپنے ایک قدیم دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی کے یہاں قیام کرتے ہیں۔ سوچا کہ جب کبھی ممکن ہوگا ذاکر صاحب سے رشید صاحب کے گھر جا کر ملوں گا مگر اس کی نوبت بہت دیر میں آئی۔

۱۹۳۹ء میں جب میں نے بی۔ ٹی کا امتحان دے دیا، تو رشید صاحب نے ذاکر صاحب سے ملنے کا مجھے پہلی بار موقع فراہم کیا۔ اُن سے جو گفتگو ہوئی تو ایسا لگا کہ وہ پہلے ہی میرے تعلیمی امتیازات اور عزائم سے واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ میں نے اپنا مقصد بیان کیا کہ اب میں کوئی قومی خدمت کا کام کرنا چاہتا ہوں اور اس میں آپ کی رہنمائی درکار ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں کہا کہ ہر کام قومی خدمت ہے، بشرطیکہ لگن، دیانت داری اور اس شعور کے ساتھ کیا جائے کہ اس کا نتیجہ متعلقہ لوگوں کے لیے اچھا ہوگا۔ اس طرح ادنی سے ادنی کام مثلاً سڑکوں کی صفائی قومی خدمت کا کام ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کس کام کے اہل ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کام کی تخصیص کی ذمہ داری خود پر عائد ہوتی ہے۔ کوئی دوسرا اُسے طے نہیں کر سکتا۔ یہ پہلا سبق تھا جو ذاکر صاحب سے میں نے سیکھا۔ ان کے مشفقانہ انداز لیکن بے لاگ مشورہ کا مجھ پر مثبت اثر پڑا۔ اور میں نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ اس مشورہ کی روشنی میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔

قومی آزادی کی تحریک سے دلچسپی ہونے کی وجہ سے جی چاہتا تھا کہ اپنے علاقے کے ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی کوئی تدبیر نکالوں جنھیں مادی وسائل کی نایابی نے اس برکت سے

محروم رکھا ہے۔ ٹریننگ کالج میں تعلیم کے دوران اس قسم کے تجربوں کا مطالعہ کیا تھا۔ بالخصوص پستا لوزی کا تجربہ پُرکشش اور ولولہ انگیز تھا، جس نے یتیم اور بے سہارا بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، اور اس کی خاطر فقر و فاقہ کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا تھا اس کے اس قول نے کہ "میں نے اس لیے فقیرانہ روش اختیار کر لی ہے تاکہ گداگر انسان کی طرح زندگی بسر کر سکیں" میرے دل و دماغ پر گہرا نقش ڈالا تھا پھر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی قربانیوں نے، جو وہ قومی تعلیم کے میدان میں کر رہے تھے، میری اس آرزو کو اور اکسایا کہ مجھے بھی کچھ ایسا ہی کام کرنا چاہیے۔ لیکن بظاہر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ایک مبہم سی بات دل میں آ رہی تھی۔ کاش جامعہ ملیہ کے کام میں شرکت کر کے براہِ راست تجربہ حاصل کر سکتا تو پھر شاید میں خود اپنے خواب کو حقیقت بنا سکوں۔

اسی ادھیڑبن میں تھا کہ ایک دن جامعہ کے دفتر سے خط موصول ہوا کہ ذاکر صاحب کی خواہش ہے کہ میں جامعہ کے کام میں شریک ہو جاؤں اور کام یہ ہے کہ جامعہ نے ابھی حال ہی میں بنیادی قومی تعلیم کو فروغ دینے کی خاطر استادوں کی ٹریننگ کا جو کام شروع کیا ہے اور اس کے لیے جو ایک نیا ادارہ استادوں کا مدرسہ قائم کیا ہے، اس میں معلمی کے فرائض انجام دوں۔ اس خط سے مجھے خوشی تو بہت ہوئی۔ لیکن اپنی نا اہلی کا احساس بھی ہوا کہ یہ کام میری صلاحیتوں سے بالاتر ہے۔ اس خط میں ذاکر صاحب نے جامعہ میں ملنے کے لیے ایک تاریخ بھی مقرر کی تھی۔ خود اعتمادی کی کمی کے باوجود میں نے مقررہ تاریخ پر ذاکر صاحب سے ملاقات کی۔ غالباً یہ جولائی ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔ ذاکر صاحب کی ایک آنکھ میں بہت تکلیف تھی اور اس کے علاج کے لیے ان ہی دنوں وہ جرمنی جانے والے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ جو کام آپ نے تجویز کیا ہے، اس قسم کا مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔ مجھے تو بنیادی تعلیم کے بارے میں بھی بہت سرسری معلومات ہے۔ میں مجوزہ فرائض کیوں کر انجام دے سکوں گا۔ ذاکر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا بھئی ہر کام شروع میں سب کے لیے نیا ہوتا ہے۔ اس کام سے آپ کو جو جھجک ہے وہ مجھے بھی ہے۔ پتھر توڑ کر پہاڑی راستہ بنانا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن ہم سب مل کر اپنی اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائیں گے، تو راستہ تیار ہو جائے گا۔ بنیادی قومی تعلیم کے فقط چند اصول ہی ہمارے سامنے ہیں، انھیں عملاً کسی طرح برتا جائے گا، اس کی تکنیک اور طریقۂ کار ہمیں خود وضع کرنا ہے، اس کی وسعت اور حدود کا تعین کرنا ہے۔ اور یہ ہم سب کچھ کر سکیں گے۔ اگر بلند حوصلگی وسیع الخیالی اور اشتراکِ عمل سے کام لیں گے۔ ذاکر صاحب کے ان کلمات سے کچھ ہمت بندھی اور میں نے ذاکر صاحب کی پیش کش کو قبول کر لیا۔

جامعہ کے بیشتر کارکنوں کے نزدیک ذاکر صاحب کی حیثیت بیک وقت ایک دوست فلسفی اور رہنما کی تھی۔ خود ذاکر صاحب کے الفاظ میں جماعت کا سربراہ برابروں میں اگوا کا

درجہ رکھتا ہے۔ جامعہ میں ہم لوگوں کے تعلقات کی بنیاد اعتماد باہمی پر قائم تھی۔ ذاکر صاحب اور ہمارے درمیان تعلقات کی دیوار حائل نہیں تھی۔ اس لیے ہم اپنے ذاتی معاملات میں بھی اُن سے مشورہ اور مدد طلب کرنے میں کوئی جھجک یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار میرے گھر والوں کو ناگہانی ایک مالی ضرورت پیش آگئی، جسے میں خود پورا نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ذاکر صاحب سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا کہ اگر مطلوبہ رقم کا فوری انتظام نہ ہو سکا تو میرے گھر والوں کو بڑی شرمندگی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بات سن کر ذاکر صاحب متفکر ہوگئے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے مجھے لکھنے کا کچھ کام دیا تھا، وہ میں کر رہا ہوں۔ اس کے معاوضے میں سے یہ رقم محسوب کی جا سکتی ہے۔ اگر مطلوبہ رقم کی پیشگی ادائیگی ہو سکے تو موجودہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ذاکر صاحب نے اطمینان دلایا کہ اسی دن دوپہر تک میرے پاس رقم پہنچ جائے گی۔ چنانچہ میں کالج میں ایک بجے تک انتظار کرتا رہا۔ مایوس ہو کر ذاکر صاحب کو یاددہانی کا خط چپراسی کے ذریعے بھیجا اور اپنی قیام گاہ پر بہت افسردہ پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ رقم دو گھنٹے پہلے موصول ہو گئی تھی۔ مجھے اپنی جلد بازی اور بے صبرے پن پر بڑی شرمندگی ہوئی اور ایفائے وعدہ کی قدر کا احساس ہوا۔

یوں تو ذاکر صاحب کے سامنے جو مسئلہ آتا تھا، اس کے بارے میں اپنی رائے سوچ سمجھ کر قائم کرتے تھے، لیکن دوسروں کی مخالف رائے کو فراخ دلی اور بردباری کے ساتھ سننے کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم آزادی کے ساتھ کسی بھی مسئلہ پر اُن سے بحث کر سکتے تھے۔ اگر کوئی ان کے نقطۂ نظر کا قائل نہ ہو سکے، تو ان میں اتنی قوت تحمل تھی کہ مخالف رائے کو دبانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اور بعد ازاں ان کے سلوک سے خفگی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ یہاں مجھے چند واقعات یاد آتے ہیں، جب جذبات کے جوش میں میرا ان سے تصادم ہوا۔ لیکن اس وجہ سے بعد میں ان کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مثال کے طور پر یہاں ایسے دو واقعات کا ذکر کروں گا ایک واقعہ تو یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے دہلی کے چیف کمشنر سر جینکس کو اوکھلا گاؤں کے بنیادی مدرسے کی عمارت کا افتتاح کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ یہ مدرسہ کم و بیش ٹیچرس کالج کے عملے کی کوششوں کا رہین منت تھا۔ میں اور میرے بعض ساتھی ذاکر صاحب کے اس اقدام پر بہت خفا تھے۔ اس کی خاص وجہ اُس وقت کے سیاسی حالات تھے، جن سے ملک گزر رہا تھا۔ یہ دوسری عالم گیر جنگ کا زمانہ تھا جب کہ حکومت نے قومی تحریک کو کچلنے کے لیے بدترین مظالم توڑ رکھے تھے، یہاں تک کہ بعض صوبوں میں جہاں جنگ سے پہلے بنیادی تعلیم کا کچھ کام شروع ہو گیا تھا، اُسے بھی کسی نہ کسی بہانے سے بند کروا دیا تھا۔ میں نے ذاکر صاحب سے اس معاملے کے متعلق خاصی تلخ و تند گفتگو کی اور اس بات پر زور دیا کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ لیکن بے سود، کیونکہ

ان کا خیال تھا کہ اس اقدام سے دہلی کے علاقے میں بنیادی تعلیم کا کام پھیلانے میں مدد ملے گی۔ پروگرام کے مطابق جلسہ ہوا گو کہ میں نے اور دو ایک ساتھیوں نے اس کا بائی کاٹ کیا۔

دوسرا واقعہ جامعہ کے طلبا کے یونی فارم میں ٹوپی کے ڈیزائن کی تبدیلی سے متعلق ہے۔ اس زمانے میں خاص طور پر جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بچوں کے لباس میں وہ ٹوپی نمایاں تھی، جسے عرفِ عام میں گاندھی کیپ کہا جاتا تھا جامعہ کے استاد اور دوسرے کارکن بھی عموماً وہی ٹوپی استعمال کرتے تھے۔ اُس دور میں جب کہ مسلم لیگ کی قیادت میں پاکستان کی جادحانہ تحریک پورے شباب پر تھی، تو مسلمانوں کا ایک قابلِ ذکر طبقہ لیگ کی پیروی میں ہر اس چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، جس کا تعلق کانگریس پارٹی سے ہو۔ چنانچہ کیپ بھی ان لوگوں کے نزدیک ہدف ملامت تھی اور وہ اُس مسلمان کے ساتھ غائب درجے کا ناشائستہ سلوک کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، جو گاندھی کیپ پہنے ہوئے نظر آتا۔ آوازے لگاتے کہ کافروں کا غلام جا رہا ہے۔ ہمارے ایک کارکن کے ساتھ شہر میں یہ بے ہودگی ہو چکی تھی کہ اس کے سر سے ٹوپی ہی غائب کر دی گئی۔ ذاکر صاحب پر اس صورتِ حال کا یہ اثر ہوا کہ وہ ٹوپی کا ڈیزائن بدلنے پر آمادہ ہو گئے۔ جامعہ کے کارکنوں میں ایسے لوگوں کی خاصی تعداد تھی، جو اس قسم کی تبدیلی کے مخالف تھے۔ میں نے ذاکر صاحب سے حجت کی کہ گاندھی کیپ کو برقرار رکھنا چاہیے، اس لیے کہ یہ ٹوپی ہماری آزادی کی جدوجہد کی ایک علامت کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ یہ محض ایک سر ڈھکنے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ قربانیوں کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ بے شمار مجاہدین آزادی کی قربانیوں کی تاریخ۔ ذاکر صاحب نے اپنے موقف کا جواز یہ پیش کیا کہ ہمارے طالب علم اس ٹوپی کی وجہ سے نہایت لغو قسم کی جملہ بازی کا نشانہ بنتے ہیں۔ اُن پر بھانت بھانت کی پھبتیاں کسی جاتی ہیں جس سے انھیں لامحالہ خفت ہوتی ہے۔ پھر آخر اس ٹوپی میں ایسا کون سا تقدس ہے کہ اسے بدلا نہ جا سکے، جب کہ بعض چوٹی کے کانگریسی مسلم لیڈروں نے یہ ٹوپی کبھی نہیں پہنی۔ نہ حکیم اجمل خاں نے نہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے اور نہ ہی مولانا ابوالکلام آزاد یہ ٹوپی پہنتے ہیں۔

ذاکر صاحب کی عظمت کی یہ دلیل ہے کہ میری ان حرکات نے جو بظاہر ناروا تھیں، انھوں نے اپنے انصاف پسندانہ کردار کو متاثر نہیں ہونے دیا اور میں برابر اُن کی اعانت اور شفقت سے فیض یاب ہوتا رہا۔ ان کی ذات ضبطِ نفس کا ایک نمونہ تھی۔ بڑے سے بڑا ناروا اشتعال بھی ان کے ذہنی توازن کو بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ ایسی صورتِ حال میں اپنے اوپر کنٹرول قائم رکھتے تھے، جو دوسروں کے لیے طیش کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ میں لوگ کہا کرتے تھے کہ ذاکر صاحب میں جھیلنے کی لامحدود صلاحیت ہے۔

بحث و مباحثہ میں ذاکر صاحب اکثر جدلیاتی طریقہ اختیار کرتے تھے۔ آپ کسی معاملہ میں جو رائے

ظاہر کرنے، وہ بالقصد اس کی مخالفت میں دلائل پیش کرتے۔ اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اس طرح آپ کی فکر کی گہرائی کا اندازہ لگا سکیں۔ اور یہ کہ آپ کے موقف کی بنیاد کس قدر مضبوط ہے۔ اس بحث کے نتیجے میں آپ کو اپنی کمزوریوں کا علم ہو جائے گا، تو اپنے اندازِ فکر کی اصلاح کا موقع ملے گا۔ اگر ذاکر صاحب دیکھتے کہ آپ کی رائے ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے، تو واجب طور پر سراہتے اور ہمت افزائی کرتے۔

لازمی طور پر ذاکر صاحب آدرش وادی تھے، لیکن وہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا بھی احساس رکھتے تھے۔ اُنھیں یقین تھا کہ کسی کام کی تکمیل میں آخر کار آدمی کی حیثیت ہی فیصلہ کن ہوتی ہے۔ ہوائی قلعے بنانا کارِ عبث ہے۔ آدمی کی ذات پر ہی منحصر ہے کہ کام کتنی کوشش اور محنت کے ساتھ کیا جائے گا اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ ذاکر صاحب نے ہمیشہ یہ مشورہ دیا کہ ہم ایسے منصوبے ہاتھ میں لیں، جنھیں اُن انسانی اور مادی وسائل کی مدد سے پورا کیا جا سکتا ہو، جو ہماری پہنچ کے اندر ہیں۔ وہ انسانی معاملات میں گہری نظر اور سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ وہ آدمی کی صلاحیت کا کم و بیش صحیح اندازہ لگا لیتے تھے کہ اُس میں کون سی خوبیاں اور خامیاں ہیں، اس کے امکانات اور حدود کیا ہیں، اس سے کیا توقع کرنی چاہیے اور کون سی چیز اُس کی طاقت سے باہر ہوگی۔ اس تجزیہ کی روشنی میں ذاکر صاحب مناسب آدمی کو ٹھیک موقع پر موزوں کام تفویض کرتے تھے اس طرح دوہرا فائدہ ہوتا تھا۔ ایک تو کام خوش اسلوبی کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ متعلقہ شخص کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ یہی طریقہ کار تھا جس نے ایسے لوگوں کو مصنف بنا دیا، جنھیں پہلے کبھی اپنی کسی چیز کو شائع کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ بعض ایسے تھے جن میں نہ کوئی خاص علمی قابلیت تھی اور نہ کوئی پیشہ ورانہ مہارت لیکن انھوں نے تخلیقی درس و تدریس میں نام پیدا کیا۔ اُس کی ایک روشن مثال پرائمری اسکول کے ایک استاد عبدالغفار مدھولی صاحب تھے۔ گو کہ وہ ہائی اسکول تک کی تعلیم بھی مکمل نہیں کر سکے تھے۔ بعض نووارد اور ناتجربہ کار استاد مثلاً عتیق احمد صاحب پرائمری اسکول کے نگراں بنائے گئے اور اس حیثیت سے بہت کامیاب ثابت ہوئے۔

ذاکر صاحب نے مختلف قسم کی ذمہ داریاں دے کر میری صلاحیتوں کو بھی اُجاگر کیا ۱۹۴۱ء میں بنیادی قومی تعلیم کی دوسری کُل ہند کانفرنس کا اجلاس جامعہ میں ہونا طے پایا۔ اس سلسلہ میں ایک تعلیمی نمائش کا بھی انتظام کرنا تھا۔ ذاکر صاحب نے یہ کام میرے سپرد کیا۔ حالانکہ مجھے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس نمائش کے لیے بنیادی تعلیم سے متعلق لٹریچر تیار کرانے کا کام خاص اہمیت کا حامل تھا۔ مجھے جامعہ میں آئے ہوئے ابھی مشکل سے دو سال ہوئے تھے اور تصنیف و تالیف کا کام میرے لیے بالکل نیا تھا۔ لیکن جس شفقت سے ذاکر صاحب کی رہنمائی نے اور جس فراخ دلی سے دوسرے ساتھیوں نے حوصلہ بڑھایا، اُس سے کام کرنے

میں بڑا مزہ آیا۔ مشکلات کم ہوتی چلی گئیں اور آخر کار اچھی خاصی نمائش تیار ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد رسالہ نئی تعلیم کے اردو ایڈیشن کی ادارت کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی، جب کہ اس سے پہلے میری کوئی قابل ذکر تحریر شائع نہیں ہوئی تھی۔ نئی تعلیم کا ہندی ایڈیشن ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے صدر دفتر سیواگرام (وردھا) سے ماہانہ شائع ہوتا تھا۔ گاندھی جی کے تعمیری پروگرام میں بنیادی قومی تعلیم کا کام بھی شامل تھا اور اس کے فروغ اور ترویج کے لیے انھوں نے ہندوستانی تعلیمی سنگھ کا ادارہ قائم کیا تھا، جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ اس لحاظ سے رسالہ نئی تعلیم کی بڑی اہمیت تھی اور اس کی ادارت ایک بڑا اعجاز، جو مجھ جیسے ناتجربہ کار شخص کو ذاکر صاحب کی بدولت حاصل ہوا اور اس طرح میں نے تصنیف کے میدان میں قدم رکھا۔

ذاکر صاحب کی سیرت کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ انھیں عزت نفس اور خودداری کا شدید احساس تھا۔ وہ خودداری کی قیمت پر کسی سے سمجھوتا نہیں کر سکتے تھے اور اپنے عمل سے دوسروں کو بھی تحفظِ خودداری کی ترغیب دیتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے۔ ذاکر صاحب نے بنیادی مدارس کے کام میں سہولت پیدا کرنے کے لیے خیال ظاہر کیا کہ رہنما کتابیں مرتب کی جائیں اور انھیں شائع کیا جائے چنانچہ مجھے بھی اس کی ترغیب دی۔ انھیں امید تھی کہ ہندوستانی تعلیمی سنگھ اس کتابوں کو شائع کرے گا۔ جب میں نے اپنی کتاب کا مسودہ تیار کر لیا، تو ذاکر صاحب نے سنگھ کے ایک جلسے میں تجویز پیش کی کہ بنیادی استادوں کی رہنمائی کے لیے کتابیں شائع کرنا بنیادی تعلیم کی ترقی اور توسیع کے لیے ایک موثر اقدام ہوگا۔ اور یہ کہا کہ جامعہ کا ایک استاد ایسی کتاب تیار کر سکتا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب نے جلسے میں محسوس کیا کہ سنگھ کے بعض اراکین ان کی تجویز کے بارے میں محفوظات ذہنی رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے اپنی تجویز کو وہیں اور اسی وقت ختم کر دیا۔ بعد ازاں ذاکر صاحب نے مجھے بتایا کہ سنگھ کی میٹنگ میں انھیں ایسا لگا کہ بعض اراکین کو شبہ ہے کہ جامعہ کے استاد کو سنگھ کے وسائل سے ناجائز فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لہٰذا غیرت کا تقاضا ہے کہ اب اگر سنگھ اس کتاب کو شائع کرنے کی پیش کش بھی کرے تو مجھے اس کی رضامندی نہیں دینی چاہیے۔ یہ خودداری اور راست بازی کا سوال ہے۔ یہ وہ اخلاقی اقدار ہیں، جن کا تحفظ بہر صورت ضروری ہے، چاہے ہمیں اپنے فوری فائدے کو قربان ہی کرنا پڑے۔

یہ متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ ذاکر صاحب نے کبھی دعویٰ کیا کہ وہ وجدانی قوت کے حامل ہیں۔ ان کے بعض رفقا کا خیال ہے کہ ان میں یہ قوت فطرتاً موجود تھی جس کی بدولت وہ بعض ایسی چیزیں کر گزرتے تھے، جن کے لیے بظاہر کوئی معروضی یا معقول بنیاد نہیں معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کی یہ تعبیر بھی کی جا سکتی ہے کہ ان کے ایسے اعمال ان کی غیر معمولی ذہانت کا ثبوت ہیں جس کی وجہ سے ان میں ایسی دیدہ وری اور دور اندیشی پیدا ہو گئی تھی کہ انھیں ان چیزوں

کا بھی عرفان ہو جاتا تھا جو اور لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہوتی تھیں۔ ذاکر صاحب نے ایسا تیز دماغ پایا تھا کہ ان کے سامنے جو مسئلہ آتا اس کی تہہ تک بہت جلد پہنچ جاتے اور پھر ضروری اقدام کرتے تھے۔ چونکہ اس کا کوئی ظاہری جواز نظر نہیں آتا تھا، اسے وجدان سے تعبیر کر دیا جاتا تھا۔ جو شخص ان سے ملنے آتا اور اپنی بات شروع کرتا تو ذاکر صاحب فوراً اُس کے اصل ارادہ کو بھانپ لیتے خواہ اُس نے اپنی بات کیسے ہی محتاط انداز میں کہی ہو۔

ذاکر صاحب میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ ہر خیال اور مسلک کے لوگوں سے ملتے تھے۔ مختلف ہی نہیں بلکہ متصادم جماعتوں سے تعلق رکھنے والے حضرات سے اُن کی راہ و رسم تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے سربراہوں کو جامعہ کی سلور جوبلی ۱۹۴۶ء کے افتتاحی جلسہ میں ایک ساتھ شرکت کرنے پر آمادہ کر سکے۔ ذاکر صاحب نے یہ عجوبہ کر دکھایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح اس جلسہ میں موجود تھے اور یہ اس وقت جب کہ حال ہی میں کلکتہ میں ہیبت ناک فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے اور وہاں کئی روز کشت و خون کا بازار گرم رہا تھا۔ اس کی بازگشت ملک کے دوسرے حصوں میں اس وقت بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس مکدر اور مسموم فضا میں اس قسم کی تقریب کا انعقاد دیوانے کا خواب معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ذاکر صاحب کی دانشمندانہ حکمت عملی کی بدولت اس نے حقیقت کا جامہ پہنا۔ اس موقع پر انھوں نے جو خطبہ پیش کیا وہ ان کے دلی کرب اور سوز و گداز کا آئینہ دار ہے، جو دراصل مجروح انسانیت کی پکار ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ذاکر صاحب نے قومی رہنماؤں سے اپیل کی کہ للہ سر جوڑ کر بیٹھئے اور ایسی صورت نکالیے کہ ملک میں درندگی کا غلبہ نہ ہو سکے اور امن و آشتی کی فضا قائم ہو تاکہ تعلیمی ادارے انسان سازی کا کام کر سکیں کہ اصل میں یہی ان کا وظیفہ ہے۔

ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں، جنھوں نے اپنے علمی اور دانشورانہ کارناموں کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کی یا کسی مخصوص فن میں مہارت کی بدولت غیر معمولی امتیاز حاصل کیا۔ لیکن ایسے مشاہیر کم ہیں جن کی شخصیت ہمہ جہت اوصاف اور کامرانیوں کا نمونہ ہو۔ ذاکر صاحب کا شمار ان چند اشخاص میں کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف وہ ایک ممتاز دانشور تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے ان کا جمالیاتی ذوق اُن کی ہر چیز میں نمایاں تھا۔ ان کے رہنے اور کام کرنے کی جگہ کا ساز و سامان، ان کا لباس اور استعمال کی سبھی چیزیں اگرچہ سادہ اور کم قیمت ہوتی تھیں، لیکن خوش سلیقگی اور خوش ذوقی کی عکاسی کرتی تھیں۔ چھوٹے سے چھوٹا کام جو وہ ہاتھ میں لیتے تھے، اس کو کمال کی حد تک پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا قول تھا جو کام کرنے کے قابل ہے، وہ اس قابل بھی ہے کہ اُسے اچھے سے اچھا کیا جائے۔ اس لیے اس کی منصوبہ بندی اور جزئیات پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ اگر کام میں کوئی رکاوٹ

ہو جائے تو اُس سے ان کی ہمت ٹوٹتی نہیں تھی۔ بلکہ رکاوٹ پر قابو پانے کی تدبیر کرتے تھے۔
مجھے یاد پڑتا ہے کہ حکومت وقت کی بے رُخی اور مخاصمانہ رویّہ کی وجہ سے ایک سال ہمارے کالج میں صرف سات طالب علموں نے داخلہ لیا۔ میں بہت ہراساں ہوا اور ذاکر صاحب سے کہا کہ اتنی حقیر تعداد پر محنت اور وقت صرف کرنے سے کہیں بہتر ہوگا کہ کالج بند کر دیا جائے۔ ذاکر صاحب نے ردعمل کے طور پر بڑے پتے کی بات کہی کہ وہ سوداگر بہت نادان ہوگا جو کساد بازاری کی تاب نہ لا کر دُکان بند کر بیٹھے۔

اُن دنوں جامعہ کی مالی حالت بہت تشویشناک تھی۔ کارکنوں کی تنخواہیں مضحکہ انگیز حد تک ناکافی تھیں، خود ذاکر صاحب قلندرانہ زندگی گزارتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی جیب بالکل خالی ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ،نیوا یجوکیشن فیلوشپ، کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی۔ یہ ۱۹۴۶ء کے شروع کی بات ہے۔ ان کے ساتھ میں بھی کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ واپسی میں جب ہمارے میزبان کی موٹر ہمیں ریلوے اسٹیشن پہنچانے گئی، تو ذاکر صاحب ڈرائیور کو حسبِ دستور ٹپ دینا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ یہ رسم ادا کر سکتے۔ ایک طرف لے جاکر مجھ سے کچھ روپے لیے اور ڈرائیور کو اس طرح دئے کہ کوئی یہ نہ دیکھ سکے کہ کیا کر رہے ہیں۔

ایسی نازک حالت میں ضروری تھا کہ جامعہ کے کارکن کسی اور کام کے ذریعے اپنے مالی وسائل میں اضافہ کریں۔ ذاکر صاحب کو اس کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ وہ حاجت مندوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق مزید کام مہیا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایسے حساس انسان دوست تھے کہ بھانپ لیتے تھے کہ ان کے کسی ساتھی کو کیا پریشانی ہے اور اسے دور کرنے کی حتی الوسیع کوئی راہ نکال لیتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یہ ہے۔ انھیں معلوم ہوا کہ جامعہ کے ایک پرانے استاد کی بیوی تعطیلات میں اپنے آبائی وطن نہیں جا رہی ہیں کیونکہ ان کے پاس وہاں کے لیے کوئی معقول لباس نہیں ہے۔ جامعہ میں تو وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں گزارہ کر لیتی ہیں مگر وہاں ان کپڑوں میں جاتے ہوئے سُبکی محسوس کر رہی ہیں۔ ذاکر صاحب نے مسئلہ کی نزاکت کو بھانپ لیا اور اس کے لیے پیشگی رقم کی ادائیگی کا انتظام کر دیا۔
وہ جامعہ کے کارکنوں کی مالی دشواریوں کا کوئی معقول حل نکالنے پر سنجیدگی سے غور و فکر کر رہے تھے۔ ایک موقع پر مجھ سے ذکر کیا اگر ہر شخص کی زندگی کا بیمہ کرایا جا سکے، رہنے کے لیے مکان کا انتظام ہو جائے اور اس کی اولاد کی حسبِ صلاحیت مناسب تعلیم کی ضمانت دی جا سکے، تو تمام کارکن ناکافی تنخواہ کے باوجود زیادہ اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکیں گے۔ اس کے لیے جو سرمایہ درکار ہوگا اُس کی فراہمی کیسے کی جائے، اس کے بارے میں ہمیں سوچنا چاہیے اور کوئی تدبیر نکالنی چاہیے۔ ذاکر صاحب جامعہ سے جانے

بعد بھی اپنے ان قدیم رفقا کے بارے میں خاص طور پر فکر مند رہے، جن کی مالی حالت بہت نازک تھی، اگرچہ کہ باضابطہ طور پر جامعہ کے روزمرہ کے مسائل سے اُن کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جب وہ مملکت ہند کے نائب صدر کے عہدہ پر فائز تھے، جامعہ کو یو۔جی سی ایکٹ (۱۹۵۶) کی دفعہ ۳ کی رو سے یونیورسٹی تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے نتیجے میں جامعہ کو تعلیمی اور انتظامی امور کی انجام دہی کے لیے دوسری یونیورسٹیوں کے مانند قواعد و ضوابط وضع کرنے پڑے چنانچہ کارکنوں کے ریٹائر کرنے کی عمر بھی مقرر کی گئی۔ میں اس دوران جب ذاکر صاحب سے ملنے گیا تو اس معاملہ میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا خاص طور پر ان ساتھیوں کے تئیں جن کے پاس ریٹائر ہونے کے بعد زندگی گزارنے کے کوئی وسائل نہیں ہوں گے۔ اس سلسلے میں جامعہ پرائمری اسکول کے ایک استاد احمد علی آزاد صاحب کا ذکر کیا کہ ان کے خاندان کا کیا حشر ہوگا۔

ذاکر صاحب ہونہار اور حوصلہ مند اشخاص کی تلاش میں رہتے تھے جو جامعہ کی سخت زندگی کو انگیز کر سکیں۔ جہاں کہیں ایسا شخص نظر آتا، اُسے جامعہ میں کھینچ لاتے اور دامے درمے سخنے ہر طرح اس کی صلاحیتوں کے پنپنے میں مدد دیتے اور بالآخر وہ جامعہ برادری کا ایک اٹوٹ حصہ بن جاتا۔ گو کہ اس دور میں جامعہ ایک چھوٹا سا ادارہ تھی۔ لیکن اپنی اپج سے کام کرنے کی آزادی اور ہم نفسوں کی رفاقت ایسی چیزیں تھیں کہ ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ وہ ایک دل چسپ، پُر لطف اور بڑا کام کر رہا ہے اور اس طرح عرفان ذات کی منزل کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

آخری بار میں ذاکر صاحب سے راشٹرپتی بھون میں ان کے انتقال سے چار یا پانچ دن پہلے ملا۔ ملنے کی ایک خاص ضرورت پیش آئی۔ میں اپریل ۱۹۶۹ء میں راجستھان یونیورسٹی کے بلاوے پر اس کے الحاقی ٹریننگ کالجوں کے عملی امتحانات لینے گیا تھا۔ یہ ادارے ریاست کے کئی اہم شہروں میں واقع تھے۔ اس سلسلہ میں مجھے متعدد ہائی اسکولوں میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں ٹریننگ کالجوں کے طلبا کا امتحان ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان سبھی اسکولوں میں تمام سابق اور موجودہ پرائمنسٹروں اور راشٹرپتیوں نیز دیگر اہم قومی لیڈروں کے فوٹو آویزاں تھے بجز موجودہ راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین یا دوسرے مسلم قومی لیڈروں کے، یہ چیز مجھے بہت کھٹکی کہ یہ قومی یک جہتی اور سیکولرازم کی اسپرٹ کے منافی تھی۔ اپنے اس تاثر کا اظہار ذاکر صاحب سے کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ ہمارے تعلیمی ادارے جن کا منصب خاص طور پر قومی یک جہتی کو فروغ دینا اور نئی نسل میں تمام دیس باسیوں کے لیے بلا امتیاز مذہب و ملت مساوات اور عزت و احترام کا جذبہ پیدا کرنا ہے اپنی ذمہ داری سے غافل ہیں۔ رد عمل کے طور پر ذاکر صاحب نے کہا کہ یہ صورت حال یقیناً تشویش ناک ہے۔ اس

سے نپٹنے کے لیے ہمیں تعلیم و تربیت کے پروگرام پر خاص توجہ دینی ہوگی کہ یہ صالح اقدار کی ترویج و اشاعت کا موثر ذریعہ بن سکے اور اس غرض سے نہ صرف رسمی تعلیم کے اداروں کی ازسرِنو تنظیم کرنی ہوگی بلکہ اطلاع و ابلاغ کے تمام وسائل۔ ریڈیو ٹیلی وژن اخبارات و رسائل وغیرہ کو شعوری طور پر کام میں لانا ہوگا۔

سطورِ بالا میں ذاکر صاحب کی ذات اور صفات کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بڑے آدمی کی نشانی ہے خیال، قول و فعل کی ہم آہنگی۔ ایسی شخصیتوں سے فیضان حاصل کرنا بھرپور زندگی کی ضمانت ہے۔

کے۔ اے۔ نظامی

ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ میں

ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت اور خیالات کو ڈھالنے میں علی گڑھ نے ایک بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے بھی علی گڑھ کا یہ خوشگوار قرض دورانِ تقسیم علی گڑھ کو ٹوٹنے، بکھرنے، یاس اور مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبنے سے بچا کر ادا کر دیا۔ نتیجے میں آزاد ہندوستان میں علی گڑھ کا وجود قائم رہا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے کالج کی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ علی گڑھ میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف تحریک عدم تعاون کا جذبہ بیدار کیا۔ یونیورسٹی یونین کے پُرجوش مقرر تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف سپرا ٹھالی تھی۔ انھوں نے اپنی پرجوش تقریروں سے طلبا کو انگریز راج کے خلاف بھڑکایا اور اس تحریک میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کا نعرہ بلند کیا۔ علی گڑھ کے منتظمین کے مایوس کن رویہ سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ قائم کی تاکہ زیادہ سے زیادہ عوام کو اس جدوجہد میں شامل کیا جا سکے۔ اس کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گئے اور ایک چوتھائی صدی انھوں نے جامعہ کی دیکھ بھال میں گزار دی۔ ۱۹۴۸ء میں وہ علی گڑھ واپس آئے تاکہ اپنی مادرِ علمی کو نازک وقت میں مشکلات سے نجات دلائیں۔ اس طرح ان کا اس ادارے میں پچاس سالہ قیام ایک باغی اور ایک وکیل کی حیثیت رکھتا تھا۔

۲۸ جنوری ۱۹۵۷ء میں کنووکیشن کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ علی گڑھ نے ان کی زندگی میں کیا اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ”ہمیشہ میری نظر اپنی قوم کے عیوب پر رہی اور میں جلتا کڑھتا رہتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں ایک سنہرے مستقبل کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس لیے کہ یہ وہ جگہ تھی جہاں میں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر جدوجہد کرنے کا سبق سیکھا تھا۔ ہم ادارے کے تئیں وفادار رہے لیکن افسوس کہ جب ہم نے اس ادارے کے منتظمین کو اپنے سے غیر مطمئن پایا تو ہم باغی ہو گئے۔ یہاں سے نکالے جانے کے بعد ہم نے ایک صدی کے پچیس سال ایک اور بستی بسانے میں بتا دئے۔ لیکن پھر بھی ہمارے دل میں اس

ادارے کے تئیں کوئی تلخی نہیں پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ شہر بدر ہو کر بھی میرا دل اس سے وابستہ رہا۔" ان کی آخری خواہش تھی کہ ان کی آخری آرام گاہ علی گڑھ ہی ہو مگر شاید قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔

علی گڑھ کا ایک طالب علم :-

ذاکر صاحب نے ابتدائی تعلیم یو۔پی کے دو چھوٹے شہروں میں حاصل کی ۔۔ قائم گنج اور اٹاوہ ۔ ۱۹۱۳ء میں وہ ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ ان کو کالج کی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا جیسے یونیفارم ہونا، ڈائننگ ہال میں کھانا، یونین اور کھیل کے بڑے بڑے میدان وغیرہ ان کی جستجو آمیز طبیعت نے بہت جلد ہی کالج کی دلچسپیوں اور روایات کو اپنا لیا۔ دوستوں کا ایک حلقہ بھی بنا لیا جیسے رشید احمد صدیقی، اقبال سہیل وغیرہ۔ دلچسپ گفتگو اور خوشنما شخصیت نے ان کو کالج میں جلدی ہی مقبول بنا دیا۔ ان کے احباب انھیں "مرشد" کہا کرتے تھے۔ انھوں نے کالج یونین میں بڑھ چڑھ کر تقریریں کیں اور اپنی سحر انگیز تقاریر سے سامعین کے دل جیتنے کا سلیقہ آگیا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ یونین کے نائب صدر تھے۔ ہم نے ہمیشہ انھیں اہم موضوعات پر تقریر کرتے سنا جیسے ہندوستانی لسانی مسئلہ (۱۹۱۷-۴-۱۴) ہندوستان کی تعلیم کی خامیاں (۱۹۱۷-۸-۱۱)، آزادی کی اہمیت اور جمہوریت (۱۹۱۷-۱۱-۱۷ ۔ ۱۹۱۷-۷-۱۵) وطن پرستی (۱۹۱۹-۱-۸)، ذاتی جاگیریں ترقی میں حائل (۱۹۱۹-۱۱-۲۴)، علی گڑھ تحریک (۱۹۲۰-۴-۲۴) وغیرہ۔ طلبا کی یونین نے ان کو بہتر سے بہتر تقریر کے مواقع فراہم کیے اس طرح کہ سامعین بھی محو ہو جاتے تھے ۔۔ یہ خوبی آخری زندگی تک برقرار رہی۔

تحریک عدم تعاون اور قیام جامعہ :

جب تحریکِ عدم تعاون شروع ہوئی تو ڈاکٹر ذاکر حسین زور شور سے اس میں شامل ہو گئے جوان کی دلی تمنا تھی۔ وہ مہاتما گاندھی، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کی وقتاً فوقتاً اپیلوں سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اس گروپ کے مستعد کارکن بن گئے جس نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی وہ تقریر جو یونیورسٹی کی مسجد میں، کرائی جس میں طلبا کو نصیحت کی گئی تھی کہ وہ تحریکِ عدم تعاون میں شریک ہوں۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ وجود میں آئی۔ یہ ردِ عمل تھا علی گڑھ کے منتظمین کے خلاف جن کا جھکاؤ انگریز حکومت کی جانب تھا۔ اس طرح یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد ذاکر حسین کی زیادہ تر توجہ جامعہ کے فروغ کی طرف مبذول ہو گئی جو بعد میں دہلی منتقل ہو گئی۔

علی گڑھ سے وابستگی :

دہلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی پہچان ایک ماہر تعلیم کے طور پر ہوگئی اور جامعہ ایک قومی جدوجہد کی علامت بن گئی۔ رفتہ رفتہ ماہر تعلیم اور ایک منصوبہ بنانے والے کی حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک ہوگئی۔ وہ علی گڑھ کی مختلف کمیٹیوں کے کارکن نامزد کیے گئے۔ ان کا نام ان ممتاز شخصیتوں میں لیا جاتا ہے جو ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ آئیں ۔
شیخ الجامعہ سر راس مسعود ایک خط میں طاہر علی قدوائی کو لکھتے ہیں : " غلام محمد اور ذاکر حسین میرے بہت مددگار ہیں " انھیں کے زمانے میں ذاکر حسین یونیورسٹی کی مالیاتی کمیٹی کے سکریٹری بنائے گئے۔

علی گڑھ کے شیخ الجامعہ :

تقسیم ہند کے فوراً بعد علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کے لیے سب کی نگاہیں مناسب ترین انسان ڈاکٹر ذاکر حسین پر پڑیں۔ تقسیم ہند کے نتائج ہر لحاظ سے خراب تھے بلکہ دل برداشتہ بھی تھے سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ بہت سے اساتذہ اور طلبا جو پنجاب صوبہ سرحد اور سندھ سے تعلق رکھتے تھے ملک چھوڑ گئے اور جو رہ گئے ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں وہ لوگ اپنے آپ کو Lost sheep تصور کرتے تھے۔ ہنگامۂ حالات نے چاروں طرف مایوسی اور تاریکی کا سماں باندھ رکھا تھا۔ عملی اور نفسیاتی، دونوں ہی طرح کے مسائل درپیش تھے۔ مولانا آزاد کا فیصلہ علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کے طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین کے حق میں خود علی گڑھ یونیورسٹی اور وہاں کے لیے ایک بڑی نعمت اور برکت ثابت ہوا۔ اگر ذاکر حسین کو مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کی بروقت مدد اور ہمت افزائی نہ ملتی تو علی گڑھ اپنا تعلیمی وقار کھو چکا ہوتا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے علی گڑھ کو قنوطیت کے اندھیروں سے نکالا اور ازسرِ نو اپنی عملی اور ذہنی فراست کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے سنبھالا دیا اور کھویا ہوا مقام دلوایا۔ ذاکر حسین کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے سر مرزا اسماعیل نے فرمایا :

"شیخ الجامعہ کی اہم اور معزز کرسی کے لیے سب سے مناسب انسان ڈاکٹر ذاکر حسین کا تقرر ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں تعلیم اور ذریعۂ تعلیم پر مہارت ہو۔"

لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد علی گڑھ گلابوں کی سیج نہیں رہا۔ ضرورت تھی ایک صحت مند نظریے کی، محنت اور لیاقت جو علی گڑھ کے بکھرتے شیرازے کو سمیٹ سکے۔ ۲۷ فروری ۱۹۵۰ء میں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر رپورٹ پڑھتے ہوئے انھوں نے کہا تھا :

"جب میں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی کرسی سنبھالی تو مجھے پوری طرح علم تھا کہ مجھے نفسیاتی اور معاشی مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میں بعد خوشی حاضرین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ گزشتہ ایک سال میں ہمارے طلبا میں ایک صحت مند اور خوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو Lost sheep محسوس نہیں کرتے بلکہ اپنے سارے فرائض اپنے عظیم ملک کے معتبر شہری کی حیثیت سے انجام دے رہے ہیں اور ہر طرح کی مدد دینے کو تیار ہیں چاہے وہ اخلاقی ہو یا مالی۔ وہ اپنے عظیم ملک کے شہری بن کر ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور برابر سے مدد دے رہے ہیں۔ وہ اپنے اندر انصاف اور قوت برداشت پیدا کر رہے ہیں، نئی قدریں اجاگر کر رہے ہیں تاکہ علی گڑھ کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلائیں اور یہی میری آرزو اور میرا خواب ہے۔"

یہ مبالغہ آرائی ہرگز نہیں ہو گی اگر میں کہوں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس ادارے کو تباہ اور برباد ہونے سے بچالیا۔ بقول Mathew Arnold میتھو آرنلڈ:

"اس نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی "

اور کہا: تمہاری بیماری یہ ہے اور اسی جگہ ہے۔

ان کے سامنے فوری اور اہم مسئلہ یہ تھا کہ وہ ادارے کی ذہنی آلودگی کو ختم کر کے ایک صحت مند فضا پیدا کریں، لوگوں میں قومی شناخت اور اتحاد کی روح پھونکیں، قنوطیت کی گھٹن کو ختم کریں، آخری لیکن سب سے اہم بات یہ کہ تعلیمی خلا، کو پر کریں جو اساتذہ کی پاکستان ہجرت سے پیدا ہو گیا تھا۔ ذاکر صاحب نے نہ صرف اس خلاء کو پُر کیا۔ بلکہ اساتذہ کی ایک نئی نسل کو ہموار کیا، جس نے جوش و خروش اور لگن کے ساتھ مل کر ایک نئے علی گڑھ کو جنم دیا۔

۲۴ جنوری ۱۹۵۳ء تقسیم اسناد کے جلسے میں ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا:
"آپ کے شیخ الجامعہ آپ کی اور آپ کے ادارے کی عین آئینِ ہند کے اصولوں کی تقلید کر رہے ہیں۔"

ذاکر صاحب کو پوری طرح سے علم تھا کہ شیخ الجامعہ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد علی گڑھ میں ان کو ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا پھر بھی انھوں نے بڑے حوصلے اور بھروسے کے ساتھ یہ عہدہ قبول کیا تھا۔ جامعہ چھوڑنے سے پہلے ان کو اندازہ تھا کہ جامعہ سے ان کا تعلق ختم تو نہیں ہو گا مگر یقیناً وہ زیادہ توجہ اور وقت نہیں دے سکیں گے۔ لہٰذا انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی آنے کے بعد بھی جامعہ کے ادھورے کام پورے کیے۔ دوسرے معنوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سوچا کہ علی گڑھ کے شیخ الجامعہ ہونے کے بعد ان کو ایک اچھا موقع ملے گا اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا جس کی بدولت ان کو تیس سال

پہلے علی گڑھ چھوڑنا پڑا تھا۔

ایک طرف ان کا جتن اور کوشش تھی کہ علی گڑھ کو بڑھاوا ملے جو اس کی پہچان ہو اور دوسری طرف ان کو ان تکلیف دہ حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جب کچھ لوگ علی گڑھ کے خلاف پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ انھوں نے اُن لوگوں کی سختی سے نکتہ چینی کی اور تنبیہ بھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے آچاریہ ونوبا بھاوے کو یونیورسٹی آنے کی دعوت دی اور اس موقع پر انھوں نے اتنی زبردست اور پُرجوش تقریر کی جو ناقابلِ فراموش ہے خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جو اس جلسے میں موجود تھے۔

علی گڑھ کی قومی زندگی کی تشکیل کا جو بہتر نظریہ انھوں نے اپنایا تھا اس کا ذکر ۱۹۵۱ء کی سالانہ رپورٹ میں اس طرح کیا:

" علی گڑھ جس طرح سے کام کرتا ہے، جو اس کی سوچ و فکر ہے، جس طرح علی گڑھ نے ہندوستانی زندگی کا نظریہ پیش کیا ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں کی قومیت، وطن پرستی کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ علی گڑھ کے کارہائے نمایاں اور حب الوطنی آگے چل کر ہماری مادرِ وطن، ہندوستان کی ترقی اور سچی قومی زندگی کا ضامن ہوں گے۔"

بدلے ہوئے حالات میں ملک کا سیکولر ہونا اس بات کا احساس لازم طور پر دلاتا تھا کہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ ۱۹۵۱ء ایکٹ کے مطابق یہ پابندی ہٹ گئی تھی کہ "غیر مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر نہ ہوں۔"

ایک عام خیال تھا کہ علی گڑھ اپنی مخصوص روش سے ہٹ گیا ہے۔ اس کے ماضی نے اس کی قومی اور بین الاقوامی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی باریک بینی اور دور اندیشی نے ان دونوں شبہات کو دور کر دیا اور علی گڑھ کو اس کا مقام واپس دلایا۔ قومی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، جنرل کیری اپا، ڈاکٹر کے۔ ایم۔ پانیکر جیسی اور دوسری شخصیات مثلاً سعودی عرب کے بادشاہ، شاہِ ایران، افغانستان کے بادشاہ اور آغا خان جب علی گڑھ تشریف لائے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ غیر ملکی اداروں اور جماعتوں سے تعلقات وسیع کیے گئے۔ عرب کے کنگ سعود نے علی گڑھ سے ایک وفد کو دعوت پر اپنے ملک بلایا جس کے سربراہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ اس وفد کو علی گڑھ میں میڈیکل کالج کھولنے کے لیے ایک بڑا عطیہ دیا گیا۔ جب شاہِ ایران آئے تو ایک فنڈ مقرر ہوا جس سے فارسی میں اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یورپ اور انگلینڈ سے بھی بہت سی ممتاز شخصیات علی گڑھ تشریف لائیں اور لکچرز دیئے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا نظریہ تھا کہ ایک صحت مند دماغ کی نشوونما میں آس پاس کے

ماحول کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے، جو خوش کن دل، خوش نما اور خوش گوار ہونا ضروری ہے۔ جب وہ علی گڑھ آئے تو لوگ خاصے مایوس اور دل برداشتہ تھے۔ انھوں نے آتے ہی چاروں طرف سبز لان اور باغیچے لگوائے۔ کچھ لوگ معترض اور متعجب بھی ہوئے کہ ان حالات میں جب کہ ادھر اُدھر سے علی گڑھ پر حملے کی کانا پھوسی ہو رہی تھی۔ ایسی صورت حال میں ان ہرے بھرے لانوں اور باغ باغیچوں کی کیا ضرورت ہے۔ اس نکتہ چینی پر انھوں نے یہ جواب دیا:

"اگر علی گڑھ پر حملہ ہونا ہی ہے اور بربادی لگنا ہی ہے تو کم سے کم حملہ آوروں کو یہ احساس تو ضرور ہوگا کہ وہ ایک خوب صورت جگہ کو برباد کر رہے ہیں۔"

جب پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد لائبریری اور سیفی ہوسٹل کے سنگ بنیاد رکھنے علی گڑھ تشریف لائے تو ڈاکٹر ذاکر حسین نے خاص طور پر ان کو یونیورسٹی دکھائی اور جواہر لال نہرو چاروں طرف سبزہ زاروں، گلابوں اور باغیچوں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔

کوئی بھی ادارہ اپنے ادبی اور علمی کارناموں سے فروغ پاتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی توجہ اور شوق سے پرانے سائنسی اور آرٹ ڈپارٹمنٹس کی از سر نو تشکیل کی۔ انجینیرنگ اور میڈیکل کالج وجود میں آئے۔ نئی نسل کا رجحان ریسرچ کی طرف مبذول کرایا۔ یونیورسٹی گزٹ میں علمی اور ادبی خبریں شائع ہونے لگیں۔ انھوں نے اردو اور تاریخ کے شعبوں میں نئے ریسرچ پروجیکٹز شروع کرائے اور ان کے لیے مالی امداد کا بھی بندوبست کیا۔ اردو ڈپارٹمنٹ کو خصوصی مالی امداد دی گئی کہ جہاں اردو زبان اور ادب کی مکمل اور جامع تاریخ مرتب کی جا سکے۔ تاریخ ڈپارٹمنٹ کو مزید مالی امداد فراہم کرائی جہاں انڈین مڈیول ہسٹری پر ریسرچ ہو سکے اور ایک جرنل Medieval Indian History بھی نکالا۔ یہ ان کی محنت اور دلچسپی ہی کا نتیجہ تھا کہ تاریخ کے ادارہ کو "سینٹر فور ایڈوانس سٹڈی اِن مڈیول انڈین ہسٹری" کا نام دیا گیا۔ یہ ان کے ذاتی اور لگاتار دلچسپی کا نتیجہ ہی تھا کہ آنے والے تیس برسوں میں علی گڑھ یونیورسٹی کی نوجوان نسل نے گراں قدر علمی اور ادبی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ انھوں نے گلمرگ لیبورٹری کا قیام کیا جہاں سائنس اور ٹکنولوجی پر مشترکہ طور پر کام ہو سکے۔ انھوں نے آنکھوں کے علاج کا اسپتال قائم کیا جسے وہ لندن کے "مور فیلڈ اسپتال" کے پائے کا بنانا چاہتے تھے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے پاس مشرقی موضوعات کے قلمی نسخوں کا خاصا بڑا ذخیرہ ہے۔ لیکن ایک مفصل فہرست کی نہایت ضرورت تھی، ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس سلسلے میں علماء کو منتخب کر کے یہ ذمہ داری انھیں سونپی۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی طرح سے ہر مخطوطہ یونیورسٹی کے لیے مل جائے۔ ایک بار انھوں نے کچھ مخطوطے کتب فروش سے منہ مانگی قیمت پر خریدے۔ جب میں نے ان سے کہا کہ آپ نے دام زیادہ دیئے ہیں جب کہ میں

کم داموں پر خرید تا ہوں۔ تو انھوں نے جواب دیا: "مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ پیش قیمت مخطوطے کی قیمت کم کر سکوں۔"

ان کو علی گڑھ میں اورینٹل کتابیں اکٹھا کرنے کا بہت شوق تھا۔ مولانا آزاد لائبریری ان کے ہی منصوبے کے مطابق بنی تھی جو ہندوستان میں اورینٹل ادب ایک نمونہ مرکز ہے۔

علی گڑھ کی گوناگوں ذمہ داریاں اور باہر کی معروفیات کچھ اس قدر بڑھیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی صحت پر اثر انداز ہوئیں اور ان کو پہلا دل کا دورہ پڑا۔ مگر انھوں نے آرام نہیں کیا اور کام کرتے رہے۔ جب بھی کبھی ان کا دل گھبراتا تو تصوف کے متعلق کتابیں پڑھتے صوفیوں کے بارے میں پڑھ کر ان کے دل و دماغ کو بڑی راحت محسوس ہوتی تھی۔ ایک دفعہ جب وہ بیمار ہوئے تو انھوں نے مجھ سے ۲۵ کتابیں تصوف پر لے کر پڑھیں۔

کچھ مخالف گروپ کے لوگوں نے ان کی خرابیٔ صحت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ ذاکر حسین چاہتے تو ان کو منہ توڑ جواب دے سکتے تھے مگر انھوں نے استعفیٰ دینے میں بہتری سمجھی۔ پروفیسر محمد مجیب نے لکھا ہے کہ ان کے استعفیٰ دینے کی ایک وجہ اور بھی تھی: "جب وہ علی گڑھ چھوڑنے والے ہی تھے تو ڈاکٹر خلیق احمد نظامی نے اُن کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ انھوں نے معذرت کر دی مگر کہا کہ میں آپ سے تنہائی میں اطمینان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یا دو دن بعد فجر کی نماز سے فارغ ہو کر وہ ڈاکٹر نظامی کے گھر گئے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کو یو۔ جی۔ سی کی چیئرمین شپ آفر کی گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ میں نے اس کے یا کسی بھی پوسٹ کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن جب یہ پیش کش کی گئی تو اس کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ بعد میں مولانا آزاد نے بغیر کوئی وجہ بتائے اپنا فیصلہ بدل دیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے ریڈیو پر اچانک سنا کہ ڈاکٹر دیش مکھ کا اس پوسٹ پر تقرر ہو گیا ہے۔ ان کو بے حد صدمہ پہنچا۔ جب منسٹری آف ایجوکیشن سے فون آیا تو انھوں نے بات کرنے سے انکار کر دیا، ممکن ہے یہ فون کسی قسم کے جواز پیش کرنے کے سلسلے میں ہو۔ کچھ دن بعد جب وہ دہلی میں تھے تو پروفیسر ہمایوں کبیر ان سے ملنے آئے اور کہا کہ مولانا آزاد بھی ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ برائے مہربانی مولانا آزاد سے کہیے کہ ان کے گھر سے میرے گھر کا فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا میرے گھر سے ان کے گھر کا۔

مولانا آزاد کے تعزیتی جلسے میں اس ناخوشگوار واقعے کا ذکر، ڈاکٹر ذاکر حسین کی شرافت اور انسانیت کا پتہ دیتا ہے۔ جب وہ صدر جمہوریہ منتخب ہوئے تو میں ان کو مبارک باد پیش کرنے ان کے پاس گیا۔ میں نے کہا "ذاکر صاحب! یو۔ جی۔ سی۔ سے

راشٹرپتی بھون کا فاصلہ بہت بڑا ہے۔" کچھ لمحے تو وہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں مگر فوراً ہی ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور انھوں نے کہا "اگر کسی کو اپنے مستقبل کے بارے میں معلوم ہو یا تو دکھ یا خوشی کے بوجھ سے ختم ہو جائے۔"

علی گڑھ کے لیے جو خدمات اور کارہائے نمایاں ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیے ان کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ان کی ذات تھی جس نے علی گڑھ کو مایوس کن دور ماضی سے نکال کر نیا حوصلہ، نیا مقام اور نئی شکل دی اور جمہوری انداز فکر بخشا۔

ہیرن مکرجی

ذاکر حسین — خراجِ عقیدت

بڑی مسرت کی بات ہے کہ ذاکر حسین کا صد سالہ جشن (۱۸۹۷-۱۹۶۹) منایا جا رہا ہے۔ میں ان کی یاد کو سلام کرتا ہوں۔ وہ صدر جمہوریۂ ہند (۱۹۶۷-۱۹۶۹) رہے۔ ممکن ہے میری یہ بات مبالغہ آمیز سمجھی جائے کہ ہر ایک کی خواہش ہے کہ اگر کبھی بھی، کسی بھی ملک کا صدر پیدا ہو وہ صدر ہند ذاکر حسین جیسا ہو۔ اگر کبھی بھی کسی انسان میں شخصیت کی خوب صورتی، ذہانت، نفاست، خوبیاں اور جذبۂ وطن پرستی ہوں اور اس کو کسی ملک کا شخص اول، بنانا ہو تو وہ اُن جیسا ہو۔ اپنے سابق مدبّر، فلسفی، سروپلی رادھا کرشنن کی طرح انھوں نے اپنا قدم راجیہ سبھا کی طرف بڑھایا۔ اس عہدے پر ان کی نامزدگی، صدرِ ہند کے لیے بابرکت تھی اور جس میں دوبارہ جان ڈالنے کی ضرورت تھی۔

ذاکر صاحب دوسرے سیاست دانوں سے مختلف تھے۔ غیر معمولی شرافت اور بے انتہا خوبیوں سے مرصّع اس انسان کے لیے کوئی بھی چیز غیر اہم نہ تھی۔ ان کی شخصیت میں فطری متانت، ذہانت اور ایک طرح کی پرسکونیت تھی، مگر پھر بھی وہ اپنے ملک کی سیاست میں دخیل تھے۔ جیسا کہ گاندھی جی نے کہا — کہ انھوں نے ذاکر صاحب کا انتخاب ان کی خاص قابلیت "تعلیم" کی بناء پر کیا تھا۔ گاندھی جی کے اسی نظریہ کو "بنیادی تعلیم" کا نام دیا گیا ہے؛ یعنی محنت اور علم دونوں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ نظریۂ تعلیم ہندوستان جیسے ملک میں جس کو حال ہی میں آزادی ملی تھی، محض ایک کوشش تھی۔ ذاکر حسین حالات کے طرح طرح کے اتار چڑھاؤ سے گزرے، فرقہ وارانہ تلاطم بھی برابر آتے جاتے رہے مگر ان سب کے باوجود انھوں نے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی اور مطمئن بھی تھے۔ یہ اس روشنی کی طرح تھا جو کہ جلتی بجھتی رہتی ہے مگر پھر بھی بجھتی نہیں۔

وہ ایک رواں دواں زبردست ہندوستانی تھے۔ ان کی سب سے بڑی تشویش

تھی کہ ہندوستانی عوام کے حالات ابتر تھے۔ ان کی زندگی کے ' رفقا ر محمد مجیب اور عابد حسین کی مدد سے سب سے پہلے انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو سمجھا۔ انھوں نے اقتدار کی بھوکی، زہر اگلتی فرقہ پرستی سے بغاوت کی اور اس زہر کے اثرات کو اپنی کوششوں سے ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی، بھلے ہی اس بغض نے کسی بھی مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ ان کے لیے یہ عقیدت اور بیعت کا کام تھا، ناسازگار حالات میں بھی، وقت کے قومی دھارے میں ساتھ ساتھ بہنے کا، چلنے رہنے کا اور پھر — کرسیٔ صدارت ایک اعزاز تھا، ایک خراج عقیدت تھا۔ ان کی خوش اسلوبی، ان کی پُرحسن شخصیت اور کردار کا جو ہندوستانی جمہوریت کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

راشٹرپتی بھون میں پھول ان کو اس قدر پسند تھے کہ ۶۹ ۱۹ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو یقیناً وہ بھی شبنم کے آنسو روئے ہوں گے۔ وہ بجنسہی ایک باوقار انسان تھے۔ ان کے دورانِ صدارت کافی سیاسی تناؤ اور دباؤ آتے رہے مگر بذاتِ خود ان سے کسی کو کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اپنی زندگی میں انھوں نے کبھی کسی ظاہری دکھاوے یا چمک دمک کا اظہار نہیں کیا بلکہ بے حد انکساری اور دردمندی سے کام کیا جس سے ان میں کسی قسم کا علمی، ذہنی احساسِ برتری نہیں پیدا ہوا۔ پارلیامنٹ میں ان کے ہر ایک سے تعلقات مخلصانہ تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء فروری کے قریب میں مخالف پارٹی میں تھا اور جب پارٹی نے احتجاج کے طور پر واک آؤٹ (جس کے لیے بعد میں لوک سبھا نے مجھ پر سرزنش کی!) جب صدر کے افتتاحی خطاب میں گورنمنٹ پالیسیوں پر چبھتی ہوئی نکتہ چینی کی گئی تھی، پارلیمنٹ کے دونوں ایوان میں صدر کے سامنے بصد احترام جھکا تو ان کی طرف سے بھی بے حد خلیقانہ اور مودّبانہ جواب ملا — ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی۔

میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا ان کا یک طرف خمیدہ سر، جب ہم لوگ احتجاج کے طور پر پارلیمنٹ میں شور مچایا کرتے تھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ذاکر صاحب ہماری اصلیت سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا وہ سرِ خمیدہ آدمی کو " سرو ینو بھدراہ " دکھاتا تھا اگر واقعی اس میں کچھ حقیقت تھی۔ ہر لحاظ سے ہندوستانی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ممکن ہے کہ ہمارے پڑھنے والوں کو لفظوں کا یہ انتخاب کچھ زیادہ ہی عطر بیز لگے لیکن یہ الفاظ میرے موئے قلم سے خود بخود ادا ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ میرے خیال میں ذاکر حسین کا شمار بھی اسی صف میں ہوتا ہے جو امیر خسرو سے لے کر ابوالکلام آزاد تک جاتی ہے۔ یہ سب وہ مسلمان چمکتے ستارے تھے جنھوں نے ہمارے ہندوستان کو بنانے سنوارنے میں تخلیقی کام کیے ہیں۔ ان ناموں کو الفاظ کی ضرورت نہیں، یہ میرے کانوں میں موسیقی کی مدھر دھنوں

کی طرح گونجتے رہتے ہیں۔

ذاکر حسین تقسیم ہند کے شدید صدمے سے دوچار ہوئے اس لیے کہ برطانوی حکمرانوں کی کرم فرمائیوں کی ہمیں یہ قیمت ادا کرنی پڑی۔ یہ ہماری ہی کمزوری تھی کہ اقتدار کی تقسیم ہوئی۔ حالانکہ آزادی ہمیں ملی (۱۵ اگست ۱۹۴۷) مگر نتیجے میں ہندوستان اور پاکستان بن گئے۔ اس سے ہمیں بھی صدمہ پہنچا۔ بہت سے دماغوں میں میر تقی میر کا (۱۸۱۰-۱۷۲۴) مصرع سے ،، دل ڈھا کے کعبہ بنایا تو کیا کیا ؟،، گونجا کرتا تھا (جواب بھی مجھے آسیب کی طرح ستاتا ہے)۔

میں اپنے دوست، جن کا پچھلے سال انتقال ہوا، رشید الدین خاں سے ملا۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پڑھایا تھا وہ مختلف زمانے میں لکھی گئی اپنی بہت سی تخلیقات ہمارے پاس چھوڑ گئے۔ ان کی آخری تخلیق ،، متحیر ہندوستان: شناخت کثرتِ وجود، اختلاف (دہلی ۱۹۹۵) ایک نہایت عمدہ، عملی تخلیقی کام ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ یہ حب الوطنی کا احساس جگاتی ہے، ہندوستان کے ماضی کی پیچیدگی پر مبنی ہے، اور موجودہ تاریخ میں راہِ نجات دکھلاتی ہے۔ سب سے زیادہ باعثِ تکلیف اور دھمکی آمیز واقعہ ایودھیا کی پانچ سو سال پرانی بابری مسجد کی شہادت ہے، جو اپنی جگہ پر ایک نہایت ہی شرمناک بات ہے اور ہندوستانی جمہوریت پر ایک تازیانہ۔ دنیا کے سامنے انسانی تہذیب پر اس سے زیادہ داغدار مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ ذاکر حسین اس تکلیف دہ صورت حال سے تو نہیں گزرے مگر یقیناً اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ حادثہ ان کے لیے سخت اذیت کا سبب ہوتا۔

یہ سب لکھتے ہوئے یاد آتا ہے ایک بار لگ بھگ ۱۸۲۲ کے قریب مشہور شاعر کیٹس نے لکھا تھا " دنیا میں شریف لوگوں کی شدید قلت ہے " جو موجودہ دنیا کے لوگوں کی شکل ہے۔ ہر جگہ اشتراکیت زوال پذیر ہے، سماجی شعور کی ابتری، پرانی قدروں کی تحقیر، جرم، دھندلی انسانی روح کو گھن لگا دینے والی برائیاں، اصولوں سے ہٹ کر گمراہ کن رجحان پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ قابلِ حیرت بات نہیں ہے کہ دل شکستہ سیاق و سباق فرقہ پسند، جنگ جو عناصر مل کر ایک بھیانک دھمکی کی شکل میں ابھر رہے ہیں۔ ہمیں فوری طور پر زخموں کو بھرنا، روحوں کو تازگی بخشنا اور جہاں تک ممکن ہو دل کی ایکتا (گاندھی کا تصور) کو قائم کرنا ہے تاکہ ہمارے ملک کو دکھوں سے نجات ملے۔ یہ نعرہ اتنا بلند ہو کہ شر پسندوں کے مقاصد کی دیواروں کو گرا دے۔ ان سب کے لیے ہمیں ان بڑے لوگوں کو یاد کرنا ہوگا جیسے ذاکر حسین۔ تاکہ ہندوستان کی مشترکہ، تخلیقی، مذہبی اور

لسانی ہم آہنگی کی شان برقرار رہے۔ ہماری تہذیب کو اور خاص طور سے ہندو مسلم یک جہتی کو بحال کرنا ہوگا جس کو پیتے ہوئے وقت نے بہت زخم دیئے ہیں۔

اس موضوع پر ضخیم کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے۔ ذاکر صاحب کے صدسالہ جشن پر ذرا توجہ چاہوں گا — ۱۹۵۴ء میں اردو جاننے والے اور اردو پسند کرنے والے صدر ہند ڈاکٹر راجندر پرساد کے سامنے، اردو بولنے اور اردو سے محبت کرنے والے ذاکر حسینؒ نے بہ حیثیت صدر کل ہند انجمن ترقی اردو کی طرف سے ۲۰ لاکھ لوگوں کے دستخطوں پر مشتمل ایک تاریخی عرضداشت، پیش کی تھی۔ اس عرضداشت میں ہندوستان کے اردو بولنے والوں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اردو کو ہندوستان میں مناسب مقام دلایا جائے۔ مگر آج تک یہ خواہش ادھوری ہی رہی۔ چونکہ جواہر لال نے چاہا تھا لہٰذا آئین ہند میں اردو کو بہت سی ''فرضی'' زبانوں میں سے ایک زبان قرار دیا گیا محض تکنیکی ضابطہ پرست حکمتی بنیاد پر۔ پھر بھی اردو ہندوستان کی وہ زبان ہے جو محض زندہ تو ہے مگر کوئی ریاست اسے تسلیم نہیں کرتی۔ ایسا لگتا ہے کہ جب تک ۳۰ فیصدی آبادی کی زبان اردو نہ ہو، اردو کو دوسری مقامی زبان بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اردو صرف ہندوستانی مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے کہ اردو کو ہندو حضرات کی صدیوں سے ادبی خدمات حاصل رہی ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہے جس کی مادری زبان اردو ہے۔ یہ ہندوستان کی ساری زبانوں سے زیادہ میٹھی اور شستہ زبان ہے۔ اس نے ہماری تہذیب کو چار چاند لگائے ہیں۔ اس نے فلسفیانہ خیالات اور ذی اثر ادب کو بڑھاوا دیا ہے۔ حب الوطنی کی جدوجہد میں ہندو مسلم دونوں پر اثر انداز ہوئی ہے۔ آزادی سے قبل حیدرآباد میں اس نے اپنے آپ کو مادری زبان اور اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کا کامیاب ذریعہ ثابت کردیا ہے۔

جیسا کہ جواہر لال نے کہا کہ ہمارے ملک کو اردو زبان کا احسان مند ہونا چاہیئے چونکہ بغاوت کی للکار کا نعرہ ''انقلاب زندہ باد'' اس زبان کا مرہون منت ہے۔ سبھاش چندر بوس جنھوں نے اپنی تاریخ الگ بنائی ہے اور ہندوستانی نعرے جیسے ''جے ہند'' — ''دلی چلو'' اور ''اتحاد'' — ''اتفاق'' — ''قربانی'' اردو ہی کے خزانے کی کھوج ہیں۔ نہایت ہی شرم کی بات ہوگی اگر موجودہ گورنمنٹ نے اس زبان کو نظرانداز کیا، جو کہ بہت آسان نہیں ہوگا۔ لوک سبھا میں ۵۰۰ اراکین میں سے ۱۹ مسلم تھے، ۱۹۶۲ء میں ۲۰، ۱۹۶۷ء میں ۲۸، ۱۹۷۱ء میں ۲۸، ۱۹۷۷ء میں ۳۱، ۱۹۸۹ء میں ۲۷، ۱۹۹۱ء میں ۲۵ (جب کہ ہماری آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ۱۵ - ۱۲ فیصدی ہے)۔ کون جانے کہ اگر وقت پر ہوش نہیں آیا تو یہ ملک ''ہندوتوا'' کے طرح طرح

کے ٹکڑوں میں بٹ کر بکھر جائے گا۔

سالوں پہلے شاید ۴۴-۱۹۴۳ء کے آس پاس میں بنارس جو ہندوستان کا "ابدی شہر" کہلاتا ہے، میں، میں نے ایک عمارت دیکھی جس کا نام تھا "بھارت ماتا مندر" اس کا افتتاح غالباً ۱۹۳۸ء میں گاندھی جی نے کیا تھا۔ جن کو ایک حب الوطن سامنت بابو بھگوان داس نے دعوت دی تھی اور سامعین میں ایک اور بڑے حب الوطن خان عبدالغفار خاں بھی شامل تھے۔ میں جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں ہندوستان کا کوئی نقشہ نہیں تھا مگر بے حد خوب صورت نقاشی کے نمونے ہماری مختلف زبانوں میں موجود تھے۔ میں بہت دکھی ہوا جب میں نے اردو کا کوئی نمونہ نہیں دیکھا۔ جب میں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا اور اردو کو نظر انداز کیے جانے کی وجہ جاننا چاہی تو مجھے بتایا گیا کہ اس زبان کے حروفِ تہجی "غیر ملکی" ہیں، اس لیے یہ "قومی" حیثیت حاصل نہیں کر سکی۔ یہ جاہلانہ اور بے حس دلیل نہایت اشتعال انگیز تھی اور اس غلطی پر مجھے شدید غصہ آیا تھا جو کہ میں اب تک نہیں بھولا ہوں۔ مجھے بڑی حیرت ہے کہ سرحدی گاندھی، خان عبدالغفار خاں نے اس بات کو کیسے برداشت کیا ہوگا؟ کس طرح گاندھی جی نے اس ناقابل معافی سیاسی، نفسیاتی اور سماجی غلطی کو برداشت کیا ہوگا؟ کم سے کم میں پوری زندگی نہیں بھول سکا اور یہ سب باتیں ہوتی رہی ہیں، ایک بار نہیں بار بار۔

اُن اذیت ناک سالوں میں، شاید جانی بوجھی سازش کے تحت، جب ہندو مسلم دونوں آزادی کی جدوجہد میں برابر کے شریک تھے، فرقہ پرستی نے سر اٹھایا اور یک جہتی کے پھول کو کھلنے سے پہلے مسل دیا۔ تقسیم ملک کے بیج ہم لوگوں نے بھی بوئے، جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے آپ کو وسیع القلب اور وسیع النظر کہا کرتے تھے۔ ہمارا ہندوستانی المیہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کے لیے ہم تقدیر یا ستاروں کو یا صرف انگریزوں کے "بٹوارہ کرو، حکومت کرو" کے اصول کو موردِ الزام ٹھہرائیں۔ ہم خود ہی ذمہ دار ہیں ــــ "اے روشنی! تیرے اندر اگر اندھیرا ہے تو پھر کتنی بھیانک تاریکی ہے!"

کلکتہ پریسیڈنسی کالج کے میرے ایک بڑے استاد تھے جن کا نام 'کردولا ذکریا' تھا جن کا تعلق کیرالا سے تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھے نصیحت کی اور بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ انھوں نے کیٹس کا ایک قول دہرایا ــــ "یہاں جہاں آدمی بیٹھتا ہے ایک دوسرے کے درد سنتا ہے تو دکھ سے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، مجھے بھی سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو "نظر انداز" کیا جاتا ہے، مجھے بھی بارش میں "دھنک" دیکھنا چاہیے۔" ان کے ان الفاظ نے میرے دماغ کو جگایا جب کہ میں نے اپنی عمر کے انیسویں سال ہی میں قدم رکھا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان میں یا کسی اور جگہ میں اتنا دکھی ہوا ہوں، میری تمنا ہے کہ

میں طویل عمر کے صدمات سے کسی طرح فرار حاصل کر لوں۔

لیکن خدا کا کرم ہے کہ ہماری نئی نسل ہی میں عظیم انسان بھی ملے ہیں۔ مثال کے طور پر رابندر ناتھ ٹیگور اور مہاتما گاندھی تو گویا کسی دوسرے سیارے کی مخلوق تھے جن کے اندر انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے جہاں تک کہ سیاسی حلقے میں کچھ بہترین لوگ، جن میں بلند و بالا، سرو قامت مسلم امیر خسرو سے لے کر ابوالکلام آزاد تھے۔

میں دو حضرات کی خدمات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ خان عبدالغفار خاں اور ذاکر حسین۔

"مدتوں ہمارے دل کا آشیانہ خالی رہا ہے۔" محمد اقبال نے کہا اور کہا کہ "آؤ نیا شوالہ بنائیں۔" یہ اقبال تھے جنھوں نے پیارا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" یہ یقیناً رابندر ناتھ ٹیگور کے "سنہری بنگال" کے ہم وزن تھا، جس کے سائے میں میری بانہوں کو سہارا ملا"۔ یہ ساری دنیا کے لیے ایک سندیہ تھا کہ "ایک نشیمن کے اندر سب اکٹھا ہو جاؤ۔"

آئیے ہم سلام کریں اور یاد کریں اس عظیم ہستی، ذاکر حسین کو جو زندگی کی جد و جہد میں طرح طرح کے مدّو جزر سے گزر کر آگے بڑھے۔ ان کے نام سے روشنی وابستہ ہے جس کی چمک کبھی مدھم نہیں پڑے گی اور ان جیسے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ جن کے ناموں کی شمعیں جلتی رہیں گی حتیٰ کہ ایک دن سارے آسمان پر شفق پھیل جائے گی۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

ذاکر صاحب . . . جامعہ اور علی گڑھ میں
ایک طالب علم کی یادداشت

دنیا یوں تو ہمیشہ سے بدلتی رہی ہے مگر پچھلے پچیس تیس برس میں جس تیزی کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے بدلی ہے اس کا خیال کر کے اب تو اپنے آپ پر کچھ شک ہونے لگتا ہے۔ وہ سب باتیں جو ہم نے دیکھیں واقعی سچ تھیں یا محض ہماری آرائش خیال ہے۔ وہ لوگ، ان کے قصے، ان کی باتیں، ان کے ہیجے اگر اس دنیا کے تھے تو پھر یہ سب ہوئے کیا۔ لگتا ہے کہ ایک بیتا ہوا یگ ہے جیسے ہم ماضی کے دھندلکوں سے ٹٹول ٹٹول کر جتنا نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی خود پر اعتبار کم ہوتا جاتا ہے۔ تاریخ کی کچھ کڑیاں جیسے ہمارے دیکھتے دیکھتے ٹوٹ گئی ہوں اور ان کے سروں سے کوئی سرا جڑا ہوا نظر نہیں آتا۔ ذاکر صاحب اور ان جیسے لوگوں کا ذکر کرتے وقت ہر وہ بات جو بظاہر صاف ہے دھندلانے لگتی ہے۔ پھر یکایک ان کے وجود کا پھیلتا ہوا سایہ ساری فضا پر چھا جاتا ہے۔ اور یہ راز پھر سے افشا ہوتا ہے کہ ہر زمانہ اپنی اونچ نیچ کے ساتھ آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور اس میں جینے والے لوگ اسی اونچ نیچ سے گزرتے ہوئے ایک نئی دنیا بھی بناتے چلے جاتے ہیں۔ جو ان کے خوابوں کی دنیا سے خواہ کتنی ہی مختلف ہو مگر جب ہر لمحہ ماضی میں دیکھے جانے والے خواب حال کی حقیقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کرتے ہیں تو ٹوٹی ہوئی کڑیاں جڑنے لگتی ہیں۔ یہی چشمک ہے جو آج بھی ذاکر صاحب اور ان کے ساتھ ایسے بہت سے لوگوں کی طرف دھیان دینے پر ہمیں مائل کرتی ہے جن کے لب آج خاموش ہیں مگر جن کی باتیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

ذاکر صاحب کو میں نے پہلی بار کب دیکھا، مجھے یاد نہیں۔ جب دیکھا ہوگا تو اتنا چھوٹا ہوں گا کہ شاید تھوڑے بہت فرق کے ساتھ سب لوگ ایک ہی سے نظر آتے ہوں۔ ہر شخص اس دنیا میں آنے کے بعد جیسے اپنے گھر، محلے اور بستی کے لوگوں کو خود بخود پہچاننے لگتا ہے۔ میں نے بھی بس اسی طرح ذاکر صاحب کو دیکھا اور پہچانا۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ جس فضا میں میں نے آنکھ کھول

وہاں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ برتاؤ انداز گفتگو سب ہی لوگوں کے ہاں پایا جاتا تھا مگر محسوس ضرور ہوتا تھا کہ کسی ایک شخصیت کا اثر زیادہ گہرا ہے۔ بزرگوں کی باتوں میں ان کا ذکر بار بار اور بڑے احترام کے ساتھ آتا تھا، اور میرے والد صاحب کو ان سے جو عقیدت تھی اور خاندان کے سب ہی لوگوں میں ان کا جتنا ذکر رہتا تھا اس کی بنا پر یقین ہے کہ میرے کان ان کے نام سے اور بھی پہلے آشنا ہوئے ہوں گے۔

۴۱-۴۲ء میں، میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسہ ابتدائی کی دوسری، تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ اسی زمانے میں کسی بڑی جماعت کے طالب علم کے پاس ایک چھوٹی سی نوٹ بک دیکھی جس پر وہ کبھی کبھی کسی شخص کے دستخط لے لیا کرتا تھا۔ میری اور میرے ہم عمروں کی سمجھ میں بات نہ آئی، جب یہ سلسلہ کئی بار دیکھنے میں آیا اور دوسروں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک چیز آٹوگراف بک ہوتی ہے جس میں بڑے لوگوں کے دستخط کرائے جاتے ہیں۔ چنانچہ پہلی بار ہم پر یہ کھلا کہ ذاکر صاحب نہ صرف بڑے آدمی ہیں بلکہ ایسے لوگوں میں بھی ہیں جن کے دستخط لے لیے جاتے ہیں۔ میں نے بھی ایک آٹوگراف بک حاصل کر لی اور ایک دن جب ذاکر صاحب کچھ اساتذہ کے ساتھ ہوسٹل کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ ہم آٹوگراف بک لے کر ان کے پاس پہنچ گئے مگر سوچ میں پڑے رہے کہ اب ان سے کیا کہیں؟ جو لوگ ان کے ساتھ تھے انھوں نے کچھ ہمت بڑھائی تو ہم نے آٹوگراف بک ذاکر صاحب کے آگے کر دی۔ انھوں نے کہا: یہ کیا چیز ہے۔ میں نے کہا آٹوگراف بک ہے۔ انھوں نے پوچھا آٹوگراف کسے کہتے ہیں: میں نے کہا اس پر دستخط کر دیجیے۔ یہ تو وہ جانتے ہی تھے کہ ہم بے سوچے سمجھے اس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ میری حالت دیکھی تو سوالات کی بوچھار کر دی۔ "آپ میرے دستخط کا کریں گے کیا؟" "میرے دستخط کیوں لے رہے ہیں۔ مجھے اپنے دستخط کیوں نہیں دیتے۔" "اور جو لوگ یہاں ہیں، ان کے بھی تو دستخط لیجیے!" میں چپ کھسیانی ہنسی ہنستا رہا۔ اور وہ ہماری بے بسی سے لطف لیتے رہے۔ پھر دستخط کر بھی دیئے مگر یہ کہتے ہوئے ساتھ کہ "کبھی سوچنا کہ تم نے یہ کیوں کیا!" میری یادداشت میں یہ پہلا سابقہ تھا جو ان سے پڑا۔ اور بات بھی بظاہر چھوٹی سی تھی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ بات بھی عیاں ہو گئی کہ ذاکر صاحب کے تصورات اور جامعہ کے ماحول میں سوال و جواب کی ہی دراصل اہمیت تھی خود سوچنے اور بزرگوں کے سامنے بے جھجھک اپنی بات کہنے پر اکسانا، آزادانہ بحث و مباحثے کی ترغیب دینا، جامعہ کی زندگی کا معمول تھا۔ جامعہ محض تعلیمی ادارہ تو تھی ہی نہیں۔ یہ ایک تہذیب اور فضا تھی جس کی آہٹ سننے والوں نے اس وقت سنی ہو گی جب ایم۔ اے۔ او کالج کے نوجوانوں نے سامراج کے مفادات پر مبنی نظام تعلیم کے ڈسپلن کو توڑ کر ایک نئی قسم کی ڈسپلن کی ابتدا کی تھی جس کے مطابق دنیا میں ترقی کا تصور حکومت وقت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچنا نہیں بلکہ اس کے

ضابطوں کو توڑ کر خود کو بالکل نئے طرز پر منظم کرنا تھا۔ جامعہ کے طالب علموں اور ان کے والدین کو یہ تو داخلہ سے پہلے ہی معلوم ہو جانا تھا کہ یہاں پڑھ چکنے کے بعد سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہو جائیں گے۔ چنانچہ انھیں جینے کا کوئی اور ہی ڈھنگ سیکھنا ہوگا، مگر جینے کا ڈھنگ سکھانے والے ذاکر صاحب، مجیب صاحب، عابد صاحب، شفیق صاحب اور اسلم جے راج پوری جیسے لوگ بھی ہوں گے۔ یہاں انھیں مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں، ابو الکلام آزاد، گاندھی، نہرو اور بادشاہ خاں جیسے سیاسی رہنماؤں اور اقبال اور پریم چند جیسے لازوال مصنفوں سے وقتاً فوقتاً ملنے اور بہت کچھ پانے کی سعادت نصیب ہوگی۔ جلیانوالا باغ کی یاد میں پورا ایک دن وقف ہونا مکمل آزادی کے مطالبے کے بعد ہر سال ۲۶ جنوری کو یوم آزادی کے طور پر شان وشوکت سے منانا۔ گاندھی جی کے برت ستیہ گرہ اور رہنماؤں کی گرفتاری پر احتجاجی جلسے کرنا، قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اہم ترین شخصیتوں کی تقاریر کرانا سیاست ادب اور ثقافت کے ہر شعبے میں باغیانہ رجحان رکھنے والے مشاہیر کو مدعو کرنا اور طلبہ اور اساتذہ کا ان سے قریب آنا یہ سب کچھ روایتی طرز کے تعلیمی اداروں کے آداب سے مختلف تھا۔ آزادی سے پہلے کی جامعہ جنگ آزادی کا ہی ایک محاذ تھی اور آزادی کے بعد بھی اس نے تاریخ ساز کام انجام دیا۔

تقسیم ہند سب کے لیے ایک آزمائش کی گھڑی تھی۔ ذاکر صاحب خود قاتلوں کی گرفت سے نکل کر آئے تھے۔ ان کے دوسرے ساتھیوں کے گھر بار لٹ چکے تھے۔ کچھ کی جانیں بھی گئی تھیں۔ قرول باغ میں جامعہ کی عمارتیں کچھ جلیں کچھ لٹ گئیں۔ مگر ذاکر صاحب کی رہنمائی میں جامعہ اور جامعہ کے لوگ اس منزل سے بھی جس شان وشوکت کے ساتھ گزرے وہ ہماری ثقافتی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ جس ادارے اور اس کے افراد کا پچیس برس کا پائی پائی کر کے جمع کیا ہوا اثاثہ خاک وخون کی نذر ہو چکا ہو اور خود اپنے وجود کو باقی رکھنے کی کشمکش میں مبتلا ہو، وہ سب کچھ بھول کر آگ میں کود پڑے اور ہزاروں زندگیوں کو نہ صرف بچا لائے، بلکہ ان کے مستقبل کی تعمیر کا اہتمام بھی کرے اس کا مادی اعتبار سے جو بھی حشر ہوا ہو، اخلاقی اور روحانی دولت سے کس قدر مالا مال رہا ہوگا۔ انتقام کے جذبے سے عاری، خوف وہراس سے آزاد تمام تر رحم اور ایثار! یہ اعلیٰ ترین انسانی منصب تھا جہاں اس دور میں جامعہ اور جامعہ والوں نے خود کو پایا۔ دہلی کے فساد زدہ علاقوں کے پریشان حال لوگوں کو بسانا اور ان کے محلوں میں تربیتی مراکز قائم کرنا، پاکستان سے اجڑ کر آئے ہوئے خاندانوں کے بچوں کی تعلیم وتربیت کی تمام تر ذمہ داری لینا اور ان کے دلوں میں خوف ونفرت کی جگہ محبت واعتماد پیدا کرنا، یہ سب ایسے کام تھے جن کی بدولت آج بھی ہزاروں لوگوں کی زندگی کے بہترین دنوں کی یاد جامعہ سے وابستہ ہے۔

ذاکر صاحب آزادی کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر گئے۔ ہمارا داخلہ بھی علی گڑھ میں ہوا۔ ہم نے سنا تھا کہ یہی وہ جنت ہے جہاں سے نکالے جانے پر کچھ لوگوں نے جامعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ میرے والد بھی ان سب کے ساتھ یونیورسٹی سے نکالے گئے تھے۔ جامعہ کی تاریخ ہی علی گڑھ سے شروع ہوئی تھی۔ اس لیے ہمارا علی گڑھ جانا ایک جذباتی تجربہ بھی تھا۔ وہاں کی فضا جامعہ سے بالکل مختلف تھی، وہ بہت بڑی یونیورسٹی تھی۔ ہزاروں طالب علم، سیکڑوں استاد، دور تک پھیلا ہوا کیمپس، شاندار عمارتیں اور اس پوری بستی میں سب سے اعلیٰ مرتبے پر وائس چانسلر۔ ظاہر ہے یہاں ذاکر صاحب کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے امکانات اب وہ نہیں تھے جیسے کہ جامعہ میں ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ عرصے تک ہم نے انھیں دور دور سے جلسوں میں دیکھا۔ ان کی پُرشکوہ تقریریں سنیں جن میں سے کچھ تو اب یادگار بن چکی ہیں مثلاً لیاقت علی خاں کے انتقال کے بعد ریڈیو پر ان کی تقریر یا پٹیل کی آمد پر جلال سے لبریز ان کی تقریر۔ بہرحال ذاکر صاحب کو بڑا آدمی تو ہم نے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مان لیا تھا۔ اب جو ان کے اردگرد ایک اور ہالہ سا نظر آیا تو ہمیں ان کے قریب پہنچنے میں مدت تک جھجھک ہوتی رہی۔ مگر ذاکر صاحب اپنی مصروفیتوں کے باوجود کبھی کبھی ہوسٹلوں میں لڑکوں کے کمروں میں اچانک خود ہی پہنچ جاتے۔ ایک بار ایس۔ ایس ہال میں ایک سینئر طالب علم کے کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ دیوار پر مدھو بالا کی بہت بڑی اور خاصی شوخ تصویر سجی ہوئی ہے۔ ذاکر صاحب وہیں بیٹھ گئے اور تصویر کے بارے میں پھر فلموں اور اداکاروں کے متعلق ایسے عجیب عجیب سوالات شروع کر دئے کہ بڑے بڑے تیس مار خاں قسم کے سینئروں کے چھکے چھوٹ گئے۔ مگر اتنی دیر میں ان طالب علموں سے وائس چانسلر کا رشتہ بدل چکا تھا۔ ذاکر صاحب میں ظرافت کی حس غضب کی تھی۔ ان کے سامنے لوگ ڈرتے جھجکتے ہوئے جاتے تھے مگر وہ اپنے برجستہ فقروں اور بے تکلف گفتگو سے اس بوجھل فضا کو خود ہی سب کے لیے سازگار بنا دیتے تھے۔ اکثر وہ آنے والے کی صورت دیکھ کر ہی پہچان جاتے تھے کہ وہ کیوں آیا ہے اور موقع ہو تو اس کی حالت سے دل چسپی بھی لیتے تھے۔ مجھے ایک بار یونیورسٹی یونین کا مضمون نگاری گولڈ میڈل ملا جو کنووکیشن کے موقع پر دیا جاتا تھا۔ میرا نام پکارا گیا اور میں ڈائس کی طرف چلا تو ذاکر صاحب کے چہرے پر ان کی خاص مسکراہٹ نظر آئی اور قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ چانسلر صاحب اور معزز مہمان سے میرا تعارف کرا رہے ہیں۔ میں بہت خوش ہوا، انعام لے کر چلا تو آیا مگر دل میں یہ بھی سوچا کہ ذاکر صاحب خوش ہوئے ہیں تو ان کے پاس پھر جانا چاہیے تاکہ کچھ اور داد ملے۔ میں ایک دن ان کے گھر پہنچا، وہ بھی کچھ فرصت سے تھے۔ دیر تک پوچھتے رہے۔ پڑھائی کیسی چل رہی ہے، کورس کے علاوہ اور کیا پڑھتے ہو اور یونیورسٹی کی کن سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہو۔ اور بھی بہت سی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ قائم گنج

کے بہت خوش رنگ و خوش ذائقہ بیر کھلائے ہیں منتظر رہا کہ میرے انعام پانے کا ذکر بھی تو آئے۔ جب دیر ہو گئی اور مایوس ہو کر اٹھنے لگا تو پوچھا کیا اس مقابلے میں اکیلے تم ہی پہنچے تھے، تمہیں انعام کیسے مل گیا

علی گڑھ کی زندگی میں اسٹوڈینٹس یونین کی خاص اہمیت تھی۔ اس کے جلسوں کے علاوہ بھی مختلف انجمنوں کی علمی و ادبی محفلیں آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ اس زمانے میں اسٹوڈینٹس فیڈریشن اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ ان کے ممبروں کی تعداد تو بہت زیادہ نہیں تھی مگر یونیورسٹی کی زندگی پر ان کا گہرا اثر تھا۔ ان کے کاموں کے باعث بھی اور مخالفین کی مخالفتوں کی وجہ سے بھی۔ میں ان میں شروع سے ہی دل چسپی رکھتا تھا ایک بار یونیورسٹی کے ایک جلسے کے بعد چائے ہو رہی تھی۔ ذاکر صاحب موجود تھے۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ انھوں نے پوچھا آج کل کیا کر رہے ہو۔ جواب بنا بنایا پہلے ہی سے میرے پاس موجود تھا۔ امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔ کہنے لگے "آپ نے کارل مارکس کو پڑھا ہے" اس سے پہلے کہ میں منہ کھولوں، بولے "دیکھیے، نہ پڑھا ہو تو مت کہیے گا کہ پڑھا ہے، بہر حال پڑھ لیجیے گا، مگر میں آپ کو بتاتا ہوں اس نے لکھا ہے کہ انقلاب دنیا کی تقدیر ہے۔ ارتقا کی ایک منزل پر اسے آنا ہے اور وہ ضرور آئے گا۔ آپ اگر امتحان میں پاس ہو گئے تب بھی وہ رکے گا نہیں، اس لیے فیل ہونے کی تیاری مت کیجیے گا"

ذاکر صاحب ملک کے اعلیٰ ترین منصب پر پہنچنے کے بعد بھی ایک مثالی استاد کی شان سے رہے۔ وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی موجودگی سے دھیرے دھیرے فاصلے کم ہوتے جاتے۔ وہ سب کو کھل کر اپنی بات کہنے پر اکساتے اور یہی ملاقاتیں اور باتیں چھوٹوں کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بنتیں۔ نائب صدارت کے زمانے میں ایک بار انھوں نے کچھ لوگوں کو اپنی رہائش گاہ پر مدعو کیا۔ کھانے کے دوران اور اس کے بعد دیر رات تک باتیں ہوتی رہیں۔ انھیں ایبسٹریکٹ آرٹ سے خاص دل چسپی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بڑے اہم مصوروں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ تصویر جو ستیش گجرال کی بنائی ہوئی تھی، گفتگو کا موضوع بن گئی۔ ذاکر صاحب نے اس کے بارے میں سب سے الگ الگ پوچھا۔ زیادہ تر لوگوں پر اس کا وہ تاثر نہ ہوا جو ذاکر صاحب پر تھا۔ چنانچہ جدید مصوری پر بحث کے دوران گرمی آ گئی۔ ذاکر صاحب کہنے لگے کہ آپ لوگ صرف لفظوں کے مارے ہوئے ہیں۔ اظہار کے دوسرے وسائل سے بالکل غافل۔ رنگوں، لکیروں، آوازوں کے بھید سمجھنے کی کوشش بھی کیا کیجیے۔ بات ان کی بالکل درست تھی مگر اسی دوران میری زبان سے کوئی ایسی بات نکل گئی جو ذرا گستاخانہ تھی۔ ذاکر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا، خود میں بھی ٹھٹھک گیا۔ ایک لمحے بعد ذاکر صاحب نے کہا، آپ اپنی رائے پر ضرور پُر زور اصرار کیا کریں، مگر

دوسروں کی رائے کا احترام بھی لازم ہے۔ اختلاف کو بھی سمجھنے کی کوشش کیا کیجیے اس کے بغیر کوئی کسی سے کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ ہی کی بات صحیح ہو مگر لازم نہیں۔ اس رات کی طویل نشست کا ایک ایک لمحہ اور ہر ہر بات آج تک دل پر نقش ہے۔

دراصل ہندوستانی تہذیب میں استاد اور گرو کا جو روپ اور رتبہ رہا ہے وہ ذاکر صاحب کی شخصیت میں پورا کا پورا موجود تھا اور شاید یہی سبب تھا جمہوریہ ہند کی صدارت کے لیے ان پر نظر انتخاب پڑنے کا۔ وہ اس معزز ترین منصب پر سیاست کے ذریعے نہیں علم کے راستے سے پہنچے تھے۔ اور یہی اعزاز تھا ان کا بھی اور ان کے عہدے کا بھی۔

ایک دن پیغام پہنچا کہ ذاکر صاحب نے بلایا ہے اسی وقت چلے آؤ۔ ہم نے سوچا نہ جانے کیا آفت آنے والی ہے فوراً ان کی خدمت میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک جرمن بزرگ ان کے پاس بیٹھے ہیں۔ جو آنکھوں کے امراض کے ماہر ہیں اور یونیورسٹی کے امراض چشم کے شعبے میں کچھ عرصے رہیں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں ذاکر صاحب نے مجھے ان کے حوالے کر دیا کہ وہ میری آنکھوں کا علاج کریں۔ انھوں نے مجھے اپنے Clinic میں دو ایک بار دیکھا بھالا اور پھر آپریشن تجویز کر دیا۔ پتہ چلا کہ علی گڑھ کے مشہور موہن لال اسپتال میں کمرہ اور آپریشن کی تاریخ سب کچھ طے ہو چکا ہے مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ آپریشن سے کون نہیں ڈرتا۔ اور مجھ پر تو یہ بپتا پہلی بار پڑی تھی چنانچہ میں نے ٹالنا چاہا۔ اور ذاکر صاحب کے پاس جا کر فریاد کی میری والدہ دہلی میں ہیں، کسی کو اطلاع نہیں کی ہے۔ اسپتال میں کئی دن رہنا ہوگا کسی کو ساتھ ٹھہرنا پڑے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب کا موڈ کچھ خراب رہنے لگا تھا۔ اس دن وہ یونیورسٹی کی ایکزیکٹو کاؤنسل کی میٹنگ سے آئے تھے اور بھرے بیٹھے تھے۔ میری باتیں سننے کے بعد بولے "جی ہاں، میں آج کل زیادہ تر باتیں غلط ہی کہتا ہوں۔ مگر آپ آج اسپتال میں داخل ضرور ہو جائیں۔ کل آپریشن ہو جائے گا" چنانچہ ان کے حکم کے مطابق آپریشن بھی ہو گیا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ بے ہوشی کی دوا کا اثر دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا کہ معلوم ہوا ذاکر صاحب ڈاکٹر موہن لال کے ساتھ آئے ہیں۔ آپریشن کا حال تو انھیں معلوم ہی ہو گیا تھا مجھے دیکھ کر ہنستے ہوئے بولے "حضرت ان حالات میں تو صرف شاعری کی جاتی ہے۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔ اور آپ بھی ایک آدھ دن میں یہی کر رہے ہوں گے۔"

راشٹرپتی ہونے کے بعد ایک بار ایک جلسے میں شرکت کے لیے جامعہ آئے۔ جلسے کے بعد میں ملنے کے لیے پہنچا۔ پوچھنے لگے "تم آج آئے نہیں" میری سمجھ میں بات نہیں آئی تو پھر بولے "تم نے آج صبح مجھ سے ملنے کے لیے وقت لیا تھا تم آئے نہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے تو وقت نہیں لیا تھا مجھے معلوم تھا کہ آپ آج یہاں آنے والے ہیں۔ کہنے لگے "بہر حال یہ بھی اچھا ہوا۔ آج Appointment کی ڈائری آئی تو مجھے لگا کہ تمہارا نام ہے، اس وقت ایک صاحب

ملنے بھی آئے، میں سوچتا رہا کہ کسی کی بھی وضع قطع اچانک اتنی کیسے بدل سکتی ہے۔ پھر ہنستے ہوئے کہنے لگے، خیر وہ صاحب جو بھی ہوں میں نے انھیں محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں پہچان نہیں رہا ہوں۔"

علی گڑھ میں میرا انٹرمیڈیٹ کا امتحان شروع ہوا تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ذاکر صاحب کو خبر ملی انھوں نے میرے ماموں اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب کو اطلاع کی، جو میرے سرپرست اور کیمسٹری کے شعبے کے صدر تھے۔ ان کے ساتھ میں ذاکر صاحب کے گھر پہنچا، تو ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب اور رشید احمد صدیقی صاحب بھی موجود تھے۔ ابھی تک مجھے صرف والد صاحب کے حالت کے خراب ہونے کی خبر دی گئی تھی۔ راستے میں ذاکر صاحب نے مجھے انتقال کی خبر سنائی اور پھر انھوں نے جو کچھ کہا کچھ ایسا تھا کہ آج تک وہ لمحے بار بار واپس آتے ہوئے لگتے ہیں۔ انھوں نے کہا اب تمہارے امتحان کا دوسرا پرچہ ہونے والا ہے۔ تم سب سے بڑے بھائی ہو۔ سب کہیں گے کہ ان حالات میں کیا امتحان دوگے۔ تمہارا بھی جی چاہے گا کہ اس وقت اپنی ماں اور بہن بھائیوں کو نہ چھوڑو۔ مگر کیا تم ابھی سے حادثات کے آگے ہار ماننے لگو گے۔ ظاہر ہے یہ بڑا حادثہ ہے۔ سب رو رہے ہوں گے اور تمہیں دیکھ کر اور بھی روئیں گے مگر تمہیں جتنا رونا ہے ابھی رو لو، وہاں پہنچ کر تمہیں رونا نہیں ہے۔ تم سب کو سمجھاؤگے، ڈھارس دوگے اور میرے ساتھ واپس جا کر کل ہی امتحان دوگے۔" میں اگلے روز جب امتحان دینے کے لیے ہال میں وقت پر پہنچا تو میرے ہم جماعتوں اور استادوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور آج تک پرانے دوست جب اس بات کا ذکر کر کے حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ تو آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ ایک غرور امڈ آتا ہے کہ ہم نے بھی کیسے کیسے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔

چترا نائک

ڈاکٹر ذاکر حسین کی تعلیمی خدمات

بیسویں صدی کی دوسری دہائی دو وجوہات کی بنا پر قابل ذکر مانی جاتی ہے ایک تو اس نے عالمی جنگ کے تباہ کن اثرات مغربی سوسائٹی پر چھوڑے اور ایسی جماعتیں ابھر کر آئیں جنھوں نے اصلاحی، سیاسی اور معاشی فلسفہ سامنے رکھا، جس نے غیر مستحکم شخصی اور معاشرتی ترقی پر بہت زور دیا۔ ۱۹۱۸ء کا دور پُر آشوب دور تھا جب ذاکر حسین ایک طالب علم تھے اور اپنے سائنسی نصاب کو تبدیل کر کے انگریزی، فلسفہ اور علم اقتصادیات میں سند حاصل کرنے والے تھے۔ عالمی جنگ اسی زمانے میں ختم ہوئی تھی اور اپنے ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے مضامین کا انتخاب کر کے ۱۹۱۸ء میں پہلی ڈگری لی اور عالمی جنگ اسی زمانے میں بند ہوگئی تھی۔ نوجوان ذاکر حسین نے مشرق اور مغرب کے درمیان ذہنی اور فراستی راہوں کا انتخاب کیا۔ اُن میں کتنا تضاد اور تناسب ہے اور انھوں نے ترقی کے لیے کون سے کارہائے نمایاں انجام دیئے، اس کا پورا اندازہ لگایا۔ ان کے ذہین دماغ نے محض مختلف تہذیبی پہلوؤں سے نہیں سوچا۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی یونین کے مباحثوں میں بولے اور اپنے فنِّ تقریر کو مع دلیلوں کے نکھارا اور دوسری دلچسپیوں میں حصہ لیا، تاکہ بہتر سے بہتر طور پر دوسرے انسانی مسائل کو سمجھنے کا سلیقہ آجائے۔ خاص طور سے جس کا تعلق انسان سے ہو۔ دس سال کا وہ شورش انگیز دور تھا جب مہاتما گاندھی نے ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کی اہنسا اور عدم تعاون تحریکیں چلائی تھیں ۱۹۲۰ء میں ذاکر صاحب نے کالج کی تعلیم ختم کی تو تحریک عدم تعاون پورے طور پر پھیل چکی تھی۔ گاندھی جی، لالہ لاجپت رائے، اینی بسینٹ، پٹابھی سیتا رمیّا، مولانا آزاد، علی برادران اور دوسرے قومی رہ نماؤں نے اساتذہ اور طلباء کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ حکومت کے امدادی اسکولوں کو چھوڑ کر، نئے جو قومی اسکول و کالج قائم ہوں، ان میں جائیں۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے علی گڑھ کا دورہ کیا اور علی گڑھ کو قومی ادارہ بنانے میں مدد دی۔ اس طرح کامیابی نہیں ملی تو ایک نئی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ (قومی مسلم یونیورسٹی)، علی گڑھ میں قائم کی گئی۔ جامعہ کی اس رہ نمائی نے ملک کی دوسری ریاستوں کو

یہی راستہ دکھایا اور اس پر عمل کیا گیا۔ اس طرح چار ماہ کے اندر اندر گجرات ودّیا پیٹھ، بہار ودیا پیٹھ، کاشی ودیا پیٹھ ان کے علاوہ اور بھی بڑی تعداد قومی اسکولوں کی قائم ہو گئی۔ اس نمایاں اختراع نے ملک کو غیر ملکی حکومت سے آزادی کا ایک اور نیا راستہ دکھایا۔ ذاکر حسین ملک کی آزادی کے لیے پہلے ہی بلاوے پر فوراً تیار ہو گئے اور جامعہ کے ادارے میں شامل ہو گئے جو کہ مسلم ادارہ تھا مگر بنیاد اس کی ہندوستانی قومیت پر تھی۔

ان کی زندگی کا یہ ایک نیا موڑ تھا کہ جب تعلیم کی پُرزور حمایت سماجی تبدیلی اور انسانیت کی مکمل بہتری کے لیے سخت ضروری تھی۔ اس دوران یہ نظریہ یقین کلّی بن گیا۔ ۱۳ مئی ۱۹۶۷ء میں ذاکر حسین نے صدر جمہوریۂ ہند کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر میں کہا:

"یقیناً لگاتار تجدید قومی تہذیب اور قومی کردار کے نشو و نما کے لیے نہایت ضروری ہے۔ تعلیم کا فرض منصبی بنتا ہے کہ وہ لگاتار تجدیدیت کی اعانت کرے۔ اس جسارت کی معافی چاہتے ہوئے میں کہوں گا اس اعلیٰ عہدے کے انتخاب میں بہت نہیں تو کم سے کم مقصد مدنظر رکھ کر میرے حق میں فیصلہ کیا ہے کہ میرا تعلق عوام سے ایک معلم کی حیثیت سے عرصۂ دراز سے رہا ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تعلیم کی اچھائی اور قوم کی خصوصیت قومی مقصد کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔"

ذاکر حسین کے لیے تعلیم علیحدہ سے کوئی کام نہیں ہے جو ماضی۔ حال۔ اور مستقبل کی قومی زندگی سے علیحدہ ہو۔ انھوں نے تعلیم کو ایک تحریک سمجھا جو قومی اصلاح کے لیے ایک فائدہ مند اور بھرپور طاقت ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ان کا تعلیمی تصور یہ تھا کہ تعلیم ہمیشہ تبدیل پذیر، ہمیشہ قابل قبول اور ہمیشہ آزادانہ بہاؤ کی محرک رہی ہے جس نے انسان کی مادی اور روحانی ڈھانچے کی تشکیل کی ہے۔ تعلیم نے انسانی کارکردگی نے 'کام اور کلچر نے' سائنس اور فلسفہ، ادب و حرفے میں بہت متوازن طریقے سے ہر جگہ، ہر مشکل میں انسانی ربط قائم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ جس تیزی سے آگے بڑھی اور دوسرے ادارے جو دوران تحریک عدم تعاون میں وجود میں آئے، اتنا آگے نہ بڑھ سکے۔ خود انتظامی، حرفے کے کام، ماحولیات میں دل چسپی، محنت سادگی اور ذہانت جامعہ کے تعلیمی کاموں کی خاص پہچان ہے۔ عملہ مختلف مذاہب پر مشتمل تھا۔ اس کے سارے اراکین بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ ان سب لوگوں نے برائے نام تنخواہیں لے کر کام کیا اور طلباء کے سامنے قربانی اور قومی آزادی سے وابستگی کی مثال پیش کی، اور اس سلسلے میں پہل ذاکر حسین اور ان کے رفیق دوستوں نے کی۔ آج ان لوگوں کو یاد رکھنے اور موجود اساتذہ کے سامنے مثالی پیکر بنا کر پیش کرنے کی ضرورت ہے، جو آج کل اپنے ملک کی خدمت کے بہترین مواقع فراہم کرنے سے زیادہ اونچی تنخواہوں کی توقع رکھتے ہیں۔

جب جامعہ دہلی منتقل ہوگئی تو اس کا اپنا الگ ایک نظریہ محکم تھا۔ اپنے قیام کے لیے اسے خاصی قربانی اور سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جامعہ کے ممتاز اور اپنے کو وقف کر دینے کا جذبہ رکھنے والے اساتذہ کا حلقہ تھا جس نے ذاکر حسین کی قیادت میں جدوجہد کی اور مشکلات پر قابو پایا۔ آخر کار کامیابی ہوئی۔ جامعہ کے قیام کے بعد یہ ذاکر حسین کی جرمنی کی تعلیم کا اثر تھا جس نے ان کے تعلیمی تصور کو ایک خاص شکل دی۔ جنگ کے بعد جرمن میں دانشوروں کو تنقیدی نظریہ کی ضرورت تھی۔ مادیت اور قومی محبت تباہ کن لڑائی کا سبب بنے مشرقی تہذیب کی تحقیق پر غور کیا جا رہا تھا، فلسفیانہ ضابطوں پر نظر ثانی کی جا رہی تھی، مذہب، معاشیات اور سیاست کے درمیان جو گتھیاں تھیں ان کو سلجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ نادیبی تحقیقات کو بڑھا وا دیا جا رہا تھا۔ ذاکر حسین کے اس رجحان کے بہت لوگ گرویدہ ہو گئے۔ ان کے چوکنا دماغ نے انسانی معاملات کے روایتی اور جدید خیالات کا تجزیہ کرنا سکھا دیا تھا۔ "مشرقی اور مغربی تعلیم کے مقصد اور تعلیم یافتہ لوگوں کی سماجی ذمہ داری" اس موضوع پر انھوں نے بحث اور مباحثوں کی شکل میں اپنے دوستوں سے تبادلۂ خیالات کیا اور اکثر وبیشتر جامعہ میں مقیم اپنے دوستوں سے خط وکتابت کی۔ اس تبادلۂ گفتگو نے نہ صرف ان کے خیالات کو روشن کیا بلکہ تعلیمی نظام کو ایک نئی شکل بھی دی۔ "برٹرینڈ رسل کی کتاب "از سر نو سماجی تعمیر کے اصول" پڑھ کر وہ بہت متاثر ہوئے اور کسی قدر جارج کرشنٹنر کے فلسفے نے ان کو متاثر کیا کہ کاموں کے ذریعے تعلیم پر زور دیا جائے۔ بلکہ کرشنٹینر نے تعلیمی مسائل کو ایک صنعتی سوسائٹی اور سماج کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا نظریہ خیال ظاہر کیا۔ ذاکر حسین نے ہندوستان کی 'اگریرین' سوسائٹی کی نئی زندگی کے معاشی اور جدید ترقی اور بڑھاوے میں ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس سوچ میں تھے کہ تعلیمی کاموں کے تصور کو کس طرح اپنے ملک میں رائج اور مقبول بنایا جائے۔

ان کو ایک سنہری موقع مل گیا۔ جب گاندھی جی نے سبق دینا شروع کیا کہ کام ہی تعلیم ہے اور کام کے ذریعے سیکھنے والے کی ذہنی نشوونما اور تخلیقی بارآوری کے ذریعے ہی متحرک بنایا جا سکتا ہے۔ گاندھی جی اور کرشنٹینر دونوں کو یقین تھا کہ کام کا تجربہ بچوں میں نہ صرف جستجو اور کارآمد تخلیق کا جذبہ پیدا کرتا ہے بلکہ شخصیت اور ذہنی رکھ رکھاؤ سکھاتا ہے۔ گاندھی نے کچھ اصولوں کا نظریہ پیش کیا، جو ۱۹۲۱ء میں جاکر "واردھا سکیم" کا بنیاد بنا۔ ذاکر حسین نے تعلیم کے بعد باقاعدہ طور پر ضابطگی کی۔ گاندھی جی نے "ینگ انڈیا" (۱۹۱۹ء-۱۹۲۲ء) صفحہ ۵۰-۴۹) میں لکھا:

"ہمارے جیسے غریب ملک میں کہیں نہ کہیں کوئی بنیادی غلطی ضرور ہے والدین کو بچوں کو بڑا ہو جانے کے بعد بھی ان کی کفالت کرنا پڑتی ہے، ان کو مہنگی اور اعلیٰ تعلیم دلاتا

پڑتی ہے جب کہ بچوں سے باہمی امداد کا سوال تو ہے ہی نہیں۔ مجھے بچوں کی کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ ابتدائے تعلیم ہی سے وہ کام کر کے رفتہ رفتہ وہ اپنے والدین کی مدد کر سکتے ہیں۔ یہ سکیم آزاد خیال تعلیم کو نظرانداز نہیں کرتی، بلکہ برخلاف اس کے ہر لڑکے اور لڑکی اس تک پہنچ آسان ہو سکتی ہے اور اس طرح ادبی تربیت کو اس کے اصل معراج تک پہنچا سکتی ہے۔ اس تعلیم کو بنیادی طور پر ذہنی اور تہذیبی طریقے اپنا کر اور اپنی روزی کا ایک بالواسطہ طریقہ بنایا جا سکتا ہے۔"

۱۹۳۷ء میں جب سات صوبوں میں کانگریس حکومت اقتدار میں آئی تو اسے ابتدائی تعلیم کو طریقۂ کار بنانا اور اس کے لیے باقاعدہ ایک باضابطہ پروگرام بنانا تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ گاندھی کے نظریۂ بنیادی تعلیم بہت سے دانشوروں اور ماہرین تعلیم کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ ماہر تعلیم مبصروں کی ایک کانفرنس بلائی گئی جو اس نوعیت کے تصورِ تعلیم اور اس کو کس طرح سے رائج کیا جائے کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر سکے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء واردھا میں فوراً ایک اور کانفرنس بلائی گئی۔ اس کانفرنس میں ذاکر حسین کی زیرِ صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو ایک مفصل نصابِ تعلیم کو تشکیل دے سکے۔ دو ماہ کے اندر ذاکر حسین کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی، جس میں ماہرِ تعلیم اشخاص کی تجاویز کی تفصیلات دی گئی تھیں، تعلیمی اصولوں اور نفسیاتی بنیادوں پر روشنی ڈالی گئی تھی مفصل فن حرفہ اور اس سے اخذ کی گئی عملی تعلیم کی تحقیق سے متعلق نصاب تشکیل کیے گئے۔ جس کے نتیجے میں "وار دھا کانفرنس میں ذاکر حسین رپورٹ" بنیادی نظریۂ تعلیم اور عمل پر ایک مستند دستاویز قرار دی گئی۔

۱۹۶۷ء، تریوندرم میں منعقد "کل کیرالا استاد۔ ماہرین تعلیم جماعت" کے ریاستی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے ذاکر حسین نے کہا کہ بنیادی تعلیم کی حمایت ان کے بہت سے مقاصد میں سے ایک ہے۔ جو سماجی ضروریات اور مسائل سے متعلق اساتذہ کے ضمیروں کو جگائے۔ اقتباس کے طور پر:

"مجھے بنیادی تعلیم کا پدرِ محترم کہا گیا ہے لیکن قبل از وقت بچے کی ولادت کی ولدیت سے وابستگی میرے لیے کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ہر انسان اپنی سی کوشش ضرور کرتا ہے۔ میرے خیال میں بنیادی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ ایک بار میں نے کسی کانفرنس میں کہا تھا کہ بنیادی تعلیم ناکام ہو گئی ہے یقین جانیئے جو لوگ اس تعلیم کے خلاف تھے بے حد خوش ہوئے کہ یہ شخص خود اپنی ناکامی تسلیم کر رہا ہے لہٰذا بنیادی تعلیم کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ جب کہ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا بنیادی تعلیم غلط نہیں ہے یقیناً عنقریب مستقبل میں ہمارا ملک اس تعلیم کو تسلیم کرے گا۔ ہم لوگ جس طرح کی

تعلیم دیتے آئے ہیں اور جس کے ہم عادی ہو گئے ہیں وہ ـــــ " اسکول کی کتاب " ـــــ اور یہ تعلیم طالبِ علم کو لوگوں کی زندگی سے علیحدہ کر دیتی ہے ۔ ذاکر حسین کی دلیل یہ تھی کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ جب کئی لاکھ لوگوں کو تعلیم دینے کا سوال ہو جو اعلیٰ عہدے بھی حاصل کریں اور یقیناً چند عالی دماغ لوگ پیدا بھی ہوئے جن پر ہندوستان کو ناز ہے لیکن جب کئی کروڑ لوگوں کو تعلیم دی جاتی ہے تو پھر ہر ایک سے یہ توقع نہیں کی جاتی ہے کہ وہ اپنے " کام " سے توجہ ہٹا کر فلسفے اور ادب پر توجہ دے ۔ ہمارے معاشرے کو ضرورت ہے کسانوں کی منعت کاروں کی، تیکنکی لوگوں اور تاجروں کی ۔ ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہو کہ جہاں ہر شخص کے سامنے تعلیمی اور سماجی مقاصد ہوں ۔ ذاکر حسین نے اپنے خاص علمی انداز میں بات کی وضاحت کی کہ آدمی سب سے پہلے فلسفی نہیں بنا، پہلے اس نے کام شروع کیا ۔ آدمی بنیادی طور پر اپنے قوتِ بازو سے کچھ پیدا کرتا ہے وہ ایک طفیلی پودا نہیں جو دوسروں کی محنت پر پنپتا ہے ۔ انھوں نے کہا " اگر بنیادی تعلیم سنجیدگی سے دی گئی ہوتی اور اس کے بعد ناکام ہو گئی ہوتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں گیا " وہ بنیادی تعلیم کے سلسلے میں ہمدردی رکھنے والوں کی صرف زبانی جمع خرچ سے خوش نہیں تھے اور انھوں نے کہا ـــــ " مجھے معلوم ہے کہ کچھ ریاستوں میں اسکول محض ایک حکم جاری ہونے پر بنیادی اسکولوں میں تبدیل کر دیئے گئے ہیں نے وہ بنیادی اسکول بھی دیکھے ہیں جہاں روئی کاتنے کے چرخے پانچ سال تک گودام میں پڑے رہے اور باہر نہیں نکالے گئے " تب میں نے پوچھا " کیوں " ـــــ تو انھوں نے کہا کہ یہاں روئی نہیں ہے لیکن کسی نے توجہ ہی نہیں دی ۔ جب روئی کاتنے کے چرخے مہیا کیے گئے تو یہ کیوں نہیں سوچا کہ سوت نہیں ہے ۔

جب اس صورتِ حال کا تجزیہ کیا تو انھوں نے سوچا کہ ہندوستانی نظام میں جو کمی ہے وہ ہے " پیشہ ورانہ عقیدہ " وہ جس طرح سوچا کرتے تھے کہ ـــــ " اس ملک میں نصاب وہ لوگ بناتے ہیں جو دفتروں میں بیٹھے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی تو ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ چاہے انھوں نے پچھلے بیس سالوں سے کچھ نہ پڑھایا ہو ۔" دراصل انھوں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ " کام " کرو اور آگے بڑھو اور ان کی آراء کا وزیر تعلیم اور اس محکمے کے نگراں اور ڈائرکٹرز کو احترام کرنا چاہیے ۔ لیکن انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا کہ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں، پہلے ہی ماہرین تعلیم کے احکام جاری کیے گئے ہوں، وہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہیں اس لیے کہ ان کو بنانے میں انھوں نے کوئی حصہ ہی نہیں لیا ۔ ظاہر ہے جب اس قسم کے احکام عمل میں لانے کی بات ہوتی ہے تو ان کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور نہ پابندی ۔

بنیادی تعلیم کی فکر کے ساتھ ساتھ، ذاکر حسین کو اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کی بھی فکر تھی۔ مدورائی یونیورسٹی کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت انھوں نے اسی بات پر کافی زور دیا تھا کہ تمام یونیورسٹیز کو چاہیے کہ وہ ماضی کو بھول جائیں جہاں خارجی اور آخری امتحانات ہوا کرتے ہیں۔ اس قسم کی اعلیٰ تعلیم صرف ایک اوسط درجے کے طالب علم کی سربراہی کرتی ہے جو صرف "کامیاب" ہونا چاہتا ہے اس کی جدوجہد کو اجاگر نہیں کرتی۔ وہ چاہتے تھے تمام یونیورسٹیز اس رویہ کو بدلیں اور "قوم کے ضمیر" کہلائیں۔ ۱۹۶۸ء میں اتکل یونیورسٹی کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اشارہ کیا کہ ہندوستان زبردست تہذیبی، معاشی، سیاسی اور سماجی تناؤ اور دباؤ کے دور سے گزر رہا ہے۔ یہ چیز اس بات سے نمایاں ہوتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں پہلی نسل کے تعلیم یافتہ لوگوں کو نظر انداز کیا گیا، اس بات کی ضمانت نہیں لے سکتے کہ سندیں نوکری مہیا کریں گی، گرتے ہوئے معیاروں اور طلباء واساتذہ کے درمیان فاصلے کم کریں گی۔

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ آج سے تیس سال پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین نے اعلیٰ تعلیم کے اصول بتائے تھے وہی آج بروئے کار لائے جا رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یونیورسٹیز معروضی، اعلیٰ اور بے باک ادارے بنیں اور اپنے تعلیمی پروگرام، تحقیق میں توسیع کریں جس کا اہم مرکز ترقی پر مبنی ہو۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف مباحثوں کے ذریعے یونیورسٹیز ایک ایجنڈا بنائیں جو اعلیٰ تعلیم کی بقا کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ذاکر حسین کو یقین کامل تھا کہ تعلیم اسکول کی چار دیواری تک محدود نہیں رہ سکتی۔ تمام موجودہ ذرائع سے سیکھنے پرکھنے کی آزادی، دماغی فراست کو بڑھانے کے لیے، خود اپنے کو تعلیم دینا، تحقیقی اور فلاحی کام کرنا، ذاکر حسین کی تعلیمی فکر و عمل کا کل اثاثہ تھا۔ انھوں نے زور دیا کہ تعلیم کا اہم جُز لوگوں کی تہذیبی میراث کو باشعور بنانا ہے اور یہ بھی بہت ضروری ہے کہ طالب علم کی شناخت بطور انسان پیدا کرائی جائے۔ ان کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا کہ ہندوستان کے موجودہ نظام نے اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے لوگ اپنی اپنی تہذیب کو آنکھ بند کر کے مانتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے کہا:

"وہ نابینا تھے کہ ان کو اپنے ہی فن کی خوب صورتی نظر نہیں آتی تھی، وہ بہرے تھے کہ ان کو خود اپنی موسیقی کی مدھرلے نہیں سنائی دیتی تھی۔ ان کو اپنی زبان اور اپنے ہی ادب سے شرم آتی تھی یعنی — "جو سب ان کا ہے گھٹیا اور کم تر ہے، وہ سب جو غیر ملکی ہے پورا کا پورا عالی اور برتر ہے:" اور انھوں نے دکھ کا اظہار کیا "ہمارے بچے غیر ملکی بنتے جا رہے ہیں اپنے ہی ملک میں، پرائی زبان اپنے ہونٹوں پر لیے، ادھار مانگی

تمنائیں لیے ہوئے۔" بیس سال پہلے ذاکر حسین نے اپنے جس دکھ کا اظہار کیا تھا ہندوستان میں پچھلے چند سالوں سے سامنے آتا جا رہا ہے۔ انھوں نے پیشن گوئی کی تھی کہ ہندوستان کے نوجوان جو ذرائع ابلاغ سے مغلوب ہوتے جا رہے ہیں وہ اپنی زندگی نہیں جی رہے ہیں بلکہ مانگی ہوئی شخصیتوں کی مانند اپنی وراثت سے ناواقف۔ یہ نادان یہ بھی نہیں جانتے کہ کل ان کی زندگی کی کیا شکل ہوگی۔ ذاکر حسین کی دوربین نگاہیں تھیں ایسے مسئلوں پر بھی جن کا تعلق زبان، تعلیم اور لسانیات سے تھا جو تعلیمی اور تہذیبی مسائل پیدا کریں گے۔ مذہب کے بارے میں ان کا بالکل واضح تصور تھا۔ ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ میں منعقد "کل ہند مسلم تعلیمی کانفرنس" میں انھوں نے کہا — "مذہب صدیوں سے ملی زندگی کا اہم نکتہ ہے اس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکا، اس کو برقرار رکھنے کی ضرورت تھی۔ اسی طرح کے دنیاوی مقاصد کے حصول کے لیے وہ تنازع نہ پیدا کرے۔ یا ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں۔ اس دنیا کے جو لوگ ترقی یافتہ ہیں ان کے طور طریقے خاموشی سے اپنا لیے جائیں۔"

علاوہ ازیں زندگی میں سائنسی رجحان ہونا ضروری ہے وہ سمجھتے کہ صرف سیاسی آزادی اور اپنے مذہب پر عمل پیرا رہنا ہی کافی نہیں ہے۔ انھوں نے اساتذہ اور طلباء کو اکسایا کہ وہ اپنا بھی ایک آزاد تصورِ زندگی رکھیں کہ ہر طرح کی چنوتی کو قبول کرنا سیکھیں۔ ان کو پوچھنا چاہیے کہ یہ پہاڑ یہ دریا، یہ سمندر، یہ معدنیاتی خزانے ہمارے جنگلات اور خوشگوار آب و ہوا سب کہاں سے اور کیسے وجود میں آئے؟ کن کن طریقوں سے انسان اور ماحولیات کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ کس طرح سے اپنے تحقیقی رجحان کا رخ 'ادب اور سائنس' اپنی پیداوار اور اپنا پیشہ لوگوں کی مادی اور روحانی طریقوں سے بہتر اور خوش حال بنایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ سائنس اہنسا کا راستہ دکھاتی ہے اور کام ہماری زندگی کی ضرورت ہے۔ انسان کی خوشی اور سکون کے لیے ہمیں ان دونوں کو اختیار کرنا پڑے گا۔

صدرِ ہند کی حیثیت سے ذاکر حسین کی تقریریں ان کے تعلیمی خیال اور اصول جن پر انھوں نے اپنی عوام کے لیے اور اپنی ذاتی زندگی میں بھی عمل کیا۔ انھوں نے کہا: "میں اس بات پر قائم ہوں کہ تعلیم قومی مقصد کا بنیادی اصول ہے اور یقیناً تعلیمی قابلیت قوم کی قابلیت کو نکھارنے میں ایک بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے میں حلف اٹھاتا ہوں کہ اپنے ماضی کی مجموعی تہذیب سے جو جہاں سے اور جس سے بھی ملی ہو۔ اپنے ملک کا وفادار رہوں گا، بغیر کسی لسانی اور علاقائی تفریق کے۔ میں حلف اٹھاتا ہوں ہندوستان کے استحکام اور ترقی کے لیے کام کروں گا اور بغیر کسی مذہبی، عقیدوں، رنگ و نسل کی تفریق کے لیے کام کروں گا۔ پورا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے رہنے والے سارے لوگ میرا خاندان۔"

اس وقت انھوں نے اپنے ملک کے لیے پریشانی کا اظہار بھی کیا:

"ہمارے آگے کام کے تقاضے اس قدر ہیں کہ کوئی بھی بس بیٹھا تماشا نہیں دیکھ سکتا نہیں تو پژمردگی اور مایوسی وبا کی طرح اپنے ملک میں پھیل جائے گی۔ حالات ہم سے تقاضہ کرتے ہیں کام ــــ کام اور صرف کام کا ۔ خاموشی سے کام، خلوص سے کام مگر مضبوطی اور ٹھوس طریقے سے۔ ہمارے لوگوں کی پوری مادی اور تہذیبی زندگی کی از سرِ نو تعمیر کی ضرورت ہے۔"

مختصراً یہ کہ ذاکر حسین کی تعلیمی خدمات، محض لفظوں کا اظہار نہیں بلکہ تنبیہ تھی۔ لیکن جس طرح کی زندگی پر انھوں نے عمل کیا اس سے ظاہر ہے کہ ان کو ہندوستانی لوگوں کی صلاحیت کا یقین کلی تھا۔ دراصل ہر انسان کے لیے ان کا یہی خیال تھا۔ ان کا مقولہ "صرف ایک انسان مکمل طور پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مشترکہ سماجی وجود کے لیے اسے ہندوستانی تعلیمی نظام کی بنیاد پر چلنا ہوگا جو نہ صرف اسے بحال کرے بلکہ از سرِ نو تعمیر کرے۔"

رام کمار

ڈاکٹر ذاکر حسین

اپنی تعلیمی ذمہ داریوں اور آخر کے سالوں میں قوم کے فلاحی کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود آرٹ سے ان کی دل چسپی دیکھتے ہوئے میں حیران ہو کر سوچتا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین جیسا کوئی رہنما ہمارے ملک میں مشکل ہی سے ملے گا۔ اُن سے وابستہ کتنی ہی یادیں اتنے برسوں بعد بھی آج تک دھندلی نہیں پڑیں۔

سب سے بڑی مسرت یہ سوچ کر ہوتی ہے کہ میری پہلی چار پینٹنگز ڈاکٹر ذاکر حسین نے خریدیں۔ غالباً ۱۹۴۸ء کے آس پاس کا زمانہ ہوگا۔ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی میٹنگ میں شملہ آئے ہوئے تھے اور حسنِ اتفاق سے اُن ہی دنوں میری پہلی نمائش شملہ میں ہو رہی تھی۔ ایک شام رِج پر اچانک ہی انھیں جاتے دیکھ کر میں تیز قدموں سے اُن کے پاس پہنچ گیا اور انھیں بتایا کہ تقریباً چار سال قبل دلی اسکول آف اکنومکس میں جب وہ مہمان پروفیسر کی حیثیت سے ہفتے میں ایک بار 'بین الاقوامی تعلقات' پر لیکچر دینے آتے تھے تو ان کے شاگردوں میں سے ایک میں بھی تھا۔ وہ یہ جان کر خوش ہوئے کہ اب میں ماہر اقتصادیات ہونے کے بجائے ایک مصور بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگلے دن وہ نمائش میں آئے اور میری حوصلہ افزائی کی اور پینٹنگز خریدیں۔

اس واقعہ کے بعد جب جب مجھے ضرورت پڑی انھوں نے میری مدد کی۔ اپنے ملنے والوں کو میری پینٹنگز کے بارے میں بتایا اور یہ واقعہ میں بھول نہیں پاتا وہ ۱۹۴۹ء کے ابتدائی زمانہ کا ہے۔ مصوری کے فن سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے میں نے پیرس جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ والد صاحب نے پانی کے جہاز سے ایک طرف کی ٹکٹ کا انتظام کر دیا تھا۔ پاس میں کچھ اور روپے بھی ہونے چاہئیں، یہ سوچ کر میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو ایک خط لکھا جس میں اپنے مسائل کا تذکرہ کیا۔ اُن دنوں وہ علالت کے بعد رام پور ریاست میں وزیر اعلیٰ کرنل زیدی کے گھر پر آرام کر رہے تھے۔ جلد ہی انھوں نے اپنے جواب میں مجھے رام پور آنے کی دعوت دی اور ساتھ میں کچھ پینٹنگز بھی لانے کو کہا تاکہ اگر ممکن

ہو سکے تو وہ اُسے فروخت کروانے کی کوشش بھی کریں گے۔

اسٹیشن پر کرنل زیدی کا ایک کارندہ اپنی گاڑی لے کر مجھے لینے آیا اور ایک دوسرے وزیر کے گھر لے گیا۔ وہاں میرے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا اور رات کو کرنل زیدی کے بنگلے میں کھانے کی دعوت تھی جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین مجھ سے ملنے والے تھے۔ بیماری کے باوجود وہ بے حد تپاک سے ملے۔ میری پینٹنگز کو بغور دیکھتے رہے اور پھر آخر میں مرکزی حکومت کے وزیر جناب ہمایوں کبیر کے نام ایک خط مجھے دیا جس میں حکومت کی جانب سے مجھے مالی تعاون دینے کا اصرار کیا تھا۔ پانچ سو روپیوں کی وہ امداد بھی مجھے اس وقت ایک نعمت معلوم ہوئی۔

میری تصویروں کے لیے ان کا لگاؤ اور ان کی توجہ آخر تک قائم رہی۔ بہار کے گورنر نائب صدر اور پھر صدر بننے کے بعد بھی میں وقتاً فوقتاً ان سے ملاقات کرتا رہا۔ جب پہلی بار ان کے صدر بننے کے بعد میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو وہ ہنس کر بولے "چھوٹے قید خانے سے بڑے قید خانے میں آ گیا ہوں" صدر کی رہائش گاہ کے اندر رسماً انھیں ایسے لوگوں سے بھی ملنا پڑتا تھا جن کی بات چیت میں انھیں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ "کبھی کبھی آپ آتے رہیے جس سے دوسری طرح کی باتیں کرنے کا موقع ملے۔ ورنہ یہاں تو ایک ہی طرح کی بات ہوتی ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔"

ایک بار میں بنارس میں پینٹنگ بنا رہا تھا۔ شاید انھیں یہ بات معلوم تھی۔ وہ ان دنوں بہار کے گورنر تھے اور دلّی سے پٹنہ ریل گاڑی میں جا رہے تھے۔ انھوں نے مجھے اطلاع کیا کہ اگر ممکن ہو تو انھیں بنارس کی کچھ پینٹنگز دکھانے کے لیے میں مغل سرائے آ جاؤں جہاں گاڑی ۱۵ ــــ ۱۰ منٹ رکتی تھی۔ میں اسٹیشن چلا گیا اور پانی کے رنگوں میں بنی چار پینٹنگز لے گیا۔ اُن سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے پینٹنگز بھی دیکھیں اور ایک تصویر اپنے پٹنہ کے گھر کے لیے خرید لیا۔ وہ جانتے تھے کہ ان دنوں پینٹنگز کو فروخت کرنا کتنا مشکل تھا اور ایک بیچ کر دو تین مہینے آرام سے گزر جاتے تھے لہٰذا جب بھی ممکن ہوتا وہ اپنی پسند کی ایک دو پینٹنگز ضرور خرید لیتے تھے انھیں شوق بھی تھا۔ جدید آرٹ سے بھی وہ واقفیت رکھتے تھے۔ جب بھی یورپ جاتے تو میوزیم آرٹ گیلریوں کے چکر ضرور لگاتے تھے۔

کس طرح کی پینٹنگ انھیں زیادہ اچھی لگتی تھی اور کچھ کم، اس کا فیصلہ ان کی گہری سمجھ بوجھ، ان کی سچی دل چسپی، الگ الگ موضوعات پر ان کی معلومات اور گہرے شعور پر منحصر ہوتا تھا۔ عموماً بات چیت میں جدید آرٹ کے بارے میں ان کے خیالات جان کر میں حیران رہ جاتا تھا۔ اُن کا ایک بنیادی نقطۂ نظر تھا۔

ایک شام کو ویسٹرن کورٹ کے ایک کمرے میں بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے کرنل زیدی (جو اُن دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے) کے سامنے تجویز پیش کی کہ انھیں یونیورسٹی میں ایک آرٹ گیلری قائم کرنا چاہیے جس میں طلباء کو پینٹنگز دیکھنے اور انھیں سراہنے کی عادت پڑے۔ کرنل زیدی نے ان کی تجویز فوراً منظور کر لی اور کہا کہ وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے اس کے لیے ایک گرانٹ مانگیں گے۔ میری ایک پینٹنگ بیگم زیدی نے فوراً خرید بھی لی۔ لیکن یہ منصوبہ وہیں ختم بھی ہو گیا کیونکہ کرنل زیدی علی گڑھ یونیورسٹی چھوڑ گئے۔ میری وہ پینٹنگ شاید اب بھی یونیورسٹی لائبریری میں کہیں بھٹک رہی ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ اگر وہ تعلیم اور کلچر کے میدان میں ہی رہتے تو اس کے فروغ میں ان کا تعاون بے حد اہم ہوتا۔ بدقسمتی سے اُن کی ذمہ داریاں قوم کے بڑے مفاد کے لیے بڑھتی گئیں جس کی وجہ سے اُن کے پاس دوسری چیزوں کے لیے وقت ہی نہیں رہ گیا۔ لیکن ان کی قابلیت اور ایمانداری کو دیکھتے ہوئے ہی ان کی خدمات کا تعین کیا گیا۔ پھر بھی اپنے محدود وسائل اور وقت کے سہارے آرٹ اور کلچر کے میدان میں جو وہ کر سکتے تھے، انھوں نے کیا۔

خورشید عالم خاں

خوشبو جو بکھر گئی

ہندوستان کا صدر بننے والی ہستیوں کے کارناموں اور شخصیت کے بارے میں تاریخ جب اپنا فیصلہ سنائے گی تو ذاکر حسین کا شمار اعلیٰ ترین صدروں میں ہوگا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ۸ر فروری ۱۸۹۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد فدا حسین حیدرآباد منتقل ہو گئے تھے اور وہاں کے کامیاب وکیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ ذاکر صاحب اپنے والد کے سات بیٹوں میں سے تیسرے تھے۔

نوجوان ذاکر کو ہر طرح سے وہ تمام بہترین سہولتیں دستیاب تھیں جو اس وقت روایتی اور اونچے طبقہ کے مسلم خاندانوں کو میسر تھیں۔ ان میں انگریزی زبان کا سیکھنا بھی شامل تھا۔ بدقسمتی سے ۱۹۰۷ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ذاکر صاحب کی عمر صرف دس سال تھی۔ چودہ سال کی عمر میں وہ اپنی ماں سے بھی محروم ہو گئے۔ اب ان کا خاندان اپنے آبائی وطن قائم گنج واپس آگیا۔ انھوں نے اٹاوہ کے اسلامیہ اسکول میں تعلیم پائی جہاں اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی الطاف حسین نے اس ہونہار غیر معمولی طور پر ذہین بچے کی تربیت کی۔

ذاکر صاحب نے جن میدانوں میں اہم رول ادا کیا ہے اور جن کاموں کے لیے وہ زندگی بھر وقف رہے۔ وہ ہیں سماج میں نئے رجحانات اور اقدار کو پھیلانا، ملک کے تمام طبقوں میں علم و تہذیب کو فروغ دینا اور زندگی کے نفیس پہلوؤں کے اعلیٰ معیار کی تلاش کرنا اور یہی باتیں ان کی روح کی جستجو اور طلب بنی رہیں۔ انھوں نے پوری زندگی اس ملی جلی تہذیب میں تخلیقی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کی جو اس عظیم ملک کی پہچان ہے۔ جس کا اظہار کثرت میں وحدت اور رنگا رنگی میں یکسانیت کی شکل میں ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ وہ ہوگا جس کی آنکھوں پر اندھیرے کے پردے نہیں ہوں گے اور جو روایتوں کا پرستار نہیں ہوگا اور بے جھجک نئی قدروں اور تصورات کو کھلے ذہن سے قبول کرے گا۔ وہ ایسا شخص ہوگا جو بندھے ٹکے اصولوں سے

پرہیز کرے گا اور اخلاقی اقدار کے لیے جد و جہد کرے گا۔ اقدار کے اس نظام کو وہ اپنائے گا جو اس کے تنقیدی ذہن کو قبول ہوں اور وہ روشن خیال بننے کی کوشش کرے گا۔ انھیں خصوصیات کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلری کی مدت کار کے دوران اور اس سے پہلے بحیثیت جامعہ کے معمار کے وہ بیدار کرتے میں سرگرم رہے۔

ذاکر صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ ہمارا تعلیمی نظام پوری طرح مغرب کے زیر اثر ہے۔ اس لیے انھوں نے اس بات پر توجہ کی کہ ہمارے اعلیٰ تعلیم کے نظام کو لوگوں کی زندگی، ان کی ضروریات اور امنگوں سے پوری طرح ہم آہنگ کرنا پہلا اور اہم ترین پروگرام ہونا چاہیے اور مغربی یونیورسٹیوں سے مستعار روایتوں اور تعلیمی نظام میں اپنے نظام اقدار اور طریقۂ کار کی آمیزش سے ایک قومی نظام تعلیم مرتب ہونا چاہیے۔

انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ قومی ترقی اور زندگی کے مختلف میدانوں میں عورتوں کو کام کے زیادہ مواقع فراہم کرنے کے نقطۂ نظر سے تعلیم نسواں کے پروگرام کو وسیع تر اور بہتر بنانے کو اہمیت دی جائے۔ ان کے خیال میں اس سلسلے میں جو اہم قدم اٹھایا جانا چاہیے وہ رائے عامہ کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنا ہے اور لوگوں کو باور کرانا ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم لڑکوں اور مردوں کی تعلیم سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

ان کی نظر میں یہ بات بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ سماجی اور قومی خدمت کے کارآمد اور جوتی بھرے کام میں استاد اور طالب علم شرکت کریں۔ وہ مانتے تھے کہ اس قسم کا امتزاج ہی ہمارے اعلیٰ تعلیم کے نظام کو قومی ضروریات اور امنگوں سے مؤثر ڈھنگ سے ہم آہنگ کر سکتا ہے اور اُسے قومی نشو و نما کا طاقت ور وسیلہ بنا سکتا ہے۔

وہ ہندوستانی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر یقین رکھتے تھے۔ حالانکہ وہ انگریزی کے نہایت خوب صورت اسلوب میں لکھ اور بول سکتے تھے لیکن انھوں نے ہندوستانی زبانوں سے بے اعتنائی سے پرہیز کیا۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ ادبی ذوق رکھنے والے ہمارے نوجوان انگریزی اور دنیا کی دوسری زبانوں سے اپنے ذوق کے مطابق اچھی طرح روشناس ہوں اور میری خواہش ہے کہ وہ بوس، رائے یا ٹیگور کی طرح اسی لسانی مہارت سے ہندوستان اور دنیا کو فائدہ پہنچائیں۔ لیکن میں یہ نہیں چاہوں گا کہ کوئی بھی ہندوستانی اپنی مادری زبان کو بھول جائے، اس سے بے اعتنائی برتے یا اس سے شرمندہ ہو یا محسوس کرے کہ وہ اپنی زبان میں نہ سوچ سکتا ہے اور نہ ہی اعلیٰ خیالات کا اظہار اس کے ذریعہ کر سکتا ہے۔

جامعہ ملیہ کے قائم کرنے کے دوران انھوں نے قومی تعلیم کا شاندار تجربہ شروع کیا تھا۔۔ ہمارے عہد کی زبردست کامیابیوں میں سے اس کامیابی کے حصول کی راہ میں مشعل

روشن کرنے کا بہت دشوار کام تھا، اس میں شکست کا مقابلہ کرنا تھا، ذہنی خلفشار سے دوچار ہونا تھا، تکلیفیں برداشت کرنی تھیں، یاسیت کا شکار ہوتا تھا اور قربانیاں کرنی تھیں۔ اس سلسلے میں ہمیں ان نوآبادیاتی شکنجوں کو یاد رکھنا چاہیے جو قومی شعور کے اس بڑھتے ہوئے دھارے کو ابتدا میں ہی ختم کرنے سے باز نہیں آ سکتا تھا جس سے ہمارے تعلیمی نظام کو جکڑی ہوئی نوآبادیاتی زنجیروں کو پاش پاش کرنے کا خطرہ لاحق تھا۔ اپنی ناواقفیت اور اپنی بے اعتنائی کی بدولت مسلم ملت بدیسی سیاسی چالوں کا شکار ہو چکی تھی اور اصل میں ذاکر صاحب کے دشوار گزار راستے میں مشکلات کھڑی کرنے میں وہ برابر کی شریک تھی۔

ذاکر صاحب نے جامعہ کو قائم کرنے اور پروان چڑھانے میں جس طرح کوشش کی ہے وہ ایک مثال ہے۔ مالی لحاظ سے ذاکر صاحب کو غربت کی زندگی بتانی پڑی تاکہ جامعہ چلتی رہے۔ انھوں نے انتہائی جزرسی اور کفایت شعاری سے جامعہ کے وسائل کا استعمال کیا تاکہ سب سے پہلے جامعہ کے کارکنوں کی ادائگی ہو سکے اور بعد میں اگر کچھ بچ رہے تو خود انھیں ملے۔ اس سلسلے میں بیگم ذاکر حسین ہمارے خراج عقیدت کی مستحق ہیں جنھوں نے ذاکر صاحب کے جامعہ کو اپنا تن من وقف کر دینے کے بعد ان تھوڑے بہت وسائل سے خاندان کی پرورش اور پرداخت کی جو انھیں نصیب ہو سکے۔

جواہر لال نہرو کے لفظوں میں جامعہ عدم تعاون تحریک کا تندرست بچہ ہے، اور یہ ملک میں برطانوی راج کے ذریعہ چلائے جا رہے تعلیمی اداروں سے قطع تعلق کرنے کی گاندھی جی کی پکار کے زیر اثر وجود میں آیا تھا۔ یہ ادارہ اس دور میں قائم ہوا جو لامحدود خوابوں، ولولہ انگیز عزائم اور پرجوش قوم پرستی سے معمور تھا۔ اس کا قیام روایتی طرز تعلیم اور جدید نظام تعلیم میں امتزاج پیدا کرنے کے لیے عمل میں آیا۔

عدم تعاون کے دور میں جامعہ کے طالب علم اور استاد گاندھی جی کا پیغام ملک کے کونے کونے میں پھیلاتے ہوئے پھرے! ور انھوں نے گاندھی جی کے تعمیری پروگراموں کو مقبول عام بنانے میں اپنی پوری طاقت لگا دی۔ جامعہ نے دو سو سے زیادہ ایسے استاد اور طالب علم تیار کیے جو قومی آدرش کی مشعل کو روشن رکھ سکیں۔ بعد میں بھی جامعہ کانگریس کی حامی رہی اور دو قومی نظریے کی ڈٹ کر مخالفت کرتی رہی۔ ۴۸-۱۹۴۶ء میں جب دلی میں فرقہ وارانہ فساد نے حشر برپا کر رکھا تھا اس وقت بھی جامعہ کا کیمپس ان چند جزیروں میں سے ایک تھا جہاں حالات پر امن رہے اور وہ جنون سے پاک رہے۔

کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے ایک مجمع کے سامنے نومبر ۱۹۴۶ء میں بولتے ہوئے ذاکر صاحب نے اس باہمی نفرت کی آگ کی بات کہی تھی جو ملک میں لگی ہوئی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس آگ کو سب سے پہلے بجھائیں انھوں نے

کہا تھا اُس بات کی جانچ پڑتال کرنے اور تعین کرنے کا وقت نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی۔ آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ آئیے ہم سب مل کر اسے بجھائیں۔

نیکی اور انسان دوستی ذاکر صاحب کی شخصیت میں کئی طرح سے ظاہر ہوئی ہے۔ علم کے لیے ان کی دائمی جستجو اس کا پہلا مظہر تھا۔ وہ جانتے تھے کہ علم سے حکمت کی راہ روشن ہوتی ہے اور یہ انسانی ترقی کی کلید ہے۔ وہ اپنے اس نظریے سے اس نتیجے پر پہنچے کہ دانشوروں کو پروان چڑھانا اور تخلیقی اور تنقیدی ذہنوں کے لیے صحیح ماحول پیدا کرنا ہی کسی قوم کی اصل دولت ہے۔ جامعہ ملیہ ان کی اس قابل ستائش جستجو کی جیتی جاگتی عمارت ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ عروج و کمال کی باطنی جاذبیت محبت ہے اور اس کا ظاہری اظہار حسن ہے۔ وہ کولرج کے اس قول سے متفق تھے کہ، وہی اچھا عبادت گزار ہے جو اچھی طرح محبت کرتا ہے۔

ذاکر صاحب خدمت اور قربانی پر پورا یقین رکھتے تھے کیونکہ انھیں سے محبت بڑھتی ہے، یک جہتی کا فروغ ہوتا ہے، ہم آہنگی مضبوط ہوتی ہے، باہمی مصالحت میں اضافہ ہوتا ہے۔ فرد ہو یا ملک دونوں کے لیے باہمی تعاون اور امداد باہمی ہی ترقی کا بنیادی نسخہ ہیں اور صرف یہی آزادی اور خوش حالی کی طرف لے جانے کو یقینی بناتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذاکر صاحب کی پوری زندگی خدمت اور قربانی کی ہی داستان ہے۔

ذاکر صاحب کی پوری زندگی کا تخلیقی کام چار گوشوں میں پھیلا ہوا ہے۔ بحیثیت جامعہ کے معمار کے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے، بہار کے گورنر کی شکل میں، نائب صدر جمہوریہ اور آخر میں بطور صدر جمہوریۂ ہند کی حیثیت سے۔ جامعہ کی تعمیر انتہائی چنوتی بھرا پروجیکٹ تھا اور انھیں بہت عزیز تھا۔ ان کی کامیابیوں میں یہ حالانکہ بہت چھوٹی سی کامیابی معلوم ہوتی ہے لیکن اُن کے لیے یہ بے بہا اثاثہ ہے جسے انھوں نے ملک کو دیا ہے۔ یہ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا بہترین ثمر ہے جہاں آسمان دانشوری کے ایسے درخشاں ستارے یکجا ہو گئے تھے جو اسلامی علوم سے اچھی طرح واقف تھے اور اسلامی تہذیب کے نفیس پہلوؤں کو عالم انسانیت کے روبرو پیش کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے اس لاثانی تحفے کے لیے ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی آخری آرام گاہ جامعہ کے قریب ہیں جس زمین کے ٹکڑے پر ہے وہ متبرک ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی آخری آرام گاہ اس کے ایک طرف اسکول دوسری طرف مسجد اور تیسری طرف لائبریری ہے۔ یہی ان کے وجود کے تین اجزا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ذہن، دل اور جسم۔ اسکول خیال و ذہن کی نشوونما کی علامت ہے، مسجد خدا کے

رب العالمین ہونے کی گواہی ہے اور لائبریری علم کا خزانہ ہے۔

سیکولرزم کا ذاکر صاحب کا تصور بہت اعلیٰ تھا۔ انھوں نے نہ تو مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے ملنے دیا اور نہ اپنے عقائد کو اپنے مناصب کے فرائض میں دخل دینے دیا۔ ایک دفعہ دہلی میں رام لیلا کی تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے شری رام کا تلک لگایا۔ اس پر کچھ مسلمانوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ انھیں ذاکر صاحب نے جواب دیا: میں ہندوستان بھر کا راشٹرپتی ہوں کسی مخصوص کمیونٹی کا نہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کا دائرہ عمل فلسفے، سیاسی تدبیر اور ادبی تخلیق تک پھیلا ہوا ہے۔ انھیں بچوں کے ادب اور بالغوں کے لیے مناسب اور موزوں کتابیں تیار کرنے سے گہری دل چسپی تھی۔ انھوں نے خود چھوٹے بچوں کے لیے بہت سی کتابیں لکھیں جن کا موضوع بہت ہی سبق آموز اور معلوماتی تھا۔ اسی طرح انھوں نے جامعہ کے لوگوں کی ہمت افزائی کی کہ وہ غیر حروف شناس، بالغوں کے لیے درسی کتابیں تیار کریں۔ جامعہ نے ان لوگوں کے لیے جو کتابیں تیار کی تھیں وہ یقیناً تعلیم بالغان کے کام میں سنگ میل ثابت ہوئیں۔

۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو ذاکر صاحب بہار کے گورنر مقرر ہوئے۔ حالانکہ اس عہدے میں تخلیقی کام کے لیے کم ہی گنجائش تھی لیکن ایک مشہور واقعہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ تعلیم سے ان کا لگاؤ کتنا گہرا تھا۔ بہار کی حکومت نے تعلیم سے متعلق ایک بل پیش کیا تھا۔ اگر اس کا مجوزہ مسودہ جوں کا توں پاس ہوجاتا تو ریاست کی یونیورسٹیوں کی خودمختاری پر اس کا بہت برا اثر پڑتا۔ ذاکر صاحب نے وزیر اعلیٰ کی اس طرف توجہ دلائی اور اس بات کو یقینی بنایا کہ حکومتی دخل اندازی سے یونیورسٹیوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اس بل میں مناسب ترمیم ہو۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۳ مئی ۱۹۶۲ء کو نائب صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے۔ ان کا دور صدارت ان کی رحم دلی اور انسان دوستی کی قدروں سے عبارت ہے۔ وہ ۱۳ مئی ۱۹۶۷ء کو اس منصب اعلیٰ پر فائز ہوئے تھے۔ ان کی مدت کارگوناگوں اور پرمقصد تھی لیکن افسوس ہے کہ دو سال بعد ان کا انتقال اس وقت ہوگیا جب ان کی ناموری عروج پر تھی۔ بحیثیت صدر کے انھوں نے ہمیں کتنا مالا مال کیا ہے اس پر شریمتی اندرا گاندھی کے اس بیان سے روشنی پڑتی ہے۔ اس وقت کی وزیر اعظم اندرا جی نے کہا تھا: "ڈاکٹر ذاکر حسین اس نسل کے آخری لوگوں میں سے تھے جنھیں محض جنگ آزادی میں شامل ہونے سے ہی عظمت نہیں ملی بلکہ ان کی روح اپنے مشن کے اعلیٰ شعور سے سرشار تھی۔ دو سال پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین کو جمہوریہ ہند کا صدر منتخب کر کے ہندوستانی عوام نے خود کو عزت بخشی تھی۔ اپنی قلیل مدت کار کے دوران انھوں نے اس عہدے کی تابناکی کو بڑھایا۔

شاید کسی فردِ واحد کے مقابلے وہ زندگی کے ہر میدان میں ملک کی یک جہتی کے علمبردار تھے۔ ملی جلی ہندوستانی تہذیب کی گہرائی اور لطافت کو اپنی شخصیت میں سموئے ہوئے انھوں نے اپنے قول اور عمل سے سیاسی زندگی کے معیار کو بلند کیا۔ جن قدروں کو انھوں نے عزیز رکھا وہ تعمیری کام جو ماہر تعلیم اور سماجی کارکن کے حیثیت سے انھوں نے انجام دیں، وہ امتیازی خصوصیات جنھیں انھوں نے ہر اس عہدے میں سرایت کیں جن پر قومی اور بین الاقوامی میدان میں وہ فائز ہوئے۔ یہ اقدار آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔

ذاکر صاحب اعلیٰ معیار کی جستجو کے پیغامبر تھے۔ وہ اپنے کام سے اتنا لگاؤ رکھتے تھے اور اتنے مہذب تھے کہ ان کی موزوں قدر شناسی فطری بات تھی۔ ان کی داستانِ زندگی ہمیشہ ہی دوسروں کی خوشبوں اور فیضان کا سرچشمہ بنی رہی۔ لیکن یہ داستان ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو اختتام پذیر ہوگئی۔ ان کی رحلت پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے بہت کچھ کہا گیا لیکن پنڈت آنند نرائن کا شعری خراجِ عقیدت ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا:

صفِ اول سے فقط اک ہی میخوار اٹھا
سنسان ہے لیکن کتنی مری محفل ساقی
اک ہی شمع بجھی موت کے ہاتھوں لیکن
تاریک ہوئی کتنی قوم کی منزل ساقی
اک کلی آئی تھی خوشبو لیے کچھ دم کے لیے
گئی وہ پھر وہی کانٹوں کی ہے محفل ساقی
دفن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ
خوشبو تو ہے یہی اس بزم کا حاصل ساقی

عبداللہ ولی بخش قادری

ہماری تعلیم میں ذاکر صاحب کا حصّہ

اس صدی کے آغاز پر ہندوستانی شعور میں قومی تعلیم کے تصور کا ادراک و احساس قائم ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کے خاتمے پر گاندھی جی کی قیادت میں بدیسی راج کے خلاف عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا اور اس کی تائید میں تحریکِ خلافت کے مسلم رہنما بھی ترکِ موالات کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سارے ملک میں برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا جانے لگا، لوگ سرکاری کاموں سے دست بردار ہونے لگے اور حکومت وقت کی سرپرستی میں تعلیم دینے والے اداروں کو چھوڑنے کے لیے بھی اعلان کروایا گیا۔ رہبرانِ قوم کی اس آواز نے اسکول اور کالج کے نوجوانوں کو بھی ابھارا۔ اس معاملے میں پیش قدمی علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے طلبا نے کی۔ ۱۹۲۰ کا آغاز تھا، گاندھی جی اور مولانا محمد علی کے مرادآباد آنے کی خبر پاکر دو تین پرجوش طالب علم ان سے وہاں جاکر ملے اور درخواست کی کہ علی گڑھ تشریف لاکر طلبا کو خطاب کریں۔ مولانا محمد علی نے طلبا کے جذبۂ آزادی کو سراہا۔ وہ خود ہی یہ جذبہ رکھتے تھے کہ علی گڑھ کی دانش گاہ کو انگریز نوازوں اور انگریزی نوازی سے حتی الامکان بچایا جائے۔ انھوں نے چاہا کہ سرکار کی زیر سرپرستی پروان چڑھنے والے اداروں سے عدم تعاون پروگرام کی ابتدا گاندھی جی علی گڑھ سے کریں۔ اور ایسا ہی ہوا۔ علی برادران کی ہمراہی میں گاندھی جی علی گڑھ تشریف لے گئے۔ کالج کے طلبا کا جلسہ منعقد ہوا۔ کالج کے اربابِ حل و عقد نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ جلسے کو بہر طور ناکام بنایا جائے۔ ان کی چال چلی گئی۔ طرح طرح کے معقول اور نامعقول سوالوں کی یورش میں جلسہ کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخاست ہوگیا۔ لیکن چند ہوش مند اور درد مند طلبا کی کوشش سے اسٹوڈینٹس یونین کا جلسہ اگلے روز پھر ہوا۔ اس موقع پر ایک مقبول اور ممتاز طالب علم کی مدلل اور سنجیدہ تقریر پر کان دھرنے کے بجائے اس کی نیت پر شبہ کیا گیا کیونکہ وہ اسسٹنٹ لکچرر مقرر کیا جاچکا تھا اور اپنا معاشیات کا ایم۔ اے مکمل کر رہا تھا۔ لیکن یہ نوجوان دوبارہ تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اس کی تقریر کا پہلا جملہ یہ تھا: "میں اپنی لکچراری سے مستعفی ہوتا ہوں۔"

بس پھر کیا تھا۔ پانسہ ہی پلٹ گیا تھا۔ یہ ہمارے ذاکر صاحب ہی تھے جنھیں جامعہ کا معمار اعظم بننا مقسوم ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں سید نوراللہ اور جے۔ پی نائک اپنی مشہور و معروف کتاب 'تاریخ تعلیم ہند' میں یوں رقم طراز ہیں: "جوش و خروش کی اس فضا میں انھوں (طلبا) نے ایک تجویز پاس کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ قومی لائنوں پر نصابِ تعلیم کی تدوین نو ہونی چاہیے اور حکومت سے قطع تعلق کرکے یونیورسٹی کو قومی بنا دینا چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ طالب علموں کا یہ اتحاد بہت دن نہیں چل سکا۔ ان میں سے بہت سوں کو ان کے والدین نے واپس بلا لیا اور بہتوں کو ان کے خیالات تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یقینِ محکم رکھنے والے مجاہدوں کی ایک چھوٹی سی جماعت جس کی قیادت عظیم مولانا محمد علی جوہر کر رہے تھے بہر حال یونیورسٹی میں ٹھہری رہی اور یہ کہتی رہی کہ ان کے مطالبے کے مطابق ادارے کو کلی طور پر قومی بنایا جائے۔ یہ جدو جہد چند ہفتے تک چلتی رہی مگر آخر میں یونیورسٹی کے حکام نے پولیس بلالی اور اس کی مدد سے ان تمام لوگوں کو یونیورسٹی سے باہر نکلوا دیا جو یونیورسٹی کو قومی بنوانے کی جدو جہد کر رہے تھے۔ اشتعال انگیزی کی تمام ترغیبات کے باوجود ان لوگوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ، کیوں کہ تحمل اور اہنسا تحریک کے جز و تھے، یونیورسٹی کو خیر باد کہا اور تقریباً فوراً ہی علی گڑھ ہی میں ایک نئی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ، (نیشنل مسلم یونیورسٹی)، نام کی قائم کر دی۔" (تاریخ تعلیم ہند، مترجمہ مسعود الحق، صفحہ ۳۴۷)۔

ذاکر صاحب ان چند طلبا اور اساتذہ کے زمرے میں شامل تھے جنھوں نے اس نئے قومی تعلیمی ادارے کی داغ بیل ڈالنے کی سعادت (یوم تاسیس ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء) حاصل کی۔ اس نوزائیدہ درس گاہ میں تقریباً دو سال کام کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے جرمنی تشریف لے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں علی گڑھ کے اندر بوجوہ جامعہ کا قیام دشوار ہو گیا اور ۱۹۲۵ء میں اُسے دہلی لے آیا گیا۔ جامعہ کے دہلی منتقل ہونے کے ایک سال بعد ذاکر صاحب جرمنی سے واپس آئے جب کہ حالات کی ناسازگاری کی بنا پر اسے بند کرنے کا انھیں علم ہوا۔ ذاکر صاحب نے جامعہ کو برقرار رکھنے پر زور دیا۔ ان کی لیاقت، ذہانت اور ہمت دیکھتے ہوئے انھیں شیخ الجامعہ بنا دیا گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۹ سال تھی اور وہ جرمنی سے معاشیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کر کے آئے تھے۔ ذاکر صاحب نے ۱۹۲۶ء میں جامعہ کی باگ ڈور سنبھالی اور حصول آزادی تک مسلسل ۲۲ سال اس کی قیادت اور رفاقت میں اس طور گزارے کہ ایثار و قربانی کی ایک تابندہ مثال قائم کر دی۔ ان کا پہلا قدم یہ اٹھا کہ انھوں نے انجمن تعلیم ملی کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد مجیب نے اپنی کتاب 'ڈاکٹر ذاکر حسین: ایک سوانح' (مترجم محمد طیب، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۱۹۷۶ء) میں لکھا ہے کہ "اس سوسائٹی میں دو طرح کے ممبر تھے، ایک تو معاون ممبر اور

دوسرے وہ جو بیس سال تک زیادہ سے زیادہ ایک سو پچاس روپے ماہانہ پر جامعہ کی خدمت کی نیت رکھتے تھے۔ یہ سب ممبر جامعہ کے ملازم تھے۔" ذاکر صاحب کی صاحبزادی سعیدہ خورشید عالم صاحبہ نے 'ذاکر صاحب کی کہانی' (نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۶) میں لکھا ہے کہ "یوں تو ۱۵۰ روپے سے زیادہ نہ لینے کا عہد کیا گیا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس ۱۵۰ روپے کی آخری حد تک کوئی نہ پہنچا۔ خود میاں کی تنخواہ ۷۵ روپے ماہوار تھی۔ یہ وہ ۷۵ روپے تھے جن پر انھوں نے زندگی کے بہترین ۲۰ سال بسر کیے اور وہ بھی کبھی باقاعدگی سے ماہ بماہ نہ ملے۔ کہیں سے روپیہ آ گیا تو کچھ کچھ تنخواہیں بٹ گئیں ورنہ اللہ کا نام مجھے یاد ہے ہماری والدہ جنھیں اس قلیل رقم میں گرہستی چلانا تھی، بڑی جزرسی سے کام لیتیں۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی ان کے منہ سے یہ نکل جاتا کہ مجھے زیادہ روپے کی حاجت نہیں لیکن بس میں یہ چاہتی ہوں کہ ایک مقررہ رقم مجھے ہر مہینے مل جایا کرے تاکہ اسی کے مطابق اپنے اخراجات کو تقسیم کر لوں۔" لیکن اس عہد کو ان بندگانِ خدا نے اس طرح نباہا کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اور یوں جامعہ کو ایک خود مختار تعلیمی ادارے کی حیثیت حاصل ہو گئی جس کے خادم اور مخدوم خود اس کے اپنے کارکن تھے اور تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اور رہنمائی خود اس کے اپنے اساتذہ کے سر تھی۔ اس طور ذاکر صاحب نے نہ صرف اہلِ جامعہ کو وفاداری بشرطِ استواری کا سبق پڑھایا بلکہ ان کے درمیان سے محمود و ایاز کا فرق اٹھا دیا۔ مزید برآں انھوں نے اپنے رفیقانِ کار کے انتخاب کے لیے بھی ایک اپنا انوکھا نقطۂ نظر قائم کیا۔ ان کا ارشاد ہے کہ "جماعتی کاموں میں میرا گمان ہے کہ پہلے سے راہ کے نشیب و فراز سے آگاہ ہونا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ساتھ مل کر چلنے والوں کا ایک جا ہونا۔ توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہو تو یہ راہ بھی دریافت کر لیتے ہیں، ایک دوسرے کو سہارا دے کر اُسے طے بھی کر لیتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے: من از طریق نہ گویم، رفیق می جویم — کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و باز طریق۔" ذاکر صاحب کا خط عبدالغفار مدہولی صاحب کے نام، ۲۴ / اکتوبر ۱۹۴۶ء) "اس امر کی تائید مزید ذاکر صاحب کے ہمدمِ دیرینہ اور بے تکلف دوست پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "ذاکر صاحب کے طریقۂ کار کا بڑا دل آویز پہلو یہ ہے کہ انھوں نے کام لینے میں منصب کو بطور قوت یا سیاست استعمال نہیں کیا۔" (ذاکر صاحب کی کہانی، سعیدہ خورشید عالم، نیشنل بک ٹرسٹ صفحہ ۳۲)۔

ذاکر صاحب نے اپنی تعلیمی زندگی کے ابتدائی دس بارہ سال کے اندر ہی استاد کے منصب و مقصود کو پا لیا تھا۔ ان کی ۱۵ / مارچ ۱۹۳۶ء کی نشری تقریر (تعلیمی خطبات: ذاکر حسین۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۴۳ء) "اچھا استاد" بڑے واضح اور موثر انداز میں استاد کی تصویر کشی کرتی ہے۔ اس تقریر کا مرکزی خیال تو ان کے اِن جملوں میں سمو گیا ہے کہ: "استاد کی کتابِ زندگی

کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا، محبت کا عنوان ہوتا ہے، اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے، سماج جن خوبیوں کی حامل ہے، ان سے محبت ہوتی ہے، ان ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں" لیکن وہ صرف اس بات پر اکتفا نہیں کرتے ہیں۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ "مگر صرف یہی کافی نہیں۔ ہر اچھے استاد میں اس کا ہونا ضروری ہے، پر ہر وہ شخص جس میں یہ ہو اچھا استاد نہیں ہوتا۔ محبت کے اِس میلان کو ایک خاص طریقے سے کام میں لانے کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے" لہٰذا ان کا ارشاد ہے کہ "اُسے اپنے شاگرد کی بننے والی شخصیت کا رخ سمجھنا اور اس کے امکاناتِ ترقی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے اور اُسے درجۂ کمال تک پہنچانے میں مدد کرنی ہوتی ہے" وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ "استاد کا اصلی کام سیرت کی تیاری ہے اور ساری تعلیم کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ بچے کے ارادے اور عمل کی قوت کو کسی سیدھی راہ پر ڈال دے اور سچے اصولوں کی روشنی میں، اچھی عادتوں کی مدد سے اس کی سیرت میں یک سوئی اور پختگی پیدا کرے"۔ وہ استاد کے لیے اچھی سیرت کی بھی قید لگاتے ہیں جو ان کے نزدیک زندگی کا کوئی مستقل ڈھنگ رکھنے والے کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ انھوں نے حکمراں اور استاد کی اثر اندازی کا فرق بڑی خوبی سے واضح کیا ہے کہ "حکمراں جبر کرتے ہیں، یہ صبر کرتا ہے، وہ مجبور کرکے ایک راہ پر چلاتے ہیں، یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے، ایک کے وسائل ہیں تشدد اور زبردستی، دوسرے کے محبت اور خدمت، ایک کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے، دوسرے کا شوق سے، ایک حکم دیتا ہے، دوسرا مشورہ، وہ غلام بناتا ہے اور یہ ساتھی۔ ذاکر صاحب نے اپنی تقریر کے اختتام پر یہ جتایا ہے کہ استاد "فوق البشر کا تصور بھی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے مگر نادان اور بے بس بچے کی خدمت کو اپنی زندگی کا افتخار جانتا ہے اور بچے کی طرف سے جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں اُمید باقی رہتی ہے — ایک اس کی ماں اور دوسرا اچھا استاد"! بلاشبہ یہ تقریر ایک ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور اپنے موثر و شگفتہ انداز میں استاد کی شخصیت کے محاسن کو بخوبی اجاگر کرتی ہے۔

ذاکر صاحب نے استاد کی حیثیت، اہلیت اور اہمیت کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ جامعہ کے اندر بچوں کا ادب، تیار کرنے کی مہم کا بھی آغاز کیا۔ بچوں کے لیے خود مضامین اور کہانیاں لکھیں اور اپنے ساتھیوں کو اس طرف رجوع کیا۔ انھوں نے بچوں کے لیے درسی کتب تیار کرنے کی طرف بھی دھیان دیا۔ ذاکر صاحب نے ایسے تعلیم کے بنیادی کاموں کی طرف اس وقت توجہ کی جب کہ اردو کا میدان اُن سے تقریباً خالی تھا۔ ذاکر صاحب کی ہر ایک کہانی اپنا تعلیمی اور نفسیاتی پہلو رکھتی ہے۔ وہ کسی خوبی یا نیک کام کی ترغیب دیتی نظر آتی ہے۔ جذبۂ آزادی، وطن دوستی، اتحاد و اتفاق اور خدمت و ایثار کی دولت سے یہ کہانیاں مالا مال نظر آتی ہیں۔ ان کی کہانیوں

کا پہلا مجموعہ ابو خاں کی بکری اور چودہ اور کہانیاں، شائع کردہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۶۳ء) نمایاں طور پر ایک استاد کی بصیرت اور احساس منصبی کا رہین منت نظر آتا ہے جو خوش قسمتی سے اپنے اندر ایک ادیب بھی سموئے ہوئے ہے۔ اُس کی شانِ نزول ملاحظہ فرمائیے "یہ کہانیاں، بہت دن ہوئے، رقیہ ریحانہ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ مجھے انھوں نے سنائی تھیں اور یہ کہہ کر سنائی تھیں کہ کہیں پڑھی ہیں یا کسی سے سنی ہیں مگر یاد نہیں کہ کب اور کہاں۔ میں نے ان سے پائی تھیں، اس لیے انھیں کے نام سے شائع کیں۔ پھر رقیہ ریحانہ ہمیشہ کو رخصت ہو گئیں اور میں یہ بھی نہ پوچھ پایا کہ میں نے جس طرح ان کہانیوں کو لکھا ہے، وہ انھیں پسند بھی ہے یا نہیں لیکن لکھی، چونکہ میرے ہاتھ سے گئی تھیں اور لوگ اسے جانتے ہیں اس لیے اب انھیں اپنے ہی نام سے شائع کرتا ہوں۔ کس کس کو بتاؤں کہ رقیہ ریحانہ کون تھیں اور کہاں چلی گئیں۔ سہل یہی ہے کہ کہانیوں کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لوں۔ کہانی اپنے کہنے والی کی اچھائی برائی کو بے تکلفی سے اپنے اندر لے لیتی ہے۔ یہ کہانیاں آپ کو پسند آئیں تو سچ یہ ہے ان کی ساری خوبی رقیہ ریحانہ کی دین ہے۔ اگر طبیعت کو نہ بھائیں تو سمجھیں کہ میرے بیان نے انھیں بگاڑ دیا ہے۔ مگر ایک بار پڑھ ضرور لیں۔ تھوڑی سی ہیں، زیادہ وقت ضائع نہ ہوگا۔" اس اقتباس سے ذاکر صاحب کے اخلاق و کردار کی بھی قدرے غمازی ہوتی ہے۔ اور اس ضمن میں اتنا بتانا مناسب ہوگا کہ یہ کہانیاں وقتاً فوقتاً 'پیام تعلیم' میں شائع ہوتی رہی تھیں اور سعیدہ خورشید عالم صاحبہ کا یہ بیان کہ: "جب میری چھوٹی بہن ریحانہ جس کی عمر چار سال تھی اچانک فوت ہو گئی تو میاں جامعہ کے پرائمری اسکول کے بچوں کا نتیجہ سنا رہے تھے۔ اس وقت میں غالباً چھے سات سال کی ہوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے دیکھا کسی صاحب نے چپکے سے آکر میاں کے کان میں کچھ کہا جس سے میاں کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا لیکن نتیجے کی کارروائی جاری رہی۔ یہ خبر ریحانہ کے ہارٹ فیل ہونے کی تھی۔ تھوڑی دیر میں جلسہ ختم ہو گیا، میاں گھر چلے گئے اور مجھے ایک استاد اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ریحانہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے۔" (ذاکر صاحب کی کہانی۔ سعیدہ خورشید عالم۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا۔ صفحہ ۹۶)۔

اب ذرا پہلی کہانی 'ابو خاں کی بکری' پر نظر ڈالی جائے۔ ان کی بکری کا نام چاندنی تھا۔ ایک دن وہ گھر سے نکل بھاگی۔ اس سے آگے ذاکر صاحب کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "پہاڑ پر پہنچی تو بھیڑیے کا سامنا ہو گیا۔ چاندنی نے بھیڑیے کے آگے سر نہیں جھکایا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ بکریاں بھیڑیے کو نہیں مار سکتیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنی بساط کے مطابق مقابلہ کرے۔ جیت ہار پر اپنا قابو نہیں، وہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ مقابلہ ضروری ہے۔ چاندنی رات بھر بھیڑیے کا مقابلہ کرتی رہی لیکن صبح ہوتے ہوتے چاندنی بے دم ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس کا سفید بالوں

کا لباس، خون سے بالکل سُرخ تھا۔ بھیڑیے نے اسے دبوچ لیا اور کھا گیا۔" لیکن کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کا اصل مقصد ابھی باقی ہے۔ ذرا دیکھیے کس سادگی اور پُرکاری سے فلسفہ حرّیت سمجھایا گیا ہے۔ ہاں، یہ بھی یاد رہے کہ حصولِ آزادی سے پہلے کی کہانی ہے۔ کہانی یوں ختم ہوتی ہے: " اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ اُن میں یہ بحث ہو رہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی۔ سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی سی چڑیا ہے، وہ مُصر ہے کہ چاندنی جیتی۔" اسی طور ان کی ایک اور کہانی "آخری قدم"، خودنمائی اور ظاہر پرستی سے قطع نظر بے لوث خدمتِ خلق کی تلقین کرتی ہے۔ کہانی یوں شروع ہوتی ہے: "آؤ، آج تمہیں ایک بہت اچھے آدمی کا حال سنائیں جسے اس کے جیتے جی بہتیرے لوگ بُرا بُرا کہتے تھے اور مرنے کے بعد بھی اس کی نیکی کا حال بس وہی جانتے ہیں جن کے ساتھ اس نے بھلائی کی تھی اور شاید بعضے تو ان میں سے بھی بھول گئے ہوں۔ اس نیک آدمی کے پاس بڑی دولت تھی مگر یہ ان لوگوں میں تھا جو اپنے دھن دولت کو اپنا نہیں سمجھتے بلکہ اللہ میاں کی امانت جانتے ہیں۔" اس نیک آدمی کا حال یہ تھا کہ "اپنی دولت سے خود بہت کم فائدہ اٹھاتا تھا۔۔۔ آخر کو سب میں بڑا کنجوس مشہور ہوگیا۔۔۔ مگر یہ دھن کا پکّا تھا۔ برابر چھپ چھپ کر چپ چپاتے اپنی دولت سے کسی نہ کسی مستحق کی مدد کرتا ہی رہتا تھا۔۔۔ اس کے پاس ایک خوب صورت سی کتاب تھی۔۔۔ اس کتاب میں یہ اپنا پیسے پیسے کا حساب لکھا کرتا تھا۔۔۔ اس کا ارادہ تھا کہ مرتے وقت یہ کتاب ان لوگوں کے لیے چھوڑ جاؤں گا جو عمر بھر مجھے پہچانے بغیر میرا دل دکھاتے رہے ہیں۔۔۔ اس کی سمجھ میں آگیا کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے جو سب کے لیے آتا ہے۔۔۔۔ کتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کر اُسے اٹھانا چاہا۔۔ پھر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔۔۔ ان کو شرما کر تجھے کیا ملے گا۔۔۔ کتاب کو اُس پاس والی انگیٹھی میں پھینک دیا۔" اور اختتام یوں ہوتا ہے:

"کتاب جلنے لگی۔ اس کی نظر اسی پر جمی تھی۔ جلد کے جلنے میں دیر لگی۔ پھر اندر کے کاغذوں میں آگ لگی تو ایک شعلہ اٹھا۔ اس کی روشنی میں اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ دکھائی دی اور چہرے پر ایک عجیب اطمینان۔ اُدھر مؤذن نے اشہد انّ محمد الرسول اللہ کہا اور نیکیوں کے اس کارواں سالار کی رسالت کے اعلان کے ساتھ اس کی امت کے ایک نیک راہرو نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔" یہ تو جستہ جستہ الفاظ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے کہانی کا ایک خاکہ سا پیش کرنے کی کوشش رہی ہے۔ پوری کہانی پڑھنے سے جذبات متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان دو کہانیوں کو مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ دراصل ذاکر صاحب کی ہر ایک کہانی کا موضوع بچّوں کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اچھے اخلاق اور نیک اطوار کی تعلیم دیتی ہیں۔ اُن سے دائمی اقدار کی پیروی کرنے کی راہیں

استوار ہوتی ہیں جیسا کہ آج قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء شدت کے ساتھ اقدار رخ تعلیم کی طرف رجوع کرتی ہے۔

مندرجہ بالا کہانیوں کے مجموعے کے بعد ذاکر صاحب کی ایک طویل کہانی 'کچھوا اور خرگوش' (نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۱۹۷۹ء) منظر عام پر آئی۔ اس سے کچھوا اور خرگوش کی کلاسکی کہانی کا تعلق تو بس برائے نام ہے۔ دراصل یہ قصہ چار پروفیسر صاحبان کا ہے جو اپنے اپنے تخصص کا ایسا شکار ہیں کہ اپنے اپنے آفاق میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کہانی میں تخصص کے اہم مسئلے پر ذاکر صاحب کے نقطۂ نظر سے آگاہی نصیب ہوتی ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اُسے انھوں نے ۱۹۵۷ء کے آس پاس بہار کا گورنر بننے کے بعد لکھا اور ۱۹۶۲ء میں نائب صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد نظر ثانی فرمائی تھی کیونکہ ایک نجی صحبت میں انھوں نے اس کہانی کے مسودے کا ذکر کیا تھا۔ نیز داخلی شہادت بھی اس امر کی تائید کرتی ہے۔ وہ بہار تشریف لے جانے سے قبل، آٹھ سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے تھے اور اس عہد کا ایک بڑا مسئلہ 'جنرل ایجوکیشن' سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ ذاکر صاحب کے گورنر اور نائب صدر رہنے کے دوران ملک کے اندر زور و شور سے اٹھنے والے زبان کے تعصب اور مذہبی نارواداری سے وابستہ مسائل کی گونج بھی اس کہانی میں سنائی دیتی ہے۔ اس کہانی کا میدان کارزار 'جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی' ہے اور اس کے چاروں اہم کردار عہد ذاکر کے جامعہ کالج کے اساتذائے کرام کی چغلی کھاتے نظر آتے ہیں بلکہ انھیں رفقائے ذاکر کا چربہ گرداننے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ ان کا بے تکلفانہ ربط ضبط اور شستہ و شائستہ گل افشانی گفتار کے قرینے سے ذاکر صاحب پر 'غم یادِ یاراں' کے سایہ فگن ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ ذاکر صاحب نے کہانی کے دل کش انداز میں محدود تخصص کی نارسائی کو عیاں کر دیا ہے۔ وہ تعلیم کا ایک جامع تصور رکھتے تھے اور 'لبرل ایجوکیشن' کے حامی تھے۔ یعنی کہ ایسی عام تعلیم جو تہذیب نفس کے پیسے دی جائے۔ ان کے نزدیک علم و فضل کی ایک سطح پر پہنچ جانے کے بعد حصول امتیاز کی منزل کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کہانی کا انجام یعنی نوجوان خرگوش کی موت اس طرف توجہ دلاتی ہے کہ پختہ کار اور جہاں دیدہ حضرات کو نوخیز اور کندۂ ناتراش ہستیوں کے ساتھ کیا رویہ اپنانا چاہیے۔ یہ کہانی اپنے نام اور ظاہری شکل کی بنا پر بڑوں کی توجہ حاصل کرنے سے قاصر رہی ہے اور بچے نہ اس کی شستہ تہذیبی اور فارسی زدہ اردو سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ اس کا اصل موضوع ان کی دل چسپی اور توجہ کا باعث ہو سکتا ہے (کچھوا اور خرگوش۔ ایک تعلیمی تجزیہ، 'نقش ذاکر'، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۷ء)۔

ذاکر صاحب اپنے دور کی 'نئی تعلیم' کی لہر سے متاثر ہوئے تھے جس کا سربراہ مغرب

میں جان ڈوئی، ٹی۔ پی۔ نَن اور ڈی۔ ایچ کلپیٹرک جیسے مفکرین تعلیم تھے۔ ان کی بدولت تعلیم میں خلاقیت پر زور بڑھا، آزاد فضا کی اہمیت کو محسوس کیا گیا، ذمہ دار شہری بنانے میں تعلیم کے منصب کو گردانا گیا اور ہاتھ کے کام کی تعلیمی افادیت کو سراہا گیا۔ ذاکر صاحب نے اِن مختلف اثرات کو اس طرح قبول کیا اور اپنی فکر میں ڈھالا کہ ایک نیا احساس جاگ اٹھا۔ ذاکر صاحب تعلیم کا ایک اَرفع و اعلیٰ تصور رکھتے تھے۔ اُس تصور میں با مقصد کام بھی شامل تھا اور اقدارِ عالیہ کا مقام بھی۔ وہ بچے کی خلاقانہ صلاحیتوں کو پورے طور پر ابھارنے کے حامی تھے اور اُسے ایک محبت بھرے، آزاد ماحول میں پروان چڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا منشاء تھا کہ وہ اپنی انفرادیت کو اجتماعی مفاد کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔ وہ مادی اقدار اور روحانی اقدار میں ایک توازن دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے درسی اور ہم درسی مشاغل کو صحیح نصب العین اور رویے پیدا کرنے کے لیے برتنے پر زور دیا ہے۔ وہ تعلیم میں فضیلت کوشی یا درجہ کمال تک پہنچنے کی لگن کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اقبال کو شکوہ تھا کہ:

کیا رفعت کی لذّت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے

ذاکر صاحب کے نزدیک نئی نسل کی 'رفعت کی لذّت' سے آشنائی ایک اہم تعلیمی مقصد قرار پائی ہے۔ انھوں نے اپنے جرمنی کے قیام میں وہاں کے تجرباتی مدارس سے واقفیت حاصل کی تھی اور وہاں کے فلسفۂ تعلیم میں گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ وہ بالخصوص جارج کرشین اسٹا ئینر سے بے حد متاثر تھے۔ ان کی تعلیمی فکر میں اِس جرمن مفکر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اس کی اس بات کو دل میں بٹھالیا تھا کہ "ایک تعلیم یافتہ شخص خود کو کبھی بھی مکمل محسوس نہیں کرسکتا۔ فطرتاً تعلیم کے لیے جدو جہد کرنا صحیح تعلیم کی ایک سچی نشانی ہے۔" اور اس کی یہ بات بھی گرہ میں باندھ لی تھی کہ "ہمارے تصورِ تعلیم کے مطابق تعلیم ایک نفسی کیفیت ہے۔ تعلیمی عمل اسی وقت با مقصد ہوسکتا ہے جب تمدّنی عناصر کی مدد سے وہ انفرادی نفوس کی نشو ونما میں اس طرح مدد کرے کہ وہ ایک نظامِ قدر کی صورت اختیار کرلیں، جو ایک طرف نفس سے مطابقت رکھتا ہو اور دوسری طرف معروضی قدر کی حیثیت رکھتا ہو، کیونکہ اس نظامِ قدر کی ساخت معروضی حیثیت رکھنے والی عناصر کی بنیادوں پر ہوتی ہے انھیں کے باعث اس میں نظم پیدا ہوتا ہے۔ (نظریۂ تعلیم حصہ دوم، ڈاکٹر کرشین اسٹائینر، مترجمہ ڈاکٹر قاضی عبدالحمید، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، صفحات ۱ - ۲۰)۔ ذاکر صاحب اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی گاندھی جی سے عقیدت رکھتے تھے۔ جامعہ کی خدمت کے دوران وہ برابر گاندھی جی کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے مستفید ہوتے رہے اور گاندھی جی پر بھی اُن کے جوہر کھل گئے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے اپنی بنیادی تعلیم کے تصور کو عملی

جامعہ چلانے کے لیے جو کمیٹی تشکیل کی اس کا صدر انھوں نے ذاکر صاحب کو ہی بنایا اور ان کے قائم کردہ "ہندوستانی تعلیمی سنگھ" کے صدر بھی تا حیات ذاکر صاحب ہی رہے۔ جب بنیادی تعلیم کے اساتذہ کی ضرورت پیش آئی تو دو جگہ انتظام ہوا۔ ایک تربیتی ادارے کا بندوبست خود گاندھی جی نے سیوا گرام میں کیا اور دوسرا ذاکر صاحب کی سرپرستی میں جامعہ کے اندر ۱۹۳۸ء میں "استادوں کا مدرسہ" قائم کیا گیا۔ اس تربیتی مدرسے میں حرفے کی تعلیم اور حرفے کے ذریعے تعلیم کو خصوصیت کے ساتھ فروغ حاصل ہوا اور تعلیم میں ربط کے اصول کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔

ذاکر صاحب نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۰ء (تعلیمی خطبات، بنیادی تعلیم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۴۳ء) کو جامعہ میں منعقد ہونے والی "بنیادی تعلیم" کی دوسری کانفرنس کے موقعے پر اپنے خطبے میں کام اور تعلیمی کام کا مفہوم بخوبی واضح کیا ہے اور بنیادی تعلیم میں حرفے کی حیثیت کو مسلم بنا دیا ہے۔ انھوں نے بنیادی تعلیم کی تعریف کرتے ہوئے پہلی بات یہ کہی تھی کہ "قوم کبھی سات سال سے کم مدت کی مفت اور لازمی تعلیم پر راضی نہ ہوگی (اس وقت یہی مدت قرار پائی تھی۔ بعد کو آٹھ سال کی گئی)۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا تھا کہ "دوسری بات جو اس طرح آخری طور پر سمجھنی چاہیے یہ ہے کہ یہ سات سال کی تعلیم مادری زبان میں ہوگی"۔ اور پھر جتایا تھا کہ "تیسری بات جو میری رائے میں انھیں دو کی طرح کبھی ہاتھ سے نہ دی جائے گی وہ یہ ہے کہ تعلیم کے ان سات سال میں کام کو بیچ کی جگہ دی جائے اور جہاں تک ہو سکے گا اس کے ذریعے دوسری سکھانے اور بتانے کی چیزیں سکھائی اور بتائی جائیں گی"۔ گویا ربط کا مرکز حرفہ ہوگا۔ ذاکر صاحب نے تعلیمی کام کے معنی اس طور بتائے ہیں کہ "جب ہم تعلیم کے سلسلے میں کام کا ذکر کریں تو ہمیں وہی کام دھیان میں رکھنا چاہیے جس سے تعلیم ہو، ذہن کی تربیت ہو، آدمی اچھا بنے"۔ اور اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کا ذہن اپنے کیے کو پرکھ کر اس کے اچھے برے پر نظر کر کے ترقی کرتا ہے"۔ انھوں نے تعلیمی کام کے ساتھ یہ بھی شرط لگائی ہے کہ "وہ ایسی قدر کی خدمت کرے جو ہماری خود غرضی سے برے ہو اور جسے ہم مانتے ہوں۔ جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنرمند مزدور ہو جاتا ہے مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پاتا ہے"۔ اس طور ہم دیکھتے ہیں کہ ذاکر صاحب کیونکر تعلیم کا اقدار سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ "سچے کام کا مدرسہ وہی ہے جو بچوں میں کام سے پہلے سوچنے اور کام کے بعد جانچنے اور پرکھنے کی عادت ڈالے تاکہ کام سے اس بات کی عادت سی ہو جائے کہ جب کبھی کوئی کام کریں، ہاتھ کا یا دماغ کا، اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کریں"۔ ذاکر صاحب نے واضح طور پر تعلیمی کام کی چار منزلیں قرار دی ہیں: "اوّل کام کا نقشہ، کام کا خاکہ ذہن

میں بنانا۔ دویم ''اس نقشے کو پورا کرنے کے ذرایع سوچنا'' سویم '' کام کو اُن چُنے ہوئے ذریعوں سے کر ڈالنا''۔ اور چہارم '' کیے ہوئے کو پرکھنا کہ جو کرنا چاہا تھا وہی کیا اور جس طرح کرنے کا ارادہ کیا تھا اسی طرح کیا یا نہیں'' ان کا ارشاد ہے کہ '' کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیے کہ کام بے مقصد نہیں ہوتا، کام ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا، کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔ کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں، کام کام ہے، با مقصد محنت ہے، کام دشمن کی طرح آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے، پھر اس میں پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی، کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے''۔

گاندھی جی کے یہاں حرفے کا تصور بالکل ارضی تھا۔ اس کی نوعیت ایک ناتراشیدہ ہیرے کی سی تھی۔ ذاکر صاحب نے اپنی تعلیمی بصیرت سے اسے کوہ نور بنا دیا۔ انھوں نے عملی کام کو ذہنی کام سے وابستہ کیا۔ بنیادی تعلیم کے اندر حرفے کو مرکزی حیثیت دینے اور اسے ایک ذریعۂ تعلیم کے طور پر برتنے میں بلاشبہ ذاکر صاحب کے کام کے بارے میں تصورات سے بڑی تقویت پہنچی۔ ان تصورات کو تربیتِ اساتذہ کے لیے استادوں کا مدرسہ، نبرد آزما رہا اور آج بھی اس کے بدلے ہوئے روپ جامعہ کی فیکلٹی تعلیم کے شعبۂ تربیت اساتذہ۔ (تھرما انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانڈ اسٹڈیز ان ایجوکیشن) پر اپنے اساسی مقصد و منہاج کی چھاپ یا پرچھائیں کو دیکھا جا سکتا ہے اور دور ذاکر میں انھیں مجسم طور پر جامعہ کے مدرسۂ ابتدائی میں کارفرما پایا جاتا تھا۔ وہاں تعلیم کے منصوبی طریقے (پروجیکٹ میتھڈ) کو خاص طور پر برتا گیا۔ بچوں کے لیے کھیل کود، ورزش، تیراکی وغیرہ کے اہتمام کے علاوہ مرغی خانہ، خوانچہ دکان، بینک جیسے مشاغل پر دھیان دیا گیا۔ کھلی ہوا کے مدرسے کا اہتمام کیا گیا جب کہ دورانِ سال ہفتے عشرے کے لیے سارا مدرسہ، آبادی اور بستی سے دور حتی الامکان فطرت کی آغوش میں منتقل ہو جاتا تھا۔ ایک دن کا مدرسہ بھی منایا جاتا جب کہ مدرسے کے اساتذہ اور کارکن سیر کو نکل جاتے اور مدرسے کی باگ ڈور بچوں کے ہاتھ میں آجاتی۔ لہٰذا نگراں مدرسہ، اساتذہ، کارکنان دفتر سے لے کر خاک روب بہشتی، چپراسی سب ہی کے فرائض، بچے خود ہی انجام دیتے۔ اس موقع پر وہ خود ہی مدرسے کو سجاتے، خود ہی پڑھتے اور پڑھاتے۔ یوں بھی معمول کے جلسوں کی صدارت و نظامت بچے ہی کرتے۔ بڑے بڑے معزز مہمانوں کی پیشوائی اور پذیرائی بھی وہی کرتے۔ بچوں کی حکومت، قائم تھی، ایسی حکومت جو کام کرتی ہے۔ اس طور پر ذمہ داری، پیش قدمی، اشتراک و تعاون، نظم و ضبط، پابندی اوقات، آدابِ مجلسی، اخلاق و انکسار، جرات و استقلال، راست بازی و حق گوئی جیسی اقدار اور اعمال کے حصول و فروغ کے لیے وہ سب وسائل و مواقع فراہم کیے گئے جن سے جامعہ کا مدرسۂ ابتدائی، حقیقی معنوں میں کام کا مدرسہ، مدرسۂ عمل

کہلانے کا مستحق ہوگیا۔ مزید برآں یہاں کی فضا میں اردو تہذیب کی نفاست و لطافت بھی پائی جاتی تھی اور اپنے عہد کی 'ترقی پسند تعلیم (پروگیسو ایجوکیشن)' کی چمک دمک بھی دکھائی دیتی تھی۔ نیز کسی قدر اس کے مزاج میں فلسفۂ عملیت کا عمل دخل بھی نظر آتا تھا۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہو سکا جب کہ وسائل محدود تھے اور حالات ناساز گار۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو وردھا میں گاندھی جی کی نئی تعلیم سے متعلق ملک کے سامنے پیش کردہ تجاویز پر غور ہوا تھا اور ان تمام باتوں سے پورا اتفاق کیا گیا تھا جن کا ذکر مندرجہ بالا ذاکر صاحب کی تقریر میں کیا جا چکا ہے البتہ ایک مسئلہ ایسا تھا جس سے ذاکر صاحب نے پورے تعلیمی وقار کے ساتھ اختلاف کیا تھا۔ گاندھی جی کی تجویز میں تعلیم کو خود کفیل بنانے کے لیے کہا گیا تھا۔ ان کا ارشاد تھا کہ اس اسکیم کے مطابق جو مدرسے کھولے جائیں وہ اپنا خرچ آپ برداشت کریں یعنی حرفے کی تعلیم سے جو سامان حاصل ہو اس کی آمدنی سے اخراجات پورے ہو جائیں۔ ان کے نزدیک ہندوستان جیسے غریب ملک میں تعلیم کو عام کرنے اور مفت بنانے کا کوئی اور حقیقت پسندانہ حل نہیں تھا عقیدت مندی اور سعادت مندی کے بارنے جملہ حاضرین کو سرنگوں اور مہر بہ لب رکھا سوائے ذاکر صاحب۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ "بچہ مقدم ہے، نہ کہ کام۔ بچے کی شخصیت کے جوہر کھلنا چاہئیں، اسے کام میں لطف آنا چاہیے، اصل معاوضہ یہی ہے۔ وہ طالب علم ہے، خدانخواستہ کوئی بیگار کرنے والا مزدور نہیں۔ اگر بچہ سنور گیا تو سمجھ لیجیے کہ تعلیم کا مقصد حاصل ہو گیا، ہماری کوشش کامیاب رہی۔" ذاکر صاحب نے اپنی بات اس قدر خلوص نیت اور تبحر کے ساتھ کہی تھی کہ متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ گاندھی جی نے بنیادی تعلیم سے متعلق ایک کمیٹی کی تشکیل کی جس کا صدر ذاکر صاحب کو بنایا۔ آج تک 'ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ' ہی 'بنیادی تعلیم' کی سب سے مستند دستاویز قرار دی جاتی ہے کیونکہ گاندھی جی نے اسے سراہا تھا اور وہ اتفاق رائے سے منظور کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "ہاتھ کا نفع بخش کام" ہونا چاہیے اور "یہ نظام تعلیم رفتہ رفتہ اس قابل ہو جائے گا کہ استادوں کی تنخواہوں کا خرچ خود نکال لے۔" اس طرح ذاکر صاحب کی بدولت مدرسے میں 'تعلیمی کام' کا مقام برقرار رکھا اور اسے محض 'کام' یا محنت، مزدوری بننے سے بچا لیا۔ ان کا یہ رویہ، بچے کی محبت، عزت اور اہمیت پر دلالت کرتا ہے اور تعلیمی دنیا میں ان کی علمی بصیرت کی ایک مستقل علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ وردھا کانفرنس ۱۹۳۷ء کی مفصل روداد Educational Reconstruction نامی کتاب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔) اس ضمن میں یہ اعتراف بجا معلوم ہوتا ہے کہ 'بنیادی تعلیم' کے تار و پود تیار کرنے میں پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین اور خواجہ غلام السیدین جیسے دانشور، ادیب اور صاحبان علم و فضل کا بھرپور ہاتھ رہا ہے جو کہ ذاکر صاحب کے ہمدم و دمساز کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

ذاکر صاحب سیرت سازی اور اقدار کی پاسداری کو ہی تعلیم کا مقصد گردانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہم میں سے ہر ایک کے دل میں شیطنیت اور انسانیت موجود ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ شیطنیت کو ہمارے اندر دبائے۔ تعلیم کا سارا راز ہی یہ ہے کہ حیوانیت کو دبایا جائے اور انسانیت کی صفات کی پرورش ہو۔ (جلسہ انجمن طلبا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منعقدہ ۱۱ر اگست ۱۹۵۱) انھیں پھولوں کا شوق تھا، نت نئے پتھر جمع کرنے کے شایق تھے۔ مصوری، موسیقی، نقاشی، خطاطی، شاعری اور نادر اشیاء کے شیدائی تھے۔ ہر کام میں سلیقہ چاہتے تھے۔ انھوں نے جامعہ کے فرزندوں میں اپنے مطمح نظر اور رویوں کی جوت جگانے کی ان تھک کوشش کی۔ ایک سچے معلّم کے مصداق اوّلاً انھوں نے اپنی زندگی کو سنوارا۔ مثلاً یہ واقعہ: مجیب صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب جامعہ ملیہ کی اپنی عمارتوں کو فسادات کے سبب چھوڑنے کا خطرہ پیدا ہوا تو ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ ہمیں ہر چیز کو اس حالت میں چھوڑنا چاہیے کہ وہ لوگ جو ہمارے بعد یہاں قبضہ کریں، محسوس کریں کہ ہم اس سے محبت کرتے تھے۔" ان کی تعلیمی فکر کا مرکزی نقطہ تہذیبِ نفس ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ نفاستِ ذوق اور لطیف احساس کو ترتیب یافتہ ذہن کے نمایاں اوصاف شمار کرتے تھے۔ چند ماہ قبل طنز و مزاح کے مقبول و معروف شاعر اسرار جامعی کا شعری مجموعہ "شاعر اعظم" منظرِ عام پر آیا ہے۔ انھوں نے اسے ذاکر صاحب کے نام معنون کیا ہے۔ نیچے یہ عبارت درج ہے: جنھوں نے مجھے طالب علمی کے زمانے میں انصاری منزل کی دیوار پر پنسل سے اپنا نام لکھتے ہوئے دیکھ کر یہ سبق دیا۔

"آپ کا نام ایسا ہونا چاہیے جسے دوسرے اخباروں اور کتابوں میں سنہری حروف میں لکھا کریں، نہ کہ آپ خود اسے فرشوں اور دیواروں پر لکھیں۔" بچّوں کے نامور ادیب سید غلام حیدر کا ایک مضمون ہے "ہڈی کی پلیٹ"۔ اس میں انھوں نے اب سے تقریباً اڑتالیس سال پہلے کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جب کہ وہ مدرسۂ ابتدائی کے طالب علم تھے۔ بعض بچّوں کو بینگن کا بھرتا پسند نہیں آیا اور انھوں نے اُسے اپنی پلیٹ سے "ہڈی کی پلیٹ" میں ڈال دیا جس میں ہڈی، جلی روٹی کا ٹکڑا وغیرہ ڈالا جاتا تھا اور کسی کسی نے کچھ پانی بھی ملا دیا۔ ذاکر صاحب، شیخ الجامعہ تھے اور اکثر آجاتے۔ انھوں نے جب یہ حال دیکھا تو وہ بھی شریک ہوگئے۔ مانیٹر نے کھانے کے لیے پلیٹ پیش کی تو منع کر دیا اور ہڈی کے پلیٹ میں سے ہی کھانا شروع کر دیا۔ یوں تو بچّے خوش ہوتے تھے کہ شیخ الجامعہ صاحب انھیں بے حد عزیز رکھتے ہیں اور آکر ان کے ساتھ کھانے میں بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب صورتِ حال نے دل کا چور پکڑوا دیا اور بچّے سراسیمہ ہونے لگے۔ بڑی ہمت کر کے دو ایک نے ہڈی کی پلیٹ سے جھوٹن کھانے کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے فرمایا: "تم لوگوں کو نہیں معلوم ہے کہ تمہارے ملک میں بلکہ تمہارے اسی شہر میں یا شاید تمہارے آس پاس کی اسی بستی ہی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو اگر یہ بھی کھانے کو مل جائے جو تم نے پھینکا ہے

تو آج رات وہ بھوکے نہ سوئیں گے۔ تم نے اس کھانے کو ہڈی کی پلیٹ میں ڈال کر اس میں پانی اور روٹی کے ٹکڑے ملا کر اس قابل بھی نہیں چھوڑا جو یہ کسی کو دیا جاسکے اور اس کے کام آسکے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اُسے کھالوں تو کم سے کم میرا اپنا کھانا کسی اور بھوکے کو دیا جاسکتا ہے۔" آخر میں مصنف کا تاثر ملاحظہ ہو: "اس واقعے کا اثر کس پر کتنا ہوا یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اتنی بات ضرور جانتا ہوں کہ اس دن سے آج تک روٹی یا سالن، چاہے کیسا بھی ہو، میں پھینک نہیں سکا۔ اگر کوئی بزرگ جس سے میں کچھ کہہ نہیں سکتا، روٹی کا کوئی جلا ہوا یا کچا کنارہ توڑ کر الگ ڈال دیتا ہے تو کوشش یہی کرتا ہوں کہ اس کی نگاہ بچا کر اُسے اٹھا کر کھا جاؤں، اس لیے کہ میری آنکھوں میں وہ منظر گھومنے لگتا ہے۔" (بچوں کے ذاکر صاحب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۷ء) ذاکر صاحب نے صفائی ستھرائی کی طرف ہمیشہ دھیان دیا۔ جب وہ شیخ الجامعہ تھے تو ان کا طریقہ تھا کہ جامعہ کے اندر آتے جاتے جہاں کہیں کاغذ کا ٹکڑا نظر آجاتا تو اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتے اور اپنے دفتر میں پہنچ کر اُسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے۔ وہ اپنے کسی ساتھی کی دل داری کے لیے اُسے اپنی حالت سے لاعلم رکھ کر بخار کی حالت میں، جب کہ ہلکی ہلکی بوندیں بھی پڑ رہی ہوں، دیر تک اس کے ساتھ چہل قدمی کرسکتے تھے۔ وہ محض اس لیے قبل از وقت گھر سے دفتر کے لیے روانہ ہوا کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کون کون راہ کے کس کس موڑ پر ان کے سامنے نمودار ہوگا اور وہ پاس وضع سے باز نہیں رہ سکیں گے۔ وہ تہذیب نفس کے قائل تھے نیز نفاست ذوق اور لطیف احساس کو تربیت یافتہ ذہن کے نمایاں اوصاف میں شمار کرتے تھے۔

ذاکر صاحب قومی تعلیم کا نہایت واضح تصور رکھتے تھے۔ ان کا کاشی ودیا پیٹھ کے جلسہ تقسیم اسناد میں ۱۴ راگست ۱۹۳۵ء کو پڑھا گیا خطبہ آج کی بات نظر آتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے دیس کے موجودہ تعلیمی اور سماجی مسائل و مصائب کے پیش نظر وہ اپنے خیالات و خدشات بیان کر رہے ہوں۔ انھوں نے اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے مطمح نظر کو جس طور پیش کیا تھا اور وہ بھی کاشی ودیا پیٹھ میں فارغ التحصیل ہونے والے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، اُن کے خلوص نیت... علمی بصیرت اور آئین جواں مرداں کے مصداق حق گوئی و بے باکی کی درخشندہ مثال ہونے کے علاوہ ابنائے وطن کے جذبۂ ربط باہم اور حب وطن پر بھی دلالت کرتا ہے جو کہ دور حاضر کی تنگ نظری اور تاریک خیالی کے پیش نظر اور زیادہ متاثر کرتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ "ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی قوم کا جزو ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ اُن کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی، اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے، نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے، ہندوستان میں ان کا دین، ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے،

ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔"

یوں تو ذاکر صاحب کے افکارِ تعلیم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ نظریۂ تعلیم سے لے کر عمل تعلیم تک جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ملتے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ انھوں نے بچے کی عظمت کا احساس دلایا ہے اور سیرت سازی پر زور دیا ہے۔ وہ اقدار کی پاسداری کے علم بردار ہیں۔ انھوں نے استاد کے منصب، فرائض اور محاسن کو نہ صرف اُجاگر کیا ہے بلکہ اپنے عمل اور نمونے سے یہ بھی دکھایا ہے کہ استاد کو خادم و مخدوم دونوں بنا کر ہی اُسے صحیح معنیٰ میں جواب دہ اور پختہ وابستگی کا نمونہ بنایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بنیادی تعلیم، میں ہاتھ کے کام کی تعلیمی حیثیت کو مسلم بنایا اور حرفے کو ربط کا ایک اہم مرکز قرار دیا۔ اس ضمن میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بچے کو بندھوا مزدور بننے سے بچا لیا اور حرفے کی ثمرآوری، کو بھی برقرار رکھا۔ تعلیم کو ان کا ایک اور فیض محدود تخصص کی نارسائی کو اجاگر کرنے اور کشادگی ذہن پر زور دینے سے حاصل ہوا۔ انھوں نے واضح کر دیا کہ محدود تخصص اپنی علمی خودکشی کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے نظر پیدا نہیں ہوتی، وہ صاف طور پر بتاتے ہیں کہ علمی وقار کی ایک سطح حاصل کرنے کے بعد ہی اختصاص کی منزل آتی ہے۔ انھوں نے بچوں کی تدریس میں ہم درسی مشاغل کو اہم مقام دیا ہے۔ ان کے یہاں تعلیم کا دوسرا نام تہذیبِ نفس ہے۔

ذاکر صاحب تعلیم کے میدانِ کارزار میں ایک ایسے رہنما نظر آتے ہیں جن کی زندگی اپنے قول و فعل کے ربطِ باہم کی ایک غیر معمولی مثال ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ وہ مجسم پیکرِ عزم و عمل تھے۔

محمد یونس

میری یادوں کے چند اوراق

میرے ذہن پر ڈاکٹر ذاکر حسین کی یادوں کا پہلا نقش، نقش سے زیادہ تصادم کہوں تو بہتر ہوگا۔ یہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ صوبۂ سرحد میں کانگریس کی گورنمنٹ تھی اور ڈاکٹر خاں صاحب اس کے سربراہ تھے۔ علی گڑھ کا شیخ الجامعہ کون ہو، یہ بات زیرِ غور تھی؛ ذاکر صاحب پر زور دیا جا رہا تھا کہ وہ عہدے کو سنبھال لیں۔ بے حد پُرسکون انداز میں ذاکر صاحب نے جو جواب دیا تھا وہ آج بھی مشہور ہے:

"علی گڑھ ایک صاحبِ حیثیت ادارہ ہے، اس کو قابل لوگوں کی کمی نہ ہوگی۔ اس میں اتنی استطاعت ہے کہ وہ اپنے شیخ الجامعہ کو چار ہزار روپے ماہوار تنخواہ دے سکتا ہے، لیکن جامعہ صرف پچھتّر روپے ماہوار کی حیثیت رکھتا ہے بہتر یہ ہے کہ میں یہیں رہوں۔"

ذاکر صاحب سے اور جامعہ سے میری وابستگی اس بیل کی مانند ہے جو ایک تناور درخت کے چاروں طرف لپٹ جاتی ہے۔ میرے حافظے میں نہ معلوم کتنی یادوں نے نشیمن بنا رکھا ہے۔ جن میں سب سے پہلی یاد ذاکر صاحب اور جواہر لال جی کے بارے میں ہے۔

۱۹۴۷ء کے پُر آشوب دن تھے۔ میں جواہر لال جی کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ رات کو فون کی گھنٹی بجی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب ذاکر حسین صاحب جامعہ کے پرنسپل تھے۔ انھوں نے اپنے گھر سے فون کیا تھا جو جامعہ کے احاطے ہی میں تھا اور کھلے کے نزدیک انھوں نے بہت ہی اداس اور متفکر لہجے میں فون پر کہا کہ جامعہ کی چاروں اطراف جنونی لوگوں کا ہجوم بڑھتا آ رہا ہے اور جامعہ کے لوگوں کی زندگیوں کا خطرہ ہے۔ انھوں نے آخری دو الفاظ کہے ـــــ "خدا حافظ!"

میں اوپر کی طرف دوڑا۔ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ وہ فوراً اٹھ گئے، کار بلوائی اور مجھے بھی بٹھا لیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ ۱۹۳۶ء کی خاکی رنگ کی بیوک تھی۔ ہم لوگ

جامعہ پہنچے، دیکھا کا جامعہ کا پورا عملہ اور تھوڑے سے طلباء نے جامعہ کی صدر عمارت میں پناہ لے رکھی تھی۔ شرپسند لاٹھیاں وغیرہ لیے ہوئے ادارے کے باہر اکٹھے تھے۔ ہجوم نے نہرو کو فوراً پہچان لیا اور ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جواہر لال جی کو غصہ آگیا اور وہ اپنے مخصوص انداز میں ان لوگوں پر برس پڑے۔ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کے اساتذہ اور طلباء کو دہشت زدہ کرنے کے سلسلے میں خوب جھڑکا۔ ہجوم نے شرمندگی سے سر جھکا لیے اور اپنے غلط برتاؤ کی معافی بھی مانگی۔ شرمسار چہرے لیے وہ لوگ واپس چلے گئے اور ہم لوگ عمارت میں داخل ہوئے۔ ذاکر صاحب کچھ اور لوگوں کے ساتھ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جواہر لال جی کی ذاکر صاحب سے محبت دیکھ کر اس پر ہر آدمی جذباتی ہو گیا۔ مجھے ذاکر صاحب کے الفاظ آج بھی یاد ہیں :

"پنڈت جی! آپ نے عزت سے زندہ رہنے کا سبق بھی دیا ہے اور اب عزت سے مرنے کا راستہ بھی دکھا دیا۔ اب ہمیں اپنی قسمت آزمانے دیجئے۔"

جب ہم لوگ جامعہ سے واپس لوٹ رہے تھے تو بھوگل میں ہماری کار کو پناہ گزینوں نے گھیر لیا، وہ نہرو کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے فوراً رکوائی اور خود اچھل کر فوراً بیوک کے بونٹ پر چڑھ گئے اور پرجوش بھیڑ کو ڈانٹا — میں ابھی جامعہ سے آرہا ہوں۔ میں نے وہاں کیا دیکھا جانتے ہو؟ ذاکر حسین اور ان کے ساتھی جو اصل معنوں میں سچے وطن پرست ہیں، وہ آج کل کے دیوانگی کے عالم میں اپنے آپ کو غیر محسوس اور دہشت زدہ محسوس کر رہے ہیں۔ کیا آپ کا یہ رویہ قابل معافی ہے؟ مجمع سے "نہیں — نہیں" کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور پھر انھوں نے عہد کیا کہ وہ مسلمانوں کی حفاظت کریں گے۔

اسی دوران یہ بات سردار پٹیل تک پہنچ گئی جن کی رہائش گاہ پنڈت جی کے سامنے سڑک پار دوری پر ہی تھی۔ ان کو پتہ چلا تھا کہ نہرو بغیر کسی محافظ دستے کو لیے ذاکر صاحب اور جامعہ کو بچانے نکل پڑے تھے۔ شدید خطرے کا احساس کرتے ہوئے انھوں نے نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے رابطہ قائم کیا۔ اسی وقت کوئی حفاظتی دستہ موجود نہیں تھا لہٰذا انھوں نے چند جیپوں کا انتظام کیا اور ان پر مشین گنیں نصب کر کے فوراً جائے وقوع پر پہنچے جہاں نہرو بھیڑ کو ڈانٹ رہے تھے۔ اس دن میں نے دیکھا کہ لوگ چلا رہے تھے "پنڈت ماؤنٹ بیٹن زندہ باد!"

اگلی صبح سردار پٹیل نے مجھے اپنے گھر بلوایا اور بگڑ پڑے — "یونس تم کیا چاہتے ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ تم نے کیا کیا؟ اگر جواہر لال کو کچھ ہو گیا ہوتا تو؟ پھر شاید ان کو اپنے الفاظ کی کرختگی کا احساس ہوا اور انھوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اداسی سے بولے۔ "کیا تم کو اس بات کا احساس ہے کہ کیا ہو گیا ہوتا؟ مجھ سے وعدہ کرو اور صدق دل

سے عہد کرو کہ آئندہ ایسا نہیں کروگے۔"

بنیادی تعلیم کی اسکیم کو فروغ دینے کے سلسلے میں ذاکر صاحب کا گاندھی جی سے رابطہ قائم ہوا۔ جناح صاحب کی ملاقات ذاکر صاحب سے دہلی میں ایک پارٹی میں ہوئی۔ ایک دم انھوں نے مسلمانوں کے خلاف اسکیم تیار کرنے کے بارے میں سوال کیا۔ ذاکر صاحب نے نہایت ملائمت سے جواب دیا کہ اُن کو اسکیم کے کس حصے پر اعتراض ہے۔ جناح نے جواب دیا کہ تم سمجھتے ہو کہ میرے پاس پڑھنے کے لیے تمہاری اسکیم سے بہتر کوئی اور چیز نہیں۔

ایک دفعہ بیگم ذاکر حسین کے پاس کوئی آیا اور کہا آپ کے شوہر ایک دن ہندوستان کے شہنشاہ بنیں گے۔ بیگم صاحبہ نے پلٹ کر جواب دیا: "مُوا! کھانے کو تو ہے نہیں، بادشاہ بنیں گے۔"

پھولوں سے ذاکر صاحب کا عشق بہت مشہور ہے۔ کبھی کبھی تو میں نے یہ دیکھا کہ کیکٹس یا کوئی چھوٹے سے خوشنما پودے کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے اس کو رومال میں لپیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یقیناً جیسے گھر پہنچ کر جامعہ کے باغیچے یا صدر جمہوریہ کی جائے رہائش پر کسی کونے میں اس کو لگا دیا ہوگا۔

عظیم ہستیوں کی ایک کہکشاں تھی —— جیسے ذاکر صاحب، عابد صاحب، مجیب صاحب، بیگم زیدی، سیدین صاحب، شفیق صاحب۔ ایک بار ذاکر صاحب نے شفیق صاحب اور مجیب صاحب کو پشاور بھیجا۔ انھوں نے میرے یہاں قیام کیا اور ہم سب نے کار دِل پر اکٹھا سفر کرکے جامعہ کے لیے فنڈ اکٹھا کیا۔ اِن لوگوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کی سادگی کو نئی بصیرت عطا کی۔ یہ سب ایک دوسرے کے بہت قریبی اور مخلص دوست تھے ان لوگوں کی بڑے بھائی کی طرح تعظیم کرتا تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں میرے اپنے بڑے بھائی یحییٰ خاں صوبۂ سرحد میں وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے کہا کہ کیا اچھا ہو کہ سیدین صاحب اس علاقے میں تعلیم کے ڈائریکٹر جنرل ہوکر آجائیں! میں گیا اور ذاکر صاحب سے پوچھا —— "یہ بہت ہی مناسب خیال ہے" انھوں نے جواب دیا —— "سیدین صاحب سے پوچھئے!"

علاوہ اس کے ذاکر صاحب تعلیمی میدان کے روشن چراغ تھے۔ ذاکر صاحب ہمارے ملک کی کشادہ دل جمہوریت کی روایات کے زبردست حامی تھے، وہ گاندھی اور نہرو کے بے حد مخلص پیرو تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ طلبا ان دونوں رہنماؤں کے اعلیٰ مقاصد پر عمل پیرا ہوں۔

ان کی یاد آج بھی تازہ ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ آخر دم تک وہ اپنے اعلیٰ مقاصد کے لیے کام کرتے رہے جن کے لیے انھوں نے زندگی بھر جانفشانی کی۔

ذاکر صاحب کا اپنے مقاصد دوسروں تک پہنچانے کا ایک انوکھا انداز تھا — سیدھا اور سہل۔ اس سلسلے میں وہ بالکل گاندھی جی کی طرح تھے ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا:

"ہندوستان کا تصور سیب ہے نہ امرود۔ ہندوستان کے دو ہی لعل ہیں — ایک گاندھی — دوسرا نہرو۔ ہم گاندھی جی اور پنڈت جی کے بغیر تو ہندوستان کا تصور ہی نہیں کر سکتے!"

یہ ہیں وہ عزیز از جاں یادیں جو میرے محترم اتالیق — ذاکر صاحب سے وابستہ ہیں۔

ایل۔ پی۔ سنگھ

ڈاکٹر ذاکر حسین

میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو جتنا دیکھا اور سمجھا، اتنا ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی گوناگوں کار ہائے نمایاں اور کامیابیوں سے کہیں زیادہ عظیم تھے۔ وہ ایسے کمیاب اشخاص میں سے تھے جن کا وجود ایک اخلاقی اور سماجی مقصد ہوتا ہے اور انسانی روح کی نیکی اور اس کی صلاحیت کی مثال پیش کر کے لوگوں کو ان کے محدود وجود سے اوپر اٹھاتا ہے۔

ذاکر صاحب کے ریاست کے گورنر بننے سے پہلے میں وہاں سے جا چکا تھا مگر ایک بار جب وہ دہلی آئے تو مجھ سے بہت اچھی طرح ملے اور ہماری بات چیت کا سلسلہ بہار کے حالات کی طرف مڑ گیا جہاں میں نے چیف سکریٹری کی حیثیت سے چند سال کام کیا تھا۔ میں ان سب گورنروں سے واقف ہوں جو آزادی کے بعد سے اس عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ سب قابل احترام تھے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ریاستی وزارت سے اُن کے تعلقات میں کش مکش رہی۔ ایک گورنر کے دور میں تو انتظامیہ پر اس طرح اثر انداز ہونے کی کوشش کی گئی جس میں سیاسی حقائق اور نمائندہ حکومت کی حیثیت کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ ایک دوسرے گورنر کے عہد میں اس حد تک بے تعلقی دکھائی گئی کہ حکومت کے طریقۂ کار کی طرف سے تقریباً بے اعتنائی برتی گئی تیسرے گورنر کا قصہ یہ ہے کہ انھوں نے وزیر اعلیٰ سے اپنی مدت کار بڑھائے جانے کی سفارش کرانی چاہی اور اس طرح انھوں نے اپنے اُس اخلاقی اختیار کی قدر و قیمت گھٹالی جو ان کے مشوروں کو باوزن بنانے کے لیے ضروری تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین باوقار انداز سے ریاست کی کارکردگی میں مناسب دل چسپی لیتے تھے اور دور اندیشی اور نفیس پیرائے میں وزارت کو مشورہ دیتے تھے۔ وزارت کی سربراہی ممتاز اور تجربہ کار سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی، لیکن اس میں کمزور کرنے والے اندرونی اختلافات بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ چند سال پہلے ہی ریاست کے ایک بہت بڑے حصے میں وحشیانہ فسادات ہو چکے تھے۔ ایک مسئلہ ریاست کی تعلیمی پسماندگی کا بھی تھا۔ کیونکہ بہار کو جو زیادہ تر دیہی علاقے پر پھیلا ہوا تھا، ۱۹۱۲ء میں ہی ایک الگ صوبہ بنایا گیا تھا۔ یہ خیال بہت عام تھا کہ

حکومت ہند ایسے شخص کو گورنر کے عہدے پر مامور کرکے بہار کے اہم مفاد کو پورا کرسکتی ہے جس میں اخلاق اختیار کو بروئے کار لانے، وزارت کو مل جل کر کام کرنے کے لیے لوگوں میں جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔ وہ شخص ایسا ہو جو اپنے دانشورانہ امتیاز اور تعلیمی تجربے کی وجہ سے تعلیمی اداروں کی کارکردگی کی رہنمائی کرسکے اور ان پر اثر انداز ہو سکے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ان تینوں صلاحیتوں کے مالک تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہار کو صدر جمہوریہ ہند کا صحیح معنوں میں نایاب تحفہ تھے۔

۱۹۵۰ء میں ریاست کے وزیر تعلیم بنیادی تعلیم کے فروغ میں بہت دل چسپی رکھتے تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین گاندھی جی کے ایما پر اس سے گہرائی کے ساتھ جڑے رہتے تھے۔ اگرچہ طریقۂ تعلیم قومی سطح پر قابل قبول نہیں ہو سکا یا بہار میں اس کا فروغ نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے اس نظریہ کو اپنانے میں کوتاہی برتی گئی کہ اسکول کی سطح کی تعلیم مالی لحاظ سے خود کفیل نہیں ہو سکتی اور یہ کہ بہترین تعلیم کو ناقابل حصول مالی خود کفالت کے تحت نہیں لانا چاہیے۔ تعلیم کے میدان میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا اختراعی رویہ اس طرح غلط فہمی کا شکار ہو کر نزاع کے بنجر میں گم ہو گیا۔

گورنر عام طور سے ریاستی یونیورسٹیوں کا چانسلر ہوتا ہے اور یونیورسٹیوں میں نافذ قانون کے تحت چانسلر کو چند امتیازی اور خصوصی اختیارات حاصل ہیں۔ چانسلر کی حیثیت سے گورنر کو وزارتی مشورے پر قانوناً عمل کرنا ضروری نہیں ہے جب تک وہ ایسا قانون بنائے جانے پر رضامند نہ ہو جس میں وزارت کے مشورے پر عمل کرنے کی ہدایت دی گئی ہو۔ اس وقت جب وزارتِ بہار یونیورسٹی ایکٹ میں ایک ایسی ترمیم کرنے والی تھی جس کے تحت بہار کی یونیورسٹیاں ایک معمولی سرکاری شعبہ بن کر رہ جائیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بہت سختی کے ساتھ انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔

بہار کی تعلیمی برادری نے نہایت اعتماد اور احترام سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرف دیکھا اور راج بھون اُن کے دور میں علمی مذاکرات کا مرکز بن گیا۔ ریاست کی تعلیمی برادری اس کے کالجوں اور ہائی اسکولوں میں پھیلی ہوئی ہے اور گورنر سے تعلقات کی بنا پر تعلیمی برادری عوامی اعتماد کو اس درجے پر پہنچانے میں مددگار ہوئی جس کا گورنر مجاز ہے۔

اپنے ذاتی برتاؤ میں ڈاکٹر ذاکر حسین شریف مہذب اور انتہائی بامروت تھے لیکن عوامی مسئلے پر بات کرتے وقت ان کی فراست پوری طرح کارفرما ہوتی تھی۔ اس کا اظہار ان کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو ہمارے منصوبوں کے بارے میں انھوں نے راجیہ سبھا میں کی تھی۔ انھوں نے اس تاریخ کو نامناسب قرار دیا جب ہمارا پہلا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ایک خاص عمر کے تمام بچوں کو تعلیم مہیا کرنے کے دستوری راہنما اصول کو صفائی سے منصوبے میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ منصوبے پر اس سے بڑا اعتراض کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ ذاکر صاحب کے اس قول میں صرف اتنا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ تمام بچوں

کو مفت تعلیم بہیا کرنے کی بے انتہا اہمیت اور ضرورت کو بطور عملی پالیسی کے منظور کرنے میں مزید چالیس سال گزر گئے۔

۱۹۵۶ء کے موسم بہار سے لے کر ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال کے بعد تک وزارتِ داخلہ میں کام کرنے کے دوران مجھے ڈاکٹر صاحب کی کارکردگی سے واقف ہوتے اور جب وہ صدر تھے تو ان سے ذاتی ملاقاتوں کے چند مواقع ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ اُن ممتاز شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے ۱۹۶۱ء کے موسم بہار میں منعقدہ قومی یک جہتی کانفرنس میں شرکت کی اور اس میں قابلِ ذکر رول ادا کیا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں چند قابلِ توجہ باتیں کہی تھیں۔ مثلاً انھوں نے کہا تھا کہ "تشویش کی زیادہ گنجائش نہیں ہے کیونکہ ہندوستانیت کے ہزاروں عنصر ہیں جو ہم میں سے ہر ایک کے روحانی وجود کا مکمل اجزائے ترکیبی بن گئے ہیں۔ ہماری ایک طویل تاریخ ہے اور تصورات کی وہ طویل تاریخ ہمیں عزیز ہے۔ آزادی کی کامیاب جدوجہد، ساتھ ساتھ مصیبت جھیلتے رہنے کی پرانی اور نئی یادیں باقی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا . . . . دقت یہ ہے کہ ہندوستانیت ثقافتی ہندوستانیت ہے۔ یہ سیاسی ہندوستانیت نہیں ہے۔ ریاست ہمارے ثقافتی اتحاد پر قائم ہوئی ہے . . . . لیکن اب ہم سب کو طاقت میں حصہ دار بننا ہے اور طاقت کی حصہ داری کی مشکل مہم میں سب برابر کے شریک نہیں ہیں۔" ہندوستانی قومیت کی مضبوط بنیاد اور اسے درپیش موجودہ عمل چیلنجوں کے تجزیے کے بعد انھوں نے ہماری جارحانہ اور تنگ نظر انتخابی سیاست پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے طنزاً کہا، یہ وہ ہتھیار تھا جس کے ذریعے وہ موثر انداز میں بات کہتے تھے گو کہ حقائق کے بارے میں مجھے پورا علم نہیں ہے۔ مولانا آزاد ہماری قومی زندگی میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ جب انتخاب میں کھڑے ہوئے تو ان کا حلقۂ انتخاب رام پور میں تلاش کیا گیا کیونکہ وہاں مسلمان رائے دھندوں کی کافی بڑی تعداد تھی۔ لیکن مولانا نے رام پور سے چناؤ لڑنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انھیں گڑگاؤں سے کھڑا کیا گیا کیونکہ وہاں میوؤں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ہم مولانا کو اس حلقۂ انتخاب سے کھڑا کر کے ہار جانے دیتے جس میں صد فیصد ہندو رائے دہندگان ہوتے۔ مولانا ہار جاتے لیکن یہ ہار یک جہتی کی اخلاقی فتح ہوتی۔ ہو سکتا ہے پارٹی کو اس سے نقصان ہوتا لیکن اس کے بعد یک جہتی کے زیادہ طاقتور پروگرام کے ساتھ وہ فتح یاب ہوتی . . . . ہندو مسلم تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہم لوگ برسوں سے مل جل کر رہ رہے ہیں اور ہم نے زندگی کا ایک ڈھانچہ بنایا ہے جو بے حد دلکش اور انتہائی حسین ہے لیکن اب اس ڈھانچے کو تہس نہس کر کے بدنما بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ہندو مسلم مل جل کر رہتے آئے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہے ہیں۔

وہ غلامی کی اندھیری رات میں ساتھ ساتھ رہے تھے اور اب جب کہ ملک آزاد ہے انھیں اپنے دلوں میں بے گانگی نہیں لانی چاہیے۔ ذاکر صاحب نے ایک جلسۂ عام میں کی گئی تقریر میں کہا تھا کہ ثقافتیں نہیں ٹکراتیں، اس کے برعکس تہذیبیں وحشیانہ پن کو دباتی ہیں۔ بہار میں جین مت کے متعلق بولتے ہوئے انھوں نے ہندوستان کے سیاق و سباق میں جینیوں کے "عدم مطلقیت" یا "سیادواد" کے تصور کی بے انتہا اہمیت کا ذکر کیا تھا۔ یہی وہ فکر ہے جو برابر ان کے خیالات اور تقریروں میں ملتی ہے۔

صدارت کا عہدہ سنبھالتے وقت انھوں نے اعلان کیا تھا کہ سارا بھارت ان کا گھر ہے اور اس میں بسنے والے لوگ ان کا خاندان ہیں۔ آپ لوگوں نے کچھ مدت کے لیے مجھے اس خاندان کا بزرگ چنا ہے۔ یہ میری ایماندارانہ کوشش ہوگی کہ میں اس گھر کو مضبوط اور خوب صورت بناؤں۔ انھوں نے ہند کے متعلق کہا تھا کہ "یہ ان قدیم عوام کی نوخیز ریاست ہے جنھوں نے ہزارہا سال کے عرصے میں اور مختلف نسلی عناصر کے تعاون سے اپنے مخصوص انداز میں زندۂ جاوید اقدار مطلقہ کے حصول کی کوشش کی ہے۔ میں خود کو ان اقدار کی خدمت کے لیے وقف کرتا ہوں۔" میں ایک کارکن کی حیثیت سے اس موقع پر موجود تھا اور مجھے وہ تاثر واضح طور پر یاد ہے جو سننے والوں پر اس تقریر سے مرتب ہوا تھا۔

صدر ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلقات وزیر اعظم اور عام طور پر وزارت سے ایسے تھے جن پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی تھی۔ وہ صحیح اور تعمیری انسان تھے۔ اخلاق اور دستور سے متعلق ان کے اپنے خیالات اور اقدار تھے اور انھیں کٹھ پتلی نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اس بات سے سبھی واقف تھے کہ وقت ضرورت وہ اپنے خیالات کا اظہار صفائی سے کریں گے لیکن ایسا وہ خوش اسلوبی اور وقار کے ساتھ کریں گے کیونکہ ان کے ہر برتاؤ میں یہی نمایاں خصوصیت تھی۔ انھوں نے وزیر اعظم کے ساتھ اپنی گفتگو کو اور عام طور پر دوسروں سے بھی اپنی گفتگو کو ہمیشہ راز داری میں رکھا۔ نجی گفتگو تک میں کبھی انھوں نے وزیروں پر اعتراض کرنے سے پرہیز کیا۔ بے جا طرف داری کی سیاست سے خود کو نہایت اعلیٰ ظرفی کے ساتھ الگ رکھا لیکن ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور دستوری اہمیت کے رفاہ عامہ کے مسائل میں پُرجوش دل چسپی لی۔ عوام کی طرف اپنے فرض کا انھیں اس قدر احساس تھا کہ خراب صحت کے باوجود انھوں نے شمالی مشرقی ہندوستان کا دشوار گزار سفر کیا جو ان کے جان لیوا دل کے دورے کی وجہ بنا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہندوستان کے گنگا جمنی کلچر کی، اس کی وسیع تر انسان دوستی، رواداری اور جمالیاتی حسیت کی بہترین مثال پیش کی۔ اسلام کے بنیادی اصولوں اور اس صوفیانہ عنصر پر انھیں یقینِ محکم تھا جس کا اظہار تصوف کی شاعری میں ہوا ہے۔ لیکن وہ ہر طرح کی تنگ نظری

اور تعصب کے خلاف تھے۔ ہندوستانی وراثت کے طور پر اسلامی ثقافت کے تحفظ کی آرزو رکھتے ہوئے انھوں نے اُسے سیکولر قوم پرستی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے حب الوطنی کے نظریہ میں نہ صرف ملک کی تمام دھرتی اور اس کے سارے دریا شامل تھے بلکہ اس کی تمام ثقافتیں اور سارے فلسفے بھی اس نظریہ کا جزو ہیں۔ ان کے پاس ذہنی جستجو کا لامحدود خزانہ تھا اور وہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے علم کو فروغ دینے میں یقین رکھتے تھے۔ وہ عقیدے اور علم میں یگانگت پیدا کرنا چاہتے تھے اور خود ان کی زندگی اس یگانگت کی مثال تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی کے زیر اثر آئے اور اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک وہ گاندھی وادی رہے، سچائی، عدم تشدد اور سماج کی خدمت کے لیے اُن کی زندگی وقف رہی۔ ہماری طویل تاریخ میں ان جیسی گوناگوں شخصیت شاذ و نادر ہی ملتی ہے جو روحانیت، دانش وری اور ثقافت کی تکمیل کا مجموعہ ہو۔

چنچل سرکار

ڈاکٹر ذاکر حسین سے بات چیت

ذاکر صاحب سے وابستہ میری یاد زیادہ تر مختلف مواقع اور مختلف موضوعات پر کی گئی گفتگو پر مشتمل ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کا کوئی قریبی رازدار یا کچھ اور تھا بس محض ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے جس نے ہم کو بہت جلد ہی قربت کے دھاگوں میں گوندھ لیا تھا۔ وہ اکثر مجھے بے مقصد، بس یوں ہی گپ شپ کے لیے بلوا لیا کرتے تھے۔ انھیں کی طرح دو حضرات اور بھی تھے جن کو میں جانتا تھا: ایک تھے ڈاکٹر ایچ۔ سی۔ مکرجی ایک ماہر تعلیم، مذہباً عیسائی نہایت ہی خلیق انسان جو مجلسِ آئین کے قائم مقام تھے اور بعد میں مغربی بنگال کے حاکم مقرر ہوئے۔ دوسرے تھے ٹی۔ ٹی۔ کرشنمچاری، جب وہ وزیر معاشیات تھے۔ میں خصوصی طور پر محترمہ کملا دیوی چیٹوپادھیائے کا ذکر کروں گا گو کہ میری ان سے ملاقات کم ہی ہو پائی۔

ان تینوں حضرات سے گفتگو جب جب ہوئی ایک بات مشترک رہی کہ دورانِ گفتگو کوئی ٹیلی فون نہیں، کوئی پیام سلام نہیں، کوئی بیرا ورملاقاتی نہیں ہوتا تھا جو ہماری بات چیت میں مخل ہوتا۔ میرے لیے یہ بڑی مسرت اور فخر کی بات تھی کہ ان سے مل کر ان لوگوں کے علم، معلومات اور تجربات پر مبنی گفتگو سن کر محو ہو جایا کرتا تھا۔ جس انداز سے وہ لوگ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کا خوش دلی اور جامع انداز سے ذکر کرتے تھے تو اس میں کسی قسم کی انانیت کا عنصر نہیں ہوتا تھا اور یہ تھی پہچان مہذب اور قابل لوگوں کی۔

میں واقعہ کے طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات بہت پہلے ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ تعلیم کے موضوع پر ان کے مختلف مضامین پڑھ کر میں ان سے بہت متاثر ہوا اور میں نے کلکتے سے ان کو خط لکھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جب میں دہلی آؤں تو اُن سے ملوں۔ میں دلی آیا اور میں نے ان کو فون کیا۔ جامعہ نگر میں وہ مجھے ایک خیمے کے اندر ملے جو ان کا دفتر تھا۔ میں وہاں تھوڑی دیر رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میری ان سے کوئی خاص بات ہوئی۔ میں ان کے دورانِ نائب صدارت زیادہ ملا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں کہ میں نے کبھی ان سے جامعہ میں ہوئی ہماری پہلی ملاقات کا ذکر کیا ہو۔

ہماری ملاقاتیں ہمیشہ مولانا آزاد روڈ پر واقع نائب صدر کی رہائش پر ہی ہوا کرتی تھیں یہ اس سے پہلے کی بات ہے کہ جب وی۔ وی۔ گری نے اس مکان میں آفس سے ملحق ایک ذیلی گھر بنوایا تھا۔ لیکن یہ تو ایک مکمل مکان تھا۔ ذاکر صاحب کو پتھر جمع کرنے کا بہت شوق تھا، ان میں سے کچھ تو بہت خوب صورت رنگ برنگے تھے جو ملاقاتی کمرے میں ایک میز پر سجے رہا کرتے تھے ایک اور بات جو مجھے یاد آتی ہے وہ یہ کہ کمرے کی سجاوٹ مشرق اور مشرق وسطیٰ سے زیادہ قریب تھی اور مغرب کے رنگ کی آمیزش کم تھی۔ وہ بے حد خوش لباس رہا کرتے تھے۔ میں جب بھی ملا ان کو ایک اچھی اور متناسب سلی ہوئی شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں پایا مع کھادی کی یا شیروانی کی ہم رنگ ٹوپی کے۔ آنکھوں پر موٹا سیاہ چشمہ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ جب وہ بہار کے گورنر تھے تو اُسی سے متعلق باتیں کر رہے تھے انھوں نے کہا میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہوں" تاکہ مجھے صحیح اور پوری طرح سے اندازہ ہوسکے کہ ریاست میں کیا ہو رہا ہے۔ لوگ ان سے ملنے کو بہت بے قرار رہا کرتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ پنڈت جواہر لال کے بہت قریب ہیں۔" جب ان کو پتہ چلا کہ میرے پنڈت جواہر لال نہرو سے برائے نام تعلقات ہیں تو انھوں نے آنا کم کر دیا۔" خیر لفظ "برائے نام" تو صحیح نہیں ہے لیکن بہر حال یہ ان کا کہنا تھا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران ہم لوگ کئی بار ملے ظاہر ہے گفتگو کا موضوع ہندوستانی مسلمان تھے۔ ذاکر صاحب بے حد تلخی محسوس کر رہے تھے، مسلمانوں پر لگائی گئی بہتان سے کہ وہ ملک کے وفادار نہیں۔" آپ جانتے ہی ہیں کہ میرے بارے میں ہر طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں ——" انھوں نے کہا —" مثال کے طور پر میں اپنے ہی گھر میں ایک طرح سے "نظر بند" ہوں، دوسرے یہ کہ میرا بیٹا جو پائلٹ ہے جس کے جہاز میں ہندوستان کے اعلیٰ ملٹری آفیسرز ہیں اور اس نے جہاز پاکستان لے جانے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی اس بات کا پتہ چل گیا تھا۔" وہ رکے اور کہا "چنچل! تم جانتے ہو کہ میرے کوئی بیٹا نہیں۔"

دوسرے واقعے میں تلخی سے زیادہ صدمے کا اظہار تھا۔ ان کے داماد انھوں نے کہا دفاعی محکمے میں جانے کا خواہش مند تھا اور امتحان میں بھی بیٹھا تھا۔ جب وہ اپنا نتیجہ لینے گیا تو ڈیوٹی پر تعینات افسر نے کہا "تم اپنا نتیجہ پاکستان سے معلوم کرو" مجھے یقین ہے اور میں صحیح کہہ رہا ہوں کہ یہ بات میرے داماد سے کہی گئی تھی مگر میں لرز گیا۔" ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں ایک کہانی انھوں نے مجھے اور سنائی جو مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ سرکاری دورے پر مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک (شاید مصر) گئے۔ ایک خاص اجتماع کے موقعے پر ایک بے حد معزز مذہبی انسان نے مجھ سے پوچھا "ہندوستان میں کتنے مسلمان ہیں؟" میں نے جواب دیا

"ایک کروڑ سے زیادہ" ذاکر صاحب نے کہا اور جن لوگوں نے یہ سوال پوچھا تھا ان کے منہ تک گئے۔ "اتنے زیادہ؟" اس نے ناقابل یقین لہجے میں کہا۔

میں پہلی بار علی گڑھ گیا ایک وفد کے رکن کی حیثیت سے۔ اس وفد کا کام دس مختلف یونیورسٹیوں میں طالب علموں میں پھیلے انتشار کے بارے میں ایک رپورٹ دینا تھا۔ میں نے بہت سے اساتذہ سے بات کی وائس چانسلر ذاکر صاحب کے بہت سے دل چسپ اور اہم کارناموں کے راز افشا ہوئے جب کہ اس وقت ذاکر صاحب علی گڑھ سے جا چکے تھے اور کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر تھے۔

استادوں نے مزید یہ بھی بتایا کہ ہم لوگ جو تحقیقی کام کر رہے تھے ذاکر صاحب اس میں بہت دل چسپی لیتے تھے اور وہ ہم سے وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیالات بھی کرتے تھے۔ اگر کسی نے اپنے شعبے میں کتاب لکھی ہے تو ذاکر صاحب اس کوشش کی خوب مدح سرائی کرتے تھے اور پھر مصنف سے اس کتاب کے موضوع اور جزو کتاب پر مفصل بات چیت بھی کرتے تھے اور یہ اپنی جگہ پر اساتذہ کی زبردست حوصلہ افزائی ہوئی تھی اور وہ سوچتے تھے کہ وائس چانسلر بذات خود ہمارے کاموں میں دل چسپی لیتے ہیں۔

ماضی کے اس پس منظر میں، میرا خیال ہے کہ یہ بہت غلطی کی گئی کہ ان کو یونیورسٹی سے گھسیٹ کر ہندوستان کا نائب صدر بنا دیا گیا اور اس کے بعد صدر بھی بنا دیئے گئے۔ میں نائب صدر کے طور پر ان کو کیسا سمجھتا ہوں اس کا ذکر آگے چل کر کروں گا بلکہ مجھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ بہ حیثیت صدر بھی وہ مطمئن تھے۔ ان کے سپرد تو مجموعی طور پر ہندوستان کے تعلیمی اداروں کی نگرانی ہونا چاہیے تھی۔ کبھی یہاں ہیں تو کبھی وہاں! کبھی اساتذہ، طالب علموں کبھی محققین سے بحث و مباحثہ کر رہے ہیں، کبھی یونین والوں کو صلاح مشورہ دے رہے ہیں، کبھی با صلاحیت فنکاروں کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ وہ ہماری یونیورسٹیوں کے ماحول کو بہتر سے بہتر خوشگوار بنانے کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے۔

میں آپ کو ان کا ایک حصہ سناتے جا رہا ہوں جو کتابوں اور مضامین میں شائع بھی ہوئے ہیں اور میرے دوسرے قصے کی بنیاد ہیں۔ ایک دفعہ وہ مولانا آزاد سے کسی بات پر خفا ہو گئے تھے ممکن ہے مولانا نے کوئی بات کہہ دی ہو جو ذاکر صاحب کو گراں گزری ہو۔ جب ذاکر صاحب دہلی آئے تو ایک مشترکہ دوست نے ان کو بتایا کہ مولانا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ "مولانا سے کہنا کہ میرے گھر سے ان کے گھر کا فاصلہ اتنا ہی ہے جتنا ان کے گھر کا میرے گھر سے"۔ یہ ذاکر صاحب کا جواب تھا۔

دوسرے واقعہ کا تعلق اس پر روشنی ڈالتا ہے کہ راشٹرپتی بھون میں ذاکر صاحب کا کیا طرز زندگی تھا۔ وہ ہر ایک ملاقاتی سے باہر کار تک ملنے آتے تھے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

ایک افسرِ انتظامیہ نے گو کہ اسے صدرِ حکومت کی ذہانت اور سمجھ پر کوئی شبہ نہیں تھا، پھر بھی اصولوں کی ضابطگی لازم تھی، ذاکر صاحب سے کہا کہ وہ سرکاری معاہدہ کی ضابطگی کی خلاف ورزی کر رہے ہیں — "آپ اپنے سرکاری ضابطے اپنے پاس رکھیے —" ذاکر صاحب نے جواب دیا — "اور میرے اصول میرے ساتھ ہیں۔"

ہم لوگ ایک بار انڈیا انٹرنیشنل، دہلی میں ایک سمینار منعقد کر رہے تھے (اس کا موضوع بھول گیا ہوں) میرے ساتھیوں نے سوچا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے شرکت کی اور تقریر کی درخواست کی جائے۔ میرے ساتھیوں نے مجھے آگے کر دیا۔ بہر حال میں ان کے پاس درخواست لے کر گیا۔ انھوں نے کچھ دیر سوچا اور ایک لاکھوں کا سوال کر دیا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں آؤں مگر تقریر نہ کروں؟" میں نے سوچا ہندوستان کے سیاسی آسمان پر کوئی ایسا بھی ہے جو صرف سننا چاہتا ہو، ورنہ تو ہر سیاسی رہنما کا بندھا ٹکا طریقہ ہے کہ کسی بہانے خطاب کیا جائے (بھلے ہی وہ کسی اور ہی کا لکھا ہوا ہو) اور تالیوں کی گونج میں روانہ باشند۔

میں نے ان سے کہا کہ بے شک وہ ضرور آئیں اور صرف سُنیں اور درحقیقت ایسا ہی ہوا۔ وہ تشریف لائے، کچھ دیر بیٹھے اور بہت دل چسپی کے ساتھ سنا۔

ایک بار تقسیم ہند کے فوراً بعد وہ پنجاب (ہندوستانی) ریلوے اسٹیشن پر اُترے۔ ایک ہنگامی ہجوم نے یقیناً ان پر حملہ کر دیا ہوتا اگر بر وقت ایک ریلوے افسر نے ان کو پہچان کر ایک کمرے میں بند نہ کر دیا ہوتا۔

اس کے بعد وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے "میں ادھار دی گئی زندگی جی رہا ہوں۔" ممکن ہے کہ یہی وجہ ہو کہ انھوں نے سوچا کہ میں کچھ ایسا کروں جو محض رسمی نہ ہو بلکہ قابلِ اہمیت ہو۔ وہ ہندوستان ہی میں رہے ظاہر ہے انھوں نے اکثر اس بات کے بارے میں، پاکستان کے بارے میں اور ان مسلمانوں کے بارے میں جو ہندوستان ہی میں رہے کافی سوچا اور غور کیا ہوگا۔ ہندو۔ مسلم تعلقات، ان کے رہن سہن، ان کے خیالات اور طور طریقے، ان کے قابلِ رحم رویوں کے بارے میں، بہت سوچ سمجھ کر اپنا طرزِ عمل اور طرزِ زندگی بدلا ہوگا۔

وہ بہت نرم گفتار تھے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ کوئی ان کے اصولوں میں آسانی سے لچک ... پیدا کر سکتا تھا۔ آج کے ہندوستان میں اُن جیسے ممتاز اور قابل انسان مشکل ہی سے رہ سکتے ہیں ورنہ یہاں کی گھٹن آمیز حفاظت میں انسان ہر چیز سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے ذاکر صاحب ایک رات ڈرامہ دیکھنے جا رہے تھے، مجھے یاد نہیں کہاں، لیکن یہ کھلے آسمان کے نیچے تھا۔ وہ کسی کے ساتھ خاموشی سے جا رہے تھے اور کرسیوں کی طرف بڑھے۔ آج کے زمانے میں یہ بات قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی۔ جب وہ نہ تو نائب صدر تھے بلکہ علی گڑھ

سے نکلے ہی تھے۔ یہ ہوا کہ ان کو غلط کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ وہ کرسی ایک خاتون کی تھی۔ وہ غصے میں برہم آئیں اور ان سے اٹھنے کو کہا اور اس نے یہ بھی کہا کہ اگر منتظمین خالی نہیں کرائیں گے تو میں خود خالی کراؤں گی۔ بڑی مشکل سے میں نے ان خاتون کو سمجھایا کہ ان کو بیٹھا رہنے دیجیے میں آپ کو اور آپ کی ساتھی کو اس سے بہتر سیٹ دلوا دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اگر ان سے سیٹ خالی کرنے کا مطالبہ کرتیں تو وہ بغیر کسی حیل و حجت کے سیٹ دیدیتے۔

میرا ان کا آخری ساتھ، میرے لیے بے حد تکلیف کا باعث تھا۔ ان کے انتقال کے منٹوں بعد ہی دور درشن والوں نے مجھ سے کہا کہ میں راشٹرپتی بھون سے آنکھوں دیکھا حال نشر کروں۔ لہٰذا میں وہاں گیا اس دن یا اس سے اگلے دن میں جامعہ نگر گیا۔ ان کے دوستوں، ساتھیوں اور پڑوسیوں سے، جن کا اس چھوٹی سی بستی میں ان سے پرانا ساتھ رہا تھا۔ مجھے صحیح طور پر یاد نہیں ہے کہ ان لوگوں میں سے کسی نے ایک گورنر، یا صدر جمہوریہ ہند کی بات کی ہو وہ تو ایک ایسے انسان کی بات کر رہے تھے جو چند باغیچوں کے پرے زیر خاک سو رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اچانک ایک چور دروازے سے نکل کر ٹہلتا ہوا آئے گا اور کہے گا "ہلو!"

سب سے اچھی کہانی میں نے آخر کے لیے بچا کر رکھ چھوڑی ہے۔ وہ سردیوں کی ایک شام تھی۔ میں ان سے ملنے گیا تھا۔ وہ اپنے نائب صدر کی رہائش گاہ میں لان پر غیر ملکی طلبا کو دیئے گئے عصرانے میں شریک تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا "چلیے! ہم اندر چلتے ہیں۔" ہم لوگ گھر کی سیڑھیوں کی طرف چند قدم چلے تو راستے میں، میں نے پوچھا — "جناب! آج آپ کا دن بہت گراں گزرا ہوگا؟" انھوں نے جواب دیا "کوئی چیز جو خالی ہو وہ گراں کیسے ہو سکتی ہے! ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج کا دن بہت طویل گزرا۔

اے۔جی۔نورانی

ڈاکٹر ذاکر حسین — ہندوستانی خدمات

"جب ہندوستان کو آزادی ملی اور قوم کے لیے ترقی کی راہیں کھلیں تو فوراً ہی نظامِ تعلیم میں زبردست ردوبدل ہوئی اس لیے جو پُرانا طریقۂ تعلیم تھا اس کا تعلق نہ تو آزادی سے تھا اور ترقی سے تو دور دور کا واسطہ نہ تھا۔ لیکن ایسے دور میں کم سے کم ایک مسلم تعلیمی ادارہ ایسا تھا جو آزاد بھی تھا اور ترقی یافتہ بھی۔ جس کی اپنی الگ پہچان اور غیر معمولی حیثیت تھی۔ اس نے سخت جدوجہد کے بعد نئے تعلیمی نظام کی بنیاد ڈالی۔ جب کہ ماحول پستی کی طرف مائل تھا۔ خیال یہ تھا کہ نیا تعلیمی نظام نئی سوسائٹی میں زیادہ پنپ نہیں سکے گا مگر نہ صرف اس نئے طرزِ تعلیم نے فروغ پایا بلکہ روز بروز ترقی کرتا گیا یہ ادارہ دہلی میں، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے مشہور ہوا جو عام طور سے جامعہ ہی کہلاتا ہے۔"

مشہور عالم ولفریڈ کینٹول سمتھ نے اپنے سیمناروں پر مبنی اپنی کتاب "ہندوستان میں ماڈرن اسلام" جو ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی اور بعد میں نظرِ ثانی کے بعد ۱۹۴۶ء میں دوبارہ شائع ہوئی، انھوں نے اس ادارے کے بارے میں پورا ایک "نوٹ" لکھا ہے۔ یہ تصدیق ہے اس بات کی کہ یہ ادارہ نہ صرف اپنے ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی کس قدر مشہور ہوا اور وہ انسان جس کی جامعہ مرہونِ منت ہے۔ سمتھ نے مزید لکھا ہے —— "قابل اسٹاف میں امتیازی حیثیت جس کی تھی وہ تھے جامعہ کے پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین! وہ اچھے عالم، اچھے کارکن، اچھے استاد اور اوّل درجے کے ماہرِ تعلیم تھے۔ درحقیقت وہ واحد شخص تھے کہ جن کی شخصیت کی بنا پر یہ پورا ادارہ قائم دائم رہا۔ پہلے ہی ان کو طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ وہ واردھا بیسک نیشنل ایجوکیشن کمیٹی کے چیرمین تھے تو ان کو اور جامعہ کو بہت شہرت ملی۔"

وہ "نوٹ" بلامبالغہ مفصّل اور بامقصد تھا جس میں جامعہ کے سارے شعبوں کا تذکرہ بھی تھا۔ جذبۂ تخلیق نے تمام لوگوں کی نوک پلک درست کی۔ یہ ادارہ" برابر آگے بڑھ رہا تھا اور نئے نئے طریقے اور تعلیمی جدتیں پیدا کر رہا تھا جو ہندوستان کے لیے انوکھی مثال

تھی" سنفو نے آگے لکھا ہے کہ "اس کی تعلیم کا مقصد آگے بڑھتے رہنا تھا اور اب بھی ترقی کر رہا تھا، جس میں ہر ہندوستانی اور مسلمانوں کی ترقی خاص طور پر نصب العین رہی ہے۔ ان تمام لوگوں کی پوری زندگی قوم کی خدمت رہی ہے۔"

جامعہ کس طرح وجود میں آئی یہ کہانی سب لوگ جانتے ہیں۔ اس سلسلے میں عبدالغفار مدھولی کی کتاب "جامعہ کی کہانی" لاجواب ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کے خلاف بغاوت کی گئی اور پھر ۱۹۲۰ء میں کوشش کرکے "قومی اسکول اور کالج" قائم کیے گئے۔ کانگریسی تاریخ داں جناب بی۔ پٹہ بھائی سیتا رمیا، نے اس کو "قومی مسلم یونیورسٹی آف علی گڑھ" کے نام سے حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس نے اور دوسرے اداروں جیسے گجرات ودیا پیٹھ اور کاشی ودیا پیٹھ کے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کیا۔

ابھی جامعہ کی بنیاد نئی نئی ہی پڑی تھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین یورپ چلے گئے اور جب واپس تشریف لائے تو جامعہ اس وقت زبردست مالی بحران سے گزر رہی تھی۔

۱۹۲۵ء میں یہ علی گڑھ سے قرول باغ دہلی منتقل ہوگئی۔ اس سال ذاکر صاحب کا شیخ الجامعہ کے طور پر تقرر ہوا۔ انھوں نے اپنے قریبی دوستوں، محمد مجیب اور عابد حسین کو اپنے ساتھ کر لیا نیز ان کو خبردار بھی کر دیا کہ ان سب کو مالی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔

۱۹۳۷ء میں ترکی کی مشہور صحافی خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب "انسائڈ انڈیا" میں اس طرح لکھا ہے: "اس ادارے کے دو مقاصد ہیں۔ اول طور پر یہ کہ ہندوستانی مسلم نوجوان کی تربیت کی جائے کہ ہندوستانی ہونے کے ناطے اس کے کیا حقوق اور فرائض ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلامی نظریۂ فکر کو ہندوؤں کے رویّوں کو ہم پلّہ بنانا تھا۔ عام طور پر اپنی اپنی شناخت کھوئے بغیر ایک ہم آہنگ قومیت بنانا۔ گو کہ یہ اسلامی ادارہ تھا، بھلے ہی اس کے مقاصد اور طریقے الگ رہے ہوں مگر گاندھی، تحریک سے زیادہ میل کھاتے تھے، جیسا کہ میری نظر سے گزرا ہے۔"

۱۹۲۳ء میں خالدہ ادیب خانم ذاکر حسین سے میونخ میں ملی تھیں ــــ "ایک شاندار انسان بظاہر نوعمر مگر بے حد پختگی لیے ہوئے۔"

لگ بھگ دس سال بعد خالدہ ادیب خانم نے جامعہ میں ذاکر صاحب سے ملاقات اور اپنے تاثرات کا بیان اس طرح کیا ہے: "یہاں ایک بھی ہندوستانی دانشور نہیں جن سے میں ملی اور انھوں نے یہ نہ پوچھا ہو کہ آپ کا ذاکر حسین کے بارے میں کیا خیال ہے؛ اس کا مطلب ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے ملک کے لوگوں کے لیے ناقابل فہم تھے۔ ان کی طرح کا کھرا اور صاف گو انسان ملنا مشکل ہے، عام بات یہ ہے کہ ان پر کوئی سیاسی ٹھپّہ نہیں لگا۔ ان کے کاموں میں کوئی بھی پارٹی کسی بھی قسم کا رنگ نہیں بھر سکی۔ وہ اپنا زیادہ تر

وقت اور طاقت تعلیمی یعنی تخلیقی اور تجرباتی مسائل پر صرف کرتے ہیں:

"یہ بات کس قدر قابلِ ستائش ہے کہ ان کو مغرب کی بے حد معلومات ہیں مگر ان میں کسی بھی قسم کا احساسِ کمتری یا برتری نہیں پیدا ہوا اور ہمیشہ ماحول خوشگوار رہا۔ جو اس ماحول سے مختلف تھا جب امیلڈوز ہکسلے ہندوستان آیا تھا تو دیکھ کر جھنجھلایا تھا۔"

انھوں نے بار بار لکھا ہے: "ڈاکٹر ذاکر حسین سے سیاسی غلطیاں محض اس لیے سرزد ہوئیں کہ جو لوگ ان کے ساتھ تھے کاموں کی سماجی اور معاشی معلومات سے نابلد تھے۔ سیاست میں آنے سے پہلے لوگوں کو ان بنیادی سوالوں کی جن کا سماجی تعلق ہو، باقاعدہ ٹریننگ ملنا چاہیے۔"

ذاکر حسین ہمیشہ گاندھی جی کے شکر گزار تھے۔ ان کی مدد اور قیمتی مشوروں کے جو انھوں نے ایسے وقت میں دیئے جب بہت سے لوگ جامعہ کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ گاندھی جی نے ان کو واردھا بیسک ایجوکیشن اسکیم کا چیئرمین نامزد کیا۔ جس کی بنیاد گاندھی کے بنائے ہوئے اصولوں پر تھی۔

بڑے دکھ کی بات ہے کہ عین اس زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ الگ ہو گئیں۔ لیگ نے واردھا اسکیم کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ ۱۸ جون ۱۹۴۶ء میں جناح نے وائسرائے ویول کو خط لکھا ذاکر حسین کی نامزدگی پر اعتراض کیا گو کہ یہ دشمنی یک طرفہ تھی۔ ۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء ہی میں جامعہ کے جشنِ سیمیں کی تقریبات کے سلسلے میں نواب بھوپال کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا۔ ذاکر حسین نے کسی طرح سے جناح کو تیار کیا کہ وہ تشریف لائیں اور جواہر لال اور مولانا آزاد کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھیں۔ پھر انھوں نے اپنی دل گداز تقریر میں التجا کی!

آپ! حضرات۔ سیاسی آسمان کے جگمگاتے ستارے ہیں۔ لاکھوں لوگوں کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ یہاں آج آپ لوگوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں تمام تعلیمی کارکنان کی طرف سے میری خواہش ہے کہ میں اپنے شدید دکھ کا اظہار کروں۔ نفرت کی آگ اس تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ لگتا ہے باغیچۂ تعلیم و تدریس کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ یہ آگ ایک کریم النفس اور عظیم ملک میں پھیل رہی ہے۔ اس طرح سے شرافت اور محبت کے پھول کیسے کھل پائیں گے؟ ہم انسانی قدروں کو کس طرح اعلیٰ سطح پر لے جا سکیں گے؟ جو آج حیوانی سطح پر ہیں۔

خدا کے واسطے ایک ساتھ بیٹھیے اور ٹھنڈے دل سے غور کیجیے کہ یہ نفرت کی آگ کس طرح بجھائی جائے! آگ شدت پکڑ رہی ہے، خدارا! اس کو بجھائیے ......!"

خاتمۂ تقریر پر لوگوں نے دیکھا کہ نہرو اپنے آنسو پونچھ رہے ہیں۔ ذاکر حسین ان بے مثال

لوگوں میں سے تھے۔جو کبھی بھی اپنی پابندیوں کو نہیں چھپاتے تھے اور نہ ہی کبھی بے جا حمایت کرتے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ چھوڑ دیا مگر اس سے محبت اسی طرح برقرار رہی۔ کہتے تھے کہ میں کہیں بھی رہوں میرا دل ہمیشہ علی گڑھ سے وابستہ رہے گا۔ یہ بہت ہی مناسب ہوا کہ تقسیم ہند کے بعد وہ شیخ الجامعہ رہے اور اس کی ڈوبتی ناؤ کو پار لگایا۔ بقول ان کے دوست رشید احمد صدیقی سے " وہ انسان جس نے نئی جامعہ کو بڑھاوا دیا اور پرانے علی گڑھ کی بھی حفاظت کی۔ وہ صحیح معنوں میں علی گڑھ اور آزاد ہندوستان میں سیاسی ڈھرّے کے درمیان مصالحت کا بہت بڑا ذریعہ بنے اور خوف و دہشت کو پنپنے کی راہ نہ دی "

علی گڑھ زبردست مایوسی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا، ذاکر حسین صاحب نے سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔ شکر ہے کہ ایک عظیم اور بے مثال ادارہ بچ گیا۔

ایک اور قومی مسئلہ تھا جس کے لیے وہ بہت رنجیدہ تھے اور وہ تھا نئے حالات میں اردو زبان کی حفاظت۔ ۱۹۵۱ء میں ذاکر حسین نے دس ہزار دستخطوں پر مشتمل، لکھنؤ میں مقیم طلباء کے والدین کی طرف سے یو۔پی کے وزیر تعلیم کو ایک عرضداشت پیش کی کہ ان کو اردو میں تعلیم دی جائے ۱۹۵۴ء میں کُل ہند انجمن ترقی کے صدر کی حیثیت سے وہ ایک وفد جس میں ہر عقیدے کے لوگ شامل تھے لے کر صدر ہند راجندر پرشاد کے پاس گئے اور ان کو ۲۰،۰۰،۰۰۰ دستخطوں پر مشتمل ایک عرضداشت پیش کی جس میں یو۔پی کے بالغان کی طرف سے اپیل کی گئی تھی کہ اردو کو اس کا مقام دلایا جائے۔ نابالغ بچوں کی تعداد نو ۲۲،۰۰،۰۰۰ سے بھی زیادہ تھی۔ درخواست میں کہا گیا تھا کہ یو۔پی میں خاص طور سے مقامی زبان اردو قرار دی جائے۔ جس کی خاص وجوہات ہیں (۱) جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کو اسی زبان میں تعلیم دی جائے (۲) اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں کورٹ اور گورنمنٹ کے دفاتر میں لی جائیں۔ (۳) اہم قانون، اصول اور اشتہار یا اعلان اردو میں چھاپے جائیں۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ۱۹۶۷ء میں ذاکر حسین کا چناؤ ایک بے جا طرفداری کے ماحول میں ہوا۔ وہ باضابطہ انسان تھے۔ انھوں نے ان سارے چھینٹیوں اور طعن طنز کو نظر انداز کیا جو ان پر کیے گئے تھے۔ گو کہ ان کا تعلق وزیراعظم اندرا گاندھی سے تھا، جنھوں نے ان کو صدارت کے لیے نامزد کیا تھا۔ بہت سے انٹرویوز میں سے ایک انٹرویو مجھے اپنی سوانح عمری کے بارے میں دیا، ذاکر حسین نے ہم عصری کے معاملات کو بخوبی نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ مخالف پارٹی دراصل ایسا صدر چاہتی تھی جو وزیراعظم سے ٹکر لے۔ یہ بے ایمانی ہوگی۔ صدر کابینہ کے مشوروں کا پابند ہوتا ہے مگر مزید یہ بھی کہا کہ اس کے اپنے کچھ "ایمرجنسی اختیارات" بھی ہوتے ہیں۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ ایمرجنسی اختیارات

بھی آئین میں اتنی اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن ایک جمہوری پارلیمنٹری نظام میں آئین کی رو سے آخری اختیارات صدر کے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذاکر حسین کے حریف مخالف ہندوستان کے سابق چیف جسٹس سبھا راؤ اور ان کے ساتھی ایک Activist صدر چاہتے تھے۔

۱۹۶۹ء میں اگر ان کی موت اچانک واقع نہ ہو گئی ہوتی تو یقیناً ذاکر حسین نے اس اعلیٰ مرتبت آفس کے طور طریقے بے حد خوش اسلوبی سے بہتر کر دیتے اور یہ قوم کی ایک بہت بڑی خدمت ہوتی۔

اس سال جب کہ ان کا صد سالہ جشن پیدائش منایا جا رہا ہے تو ضرورت اس بات کی ہے ہم اپنے ذہنوں میں ان کا مشترکہ تہذیب کا تصور واضح طور پر رکھیں اور عمل پیرا ہوں۔ یہ محض دو طرح کے ٹکراؤ کا نتیجہ نہیں بلکہ مجموعی طور پر یہ لازم ہے جس کا اظہار ۱۴ راگست ۱۹۳۵ء میں کاشی ودیاپیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کیا تھا۔ انھوں نے بے حد خوش بیانی سے کہا تھا:

"کچھ لوگ یا مقصد میں مگر وہ شدت پسندی کی حد تک قومیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یعنی ہندوستانی قومیت کا اس طرح کا تصور رکھتے ہیں جو مسلمانوں کے حقوق، ملک کے یک جہتی اور ترقی کے لیے نقصان دہ ہو سکتے ہیں، لیکن ہمارے ماہر تعلیم ایمانداری سے ہندوستانی مسئلے کے بارے میں سوچیں تو مجھے یقین کامل ہے کہ وہ بخوشی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ مسلمان اپنی تعلیم کی بنیاد اپنی تہذیب سے وابستہ رکھیں اور یہ ایک اچھی تعلیم اور ذہین سیاسی نظریہ کہلائے گا۔ آپ سے معذرت چاہتے ہوئے میں اپنے تمام معزز حاضرین سے یہ نظریہ صاف طور پر پیش کرنا چاہوں گا کہ ہندوستانی قومیت سے مسلمانوں کو الگ کر دینا یا سمجھنا محض خود فریبی خود غرضی، تنگ دماغی اور ایک صحت مند نظریہ فکر کی کمی کہلائی جائے گی جو ملک کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ ایک بڑی حد تک مسلمانوں کے تئیں مشکوک ترین رویہ کہ ایک قومی حکومت کو مسلمانوں کی تہذیب سے خطرہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ مسلمان کسی بھی صورت میں یک جہتی کی یہ قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ صرف میں ہی مسلمان نہیں ہوں، لیکن ایک سچے ہندوستانی ہونے کے ناطے، مجھے اس بات کی خوشی اور فخر ہے کہ یقیناً مسلمان یہ قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس طرح سے نہ صرف مسلمان اثر انداز ہوں گے بلکہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب پر بھی آنچ آئے گی اور وہ کمزور ہو جائے گی۔"

محمد اکرام خاں

ڈاکٹر ذاکر حسین بحیثیت مُعلّم

اگست ۳۹-۱۹۳۸ء کی بات ہے جب ہم 'استادوں کا مدرسہ' میں بنیادی قومی تعلیم کے ڈپلوما کورس میں داخل ہوکر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم بنے تھے۔ کلاسیں شروع ہونے پر ہمیں پڑھانے کے لیے سب سے پہلے جو استاد تشریف لائے وہ تھے ذاکر حسین۔ نہ صرف ہم بلکہ جماعت کے تمام طلبا ان کی جسمانی اور اخلاقی صفات کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ انھوں نے دوران سال بنیادی قومی تعلیم اور تعلیمی نظریات پر جو لیکچر دئے ان کا نقش ابھی تک ہمارے ذہن میں محفوظ ہے۔ ان کی محبت اور رہنمائی نے ہمیں تعلیمات کے ڈسپلن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق دلایا ان کی بدولت ہمیں لندن انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن لندن اور اس کے بعد ٹیچرز کالج کولمبیا یونیورسٹی نیویارک میں بالترتیب پروفیسر لاربن اور پروفیسر کلیرک جیسے ممتاز اور مشہور استادوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا لیکن حصول علم اور تحقیق کی وہ پیاس کہیں نہ بجھ سکی۔ جو ۱۹۳۸ء سے ۳ مئی ۱۹۶۹ء تک ڈاکٹر صاحب کے زیر سایہ رہ کر لگتی اور بجھتی رہی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کئی حیثیتوں سے مشہور ہوئے لیکن ان کی اصل اور خاص حیثیت معلم کی ہے اور اسی حیثیت سے ان کو عالم گیر شہرت حاصل ہوئی۔ فطری طور پر ان کی طبیعت کا رجحان بچوں اور نوجوانوں کی بنتی ہوئی شخصیتوں کی طرف تھا ان ہی میں رہ کر ان کو راحت اور سکون ملتا تھا۔ ان کی زندگی کے سرورق پر علم اور محبت کا عنوان لکھا تھا انھوں نے اپنی زندگی کے بہترین ماہ وسال جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت میں گزارے جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت اور آبیاری میں ان کا خون جگر ختم ہونے کو آیا تو رہبران قوم اور ذمہ داران حکومت نے قومی مفاد کے پیش نظر انھیں پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا وائس چانسلر بنایا پھر ریاست بہار کا گورنر۔ اس کے بعد وہ پہلے نائب صدر جمہوریہ ہند بنے اور پھر صدر جمہوریہ ہند۔ ان سب عہدوں پر مامور رہتے ہوئے انھوں نے اپنی معلّم کی حیثیت کو یاد رکھا جب نائب صدر جمہوریہ ہند ہوئے اور پارلیمنٹ میں ان کا خیر مقدم کیا گیا تو خیر مقدم کے بعد شکریہ ادا کرنے کے لیے جو تقریر کی اس میں بڑے فخر کے ساتھ اپنے معلم ہونے کا اعتراف کیا۔ فرمایا "۔ ۔ لیکن انتخاب کے بعد ہزاروں کی تعداد

میں مبارکباد کے جو خطوط اور تار مجھے موصول ہوئے ان سے کچھ کچھ یہ پتا چلا کہ مجھے اس عہدے کے لیے کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ ان خطوط اور تاروں کے بھیجنے والوں کی ایک بڑی تعداد استادوں کی تھی۔ ملک کے دور دراز علاقوں کے پرائمری اسکولوں کے استاد ہائی اسکولوں کے استاد اور یونیورسٹیوں کے استاد۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سب مجھ سے یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے اس اعزاز کا مستحق اس لیے سمجھا گیا کہ تعلیم سے میرا گہرا تعلق رہا ہے . . . . قومی زندگی میں تعلیم کو اہمیت دینے سے ہی اس بات کا پتا چلتا ہے کہ آپ نے کیوں ایک ایسے شخص کو ہندوستان کا نائب صدر اور اس حیثیت سے راجیہ سبھا کا چیرمین منتخب کیا ہے جس نے اب تک ایک اسکول ٹیچر کے علاوہ کوئی اور اہم کام نہیں کیا ہے۔" [1]

اسی طرح ۱۳رمئی ۱۹۶۷ء کو صدر جمہوریہ ہند منتخب ہونے کے بعد یہ فرمایا " دراصل یہ ایک بڑا اعزاز ہے جسے قوم نے ایک ایسے شخص کو عطا کیا ہے جو محض ایک معلم ہے۔ جس نے آج سے کوئی سینتالیس سال پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے بہترین ماہ و سال قومی تعلیم کے کام میں کھپا دے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایسا کر کے میری قوم نے صاف صاف اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ تعلیم کا قوم کی زندگی کی اصل کیفیت سے ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ یعنی تعلیم ہی قومی مقاصد کے حصول کا اصل ذریعہ ہے۔ (بحوالہ شہید جستجو از پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ص ۵۳۶)

ڈاکٹر ذاکر حسین بڑے کامیاب اور بے مثل معلم تھے۔ وہ انسانیت دوست اور جمہوریت پسند تھے۔ ان کی شخصیت میں وہ تمام سماجی خوبیاں تھیں جو دوسروں کو پسند آتی ہیں اور جن کی وجہ سے غیر اپنے اور دشمن دوست بن جاتے ہیں یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے ان سے ہر ملنے والا انھیں اپنا سمجھنے لگتا تھا۔ ان کی عادات اور اطوار میں انکسار اور دلکشی تھی ان کی خوش گفتاری دل کو موہ لینے والی تھی۔ ان کے بات کرنے کا طریقہ من کو بھانے والا تھا۔ وہ اللہ سے محبت رکھنے کی بنا پر بچوں اور نوجوانوں سے بے لوث محبت کرتے تھے۔ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو گھر میں اور گھر سے باہر دونوں جگہ خوب دیکھا ہے۔ وہ جیسے باہر تھے ویسے ہی اندر تھے۔ ان کے قول و فعل میں ذرہ برابر فرق نہ تھا۔ جو کہتے وہ کرتے اور جتنا کر سکتے تھے اتنا ہی کہتے بھی تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین 'استادوں کا مدرسہ' میں ایک اعادی کورس کے اختتام پر ان طلبا کو جو تقسیم ہند کی وجہ سے پنجاب سے آکر دہلی میں بس گئے تھے اور پرائمری اسکولوں میں پڑھانے لگے تھے خطاب کر رہے تھے اس موقع پر محترمہ 'اماں' (بیگم ڈاکٹر ذاکر حسین) کو بھی بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی تقریر جس میں اچھے استاد کی

[1] راجیہ سبھا کے پارلیمانی مباحث جلد ۳۹ جون ۱۴ تا ۲۶ ، ۱۹۶۲ء۔

خوبیاں بتائی گئی تھیں غور سے سنی۔ گھر واپس جاکر جب رات کے کھانے پر سب گھر والے جمع ہوئے تو باتوں باتوں میں اماں نے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا "تم جلسوں میں گھما پھرا کر کیوں باتیں کرتے ہو۔ تم صاف صاف یہ کیوں نہیں کہہ دیا کرتے کہ جیسا میں ہوں ویسے ہی تم ہو جاؤ۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین کے اخلاق کی بلندی اور قول وفعل کی ہم آہنگی پر اعتراف مشہور ومعروف دانشور پروفیسر خواجہ غلام السیدین نے بھی خوب کیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد ایک دل گیر اور حقیقت پر مبنی ریڈیائی تقریر میں فرمایا۔۔۔۔ "میں نے اپنی زندگی میں بہت کم لوگ ایسے دیکھے ہیں جن کو ہر حالت، ہر رنگ، ہر مقام پر خالص سونا پایا اور کہیں کھوٹ کا میل نظر نہ آیا ہو۔ لیکن جب قدرت اپنی فیاضی سے کسی کو مالا مال کرتی ہے تو پھر اس کی بخشش کی انتہا نہیں رہتی۔ کیا کیا نہیں دیا اس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو؟ ایسا جمال صورت جو لاکھوں میں ایک آدھ کو نصیب ہوتا ہے۔ ایسا جمال سیرت جو کروڑوں میں ایک آدھ کے حصے میں آتا ہے۔ ایسا روشن دماغ جو ہر مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتا۔ ایسا قلب گداز جس میں سارے عالم انسانیت کے لیے شامل تھی۔ جو ہر کسی کی بھلائی چاہتا تھا، کسی کی برائی نہ صرف چاہتا تھا بلکہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ جو ان لوگوں کے ساتھ بھی شفقت اور پردہ پوشی کا سلوک کرتا تھا جنھوں نے اس کے ساتھ برائی کی ہو۔ گفتگو میں وہ کشش کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ تقریر میں وہ روانی اور برجستگی، وہ سوز و ساز کہ لفظ دل سے نکلتا تھا اور بجلی کی طرح دل پر گرتا تھا۔ تحریر میں وہ سادگی اور پرکاری اور خلوص کا وہ بے پناہ جوش جو ہر پڑھنے والے کو اپیل کرتا تھا۔۔۔ ان کا کہنا تھا کہ زندگی ایک وحدت ہے اور اس کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہیے۔۔۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین ان معلموں میں سے ایک تھے جو اپنے شاگردوں کو صرف علم نہیں دیتے بلکہ حقیقت میں ان کی زندگی کی تشکیل اور تہذیب کرتے ہیں، وہ ایسے معلم تھے جو مردم سازی اور آدم گری کو تعلیم کا بنیادی کام تصور کرتے ہیں اور یہ کام صرف کلاس ہی میں نہیں بلکہ ہر جگہ کرتے رہتے ہیں ڈاکٹر صاحب نے پوری زندگی اقدار عالیہ کی خدمت میں گزاری۔ کہتے تھے کہ زندگی کا مقصد انسانوں کی خدمت ہے۔ جس نے زندگی بخشی ہے اس کی راہ میں زندگی کو کام آنا چاہیئے انھوں نے رائج کتاب مرکوز تعلیم کو زندگی کی تہذیب اور تشکیل کے لیے بالکل بے سود اور بے معنی کہا اور دستکاری اور سماجی کاموں سے مربوط طریقۂ تعلیم کو رواج دیا۔ کہتے تھے کہ تعلیم کا مطلب صرف انگریزی پڑھ لینا یا کچھ بول رٹ لینا نہیں ہے بلکہ تعلیم اسے کہتے ہیں کہ آدمی جو دماغی قوتیں لے کر پیدا ہوتا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرے تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے۔ کہتے ہیں کہ تعلیم کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ بچے کے ارادے اور عمل کی قوت کو سیدھی راہ پر ڈال دے اور سچے اصولوں کی روشنی میں اچھی عادتوں کی مدد سے اس کی سیرت میں لچک سوئی اور پختگی پیدا کرا دے۔

ڈاکٹر صاحب کو قدرت نے وہ تمام صلاحیتیں اور صفتیں ودیعت کی تھیں جو ایک معلم اور رہنما میں ہوتی چاہئیں۔ وہ بچوں اور نوجوانوں کی ہی نہیں بلکہ عام انسانوں کی فطرت کو بھی خوب سمجھتے تھے انھوں نے مادر وطن کی خدمت کو مذہبی فریضہ سمجھا اور تعلیم کو قومی اور سماجی زندگی کو سنوارنے کا ذریعہ مان کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیمی کام شروع کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس لیے کہ اس کا بنیادی مقصد ہی علم کو دین کے رنگ میں رنگ کر طلبا میں بالخصوص مسلم طلبا میں حب الوطنی اور قومی اتحاد کا شعور پیدا کرنا، ملک کی آزادی اور ترقی کے لیے کام کرنا اور ایسے شہری پیدا کرنا تھا جو دوسروں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر عالمی امن و عافیت کا کام کر سکیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نفسیاتی اور تعلیمی نقطہ نظر سے بچپن اور نوعمری کی تعلیم کی افادیت اور اہمیت کو مانتے ہوئے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو قومی زندگی کے رنگ میں رنگنے کا فیصلہ کیا اور اپنی کوشش اور توجہ کا مرکز جامعہ کے مدرسۂ ابتدائی اور مدرسۂ ثانوی کو بنایا۔ ان دونوں مدرسوں میں ڈاکٹر صاحب نے طلبا کی سیرت کی تعمیر کے لیے ضرورت کے مطابق ان کے جوتوں پر پالش کر کے جوتوں کو صاف رکھنے کی تعلیم دی۔ اقامت گاہوں میں بیٹھ بیٹھ کر بچوں کو پیار و محبت کا سبق سکھایا اور جماعت میں پڑھاتے وقت جس محبت، ضبط اور صبر و تحمل سے کام لیا اس کا اندازہ ان کے ایک خاص شاگرد ثروت صولت صاحب کے ایک مضمون سے ہوتا ہے وہ مدرسۂ ثانوی میں پڑھتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ "ہمیں ڈاکٹر صاحب نے انگریزی پڑھائی تھی اور وہ ہمیں جس شوق لگن اور دلچسپی سے پڑھاتے تھے اس کی مثال کم ملے گی۔ ہر طالب علم پر وہ خصوصی توجہ دیتے تھے اور جب تک ہر طالب علم اچھی طرح مطلب نہیں سمجھ جاتا تھا آگے نہیں بڑھتے تھے" اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے۔" میرے ایک ہم جماعت ذرا کند ذہن واقع ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی دن تک انھیں سمجھانے کی کوشش کی اور ایک ہی سبق طلبا کو بار بار پڑھاتے رہے لیکن جب دیکھا کہ وہ کسی طرح سمجھ نہیں پا رہے ہیں تو ذاکر صاحب کے آنسو نکل پڑے۔۔۔ یہ کوئی ایک واقعہ نہیں، یہ ان کا معمول تھا۔ وہ کبھی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے تھے۔ وہ شاگرد پر غصہ کرنے کے بجائے اپنا غصہ اتنا ضبط کرتے تھے کہ ان کے آنسو نکل آتے تھے۔ اس دل سوزی اور محنت سے پڑھانے والے استاد دنیا میں کہاں ملیں گے۔ (ماہنامہ جامعہ جولائی ۱۹۸۸ء ص ۲۵)

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۸ء تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بحیثیت شیخ الجامعہ اور معلم کا کام کیا۔ اس پورے عرصے میں انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت دل چسپی لی۔ کتابی تعلیم کو کام سے مربوط تعلیم میں بدلا۔ نصاب تعلیم میں دستکاریوں اور عملی سرگرمیوں کو خاص اہمیت دی۔ سیکھنے کے اس اصول کو کہ بارہ تیرہ سال کی عمر سے پہلے بچوں کے رجحانات زیادہ تر عملی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کے ذریعے سوچتے ہیں اور کام کے ذریعے سیکھتے ہیں، عملی جامہ پہنایا۔ گتے کے کام، لکڑی کے کام، مٹی کے کام اور کتائی دھنائی اور بنائی کے کام کے علاوہ بچوں کے

بنک، بچوں کی دکان، مرغی خانہ، چڑیا گھر اور باغبانی وغیرہ یا آدرا ور دل چسپ کاموں کے ذریعے تعلیم کو زندگی سے مربوط کیا اور تعلیم برائے زندگی دینے کی کوشش کی بچوں کی حکومت کے ذریعے بچوں کو مدرسے کے انتظام میں شریک کیا گیا۔ بچوں کو مختلف قسم کی ذمہ داریاں دے کر ان میں اشتراک عمل اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرایا۔ مساوات باہمی تعاون اور کام کو عبادت سمجھنے کی فضا قائم کرنے کے لیے حسب ضرورت مدرسہ کے احاطے اور دارالاقاموں کی صفائی کا کام کرایا گیا۔ اس کام میں استاد بھی طلبار کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ اس طرح بچوں کو ہاتھ سے کام کرنے کی عادت ہوتی۔ نفس پر قابو پانے کا موقع ملتا۔ ہاتھ سے کام کرنے والوں کے لیے دل میں عزت ہوتی۔ مساوات کا سبق ملتا۔ مل جل کر ساتھ رہنے اور کام کرنے کی تربیت ہوتی اس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین مدرسہ کے دیگر استادوں کے ساتھ مل کر بچوں کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر کے کام میں برابر حصہ لیتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کے یہاں فرد کا بڑا مقام ہے۔ وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی عزت کرتے ہیں۔ اس پر بھروسہ کرتے ہیں اس میں خود اعتمادی پیدا کرتے ہیں۔ اسے خود کفیل بنانے کی فکر کرتے ہیں اور اسے سماج کا خادم بنانا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ فرد کی شخصیت کی صحیح نشو ونما سماج میں رہ کر اور سماجی کاموں کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فرد کی ذہن کی پوری پوری پرورش کے لیے سماج کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ذہنی پرورش کے لیے جس ذہنی غذا کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمدنی ورثے سے ملتی ہے۔ وہ ملتی ہے تمدن کی مادی اور غیر مادی چیزوں سے۔ یہ بات الگ ہے کہ ہر ذہن کی تربیت تمدن کی ہر چیز سے نہیں ہوتی۔ اس لیے اچھے اور سمجھ دار استاد کا کام یہ ہے کہ وہ طلبار کے لیے حتی الامکان اتنے سارے کام، مشغلے اور وسائل فراہم کرے کہ طلبار ان کے ذریعے اپنے رجحان طبعی کے مطابق اپنی ذہنی نشوونما کے لیے ذہنی غذا فراہم کر سکیں اس سلسلے میں طلبار کو صحیح رہنمائی ضرور ملتی چاہیے۔ انھوں نے قومی تعلیم کے نصاب میں قومی روایتوں اور قوم کے تمدنی ورثے کو بنیادی حیثیت دی ہے اور اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے جامعہ کے تعلیمی اداروں کے ماحول کو باہمی محبت اور تعاون کے ذریعے ایسا دلکش اور اتنا سازگار بنایا کہ استاد اور طلبار جامعہ کو اپنا گھر اور اپنا خاندان جیسا سمجھنے لگے تھے اور ڈاکٹر صاحب کو اس خاندان کا مورث اعلیٰ مانتے تھے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مدرسے اقامتی تھے۔ صبح سے شام تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور مل جل کر کام کرنے سے طلبار کے دلوں میں باہمی محبت، عزت، ایثار اور بھروسہ پیدا ہوتا تھا۔ مدرسے کے کاموں میں صبح کی ورزش، شام کے جماعتی کھیلوں اور انفرادی کھیلوں نیز نجی مطالعے کو خاص طور سے شامل کیا گیا تھا۔ چھٹی کے دنوں میں آس پاس کے گاؤں میں جا کر سماج سیوا کے کام کیے جاتے تھے اور کلچرل پروگراموں میں طلبار کے والدین اور بستی کے عام لوگوں کو شریک کیا جاتا تھا۔ اس طرح طلبا کو معاشرتی اور طبعی ماحول سے واقفیت ہوتی اور علم کو عملی لباس پہنانے کا موقع ملتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ برادری کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو ذہن کی پرورش اور سیرت کی تعمیر کے لیے مفید بنایا۔ انفرادیت اور شخصیت کی صحیح نشوونما کے لیے مختلف قسم کے کام کرائے جاتے تھے۔ خود غرضی اور ذاتی مفاد کے مقابلے میں جماعتی فلاح و بہبود کو ترجیح دی جاتی تھی مختلف قسم کے پراجکٹوں اور سرگرمیوں کے ذریعے علم کو برتنے اور سیرت پر اثر انداز ہونے کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ غرض یہ کہ اقامتی زندگی کو طلباء کے لیے مصیبت نہیں راحت بنایا جاتا تھا اور یہ زندگی طلباء کو اچھا انسان اچھا مسلمان اور سچا ہندوستانی بنانے میں مفید اور مددگار ثابت ہوتی تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے بحیثیت معلم تعلیمی عمل میں محبت اور آزادی کی طرف خاص طور سے توجہ دی اور اپنے رفقاء کار کو بھی اس طرف توجہ دلائی۔ ان کے یہاں وہ آزادی نہیں ہے جو روسو کے یہاں تھی اور وہ محبت نہیں جو کسی ناسمجھ اور غیر مہذب کے یہاں ملتی ہے۔ ان کی توجہ اس آزادی کی طرف تھی جو طلبا اور استاد کے بنائے ہوئے قاعدوں کی پابند ہوتی ہے یا جوان کے نمائندوں اور بزرگوں کے بنائے اصولوں کے مطابق کام کرنا سکھاتی ہے تعلیم میں استاد کی ضرورت اور اہمیت کو مانتے ہوئے انھوں نے سدا یہی کہا اور کرکے دکھایا کہ استاد کو اچھا سماجی انسان ہونا چاہیے اور اس کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا محبت کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے بچے سے محبت ہوتی ہے وہ بچے کی خدمت کو اپنی زندگی کا افتخار جانتا ہے اور بچے کی طرف سے جب ساری دنیا مایوس ہوجاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید رہتی ہے۔ ایک اس کی ماں اور دوسرے اچھا استاد۔

سید ظہور قاسم

ذاکر صاحب کی یاد میں

مارچ ۹ ۴۹ء میں اتوار کے دن شاید میری پہلی ملاقات ڈاکٹر ذاکر حسین سے ہوئی تھی۔ اس وقت وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے اور میں بی۔ایس۔سی (آخری سال) کا طالب علم تھا اور وقار الملک ہال میں رہ رہا تھا۔ ہمیں اچانک خبر ملی کہ وائس چانسلر صاحب ہمارے ہاسٹل میں آئے ہوئے ہیں اور ہمارے کمرے سے چند کمروں کے فاصلے پر ہیں۔ میرے کمرے میں دو طالب علموں کے رہنے کی گنجائش تھی۔ میرے ساتھ جو صاحب رہ رہے تھے انھیں کمرے میں اپنی تصویریں آویزاں کرنے کا بہت شوق تھا۔ جن میں انھوں نے خود ہی رنگین پنسلوں کی مدد سے رنگ بھر دیا تھا۔ یہ تصویریں دیواروں پر جا بجا لٹکی ہوئی تھیں۔ ہم نے جلدی ہی جلدی جہاں تک ہو سکا کمرے کی حالت درست کی۔ اس مشغولیت کی حالت میں ہی دروازے پر ایک دستک سنائی دی اور ذاکر صاحب ہمارے کمرے میں آ گئے۔ ہلکے بھورے رنگ کی شیروانی، کھدر کا پائجامہ، شیروانی کے رنگ کی ٹوپی میں وہ ملبوس تھے۔ وہ وقار و متانت کا پیکر نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے خود کو ہم سے متعارف کرایا اور فوراً کمرے پر ایک سرسری نظر دوڑائی۔ پھر انھوں نے کمرے کے ہمارے ساتھی کی طرف دیکھا اور کہا "لگتا ہے کہ آپ کو خود سے بہت محبت ہے"۔ ان صاحب نے اس جملے میں پنہاں ظرافت کو سمجھے بغیر دھیمے لہجے اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا — "نہیں جناب"۔ ذاکر صاحب نے کہا "خود سے محبت کرنا غلط نہیں ہے۔ دراصل یہ کافی نشاط انگیز ہے۔ لیکن کمرے میں اپنی تصویریں برابر آویزاں کیے رہنے سے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ آپ خود آئینے میں جتنی بار چاہیے دیکھ لیا کیجیے"۔ اس کے فوراً بعد ذاکر صاحب ہمارے کمرے سے باہر چلے گئے۔ کمرے کے میرے ساتھی نے اپنی تصویریں ہٹا لیں اور وہ دوبارہ مجھے کبھی نظر نہیں آئیں۔

ذاکر صاحب طالب علموں سے ان کے کمروں میں جا کر ملا کرتے تھے۔ اور ہر کمرے میں

وہ مختلف قسم کی باتیں کہا کرتے تھے۔ وہ کمروں میں اکیلے ہی جانتے تھے۔ شاید ان کے سکریٹریوں میں سے کوئی ایک ساتھ ہوتا تھا جو باہر ہی کھڑا رہتا تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں یہ واقعہ بیان کیا۔ وہ وقارالملک ہال کے میرس ہاسٹل میں جانا چاہتے تھے۔ اس ہال کے چار ہاسٹل میں جو تقریباً ایک جیسے ہی ہیں۔ اُن کا ڈرائیور ٹھیک سے میرس ہاسٹل کا تعین نہ کرسکا۔ اور اس نے کار روک دی۔ ذاکر صاحب نے ایک دوسرے ہاسٹل کے طالب علم سے پوچھا۔ "میرس ہاسٹل کون سا ہے؟" طالب علم نے بغیر وائس چانسلر کو پہچانتے ہوئے جواب دیا۔ "معاف کیجیے گا میں تو بی۔ ایڈ کا طالب علم ہوں اور مجھے اس بات کی فرصت ہی نہیں ملی کہ میں اس ہاسٹل کے بارے میں جان سکوں۔" طالب علموں کی کھوج اور جستجو کی صلاحیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ذاکر صاحب نے فرمایا کہ یہاں ایک طالب علم کی بھی مثال موجود ہے جسے برابر کے ہاسٹل کا نام جاننے تک کی فکر نہیں ہوئی۔

اپریل ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جنرل اسپورٹس کے کپتان کی حیثیت سے میں دہلی میں ہو رہے ایک ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے ایک ٹیم لے جا رہا تھا۔ ٹیم کے کچھ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ میں وائس چانسلر کی دعائیں اور نیک خواہشات لینے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے انتہائی گرمجوشی سے ہم سے مصافحہ کیا اور کامیابی کی نیک خواہشات سے ہمیں فراخدلی سے نوازا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا چونکہ آپ دہلی جا رہے ہیں اس لیے کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرا ایک خط پروفیسر محمد مجیب کو لے جاکر دے دیں کیونکہ اس طرح ڈاک کے مقابلے یہ خط جلد پہنچ جائے گا۔ پروفیسر محمد مجیب اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر تھے۔

دہلی ٹیم لے جانے کے لیے ہمیں یونیورسٹی کی ایک پرانی کھٹارا جیپ ملی تھی۔ راستے میں یہ جیپ کئی بار خراب ہوئی۔ خوش قسمتی سے اس کا ڈرائیور کافی حد تک اچھا میکنیک تھا جو اسے چلنے کے قابل بنا لیتا تھا لیکن ہم سب کو اکثر و بیشتر اسے پیچھے سے دھکا دینا پڑتا تھا۔ اس طرح دہلی پہنچنے میں ہمیں چھ گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔ ٹیم ابھی تھکن دور کر رہی تھی اور میں موقع غنیمت جان کر اس جیپ پر جامعہ روانہ ہو گیا تاکہ وہ خط پروفیسر مجیب کو پہنچا دوں۔ مجھے پوری طرح سے یاد ہے کہ نظام الدین کالونی سے، جو اس وقت بہت چھوٹی سی بستی تھی، گزرنے کے بعد اوکھلا گاؤں تک شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ملا ہو جہاں عمارتیں کھڑی ہوں۔ کچی سڑک کے دونوں طرف عام طور سے ببول کے درخت کھڑے تھے۔ راستے میں مجھے کئی موڑ نظر آئے۔ میں آخر کار اپنی منزل تک پہنچ گیا اور پروفیسر محمد مجیب کی خدمت میں وہ خط پیش کر دیا۔ پروفیسر مجیب کی شکل میں مجھے ایک بے مثال شخصیت نظر آئی۔ انتہائی منکسر المزاج اور بے تکلف چائے پینے کے بعد پہلی منزل میں واقع

اپنے دفتر سے وہ میرے ساتھ نیچے آئے اور مجھے عمارتوں کے نام سے روشناس کرانے لگے۔ وہ ان عمارتوں کے بارے میں اس انہماک سے بتا رہے تھے جیسے یہ ان کا انتہائی دل پسند خزانہ ہوں۔ کسی وائس چانسلر کا اس طرح ایک طالب علم سے پیش آنا میرے لیے نہایت حیرت انگیز تجربہ تھا۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں ذاکر صاحب کو جاکر بتادوں کہ وہ ان کے خط کا جواب بذریعہ ڈاک بھیج دیں گے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے یہ میری پہلی شناسائی تھی۔ اس وقت میرے خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ انتالیس سال بعد اسی مہینے اپریل میں بحثیت وائس چانسلر کے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قدم رکھوں گا۔

علی گڑھ واپس ہونے پر وائس چانسلر کی رہائش گاہ پر میں ذاکر صاحب سے ملنے گیا تاکہ اپنے تجربے اور پروفیسر مجیب صاحب سے اپنی ملاقات کے بارے میں انھیں بتا سکوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ جامعہ کے وائس چانسلر کے انکسار اور سادگی نے مجھے کتنا متاثر کیا ہے۔ ان دو لفظوں کا ذاکر صاحب پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ انھوں نے مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔

"یاد رکھو انکسار اور حلم عظمت کی علامت ہیں۔ یہ گاندھی جی کا قول ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ بات کہی ہے بلکہ دنیا کے سامنے کرکے دکھایا ہے اور اس کی سچائی کو ثابت کردیا ہے۔ وردھا میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بیٹھے ہوئے اور بنیادی ضروریات زندگی کو کم کرکے انھوں نے پورے برطانوی سامراج کی طاقت کو ہلاکر رکھ دیا۔ عظمت یہ ہے۔ ہمیں مہاتما گاندھی کی طرز زندگی سے سبق لینا چاہیے۔ میں اور مجیب اسی راہ پر چلنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اگر کسی دن وائس چانسلر بن جاؤ تو ذہنی توازن نہ کھو بیٹھنا۔"

یہ وہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ کیونکہ جو بات روا روی میں کہی گئی تھی۔ وہ صحیح ثابت ہوئی۔

میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا اپریل ۱۹۸۹ء سے اگست ۱۹۹۱ء تک وائس چانسلر رہا۔ میرے اوپر اخلاقی اور پیشہ ورانہ دونوں طرح کا فرض عائد ہوتا تھا کہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے اس رول کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہوں جو انھوں نے جامعہ کی تعمیر میں ادا کیا تھا۔ اس ادارے کا قیام ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں بطور ایک آزاد یونیورسٹی کے عمل میں آیا تھا۔ جامعہ کو حکومت یا اس کی اعانت سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اس ادارے کا مقصد تھا قومی امنگوں کی تکمیل کرنا۔ حکیم اجمل خاں (قومی آزادی کے مشہور مجاہد) اس کے چانسلر (امیر جامعہ) مقرر ہوئے جو اس عہدے پر ۱۹۲۷ء میں اپنے انتقال تک فائز رہے۔ مولانا محمد علی (ایک

دوسرے مجاہد آزادی) اس کے پہلے وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) بنے اور جب مولانا کو اپنی قومی سرگرمیوں کی پاداش میں جیل جانا پڑا تو ان کی جگہ خواجہ عبدالمجید نے پُر کی۔ ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ کے تدریسی عملے کے رکن بنے اور ساتھ ہی اس کی مجلس منتظمہ اور مجلس تعلیمی کے ممبر ہوئے۔ وہ جامعہ کے ادارہ کے طباعت کے بھی انچارج تھے۔ ۱۹۲۲ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے جرمنی چلے گئے جہاں پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین سے ان کی دوستی ہوئی جو تاحیات برقرار رہی۔ اس عرصے میں جامعہ کافی حد تک مالی دشواریوں سے دوچار تھی۔ اور نوبت اس کے بند ہونے تک پہنچ گئی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو اس بات کا پتہ جرمنی میں چلا اور انھوں نے اس کے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں کو بذریعہ تار مطلع کیا کہ "میں اور میرے رفیق جامعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کرنے کے لیے تیار ہیں اور جب تک ہم لوگ نہ لوٹیں۔ جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔"

اس پیغام نے جامعہ برادری میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ انھوں نے جامعہ بند نہ کرنے کا عہد کیا اور اسے علی گڑھ سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا جہاں اس کی دیکھ بھال یہاں سے بہتر کی جا سکتی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری یورپ گئے جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین ان لوگوں سے ملے اور خدمت جامعہ سے متعلق اپنے رفیقوں کے فیصلے کا انھیں یقین دلایا۔ اس وقت جامعہ تقریباً ختم ہونے کے قریب تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے معاشیات میں جو مقالہ پیش کیا تھا اُسے ایک بڑے حلقے نے سراہا اور برلن یونیورسٹی نے اس پر انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔ ۱۹۲۶ء میں وہ اپنے ساتھیوں محمد مجیب اور عابد حسین کے ساتھ ہندوستان واپس آئے اور اپنے وعدوں کی پابندی کرتے ہوئے خدمت جامعہ میں لگ گئے۔ یہ جامعہ کے لیے بہت مشکل دور تھا۔ اصل دقت وسائل کی کمی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا ادارہ تھا جو چند پرانی عمارتوں میں کام کر رہا تھا۔ ذاکر صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے، ڈاکٹر عابد حسین نے بطور رجسٹرار کے اور محمد مجیب نے بحیثیت پروفیسر کے اس چھوٹی بھرے کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھا لیا۔ جامعہ کو اس طرح اپنے وجود کے چھٹے سال ایک نئی زندگی مل گئی اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ چند برسوں میں ہی جامعہ کو قومی قائدین میں مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ پھر بھی اس کی مالی دشواریاں برقرار رہیں۔ ذاکر صاحب نے عہد کیا کہ وہ ایک سو پچاس روپیہ ماہانہ سے زیادہ تنخواہ نہیں لیں گے۔ لیکن حقیقتاً انھیں اسّی روپیہ ماہانہ سے زیادہ کبھی دستیاب نہیں ہوئے۔ تنخواہوں کی ادائیگی کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو ادائیگی پہلے کی جاتی تھی اور سب کے بعد ذاکر صاحب کو تنخواہ ملتی تھی۔

جامعہ کا بحران جب زیادہ بڑھا۔ تو جامعہ کے ملازمین کو صرف نصف تنخواہ نقد ملنے

لگی اور باقی نصف ان کے کھاتوں میں جمع ہونے لگی۔ ذاکر صاحب کو صرف چالیس روپیہ ماہانہ ملنے لگے یہ وہ رقم تھی جو ذاکر صاحب ۴۴ء تک لیتے رہے۔ ۱۹۴۵ء ۱۹۴۸ء تک انھیں اسّی روپیہ ماہوار دستیاب ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

۱۹۳۵ء تک جامعہ قرول باغ میں کام کرتی رہی۔ یہ وہ بستی تھی جہاں حکیم اجمل خاں کی رہائش تھی اور ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اسی سال ذاکر صاحب نے اوکھلا گاؤں میں ایک بہت بڑا قطعہ آراضی حاصل کر لیا جہاں آج جامعہ قائم ہے۔ اوکھلا میں نئی عمارتوں کے لیے فنڈ جمع کرنے کا زیادہ تر سہرا ذاکر صاحب کے سر ہے۔ انھوں نے ایک جامعہ برادری قائم کی جو جامعہ کارکنوں اور اوکھلا گاؤں کے باشندوں کے مابین بھائی چارہ پیدا کرنے میں مددگار ہوئی۔

ذاکر صاحب ایسے ماہر تعلیم تھے جنھیں علم کے مختلف پہلوؤں پر کمال حاصل تھا۔ مہاتما گاندھی نے ان کی صلاحیت کو پہچانا اور بنیادی تعلیم کی اسکیم مرتب کرنے کے لیے ۳۷ء میں بمقام وردھا جو کانفرنس انھوں نے منعقد کی۔ شرکت کے لیے انھوں نے ذاکر صاحب کو مدعو کیا۔ ذاکر صاحب نے مہاتما کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنی زبردست صلاحیت کو بروئے کار لاکر چار تجاویز کا مسودہ تیار کیا جو آج تک ہندوستان میں پرائمری اور ثانوی تعلیم کا امتیازی نشان مانے جاتے تھے۔

ذاکر صاحب سیاست داں نہیں تھے۔ لیکن سیاست داں اُن کا احترام کرتے تھے کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی قوم کی تعمیر کے لیے وقف کر دی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت حال بہت خراب ہو چکی تھی۔ ذاکر صاحب کے مدت کار کے دوران یہ ادارہ ترقی کرنے لگا اور تمام میدانوں میں اعلیٰ معیاری مرکزی صورت میں پروان چڑھا۔ وائس چانسلر کی مقررہ پانچ سالہ مدت کار پورا کرنے کے بعد انھیں دوبارہ پانچ سال کی مدت کے لیے وائس چانسلر کا منصب پیش کیا گیا۔ لیکن اس مدت کار کے پورا ہونے سے بہت پہلے ہی انھوں نے ۱۹۵۶ء میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۵۲ء میں ذاکر صاحب، راجیہ سبھا کے ممبر نامزد کیے گئے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ان کے کارہائے نمایاں اور دوسرے مختلف اداروں میں ان کی خدمات پنڈت جواہر لال نہرو سمیت قومی قائدین کو اپنی طرف متوجہ کر چکی تھیں اور بہت سے قومی اہمیت کے منصب ان کے منتظر تھے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ بہار کے گورنر مقرر ہوئے۔ بہار کے عوام کی بخیر و خوبی خدمت انجام دینے کے بعد وہ ۱۹۶۲ء میں نائب صدر جمہوریہ ہند کے منصب پر فائز ہوئے انھوں نے راجیہ سبھا کے چیرمین کی حیثیت سے اس کی کارروائیوں

کو پورے وقار کے ساتھ چلایا۔ ذاکر صاحب ۱۹۶۷ء میں صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔ ان کے انتخاب کو پورے ملک میں گرمجوشی سے سراہا گیا۔ اس وقت کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ذاکر صاحب کے بارے میں کہا تھا:

"زندگی بھر کی بے لوث خدمت کا صلہ منتخب صدر کو پوری قوم کی محبت، احترام اور خیر سگالی کی صورت میں ملا ہے۔" ان کے بقول "یہ ہندوستانی سیکولرزم کی فتح ہے۔"

۱۳ر مئی ۶۷ء کو جمہوریہ ہند کے تیسرے صدر کی حیثیت سے حلف لیا تھا۔

ذاکر صاحب کے لیے دل چسپ مشغلہ باغبانی تھا۔ وہ جہاں بھی رہے انھوں نے اس جگہ کو گلزار بنا دیا۔ ان کا گھر اور ان کے دفتر کی عمارت علی گڑھ میں وائس چانسلر لاج، پٹنہ میں راج بھون، نئی دہلی میں نائب صدر کی رہائش گاہ اور راشٹرپتی بھون سبھی لوگوں کو گلابوں سے ان کے عشق کی داستان سناتے ہیں۔ گلاب اگانے والوں نے گلاب کی کئی نئی قسموں کو ان کے نام سے منسوب کیا ہے۔

اپنی یادوں کے دائرے کو سمیٹتے ہوئے میں ذاکر صاحب کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ حالانکہ وہ ہمارے ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے لیکن گاندھی جی کے اقوال پر سچائی سے چلتے ہوئے انھوں نے انکساری اور سادگی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ ان کی عظمت کا راز یہی ہے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کی کچھ خصوصیات کو شریمتی اندرا گاندھی نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

"انھوں نے اپنی شخصیت میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی گہرائی اور لطافت کی آمیزش کے ذریعہ اپنے اقوال و اعمال سے ہماری عوامی زندگی کے معیار کو بلند کر دیا تھا۔ جس بھی کام کا انھوں نے بیڑا اٹھایا، ماہر تعلیم اور سماجی کارکن کی حیثیت سے انھوں نے جو بھی تعمیری کام کیے اور قومی اور بین الاقوامی جس عہدے کو بھی انھوں نے شرف منزلت بخشا وہ سب آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہوں گے۔"

کے. نٹور سنگھ

ذاکر حسین: انسانِ کامل

یہ بات ہے ۵۰ء کے آخری سالوں کی جب نامور مصور ایم۔ ایف حسین نے دلی میں ایک نمائش کی یہ زمانہ وہ تھا جب ان کی نمائشوں کی ابتدا تھی۔ اس زمانے میں ان کی تصاویر لاکھوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں فروخت ہوا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس زمانے میں بہار کے گورنر تھے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں وہ ذاتی تشریف لائے۔ ایک دن بڑے اطمینان، خاموشی اور بغیر بتائے وہ نمائش میں تشریف لائے۔ اس سے پہلے کہ ایم۔ ایف حسین اپنا تعارف کراتے ذاکر صاحب نے ایک دم مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا: "خاکسار کو بھی حسین کہتے ہیں"۔ یہ واقعہ بالکل سچا ہے اور اس طرح کے اس عظیم انسان کے اور بھی نہ جانے کتنے واقعات ہیں کہ اگر ان کو قلمبند کیا جائے تو ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔

میرا تعلق ڈاکٹر ذاکر حسین سے ۱۹۵۶ء سے رہا ہے۔ اس زمانے میں وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ تھے۔ انڈونیشیا کے نائب صدر ڈاکٹر ایم۔ حاطہ جب ہندوستان تشریف لائے تو علی گڑھ جا کر ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں ان کے ہمراہ تھا۔ اس وقت میری عمر بمشکل ۲۶ سال ہوگی۔ میں نے ذاکر صاحب سے اپنا تعارف کرایا۔ جس اپنائیت اور پیار کا برتاؤ انھوں نے میرے ساتھ کیا کہ اسی دم سے میں ان کا معتقد ہو گیا۔

۱۹۶۲ء میں پنڈت نہرو نے ان کو نائب صدر منتخب کیا۔ ۱۹۶۴ء میں میں اندرا گاندھی کے ساتھ نیویارک میں تھا۔ انھوں نے مجھے تاکید کی کہ میں ذاکر صاحب کے لیے گلابوں کی کتابیں ضرور خرید لوں میں نے کتابیں خرید لیں۔ لگ بھگ ۱۹۶۶ء میں، میں اندرا گاندھی کا عہدۂ سکریٹری پر فائز ہوا۔ پھر میری ڈاکٹر ذاکر حسین سے اکثر ملاقات رہا کرتی تھی۔

اکثر و بیشتر میں خاص خاص واقعات سے متعلق ایک روزنامچہ تیار کیا کرتا تھا اور اس میں اہم واقعہ یا گفتگو وغیرہ نوٹ کر لیا کرتا تھا جس کو میں اپنے خیال میں اہم سمجھتا تھا۔

۷ راکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایک جگہ لکھا ہے:

کل شام مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین نے بلوایا۔ میں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میں پیرس میں منعقد ہونے والے یونسکو کے ۲۰ ویں سالانہ جشن میں شرکت کے لیے پیرس جارہا ہوں۔ وہ بے حد مرنجان مرنج موڈ میں بات چیت کررہے تھے۔ انھوں نے بہت سے مسئلوں پر گفتگو کی۔ کچھ تو اس قدر اہم تھے کہ ان کو میں نے نوٹ بک میں درج کرلیا تاکہ وزیر اعظم کو باخبر کیا جاسکے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کو اندیشہ تھا کہ پارلیامنٹ کا آنے والا اجلاس خاصا ہنگامی ہوگا حکومت اور کانگریس پارٹی اس کے لیے اپنے کو تیار کررہی ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ کسی بھی ہنگامے سے سلجھنے کی تیاری کرلے۔ یہ ہماری بڑی اہم غلطی ہے کہ ہم ایک بحران سے نکلتے ہی دوسرے بحران میں گرفتار ہوجاتے ہیں یا ان کو سلجھانے کی بجائے اور متضاد حالات پیدا کردیتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ آنے والے اس اجلاس میں کافی بدمزگی اور ایک دوسرے کی مخالفت ہوگی۔

ذاکر صاحب نے یہ بھی کہا کہ حکومت کو ایسے موقع پر ایک ساتھ مل کر ایک مضبوط ٹیم کی شکل میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ حکومت میں ہمارے کچھ ساتھی وفادار نہیں ہیں۔ ہمارے وزراء بجائے اس کہ ایک دوسرے کی مدد کریں، بچاؤ کریں، بہت خوشی محسوس کرتے ہیں اس حال کے جس پر بے جا دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ وزیر اعظم کو چاہیے تھا کہ راج نارائن کے عائد کیے الزامات کا جواب خود دیتیں (مجھے یاد نہیں کہ وہ الزامات کیا تھے)۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم کو غلط مشورے دیئے گئے ہیں۔ جب کہ پوری زندگی پیرہ سیاست میں دخیل رہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے اور اس بات کا عادی بھی ہونا چاہیے کہ ناخوشگوار حالات کا کیسے سامنا کیا جاتا ہے۔

ڈی۔ پی نے کہا کہ شری مدھولیمائے نے ان سے کہا کہ وہ کسی بھی وقت کوئی بھی حکومت کی فائل پیش کرسکتے ہیں۔ یہ بظاہر مبالغہ آرائی تو ہے ہی مگر اس میں کچھ تو سچائی ہوگی ہی۔ انھوں نے کانگریس میں بڑھتی ہوئی "حکمرانی" کی بہت مذمت کی سختی سے ایس۔ اتولیہ گھوش اور ڈی۔ پی۔ مشرا نکتہ چینی کی۔ ذاکر صاحب کا نظریہ تھا کہ کم سے کم ۲۰-۳۰ فیصد ممتاز نوجوانوں کو ٹکٹ دینا چاہیے اور پھر رفتہ رفتہ ان کی اس طرح تربیت کی جائے کہ مستقبل میں بڑھ کر اچھے لیڈر بن سکیں۔

جناب نائب صدر نے شری گلزاری لال نندہ پر سخت نکتہ چینی کہ کس غلط طریقے سے انھوں نے طلبا کے ہنگاموں کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مزید یہ بھی کہا کہ میرے لیے یہ غیر ناممکن تھا کہ میں شری کامراج سے کوئی حتمی گفتگو کرسکوں جن کو نہ ہندی آتی ہے اور نہ انگریزی۔ کانگریس کے صدر کی بات چیت بالکل ایسی ہوتی تھی خود بولنا اور خود ہی سمجھنا۔

دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ کوشش کرکے ان سے زیادہ سے زیادہ رابطہ بنائے رکھا جائے۔ کون جانتا تھا کہ صرف وزیرِ اعظم ہی کانگریس کو الیکشن میں کامیابی دلائیں۔ الیکشن کے بعد وہ کیا کریں گے یہ بات کسی طور پر صاف نہیں معلوم تھی۔

۱۹۶۶ء کے آخر میں اندرا گاندھی نے طے کرلیا تھا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی میعاد نہیں بڑھائیں گی۔ ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنا ارادہ بدل دیں مگر انھوں نے اس کو نہیں مانا۔ ذاکر صاحب ووٹوں کی کثیر تعداد میں صدر منتخب ہوگئے۔ جناب کے۔ سبھا راؤ، جنھوں نے چیف جسٹس کے عہدے سے استعفیٰ دیدیا تھا اور اُن کے حریف تھے۔

چناؤ کے دوران ڈاکٹر ذاکر حسین امریکہ میں تھے اور الیکشن سے تین دن پہلے پہنچے تھے۔ ۹ رمئی ۱۹۶۷ء کو وہ صدر منتخب ہوگئے۔ میں ان کو شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ مبارک باد پیش کرنے ان کی رہائش ۶۔ مولانا آزاد روڈ پر پہنچا۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے فرمایا تھا: "یہ تو بالکل ایسا ہی تھا کہ جیسے کرکٹ میچ میں اسکور بتائے جاتے ہیں، ہر چند منٹ بعد مجھے بتایا جا رہا تھا کہ کتنے رن/ ووٹ سے میں آگے بڑھ رہا ہوں۔"

۱۳ رمئی کو حلف لیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"پورا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے رہنے والے میرا خاندان! میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ میرا گھر خوب صورت ہو، مضبوط ہو! ایک ایسا نادر گھر جس کے سارے عظیم افراد اپنی ان تھک کوشش کریں کہ وہ گھر خوشحال اور پُرامن ہو۔ ۔ ۔ ۔ ہم کوشش کریں گے کہ اپنی قومی طاقت میں اخلاق، حسنِ عمل، اپنے غور و فکر کو مشرق سے مغرب تک، سیگفرائڈ سے بدھ تک شامل کریں۔"

حسنِ اتفاق سے گاندھی اور نہرو کی قدرِ مشترک یہ تھی کہ دونوں ہی ذاکر صاحب کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے ہندوستانی مسلمان تھے کہ جن کو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر ناز تھا۔

جب مہارانی پٹیالہ مہندر — میری ہونے والی خوش دامن۔ اگست ۱۹۶۶ء میں ذاکر صاحب کے گھر ان کو اپنی لڑکی کی شادی کا دعوت نامہ دینے پر مدعو کرنے گئیں تو انھوں نے بے حد سلیس اردو میں کہا: "آپ نے داماد تو اچھا چنا ہے۔"

جس زمانے میں وہ راجیہ سبھا کے چیرمین تھے تو ان کو شری راج نارائن کے سرکش اور اودھمی رویئے کے ساتھ خاصی جدوجہد کرنا پڑتی تھی۔ ایک دن انھوں نے شریمتی اندرا گاندھی سے کہا: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کس طرح قابو میں کیا جائے۔ جب وہ ہاؤس سے باہر ہوتے ہیں تو بہت اچھی بات کرتے ہیں مگر جب ہاؤس میں ہوتے ہیں تو روزانہ ہی ایک نہ ایک تماشا کیا کرتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہی جنرل آتا ہے تو وہ زمین پر لیٹ جاتا ہے۔ ۔ ۔"

بہ حیثیت صدر انھوں نے ہندوستان کے سب سے اونچے عہدے میں چار چاند لگا دیئے۔ راشٹرپتی بھون میں کھانے پینے کا انتظام کوئی خاص نہیں تھا اسی لیے مشہور بھی نہیں تھا مگر ذاکر صاحب کے مختصر عہد کے دوران، اس میں خوشگوار تبدیلی آچکی تھی۔

ان کا انتقال بالکل اچانک ہوا۔ ان کے ذاتی ڈاکٹر، میرے قریبی دوست ڈاکٹر ہربنس لال مرحوم تھے۔ وہی تھے جنھوں نے ۳ رمئی ۱۹۶۹ء کو آخری بار زندہ دیکھا تھا انھوں نے فوراً ہی مجھے فون کیا۔

شریمتی اندرا گاندھی اس دن جودھ پور میں تھیں، فوراً دلّی آگئیں۔ شری پی۔ این ہکسر اور میں ان کو پالم ایرپورٹ سے لے کر آئے۔ وہ بے حد سوگوار اور دل شکستہ تھیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی اچانک موت ایک زبردست سیاسی زلزلہ تھا جس نے کانگریس پارٹی کی تاریخ بدل ڈالی تھی۔

"میرے "روزنامچہ" میں ۲۹ راگست ۱۹۶۹ء میں ایک مختصر نوٹ تھا:

"مجھ سے کہا گیا کہ ذاکر حسین میموریل کمیٹی کی تشکیل کی جائے۔ اس بارے میں شری خورشید عالم خاں صاحب سے میں نے مشورہ کیا۔ ان کی مہربانی تھی کہ جو انھوں نے مشورے دیئے وہ نہ صرف اچھے تھے بلکہ آگے چل کر بہت مددگار اور قابل قبول ہوں گے۔ ان کا خیال ہے کہ ذاکر حسین میموریل جامعہ کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیا جائے ہاں مگر ان کی شمولیت ناگزیر ہے۔ انھوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ فخرالدین علی احمد صاحب بھی کمیٹی میں ہوں۔ پروفیسر مجیب کو شاید یہ سب اچھا نہ لگے (اور ایسا ہی ہوا)۔ کمیٹی کے سرپرست شری وی۔ وی۔ گری تھے اور اندرا گاندھی صدر۔ وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ فخرالدین علی احمد، پی۔ سی۔ سیٹھی، کرنل بشیر زیدی اس کمیٹی کے اراکین تھے۔ فیصلوں میں تاخیر نہیں ہوئی لہٰذا نئی دہلی کی ایک بڑی اور اہم سڑک کا نام ڈاکٹر ذاکر حسین مارگ کیا گیا۔ دلّی کالج ذاکر حسین کالج بن گیا اور جامعہ میں مرحوم صدر کے مقبرے کے پاس ہی میموریل بلڈنگ اور میوزیم تعمیر ہوئے۔"

قدرت کی ایک خوب صورت اور اعلیٰ تخلیق نام ہے — ذاکر حسین! وہ ایک انسانِ کامل تھے۔

غلام حیدر

ڈاکٹر ذاکر حسین اور بچوں کا ادب

ڈاکٹر ذاکر حسین کی زندگی کے آخری کم و بیش بائیس (۲۲) برس۔ بہار کی گورنری سے صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت میں انتقال تک کے دور نے عام لوگوں کے ذہنوں پر کچھ ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ ان جیسی تہہ دار اور ہمہ جہت شخصیت کے بہت سے اور زیادہ مفید پہلو پس منظر میں رہ گئے۔ ان میں جس پہلو پر سب سے کم توجہ دی گئی وہ بچوں کے اردو ادب میں ان کا وہ مجددانہ کردار ہے جو انھوں نے کم و بیش اُسی وقت سے ادا کرنا شروع کر دیا تھا جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وہ ایک اہم رُکن کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے۔

وہ بقول خود ایک معلم تھے اور صدر جمہوریہ منتخب ہونے کے بعد انھوں نے اپنے پہلے بیان میں کہا تھا کہ "میں نے کوئی سینتالیس سال پہلے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اپنی زندگی قومی تعلیم کے لیے وقف کر دوں گا۔"[1]

اپنی گوناگوں مصروفیات، انقلاباتِ وقت اور ستم ہائے روزگار میں وہ بچوں کے لیے خود تو کم ہی لکھ پائے لیکن بہر حال اس خیال سے غافل کبھی نہیں رہے۔ ان کی پہلی کتاب 'باچھو' ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی اور آخری ۱۹۶۲ء میں۔ ذاکر صاحب کی وہ تحریریں جو بچوں کے لیے تسلیم کی جاتی ہیں، کچھ درسی مضامین کے علاوہ یہ ہیں: 'ابو خاں کی بکری'، 'عقاب'، 'سعیدہ کی اماں'، 'جولاہا اور بنیا'، 'جیدو'، 'اندھا گھوڑا'، 'آخری قدم'، 'سچی محبت'، 'ماں'، 'بے کاری'، 'پوڑی جو کڑھائی سے نکل بھاگی'، 'مرغی کا نرالا بچہ'، 'اُسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم'، 'آؤ گھر گھر کھیلیں'، (یہ سب کہانیاں ان کی مشہور کتاب 'ابو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں' میں شامل ہیں)، 'باچھو'، 'پن چکی والا'، 'آدمی کی کہانی ایک ستارے کی زبانی'، 'رنگے انڈے'، 'دیانت' (ڈرامہ) اور 'کھوٹا سونا' (ڈرامہ)۔ یہ سب کہانیاں کسی نہ کسی دور میں رسالہ 'پیام تعلیم' یا مکتبہ جامعہ سے کتابی صورت میں شائع ہوئی تھیں۔ ذاکر صاحب نے اپنی کتاب 'ابو خاں کی

[1] ضیاء الحسن فاروقی۔ شہید جستجو ص ۵۳۶۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۸۸ء

بکری، کے تعارف میں پہلے صفحے پر ہی اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ کہانیاں انھوں نے اپنی بیٹی رقیہ ریحانہ کے نام سے شائع کروائی تھیں اور رقیہ ریحانہ نے بھی کہیں سنی تھیں یا پڑھی تھیں. اس بیان سے یہ بات واضح ہے کہ یہ کہانیاں ماخوذ ہیں۔

ذاکر صاحب کی ایک کتاب انگریزی میں Fables and Stories کے نام سے انڈین پبلیکیشنز، نئی دہلی نے شائع کی تھیں۔ یہ اصل میں ان کی چھ کہانیوں کا ترجمہ ہے جو ابو خاں کی بکری، میں شامل ہیں۔ اس کے مترجم رادھے موہن ہیں۔ ان کی ایک کتاب 'کچھوا اور خرگوش' بھی ہے جس کے متعلق عبداللہ ولی بخش قادری نے اپنے ایک مضمون 'کچھوا اور خرگوش ایک تعلیمی تجزیہ۔ کے پہلے ہی جملے میں اس غلط فہمی کا ازالہ بہت دل چسپ انداز میں کر دیا ہے کہ یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی تھی۔ ان کے الفاظ ہیں:

"لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپنے والوں کو اس کہانی نے اپنے نام اور ظاہر، سے خوب دھوکا دیا ہے۔ عموماً وہ بچوں کی کتاب سمجھی گئی ہے۔"[۱]

میرا خیال ہے کہ یہ کتاب صرف 'بڑوں' کے لیے نہیں، 'بہت بڑوں'، یعنی بہت پڑھے لکھے لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ ذاکر صاحب کے سوانح نگار ضیاء الحسن فاروقی نے لکھا ہے:

"ذاکر صاحب کی ایک کہانی 'کچھوا اور خرگوش' ہے۔۔۔ ہمیں ان کے ہاتھ کا لکھا اس کہانی کا مسودہ اور اس کی ایک ٹائپ کاپی ملی ہے۔۔۔ اور اس میں اس کہانی کا جو عنوان درج ہے وہ اس طرح ہے: 'کچھوا اور خرگوش۔ بچوں کی کہانی بڑوں کے لیے'۔ ذیلی عنوان کا اضافہ مصنف کے قلم سے ہے۔"[۲]

ذاکر صاحب کی بچوں کے لیے لکھی ہوئی تحریروں میں کہانیوں، ڈراموں اور مضامین کے علاوہ وہ تقریریں، بیانات اور پیغامات بھی شامل کیے جانے چاہئیں جو انھوں نے جامعہ کے مختلف جلسوں، تقریبوں یا رسالوں کے لیے تیار کیے تھے۔ انھیں صحیح طور پر سمجھنے بلکہ محسوس کرنے کے لیے اس دور کی سیاسی کیفیت اور جنگ آزادی کے مختلف دوروں کو پس منظر کے طور پر نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

۴۷-۱۹۲۷ء کے دو دہوں میں، جس زمانے میں ذاکر صاحب نے بچوں کے لیے زیادہ لکھا، انگریزی حکومت کا دباؤ، آزادی کی جدوجہد کی گرما گرمی، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی وفات سے جامعہ کی مالی مشکلات میں ہمت شکن اضافہ،

---

[۱] عبداللہ ولی بخش قادری۔ 'کچھوا اور خرگوش۔ ایک تعلیمی جائزہ' نقش ذاکر، مرتبہ عبدالحق خاں۔ ص ۲۱۷۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۸۷ء

[۲] ضیاء الحسن فاروقی۔ شہید جستجو، ص۴۷۴، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۸ء

روزانہ زندگی اور رہن سہن کی معمولی سہولتوں کی کمی، دوسری جنگِ عظیم سے پہلے اور اس کے دوران سیاسی گھٹن اور اسی میں آزادی اور سکون سے نئے نئے تجربوں کے ساتھ تعلیم کو آہستہ آہستہ آگے بڑھانے رہنے کی لگن اور اس کے دوران امیدوں اور خطرات کا لامتناہی سلسلہ اِن تمام حالات کے ساتھ ایک انتھک تعمیری ذہن میں بُنے جانے والے خواب، یہی سب ذاکر صاحب کی تحریروں کا پس منظر ہیں اور آزادی، سکون، کھلی فضا کی تلاش اور تمنّا، بندھنوں کو توڑ کر کھلی فضا میں پرواز کرنے کی تڑپ، اِن خوابوں کی مظہر ہیں۔ اس پس منظر کو ذہن میں اور صاف کرنے کے لیے سب سے پہلے اُن کی کچھ تقریروں اور پیغاموں کو مختصر طور پر دیکھا جائے۔

جلیانوالا باغ کے المیہ کی یاد منانے کے لیے منعقدہ ایک جلسے میں ۱۹۳۰ء میں انھوں نے طالب علموں سے کہا:

> "ہم اِس تاریخی واقعے کی یاد کو۔۔۔ اس طرح بھی (منا سکتے ہیں) کہ ہم اپنے دلوں میں انگریزی قوم کی طرف سے نفرت اور انتقام کے جذبات کی پرورش کریں۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ ہم سب کے لیے بہت مضر ہے۔ نفرت کی زمین میں نیکی کا پودا کمہلا جاتا ہے اور غصّے اور انتقام کی ہوا خدمت کے پھولوں کو مرجھا دیتی ہے۔ نفرت تخریب ہے، محبت تعمیر۔ اس لیے جامعہ جو تعمیری کام کو اپنی امتیازی خصوصیت بنانا چاہتی ہے نفرت کی پرورش نہیں کر سکتی۔
>
> میری آرزو ہے کہ اس قومی ہفتے کی یاد تم اس طرح مناؤ کہ اپنے اندر اپنی قوم اور اپنے ملک کی سچی خدمت کے جذبے کو۔۔۔ ایک مستقل عادت کے طور پر اپنی سیرت میں راسخ کر لو کہ تمہاری فطرتِ ثانیہ بن جائے جس ملک میں ہزاروں۔۔۔ لاکھوں، نہیں کروڑوں انسان وباؤں میں مچھر اور مکھی کی طرح مر جاتے ہوں۔۔۔ اور جس ملک میں کروڑوں انسان بلا ایک مرتبہ پیٹ بھر کھانا کھائے چلے جاتے ہیں۔۔۔ وہاں سچی خدمت کے مواقع کی کیا کمی ہے"[۱]

اسی طرح رسالہ پیامِ تعلیم کے ۳۵-۱۹۳۴ء کے سالنامے کے لیے بچوں کے نام جو پیغام ذاکر صاحب نے دیا تھا وہ خود ان کی اور اس ادارے کے ذہن کی بہترین تصویر ہے:

"پیارے بچو، جامعہ تمہیں یہی سکھانا چاہتی ہے، اور یقین ہے کہ تم یہ سب

---

[۱] عبدالغفار مدھولی: جامعہ کی کہانی، ص ۲۹ - ۱۲۷، مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۹۶۵ء۔

کچھ سیکھ جاؤ گے تو یہاں کی تکلیفیں یاد کرکے بھی مزے لوگے اور ان کی شکایت تمہاری زبان پر نہیں آئے گی۔ تم سچے ہوگے، اچھے۔۔۔ تندرست۔۔۔ صاف ستھرے۔۔۔ دیانت دار۔۔۔ دکھن کے پکّے۔۔۔ بُروں کے لیے لوہا۔۔۔ اچھوں کے لیے موم۔۔۔ غریبوں کا سہارا۔۔۔ بےکسوں کا آسرا۔۔ تم جہاں بھی ہوگے اپنے ساتھیوں۔۔۔ پڑوسیوں۔۔۔ بستی کے لیے رحمت ہوگے۔۔۔ اگر تم اچھے ہوگے تو ہماری سب محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔۔۔ تعلیم تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔۔۔ آج ہم کمزور ہیں، اُس وقت تم مضبوط ہوگے۔۔۔ ہاں اس وقت یہ بات نہ بھول جانا کہ تمہاری ساری کامیابی اس لیے ہے کہ تم نے اور تمہارے اگلوں نے بے غرض خدمت کو اپنا شعار بنایا تھا، جو ٹھیک سمجھا وہ دل لگا کر کیا اور نتیجے کو خدا پر چھوڑ دیا۔‘‘[1]

۱۹۴۴ء میں جامعہ کے تعلیمی میلے پر جامعہ کا جھنڈا لہرانے کے بعد جو تقریر کی اس کے کچھ جملے تھے:

’’یہ پرچم جس کے لہرانے کا شرف آج مجھے ملا ہے اسی جامعہ کا پرچم ہے۔ کپڑے کا ایک کم قیمت ٹکڑا۔ لیکن۔۔۔ یہ کپڑے کا ٹکڑا ان خیالات، ان افکار، ان مقاصد، ان حوصلوں کی وجہ سے بے بہا ہے جن کا یہ ترجمان ہے۔۔۔ اس حقیقت کا کہ زندگی ہلکے پھلکے میٹھے میٹھے لفظوں سے نہیں بنتی ہے۔ زندگی نفع نقصان کا بہی کھاتہ نہیں بلکہ کچھ عزائم کے لیے جان کھپانے کا موقع ہے۔۔۔ وہ دُھرا جس پر زندگی گھومتی ہے رنج و راحت کا دُھرا نہیں بلکہ ترقی، تنزل ارتقاء و انحطاط کا دُھرا ہے۔ یہ پرچم باتوں کے مقابلے میں کام کا۔۔۔ گندگی کے مقابلے میں صفائی کا، بدنمائی کی جگہ حُسن کا۔ جسم کی تندرستی کا بھی اور روح کی تندرستی کا بھی۔۔۔ اور اگر ہم تم اپنے ارادوں سے، اپنے کام سے اپنی ثابت قدمی سے اسے ان سب کا عَلَم بنا سکیں تو کپڑے کا یہ حقیر سا ٹکڑا دنیا کی سب دولتوں سے زیادہ قیمتی ہو جائے گا اور اس ملک میں ہمارے لیے باعزت زندگی کا پرچم بن جائے گا۔‘‘[2]

منتشر سے ان کچھ جملوں اور ان جیسے متعدد بیانات کی روشنی میں اگر ہم خود ذاکر صاحب اور ان کے زیرِ اثر جامعہ اور مکتبہ جامعہ سے تیار ہونے والے ادب کو دیکھیں تو ہمیں اس

---

[1] عبدالغفار مدھولی: جامعہ کی کہانی: ص ۸۹-۱۸۷۔

[2] ایضاً ص ۶۱-۲۶۰۔

کے سمجھنے میں کافی آسانی ہوگی۔

ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری نے ذاکر صاحب کی کتاب 'ابو خاں کی بکری، اور چودہ کہانیاں'، پر تبصرہ کرتے ہوئے ان تخلیقات میں اخلاقی اور انسانی صفات کو بچوں کے سامنے اجاگر کرنے کے علاوہ تین اور عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ "رومان اور تحیر، جس کی فضا بچوں کے عنصری جذبات کو اپیل کرتی ہے" دوسرے "جانوروں اور پرندوں سے۔۔۔ محبت" اور تیسرے "فطرت کے مظاہر۔۔۔ کی طرف وہ کشش جو ہم سب محسوس کرتے ہیں" میں ان کی اس رائے سے بھی بہت حد تک متفق ہوں کہ ان کہانیوں میں کہانی پن تو ایسا زیادہ نہیں ہے۔۔۔ لیکن تاثر آفرینی ہر جگہ ملتی ہے[ک] بہرطور میرے خیال میں تین چار کہانیوں (جولاہا اور بنیا'، 'ماں'، 'مرغی اجیر علی' اور 'اسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم') میں کہانی کا عنصر بھی کچھ بہتر ہے۔ اس 'کہانی پن' میں کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ذاکر صاحب کی زیادہ تر تحریریں نسبتاً زیادہ بڑے بچوں کے ذہنی معیار کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں زبان چند موقعوں کو چھوڑ کر، آسان اور سیدھی سادی ہے، اور یوں بھی یہ ان کی عام روش تھی۔

بندھنوں سے چھٹکارا، آزادی حاصل کر لینے کی یہ تمنا اور تڑپ جو اُن کی بچوں کی تحریروں کا، میرے نزدیک، سب سے اہم عنصر ہے، اسے کچھ مثالوں کے ذریعے ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ابو خاں کی بکریاں جنھیں 'پالتو بکری، کی حیثیت میں تمام آسانیاں بلکہ عیش و آرام میسر تھے، لیکن 'پہاڑی بکری، ہونے کی وجہ سے "نہ ابّو خاں کا پیار نہ شام کے دانے کا لالچ ان بکریوں کو بھاگنے سے روکتا تھا نہ بھیڑیے کا ڈر" اور یہ "مصیبت اور خطروں کے باوجود آزاد رہنے کو آرام و آسائش کی قید سے اچھا" جانتی تھیں۔ چنانچہ اُن کی چاندنی نے بھی ایک دن آزادی کا خواب دیکھا: "وہ پہاڑ کی چوٹیاں کیسی حسین ہیں۔ وہاں کی ہوا کا کیا مقابلہ، پھر وہاں اچھلنا کودنا اور ٹھوکریں کھاتا اور یہاں ہر وقت بندھے رہنا۔ آخر چاندنی ابّو خاں سے بغاوت کر کے بھاگ گئی اور اپنی کمزوری اور اس یقین کے باوجود کہ "بکریاں بھیڑیے کو نہیں مار سکتیں" وہ ساری رات بھیڑیے سے لڑتی رہی اور ایک لمحے کے لیے بھی اُسے اپنے کھونٹے پر واپس جانے کا خیال نہ آیا۔ آخر صبح کو بھیڑیے نے چاندنی کو مار ڈالا۔ اس کہانی کے آخری دو جملوں میں 'زندگی' کے اس عظیم تصور کی طرف اشارہ صاف طور پر اُبھر آتا ہے کہ: "ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں

ک اسلوب احمد انصاری: 'ابو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں'، اردو ادب۔ ذاکر نمبر (انجمن ترقی اردو دنبل علی گڑھ) ص ۶۸ (اقتباس۔ ضیاء الحسن فاروقی۔ شہید جستجو ص ۸۲-۵۸۲)

ہے زندگی" وہ جملے ہیں:

"اوپر درخت پر چڑیا بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اس پر بحث ہو رہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی۔ سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا، ایک بوڑھی سی چڑیا ہے وہ مُصر ہے کہ چاندنی جیتی"۔[1]

کہانی عقاب' میں تو یہ پیغام اور بھی صاف لفظوں میں یوں ظاہر ہوتا ہے:

"طوفان جس سے دنیا والے ڈرتے کانپتے ہیں ہمارے دروازے پر کیسے کیسے گیت گاتا ہے۔۔۔ وادی والے آزادی کا مزہ کیا جانیں۔۔۔ وہاں تو غلام بستے ہیں غلام"۔[2]

اور پھر جب عقاب قید ہو گیا اور منّو بلی کے بچے نے، جسے عقاب نے اپنے گھونسلے میں ہی پالا تھا، عقاب کو انسانوں کی بستی میں رُک کر چھوٹے موٹے شکار پر زندگی گزار دینے کا لالچ دیا تو عقاب نے بھوکوں مر جانا منظور کیا مگر اپنی کھلی فضا اور آزاد زندگی کو خیر باد کہہ دینے کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل میں نہ آیا۔ آخر کار اس نے:

"بازو پھیلا کر دیکھا، ایک بار، دو بار، تین بار۔۔۔ ایک بار چیخ ماری اتنی زور سے کہ منّو باورچی خانے میں سہم سی گئی، ایک جھٹکا دیا ایسا کہ زنجیر الگ ٹوٹ کر گری۔ پیر سے خون کی چند بوندیں زمین پر گریں اور یہ نہایت شاہانہ انداز سے اڑا، یہ جا وہ جا"۔

اور کہانی کے آخری جملے ہیں:

"خدا کا شکر ہے پھر آ پہنچا اپنے وطن میں۔۔۔ تو اکیلا ہی رہنے کو بنا ہے، بس اکیلا ہی رہ تیرے ساتھی اگر ہیں تو یہی چٹانیں، یہی چاند، یہی سورج، جو اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور کسی اور کے کام میں دخل نہیں دیتے"۔[3]

اور ان میں بھی آخری ٹکڑا 'جو اپنا اپنا۔۔۔ دخل نہیں دیتے۔ تجربات کے کتنے گہرے کرب کا کنایہ ہے۔

پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی، چھوٹے بچوں کے لیے کافی دلچسپ کہانی ہے۔ کسان کی بیوی کی بے توجہی سے ایک پوری جو تیل میں پڑی پڑی جلنے لگی تھی "اس بدسلوکی یا ناقدری پر اور چڑ گئی اور جھٹ کڑھائی میں سے کود کر بھاگ گئی" اور بالکل آخر میں ایک کنیا جو

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ابو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں۔ ص ۲۰ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۸۹ء

[2] ایضاً ،، ص ۲۸ ،، ،،

[3] ایضاً ،، ص ۳۳ ،، ،،

اُسے ہڑپنا چاہتی تھی اُسے بتایا:

"میں کڑھائی سے نکل کر، بدھو، کی ماں سے بچ کر، چھ چھ مسٹنڈوں (کسانوں) کو تھکا کر میاں چھٹ دُمے خرگوش اور مٹ دُمی لومڑی کو اُتو بنا کر آئی ہوں۔"[1]

اس کہانی میں بھی جب ایک پوری کی 'اَنا' مجروح ہوتی ہے تو وہ بغاوت بھی کرتی ہے اور خود کو بچانے کی بھی آخری حد تک کوشش کرتی ہے۔

ایک اور تصور جو اُن کی کہانیوں میں جگہ جگہ ملتا ہے وہ ہے زمین سے دور اُڑنا، چاند ستاروں اور آسمان کی سیر کرنا، سمندر کی گہرائیوں میں اُتر جانا وغیرہ، جو خود آزادی اور خود مختاری کا دوسرا مظہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کے پاس اگر وقت ہوتا اور وہ بچوں کے ادب کی تیاری کو ہی پورا وقت دے پاتے تو ان کے اِن تصورات سے کچھ اچھی تخیلاتی یا فنطاسیہ کہانیاں بچوں کے ادب کو مل جاتیں، جس کی ایک جھلک 'چھدّو' میں ملتی ہے۔

غیر معمولی ارادے والا ایک مردِ مجاہد اور اُس کے ساتھ کچھ دیوانے حکومت وقت سے ٹکر لیتے ہوئے، خود اپنی قوم و ملت کے طعنے سنتے ہوئے، انتہائی تکلیفیں اور پریشانیاں جھیلتے ہوئے تعلیم کے روحانی کام، میں مصروف ہیں اور اس میں اُسی قوم کے مختلف فرقے ان کے اس نیک مشن میں ہر ہر لمحے رکاوٹیں پیدا کر رہے ہوں تو کیا دُکھے دل کی تمنا اِن الفاظ میں ظاہر نہ ہوگی؟

"بہت دنوں کا ذکر ہے جب ہمارے دیس میں نیک لوگ بستے تھے اور دغا فریب بہت کم تھا، ہندو مسلمان سب ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کر سکتا تھا۔۔۔ اُن دنوں میں ایک شہر تھا عادل آباد۔ پھر جب فرنگیوں نے یہاں قدم جمائے اور سارے سیاہ سفید کے مالک بن بیٹھے تو ہم پر ذمہ داری نہ رہی۔ رنگ رنگ کے عیب پیدا ہو گئے۔"[2]

لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین جیسا تعمیری ذہن اپنے قاری، خصوصاً معصوم بچے کو اتنے اندھیرے میں چھوڑ دینا کیسے پسند کر سکتا تھا، لہٰذا اس نے پھر اپنے خوابوں کے سہارے بچے کو آنے والی دنیا کی پُرامید تصویر ان الفاظ میں دکھائی:

"اب فرنگی کا راج گیا، حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں آئی، تو اب سیکڑوں عادل آباد بسیں گے، پھولیں پھلیں گے۔ اس وقت تو اس پرانے شہر کا

---

[1] ذاکر حسین: ابو خاں کی بکری، چودہ کہانیاں، ص ۴-۱۰۔

[2] " اندھا گھوڑا: ص ۵۶، ۵۷، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۹ء

حال تمہیں کچھ سنا ئیں"۔ [1]

ایک کہانی کے میڈیم سے ایک نونہال یا زیادہ سے زیادہ نوخیز اور اثر پذیر ذہن والے قاری کو غلامی سے چھٹکارے اور آزادی کی لگن پیدا کرنے کا شاید یہ رومانوی سا انداز ہی سب سے موثر طریقہ ہو سکتا ہے۔ غرض ذاکر صاحب کی تحریریں بقول اطہر پرویز: "...اپنے زمانے کے بہترین خیالات کو بہترین لفظوں میں بہترین ترتیب کے ساتھ محفوظ [2] کرلیتی ہیں۔ اور ان کے نزدیک یہی ادب کی بڑی خوبی ہے۔

یوں تو ذاکر صاحب کی ساری کہانیاں اپنے دور کے سماج کی آئینہ دار تھیں لیکن کچھ کہانیاں اپنے تاثر کے اعتبار سے بہت تیکھی یا مضبوط کہی جا سکتی ہیں۔ اس زمرے میں سب سے گہرا اثر چھوڑنے والی اور میرے نزدیک بڑی جذباتی کہانی 'ماں' ہے جو اپنے دور کی محرومیوں کی بھی اچھی تصویر ہے۔

ایک بیوہ ماں کا لڑکا حمید، اپنے قصبے سے مڈل پاس کرکے، انگریزی اسکول میں پڑھنے کے شوق میں، ماں سے پندرہ روپے لے کر شہر آجاتا ہے۔ ماں بچے کا دل مضبوط رکھنے کے لیے اپنی خراب مالی حالت کا صحیح اظہار بھی نہیں کرتی، شہر میں اُسے محنت مشقت سے کچھ تعلیم بھی ملی اور ماں نے رواج کے مطابق اپنے آخری سہاروں کو بیچ کر حمید کی شادی بھی کردی۔ پھر اس کے بعد " دلّی کا خرچ، بال بچوں کا ساتھ، غریب حمید کے پاس بچتا بچاتا کچھ نہ تھا۔ اس لیے ماں کے خط پر خط آتے تھے، خود بھی اس کا جی بہت چاہتا تھا مگر گھر جانے کی نوبت نہ آتی"۔ ایک دن ایک بہت بوڑھی دھوبن کی موت سے اپنی ماں کی ایسی یاد آئی کہ وہ ماں کے پاس پہنچ ہی گیا۔ یہاں مکان بک چکا تھا، لگ بھگ اندھی ماں کسی اور غریب پڑوسن کی کوٹھری میں دن پورے کر رہی تھی۔ اب اس سے اٹھا بیٹھا بھی نہ جاتا تھا، مگر حمید کے آنے کی "خبر سن کر نہ جانے کہاں کی طاقت آگئی کہ جھٹ چارپائی سے کود کر دروازے کو دوڑی۔۔۔ کئی منٹ تک یہ حال رہا۔ نہ ماں نے کچھ کہا نہ بیٹے نے"۔ اندھی ماں اور پڑوسن نے بہت اچھے کھانے کا انتظام کیا۔ ماں نے برسوں بعد گھر آئے اجنبی سے بیٹے کے لیے جب اپنے بس بھر پرتکلف بستر لگایا تو حمید سے نہ رہا گیا:

"مگر اماں، یہ چادر، یہ غلاف، یہ جوتیاں۔۔۔ اس کے لیے روپیہ کہاں سے آیا؟"

ماں کی اندھی آنکھوں سے پانی کی دو چار بوندیں ٹپکیں اور اس نے ایسی آواز میں جس میں

---

[1] ذاکر حسین: 'اندھا گھوڑا ابو خاں کی بکری چودہ کہانیاں: ص ۷۶، ۷۵۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ ۱۹۸۹ء

[2] اطہر پرویز۔ ادب کسے کہتے ہیں؛ ترقی اردو بیورو ص ۱۴۔

نہ جانے ملامت کا زیادہ اثر تھا یا محبت کا، کہا: " بیٹا تو اور یہ پوچھتا ہے! ایک ایک دن تیرے ہی انتظار میں کٹتا ہے۔ سات برس میں یہ تیاری کر پائی ہوں بیٹا، سات برس میں"۔[1]

اسی طرح ایک مختصر سی کہانی جسے ایک تصوراتی کردار کا خاکہ بھی کہا جا سکتا ہے، 'آخری قدم' ہے۔ یہ ذاکر صاحب کی اپنی انتہائی حساس طبیعت اور نازک احساسات کی ترجمانی ہے۔ 'آخری قدم' میں تو جگہ جگہ خود ان کے اپنے کردار کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

لیکن جیسا پہلے کہا گیا ذاکر صاحب کی، بچوں کے لیے اپنی تخلیقات سے زیادہ اہم اور اس سلسلے میں اُن کے منصوبے کی زیادہ مضبوط کڑی وہ کوششیں ہیں جو انھوں نے بچوں کے ادب کی نشوونما، تجدید اور تنظیم کے سلسلے میں ایک رہنما کی حیثیت سے کیں۔ بقول صالحہ عابد حسین:

"ان کی بڑی آرزو تھی کہ جیسی کتابیں بچوں کے لیے مغربی ملکوں میں چھپتی ہیں ویسی ہی ہمارے یہاں بھی چھپیں۔ ۔ ۔ کبھی کبھی بڑی حسرت سے یہ بات کہا کرتے ۔۔۔' وہ دن کب آئے گا جب ایسی کتابیں ہمارے بچوں کے لیے بھی چھپا کریں گی۔ جب بچوں کی کوئی اچھی کتاب دیکھتے تو بہت خوش ہوتے۔ بہت دن ہوئے کتابی دنیا (لمیٹڈ)، نے بچوں کی کئی عمدہ کتابیں چھپوائی تھیں تو ذاکر صاحب کتنے خوش ہوئے تھے"۔[2]

جامعہ کے بچوں کے لیے جب ڈرامے کی کمی محسوس ہوئی تو سب سے پہلے ذاکر صاحب نے ہی 'دیانت' ڈرامہ لکھا۔ جس کے متعلق ایک محقق[3] کا خیال ہے کہ یہ بچوں کے اردو ادب میں پہلا ڈرامہ لکھا گیا تھا۔ ذاکر صاحب کا ایک اور ڈرامہ 'کھوٹا سونا' ہے۔ ذاکر صاحب کے بعد ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، عبدالغفار مدھولی، اور دوسرے استادوں نے بہت سے ڈرامے لکھے اور اسٹیج کروائے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے ساتھ ہی، یعنی علی گڑھ کے ابتدائی چند برسوں میں جامعہ نے تصنیف و تالیف اور اشاعت کا کام شروع کر دیا تھا۔ ذاکر صاحب ۲۶ ۱۹ء میں جرمنی سے واپس آئے اور اپنے ساتھ اپنے دو ساتھیوں، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کو بھی لائے۔ لگ بھگ فوراً ہی رسالہ 'پیام تعلیم' نکلنا شروع ہوا،

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین: 'ماں' ابو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں ص ۸۸ - ۸۹ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۹ء

[2] صالحہ عابد حسین، چار بزرگ دوست، ص ۳۱ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۷ء

[3] ڈاکٹر خوشحال زیدی: 'اردو میں بچوں کا ادب'، ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ، ص ۱۲۸ مطبوعہ ۱۹۸۹ء

جس کی ذمہ داری عابد صاحب کو ملی مگر محرک ذاکر صاحب ہی تھے۔ بقول ع.
قادری " واقف کاروں کا کہنا ہے کہ وہ (ذاکر صاحب) بڑوں کے لیے
کرتے تھے مگر پیامِ تعلیم کے لیے لکھنے پر بڑی جلدی آمادہ ہوجاتے تھے
اس رسالے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کے لیے نہ صرف ذاکر صاحب
مجیب صاحب اور جامعہ کے دوسرے استاد ہر حال میں کچھ نہ کچھ ضرور
بلکہ اس رسالے کے لیے لکھنے پر خود ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں
سے اور پڑھے لکھے لوگوں کو مجبور کیا۔ تقسیم ہند سے پہلے جو بڑے نام اس ر
میں لکھنے والوں کے نظر آتے ہیں انھیں دیکھ کر کچھ حیرت ہوتی ہے۔ ۱۹۴۶ء
تک کے لکھنے والوں میں ہمیں ذاکر صاحب، عابد صاحب، مجیب صاحب کے ابوئے
عبداللہ یوسف علی۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، شفیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر تر
یونس، خواجہ غلام السیدین، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، محمود حسین تنہا
گاندھی جی (ترجمہ)، جواہر لال نہرو (ترجمہ)، کرنل بشیر حسین زیدی، رشید احمد صدیقی
وغیرہ کے نام بار بار نظر آتے ہیں۔

اس رسالے کے اڈیٹر صاحبان بچوں کی لکھی ہوئی کہانیوں، مضمونوں، نظموں کی کاٹ چھانٹ کے ساتھ براہِ راست بچوں کو مشورے بھی دیتے تھے اور ان کی اصلاح بھی کرتے تھے اور اتنی ہمت افزائی کرتے تھے کہ اس کے بہت سے پڑھنے والے رفتہ رفتہ پختہ کار ادیب بن گئے۔ کم سے کم میں خود ذاتی طور پر اعتراف کرتا ہوں کہ بچوں کے لیے لکھنے کی میری مکمل تربیت پیامِ تعلیم کے اڈیٹر حسین حسان صاحب کی مرہونِ منت ہے۔

مکتبہ جامعہ سے بچوں کے لیے جو بہت سی کتابیں شائع ہوئیں ان کے لکھنے والوں نے برائے نام یا صرف فیشن کے طور پر 'بچوں کے لیے' نہیں لکھا بلکہ فی الحقیقت پوری ذمہ داری اور سنجیدگی سے ایک شعوری کوشش اور منصوبے کے طور پر ایک علمی فریضہ سمجھ کر لکھا۔ اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے والوں کی اس ذہنی تربیت کے سلسلے میں ذاکر صاحب کی رہنمائی سب سے اہم محرک ہوتی تھی۔ جامعہ کے اسکول بچوں کے لیے لکھے گئے مواد کے لیے ایک تجربہ گاہ تھے، جہاں استاد بچوں کا مشاہدہ کرتے تھے، ان کے لیے نئی نئی کتابیں لکھتے تھے، استادوں اور ان سے زیادہ اپنے شاگرد بچوں سے اپنی تحریر پر بات چیت

ـلہ عبداللہ ولی بخش قادری: 'بچوں کے ذاکر صاحب'، ص ۳۰، مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۹۸۸ء

کرکے اپنی اصلاح کے لیے سبق (Feed back) حاصل کرتے تھے، جو ہندوستان میں بچوں کے ادب کے لیے ایک انہونا تصور ہے۔ چنانچہ مکتبہ جامعہ کی چھاپی ہوئی کتابیں موضوعات، مواد، متن، بیان غرض ہر لحاظ سے اپنے وقت کی بہت اچھی کتابیں کہی جا سکتی تھیں۔ ان کتابوں کے کچھ ناموں — دھاک دھنا دھن تلے سے، پان کھا کر طبلہ بجا کر، ایک کچوری تیل میں، پکڑو دم کیسے کو، مرغی اجمیر چلی، مدّو رانا پردیس چلے، وغیرہ — سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بچوں کی دلچسپی کا کتنا خیال رکھا جاتا تھا۔ پھر کہانی کے بنیادی خیال، عمر کے مطابق کہانی کی طوالت، الفاظ کا استعمال، جملوں کی ساخت، کچھ الفاظ یا ٹک بندیوں کی تکرار ان کی موسیقیت، غرض کتاب کی نوک پلک سنوارنے کا پورا پورا خیال رکھ کر بچوں کے ادب کو ایک انفرادی اور اہم صنفِ ادب کی حیثیت دینے کا کام ذاکر صاحب کی تحریک، ترغیب اور نگرانی میں عمل میں آیا۔ طباعت میں عمر کے اعتبار سے خط کی موٹائی کا خیال، آرٹ ورک اور اپنے بس بھر دلچسپ سرورق سے کتاب کی تزئین کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔

ذاکر صاحب اور ان کے کچھ بے لوث خدمت گزار ساتھیوں کے اثر سے اس نشاۃ ثانیہ یا تخلیقِ نو کے باوجود، گو کہ یہ موضوع ابھی خود تشنۂ تحقیق ہے، افسوس ہے کہ ذاکر صاحب کا وہ خواب کہ ہندوستانی خصوصاً اردو پڑھنے والے بچوں کے ہاتھوں میں بھی مغربی ممالک جیسی خوب صورت کتابیں آنے لگیں، ان کی اپنی زندگی میں شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور اب بھی اس اگرہ نیم باز کا قرض، باقی ہے ایک کوشش ان کے اس گروپ نے جس میں ڈاکٹر عابد حسین، کرنل بشیر حسین زیدی، قیصر حسین زیدی وغیرہ شامل تھے ۴۶-۱۹۴۵ء میں دہلی میں 'کتابی دنیا لمیٹڈ'، قائم کر کے کی تھی۔ مگر بچوں کے لیے کچھ بہت خوب صورت کتابیں چھاپ کر بد قسمتی سے یہ ادارہ تقسیم ہند کے انقلاب کی نذر ہو گیا پھر ۱۹۸۴ء میں ایک اور کوشش کرنل بشیر حسین زیدی کی رہنمائی میں راقم الحروف نے 'بچوں کا ادبی ٹرسٹ'، قائم کر کے کی تھی لیکن یہ ادارہ بھی ذاکر صاحب کی تمنا کو صرف چند خوب صورت کتابوں کی اشاعت سے پورا کر کے نقش و نگار طاقِ نسیاں، کی منزل میں جا پہنچا۔

بہر طور، اگر پوری سنجیدگی سے بچوں کے اردو ادب کی تاریخ کا تجزیہ اور تحقیق کی جائے تو اس میں ذاکر صاحب کی اہم ترین دین یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کے اردو ادب کو ثانوی حیثیت سے اٹھا کر ایک بنیادی اور بے حد وقیع حیثیت دینے کی کوشش کی اور اس کے بعد سے بچوں کے ادب کو بھی ایک علاحدہ اور ممتاز صنف ادب تصور کیا جانے لگا۔

سوشیلا نائر

ڈاکٹر ذاکر حسین

ذاکر حسین مادرِ ہند کے مایہ ناز سپوتوں میں سے تھے۔ یہ آفریدی افغان خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ آفریدی اچھے سپاہی مانے جاتے تھے۔ لیکن ذاکر صاحب کے والد اس پیشے کو چھوڑ کر وکالت کرنے لگے۔ انھوں نے اپنے آبائی گھر کو چھوڑ کر جو ایٹہ کے قریب ایک گاؤں میں تھا حیدر آباد میں ایک وکیل کی حیثیت سے سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں جلد ہی ان کی وکالت چمک گئی۔ ذاکر صاحب ۸ فروری ۱۸۹۷ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔

ذاکر صاحب کی تعلیم حیدر آباد میں ایک انگریز استاد کے ساتھ شروع ہوئی۔ مگر ابھی وہ صرف نو برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ذاکر صاحب کا خاندان پھر اپنے آبائی گاؤں واپس آ گیا۔ ۱۹۰۸ء میں انھیں تعلیم کے لیے اٹاوہ بھیج دیا گیا جہاں یہ اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہے۔ وہ ۱۴ برس کے تھے جب ان کی والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ انھیں اپنی ماں سے بے حد محبت تھی۔ ان کی موت کا ذاکر صاحب کو سخت صدمہ پہنچا۔ ان کی والدہ کی شخصیت کے نقوش ذاکر صاحب کے ذہن پر بچپن سے ہی گہرے تھے۔ وہ ایک نہایت مذہبی، ایماندار، سچے اور خدا ترس نوجوان کی طرح پروان چڑھے۔ ان کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ ایک صوفی حسن شاہ کے زیر اثر آ گئے تھے۔ انھوں نے ایک چھوٹے سے لڑکے کے ذہن میں مذہبی رواداری کی بنیاد ڈالی تھی۔ ذاکر صاحب میں انھیں کی وجہ سے تمام مذاہب کا احترام اور ایک رواداری کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ اٹاوہ (یو پی) میں ہی سیاست سے دلچسپی لینے لگے۔ وہ اخبار پانیر لینے ہر صبح ریلوے اسٹیشن جاتے تھے اور پھر اسکول بھاگے جاتے تھے تاکہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس دن کی خبروں پر تبادلہ خیال کریں۔ انھوں نے ۱۹۱۳ء میں دسویں پاس کی اور پھر علی گڑھ میں اینگلو عربک اورینٹل کالج میں داخلہ لیا۔ وہ بہت ذہین اور بذلہ سنج تھے اسی لیے وہ دوسرے طلبا میں مقبول ہو گئے۔ وہ مانیٹر بنا دیے گئے۔ وہ صرف ایک اچھے طالب علم ہی نہیں تھے بلکہ ایک بہت اچھے مقرر بھی تھے اور انھوں نے تقاریر کے مقابلوں میں بہت سے انعامات حاصل کیے۔ وہ طلبا کی یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ کالج میں ان کی دوستی رشید احمد صدیقی اور مولانا اقبال احمد سہیل

سے ہوئی اور پھر ساری عمر رہی۔ ان تینوں نے کئی پروجیکٹ ساتھ مل کر کیے اور ان کاموں کو کرنے میں مشکلوں اور رضا کارانہ تنگ دستی کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔

بی اے پاس کرنے کے بعد ذاکر حسین نے معاشیات ایم۔ اے میں داخلہ لیا اور وکالت کی کلاسوں میں بھی بیٹھنے لگے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ذاکر صاحب، مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کی تحریروں سے بہت متاثر ہوئے، مولانا ابوالکلام آزاد کی مذہبی تحریروں کا ذاکر صاحب کے خیالات پر بہت اثر پڑا۔

بنیادی طور پر ذاکر صاحب ماہر تعلیم تھے۔ وہ پیدائشی استاد تھے اور وہ عملی مثالوں کے ذریعے پڑھاتے تھے۔ انھوں نے ضبط نفس کی ایک مثال قائم کی تھی وہ خود محنتی تھے اور دوسرے سے بھی محنتی ہونے کی امید رکھتے تھے۔ اس دلچسپ واقعہ سے ان کے کام کرنے کے انداز اور ان لوگوں کو قابو میں لانے کا طریقہ جو آسانی سے ان کی بات سمجھنے کو تیار نہیں ہوتے تھے، سمجھ میں آجائے گا۔ ان کے گھر میں ایک ملازم تھا جو روز صبح دیر سے اٹھتا تھا۔ ان کے گھر والے چاہتے تھے کہ اس ملازم کو نکال دیا جائے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ وہ اس کی اصلاح کریں گے۔ سب کو یقین تھا کہ یہ ناممکن ہے وہ لڑکا اصلاح کی منزل سے آگے جا چکا تھا مگر ذاکر صاحب نے امید نہیں چھوڑی تھی اور انھوں نے یہ معجزہ کر دکھایا۔

ذاکر صاحب صبح ہی ملازم کے بستر کے پاس گرم پانی لے کر کھڑے ہو گئے اور کہا "حضور آپ کے لیے گرم پانی لایا ہوں منہ ہاتھ دھو لیجیے۔ ابھی ناشتہ لاتا ہوں۔" ملازم گھبرا گیا اور بہت شرمندہ ہوا اور اس کے بعد اسے کبھی اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۲۰ کو گاندھی جی نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے طلبا کو مخاطب کیا اور طلبا کو آمادہ کیا کہ وہ برطانیہ کی مدد سے چلنے والے تمام تعلیمی اداروں کو چھوڑ دیں۔ انھوں نے ایک قومی تعلیمی ادارہ شروع کرنے کا بھی اعلان کیا۔ گاندھی جی کے اس نعرے پر لبیک کہنے والوں میں ذاکر صاحب تھے۔ وہ اس وقت صرف ۲۳ برس کے تھے۔ پرنسپل ڈاکٹر ضیا الدین نے بہت کوششیں کی کہ ذاکر حسین کالج نہ چھوڑیں۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ ایک سال کے اندر ہی انھیں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز کرا دیں گے۔ مگر ذاکر صاحب کو کوئی لالچ نہ روک سکی۔ ان کے دل میں برطانیہ کے خلاف بغاوت کا جذبہ بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے عدم تعاون کیا اور اپنے چند دوستوں کے ساتھ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ایک تعلیمی ادارہ شروع کیا، جو بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس واقعہ نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ اپنی ساری زندگی تعلیم کے فروغ میں لگا دیں گے۔ دو سال تک جامعہ ملیہ میں پڑھانے کے بعد انھوں نے طے کیا کہ مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جائیں گے۔

ان کے پاس برطانیہ کا پاسپورٹ تھا۔ مگر کسی ایسے نوجوان کو، جس نے ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون

کی تحریک میں حصہ لیا ہو، جیسا کہ ذاکر صاحب نے لیا تھا۔ برطانیہ کے کسی کالج میں داخلہ نہیں مل سکتا تھا۔ ذاکر صاحب انگلینڈ کے لیے روانہ ہوئے مگر جب ان کا جہاز اٹلی کی بندرگاہ پر پہنچا تو وہاں اتر گئے اور پھر اٹلی سے آسٹریا اور جرمنی چلے گئے۔ انھوں نے جرمن زبان سیکھی اور معاشیات میں پی ایچ ڈی کے لیے برلن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

جرمنی میں ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین ملے۔ ان دونوں نے بعد میں جامعہ ملیہ میں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کیا۔ ان تینوں نے طے کیا تھا کہ یہ لوگ جامعہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں گے۔

جرمنی میں ذاکر صاحب نے گاندھی جی کی زندگی اور تعلیمات پر بہت سے مضامین لکھے اور جرمن زبان میں ایک کتاب، جس کا عنوان تھا "گاندھی جی کا پیغام" کی تیاری اور چھپائی میں مدد کی، جو بہت پسند کی گئی اور کافی وسیع حلقے میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔

اسی زمانے میں ذاکر صاحب نے سنا کہ وہ سیاسی رہنما جنھوں نے جامعہ ملیہ کو شروع کیا تھا۔ مالی دشواریوں کی وجہ سے اس کو بند کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ ذاکر صاحب نے ایک ٹیلی گرام بھیجا کہ وہ اور ان کے کئی دوستوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ جامعہ ملیہ کے لیے وہ لوگ اپنی زندگیاں وقف کر دیں گے۔ اس کو جب تک بند کرنے کے بارے میں ہرگز نہ سوچا جائے جب تک یہ لوگ واپس نہ آجائیں۔

۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب ہندوستان واپس آئے اور جامعہ ملیہ میں شیخ الجامعہ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۱ برس تھی۔ یہ ان کے لیے ایک بڑا اعزاز تھا۔ یہاں کے ملازمین کو بہت محنت کرنی پڑ رہی تھی اور ان کو تنگ دستی کی زندگی گزارنی پڑ رہی تھی۔ کیونکہ جامعہ ملیہ کے پاس بہت کم پیسے تھے۔ ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور عابد صاحب نے اپنی مرضی سے تین سو روپے ماہوار تنخواہ سے گھٹا کر سو روپے کر لی۔ یہ لوگ کہیں باہر اس سے کہیں زیادہ کما سکتے تھے، مگر ان لوگوں نے طے کر لیا تھا کہ جامعہ ملیہ کی خدمت میں اپنی زندگیاں قربان کر دیں گے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کو چھوڑا تو وہ اس وقت ۹۵ روپے ماہوار تنخواہ پا رہے تھے اور اپنا سارا وقت جامعہ ملیہ کے لیے چندے جمع کرنے میں لگا رہے تھے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ کی ۲۲ سال تک خدمت کی۔ وہ اس کی دیکھ ریکھ اپنی اولاد کی طرح کرتے تھے۔ یہ ادارہ صرف اس لیے بچ سکا کیونکہ ذاکر صاحب نے اس کے لیے چندے جمع کیے اور یہاں کام کرنے والوں نے اپنی مرضی سے کم تنخواہوں پر کام کیا۔ اس میں بھی ذاکر صاحب نے پہل کی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے کہ انھوں نے اپنی

تنخواہ کم کر دی تھی اور سو روپے ماہوار سے بھی کم تنخواہ لیتے تھے حالانکہ وہ شیخ الجامعہ تھے۔

ذاکر صاحب صفائی ستھرائی کے بہت قائل تھے۔ ایک دن ایک بچہ اسکول گندی ٹوپی پہن کر آیا۔ وہ اُسے گھر لے گئے۔ اس کی ٹوپی دھوئی اور سکھائی پھر اس پر استری کی اور اس کو پہنا دی۔ اس کے بعد اس بچے نے کبھی گندی ٹوپی نہیں پہنی۔ وہ تمام طلبا سے کہتے تھے کہ اپنے جوتوں پر پالش کیا کریں۔ بعض بچے ان کی بات پر دھیان نہیں دیتے تھے۔ ایک دن وہ گیٹ کے پاس بیٹھ گئے اور ہر اُس بچے کے جوتوں پر پالش کی جو بغیر پالش کے جوتے پہن کر آیا تھا۔ یہ سبق بچوں کے دل میں گھر کر گیا اور یہ نقش تا زندگی قائم رہا۔ انھوں نے طلبا سے اپنے بچوں کی طرح پیار کیا۔

وہ کسی کام کو اپنے لیے چھوٹا نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار ثانوی اسکول کے ایک استاد نے ابتدائی اسکول کی کلاس لینے سے انکار کر دیا لیکن ذاکر صاحب نے جو شیخ الجامعہ تھے خود جا کر کلاس لی۔ دراصل وہ ابتدائی کلاسوں کو پڑھانا پسند کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ابتدائی اسکول کے ہی بچوں کی عمر ایسی ہوتی ہے جب انھیں صحیح سمت میں موڑا جا سکتا ہے۔

سارے ملک کے ماہرین تعلیم کی توجہ جامعہ ملیہ میں ذاکر صاحب کے کام کی طرف مرکوز ہو گئی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی وزارتیں مختلف صوبوں میں قائم ہوئیں اور تعلیم کو بہتر بنانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ گاندھی جی نے آریا نیکم جی، آشا دیوی اور شریمن نارائن کی مدد سے سیوا گرام میں ایک کانفرنس بلائی۔ یہ تینوں گاندھی جی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اس کانفرنس میں گاندھی جی نے اپنی بنیادی تعلیم کا اصل مقصد پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اصل میں تعلیم ماں کی کوکھ سے شروع ہوتی ہے اور موت کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ ہر شخص کو ساری زندگی ایک طالب علم رہنا چاہیے اور یہ بھی کہا کہ دماغ اور ہاتھوں کی نشو و نما ایک ساتھ ہونی چاہیے، اور تعلیم کا انحصار حرفے پر مبنی ہونا چاہیے۔ عمل سے علم حاصل کرنا یہ ایک تا حیات سلسلہ ہے اور شخصیت کی تکمیل کا ذریعہ۔ کانفرنس نے ایک بنیادی تعلیمی بورڈ قائم کیا جس کے چیرمین ڈاکٹر ذاکر حسین مقرر کیے گئے اور شریمتی آشا دیوی اور آریا نیکم جی کو جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ گاندھی جی ان کے رہنما تھے اور مواد فراہم کرنے والے تھے۔ یہ لوگ اپنے تمام مسائل ان کے سامنے رکھتے تھے اور گاندھی جی ان لوگوں کے ساتھ مل بیٹھ کر مسائل کے حل تلاش کرتے۔ گاندھی جی ان لوگوں سے کہتے تھے کہ ایک غریب ملک میں بچوں کے ذریعے کیا ہوا کام نہ صرف تعلیم حاصل کرنے کا ذریعہ ہونا چاہیے بلکہ اس سے استادوں کی تنخواہ کا خرچ بھی نکلنا چاہیے۔ سارے ملک میں اس تصور

کی بہت سخت مخالفت ہوئی۔ ماہرین تعلیم کا کہنا تھا کہ بچے سے مزدوری کرانا ہوگی اور اس کی محنت کا استعمال ہوگا۔ گاندھی جی اس اعتراض کو نہیں مانتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ پیداوار بیت مقصد نہیں ہے بلکہ یہ بنیادی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنی وسیع علمیت اور تعلیم کے بنیادی تجربے سے بنیادی تعلیم کے کٹر معترضین کو خاموش کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی اور بٹوارے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ پاکستان چلے گئے جس کی وجہ سے یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ یونیورسٹی کو بند کرنا پڑے گا۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم مولانا آزاد نے ذاکر صاحب پر زور ڈالا کہ وہ علی گڑھ چلے جائیں اور یونیورسٹی کو بچالیں۔ وہ جامعہ ملیہ کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے مگر علی گڑھ کی اتنی گمبھیر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اور وزیر اعظم اور وزیر تعلیم کی تشویش کو دور کرنے کے لیے وہ تیار ہوگئے۔ ذاکر صاحب ۱۹۴۸ء میں پھر علی گڑھ پہنچے لیکن اس بار وہ وائس چانسلر بن کر پہنچے۔

ہمیشہ کی طرح ذاکر صاحب جان و دل سے اپنے کام میں لگ گئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معیار کو بلند کیا۔ انھوں نے علی گڑھ میں مختلف مضامین کے بہترین عالموں کو تلاش کیا اور انھیں استاد مقرر کیا اور بہترین لیباریٹریاں اور اعلیٰ درجے کی لائبریری قائم کی۔ ذاکر صاحب کی انتھک کوششوں کی بدولت بہترین یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ شاید ہندوستان کی بہترین یونیورسٹیوں میں علی گڑھ یونیورسٹی کا شمار ہونے لگا۔

ایک ممتاز عالم اور ان دانشوروں کے نمائندے کی حیثیت سے جنھوں نے ادب، سائنس، فائن آرٹ یا سوشل سائنس کے میدانوں میں نمایاں حصہ لیا تھا، ذاکر صاحب کو ۵۵ برس کی عمر میں ۱۹۵۲ء میں راجیہ سبھا کا رکن نامزد کیا گیا۔

ذاکر صاحب نے وائس چانسلر کی حیثیت سے آٹھ برس تک علی گڑھ یونیورسٹی کی خدمت کرنے کے بعد پر سکون زندگی گزارنے کی غرض سے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ جواہر لال جی نے ۱۹۵۷ء میں ان کے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں بہار کا گورنر مقرر کر دیا۔ ذاکر صاحب اپنی مرضی سے سیاست میں کبھی نہ داخل ہوئے۔

ذاکر صاحب سیاست میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود یہ گورنر بنے۔ انھوں نے نہرو کے اصرار پر اسے قبول کیا۔ گورنر کی حیثیت سے بہترین کام کیا اور وہ بہار میں بہت مقبول ہوگئے وہ پڑھے لکھے انسان تھے۔ مختلف اداروں کی ضرورتوں کی وجہ سے انھوں نے مختلف قسم کی ذمہ داریاں قبول کیں، مگر کبھی گندی سیاست میں اپنے ہاتھ ملوث نہیں کیے۔ گاندھی جی کے زمانے میں سیاست صاف ستھری تھی۔ بدقسمتی سے گاندھی جی کے انتقال کے بعد سیاست میں گراوٹ آنی شروع ہوگئی۔ نہرو نے اپنے بس بھر اس کو روکا۔ مگر نہرو کے انتقال کے بعد حالات زیادہ تیزی سے زوال پذیر ہونے لگے۔

۱۹۶۲ء میں رادھا کرشنن ہندوستان کے صدر مقرر ہوئے اور نائب صدر کی جگہ

خالی ہوئی۔ اس جگہ کے لیے نظرِ انتخاب متفقہ طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین پر پڑی۔ نائب صدر راجیہ سبھا کی صدارت کرتا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کو راجیہ سبھا کے اراکین کی محبت و عزت حاصل تھی اور ان کے زمانے میں راجیہ سبھا کے اجلاسوں میں شور و غل کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں آداب مجلس پوری طرح برتے جاتے تھے اور بحث و مباحثے کا معیار اونچا ہوا کرتا تھا۔ ذاکر حسین نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا۔

ملک کا سب سے بڑا اعزاز بھارت رتن ڈاکٹر ذاکر حسین کو ۱۹۶۳ء میں دیا گیا۔ رادھا کرشنن ۱۹۶۷ء میں صدارت کے عہدے سے سبک دوش ہوئے سب کی نظریں ڈاکٹر ذاکر حسین پر لگی ہوئی تھیں کہ اب اس جگہ کو یہ پُر کریں گے۔ کانگریس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام تجویز کیا۔ حزب مخالف نے شری کے سبھاراؤ کو اپنا امیدوار بنایا۔ بہر حال الیکشن تو پھر الیکشن ہی ہوتا ہے اور مجھے تعجب ہوا جب میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین تھوڑے سے پریشان سے ہیں۔ ذاکر صاحب میرے بڑے بھائی شری پیارے لال پر بہت مہربان تھے، جو گاندھی جی کے سکریٹری اور انتقال کے بعد ان کے سوانح نگار تھے۔ ہم جب چاہتے تھے ان سے مل سکتے تھے۔ میں ان کے لیے آنند مائی ماں کی دی ہوئی۔ جپ مالا لائی، جو میرے خیال میں بہت متبرک تھی۔ وہ ایک پکے مسلمان تھے مگر وہ سارے مذاہب کی یکساں عزت کرتے تھے۔ انھوں نے احترام کے ساتھ اس جپ مالا کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ وہ کافی بڑی تعداد سے جیتے اور ہندوستان کے صدر بنے۔

۱۳ رمئی ۱۹۶۷ء کو ذاکر صاحب نے ہندوستان کے صدر کا عہدہ سنبھالا۔ ان کا کہنا تھا کہ سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور ہندوستان کے لوگوں نے مجھے ایک معین مدت کے لیے اس خاندان کا بزرگ چنا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں اس ملک کو تنظیم عوام کے لیے مضبوط اور حسین بناؤں۔ انھوں نے یہ کام فرقہ وارانہ تناؤ، تشدد اور تباہی کی مذمت کے ساتھ شروع کیا۔ انھوں نے مذہبی رواداری، قومی یک جہتی اور تعمیری پروگرام کو آگے بڑھایا جس پر انھیں یقین محکم تھا۔ جب بھی ڈاکٹروں نے خرابیٔ صحت کی وجہ سے ان کو آرام کے لیے کہا تو ان کا جواب ہوتا تھا کہ اگر میں کام نہیں کروں گا تو میں اس صدارت کے عہدے پر بھی نہیں رہوں گا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اونچے عہدوں کی وجہ سے خود بھی اونچے ہو جاتے ہیں مگر بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے عہدوں کا معیار اونچا ہو جاتا ہے۔ ذاکر صاحب دوسری طرح کے لوگوں میں سے تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے تنگ دستی اور سادا زندگی اختیار کی مگر امیر لوگوں کے خلاف ان کے دل میں کبھی نفرت نہیں رہی۔ وہ اپنے رہن سہن میں ایک فنکار تھے۔ چاہے وہ

اسکول کے ایک استاد ہوں یا پھر ہندوستان کے صدر لیکن وہ ہمیشہ سفید کھدر کی شیروانی پہنتے رہے۔ وہ ہمیشہ سے ہی خوش پوشاک تھے۔ انھیں پھولوں سے پیار تھا اور جانوروں سے محبت تھی۔ جب وہ ایک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے یا جب وہ صدر ہند کی حیثیت سے راشٹرپتی بھون میں رہتے تھے۔ انھیں خوب صورت گلاب اگانے اور نادر پتھر جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان کے پاس راشٹرپتی بھون میں ایسے خوب صورت پتھروں کا کم و بیش ایک میوزیم سا تھا۔

ان کا رویہ غریب امیر سب کے ساتھ یکساں ہوتا تھا۔ ان کے یہاں بہت ہی لطیف ظرافت پائی جاتی تھی۔ وہ ایک سچے مذہبی انسان تھے، ایک دین دار مسلمان، مگر ان کے دل میں دوسرے تمام مذہبوں کے لیے یکساں احترام تھا۔ ایک بار دہلی میں رام لیلا میں رام کے ماتھے پر تلک لگانے پر لوگوں نے ان پر اعتراض کیا۔ انھوں نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ وہ صرف کسی ایک گروپ کے صدر نہیں ہیں بلکہ وہ پورے ہندوستان اور اس میں رہنے والے سارے لوگوں کے صدر ہیں۔

ایک بار وہ گورو گوبند سنگھ کے بارے میں تقریر کر رہے تھے۔ انھیں شرمندگی ہوئی جب انھیں احساس ہوا کہ ان کی آنکھیں پرنم ہیں۔ مگر انھوں نے دیکھا کہ یہی حال سامعین کا بھی تھا وہ ایک ایسے گہرے جذبے کے ساتھ بول رہے تھے جس نے سامعین کے دلوں کو عظیم گورو کی عظمت اور پیار کی اتھاہ گہرائیوں سے روشناس کرا دیا۔ وہ ایک سچے دل کے انسان تھے اور تمام مذاہب اور تمام مذاہب کے پیغمبروں کے لیے ان کے دل میں عقیدت اور عزت تھی۔

ان کی تمام حیرت انگیز خوبیوں میں سب سے بڑی خوبی ان کا حسنِ ظرافت تھا جس کی وجہ سے بہت سے تناؤ سے بھرے لمحوں کو، جو انھیں اپنی ذمہ داریوں کے نتیجے میں ملتے تھے، دور کرنے میں مدد ملتی تھی۔ ان کی ظرافت ہمیشہ خوشگوار ہوتی تھی۔ اس سے کسی کو چوٹ نہیں پہنچتی تھی۔ ایک دن ان کے ایک دوست کی بھتیجی ملنے آئی۔ انھوں نے ان کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا جیسا کہ وہ دوسروں کے ساتھ کرتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ شاید ذاکر صاحب انھیں پہچانتے نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا "شاید آپ مجھے پہچانتے نہیں"۔ ذاکر صاحب نے برجستہ جواب دیا "میں تو آپ کو پہچان گیا مگر شاید آپ مجھے نہیں پہچانتی"۔

ذاکر صاحب کی بیوی شاہجہاں بیگم کو بکریاں بہت پسند تھیں اگر ان کی کوئی پسندیدہ بکری مر جاتی تو بیگم صاحبہ اس دن کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ ذاکر صاحب کو بھی بکریاں پسند تھیں۔ ایک دن ایک دوست ان کے گھر آئے اور دیکھا کہ ذاکر صاحب ایک پلنگ پر بیٹھے ہیں اور سامنے والے پلنگ پر ایک بکری بیٹھی ہے ذاکر صاحب نے اپنے دوست سے کہا کہ ہمارے گھر کے سب لوگ باہر گئے ہوئے ہیں، یہ بکری میرا ساتھ دے رہی ہے۔

انھوں نے اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھاکر کسی شخص کی غلط مدد کرنے کے لیے انتظامیہ پر زور نہیں ڈالا۔ ایک بار ذاکر صاحب کے ایک پرانے طالب علم اپنے بیٹے کو لائے اور کہا کہ " یہ تین سال سے دسویں میں فیل ہو رہا ہے اس بار مہربانی کر کے اس کو پاس کروا دیجیے"۔ "تم مجھے اتنی چھوٹی سی بات کرنے کے لیے کیوں کہہ رہے ہو۔ بی اے کی درخواست میرے پاس لاؤ میں داخلہ دلا دوں گا"۔ اس طرح انھوں نے اپنے دوست کو اس کی نامعقول بات کا احساس دلایا۔

انھیں اچھے کھانے پسند تھے۔ لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے ان کا مرغن کھانوں کا پرہیز تھا۔ ایک دن علی گڑھ جاتے ہوئے انھوں نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ بچوں کے لیے تندوری مرغے آئے اور جب آ گیا تو کار میں پیچھے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائیور نے محسوس کیا کہ کچھ کھایا جا رہا ہے۔ ڈرائیور نے ذاکر صاحب سے پوچھا تو کہنے لگے " میں چکھ کر یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ بچوں کے لیے اچھا ہے یا نہیں"۔

فسادات کے دوران ذاکر صاحب فسادیوں کے درمیان گھر گئے تھے، پولیس نے بڑی مشکل سے ان کو بچایا۔ یہ سن کر نہرو انھیں دیکھنے جامعہ ملیہ آئے اور انھوں نے دیکھا ذاکر صاحب ایک تانگے میں چلے آ رہے ہیں۔ نہرو نے انھیں روکا اور بڑی تشویش کا اظہار کیا کیونکہ فسادیوں نے لائبریری میں آگ لگا دی تھی۔ ذاکر صاحب مسکرائے اور کہا " ہمیں دو لاکھ کا فائدہ ہوا، پانچ لاکھ کی کتابوں میں سے ہم نے دو لاکھ کی کتابیں بچا لیں"۔

گاندھی جی ذاکر صاحب کو بہت پسند کرتے تھے، وہ بھی فساد کے اس واقعہ کو سن کر ذاکر صاحب کو دیکھنے جامعہ ملیہ آئے۔ انھوں نے دیکھا ذاکر صاحب پرسکون اور مطمئن تھے۔ خدا پر، انسانی فطرت کی اچھائی پر ان کے یقین نے ان کے سکونِ قلب کو برقرار رکھا۔ انھوں نے چاہے ایک استاد کی حیثیت سے یا ایک وائس چانسلر کی حیثیت سے، یا راجیہ سبھا کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے یا پھر صدرِ ہند کی حیثیت سے کام کیا، وہ سب کے لیے لبوں پر مسکراہٹ لیے ایک ہی انداز سے پرسکون، خاموش اور باوقار انسان رہے۔

۳ر مئی ۱۹۶۹ء کو اپنے معروف پروگرام کے درمیان انھیں دل کا دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہو گیا۔ ذاکر صاحب کا خاندان اور سارا ہندوستان یتیم ہو گیا اور آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب گیا۔

ان جیسے انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے مگر جب پیدا ہوتے ہیں تو اپنے پیچھے ایک خوشبو چھوڑ جاتے ہیں جس سے فضا بہت عرصے تک مہکتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسینؒ ایسی ہی شخصیت تھی جس پر مادرِ ہند کو فخر ہے۔ آئیے ہم سب مل کر ان کی یادوں کو خراجِ عقیدت پیش کریں۔

پی. شیخ علی

ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی نظریات

ڈاکٹر ذاکر حسین تاریخ میں بیسویں صدی کے ایک عظیم مفکر تعلیم کی حیثیت سے زندہ رہیں گے وہ ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کی پیداوار تھے اور انھیں پورا یقین تھا کہ اصلاحی تعلیم کے دروازے کھولنے سے ہی قومی بیداری ممکن ہوسکتی ہے۔ ان کے پورے نظریۂ تعلیم کے ڈھانچے کی بنیاد ہے ایک نظام اقدار جس میں انسان کو زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف گامزن کرنے کے امکانات مضمر ہیں۔ ذاکر صاحب نے ایسا سماجی فلسفہ پیش کیا جو ہندوستانی رشی منیوں، صوفی سنتوں اور مغربی فلاسفروں کا عالم انسانیت کو دیا ہوا تحفہ تھا۔ اس قسم کی تعلیم کی وہ ساری زندگی مخالفت کرتے رہے جو انسانی خصوصیت سے محروم کرتی ہے، زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی اور انسان کو انسانیت اور سماج سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ تعلیم کو وہ انسانی تکمیل کی بنیاد سمجھتے تھے اور اُسے وہ انسانی ترقی اور فلاح کی کلید تصور کرتے تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستانی تہذیب کی خصوصیات نئے عالمی نظام کی بنیاد بن جائیں اور اصلاح کی راہ پر دوبارہ گامزن انسان انھیں اپنا راہ نما بنا کر حال کے نفیس ترین اور ماضی کے بہترین عناصر کو اپنے میں سمو لے۔ ان کے نظریے کے مطابق انسانی ذہن، اس کے کلچر اور اس کے مقدر میں ایک باطنی رشتہ ہے اور یہی وہ تین ستون تھے جن پر انھوں نے اپنے پورے تعلیمی ڈھانچے کو کھڑا کیا تھا۔ انھوں نے یہ تصور پیش کیا کہ حقیقی تعلیم میں سائنس اور اخلاقیات کو ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اسے سچائی کی پُر جوش جستجو کو فروغ دینا چاہیے جو انسانیت اور امن کی متلاشی ہو۔ اس کا نشانہ تکمیل اور اعلیٰ معیار ہونا چاہیے۔ اسے سماجی تبدیلی اور قومی نشو و نما کا ذریعہ بننا چاہیے۔ ذاکر صاحب نے اپنے سماجی فلسفہ کو ایسے نظامِ اقدار پر قائم کیا جو ان کی انسان دوستی، ان کی وسیع المشربی، ان کی وطن پرستی اور ان کے کائناتی یک جہتی کے تصورات کا منبع بنا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے جنھیں عام طور پر ذاکر صاحب کہا جاتا ہے یہ نظریہ پیش کیا کہ ذاتی اور قومی زندگی کے لیے زیادہ روحانی بالیدگی کے تصورات بچوں میں ذہن نشین کرانے چاہئیں۔

شجاعت اور نیکی، سچائی اور حسنِ انصاف اور مساوی برتاؤ، خدمتِ خلق اور ایثار کے تصورات ایسی اینٹیں ہیں جو ہمارے مستقبل کے روشن خیالی کے محل کی تعمیر کے لیے لازمی ہیں۔ ذاکر صاحب کا مقصد بچوں کو ایمان دار اور بے خوف، حق پرست اور معتبر، دریا دل اور روادار بنانا تھا۔ وہ ہمارے تعلیمی اداروں کو ذاتی مفاد کے حصول کے بجائے سماجی مفاد کے لیے پُرخلوص کارگاہ اور نظری مطالعے کی درسگاہ کے بجائے انسانی اقدار کے متعدد پہلوؤں کی عملی، قابلِ استعمال اور مفید تربیت کے مراکز میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔

اقدار کا مسئلہ اُن کے ذہن میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی نظر میں واقعات، اعداد وشمار اور معلومات کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی اہمیت رجحانات، طرزِ زندگی، اخلاقیات اور اطوار کی ہے۔ ان کے مطابق "ذات میں اقدار کا منظم ادراک" ہی تعلیم کی تعریف ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کا ذہنی افق وسیع ہونا چاہیے جس میں اقدار مثل ستاروں کے چمک رہے ہوں۔ اقدار سے ہی انسانی امنگوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ تمام وہ چیزیں جو انسانی امنگوں کی تکمیل کرتی ہیں ان کے پیچھے اقدار کی کارفرمائی ہے لیکن امنگوں کا مفہوم صحیح لیا جانا چاہیے۔ اس کا مطلب ہونا چاہیے دل کی گہرائی سے کسی نیک اور اعلیٰ چیز کی تمنا۔ تعلیم پستی سے اسی بلندی پر پہنچاتی ہے جہاں ممتا کی سفلی معنویت معدوم ہو جاتی ہے۔ اس لیے تعلیم کو اقدار میں گراوٹ نہیں لانی چاہیے۔ قدریں وہ تصورات ہیں جو زندگی کو بقا، سکون، فروغ اور تحفظ دیتے ہیں۔ ان سے امن، نظم وضبط، وقار، حسن اور نفاست پیدا ہوتی ہے۔ اقدار انسانوں کو اپنی شناخت، اپنا مستقبل بنانے میں معاون ہیں۔ بچے میں نیک زندگی گزارنے کی امکانی صلاحیت ہے اور یہی امکانی قوت اس میں ایک قدر کے طور پر فطرتاً موجود ہے۔ اسے اجاگر کیا جانا چاہیے کیونکہ تعلیم کا اصل کام یہی ہے۔

ذاکر صاحب نے مادی اقدار، شخصی اقدار، سماجی اقدار، ثقافتی اقدار، روحانی اقدار جیسی بہت سی قدروں کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے آٹھ مختلف قسموں کے اقدار کی فہرست مرتب کی ہے۔ یہ ہیں تفریحی اقدار، اجتماعی اقدار، کردار کے اقدار، مادی اہمیت کی اقدار، جمالیاتی اقدار، دانشوری کی اقدار، دینی اقدار اور جسمانی ساخت کی اقدار۔ سب سے پہلے مادی یا اقتصادی اقدار کو لیجیے جو تمام تر عمل کو متحرک کرنے کا لازمی جزو ہیں۔ ذاکر صاحب اقتصادی اقدار میں اخلاقی اقدار کو ملا دینا چاہتے ہوں۔ ہندوستانی عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کا مطلب ہوگا انھیں زندگی کی صحیح ترجیحات کو طے کرنے کے لیے تیار کرنا۔ جسمانی محنت اور مزدور کی ہنرمندی کے ساتھ ذاکر صاحب کا کام کا مدرسہ کا تصور انھیں ترجیحات کو متعین کرنے کی طرف صحیح قدم تھا۔

دوسرے یہ کہ ذاکر صاحب کے شخصی اقدار کے تصور میں صحت، طاقت، صفائی،

ستھرائی اور جسمانی دیکھ بھال شامل ہے۔ وقت کی پابندی ورزش، غذائیت، آرام وتفریح جیسی اچھی عادتیں صحت مند زندگی کے لیے ضروری ہیں۔

دوسرے یہ کہ شائستگی، سلیقہ مندی، آداب مجلس، وقار، تربیت، کشادہ دلی، دوسروں کی مدد اور دردمندی جیسی قدروں کو بچوں کی تعلیم کا جزو ہونا چاہیے۔ ان اقدار میں ذاکر صاحب نے کردار، ایمانداری، وقت کی پابندی، کفایت شعاری، کسر نفسی، خلوص اور انکساری کی فضیلت کا اضافہ کر دیا اور انھیں بھی اچھی تعلیم کا لازمی جزو قرار دیا۔

تیسرے یہ کہ انفرادی اقدار کے ساتھ ساتھ ذاکر صاحب نے سماجی اقدار کی وکالت کی جس کا مطلب ہے سماج کی طرف احساس ذمہ داری غریب غربا کے لیے فکرمندی اور دردمندی، تمام مذاہب اور عقائد کی تعظیم اور ٹھکرائے ہوئے اور مایوس لوگوں سے ہمدردی. ذاکر صاحب سماجی اقدار کے تحت خدمت، ایثار، رواداری، محبت، وطن پرستی، قوم پرستی، انسان دوستی، اتحاد، ہم آہنگی اور تعاون جیسے تصورات کو پیش کرتے ہیں۔

چوتھے یہ کہ انھوں نے ثقافتی وراثت کو اقدار کے اپنے مطمح نظر میں شامل کیا ہے انسانی ذہن اور وہ طریقہ کار جس سے انسان نے پرامن سماج تعمیر کیے ہیں. ثقافتی اقدار کے تحت آتے ہیں. کلچر ایک پیچیدہ مکمل نظام ہے جس میں علم، عقیدہ، تصور، آرٹ، اخلاقیات، زندگی کے طور طریقے، رسم ورواج اور وہ ہر صلاحیت یا عادت شامل ہے جو انسان کو سماج میں ممیز کرتا ہے۔ ثقافت وہ خزانہ ہے جو کسی قوم کا فخر ہوتا ہے۔ تمام تعلیمی اہرام ثقافتی بنیاد پر کھڑے ہوتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ ذاکر صاحب روحانی اقدار سے صرف نظر نہیں کرتے۔ ثقافت اور مذہب کا گہرا تعلق ہے۔ مذہب اچھی زندگی کے لیے عملی اخلاقی اصول پیش کرتا ہے۔ مذہبی اسپرٹ اور سائنسی مزاج دونوں کی انسانی ترقی کے لیے ضرورت ہے۔ مذہب بغیر سائنس کے اندھا ہے اور سائنس بغیر مذہب کے لنگڑی ہے۔ ہندوستان میں مذہب کی خصوصی اہمیت ہے۔ ہر ہندو گھر میں ایک پوجا گھر ہوتا ہے، ہر مسلم گھرانے میں جانماز ہوتی ہے، ہر عیسائی گھر میں حضرت عیسیٰ کی تصویر آویزاں ہوتی ہے۔ اور ہر سکھ کے سر پر ایک مذہبی علامت ہوتی ہے۔ پوجا گھر میں نہاں خصوصی دیوتا ہوتا ہے، مسلم نماز میں اعلیٰ ترین نورانی اللہ کی ہے اور عیسائی وعظ کا موضوع گاڈ ہے۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ مذہبی اقدار تعلیمی پروگرام کا اٹوٹ حصہ بن جائیں۔ لیکن مشترکہ کلچر میں اس تصور کو عملی جامہ پہنانے میں حائل بے انتہا مشکلات سے وہ بخوبی واقف تھے مذہب ایک انتہائی حساس زمرہ ہے جہاں ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے بہتر ثابت کرنے کی خواہش کا خطرہ لاحق ہے۔ اس لیے مذہبی تعلیم کو لازمی بنانے میں انھیں پس و پیش تھا اور ٹھیک یہی وہ چٹان تھی جس سے

بنیادی تعلیم کی اسکیم لڑھک پڑی۔ اس لیے ذاکر صاحب نے مذہبی اقدار کو مختلف نہج دی۔ انھوں نے مذہبی اقدار کو محبت، خدمت، ایثار، خلوص، بھائی چارہ، مساوات، رواداری، تحمل، عدم تشدد اور سچائی سے تعبیر کیا کیونکہ یہی وہ تعلیم ہے جو تمام بڑے مذاہب دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے مذہبی عقائد کو اس کے اخلاقی جزو سے الگ کیا۔ ذاکر صاحب نے عقیدے کو نہیں چھیڑا لیکن اخلاق پر زور دیا۔ ان کی نظر میں محبت اور کشادہ دلی تمام مذاہب کی بنیاد ہے جو ذات پات، مسلک اور برادری کی رکاوٹوں کو ڈھا دے گی اور عمارت محض انسانیت کی مضبوط چٹان پر کھڑی ہوگی۔

ذاکر صاحب نے اخلاقی اقدار کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے انسان بنانے، کردار کی تعمیر کرنے اور اقدار سے معمور تعلیم کا راستہ اپنایا۔ وہ ہماری قومی زندگی میں دو طاقت کو اخلاقیات سے، تکنیک کو جائز و ناجائز کی تمیز سے اور عمل کو عقیدت مندی سے ہم کنار کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہماری قومی زندگی کے ان سات پاپوں سے واقف تھے جن کی نشاندہی گاندھی جی نے کی تھی — اصولوں کے بغیر سیاست، کام کے بغیر دولت، ضمیر کے بغیر عیش و عشرت، کردار کے بغیر علم، ایمانداری کے بغیر تجارت، انسانیت کے بغیر سائنس اور خلوص کے بغیر عبادت۔ اس لیے ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ زندگی کی تمام نشو و نما ایسے دائرہ میں رہ کر ہونی چاہیے جو جائز و ناجائز کے معیار پر مستحکم اخلاقی طور پر درست اور روحانی طور پر بیدار ہو۔

اس طرح ان کے تعلیمی فلسفے کا محور نظام اقدار ہے۔ ان کے مادی اقدار فطرت سے ہم آہنگ تھے اور انسان کی جسمانی نشو و نما کے لیے ان کی ضرورت ہے۔ لیکن ان کے سماجی اور ثقافتی اقدار روحانی فضا کو چھوتے ہیں جو آدمی کو انسان بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ طبعی اقدار کا اطلاق حیاتیاتی پر ہوتا ہے جب کہ ثقافتی اقدار سرشت کے لحاظ سے اخلاقی، موضوع کے لحاظ سے فلسفیانہ اور جوہر کے لحاظ سے روحانی ہوتی ہیں۔ ذاکر صاحب نے طبعی اقدار کو اخلاقی شخصیت کی سطح کے حصول کا ذریعہ تصور کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم ثناویت، مقامی تعصب، تفریق پرستی، لسانی تعصب، علاقہ پرستی، برادری پرستی، اور فرقہ پرستی سے پاک ہو۔ یہ وہ نئے سات پاپ تھے جو قوم کو ناپائیدار بنانے کے لیے ظاہر ہو رہے تھے۔

ان کا نظام اقدار مدرسے کے حدود میں ہی نہیں رک جاتا۔ بلکہ اس کی توسیع پوری سماج تک ہے۔ شخص سے لے کر سماج تک، سماج سے قوم تک اور قوم سے عالم انسانیت تک ان کے دائرۂ کار کے تحت آتا ہے۔ فرد کے مفاد سماجی مقصد کے سیاق و سباق میں ہی پورے ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول سے دور ہو کر پانی سے نکلی مچھلی کی طرح ہو جائے گا۔ اسی لیے فرد، سماج، ریاست کے تعلق سے خود مختاری اور آزادی کی انتہائی اہم اقدار کا انھوں نے

اضافہ کیا ہے۔ تمام تر تاریخ انسانی خود مختاری سیاسی آزادی، سماجی آزادی، ثقافتی آزادی، معاشی آزادی، ذہنی آزادی وغیرہ ڈرامائی عناصر کا مجموعہ ہے۔ ہمیں یہ بات رکھنی چاہیے کہ ذاکر صاحب کی زندگی کے زیادہ تر تخلیقی تصور کا تعلق اس استعماری دور سے ہے جب سیاسی آزادی پر ان کے عمل کا دائرہ تھا۔ آزادی کے بعد انھوں نے شخصی آزادی کے ساتھ ساتھ سماجی آزادی، معاشی آزادی اور ثقافتی آزادی پر زور دینا شروع کر دیا۔

آزادی پر ذاکر صاحب جو زور دیتے تھے اس سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے اگر ہم مکتی (نجات) کے ہندو تصور پر غور کریں جو موت و زندگی کے بندھنوں سے آزاد ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ عمر کی ہر منزل مکتی کی طرف بڑھتا ہوا قدم ہے۔ آزادی فرد اور سماج دونوں کے اعمال صالح کا انعام ہے۔ ذاکر صاحب نے شخصی آزادی کے تصور پر کافی توجہ دی ہے۔ وہ سگمنڈ فرائڈ سے متفق ہیں کہ شخصی آزادی تمدن کا تحفہ نہیں ہے۔ روسو نے بہت تفصیل سے اس کے متعلق لکھا ہے۔ تہذیب و تمدن نے انسان کو زنجیروں میں باندھا ہے اور سلامتی اور تحفظ کے تزویر میں گھر کر کے اس نے پے درپے اپنی آزادی کھو دی ہے۔ جدید جمہوری ریاست آزادی کی جنت نہیں ہے بلکہ ایک باصلاحیت اقلیت کے ہاتھ میں ایک طاقت ور مطلق العنانیت ہے جسے قانون و امن کے بہانے اپنی من مانی کرنے کی اُسے اجازت مل جاتی ہے ایسی ریاست ڈارون کے فطری انتخاب کے اصول کے نزدیک پہنچ جاتی ہے جس کے تحت حکمرانی طاقتور کا مقصد ہوتی ہے۔ آج کل کی حکومتیں فوجی لحاظ سے اتنی طاقت ور ہیں کہ عوام کو سرنگوں ہونے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ فوجی اور معاشی طاقت نے عوام کے سامنے کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ سوائے اس کے کہ وہ سروں کو توڑنے کے بجائے سروں کی گنتی کے ذریعہ اپنے تنازعوں کو حل کریں۔ مسرت کا آدرش ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہا ہے اور عہد بہ عہد تبدیل ہوتا رہا ہے۔

ریاست کے جبر کے خطرے کو ٹالنے کے لیے ذاکر صاحب شخصی آزادی کے واسطے دانشوروں کی فیصل بنانے کا نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ماہران تعلیم سماج کو مہذب بنانے کا موثر ترین وسیلہ بنیں لیکن انھیں مایوسی ہوئی جب انھوں نے بلند مرتبہ تعلیم یافتہ لوگوں کو شخصی آزادی کو ختم کرتے پایا۔ اس کی وجہ ریاست کے نظام میں اخلاقی اجزا کی کمی تھی۔ اس کے لیے صحیح قسم کی تعلیم کی ضرورت تھی۔ افلاطون کے مداح ہونے کی وجہ سے وہ اس بات کی قدر و قیمت سمجھ سکے کہ افلاطون نے ریاست کے سرپرستوں کے لیے اس قسم کی سخت تربیت کیوں تجویز کی تھی۔ زمانے کے حقائق کے شاہد ہوتے ہوئے انھوں نے اس حقیقت کو جان لیا تھا کہ "ہم ایسی دنیا میں پیدا ہوئے ہیں جہاں بے گانگی ہماری منتظر ہے"

جدید زندگی کی حقیقتیں ایسی ہیں کہ دولت میں اضافے سے نابرابری بڑھتی ہے، قوم جتنا زیادہ پیدا کرتی ہے اتنی ہی زیادہ اس کے شہریوں کی آمدنی میں فرق رونما ہوتا ہے۔ آج کی دنیا میں دولت مندی کا مطلب ہے ملکیت میں عدم مساوات امیر اور زیادہ امیر ہو جائیں اور غریب اور زیادہ غریب کیونکہ اگر سبھی لوگ امیر ہو جائیں گے تو امیری کا تصور ہی زائل ہو جائے گا۔ کچھ کے پاس بہت کم ہونا ہی چاہیے تاکہ وہ دوسروں کے زیادہ پانے کی راہ میں معاون ہو سکیں۔ جان رسکن نے کہا تھا کہ "تمہارے جیب میں پڑی گنی کی طاقت کا پورا انحصار تمہارے پڑوسی کی جیب میں گنی کی غیر موجودگی پر ہے۔ اگر اُسے اس کی ضرورت نہیں ہے تو یہ تمہارے لیے بے مصرف ہے۔"

ذاکر صاحب ایک اور بات سے تشویش میں مبتلا تھے۔ امیر اور با اثر لوگوں کو اپنے بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے مواقع حاصل ہیں جو اعلیٰ رتبوں پر فائز ہو کر کم خوش قسمتوں کو ماتحتی کے درجے پر رہنے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے سماجی تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے تدارک کے لیے ذاکر صاحب کی تجویز تھی کہ تعلیم کو قومی بنایا جائے تاکہ چودہ برس کی تمام عمر کے تمام بچے بنیادی تعلیم حاصل کر سکیں اور اہرام کی بنیادی سطح پر سب کو مساوی رکھا جا سکے۔ تکنیکی، پیشہ ورانہ یا عام تعلیم کی اعلیٰ سطحوں تک سب کی رسائی ہو سکے اور بہت زیادہ صلاحیت والے بچوں کو ریاستی امداد حاصل ہو۔

مختصراً یہ کہ ذاکر صاحب کے مطابق تعلیم کا مقصد تھا خارجی ذہن کو داخلی ذہن میں تبدیل کرنا۔ عقل کہتی ہے اصولوں کے پابند رہو۔ ہمارے اندر کا اخلاقی جذبہ کہتا ہے کہ اصول سے بلند ہو کر عشق کو اپناؤ جہاں عمل دُکھ کی وجہ ہوتا ہے اور دُکھ عمل کا سبب بنتا ہے۔ اور یہاں ہی تعلیم "اقدار کی منضبط حس" کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آزادی کے متعلق ذاکر صاحب کا فرمانا ہے کہ "آزادی کبھی دی نہیں جاتی۔ وہ تو لی جاتی ہے اور وہی اسے قائم رکھ پاتے ہیں جو اپنی عملی زندگی کے ہر لمحے میں اسے حاصل کرتے رہتے ہیں۔"

ان کا نظامِ اقدار انسان کی سماجیاتی ضروریات، زندگی کی حیاتیاتی احتیاج، دانشمندی کے عملی شوق اور پارساؤں کے اخلاقی تجربے کے تخلیقی فکر کی متعانی میں متحد کر ایک ایسے نظامِ اقدار کی شکل میں ڈھل گئے جو ذاکر صاحب کی انسان دوستی سے تعبیر ہے۔ ان کی انسان دوستی طاقت اور عہدے، عیش و عشرت اور شان و شوکت، دولت اور تعیش کے اقدار سے مختلف تھی اس کا رُخ حق و انصاف، حسن و عشق، خدمت و ایثار، نیکی و پارسائی کی طرف تھا۔ زندگی کے مقصد اور اس کی معنویت کی توضیح و تشریح اس سے ہوتی ہے یہ زندگی بتانے اور خوش رہنے کی راہ دکھاتی ہے۔

ذاکر صاحب کے نظام اقدار کا منشا ایک نیا سماجی نظام تیار کرنا تھا جس میں چند استحقاق رکھنے والے گروہوں کے ذریعہ لوگوں کا استحصال کی کوئی گنجائش نہ ہو ہاتھ سے کام کرنے والوں کی طرف لوگوں کے رویہ میں اس سے انقلابی تبدیلی رونما ہوگی۔ ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ غریبوں کی طرف توجہ اور ان سے ہمدردی مہذب زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔" ہندوستان اور عالم انسانیت کے عظیم مستقبل کی طرف بڑھتے قدموں کے دوران" امن عالم اور ہماری ملی جلی ثقافت کی بقا کے لیے وہ جمہوریت اور عدم تشدد کو اعلیٰ تصور سمجھتے تھے۔ عدم تشدد پر مبنی اقدام پر انھیں زبردست یقین تھا۔ تشدد کے بغیر اقدام سے لوگوں نے ماضی میں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ہندوستان میں بھکتی تحریک، اسلام میں صوفی رجحانات، عیسائیوں کا فلسفۂ محبت، ہندوؤں بدھوں اور جینیوں کی اہنسا سبھی کا انحصار تشدد سے پاک اقدام پر ہے۔ ان سب کے علاوہ حصولِ آزادی کی گاندھی جی کی تکنیک عدم تشدد پر مبنی تھی جو وحشیانہ طاقت کے مقابلے کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہوئی۔

ذاکر صاحب کے نظام اقدار کا ایک دوسرا پہلو محبت ہے جو دنیا کو حرکت پذیر کرنے کی توانائی ہے۔ کرۂ ارض پر موجودہ جاندار محبت کی پیداوار ہے اور جو انسان اور انسان کے درمیان تمام تنازعوں کا حل ہے۔ یہ ایک کمزور جذبے کا وقتی احساس نہیں ہے بلکہ زندگی کا رویہ ہے جس میں ذہن، جسم اور روح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اکملیت کے تصور کی طرف اٹھنے والا یہ قدم ہے۔ خارجیت سے داخلیت کا رشتہ اس سے ہویدا ہوتا ہے۔ آدمی کو اس سے امن وسکون، آرام و آسائش اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب نے جو کچھ سوچا، جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا ان سب میں محبت کا پیغام ہی نمایاں ہے۔

ان کی انسان دوستی کا دوسرا پہلو حسن ہے۔ فطرت کی خوب صورتی انھیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے۔ پھول سے لے کر پتھر تک، شاعری سے لے کر خطاطی تک، موسیقی سے لے کر مصوری تک اور بچوں سے لے کر چرند پرند تک کے حسن کے وہ پرستار ہیں۔ خدمت اور قربانی ان کی انسان دوستی کا تیسرا پہلو ہے۔ خدمت تمام نیک خوبیوں کی ٹھوس شکل ہے دعا پڑھنے والے ہونٹوں سے وہ ہاتھ زیادہ متبرک ہوتے ہیں جو دوسروں کو سہارا دیتے ہیں۔ یونانی عقلیت پسندی، ہندو وسیع المشربی، عیسائی خیرات، بدھ کی رحم دلی، اسلامی مساوات صوفیوں کے عشق، جرمن تصوریت اور مغربی نظریۂ عملیت سے ذاکر صاحب نے پوری طرح استفادہ کیا ہے۔ وہ لوگوں کو اٹھ کھڑے ہونے اور عمل کرنے پر اکساتے ہیں۔ خواب خرگوش میں مبتلا لوگوں سے وہ کہتے ہیں "کام عبادت ہے۔"

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذاکر صاحب کے نظام اقدار سے بہت سے مفید نتیجے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ دنیا کی ہر چیز اس مقصد کی تکمیل کی طرف گامزن ہے جس کے لیے اس کی

تخلیق ہوئی ہے۔ انسان کو بھی اسی سمت بڑھنا چاہیے اور ناپائیدار مسرتوں سے اوپر اٹھ کر اس بات کے حصول کی طرف بڑھنا چاہیے جس کی اس سے امید کی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ دنیا کی ہر چیز اس خواہش کے زیر اثر ہے کہ وہ جو کچھ ہے اس سے افضل ہو جائے۔ بیج پودا بن جاتا ہے۔ بچہ بڑھ کر آدمی ہو جاتا ہے۔ اس لیے انسانی ذہن کو صحیح سمت میں بڑھنا چاہیے۔ تیسرا یہ کہ دنیا کی ہر چیز کا وجود کسی دوسری چیز کے لیے ہے، وہ محض اپنے لیے نہیں ہے۔ صرف انسان اس اصول کو توڑتا ہے اور خود غرض ہو جاتا ہے۔ اُسے بھی سب کے سماجی مفاد کے لیے زندہ رہنا چاہیے۔

چوتھا یہ کہ دنیا کی ہر چیز تغیر پذیر بھی ہے اور استوار بھی۔ وقت بدلتا ہے، موسم بدلتا ہے، جسم بدلتا ہے لیکن استواری بھی اتنی ہی بڑی سچائی ہے۔ نیم کے بیج سے آم کا پھل پیدا نہیں ہوتا۔ کتے کی وفاداری، بلی کی نرمی، گلاب کی خوشبو کبھی نہیں بدلتی۔ انسان کو بھی انسان بنے رہنا چاہیے اور اُسے سنگ دل نہیں ہونا چاہیے۔ انسان دوستی وہ مقصد ہے جسے اُسے پورا کرنا ہے۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی اُسے پیروی کرنی ہے اور یہی وہ ضابطہ ہے جس کی اُسے پابندی کرنا ہے۔

ذاکر صاحب کے نزدیک آدمی کا مقدر محض زمان و مکان کے حدود میں عمل کرنا اور روزانہ کی بنیادی ضرورتیں ہی پورا کرنا نہیں ہے بلکہ اپنے پیچھے لافانی قدر چھوڑ جانے کے لیے اُسے زمان و مکان کے تناظر میں اس کی تعبیر کرنا چاہیے۔ تاریخ کے عظیم لمحات وہ نہیں ہیں جب سلطنتیں قائم ہوئیں بلکہ وہ ہیں جب نیک خوئی اور شرافت عروج پر پہنچی فطرت سے ذہن کی ہم آہنگی کا علم ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ ایسے ہی موقع پر انسان اپنے ضمیر کو روشن کر کے علم و حکمت کی مشعل جلاتا ہے اور وہی روشنی اسے یہ محسوس کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ سماج کی طرف اس کی بہت زیادہ ذمہ داریاں ہیں۔ ذاکر صاحب کی تمام تر توجہ ایسے ہی ضمیر کو روشن کرنے پر تھی جو فہم و ادراک کی شخصی حکمرانی کو پار کر کے مکمل انسان بنانے کا راستہ ہے۔

صادق علی

وہ آج بھی زندہ ہیں

ذاکر صاحب ہندوستان کی مشہور و معروف اور دل کش شخصیتوں میں ایک تھے جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا اور ایک نئے معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ ان کی جدوجہدِ آزادی نمایاں طور پر نہیں تھی اور نہ کھلے عام تھی۔ پبلک کیریر اس وقت شروع ہوا جب انھوں نے ۱۹۲۰ء میں "انڈیا ایجی ٹیشن" کے سلسلے میں خلافت اور سوراج تحریکوں میں حصہ لیا۔ انھوں نے گاندھی جی کی آواز پر کہ "انگریزی درسگاہوں کو چھوڑو، اپنی تعلیمی ادارے کھولو جہاں صحیح قسم کی قومی تعلیم دی جائے" لبیک کہا اس آواز نے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی چند نوجوانوں طلبا میں جوش و ولولہ پیدا کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی بھی قومی خلفشار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ گو کہ اس آواز کی خوب مخالفتیں ہوئیں لیکن طلبا کی ایک جماعت تھی جس نے جنوتی کو قبول کیا کالجوں کو چھوڑ دیا اور نئے تعلیمی اداروں کی بنیاد ڈالنے میں مگن ہو گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ "جامعہ ملیہ "ایک نیا ادارہ" کی کہانی دراصل ذاکر حسین کی زندگی کی کہانی ہے۔ گاندھی جی جیسی بہت سی ممتاز ہستیاں اس سے منسلک ہو گئیں۔ یہ کہانی بے حد رنگ آمیز تفصیلات کے ساتھ ذاکر صاحب کے ساتھی بیان کیا کرتے تھے۔ ایک نئے ادارے کی داغ بیل ڈالنا باوجود ہر طرح کے اتار چڑھاؤ کے ایک کارنامے سے کم نہ تھا۔ تعلیم کے میدان کو اس نے ایک نئی راہ دکھائی۔ مگر اس سے بڑھ کر اور بھی دوسرے پہلو ہیں جن کا تذکرہ لازم ہے۔ فی الحال دو پہلوؤں پر نظر ڈالوں گا۔

تعلیم، جس کا دائرہ بہت وسیع ہے، ذاکر صاحب کا محبوب مضمون تھا۔ تعلیم قومی زندگی کے ہر پہلو پر نظر رکھتی ہے۔ غیر ملکی تسلط کو ختم کرنے کی جدوجہد کے دوران ان کے سامنے بہت سارے مقاصد تھے۔ سب سے پہلا اور اہم مقصد ایکتا اور ملک کی یکجہتی تھا۔ لیکن اس یک جہتی کا تعلق کسی قلمرو یا عملداری سے نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق تھا لوگوں اور تہذیب کی یک جہتی سے۔ ملک کی جدوجہدِ آزادی کے دوران گاندھی جی نے بھی خصوصی طور سے اس پر زور دیا تھا۔ حصولِ آزادی کا سارا دار و مدار اسی پر تھا۔ لیکن ملک میں

اس قسم کے جوش و ولولے کے آثار نہیں تھے۔ آزادی کی جد وجہد کے دوران جب بھی کوئی نیا موڑ آتا آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا جاتی۔ ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد شک اور شبہ پر تھی اور غیر اعتمادی کا یہ عنصر ہندو مسلم دونوں کے درمیان ایک فاصلہ پیدا کر رہا تھا۔ لیکن ذاکر صاحب کو اور کوئی چیز اتنی عزیز نہیں تھی جتنی ہندو مسلم دوستی۔ اس مسئلے کا کیا حل ہو وہ کون سا طریقہ ہو جو ہندو مسلم اتحاد کی مضبوط بنیاد رکھے۔

اس بات کو سمجھنے اور جاننے کے لیے ذاکر صاحب نے ہندوستانی تہذیب کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی کہ شروع میں متعدد نظریات کو ہم آہنگ کر کے ایسا نظام بنایا جائے جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور لوگوں میں یہ رجحان انداز فکر پیدا کرے بخوبی زندگی کے بنیادی نظریات کا ایک اہم حصہ بن سکے۔ زندگی اور خیالات کو اس بنیادی پہنچ کی طرف یقیناً اتار چڑھاؤ آئیں گے، کچھ لوگوں کا ان نظریات کے تئیں جھکاؤ پیدا ہوگا اور کہیں انحراف مگر زندگی اور تہذیب میں میل جول آخری وقت تک فوقیت رکھتے ہیں۔ ذاکر صاحب کی اسلامی تعلیم کے ابتدائی ادوار کے نظریات ایک عام انسان کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ طاقت تلوار کے زور سے ملتی ہے، لیکن قرآن اور حضرت محمدؐ کی زندگی، امن و آشتی، بھائی چارے، آزادی اور ہر طبقے کے لوگوں کے لیے انصاف کا پیغام دیتی ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اور صحیح معنوں میں میرے خیالات کی ترجمانی کی جائے تو یہ ایک پیغام ہے جو ہندوستان کی اخلاقی آہنگی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ بہت سی باتوں میں ہم آہنگی کچھ تہذیبی تفریق پر بھی منحصر ہے۔ لیکن ایک اچھے جمہوری ملک میں اتفاق رائے ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ پھر سب مل جل کر کسی مسئلے کا حل نکال سکیں۔ دراصل جمہوریت کی کامیابی اس امر پر منحصر ہے کہ اختلاف کے باوجود سب لوگ آپس میں مل جل کر رہیں۔ ہندوستانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انگریزی حکومت نے ہندو مسلم میں نااتفاقیوں اور ناچاتیوں کو خوب بڑھاوا دیا۔ یہ صورتِ حال عہد وسطیٰ کے آخر میں ہی ابھر کر سامنے آگئی تھی۔ اس صورت کے خلاف لڑنے اور اس لعنت کو ختم کرنے کے لیے یک جہتی کو مضبوط بنانے کی شدید ضرورت تھی۔

مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان بڑھتے شگاف کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے بڑے دکھ کے ساتھ محسوس کیا۔ ہم ایک دوسرے میں غلطیاں نکال سکتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ ایک دوسرے میں خامیاں تلاش کرنے اور غلطیاں نکالنے سے ہمارا ملک کہیں کا بھی نہیں رہے گا۔ اس دکھ کا اظہار ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ ملیہ کے جشن سیمیں پر سیاسی رہنماؤں کو خطاب کرتے ہوئے کیا تھا ذاکر صاحب کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ ایک مستحکم مخلوط ماحول کی اشد ضرورت ہے جہاں آزادی کے ساتھ ہر شخص اپنی مذہبی اور تہذیبی روایتوں

کو محفوظ اور قائم رکھے، خاص طور سے اس زمانے میں جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ اس اہم موضوع پر ذاکر صاحب نے کیا کہا اور کس خوش بیانی کے ساتھ کہا یہ ہماری آنے والی نسل کو سوچنا چاہیے کہ اسی بنیاد پر اصل جمہوریت کی تعبیر ہو سکے۔

فرقہ پرستی کے مسائل ابھی کچھ زمانے تک اور چلیں گے۔ سیاق و سباق بدلتے رہیں گے مگر ان کو جمہوری انداز سے سلجھانے کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے ملک کی سماجی زندگی مختلف فرقوں پر مشتمل ہے جو اپنے اپنے مذاہب پر اہم عقیدہ رکھتے ہیں، اپنی سماجی روایات کو بخوشی جوش و خروش سے مناتے ہیں اور اس طرح مذہب اور روایت سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں پر سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ اگر مختلف مذاہب کے لوگ اپنے اپنے نظریہ میں ذرا وسعت پیدا کریں تو ہر مذہب ایک دوسرے کو باندھنے کی بہت بڑی طاقت ہے۔ مذہبی فکر کی کشادگی ہر مذہب میں ہے۔ لیکن مذہب چند لوگوں کے ہاتھ آجاتا ہے تو اپنی اہمیت کھو دیتا ہے اور تنگ نظری کو فروغ دیتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین دیگر مذہبی رہنماؤں جیسے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد اور خان عبدالغفار خاں کی طرح مذہبی تھے۔ یہ مذہبی شدت، بذات خود ہی ہمہ گیر اور عالمگیر اہمیت کی حامل ہے۔ اس لیے کہ یہی ہمہ گیر مذہبی نظریہ فرقہ پرستی کو ختم کرنے کا ایک مناسب ذریعہ ہے۔ ان کے خیال میں تعلیم انسان میں دوسرے مذاہب کے لیے رواداری اور احترام اُجاگر کرتی ہے۔ تقسیم ہند کے دوران جو ماحول پیدا ہو گیا تھا تو اس کے امکان پیدا ہو گئے تھے کہ جامعہ ملیہ تخریب کاروں کی نذر ہو جاتی مگر پھر بھی اس کا وجود برقرار رہا۔ اس نے نہ صرف فرقہ پرستی کے نعروں کو نظر انداز کیا بلکہ ان لوگوں کو بھی شکست دی جو اُسے بڑھاوا دے رہے تھے۔

دوسرا میدان جس میں ذاکر صاحب نے پائیدار امداد دی وہ تھا فروغ تعلیم، جس کے اردگرد ان کا پورا کیریر گھومتا رہتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کسی بھی انسان کی دماغی نشو و نما اور معاشرتی ترقی کو رکھاؤ اور بیلنے کے لیے تعلیم کا فروغ ایک بہت بڑا گر ہے ہندوستان کو کس نوعیت کی تعلیمی تربیت کی ضرورت ہے یہ بات صرف یوں ہی نہیں کہہ دی تھی۔ انھوں نے اپنے مطالعے کو وسیع سے وسیع تر کیا، بیدار ذہنوں کو پڑھا اور سمجھنے کا تجربہ کیا۔ جس میں ان کو کافی محنت کرنا پڑی تھی۔ خلافت اور سوراج تحریکوں کے ہنگاموں میں کسی بھی تعلیمی ادارے کو اتنی کشمکش اور جدوجہد کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو جامعہ ملیہ نے کیا۔ چاہے وہ ذاکر صاحب ہوں یا مجیب یا عابد حسین ان لوگوں نے جو شدید تکلیفیں اٹھائیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ ایک طرح کا تبلیغی جذبہ ان لوگوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ ذاکر صاحب نے جامعہ ملیہ کے لیے جو معیار رکھے تھے ان کو

پورا کرنا اتنا سہل کام نہیں تھا۔

دل، دماغ، جسم آپس میں کیا مطابقت رکھتے ہیں یہی موضوع ان کی ہر تقریر ہر تحریر میں ملتا ہے۔ ان کو بہتر سے بہتر چیز کی جستجو رہتی تھی، ہر چیز میں وہ افضلیت کے متلاشی رہتے تھے۔ یہی ان کی شخصیت کا ایک افضل پہلو تھا۔ روزمرہ کی زندگی اس کے مسائل پر نظر رکھنا ان کی زندگی کا اہم حصہ تھا۔

ذاکر صاحب بہت بڑے ماہر تعلیم تھے۔ لیکن سارے ملک کے لوگوں کے لیے ان کا بے مثال کردار اور بلند خیالی ایک بہت بڑی مثالی تھی۔ ان کی قومی وفاداری میں کبھی بھی کوئی آنچ نہیں آئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تقسیم ہند کے بعد بھی کہیں نہ کہیں ان ان کی خدمات حاصل کی جاتی رہیں۔ سیاسی میدان سے ہٹ کر بھی دیکھیں تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی بھی، کسی بھی قسم کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی ہو اور انھوں نے اسے بخوبی نبھائی نہ ہو۔ تقسیم ہند سے ان کو شدید صدمہ پہنچا اس حد تک کہ ان کی جان بھی لے سکتا تھا۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے لیکن مذہبی تعلیم پر مبنی ان کا پیام ہندو مسلم، عیسائی اور سکھ سب کے لیے ایک تھا وہ یہ کہ بھائی چارے کا مقصد یہ ہے کہ سب لوگوں کو ایک نظر سے دیکھا جائے۔

ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو ذاکر صاحب نے زندگی کے فلسفے کو خوب سمجھ لیا تھا۔ ان کی وسیع النظری، اعلیٰ ظرفی اور کارہائے نمایاں، ان کی ذہانت اور فنی صلاحیت رفتہ رفتہ سب لوگوں پر عیاں ہوتی گئی۔ یہ قابل رشک بات ہے کہ جیسے اور جب ان کے اعلیٰ مناصب بدلے اسی طرح ان کی دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔ ذاکر صاحب نے زندگی کے سمندر کو جانفشانی اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پار کیا گو کہ ان کی زندگی کی تلخیاں بھی کم نہیں تھیں۔

جب گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کی اسکیم شروع کی تو وہ کچھ پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ یہ نظریہ قوم کے سامنے کافی چھان بین اور سوچ سمجھ کے رکھنا چاہیے۔ اس وقت انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے تجربے اور ذہانت و صلاحیت استعمال کرنے کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں کافی ردّو بدل کیے گئے۔ ذاکر صاحب نے محسوس کیا اور پھر اپنا نظریہ پیش کیا کہ گورنمنٹ نے بنیادی تعلیم کی اسکیم پر مناسب توجہ نہیں دی۔ تقسیم ہند کے بعد قوم خاصی بدل ہوگئی تھی۔ ابتدائی تعلیم کا نظام کبھی تاریک تھا اور یہ بھی شکایت کی جارہی تھی کہ ہماری موجودہ ابتدائی تعلیم کا ڈھانچہ ہی بہت کمزور ہے۔ یہ منتشر ذہنوں کی پہچان تھی اور ویسے بھی ابتدائی تعلیم کی کمزوریاں اس لیے نہیں تھیں کہ ان پڑھ لوگوں کی تعداد زیادہ تھی (حالانکہ یہ تعداد اب بھی ہمارے ملک میں موجود ہے)، بلکہ خاص طور سے

اس لیے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم بہت ناقص تھا۔ اس موضوع پر کافی غور و فکر اور توسیع کی ضرورت ہے۔ حالانکہ تعلیم کی کوئی ایسی بندھی ٹکی تعریف نہیں ہے جو دنیا بغیر حیل و حجت کے قبول کرے۔ یہاں تک کہ یہ بات تو ایک ملک میں بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کی تعریف تو بدلتی رہتی ہے۔ تعلیم پورے سیاسی، سماجی، ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کا ہی حصہ ہے ذاکر صاحب نے مشرق اور مغرب کے تعلیمی میدان کے بڑے بڑے دانشوروں اور افلاطون سے لے کر ڈیوی تک کے انداز فکر سے اپنے آپ کو روشناس کرایا۔

کسی طرح تعلیم انسان کی سیاسی، سماجی، ذہنی اور روحانی نشو و نما کرے گی یہ بات ذاکر صاحب کے لیے مستقل پریشانی کا سبب بنی رہی۔

قیصر نقوی

ڈاکٹر ذاکر حسین اور سماج کی تشکیل

نوخیز عمر تھی۔ کوئی سولہ سترہ سال، محدود قصباتی جاگیردارانہ ماحول، مگر جدوجہدِ آزادی کی ہوا سے فضا گرم تھی اور ہمارا دماغ نئے نئے تصورات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی کبھی جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کاموں کا ذکر ہوتا تھا تو لگتا کہ وہ بچوں کے لیے ایک نئی دنیا یا خواب کی سی باتیں ہیں۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا بھی ذکر آتا تھا اور ہمارے اثر پذیر ذہن میں ان کا ایک عجیب ناقابل یقین سا تصور بن رہا تھا۔ خیر اب پچیس تیس سال انھیں دیکھنے مختلف حیثیتوں میں ان کے ساتھ کام کرنے، اور ان کی شخصیت کو کسی قدر سمجھنے کے بعد یہ غیر معمولی کردار کچھ اور حیرتناک محسوس ہونے لگا ہے۔

میں دہلی میں نجف گڑھ میں استادوں کی ٹریننگ کے ایک اسکول میں ٹریننگ حاصل کر رہا تھا، جس میں، بنیادی تعلیم، پر بھی زور تھا، اور اسی وجہ سے ہم دو چار لڑکے جامعہ میں بچوں کا ایک میلہ دیکھنے پہلی بار اوکھلا آئے تھے۔ یہیں میں نے پہلی بار اس ’ساحر‘ یعنی ذاکر صاحب کو دیکھا اور ان سے بات کی، کچھ ذاکر صاحب کی مسحورکن اور پُر کشش شخصیت اور کچھ جامعہ کے لڑکوں کے اس میلے میں کام، تنظیم، ذمے داری ایک عجیب سا تصوراتی انداز، ان سب نے مل کر مجھے کچھ ایسا رجھایا کہ میں نے اپنے تحت الشعور میں اپنی زندگی کا مقصد جامعہ چلے آنا طے کرا یا۔ آج جب خاصی متحرک زندگی گزارنے کے بعد فرصت میں اپنی زندگی کے تصورات اور اعمال کا لیکھا جوکھا کرتا ہوں تو زمانے کے سب گرم و سرد، کامیابیوں اور ناکامیوں، تفنع اور حصول کے گنجلک الجھنوں میں اسی فیصلے کو زندگی کا سب سے قیمتی فیصلہ پاتا ہوں چونکہ زندگی تو یوں بھی سود و زیاں کے ایک لامتناہی سلسلے کا نام ہے۔ جب خود اپنی ذات اور اپنے بہت سے ساتھیوں پر غور کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کی ایک شخصیت نے کتنی بہت سی مختلف اور متضاد شخصیتوں پر اثر ڈالا۔

جامعہ کے کام اور ان سے مرتب ہونے والے اثرات لہروں کے کھیل کی طرح تھے

جیسے پرسکون پانی میں ایک کنکر پھینک دیا جائے تو اس کی لہریں ایک مرکز سے اٹھتی ہیں اور چھوٹی سے بڑی ہوتی ہوئی پھیلتی چلی جاتی ہیں اسی طرح اب محسوس ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب سب سے پہلے ایک تصوراتی مرکز سا پیدا کر دیتے تھے جس سے فکر و عمل کا ایک چھوٹا دائرہ پھر اس سے بڑا، پھر اس سے بڑا۔ دائرہ پیدا ہوتا چلا جاتا تھا۔ یہاں کے ہر کام، ہر منصوبے، ہر تصور میں ان کا پرتو بہر حال صاف جھلکتا نظر آتا تھا۔ جامعہ میں اور مختلف سماجی کاموں کے دوران میرا تعلق براہِ راست بھی بہت کافی ذاکر صاحب سے رہا لیکن شعبہ داری تقسیم کے تحت میں زیادہ تر شفیق الرحمٰن قدوائی، جو خود اپنی ایک مکمل، منفرد اور مضبوط شخصیت رکھتے تھے اور ذاکر صاحب کے تصورات، افکار و عمل کا بہترین نمونہ تھے، کے سامنے جوابدہ تھا۔

بہر طور، ٹریننگ پوری کر کے بڑے جتنوں سے ہمارے کچھ کرم فرما بزرگوں نے ہمیں سرکاری اسکول میں نوکری دلا دی اور ہم نے ان کے خیال میں اپنی 'منزل آخر' بھی حاصل کر لی۔ تذکرتاً، ۴۳-۱۹۴۲ء میں جنگ کی بحرانی کیفیت میں ہمارے خاندان میں کسی فرد کو اسی روپیے مہینے کی باقاعدہ، نوکری مل جانا بھی نعمت سے کم نہیں تھی۔ مگر ہمارا ذہن اس منزلِ سراب سے نہ صرف مطمئن نہیں تھا بلکہ بغاوت پر آمادہ تھا، چنانچہ جیسے ہی ہمیں جامعہ میں ایک خالی جگہ کا علم ہوا ہم اس پھول پر شہد کی مکھی کی طرح منڈلانے لگے۔ اور آخر کار خود شفیق صاحب کے متنبہ کرتے کے باوجود کہ بتیس (۳۲) روپے کی جس تنخواہ کا وعدہ ہم سے کیا جا رہا ہے اس کا ہر مہینے مل جانا بھی کسی طرح یقینی نہیں ہے، ہم اپنی ہر طرح کی بے بضاعتی کی پونجی کے ساتھ جامعہ کے اس خاندان میں داخل ہو گئے جو تہی دست تو تھا مگر اپنے اصول و عمل کے اعتبار سے سربلند اور کج کلاہ۔

میں جامعہ اس لیے آیا تھا کہ مجھے بچوں سے ایک غیر معمولی لگاؤ تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ جامعہ بچوں کی تعلیم سے زیادہ ان کی ذہنی نشوونما، رٹائی اور امتحانات سے زیادہ شخصیت کی تعمیر اور ایک خود اعتماد ذہن پیدا کرنے کی خواہش مند ہے۔ اور اب اس میدان میں لگ بھگ پچاس برس براہ راست بچوں سے تعلق رکھنے اور بچوں کی مختلف تنظیموں کو دیکھنے اور برتنے کے بعد دیانت داری کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب اور ان کی جامعہ کا انداز پورے ملک میں نہ صرف مختلف اور ممتاز تھا بلکہ بچوں کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنے، بروئے کار لانے، اور ایک عمل اور منفرد شخصیت بنانے میں بے مثال تھا۔ جہاں بچے کو اپنی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کے مطابق بچوں کی دکان، بچوں کا بینک، بچوں کی میونسپلٹی، بچوں کی حکومت، بچوں کی عدالت، باغبانی، بچوں کا خوانچہ جیسے شعبوں کا ذمہ دار رکن، ایک دن کے مدرسے میں استاد، ہیڈ ماسٹر، چپراسی یہاں تک کہ مہتر اور پورے اسکول کا نگراں، جامعہ کے کاموں کا ترجمان، بڑے سے بڑے

جلسے کا صدر اور ایسے بہت سے کاموں میں برائے نام یا برائے معائنہ، نہیں پوری لگن اور احساس ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے اور ابھرنے کے مواقع متواتر فراہم کیے جاتے ہوں وہاں بچے کی شخصیت کے ہر پہلو کی نشوونما کے لیے کتنا وسیع میدان موجود ہوگا۔ حرفے، پروجیکٹ طریقۂ تعلیم، کھلی ہوا کے ایک ایک ہفتے کے تبدر سے، جامعہ اسکاؤٹنگ کے تحت کافی طویل عرصے کے کیمپ، گندی بستیوں میں گھومنے اور تعلیم بالغان اور دوسرے سماجی کاموں میں شروع سے ہی شامل کر کے بچے کو اپنے سماج کی حالت سے پوری طرح آشنا کر دینے کا کام بھی تعلیم کا ایک جزو تھا، جس سے ہندوستانی تہذیب سے واقفیت کے ساتھ ایک مضبوط ذہن بھی بنتا تھا۔ اور ان تمام تحریکوں اور منصوبوں کے محرک، روح رواں اور مثالی کردار خود ڈاکٹر ذاکر حسین تھے اور اُن کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سیارے تھے جنھیں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، شفیق الرحمٰن قدوائی، حافظ فیاض احمد اور دوسرے بہت سے بے لوث کارکنوں کے ناموں سے جانا جاتا تھا۔

اب حیرت ہوتی ہے کہ ایسی مفلسی، ناساعد حالات، سرکاری اور سماجی مخالفتوں کے باوجود یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا تھا جواب ذرائع کی فراوانی میں بھی نہیں ہو پاتا۔ بہر طور یقین اس لیے آتا ہے کہ ہم خود اس کے شاہد بھی تھے اور ایک متحرک کردار کی حیثیت میں اس میں شریک بھی۔

جیسا میں نے کہا میں ایک تصوراتی نقشہ لے کر جامعہ میں داخل ہوا تھا مگر کچھ دن بعد اس دور کی جامعہ کے تمام کاموں پر ذرا گہری نگاہ ڈالی تو اس سے بڑی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ ذاکر صاحب کا میدان عمل اور اُن کے تصورات اور منصوبے صرف اچھے اسکولوں کے ایک سلسلے تک ہی محدود نہیں تھے۔ یہ کام تو ان کے پورے منصوبے کا صرف ایک جزو تھا اور یقیناً اس کل کا ایک اہم جزو۔ مگر اس کل میں فی الحقیقت پورا سماج، اس کے تمام پہلو اور معاشرے کی تشکیل کرنے والے تمام چھوٹے بڑے عنصر شامل تھے۔ میرے خیال میں وہ ایک آزاد، حساس، باشعور اور ذمے دار معاشرے کی تشکیل کا ایک مکمل منصوبہ بنا کر کھڑے ہوئے تھے اور اس کے ہر پہلو کے لیے بنیادی یا نمونے کے کاموں کی ابتدا کر دینا ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا جسے وہ ۱۹۲۰ء (جامعہ کے قیام) سے اپنے انتقال کے وقت تک ہر لمحے پورا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

جامعہ نے اپنے ابتدائی سالوں میں ہی تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا۔ کچھ سال بعد مکتبہ جامعہ کے نام سے یہ اردو میں بڑوں اور بچوں کی بہترین معیاری کتابیں شائع کرنے کا مضبوط ادارہ بن گیا۔ اس کے توسط سے صحت مند ادب اور ترقی پسند مواد شائع کر کے ہندوستان میں ابھرتے ہوئے پڑھے لکھے ذہن کی تربیت منظور تھی اور اس کام کو اس نے عوامی سطح پر اچھے بڑے ہر دور میں انجام دیا۔ ذاکر صاحب کو مکتبے کے کاموں سے بے حد دلچسپی تھی خصوصاً رسالہ پیام تعلیم اور دل چسپ کتابوں کے ذریعے بچوں کے ادب کی تو انھوں نے ایسی رہنمائی کی کہ اس میں ایک نئی جان پڑ گئی۔

ذہنی اعتبار سے اس سے بھی اعلیٰ دانشوری سطح کے ذہنوں کی تربیت اور رہنمائی کے لیے . . . . جامعہ کا ایک اور شعبہ اردو اکادمی تھا جس کے تحت بے حد سنجیدہ ادبی، علمی، سیاسی اور ثقافتی نشستیں، سیمنار اور جلسے منعقد ہوئے اور ان میں ملک اور بیرون ملک کے مختلف میدانوں کے ماہرین لکچر دیتے تھے۔ اسی ادارے سے ایک اعلیٰ معیاری رسالہ 'جامعہ' نکلتا تھا جو اپنے سنجیدہ علمی اور ثقافتی معیاری مضامین کے لیے ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ ذاکر صاحب اس ادارے کی کارروائی میں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب اور دوسرے کارکنوں کے ساتھ رہنمایانہ انداز میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس ادارے کے تحت منعقدہ جلسوں میں جن لوگوں نے لکچر دیے ان میں ترکی کی مشہور رہنما خالدہ ادیب خانم اور ڈاکٹر محمد اقبال جیسے افراد کے نام نظر آتے ہیں۔

جامعہ کے مقاصد میں مسلمان معاشرے میں بالخصوص، اور عام ہندوستانیوں میں بالعموم، سیاسی سوجھ بوجھ، سماجی شعور، اور اپنے دور کی غیر ملکی حکومت اور مغربی تہذیب و تمدن کے مقابلے میں ایک آزاد ذہن پیدا کرنے کا مقصد شامل تھا جسے ابھارنے کے لیے ذاکر صاحب نے ہر موقع کو استعمال کیا۔ مثال کے طور پر ایک ظاہری مسئلہ تھا جامعہ کے لیے مالیت کی فراہمی کا۔ جب ہندوستان کے متمول طبقے اور راجوں نوابوں نے حکومت مخالف جامعہ کے طرز فکر سے ڈر کر جامعہ کو مالی امداد دینے سے ہاتھ کھینچ لیا تو ذاکر صاحب نے شفیق الرحمن صاحب کی کارکردگی میں ایک مہم 'ہمدردانِ جامعہ' کی شروع کی۔ اس کا بنیادی مقصد تو معمولی آمدنی والے لوگوں، یعنی عوام، سے جامعہ کے لیے ماہانہ چندہ حاصل کرنا تھا لیکن اس ادارے نے بھی جامعہ کی ذہن کے متوازی سوچنے والوں کا ایک بہت بڑا گروپ بنا لیا۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے جامعہ کی پچیس[۲۵] سالہ جوبلی (۱۹۴۶ء) کے موقع پر کہا تھا کہ یہ ہزاروں لوگ جو جامعہ کو ہر ماہ معمولی چندہ دیتے ہیں اس سے ہمارے کام کی عوام میں مقبولیت اور ان کے اطمینان کا اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ عوامی ذہن کی تشکیل کا انوکھا طریقہ تھا۔

معاشرے کے ذہن کی تشکیل اور اس میں قومی شعور پیدا کرنے کی سب سے مثالی کوشش جامعہ کا شعبہ 'تعلیم و ترقی' تھا جس کا بنیادی مقصد ہی عوام سے رابطہ اور ان کی ذہنی تربیت تھا۔ جس وقت میں نے جامعہ کے کاموں کو گہرائی سے دیکھا۔ اس وقت تک دہلی میں جامعہ کے تمام تعلیمی شعبے قرول باغ سے اوکھلا منتقل ہو چکے تھے قرول باغ کے علاقے میں بچوں کے اسکول کو 'تعلیمی مرکز ۱' کا نام دیا گیا تھا جو چھوٹی جماعت کا غیر اقامتی اسکول تھا اور جامعہ کی تمام خصوصیات کے ساتھ شہر کے بچوں کے لیے کام کر رہا تھا۔ مگر تعلیمی مرکز ۲ کو دیکھ کر اور اس کے کاموں کو سمجھ کر احساس ہوا کہ یہ سماج

میں نیا ذہن پیدا کرنے کے کتنے اہم کام کی طرف ایک ٹھوس قدم تھا۔ اس کے تحت تعلیم بالغان کی مہم کی ابتدا ہوئی تھی اور نئے بالغ پڑھے لکھوں کے لیے ان کے ماحول کے مطابق چھوٹے چھوٹے عام پیشوں، تہواروں، عقیدوں، رسم و رواج اور جدید زندگی کے اداروں وغیرہ پر جدید انداز میں بہت سی کتابیں چھپوائی گئی تھیں جو انھیں پڑھنے کی مشق کے علاوہ انھیں ان کے دور کی زندگی کے مسائل سے بھی روشناس کرتی تھیں۔ کارخانے کے مزدوروں، دستکاروں، اَن پڑھ پیشہ وروں، تانگے والوں کے لیے رات کی کلاسیں، لائبریری، اور دلچسپ اور کارآمد گفتگو کی نشستیں ہوتی تھیں جن میں یہ سب لوگ بڑی دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ ایک دیواری اخبار نکلتا تھا جس میں تصویروں اور موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ اہم خبریں اور موجودہ حالات پر ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق ہلکے پھلکے مضمون ہوتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ اپنے ملک کی حیثیت اور عظمت کا احساس پیدا کرنے کے لیے وہاں ہندوستان کا ایک نقشہ لگا ہوا تھا جس میں برصغیر میں روس کو چھوڑ کر یورپ کے سارے ملک سمائے ہوئے دکھائے گئے تھے اسے دیکھ کر سیدھے سادے لوگوں پر بڑا گہرا اثر ہوتا تھا۔ مہینے میں ایک یا دو بار ان کے اپنے پروگرام جلسے کھیل کود کے مقابلے، ڈرامے وغیرہ ہوتے تھے غرض پورے قرول باغ اور شہر کے کئی علاقوں میں عوام کے نچلے طبقے میں ایک مستقل ہلچل اور متحرک سماج کا ماحول بنا رہتا تھا شفیق صاحب کی ہر دل عزیز شخصیت اور بھرپور دلچسپی اور وقتاً فوقتاً ذاکر صاحب کی شرکت سے یہاں کی عوام میں اپنی وقعت اور اہمیت کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔

عوام سے اس قریبی رابطے اور ہمدردانہ رشتے کے مثبت اثرات خاصے واضح طور پر ۱۹۴۷ء کے انتہائی جارحانہ دور اور اس کے بعد تھوڑے عرصے میں محسوس بھی ہوئے۔ ناگفتہ بہ حالات کی سنگینی سے مجبور ہو کر سماج کا یہ طبقہ جامعہ کے ان اداروں اور اپنے ساتھیوں کو قرول باغ میں روک تو نہ سکا، مگر جامعہ کے سب کارکن صحیح سلامت وہاں سے نکل ضرور آئے، اور ان حالات میں یہ بھی ایک معجزے سے کم بات نہ تھی۔ پھر چند سال بعد جب دہلی اسٹیٹ کا پہلا الیکشن ہوا تو دہلی کے بالکل بدلے ہوئے اور فرقہ واریت سے مسموم ماحول میں دہلی کے عوام نے شفیق الرحمٰن قدوائی کو ان کی غیر موجودگی میں کامیاب کیا۔

چونکہ سماج کے ذہن کی تبدیلی ذاکر صاحب اور جامعہ کے بنیادی مقاصد میں ایک اہم مقصد تھی، جس کا ذکر ذاکر صاحب کی متعدد تقریروں، خصوصاً تعلیمی خطبات اور ریڈیو سے نشر ہونے والی تقریروں میں جگہ جگہ مل جاتا ہے، اس لیے وہ ہر موقع پر اس پر

عمل کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے ڈاکٹر صاحب سُنّی مجلس اوقاف کے سربراہ ہو گئے جس کے تحت دہلی میں ایک یتیم خانہ بھی چلتا تھا۔ ذاکر صاحب جو یتیمی کے درد و کرب اور نفسیات سے بذات خود گزر چکے تھے، انھوں نے اس یتیم خانے کے سلسلے میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جو اُس وقت تو انقلاب سے کم نہیں تصور کی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے اس کے نام سے 'یتیم خانے کے اس سیاہ داغ کو ـــ جو ہر لمحے بچے کو اس کی محرومی کا احساس دلاتا رہتا تھا ـــ بدل کر 'بچوں کا گھر' کر دیا۔ 'بچوں کے گھر' کے قوانین میں بچوں کا چندہ جمع کرنا، لوگوں کے گھر جا کر کھانا کھانا، اور ایسی بہت سی حقارت آمیز باتیں ممنوع قرار دے دی گئیں اور بچوں کے لباس، رکھ رکھاؤ اور ان کی روزانہ زندگی کو عام ہوسٹل کی زندگی میں بدل دیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں دہلی سے بے گھر ہوئے لوگوں کے لیے جب ہمایوں کے مقبرے اور پرانے قلعے میں حفاظتی کیمپ بنایا گیا تو ان بے سہارا اور پریشاں حال لوگوں کی خدمت کے لیے جامعہ کے ہی وہ نوجوان نکلے جنھیں خود پوری طرح یہ یقین نہیں تھا کہ خود جامعہ کی عمارتیں کب چھن جائیں گی۔ میں خود چونکہ ان خدمت گاروں میں شامل تھا اس لیے مجھے معلوم ہے کہ ذاکر صاحب اس دور میں خود کتنے منہمک تھے اور ان کے ان کاموں کے سرپرست ہونے کے احساس سے ہمیں کتنی ڈھارس رہتی تھی۔ پھر اسی دور کے ایسے بچے جن کے ماں باپ کیا خاندان تک کا پتہ نہ تھا، ذاکر صاحب نے انھیں بھی جمع کیا اور کچھ کو خود اپنے گھر میں پالا اور کچھ کی پرورش کو اپنے ساتھیوں کے سپرد کیا اور آخر میں ان کی ذمہ داری جامعہ کو سونپ دی۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں دوسرے حصے سے آئے ہوئے بے سہارا لوگ' جو 'رفیوجی' کہلاتے تھے، جب جامعہ کے علاقے کے آس پاس سکونت پذیر ہوئے تو ذاکر صاحب نے بڑھ کر ان کی تعلیم، انھیں جامعہ میں لانے لے جانے، کتابوں اور دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا اور استادوں کے مدرسے میں اس کے لیے باقاعدہ ایک پروگرام چلایا گیا۔ فرید آباد میں سرحدی علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کو جب فرید آباد میں بسانے کا منصوبہ طے پایا تو ذاکر صاحب جامعہ کے طالب علموں اور کارکنوں کا گروپ لے کر خود وہاں پہنچے اور کئی دن ان کے کیمپ کو لگوانے اور انھیں زندگی کی سہولتیں فراہم کرنے میں مدد کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کام انسانی ہمدردی کے جذبے کے ساتھ اپنے ساتھی کارکنوں اور خود ان لوگوں کی ذہن سازی کا عمل تھا جن کے لیے یہ کام کیے جا رہے تھے۔

ان ہنگاموں کے بعد شہر میں فرقہ واریت کے ذہن اور اس کی تحریکوں کے زہر کو زائل کرنے کا کام بہت ضروری تھا۔ جامعہ کمزور ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ تو نہ کر سکی مگر سب سے پہلے ایک انتہائی حساس علاقے۔ باڑہ ہندو راؤ اور قرول باغ کی سرحد پر۔ بہت جلدی ایک ایسا چھوٹا سا اسکول کھول لیا جس میں ہندو، مسلم، سکھ بچے بلا کھٹکے آتے تھے، پڑھتے تھے، کھیلتے کودتے تھے، لڑتے جھگڑتے تھے اور انسانوں کی طرح ساتھ رہتے تھے۔ اس بات کو اس دور کے واقف کار انہونی اور معجزے سے کم نہیں سمجھیں گے۔

یہ اسکول شفیق میموریل اسکول کے نام سے انہی خصوصیات کے ساتھ آج بھی موجود ہے اور جانکار لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ ذاکر صاحب اور شفیق صاحب نے اس کے قیام میں کتنی دلچسپی لی تھی اور شفیق صاحب کے انتقال کے بعد بعض بعض موقعوں پر ذاکر صاحب نے ذاتی طور پر اس کی کتنی مدد کی تھی۔ پھر یہ سلسلہ اس علاقے سے آگے بڑھا اور شہر کے اور کئی علاقوں میں بچوں کے کلبوں اور نوجوان کلبوں کی تنظیم میں تبدیل ہوا۔ بچوں کا کام آگے بڑھ کر بچوں کی ایک بہت بڑی کانفرنس اور بچوں کی برادری کی شکل میں ظاہر ہوا چونکہ ان تمام کاموں میں میں خود ایک متحرک کردار کی حیثیت سے شامل تھا اس لیے پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں شفیق صاحب کا عمل اور ذاکر صاحب کی روح ہماری رہنما تھی۔ ان کاموں سے دہلی کے بہت سے علاقوں میں ایکتا، محبت اور آپسی میل جول کی فضا بنانے میں کتنی مدد ملی۔

ذاکر صاحب کے ذہن میں دیہی علاقوں میں لوگوں کی زندگی کی پریشانیوں اور ان میں کام کرنے کی خواہش بہت پہلے سے نظر آتی ہے اور یوں بھی بنیادی تعلیم کے تصور کے رہنما کی حیثیت سے ان کا تعلق سب سے زیادہ دیہات سے ہی ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے بہت پہلے سے اس طرف بھی توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ دہلی کے گاؤں میں سماجی کاموں، تعلیم و تربیت، امور عامہ کی جانکاری اور سماجی شعور پیدا کرنے کی غرض سے جامعہ کے رضا کار گروپ برابر جاتے رہتے تھے۔ اوکھلا گاؤں میں بہت پہلے ایک ماڈل اسکول قائم کر دیا گیا تھا اور جامعہ کے آس پڑوس کے لوگ جامعہ کو بڑی اپنائیت اور محبت سے دیکھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھی تعلیم و ترقی نے ایک عرصے تک اس کام کو جاری رکھا۔

بہر طور اب احساس ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے ذہن سازی اور سماجی شعور کی نشو و نما کے اپنے فریضے کو اپنی زندگی کے کسی دور اور کسی رُخ میں فراموش نہیں کیا۔ اس دور کے ان طالب علموں سے جو ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تھے جب گفتگو ہوتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ طالب علموں میں ایک نیا ذہن، احساس ذمہ داری، خود اعتمادی اور آزاد ملک کے تقاضوں کو پورا کرنے والا کردار تعمیر کرنا چاہتے

تھے اور اس کے لیے خلوت و جلوت، تقریر و تحریر کسی موقعے کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔
آج اپنے ذاتی مشاہدے، زندگی کے تجربات، اور ذاکر صاحب کے ساتھ کام کرنے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، ذاکر صاحب اور ایسے ہی کچھ رہنما اس آزاد ہندوستان کی تشکیل نو میں سماج کے ذہن کی تعمیر کو ایک بنیادی یا اولین فرض تصور کرتے تھے اور ان میں سے ہر شخص نے جس میدان میں بھی وہ سرگرم عمل تھا، اس فرض کو ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ چونکہ براہ راست سیاست سے ذاکر صاحب کا تعلق نہیں رہا اور وہ خود کو ہمیشہ ایک 'معلم' کہہ کر ہی فخر محسوس کرتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے معاشرے کے معلم کی حیثیت سے بچوں، بزرگوں، تعلیم یافتہ اور دانشوروں کم پڑھے لکھوں، ان پڑھوں، شہریوں، دیہاتیوں، غرض معاشرے کے ہر طبقے میں اپنے تصورات و عمل سے اثرانداز ہونے کی کوشش کی۔

راج موہن گاندھی

انھوں نے ہندوستان کو تلاش کیا، اسے وقار دلایا
اور
اس کی مسیحائی کی

۱۹۲۵ء میں برلن میں ذاکر حسین کا ایک راز مجیب صاحب سے گفتگو کے دوران مجھ پر افشا ہوا:

" ۱۹۲۵ء کے اوائل میں ایک روز جامعہ ملیہ کے بارے میں ذاکر حسین، عابد حسین اور میرے درمیان ایک بہت سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی۔ دورانِ گفتگو ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا کہ انھوں نے جامعہ ملیہ میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے بھی پیش کش کر دی۔ میں نے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ نہیں تم کو نہیں کرنا چاہیے۔ جامعہ ملیہ تمہارے لیے مناسب جگہ نہیں ہے۔ میرے پوچھنے پر کہ کیوں جب آپ لوگوں کے لیے ہے تو میرے لیے مناسب کیوں نہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے۔ میں بھی سختی سے اپنی بات پر اڑا رہا کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔ اس پر انھوں نے کہا " دیکھو! اگر میں تم کو دہلی اسٹیشن پر اتار کر ایک کھلے میدان میں لے جا کر کھڑا کر دوں اور کہوں کہ یہ جامعہ ملیہ ہے، تم کیا کہو گے؟"

" میں بھی یہی کہوں گا کہ ہاں یہ جامعہ ملیہ ہے" انھوں نے بے اختیار مجھے گلے سے لگالیا اور کہا کہ "بہت خوب! تم بھی بخوشی ہم میں شامل ہو جاؤ"۔

اس طرح، ذاکر حسین جن کی عمر ۲۸ سال تھی اور جو اٹاوہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کام کر رہے تھے انھوں نے آگے بڑھنے کا اعلان کر دیا۔

پانچ سال قبل علی گڑھ میں جب ذاکر صاحب ایک استاد تھے اور ساتھ ساتھ قانون اور ایم۔ اے کے طالب علم بھی تھے۔ انھوں نے مدرسی سے استعفیٰ دیدیا اور اپنے وظیفہ سے بھی دستبردار ہو گئے۔ یہ گاندھی اور علی برادران کی آواز کا جواب تھا کہ کیا علی گڑھ کے اساتذہ اور طالب علم امدادی اداروں میں رہنا پسند کریں گے؟"

جو لوگ ذاکر صاحب کو کریم النفس اور مشفق انسان کے طور پر جانتے ہیں اور یہ بھی

جانتے ہیں کہ یہ "ایک لاچلو رسے" کا بہادر معلم اور طالب علم ۲۵ ـ ۱۹۲۰ء میں اپنے چند رفقاد کے ساتھ علم و فاداری سے کر ایک انجانے مگر سوچے سمجھے سفر پر روانہ ہوا اور اس طرح "جامعہ ملیہ اسلامیہ"، وجود میں آئی۔ ۱۹۶۹ء میں صدر ہند کی حیثیت سے راشٹرپتی بھون میں انتقال ہوا، یہ وہی انسان تھا جسے ہم ذاکر حسین کے نام سے جانتے ہیں۔

بارہ سال پہلے جب میں نے تفصیل سے ذاکر حسین کی زندگی کا جائزہ لیا مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ہندوستان نے ان کے دل میں گھر کر لیا تھا جس میں ہند کی محبت کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم دونوں بھی رس بس گئے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے گاندھی اور علی برادران کی آواز پر سب سے پہلے لبیک کہا۔ کچھ اور ممتاز شخصیتوں نے بھی اس تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ مسلمانوں نے لوگوں میں ہندو مسلم دوستی کا احساس بیدار کیا جس میں ذاکر حسین کا بہت بڑا حصہ تھا۔ انھوں نے ہندوستان کو اپنا گھر سمجھا اور ہندوؤں کو اپنا ساتھی۔

ذاکر حسین میں صبر و برداشت کا مادّہ بہت کم تھا بچپن ہی سے۔ انھوں نے اپنی عادت کو بدلا اور درگزر و برداشت کا مادّہ پیدا کیا۔ وہ بڑی سے بڑی اشتعال انگیز اور جھنجھلاہٹ آمیز باتوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔

مجیب کے مطابق خود داری ذاکر صاحب کی فطرت کا ایک حصہ تھی۔ وہ قائم گنج یو.پی کے پٹھان تھے۔ دور ماضی میں پٹھانوں نے بجائے زور و دولت حاصل کرنے کے پیش دستی سے کام لیا کرتے تھے۔ چنانچہ ذاکر حسین کے دادا، غلام حسین خاں نے ایک آدمی کو محض اس بات پر چھرا مار دیا کہ وہ ان کی تنبیہ کے باوجود ان کے تالاب کا پانی استعمال کیا کرتا تھا۔

شائستہ، باشعور اور خوش شکل نوجوان ڈاکٹر ذاکر حسین اسلام اور ہندوستان دونوں ہی کے لیے قابلِ فخر تھا۔ دوران تعلیم اور سیکڑوں نوجوانوں کی طرح ذاکر حسین اٹاوہ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے اور مڈل کلاس کے طالبِ علم تھے۔ ۱۳ - ۱۹۱۱ء کے درمیان "طرابلس بلقان تنازع"، نے سر اٹھایا تھا جب یوروپ نے دنیا کے واحد مسلم خود مختار ملک ترکی پر حملہ کیا تھا۔ وہاں کے حالات نے نوجوان ذاکر حسین کو بہت متاثر کیا۔ یہ نوجوان اٹاوہ اسٹیشن پر لکھنؤ کے روزنامہ اخبار "پانیر" کا انتظار کیا کرتا تھا اور اپنے دوستوں کو ترکی میں درپیش حالات کی تفصیل بتاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ مسجد میں بعد نماز لوگوں کو ترکی میں درپیش واقعات اور کیفیات کے بارے میں بتاتا تھا۔

اسلام سے دیوانگی تک عشق اور وفاداری کے ساتھ ساتھ ذاکر حسین ہندوستان

کے یے بھی جلتے کڑھتے تھے اور گھٹن محسوس کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے شروع ہی سے ان کے دل میں ہندوؤں کے یے عزت کا جذبہ پیدا ہوا اور دوسروں میں اسی جذبۂ ادب واحترام کو بیدار کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ مسلمانوں کے حقوق اور ان کی شناخت کے یے آواز بلند کی۔ اسی طرح ہندوؤں کے حقوق کے یے بھی لڑائی لڑی۔

۱۹۶۷ء میں جب وہ ہندوستان کے صدر منتخب ہوئے تو نہ صرف یہ کہ وہ راج گھاٹ پر خراجِ عقیدت پیش کرنے گئے بلکہ خود ان کے الفاظ ہیں:

"میں ایک بار پھر اپنے آپ کو اس عظیم انسان کی نذر کرتا ہوں جس نے سب سے پہلے مجھے اپنے دیش کے لوگوں کے یے اپنے آپ کو وقف کر دینے کا راستہ دکھایا تھا۔"

انھوں نے ایک بار پھر یاد دلایا کہ مہاتما نے بالخصوص "ہندو" لفظ کا استعمال کیا تھا کہ ہمارا سماجی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیے کہ پسماندہ لوگ ابھر کر سامنے آئیں۔ درپردہ ایسا لگتا تھا کہ اسلامی طریقوں اور عقائد سے ہٹ کر وہ ہندوؤں کی موافقت کر رہے تھے۔ اس بات پر ڈاکٹر ذاکر حسین بہت رنجیدہ ہوئے تھے گو کہ ان کا ضمیر صاف تھا اور ان کو کسی بات کی ندامت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ "رام راج" گاندھی جی ہمیشہ سماجی بہتری کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ صدرِ ہند کا عہدہ سنبھالنے کے بعد بھی وہ بہت کچھ چاہتے تھے۔ ان کو "غیر ہندو" سپورٹ کی ضرورت نہیں تھی بلکہ انھوں نے رام راج ہی کی بات کی۔ ان کی خواہش تھی اور کوشش بھی کہ ہندو مسلم ایک ہوں "صرف ہندوستانی"، محض اس یے نہیں کہ وہ صدر جمہوریہ بن گئے تھے بلکہ انھوں نے ایسا چاہا بھی تھا۔ خود ان کے الفاظ ہیں کہ جب ان کو یہ اعزاز بخشا گیا تو ان کا تصور مجموعی سماج یا تہذیب سے تھا۔

ایک مسلسل چپقلش ہندو مسلم کے درمیان جاری تھی کہ مسلم اپنی جگہ پر سوچتے تھے کہ وہ بہت تکلیف میں ہیں "وہ" "ہمیں" نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ خیال ان کے ذہنوں کو مشتعل کرتا تھا کہ "وہ" بھی "ان کو" دکھ پہنچا چکے ہیں۔

موجودہ دور میں یہ بات خاصی مشکل سے تسلیم کی جائے گی لیکن درحقیقت ذاکر حسین کی زندگی اور مقاصد ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کی فلاح وبہبودی کے یے وقف تھی۔ کچھ مسلمانوں نے ذاکر حسین پر نکتہ چینی کی کہ "رام راج" یک طرفہ ہونا چاہیے۔ اعتدال کا رخ مسلمانوں کی نظر میں نہایت ہتک آمیز ہے۔ جس کی مثال یہ دی کہ ایک ہندو ریلوے آفیسر کے توہین اور جان لیوا برتاؤ کرنے پر ایک مسلم ملازم نے ذاکر حسین کی جان بچائی۔

مجیب نے بتایا کہ ۱۹۴۶ء میں نو ماہ قبل جامعہ ملیہ کے جشن سیمیں پر وائس چانسلر کی حیثیت سے ذاکر حسین نے ایک بہت ہی جذباتی، پر سوز اور خوب صورت تقریر سے مجمع

کو بہت متاثر کیا تھا، اسٹیج پر بیٹھے ہوئے نہرو، آزاد اور لیاقت بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔
اگست ۱۹۴۶ء میں کلکتے میں زبردست قتل و غارت ہوئے اور ابھی ۱۹۴۷ء میں اور بھی ہونا باقی تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ اس وقت کے وائسرائے Wavell کے ماتحت تھے۔ ذاکر حسین بذات خود کانگریسی نمائندے تھے۔ لیکن جناح نے Wavell کو بتایا ذاکر حسین محض ایک کٹھ پتلی ہے، وہ کسی بھی طرح سے کانگریس کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ جو انداز گفتگو جناح نے ذاکر حسین کے لیے اختیار کیا وہ ۱۹۷۳ء میں چار سال بعد، چھپی کتاب میں ذاکر حسین کے انتقال کے بعد سامنے آئے۔

لیکن ذاکر حسین ۱۹۴۲ء میں ہی جانتے تھے کہ عارضی حکومت میں ان کی شمولیت پر پابندی لگادی گئی ہے۔ ذاکر حسین نے نہرو، آزاد اور لیاقت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:
"آپ سب سیاسی آسمان کے جگمگاتے ستارے ہیں اور سارے دلوں میں آپ کی محبت ہے۔ آپ حضرات کی موجودگی میں اپنے شدید دکھ اور جذبات کا اظہار کرتے ہوئے آپ سے رخصت چاہتا ہوں تاکہ میں تعلیم و تدریس کے کاموں میں مصروف ہو جاؤں ایک دوسرے سے نفرت کی آگ ہمارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے، ایسے میں ہمارا کوئی بھی کام محض پاگل پن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہم اپنی تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے جب کہ ہمارے چاروں طرف ایک پاگل پن پھیلا ہوا ہے۔ یہ تلخ الفاظ بلکہ ان سے بھی زیادہ تلخ الفاظ کم ہیں اس صورت حال کے لیے جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی پراگندگی کو دور کر سکیں۔
خدا کے واسطے! اپنے منتشر دماغوں کو یکجا کر کے یکسوئی سے کام لیجئے اور چار سمت پھیلی نفرت کی آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت چھان بین اور نکتہ چینی کا نہیں یہ وقت ہے نفرت کی پھیلتی آگ کو بجھانے کا، اور مزید پھیلنے سے بچانے کا یہ شعلے نہیں اور نہ ہوا پکڑلیں۔"
یہ الفاظ جو شدت جذبات رکھتے ہیں؛ الفاظ جو تنبیہ کرتے ہیں اور دل کی گہرائیوں کی التجا کرتے ہیں —— مگر ان الفاظ کا تعلق قطعی طور پر اپنی نامنظوری کو یاد کرنا نہیں تھا۔ حالانکہ یہ الفاظ ۱۹۴۷ء کے شرمناک واقعات کو تو نہیں روک سکے مگر یقیناً اپنے معنی نہیں کھو سکے تھے۔

دوران صدارت کا ایک ناقابل فراموش واقعہ آج بھی یاد ہے۔ ۱۹۶۷ء کے آخر میں پٹیالہ میں پنجاب یونیورسٹی میں ان کو گرو گووند سنگھ بھون کا سنگ بنیاد رکھنا تھا اس موقع پر وہ کیسے خطاب کریں؟ وہ خود اور سامعین دونوں سمجھتے تھے کہ ایک مسلمان کو سکھوں سے مخاطب ہونا ہے۔ سامعین اور دیگر مقررین دونوں کے دلوں میں سکھ مسلم تشدد کے زخم تازہ تھے۔ ذاکر حسین نہیں بھولے تھے کہ گرو گووند سنگھ ایک مسلمان کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے، ان کے والد اور بیٹے بھی ایک مسلمان بادشاہ

کے اشارے پر مار ڈالے گئے تھے۔ ذاکر حسین تقریر کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھی تھی کہ ان کی جان ۱۹۴۷ء میں ایک سکھ نے بچائی تھی اور غالباً اپنی بیٹی ریحانہ اور اپنے کچھ بھائیوں کی قبل از وقت موت سے متاثر ہو کر انھوں نے تقریر کی۔ شدت جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور سامعین بھی جذباتی ہو گئے۔ دوران تقریر انھوں نے کہا:

"گرو گووند سنگھ کی پوری زندگی ایک داستان ہے قربانی کی، محنت کی، تعلیمی جدوجہد کی، سپاہیانہ فراست کی، بے مثل شجاعت کی، شدید شفقت، مہربانی اور بے مثال محبت کی۔ ان ساری خوبیوں کے پیچھے، جدوجہد، تکلیفیں اور دکھ چھپے ہیں جو دلوں کو ہلا کر رکھ دیں۔ یہ کہانی —— یہ بات صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ اللہ کے اس نیک بندے کی زندگی ایک مقدس خوب صورت اور عظیم زندگی ہے جو سستے داموں میں نہیں خریدی جاسکتی۔

"وہ کیا چیز تھی جو یہ عظیم انسان بھگوان کو بھینٹ کرنے کو لایا؟ اپنا نذرانہ نہیں اپنے جان سے زیادہ عزیزوں کا نذرانہ! ان کے والد! جوان کی آنکھوں کی روشنی تھے! اپنے پیارے بیٹوں کا نذرانہ جو نڈر اور بہادر رفیق تھے —— یہ سب نذر کر دیئے۔"

دل کی گہرائیوں سے نکلے یہ پُر سوز الفاظ، جن میں درد بھی چھپا تھا اور تاریخ نے جو گھاؤ ڈالے تھے ان پر مرہم بھی تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے مختصر دوران صدارت راشٹرپتی بھون کے پھول خوب صورت ترین ہوا کرتے تھے ہم سر سبز لانوں، خوشنما پھولوں کے بغیر ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی نظر بین الاقوامی حالات پر بھی تھی۔ اپنی ہنگری اور یوگوسلاویہ کے سفر کے بعد انھوں نے تیس سال قبل درگا داس سے کہا تھا:

"ان ملکوں میں تبدیلی آرہی ہے۔ تبدیلی کی ہوائیں بڑی تیزی سے چل رہی ہیں اور تیزی سے ان دونوں ممالک میں تبدیلی آرہی ہے۔ گوکہ وہ لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ آنے والی تبدیلی کس وضع کی ہوگی؟ اشتراکی حل اور مسائل کیا ہوں گے کسی کو اس کی پرواہ بھی نہیں۔ لیکن یہاں —— یہاں اپنے ملک میں صرف نعرے بازی کرتے ہیں اور بس۔"

جب وہ نائب صدر جمہوریہ تھے (۱۹۶۷ء) اور پھر صدر ہند ہو گئے۔ اس دوران چند مواقع پر مجھے ان سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ ہر بار میرا گرمجوشی سے استقبال ہوا۔ لیکن ہمیشہ میں ایک ایسا تاثر لے کر آیا کہ اتنا بڑا اعزاز پانے کے بعد بھی وہ بہت اداس تھے کہ جو قومی تحریک انھوں نے اور دوسرے رفقا نے شروع کی تھی۔ (۱۹۲۰ء) وہ تکمیل تک نہیں پہنچ پائی ہے۔ اپنی قوم اور ملک کے لیے یہ جذبۂ ہمدردی اور محبت ہی ان کی عظیم شخصیت کی پہچان ہے۔

رفیق ذکریا

ہندوستان کی سیاست میں ذاکر صاحب کا رول

اردو کے مشہور مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر صاحب کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ ان کی کتاب "ہمارے ذاکر صاحب" میں انھوں نے ذاکر صاحب کے بارے میں بہت سے دل چسپ واقعات لکھے ہیں۔ ان واقعات سے اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ہمارے سابق صدر کی سیاست میں دل چسپی کے بارے میں ان میں مشکل سے ہی کوئی جھلک نظر آتی ہے۔ کیونکہ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی ذاکر صاحب نے سیاسی کاموں میں کبھی دل چسپی نہیں لی۔ درحقیقت یہ ان کی فطرت کے خلاف بات تھی، وہ تنہائی پسند تھے اور تعمیری کاموں میں دل چسپی رکھتے تھے۔ صدیقی صاحب کے بقول صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ذاکر صاحب سیاست داں نہیں تھے۔ وہ نہ کسی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور نہ ہی ان کی پالیسیوں یا پروگراموں پر عمل کرتے تھے۔ وہ قیادت کے خواہاں نہیں تھے۔ ذاکر صاحب ہمیشہ پارٹی سیاست سے بلند رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ صدیقی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ سیاسی واقعات اور سیاسی شخصیات سے قریبی طور پر جڑے بھی رہے اور بہت بار وہ مثبت اور متوازن طور پر اُن پر اثرانداز بھی ہوئے۔

ذاکر صاحب کا سیاست سے تعلق تیسری دہائی کے اوائل میں اس وقت پیدا ہوا جب وہ ایم اے او کالج کے ایک طالب علم تھے، جس کے بانی سر سید تھے اور جو آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے پہچانا گیا۔ یہ خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کا دور تھا۔ علی برادران، مولانا محمد علی اور شوکت علی گاندھی جی کے ساتھ سیاسی افق کے ابھرتے ہوئے ستارے تھے۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف پہلی ملک گیر تحریک شروع کی تھی جسے اس وقت تحریکِ خلافت اور مظالم پنجاب کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کے تحت ایک تو اس وعدہ کی خلاف ورزی پر احتجاج کیا گیا جو برطانیہ کے وزیراعظم

لارڈ جارج نے ہندوستانی مسلمانوں سے کہی تھی کہ وہ کعبہ اور عرب کے دوسرے متبرک مقامات کی حفاظت کرتے رہیں گے باوجود پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) میں ترکی کی شکست کے، عثمانی خلافت کی تحویل میں یہ بدستور رہیں گے اور دوسرے جنرل ڈائر کے ہاتھوں جلیاں والے باغ میں سیکڑوں معصوم ہندوستانیوں کے قتل عام پر۔ برطانیہ کے خلاف احتجاجی تحریک کے پروگرام کا ایک حصّہ یہ تھا کہ سرکاری مدد سے چلنے والے سارے اداروں کو طالب علم چھوڑ دیں۔ کالج کے طلبا؛ قدیم کی حیثیت سے علی برادران علی گڑھ آئے اور طالب علموں کو تیار کیا کہ وہ مادر درسگاہ کو چھوڑ دیں۔ طلبا میں غضب کا جوش تھا اور منتظمین اس کو بند کرنے کی ہر ممکن کوشش کو ناکام بنانے پر آمادہ تھے۔ ذاکر صاحب شروع میں ان واقعات سے بہت زیادہ متاثر نہیں تھے۔ وہ ایک سنجیدہ طالب علم کی طرح اپنی تعلیم کو ترک کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ انھوں نے مولانا محمد علی کی پرجوش تقریر سنی تھی مگر وہ ان کے دلائل سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے تھے، بڑے بھائی مولانا شوکت علی نے قہرالٰہی کا واسطہ دیا اور طلبا سے اپیل کی تھی کہ اسلام کے مقصد سے روگردانی نہ کریں۔ میٹنگ سے لوٹتے ہوئے ذاکر صاحب کافی الجھے ہوئے تھے، وہ رات بھر جاگتے رہے اور سوچتے رہے کہ وہ کیا کریں؟ دوسرے دن صبح وہ صدیقی صاحب کے پاس پہنچے اور کہا کہ انھوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دیں گے اور تحریک میں شامل ہو جائیں گے۔ صدیقی صاحب حیرت میں پڑ گئے۔ انھوں نے ذاکر صاحب سے کہا کہ یہ اقدام خودکشی ہے، مگر وہ نہیں مانے۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ حالانکہ میں اس سے پوری طرح متفق نہیں ہوں، مگر اس سے مفر نہیں ہے جب کہ ہمارے لاکھوں لوگ اس کو صحیح طریقہ سمجھ رہے ہیں۔ وہ لوگ اس کو کامیاب بنانے کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دے رہے ہیں۔ ایسے نازک موڑ پر اگر ہم اپنے لوگوں کے ساتھ کھڑے نہیں ہوئے تو یہ بزدلی ہوگی میں یہ نہیں چاہتا کہ آنے والی نسلیں علی گڑھ کے لڑکوں کے لیے کہیں کہ اس مقصد کے لیے قربانی دینے کا ان میں جذبہ نہیں تھا۔ جب کہ دوسرے اداروں کے طلبا اس جذبے سے سرشار تھے اور ذاکر صاحب نے کالج چھوڑ دیا اور جامعہ ملیّہ اسلامیہ آ گئے، جس کے بانیوں میں گاندھی جی اور علی برادران تھے، جو آگے چل کر اعلیٰ علوم کا پہلا قومی تعلیمی ادارہ بن گیا۔

بس یہی ان کی سیاست تھی۔ ذاکر صاحب نے بغیر کسی دکھاوے کے ان کی آواز پر لبّیک کہا اور خاموشی کے ساتھ تحریک میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے پروگرام کے اس حصّہ کو اپنایا جو ان کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا یعنی قومی تعلیم۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال اس کی خدمت میں لگا دیے اور سارے عیش و آرام کو تیاگ دیا جو ان کو آسانی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ جامعہ میں واقعی غربت کی زندگی گزارنے لگے اور

گروہوں کے درمیان کی کڑی بن سکتے تھے، مگر بدقسمتی سے وہ صحیح معنوں میں مفاہمت پیدا نہ کرا سکے۔

ذاکر صاحب نے اپنی استقبالیہ تقریر میں ان رہنماؤں سے صاف صاف کہا تھا، آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے ستارے ہیں، لاکھوں نہیں کروڑوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے ؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے ؟ بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے ؟ اس کے نئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے ؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے ؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں۔ اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں۔ آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے مسل دینا چاہتا ہے خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے تہذیب انسانی زندگی کی بنیادوں کو یوں کھونے نہ دیجیے۔"

تقسیم ملک ذاکر صاحب کے لیے ایک دھچکا تھا، انھوں نے اپنے انداز میں اس تقسیم کو روکنے کی بہت کوشش کی۔ ان کے دوست کانگریس اور لیگ دونوں میں موجود تھے۔ وہ ان لوگوں سے کہتے تھے کہ صدیوں پرانی اتحاد کی عمارت کو نہ ڈھائیں۔ لیکن وہ لوگ کوئی عملی حل تلاش نہیں کر پائے۔ ذاکر صاحب کو امید کی ایک کرن اس وقت نظر آئی جب کیبنیٹ مشن پلان کو تمام پارٹیوں نے منظور کر لیا۔ لیکن اس کے بعد کے واقعات نے ان کا دل توڑ دیا۔ انھوں نے طے کر لیا کہ وہ جامعہ سے چلے جائیں گے اور گوشہ نشین ہو کر اپنی زندگی پڑھنے لکھنے میں گزار دیں گے۔ مگر قسمت میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ وزیر اعظم نہرو نے ان سے کہا کہ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالیں۔ کیونکہ یہ علیحدگی پسند

ہندوستان جب تک آزاد نہیں ہوا وہ جامعہ ہی میں رہے۔ اس زمانے میں نہ انھوں نے کچھ مانگا اور نہ انھیں کچھ ملا۔ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی بے لوث خدمت کی اور اس کے بدلے میں انھیں نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پرواہ۔ ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ایسی چند ہی شخصیات ہوں گی جب کسی نے قربانیاں دی ہوں اور اس کے صلے میں کچھ نہ ملنے کی کبھی شکایت نہیں کی ہو۔ ذاکر صاحب کے نزدیک ایثار ان کے فرض کا ایک حصہ تھا اور اس فرض کو پورا کرنا ہی ان کے لیے اصل عبادت تھی۔ جامعہ ملیہ کی تین دہائیوں سے زیادہ بے لوث خدمات اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ اصل معنوں میں یہ سیاست نہیں تھی، لیکن اگر سیاست کے معنی حسن عمل ہے جیسا کہ جان مورے نے کہا تھا تو ہماری عوامی زندگی میں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو ذاکر صاحب کے راہبر بن سکیں۔

نظریاتی طور پر ذاکر صاحب کانگریس کے ساتھ تھے۔ جب بھی ضرورت ہوئی وہ اس کے مقاصد کا ساتھ دینے سے کبھی نہیں ہچکچائے۔ لیکن اپنے خیالات کے اظہار کا ان کا اپنا ہی انداز تھا جو اکثر بے لاگ اور آزادانہ ہوتا تھا۔ انھیں تنقید سے نفرت تھی اور کسی کا دل تو دکھانا ہی نہیں چاہتے تھے لیکن اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہتے تھے۔ ان کے مخالفین بھی تھے جب گاندھی جی کے ایما پر انھوں نے تعلیم کی وردھا اسکیم کا بیڑا اٹھایا تو انھیں تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ مسلم لیگ نے بہت سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ ذاکر صاحب کو بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے جناح صاحب سے پوچھا کہ آخر اس میں غلط بات کیا ہے؟ جناح صاحب نے اپنی سیاست کے تحت کہا "میں ہر اس چیز کی مخالفت کرتا ہوں جس کی مسٹر گاندھی موافقت کرتے ہیں"۔ اس کے باوجود بھی مسلم لیگ اور جناح کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے رہے۔ اس کا ثبوت ہے جب "کلکتہ فسادات" کے بعد، جو جناح کے "راست اقدام" کے اعلان کے نتیجے میں ہوا تھا، ۱۹۴۶ء کے ہولناک دور میں بھی ایک طرف نہرو اور آزاد اور دوسری طرف جناح اور لیاقت علی کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لانے میں وہ کامیاب ہو گئے تھے۔ یہ ایک معجزے سے کم نہیں تھا، ہر شخص حیران تھا۔ اسی قسم کی سیاست پر وہ عمل کرتے تھے۔ ان میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ مشکل سے مشکل اور آسان سے آسان موقعوں پر تضادات پر قابو پا لیتے تھے۔ ہر درد کی دوا تلاش کر لینے کی صلاحیت ان میں خدا داد تھی۔

یہ موقع جس میں چاروں رہنما جمع ہوئے تھے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی کے جشن کا تھا۔ یہ اپنی جگہ ایک تاریخی واقعہ بن گیا کہ ذاکر صاحب نے عارضی ہی سہی مگر دو مختلف سیاسی نظریوں کے حامل لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کتنے نیک انسان تھے جن پر سب بھروسہ کرتے تھے، یہاں تک کہ دو دشمن

مسلمانوں کی دانش گاہ بن گئی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سیکولر بنیاد پر اس کی قلب ماہیت وقت کی اہم ترین ضرورت تھی ذاکر صاحب اس سے انکار نہیں کرسکتے کیونکہ پہلی بات تو یہ تھی کہ ان کے دل میں نہرو کی بہت عزت تھی، دوسری بات وہ ایک چیلنج تھا جس کا مقابلہ کرنے کے لیے ان سے کہا گیا تھا۔ دل کے عارضے کے باوجود ذاکر صاحب نے آٹھ برس تک علی گڑھ کو سیکولر شکل دینے کی ان تھک کوششیں کیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ "اس کا رخ" بدلنے میں کامیاب ہوئے لیکن پوری طرح نہیں۔ انھوں نے استعفا دے دیا۔ حالانکہ ابھی کام کرنے کی مدت میں تقریبًا ڈیڑھ سال باقی تھا۔ انھوں نے نہ صرف علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ بلکہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو نصیحت کی تھی۔ ذاکر صاحب نے ان لوگوں سے کہا تھا! "اپنے عقیدے اور مخصوص دین کے احساس کے ساتھ ترقی کی طرف گامزن ہو، یہ تمہارے لیے ہندوستانی زندگی کی ایک صحت مند نشوونما، جو خدمت کے لیے ایک مزید ذمہ داری اور خصوصی موقع ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ جذبہ دھوکے بازی یا بے وفائی کا نہیں ہے۔ اس فریضہ کو عام طور پر تنگ نظر اور بے ایمان نقاد مشکل بنا دیتے ہیں۔ ہماری قومی زندگی میں مذہبی تعصب کی یادیں، ان تنگ دل لوگوں کے لیے سخت گیرانہ اور غیر ہمدردانہ غلط بیانیوں کا دروازہ کھولتی ہیں۔" انھوں نے ہندوا ور ہندوستانی پریس سے بھی کہا کہ مسلمانوں کے لیے ہر اس چیز کو بہت آسانی سے مان لیا جاتا ہے جس سے کوئی غلط مطلب نکلتا ہو۔ انھوں نے کہا کہ "میں اس جلد بازی کو سمجھ سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے مجھے ہر وہ بات کرنی چاہیے جس سے وفادار ہندوستانی مسلمان شہریوں کے متعلق غیر صحت مند رجحان پیدا نہ ہو۔ وہ اپنے ہی ملک میں غیر ملکی تصور نہیں کیے جا سکتے۔ یہ رجحان ناامیدی اور محرومی کا اعصاب شکن احساس پیدا کرتا ہے یہ نہ ان لوگوں کے لیے صحیح اور نہ ہمارے ملک کے لیے۔"

علی گڑھ چھوڑنے کے بعد نہرو چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے چیرمین بن جائیں۔ لیکن اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا آزاد نے اس عہدے کی پیش کش ڈاکٹر سی ڈی دیشمکھ کو کردی بہرحال کسی وجہ سے آزاد ذاکر صاحب کو نہیں لینا چاہتے تھے۔ مولانا اس کے بعد بھی ان کے بہار کے گورنر بنائے جانے پر بھی معترض تھے لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی اس دوری کے بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ ایک بار ہمایوں کبیر نے، جو مولانا کے قریبی لوگوں میں تھے ان دونوں کے درمیان غلط فہمی دور کرانے کی کوشش کی اور ذاکر صاحب کو رائے دی کہ وہ آزاد سے مل لیں۔ خود دار ذاکر صاحب نے جواب دیا کہ "میرے اس چھوٹے سے جھونپڑے سے مولانا کی سرکاری کوٹھی کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ مولانا کی کوٹھی سے

میرے جھونپڑے کے درمیان ہے۔" آزاد کو دوسرے مسلم رہنماؤں سے ایک طرح کی چڑ سی تھی، اس لیے یہ صرف ذاکر صاحب کے لیے ہی نہیں بلکہ علی برادران، ڈاکٹر ایم اے انصاری، حکیم اجمل خاں، سرحدی گاندھی اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب پر بھی صادق آتی تھی۔ ان میں سے کسی سے بھی آزاد کے اچھے تعلقات نہیں تھے۔

بہار کی گورنری کی مدت کامیابی کے ساتھ پوری کرنے کے بعد ذاکر صاحب کو ہندوستان کا نائب صدر منتخب کیا گیا تھا۔ نائب صدر کی حیثیت سے راجیہ سبھا کی صدارت کرنی ہوتی تھی جس کے اجلاس اکثر و بیشتر ہنگامہ خیز ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے لیے عجیب تجربہ تھا جو اکثر اعصاب شکن ہوتا تھا، اس کے باوجود ذاکر صاحب اپنی حکمت عملی اور صبر کے ساتھ اس پر قابو پا لیتے تھے۔ انھیں کبھی غصہ نہیں آتا تھا وہ ہمیشہ شائستگی اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور اپنے پُر لطف دلائل سے غلطی کرنے والوں کو شرمندہ کر دیتے تھے۔ لیکن اس کی قیمت بھی انھیں چکانی پڑتی تھی۔ ارکان میں ان کے پسندیدہ رکن اٹل بہاری واجپئی تھے۔ ان کی حسن خطابت، جادو بیانی اور رومانی رویے نے ذاکر صاحب کا دل جیت لیا تھا اور انھوں نے ایک بار کہا تھا "میں سیاست کو ناپسند کرتا ہوں لیکن اٹل جی میرے اس مرض کا علاج کر سکتے ہیں۔"

اب سب سے بڑے سیاسی خطرے کا سامنا ذاکر صاحب کو کرنا تھا۔ ساری زندگی وہ الیکشنوں سے بچتے رہے اور سیاست کے ہنگاموں سے اپنے کو الگ رکھا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ریٹائر ہونے کے بعد ہندوستان کے صدر ظاہر ہے ذاکر صاحب ہی ہو سکتے تھے، لیکن اندرا گاندھی کو بحیثیت وزیر اعظم کے اپنا اقتدار منوانا ابھی باقی تھا اس وقت درحقیقت نہ صرف حزب مخالف بلکہ خود حکمراں کانگریس کے سینیر رہنما بھی ان سے بدگمان تھے۔ اس کمزوری کی وجہ سے ان کے تجویز کردہ نام کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ جیت کے لیے ضروری ووٹوں کی تعداد میں کافی کمی آ چکی تھی کیونکہ مرکز اور ریاستوں دونوں میں کانگریس کی الیکٹورل طاقت گھٹ گئی تھی۔ کانگریس کے صدر کامراج کو خدشہ تھا کہ ایسے نازک موقع پر ایک مسلمان کو اس اعلیٰ عہدے کے لیے پیش کیا جانا خطرے کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ حزب مخالف بھی متحد ہو گئے تھے اور انھوں نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سبا راؤ کو اپنے امیدوار کی حیثیت سے پیش کیا۔ پھر بھی مسز گاندھی اپنی رائے پر اڑی رہیں۔ انھیں یقین تھا کہ ذاکر صاحب ضرور جیتیں گے کیونکہ ان کی قیادت پر ہندو اور مسلمان دونوں کو اعتبار تھا۔ انھوں نے اس الیکشن کو سیکولرزم سے ہندوستان کی وابستگی کا امتحان بنا دیا۔ وہ صحیح ثابت ہوئیں اور ذاکر صاحب بہت بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

ذاکر صاحب کا انتقال اپنی مدت کار کے وسط میں ہی ہوگیا۔ ان کی کمی نے ہندوستانی سیاست کی راہ موڑ دی، لیکن یہ ایک الگ کہانی ہے۔ جہاں تک ذاکر صاحب کی زندگی کا سوال ہے، میں جب اس پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے سینیکا کی وہ بات یاد آجاتی ہے جو اس نے حقیقی معنوں میں عظیم لوگوں کے بارے میں لکھی ہے "عظیم وہ ہے جو مٹی کے برتنوں کو ایسے استعمال کرے جیسے وہ چاندی کے ہوں اور چاندی کے برتن کو ایسے استعمال کرے، جیسے کہ وہ مٹی کے ہیں۔"

آل احمد سرور

علی گڑھ سے ذاکر صاحب کی وابستگی

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ذاکر صاحب علی گڑھ پہنچے جہاں ان کا داخلہ ایم۔اے او کالج میں ہوگیا۔ اٹاوہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ذاکر صاحب کو قائم گنج سے جانتے تھے، انھوں نے اس نوجوان میں جوہر قابل کی جھلک دیکھ لی تھی اور ان کی مشفقانہ تربیت کے فیض سے ذاکر صاحب ایک ذہین طالب علم ایک با صلاحیت مقرر اور نوجوان قائد کے طور پر ابھرے۔ پروفیسر حبیب الرحمان اسکول اور کالج میں ذاکر صاحب کے ہم جماعت تھے۔ انھوں نے اپنے خراج عقیدت میں اس زمانے کا ذکر کیا ہے جب یورپ میں بلقان کی جنگیں چل رہی تھیں۔ پروفیسر حبیب الرحمان لکھتے ہیں کہ ذاکر صاحب انھیں اور چند دوسرے دوستوں کو لے کر پابندی سے ریلوے اسٹیشن پہنچ جاتے تھے تاکہ دوپہر میں آئے ہوئے تازہ ترین اخبارات خرید سکیں۔ اسٹیشن سے یہ سب دوست اسکول پہنچتے، اور وہاں موجود طلبا کے منتظر گروپ کے سامنے وہ اخبارات پڑھے جاتے اور میدان جنگ کی تازہ ترین صورت حال سے لوگوں کو واقف کرایا جاتا۔ مغربی طاقت کے استحصال کے شکار اور جنگ کے زخمیوں کے لیے چندہ کیا جاتا۔ ایم۔اے۔او کالج میں داخلے کے بعد ان کی قائدانہ صلاحیت اور خطیبانہ مہارت کے سبب وہ اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر منتخب ہوئے جو اس زمانے میں کسی بھی طالب علم کے لیے سب سے بڑا اعزاز تھا۔ اس وقت تک طلبا یونین کا صدر کالج کا پرنسپل ہوا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب لائبریری پابندی سے جاتے تھے گو کلاس کی حاضری کے بارے میں وہ اتنے مستعد نہ تھے۔ حبیب الرحمان صاحب پڑھائی کے بارے میں زیادہ سنجیدہ اور وقت کے پابند تھے اور بی۔اے کے امتحان کی تیاری کے لیے انھوں نے تفصیلی نوٹس تیار کیے تھے۔ اپنے دوست، ذاکر صاحب پر ترس کھاتے ہوئے وہ انھیں اپنے نوٹس دے دیا کرتے تھے۔ حبیب الرحمان صاحب نے مجھ سے لطف لے کر بیان کیا کہ ذاکر صاحب نہ صرف یہ کہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے بلکہ پوری کلاس میں اوّل رہے، جب کہ خود وہ سکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے ایم۔اے (معاشیات) میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب ترکِ موالات اور خلافت تحریک شروع ہوئی اس وقت گاندھی جی اور

مولانا محمد علی نے یونیورسٹی اور کالج کے بائیکاٹ کی آواز اٹھائی۔ ڈاکٹر صاحب ایم۔اے۔او کالج میں بہ طور ٹیوٹر، خدمت انجام دے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے چند دوسرے رفقائے کار اور طلبا کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ایم۔اے۔او کالج کو خیر باد کہا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحریک میں شامل ہوگئے۔

گو مولانا محمد علی جامعہ کے بانیان میں سے تھے کچھ ہی عرصے میں ان کی دل چسپی اس ادارے سے کم ہوگئی۔ ان کے سامنے ان کا سیاسی کردار اور ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ زیادہ بڑے مقاصد میں تھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں جو بڑے قومی قائدین میں تھے، جامعہ ملیہ کے معاملات کو دیکھ رہے تھے۔ جامعہ ملیہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوگئی تھی اور قرول باغ میں کرائے کی عمارتوں میں اس کا کام چل رہا تھا۔ ذاکر صاحب اس دوران جرمنی میں زیر تعلیم تھے اور پروفیسر سومبارٹ کی نگرانی میں اپنا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھ رہے تھے۔ جب انھوں نے سنا کہ جامعہ بند کی جانے والی ہے تب انھوں نے جرمنی سے یہ پیغام بھیجا کہ ان کی واپسی کا انتظار کیا جائے اور جامعہ کے لیے اپنی خدمات کی پیش کش کی۔ ذاکر صاحب جب اپنے دوستوں سید عابد حسین اور محمد مجیب کے ہمراہ ہندوستان آئے تب انھوں نے دس بارہ اساتذہ پر مشتمل ایک بورڈ آف ٹرسٹیز کی تشکیل کی جن لوگوں نے زیادہ سے زیادہ ایک سو پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر بیس سال تک جامعہ ملیہ کی خدمت انجام دینے کا عہد کیا۔ اس طرح ذاکر صاحب کو جامعہ ملیہ کا حقیقی معمار کہا جاسکتا ہے کہ ان کی قیادت میں جامعہ ایک ایسا ممتاز قومی ادارہ بن سکی جس میں دیسی تعلیم، کردار سازی، اخلاقی اقدار اور ہندوستانی ورثے میں افتخار کے عناصر شامل تھے۔ مزید براں مغربی اقدار کی بہتر روایات کے حصول کی کوشش کے نتیجے میں جامعہ ایک ایسا ادارہ بن سکی جس نے اچھے مسلمان پیدا کیے جو بیک وقت اچھے قومی رہنما بھی بنے۔ پروفیسر ڈبلیو، سی، اسمتھ نے اپنی کتاب 'موڈرن اسلام اِن انڈیا' میں جامعہ کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کی صورت گری میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوششوں کو بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

جامعہ میں ہمہ تن مصروفیت کے باوجود ذاکر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ اور مجلس منتظمہ کے جلسوں میں شرکت کا موقع نکال لیتے تھے۔ ایم۔اے۔او کالج کو دسمبر ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں غلام محمد، جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل ہوئے، کے ساتھ ذاکر صاحب نے محمد علی جناح سے درخواست کی کہ وہ علی گڑھ کے وائس چانسلر کے منصب کے لیے کسی موزوں شخص کا نام تجویز کریں۔ جناح صاحب نے سر شاہ سلیمان کا نام تجویز کیا، جو اس وقت نو ساختہ فیڈرل کورٹ کے جج تھے۔ اور سر شاہ سلیمان اتفاق رائے سے علی گڑھ کے وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ وہ ہفتے میں ایک دن کے لیے علی گڑھ

آتے تھے پھر بھی یونیورسٹی کے لیے ان کی خدمات بے پایاں ہیں۔ شومیٔ قسمت سے چند برسوں میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ذاکر صاحب اس دوران علی گڑھ کی مجلسِ منتظمہ کے ممبر رہے۔

۱۹۴۰ سے ۱۹۴۷ تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بڑی حد تک مسلم لیگ کے زیر اثر رہی اور جب اگست ۱۹۴۷ میں ہندوستان آزاد ہوا اور ملک کی تقسیم ہوئی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قومی کردار بھی متاثر ہوا۔ یونیورسٹی کے وہ طلباء اور اساتذہ جن کا تعلق ان علاقوں سے تھا جو پاکستان میں شامل ہوئے، ہجرت کر گئے اور جو باقی رہ گئے وہ اپنے کو تنہا اور بے سہارا سمجھنے لگے۔ نواب اسماعیل خاں ۱۹۴۷ کے آخیر میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ انھوں نے بڑی کوشش کی کہ ادارہ پوری طرح قائم و دائم رہے لیکن مسلم لیگ سے اپنے تعلق کی بنا پر ان کی کوششیں بارآور نہ ہو سکیں۔ اس اہم مرحلے پر اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا آزاد نے تجویز رکھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو علی گڑھ کا وائس چانسلر منتخب کیا جائے۔ ذاکر صاحب بطور ایک ماہر تعلیم کے پورے ملک میں معروف تھے۔ انھیں گاندھی جی نے ۱۹۳۹ میں بنیادی تعلیم کی کمیٹی کا صدر مقرر کیا تھا اور اس مجلس نے پرائمری تعلیم کے لیے واردھا اسکیم کے خطوط پر دستکاری کے ذریعہ تعلیم دینے کی سفارش کی تھی۔ ۱۹۴۶ میں جب مرکز میں عبوری حکومت قائم ہوئی تب جواہر لال نہرو نے ذاکر صاحب کو کابینہ میں وزیر تعلیم کے طور پر منتخب کیا۔

ذاکر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو توانا اور بہتر بنانے کے آزمائشی مشن میں تن من دھن سے لگ گئے۔ جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور یو پی کی گورنر سروجنی نائیڈو نے ذاکر صاحب کی کوششوں میں ان کی بڑی مدد کی۔ ان سب کی خواہش تھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک ایسا اعلیٰ تعلیمی مرکز بنے جس پر پورے ملک کو ناز ہو۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے سب سے ربط پیدا کیا اور ان کے مشورے سے بہت سے معروف اساتذہ کو علی گڑھ لانے میں کامیاب ہو سکے۔ اس ضمن میں پروفیسر پی ایس گل (طبیعات)، پروفیسر ڈی، پی، مکھرجی (معاشیات)، ڈاکٹر نورالحسن (تاریخ)، ڈاکٹر عبدالعلیم (عربی) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

یونیورسٹی کی مالی حالت خستہ تھی۔ دیسی ریاستوں سے یونیورسٹی کو عطیات ملنے بند ہو گئے تھے اور مرکزی حکومت کی گرانٹ اتنی نہ تھی جس سے یونیورسٹی کا خرچ پورا ہوتا۔ کچھ ہی عرصے میں منظر نامہ بدل گیا۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے ۱۹۵۱ء میں کہا تھا کہ مرکزی حکومت کی گرانٹ بارہ لاکھ ہو گئی ہے اور اس میں گراں قدر اضافے کے امکانات بھی ہیں۔ یہ سب اس لیے ممکن ہوا کہ یونیورسٹی کے بہت سے پروجیکٹس مرکزی حکومت نے منظور کر لیے تھے

ذاکر صاحب اس ایجوکیشن کمیشن کے ممبر تھے جس کے چیرمین ڈاکٹر رادھاکرشنن تھے اور اس حیثیت سے انھیں بہت سے علم و فن کے ماہرین سے ملنے کا موقع ملا۔ ذاکر صاحب نے ان میں سے بہت سے لوگوں کو مختصر مدت کے قیام کے لیے، سیمینار میں شرکت کے لیے اور لکچرز کے لیے علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔ علی گڑھ کی سائنس فیکلٹی کے بہت سے اساتذہ بہتر مستقبل کی تلاش میں علی گڑھ چھوڑ چکے تھے۔ ذاکر صاحب نے اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تعلیمی رخصت (Study leave) کے قاعدوں کو آسان بنایا جس کے نتیجے میں بہت سے نوجوان اور باصلاحیت اساتذہ انگلستان اور امریکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ اس خوش اندیش حکمتِ عملی کے نتیجے میں یونیورسٹی کے بہت سے شعبوں کو فائدہ پہنچا۔ علی گڑھ کے فارسی عربی کے شعبے خاصے معروف تھے۔ ذاکر صاحب نے مرکزِ علومِ اسلامیہ کے قیام کی بنیاد ڈالی جس کے لیے مولانا آزاد نے، جو خود ممتاز عالم تھے، اپنی وزارت سے، یونیورسٹی کی بڑی مدد کی۔ اس مرکز میں عرب دنیا، ایران اور ترکی کے مطالعات اور اسلام کے فروغ میں ان کے باہمی رشتوں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اس مرکز میں ہندوستان کے باہر کے علماء کے یہاں آنے اور بدل اشتراک کے طور پر علی گڑھ کے اساتذہ کے بیرونی تعلیمی سفر کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ اس ضمن میں فارسی کے عالم سعید نفیسی اور ترکی کے عالم نیازی برکی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ یونیورسٹی کا انجینیرنگ کالج بہت قلیل ساز و سامان کے ساتھ کام تو کر رہا تھا لیکن اس کی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ ذاکر صاحب نے اس کالج کو استحکام دیا اور اسے انجینیرنگ کی تعلیم کا بڑا مرکز بنایا۔ انھوں نے مرکزی حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ میڈیکل کالج کے قیام کے لیے گراں قدر گرانٹ دی جائے۔ ہسپتال کے قیام کے لیے یوپی کی حکومت سے بھی ان کی بات چیت چل رہی تھی اور داخلوں کے ضابطوں پر بھی غور ہو رہا تھا۔ ایسے میں مخدوش صحت کی وجہ سے انھیں علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔ اسی زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے ناموں کی تبدیلی کے بارے میں بھی ایک تجویز زیر غور تھی۔ مولانا آزاد نے اس تجویز پر ذاکر صاحب کی رائے معلوم کی لیکن جب ذاکر صاحب نے اس تجویز کی مخالفت کی تو یہ تجویز مسترد کر دی گئی۔

علی گڑھ میں ۱۹۴۷ء سے ہی لڑکیوں کو بعض مضامین کی حد تک پوسٹ گریجویٹ جماعتوں میں داخلے ملنے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن وہ برقعے میں آتی تھیں اور کلاس روم کے دوسری طرف بیٹھتی تھیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے بیچ میں ایک چلمن ہوا کرتی تھی۔ ذاکر صاحب نے اس روایت کو ختم کیا جو لڑکیاں برقعہ پہننا چاہتی تھیں ان پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن کلاس روم کے درمیان کی چلمن ختم کر دی گئی۔ ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کی تہذیبی سرگرمیوں کو نئی زندگی دی اور ڈراما موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کے لیے مختلف کلب کھولے گئے اور اس طرح طلبا اور طالبات کے خلاقانہ صلاحیتوں کو جلا ملی۔ معروف شاعر اور اولڈ بوائے مجاز کی

معروف نظم "نذرِ علی گڑھ"، یونیورسٹی کے ترانے کے طور پر اس دور میں اختیار کی گئی۔ اس ترانے کی دُھن اشتیاق محمد خاں مرحوم نے بنائی۔ یہ ترانہ یونیورسٹی کی ہر اہم تقریب میں گایا جاتا ہے جو سننے والوں میں بے پناہ وارفتگی کی کیفیت طاری کرتا ہے۔ اس ترانے کے آخری مصرعے خصوصی طور پر دل کو چھو لیتے ہیں :

جو ابر یہاں سے اٹھے گا، وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہ گراں پر برسے گا
ہر سرو وسمن پر برسے گا، ہر دشت ودمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا، غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہر طرب پر گرجے گا، ہر قصر طرب پر کڑکے گا
یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے دور میں عالم گیر اہمیت کی حامل جو ممتاز شخصیتیں علی گڑھ پہنچیں ان میں سعودی عرب کے شاہ مسعود اور ایران کے رضا شاہ پہلوی کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں شاہ مسعود کی آمد کے نتیجے میں میڈیکل کالج کے قیام کے لیے علی گڑھ کو دس لاکھ روپیوں کا گراں قدر عطیہ بھی ملا۔

آزادی کے بعد بھی صرف مسلمان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر ہو سکتے تھے اس کے علاوہ مسلم دینیات کے بجائے اخلاقیات (Ethics) بھی بطور مضموں کے پڑھی جا سکتی ہے۔ میں نے اس وقت اس بات کو اپنے ایک شعر میں یوں کہا ہے :

'The gates of the wine tavern be now o[illegible] for all loves of wine but those who came to drink shall have the same sparkle"

ذاکر صاحب نے انڈر گریجویٹ سطح پر جنرل ایجوکیشن کی تعلیم کے لیے ایک پروجیکٹ تیار کیا۔ اس پروجیکٹ کو جس ٹیم نے تیار کیا اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید عابد حسین تھے۔ ان کی مدد کے لیے تین سینئر اساتذہ بھی تھے جنھیں سائنس، سوشل سائنس اور عالمی ادب کے موضوعات پر نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ جنرل ایجوکیشن کا یہ مرکز راکفلر فاونڈیشن کے گراں قدر عطیہ کی مدد سے بنایا گیا۔ اس مرکز میں ایک میوزیم اور ایک لائبریری کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ عالمی شہرت

یافتہ مصور ایم ایف حسین نے اس مرکز کی اگلی دیوار پر بے مثال نقش تخلیق کیا ہے۔ جس کا موضوع "ارتقا" ہے۔ ایک ہال جو کینیڈی کے نام سے منسوب ہے۔ ڈھائی ہزار بیٹھنے والوں کی گنجائش رکھتا ہے۔ اگرچہ انڈر گریجویٹ سطح پر ایک اساسی تعلیمی نصاب کی اہمیت کا اندازہ پوری دنیا میں کیا جارہا ہے اور اب یہاں آرٹ اور ادب کے مختلف کلب اور میوزیم ہی باقی ہیں لیکن یہ مرکز ہمیں اس بات کا احساس ضرور دلاتا ہے کہ ذاکر صاحب نے زمانہ پہلے فکری اور علمی سطح پر کیسے اہم اقدام کیے تھے۔

۱۹۵۲ء کے ایکٹ سے پہلے علی گڑھ میں وائس چانسلر کی مدتِ کار تین سال تھی لیکن اس ایکٹ کے بعد اسے پانچ سال کردیا گیا۔ ذاکر صاحب نے کم و بیش آٹھ سال (۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء) بطور وائس چانسلر خدمت انجام دی۔ ان کی صحت گرگئی تھی۔ اپنی صحت کے بارے میں وہ ہمیشہ بے پروا رہے۔ اپنے کھانے پینے کے اوقات کا خیال بھی انھیں کبھی نہ رہا۔ وہ ذیابطیس کے مریض بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے ستمبر ۱۹۵۶ء میں یونیورسٹی کو خیرباد کہا۔ ان کا نام یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے چیرمین کے منصب کے لیے زیر غور تھا۔ لیکن بعد میں مولانا آزاد نے اپنی رائے بدل دی اور سی، ڈی دیشمکھ جنھوں نے مرکزی حکومت سے انھیں دنوں مہاراشٹر ریاست نہ بنائے جانے کے احتجاج میں اپنا استعفا دیا تھا، یو جی سی کے چیرمین بنا دئے گئے۔ اس زمانے میں ریاستوں کی لسانی بنیادوں پر نو تشکیل زیر غور تھی اور مسٹر دیشمکھ کو اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ کرلیا گیا۔ بعد میں ۱۹۵۷ء میں ذاکر صاحب کو بہار کا گورنر مقرر کیا گیا۔

اپنی آٹھ سالہ مدتِ کار میں ذاکر صاحب نے طلبا اور اساتذہ پہ گہرے نقوش چھوڑے۔ انھوں نے طلبا میں اعتماد بحال کیا اور ملک اور قوم کے لیے وابستگی کے جذبے کو فروغ دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انھیں ایک نظام اقدار سے وابستگی اور ایک سمت دینے میں رہبری کی۔ یونیورسٹی کیمپس کو ذاکر صاحب نے سرسبز اور شاداب بنایا۔ گلاب کے تختے اور بوگن ولا کی جھاڑیاں ذاکر صاحب کو بہت پسند تھیں۔ یونیورسٹی کی لائبریری کی نئی عمارت مولانا آزاد کے نام سے منسوب کی گئی جس کا سنگِ بنیاد جواہر لال نہرو نے رکھا۔

یونیورسٹی کو چند ہی ایسے وائس چانسلر ملے ہیں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے دور کے طلبا اور اساتذہ پر گہرے نقوش چھوڑے بلکہ علمی دنیا سے خراجِ تحسین

بھی حاصل کیا۔ اس ممتاز فہرست میں صرف چار وائس چانسلروں کا ذکر کروں گا۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر ذاکر حسین، لکھنؤ یونیورسٹی کے آچاریہ نریندر دیو، مدراس یونیورسٹی کے لکشمن سوامی مدلیار اور دہلی یونیورسٹی کے سی۔ ڈی دیش مکھ۔ یہ چاروں شخصیتیں انسانوں کے بیچ دیو پیکر تھیں۔ ہمیں اب ایسے لوگ دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔ ان کی یاد ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ روشن رہے گی۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جنھوں نے ان کو دیکھا اور ان کے ساتھ کام کیا۔ آنے والی نسلیں ان سے ہمیشہ تحریک حاصل کریں گی۔ خدا ان روحوں کو سکون عطا کرے۔

فاروق عبداللہ

عالمِ قدآور ڈاکٹر ذاکرحسین

یُوں تو انسان دنیا میں آئے ہیں آتے ہیں اور وافر تعداد میں آتے رہیں گے۔ مگر ہر شخص کو یہ اعزاز حاصل نہیں کہ وہ انسان ہے اور تخلیقِ آدم سے متعلق تمام توقعات کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہو۔ غالبؔ کا کہنا ہے ؎

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یہ قیمتی بات کمالاتِ انسانی حاصل کرنے کے لیے ایک لمحۂ فکر یہ ہے انسان اگر اپنے معیار و قار سے گر کر قعرِ مذلّت سے ہم کنار ہو جائے تو وہ انسان نہیں رہتا۔ وہ حیوانیت کی سطح سے نیچے آجاتا ہے۔ اسی لیے اس کی ہدایت کے لیے پے در پے ہادی آئے چونکہ ہدایت کے کوثر و تسنیم کو جاری رکھنا مقصود تھا تو علم سب سے بہتر آلۂ ہدایت منتخب ہوا۔ ہر آنی و فانی نذرِ زوال ہوں گے صرف خلائے قُدس کے بخشے ہوئے لازوال کمال سے علم کبھی زوال پذیر نہیں ہوگا۔
وقت کی صلیب نے ہر شخص کو مرگِ سیاہ کا جام پلایا مگر عالم فانی جسم کو چھوڑ کر جبینِ زمانہ پر ثبتِ دوام کے رتبے کے ساتھ چسپاں ہو گئے۔

زیرِ نظر عنوان میں مرحوم ڈاکٹر ذاکرحسین کا ذکر تزئینِ قرطاس ہوگا، یہ صحیح ہے کہ مرحوم زمینِ ہند کے قابلِ فخر فرزند تھے، انھوں نے اپنی پاکیزہ زندگی کے وقار سے مسندِ صدارت کو زینت بخشی اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہونا اُن کا واحد تعارف نہیں بلکہ دنیائے علم کے اس ذی وقار شہسوار کی شخصیت خوشبوئے تعلیم سے مشامِ آرزو کو معطر کرنے کی پوری اہل تھی۔ یہ قدآور عالم نہ صرف عالم اور استاد تھے بلکہ معجزۂ علم سے عالموں اور استادوں کو علم اور تدریس کا گر سکھاتے تھے۔

مرحوم ذاکر صاحب کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کا شہرۂ آفاق تصورِ مردِ مومن یاد آتا ہے۔ اس تصور کی ہر لکیر مرحوم پر صادق آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنے دامن کو یوسفِ

کنعان کی طرح ہر فحش نظر سے پاک رکھا۔ کردار سازی اور خود سازی کے عمل سے گزرتے ہوئے ذاکر صاحب جسمانی طور بھی اور روحانی طور بھی قدآور ہوتے گئے۔ اُنھوں نے اپنی عزت حاصل کی کہ ان کے اہل وطن اُن کی طرف تکتے رہے جیسے خشت و سنگ سے بنائے ہوئے قطب مینار کی بلند قامت کی طرف ناظرین اونچا سر کرکے تکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب واقعی اپنی پیدا کردہ جہاں کے خشت و سنگ کے نہیں بلکہ گوشت و پوست کے وہ قطب مینار تھے جسے تقویم و ساعت کی آندھیوں کے جھونکے سرنگوں نہیں کر سکتے۔ اس مایۂ نازِ عالم کا مدعا نہ صرف اپنے وطن کی سرزمین پر امن پیدا کرنا تھا بلکہ وہ آفاقی مردِ کامل ہونے کی بنا پر جملہ عالم میں امن کے گلاب کھلتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ بذاتِ خود جب داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے تو فضائے بسیط میں خوشبو کی طرح ہی بکھر گئے۔ اگر ہم اپنے مشامِ طلب کو تیز کیے رہیں تو یہ خوشبو ہر قدم پر فضائے ہند میں سونگھنے کو ملے گی۔

خدا مرحوم کی تربت پر تا ابد بارشِ انوار برساتا رہے۔

امینہ احمد آہوجہ

ایک نادر انسان ذاکر صاحب پریذڈنٹ ہندوستان

گلزار ہندوستان کے گل یگانہ
جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی شخصیت ہیں، یہ بات حقیقت ہے، وضعداری اور علم وفضیلت کے جواہر کوٹ کوٹ کے بھرے تھے اور وہ سماج کی تمام قیود اور تعصبات سے آزاد تھے۔

یوں تو قومی زندگی کے ہر شعبے میں ذاکر صاحب نے نمایاں حصہ لیا لیکن شعبۂ تعلیم آپ کا خاص طور سے مرہون منت رہا اور آپ کی شعبۂ تعلیم سے دلچسپی اور دلی لگاؤ کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک متعدد تعلیمی اور سماجی اداروں اور انجمنوں کو آپ کی سرپرستی پر ناز ہے۔ بہت سے تعلیمی ادارے آپ کی رہنمائی میں ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے۔ ملک کے مسائل اور خصوصاً تعلیمی مسائل کو آپ نے جس خوبی سے سلجھایا اس کا نقش ہمارے دل ودماغ پر کندہ ہے۔ جناب حکیم اجمل خاں، مسیح الملک کے ۱۹۲۷ء میں انتقال کے بعد جامعہ ملیہ کی باگ ڈور آپ نے سنبھالی چونکہ آپ کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ :

شور بلبل کم نگردد گر رود گل زچمن

ذاکر صاحب ایک وسیع النظر دانشور اور نہایت سچے استاد تھے۔ ایسی ہستی کی اس نازک دور میں جامعہ کو اشد ضرورت تھی۔ اس وقت خدمت کے اس جذبے کو لازمی تھا کہ اجاگر کریں :

صورت خدمت صفت مردمیست
خدمت کردن شرف آدمیست

اور آپ نظامی کے اس شعر کو بخوبی سمجھتے تھے :

اگر مرد کوہ باید کند پولاد
زبون باشد بدست آدمی زاد

اور یہی ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ اسلامیہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

آپ جیسے صاحب علم وبصیرت، دوراندیش اور انسان دوست کے ہاتھوں ان اداروں کی مضبوط بنیاد پڑی اگرچہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

بقول مجیب صاحب کے:

"ان کو اس سے مطلب نہ تھا کہ قوم کی خدمت کریں۔ ان کو اصلیت میں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا تھا جس کو جھیلنے سے ان کو نفسیاتی تسکین ملے۔ یہ فلسفہ بغیر حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اور دوستوئیوسکی کے خیالات کا گہرا مطالعہ کیے بغیر مشکل سے سمجھ میں آئے گا۔"

جناب حکیم اجمل خاں نے جو قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر سب امراض کی مسیحائی کرتے تھے ذاکر صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں ان کی ذہنی کیفیت اور دلی ارادوں کو پرکھ لیا اور فرمایا: "چلو میرے ساتھ دہلی اور ایک تعلیم گاہ میں کام کرو جو تمہارے اصولوں کے مطابق چل رہی ہے۔ وہاں تمہارے لیے مال ودولت جاہ وحشم نہیں مگر خدا کی خوشنودی اور مسرت جو خدمت خلق کی سچی مدد سے حاصل ہوتی ہے موجود ہے۔"

مسیح الملک کی بات ذاکر صاحب کے دل میں اتر گئی اور جرمنی سے واپسی پر آپ نے دہلی آکر جامعہ کی خدمت کی اور اس کو نئی زندگی کی راہ پر گامزن کیا۔ جامعہ کا آغاز اس زمانے میں قرول باغ میں ہوا۔

پہلی بار جناب ذاکر صاحب کو میں نے نزدیک سے جامعہ کے دفتر میں قرول باغ میں دیکھا۔ یہ آزادی اور تقسیم وطن سے چند سال پہلے کی بات ہے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہمراہ اکثر جامعہ جانا ہوتا تھا۔ میرے والد مرحوم بیرسٹر نورالدین احمد صاحب کا تعلق جامعہ سے قانونی مسئلوں پر رائے دینے پر مبنی تھا۔ ذاکر صاحب میرے والد کے قائل تھے۔ اگر کوئی ان کی نظر میں قابل تعریف کام سرانجام دیتا اس کی بے ساختہ، فراخ دلی سے تعریف کرتے تھے اور اس بات کی داد دیتے تھے کہ نورالدین صاحب نے قانونی کتابوں کا ذخیرہ اپنے ذہن نشین کیا تھا کہ شاذ ونادر قانونی کتابوں کو دیکھتے تھے۔ میری والدہ کی دہلی کی بامحاورہ اردو کی آپ بے انتہا تعریف کرتے تھے۔ چونکہ وہ انگریز خاتون تھیں اور قرۃ العین حیدر نے اپنی کتاب "کار جہاں دراز ہے" میں یوں لکھا ہے: "ڈاکٹر ذاکر حسین کا کہنا تھا۔ ان تمام یوروپین خواتین میں جنھوں نے ہندوستانیوں سے شادیاں کی تھیں بیگم نورالدین ایک انگریز خاتون، واحد بی بی تھیں، جنھوں نے ایک ہندوستانی زبان پر اتنی قدرت حاصل کر لی تھی۔" اور جہاں تک اپنے بچپن میں ذاکر صاحب سے بات چیت کے موقعے مجھے ملے وہ کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ ایک دفعہ مجیب صاحب کے یہ کہنے پر کہ میں مصوری میں دل چسپی لیتی ہوں فوراً میرا کام دیکھنے کی فرمائش کی کام دیکھتے ہی اپنی بچوں کے لیے لکھی کتاب "ابو خاں کی

بکری" کا ذکر کیا اور مجھ سے کتاب کی تصویریں بنانے کے لیے کہا۔ جامعہ سے مجھے خط لکھا کہ "امینہ نورالدین یہ کنٹریکٹ آپ کو دیا جاتا ہے" میری خوشی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ میں اسکول میں پڑھتی تھی اور بارہ سال کی عمر رہی ہو گی ذاکر صاحب کے خط کو اسکول میں سب ساتھیوں کو کئی دن تک دکھاتی پھری۔ خوشی کا یہ عالم تھا۔

آزادی وطن کے بعد ذاکر صاحب سے ایک نا فراموش کردہ ملاقات لندن میں ہوئی۔ آپ چائے پینے آئے، اور چائے کے بعد کچھ وقت گلاب کے پھول دیکھنے میں باغ میں گزارے۔ فرمایا کہ لندن سے گلاب کی قلمیں ہندوستان لا کر ان سے اپنے سرسبز باغ کی رونق اور بڑھائیں گے۔ آپ کو باغ بانی کا بہت شوق تھا۔ جب وہ نائب صدر بنے تو ان کے باغات ان کے باغبانی سے ان کے غیر معمولی لگاؤ کا عین ثبوت تھے۔

ایک اور موقع ذاکر صاحب کے قریب کام کرنے کا مجھے ملا جب ذاکر صاحب نائب صدر تھے اور سوویت روس میں ہندوستان سے ایک معزز مہمان کی حیثیت سے سرکاری دورے پر تشریف لے گئے تھے ان کے ڈیلی گیشن کی ایک ممبر میں بھی تھی میری روسی اور فارسی کی جانکاری یہاں کام آئی۔ ذاکر صاحب ادیبوں مصوروں اور دانشوروں کی بہت قدر کرتے تھے۔ روس میں سیاسی ملاقاتوں کے بعد ballet کے آرٹسٹوں اور موسیقی کاروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ذاکر صاحب کے خیالات کی ترجمانی کرتے وقت ان کی ایک پرانی تقریر کے کچھ الفاظ ذہن میں آگئے :

"اسکول میں فن اور موسیقی، نغمہ سرائی اور رقص کو بے شک جگہ دینی چاہیے تعلیم کے پورے عمل کی بابت۔ میرا خیال موقف ہے کہ ان سرگرمیوں کی حیثیت اہم ثقافتی وسائل کی ہے جو انفرادی ذہن کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں" ماسکو میں ذاکر صاحب کی بدولت وہ نقاشی کے وہ نمونے دیکھنے کو ملے جن پر سرکاری منادی لگی تھی سمرقند بخارہ کی زیارت کے دوران تاریخ سے غیر معمولی لگاؤ کی وجہ سے ذاکر صاحب کی طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ یہاں آپ نے حافظ کا شعر بے ساختہ پڑھا :

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

محفل میں واہ واہ کے نعرے گونج اٹھے۔

اگرچہ ذاکر صاحب کا براہ راست تعلق سماجی تعلیم کے مختلف شعبوں سے تھا۔ مگر آپ کی شخصیت بنیادی اعتبار سے ایک نہایت ہمہ رنگ جمالیاتی ہستی کی شخصیت تھی۔ مناظر سے، پھولوں سے، درختوں سے، فن تعمیر، خطاطی، خوش نویسی، مصوری ان سب سے بہت لگاؤ تھا۔ جتنے وہ حسن کے شیدائی تھے اتنا ہی

بدصورتی اور بدذوقی سے پناہ مانگتے تھے۔ فنونِ لطیفہ ان کے نزدیک محض فرصت کے مشغلے نہیں تھے۔ آپ نے اپنے تصورِ حیات کی عکاسی کی اور اُسے ایک بین العلومی جامہ پہنایا۔ آج ذاکر صاحب کو یاد کرتے ہیں تو یہ شعر لب پہ آتا ہے:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

جگن ناتھ آزاد

ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر محمد اقبال
(قربتیں اور فاصلے)

ہندوستان میں مسلم لیگ کی تشکیل ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی نوعیت کے اختلافات اس سے پہلے ہی شروع ہو چکے تھے۔ یہ اختلافات ملک کی اجتماعی زندگی میں رخنہ پیدا کر کے اکثر اپنی صورت دکھا جاتے تھے۔ ہاں تحریک خلافت کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا اور بہت مختصر زمانہ جب کہ یہ اختلافات قریب قریب ختم ہو گئے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ اس وقت ملک کی سیاست میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا طوطی بولتا تھا۔ یہ دونوں سیاسی رہنما مہاتما گاندھی کے ساتھ تھے چنانچہ دونوں کے ترکِ موالات کے دنوں میں برطانوی حکومت کے بائیکاٹ کی پالیسی اختیار کی۔ گاندھی جی اس زمانے میں علی گڑھ تشریف لے گئے اور اس امر کی انھوں نے بہت کوشش کی کہ علی گڑھ یونیورسٹی برطانوی حکومت کا بائیکاٹ کرے، لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی اور نتیجۃً ان کے حامیوں نے علی گڑھ کو چھوڑ کر اپنی الگ یونیورسٹی بنانے کا فیصلہ کیا اور وہ یونیورسٹی آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کرنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین پیش پیش تھے اور غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ علامہ اقبال علی گڑھ کو چھوڑنے والوں کے ہم خیال نہیں تھے۔ اگرچہ اس وقت یعنی اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ذاکر صاحب جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر نہیں تھے۔ وائس چانسلر وہ اگلے برس مقرر ہوئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ روزِ اول سے جامعہ ملیہ کے روحِ رواں تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب مہاتما گاندھی نے اقبال کو خط لکھا اور انھیں جامعہ کا وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی تو انھوں نے اس ضمن میں حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ ہی ساتھ ذاکر صاحب سے بھی مشورہ کیا ہوگا۔

اسی ایک واقعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دو عظیم شخصیتیں سیاسیات میں ایک دوسرے سے الگ رستہ اختیار کرنے کے باوجود ایک دوسرے کے کمالات کی کس قدر معترف ہوتی ہیں اور تہذیبی دھارے کو اپنے فکر و نظر کی بدولت کس طرح رواں دواں رکھنے کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔
علامہ اقبال جامعہ کے وائس چانسلر بن کر تو نہ آئے لیکن جامعہ کے ساتھ انھیں جو ایک تعلقِ خاطر رہا وہ آج ہماری تاریخ ادب کا انمٹ حصہ ہے۔

(۲)

ذاکر صاحب علامہ اقبال سے بیس برس چھوٹے تھے۔ علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۷ء ہے اور ذاکر صاحب کی ۱۸۹۷ء۔ گویا ایک خوردی اور بزرگی کا رشتہ تھا۔ ذاکر صاحب جب انیس بیس برس کے ہوں گے تو اس وقت اقبال کی تین چار تصانیف ان کی نظر سے گزر چکی ہوں گی۔ علم الاقتصاد THE DEVELOPMENT OF MATAPHYSICS IN PERSIA اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی اور ان کی بعض اردو کی معرکتہ آرا نظمیں اور غزلیں بھی اور ۱۹۲۱ء میں خضرِ راہ اور ۱۹۲۲ء میں 'طلوعِ اسلام' بھی شائع ہو گئی تھی۔ دو برس بعد 'بانگ درا' چھپ گئی لیکن کلیاتِ اقبال اس سے بہت پہلے چھپ چکی تھی اور وہ بھی حیدر آباد میں۔
یہ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جن بانیوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ علامہ اقبال کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پہلا وائس چانسلر بنایا جائے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے مہاتما گاندھی سے اقبال کے نام خط لکھوایا تھا اور جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی شامل تھے وہ حضرات صرف یہی نہیں کہ علامہ کی سحر آگیں شاعری کے غلغلے سے متاثر تھے بلکہ ان کے افکارِ علمی کی مدت اور سیاسی نظریے سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ یہ جامعہ ملیہ کی خوش نصیبی ہے کہ ذاکر صاحب کو جامعہ میں رفقائے کار بھی ایسے ملے جو سرتاپا علمی لگن میں ڈوبے رہے اور زندگی بھر جامعہ کی بے لوث خدمت کرتے رہے۔ یہاں چونکہ بات علامہ اقبال کی ہو رہی ہے مجھے اس وقت ذاکر صاحب کے ساتھ ہی مجیب صاحب اور عابد صاحب کا خیال آ رہا ہے۔ ۱۹۳۰ء کی بات ہے جامعہ میں جشنِ اقبال منانے کی بات چیت چلی۔ اس ضمن میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

> "عابد صاحب اور ذاکر صاحب کا خیال تھا کہ جرمن یونیورسٹیوں کی طرح جامعہ بھی جشنِ اقبال کے نام سے ایک تقریب منائے جس میں ہندوستان کے اکابر اہلِ علم اور ممتاز شخصیتیں شریک ہوں اور حضرتِ علامہ کی خدمت میں جو خود بھی رونق افزائے بزم ہوں گے متعدد علمی اور فلسفیانہ مقالات کا ایک کشکول بطورِ

عقیدت پیش کیا جائے۔ لیکن افسوس ہے بعد کے حالات ——
سیاسی ہنگاموں، تحریک قانون شکنی اور گول میز کانفرنس کے
اعلان وغیرہ — کے باعث یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔"[1]

سید نذیر نیازی قابل قدر شخصیت ہیں جنھوں نے جامعہ ملیہ میں تعلیم پائی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کے شاگرد رہے۔ علامہ اقبال کے نیاز مندوں میں تھے بلکہ ان کا تعارف یوں ہونا چاہیے کہ وہ مولوی سید حسن کے بھتیجے تھے اور علامہ کی تصنیف THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کا انھوں نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا انھوں نے اپنی کتاب 'مکتوبات اقبال' میں کئی جگہوں پر یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کی صحت کے بارے میں اکثر پوچھتے رہتے تھے۔

اسی کتاب "مکتوبات اقبال" میں غازی رؤف پاشا کی جامعہ ملیہ میں آمد کا ذکر کرتے ہوئے سید نذیر نیازی لکھتے ہیں: "ڈاکٹر انصاری مرحوم کے حضرت علامہ سے ذاتی تعلقات تھے۔ انھوں نے اگرچہ اپنی طرف سے بھی حضرت علامہ کو تشریف آوری کی دعوت دے رکھی تھی اور بحیثیت شیخ الجامعہ ذاکر صاحب بھی ایک خط لکھ چکے تھے مگر پھر اس کے ساتھ ذاکر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں بھی ایک خط اپنی طرف سے لکھ دوں بلکہ کوشش کروں کہ حضرت علامہ جامعہ کا یہ دعوت نامہ منظور کر لیں۔ میں نے علامہ اقبال کو اس سلسلے میں جب خط لکھا تو انھوں نے جواب دیا۔

" پیارے نیازی جی السلام علیکم
مجھے آپ کا خط ابھی ملا۔ اگر تبدیلی نہ کی جا سکے تو کافی مشکل ہوگی آپ کوشش کیجئے کہ میرا لیکچر میری صدارت میں ہو اور آخری لیکچر کی تاریخ ۱۸ ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو میں یہاں سے ۱۹ مارچ کو روانہ ہو کر ۲۰ کو سویرے دلی پہنچوں گا۔ لیکن اگر ڈاکٹر انصاری اس بات کے لیے راضی ہو جائیں کہ آخری لیکچر ۱۸ تاریخ کو ہو تو مجھے بذریعہ تار مطلع کریں۔
باقی خیریت ہے۔ ۲۰ تاریخ سویرے یا جیسا بھی پروگرام ہو، مجھے ریلوے اسٹیشن پر مل جائیں۔

والسلام

محمد اقبال

۸ مارچ ۱۹۳۳ء

[1] مکتوبات اقبال (سید نذیر نیازی)، اقبال اکیڈیمی کراچی ستمبر ۵۷ء ص ۷۴

میں علامہ اقبال کا پیام لے کر ڈاکٹر ذاکر حسین کو دیدیا بہت خوش ہوئے لیکن مشکل یہ تھی کہ اس طے شدہ پروگرام میں گڑبڑ ہوگئی۔ آپس میں مشورے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ علامہ اقبال سے ۱۸ ر تاریخ کو آنے کی گزارش کی جائے۔ انھوں نے بھی اسے منظور کرلیا۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کو شکریہ کا خط لکھ ہی دیا مگر مجھ سے اصرار کیا کہ میں ۱۶ ر مارچ کو لاہور جاؤں اور علامہ اقبال کو بھی اس کا انتظار تھا۔ جیسے ہی میری ان سے ملاقات ہوئی انھوں نے ڈاکٹر انصاری مرحوم اور غازی صاحب کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے انھوں نے جامعہ میں اپنے دوستوں خاص طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین ڈاکٹر عابد حسین اور مجیب صاحب کے بارے میں پوچھا۔

اِس طرح اس کتاب میں ذاکر صاحب اور علامہ اقبال کے تعلق خاطر کا ذکر کئی موقعوں پر آیا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری کی دعوت اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذاتی کوششوں کی بدولت علامہ اقبال ۱۸ ر مارچ کی صبح کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تشریف لے آئے۔ اسی شام کو انھوں نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی جس میں غازی رؤف پاشا نے "وطنیت اور اتحاد اسلامی" کے موضوع پر توسیعی خطبہ ارشاد فرمایا۔ اقبال یوں تو جامعہ کے مہمان تھے لیکن ان کا قیام ڈاکٹر انصاری کے دولت کدے پر رہا۔ اس ضمن میں سید نذیر نیازی مذکورہ جلسے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "غازی موصوف نے خطبہ پڑھا اور محمد اقبال بحیثیت صدر اختتامی کلمات کہنے کے لیے آئے تو غازی موصوف کے خیالات کی رعایت سے اسلام کے مستقبل کا خیال آگیا۔ بے قابو ہوگئے۔ جذبات کا زور تھا۔ تقریر کرتے چلے گئے تا آنکہ "مسجد قرطبہ" کے عنوان سے انھوں نے جو نظم لکھی ہے اور جو بہت آگے چل کر "بالِ جبریل" میں شائع ہوئی اس کے اس شعر سے

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں

ابتدا کرتے ہوئے ایک کے بعد دوسرا شعر پڑھنے لگے تو پھر کیا تھا سامعین وجد میں آگئے۔ مجمع ہمہ تن گوش، محمد علی ہال کے گوشے گوشے میں خاموشی ہی خاموشی ایک نوا ن کا تازہ کلام، دوسرے غازی حسین رؤف پاشا کی محبوب شخصیت خلافتِ عثمانیہ کی مجاہدانہ سرفروشیوں کی زندہ یادگار ہے کوئی سوچ رہا تھا ہم کیا تھے کیا ہوگئے حتیٰ کہ انھوں نے یہ کہہ کر

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

تقریر ختم کی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو طلسم خاموشی ٹوٹا۔ شرکائے جلسہ آگے بڑھ

ان کے ہاتھوں کو بوسہ دینے، اپنی عقیدت کا اظہار کرنے لگے [۱]

در اصل یہ سارا کرشمہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ذاتی کوشش کا نتیجہ تھا کیونکہ اگر وہ دوراندیشی سے کام لے کر اقبال کو اپنے ہمراہ دہلی لے آنے کے لیے سید نذیر نیازی کو لاہور نہ بھیجتے تو علامہ اقبال کا ۱۸ر کی صبح تک دہلی پہنچ جانا غالباً ممکن نہ تھا۔

(۳)

جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے ذاکر صاحب نے علامہ اقبال کے بارے میں کوئی مضمون نہیں لکھا لیکن فکرِ اقبال اور کلامِ اقبال سے ان کا تعلقِ خاطر اس پیغام میں نظر آتا ہے جو انھوں نے جوہر کے "اقبال نمبر کے لیے مدیر "جوہر" کو بھیجا۔ اس میں ذاکر صاحب لکھتے ہیں: "آپ جس شخص کی یاد میں یہ پرچہ نکال رہے ہیں اس کا کلام ایسا جامع پیام ہے کہ اگر ہمارے نوجوان اسے سمجھ لیں تو شاید ہماری ملت کے دن پھر جائیں ......۔ خود اقبال کا ظہور ہماری ملی زندگی میں ایسا واقعہ ہے جس سے ڈھارس بندھتی ہے کہ اب رُت بدلنے کو ہے .....۔ اقبال ان شاعروں میں سے نہ تھے جو زندگی سے بس لطف اٹھاتے اور اس کا گیت گاتے ہیں۔ وہ مسیحا نفسوں میں سے ہیں جن کے دم سے زندگی کی مرجھائی ہوئی کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔"

اس دو تین صفحے کے پیغام میں جس بات نے راقم التحریر کو متاثر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں اقبال کی شاعری اور فکر دونوں کی طرف ذاکر صاحب نے بلیغ اشارے کیے ہیں۔ اُن کی فارسی شاعری کا ذکر بھی آگیا ہے۔ جذبے کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی مقصدیت کا بھی، خودی کا بھی، بے خودی کا بھی، عقل و عشق کا بھی وجدان کا بھی اور عقل کے ادب خوردۂ دل ہونے کا بھی، نورِ حیات کا بھی اور نارِ حیات کا بھی اور ظاہر ہے کہ اشاروں ہی اشاروں میں ان تمام امور کی عقدہ کشائی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اقبال کی تمام تصانیف میں قاری ڈوب نہ چکا ہو۔

علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ بقول سید نذیر نیازی "۱۹۲۳ء میں جب ذاکر صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی تشریف لے گئے اور دورانِ پیام میں مطبع کاویانی برلین سے دیوانِ غالب کا ایک منقش اور مطلا نسخہ شائع کیا تو یہ سب اس عقیدت کے جو انھیں حضرتِ علامہ سے تھی مجھے لکھا "میرا جی چاہتا ہے، بانگِ درا، کی طباعت بھی اسی اہتمام سے مطبع کاویانی ہی میں کی جائے۔"

---

[۱] مکتوباتِ اقبال ص ۹۹ - ۱۰۰ -

لیکن حضرت علامہ کو یہ تجویز پسند نہیں آئی کیونکہ برلن میں خط نستعلیق طباعت کا کوئی انتظام نہیں تھا اور حضرت علامہ نستعلیق کو کسی طرح بھی نسخ پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔" لہ

(۴)

ذاکر صاحب سے راقم التحریر کی بہت کم ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار تو اس وقت جب وہ میری بیٹی کی شادی پر ہمارے گھر تشریف لائے تھے۔ نئی دہلی میں۔ اس وقت ان کی زیادہ تر باتیں والدِ محترم کے ساتھ ہوئیں۔ ایک ملاقات میں اپنی کتاب "اقبال اور اس کا عہد" کا پہلا ہندوستانی ایڈیشن میں نے ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت اس کتاب کی وجہ سے بات چیت کا موضوع علامہ اقبال ہی رہا۔ اس بات چیت میں انھوں نے ایک جملہ یہ بھی کہا تھا کہ " آپ لاہور والوں نے اقبال کو MONOPOLIZE کر لیا ہے۔ اس جملے کے کئی معنی نکل سکتے تھے اس لیے میں نے جواب میں اتنا ہی کہا کہ اقبال تو مشرق و مغرب کا شاعر ہے۔ کوئی ایک شہر اسے کیسے MONOPOLIZE کر سکتا ہے اس کے بعد انھوں نے کتاب کے ابواب پر نظر ڈالی اور ایک باب " کلامِ اقبال کا ہندوستانی پس منظر" تھوڑی دیر کے لیے دیکھتے رہے — اور مجھ سے کہا کہ اس موضوع پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کا ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیے اور اس طرح کی اور مثالیں بھی اگر کلامِ اقبال سے ملیں تو انھیں بھی اس باب میں شامل کرنا چاہیے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کی شاعری کا یہ پہلو زیادہ تفصیل کے ساتھ اہلِ ملک کے سامنے آئے۔ میں نے عرض کیا کہ اقبال کی شاعری کے اس پہلو کو بعض حدود کے اندر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس پر زیادہ زور اس لیے نہیں دیا جا سکتا کہ ہم اہلِ ہند حب الوطنی اور نیشنلزم کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں حب الوطنی تو ملتی ہے لیکن وہ نیشنلزم کے مخالف ہیں اور اگر زیادہ تفصیل سے لکھا جائے تو ہمیں حب الوطنی اور نیشنلزم میں ایک حدِ فاصل کھینچنا ہوگی۔ اور یا پھر اس کا امکان ہے کہ بات میں خلطِ مبحث پیدا ہو جائے۔ انھوں نے اس پر سوال کیا کہ خلطِ مبحث کے پیدا ہونے کا کیوں امکان ہے۔ میں نے جواب میں یہ عرض کیا کہ ہمارے بعض اہلِ قلم حضرات اقبال کی حب الوطنی کے حدود کو اتنی دور کھینچ کے لے جاتے ہیں کہ وہ اقبال کو اس تصورِ پاکستان سے لاتعلق کر دیتے ہیں جو ان کے ۱۹۳۰ء والے خطبۂ صدارت میں ہمیں نظر آتا

لہ مکتوباتِ اقبال (سید نذیر نیازی) صفحہ ۴۔

ہے۔ اس پر انھوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک اقبال نے تصور پاکستان پیش کیا۔ اب میں نے یہ جواب دیا کہ بعض حضرات اقبال کو تصور پاکستان سے لاتعلق ثابت کرنے کے لیے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اقبال کے مذکورہ خطبے میں یا ان کی ساری شاعری میں "پاکستان" کا لفظ کہیں نہیں آیا ہے۔ تو ان کی اس دلیل کے پیش نظر میں یوں کہوں گا کہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں یقیناً وہ تصور پیش کیا جو آگے چل کے تشکیل پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اس پر ذاکر صاحب نے قدرے حیرت کا اظہار کیا اور نہ جانے کیسے لیکن بات چیت کا رُخ نیشنلزم اور نیشنلزم کے مغربی تصور کی طرف ہو گیا اور میں علامہ اقبال کے متعلق ان کے خیالات ان کی زبانی سننے سے محروم رہ گیا۔

(۵)

خیر اوپر کے پیراگراف کو آپ جملۂ معترضہ ہی کہیے۔ میں نے اس میں صرف بیانِ واقعہ سے کام لیا ہے کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے قبل بات فکری ہم آہنگی کی ہو رہی تھی۔ یہ فکری ہم آہنگی ہمیں علامہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین میں زندگی کے اس شعبے میں نظر آتی ہے جسے ہم تعلیم شعبہ کہتے ہیں۔ دراصل علامہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین بنیادی طور پر سیاسی آدمی نہیں تھے۔ اگرچہ ذاکر صاحب ہندوستان کے نائب صدر اور صدر کے عہدے تک پہنچے اور اقبال پنجاب مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر رہے، پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے صدر منتخب ہو گئے۔ الیکشن لڑنے کے بعد، لیکن مزاجاً دونوں سیاسی آدمی نہیں تھے۔ تعلیم اور تعلیم کے مسائل سے دونوں کو دل چسپی تھی۔ اگرچہ ان کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں زیادہ لکھا نہیں گیا لیکن انھوں نے اس مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل سے دونوں غافل نہیں رہے۔ بچوں کی تعلیم کو بھی دونوں نے نظر میں رکھا ہے اور چونکہ دونوں ایجوکیشنسٹ بھی تھے اور ایجوکیشنسٹ بھی اس لیے کہ انھوں نے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے تمام عملی پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد لکھا ہے۔

بچوں کی تربیت کے عنوان سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے تین تقریریں آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کیں۔ تیسری تقریر میں آپ کہتے ہیں :-

> "ظاہری ڈسپلن کے ثبوت کے بعد مدرسوں کا رائج نصاب بھی بچوں کی تربیت ٹھیک نہیں ہوئے دیتا۔ آدمی کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ اس کی

بڑی بڑی محرومیاں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ یہ جن
چیزوں کو پہلے کام کا ذریعہ بناتا ہے ہوتے ہوتے خود کسی
ذریعے کو اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ وسیلہ قریب ہوتا
ہے اور مقصد دور۔ بس وسیلہ ہی نظر میں رہ جاتا ہے
اور مقصد اوجھل ہو جاتا ہے۔

یہ وہ نکتہ ہے جس پر اقبال نے اپنی نظم و نثر دونوں میں اپنے خیالات کا جا بجا اظہار کیا ہے۔ مثلاً

آگہی از علم و فن مقصود نیست
غنچہ و گل از چمن مقصود نیست

گویا تعلیم کا مقصد محض معلومات فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ ان کے ذریعے سے اُن صلاحیتوں کو کام میں لانا ہے جو انسان کے اندر موجود ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال کے مضمون کا عنوان ہے "بچوں کی تعلیم و تربیت"، جس میں وہ لکھتے ہیں۔

جس طرح جسمانی اعضا تناسب کے اصولوں کے مطابق
بڑھتے ہیں اسی طرح نفس ناطقہ کی نشو و نما بھی انہی
اصولوں کے تحت میں ہے اس لیے طریقۂ تعلیم کامل وہی
ہوگا جو نفسِ ناطقہ کے تمام قواعد کے لیے یکساں ورزش
کا سامان مہیا کرے۔ ادراک، تخیل، تاثیر، مشیت، غرض
کہ نفسِ ناطقہ کی ہر قوت تحریک میں آنی چاہیے کیونکہ کامل
طریقۂ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ نفسِ ناطقہ کی پوشیدہ قوتیں
کمال پذیر ہوں نہ یہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع
ہو جائیں۔

جہاں تک تعلیمی مسائل پر بات چیت کا تعلق ہے ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین دونوں معلم بھی تھے اور مفکرِ تعلیم بھی۔ اس لیے بچوں کی تعلیم سے لے کر بڑوں کی تعلیم تک کے تمام مسائل پر انھوں نے نظر ڈالی ہے اور ان مسائل کے اکثر پہلوؤں پر دونوں کے افکار میں ایک حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے مثلاً علومِ جدیدہ کے بنیادی اصول علوم جدیدہ کے حصول کی ترغیب و تحریص تعلیم جدید کی خرابیاں اور ان میں اصلاح کے طریقے مقاصدِ تعلیم، علومِ طبعی، علوم عمرانی وغیرہ وغیرہ۔ اس کی اگر مثالیں تلاش کی جائیں تو دونوں کی تحریروں میں قدم قدم پر ایسی مثالیں مل سکتی ہیں۔

ابھی میں نے بچوں کی تعلیم کے متعلق ان دونوں مفکرین تعلیم کے خیالات کا ذکر کیا

ہے۔ ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا اس ضمن میں ایک کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تمام مصروفیات میں سے وقت نکال کر بچوں کی زبان میں بھی بچوں کے لیے ادب تخلیق کیا۔ اقبال نے شعر میں اور ذاکر صاحب نے نثر میں۔ ذاکر صاحب کی کتاب "ابو خاں کی بکری" اور اقبال کی نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" یا "ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا" یا "ایک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا" کو بچے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اگرچہ بچوں کے لیے ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے زیادہ نہیں لکھا لیکن جتنا بھی لکھا ہے اس کی حیثیت روشنی کے اس مینار کی ہے جو راہ چلتے مسافروں کو رستہ دکھاتا رہتا ہے۔

(۶)

ایک اور قدر مشترک جوان دونوں نابغوں کے افکار میں نظر آتی ہے وہ ہے فلسفے کے ساتھ ایک گہرا تعلقِ خاطر۔ اقبال نے تو خیر ایک فلسفی کے طور پر بڑا نام پایا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے فلسفیانہ مزاج کو جانچنے کے لیے میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ ان کے تعلیمی خطبات یا افلاطون کی کتاب ریاست کا اردو ترجمہ اول سے آخر تک پڑھیے بلکہ اتنا ہی کہوں گا کہ ایک نظر اردو ترجمے کے مختصر سے مقدمے پر ڈال لیجیے، میری بات کی وضاحت ہو جائے گی۔ آخر ذاکر صاحب نے ترجمے کے لیے اس عظیم کتاب کا انتخاب کیوں کیا۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب یہ ہو کہ افلاطون نے "ریاست" میں نظامِ تعلیم کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ آج ڈھائی ہزار برس گزر جانے کے بعد بھی پرانا نہیں ہوا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر فلسفے سے ذاکر صاحب کو دلی رغبت نہ ہوتی اور افلاطون کے نظریات پر ان کی گہری نظر نہ ہوتی تو ضروری نہیں کہ وہ اسی کتاب کا انتخاب کرتے۔ ترجمے کے لیے وہ تعلیم کے موضوع پر کسی اور جدید کتاب کو بھی منتخب کر سکتے تھے ـــــ میں اس بات کو علامہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین میں کسی قدر مشترک کی موجودگی پر محمول کروں یا نہ کروں لیکن ریاست اور اس کا مقدمہ پڑھتے وقت بارہا مجھے خیال آیا کہ اقبال نے بھی افلاطون کا مطالعہ، فکر کی پوری گہرائی کے ساتھ کیا ہے اور ان کی تصانیف مثلاً THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM اسرارِ خودی اور ضربِ کلیم میں افلاطون کا ذکر کئی جگہوں پر آیا ہے۔ اب آپ یہ نہ کہیں کہ اقبال نے تو افلاطون کے مسلک کو مسلک گوسفندی کہا ہے اور اس کے متعلق یہاں تک لکھا ہے:

راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم از گروہِ گوسفندانِ قدیم
رخشِ او در ظلمتِ معقول گم در کہستانِ وجود افگندہ سم

آنچناں افسونِ نامحسوس خورد   اعتبار از دست وچشم وگوش بُرد
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت   خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

یہاں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اقبال کے یہ سارے اعتراضات افلاطون کے صرف ایک نظریہ ـــــ نظریۂ رعیان پر ہیں .... اس کے سارے فلسفے اور سارے علم و فضل پر نہیں ہیں۔ اقبال افلاطون کی فلسفیانہ عظمت کے قائل ہیں اور اُن کے اکثر فلسفیانہ افکار کی انھوں نے تائید کی ہے۔ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں آپ ان چند الفاظ میں افلاطون کو قابلِ ذکر خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں۔

"چنانچہ قرآن، مذہب، ریاست، اخلاقیات
اور سیاست میں اسی طرح ایک باہمی ربط
ضروری خیال کرتا ہے جس طرح افلاطون نے اپنی
تصنیف "ریاست" میں بیان کیا ہے۔"

اسی طرح اقبال کا یہ شعر بھی صرف عورت ہی کے احترام میں نہیں ہے بلکہ اس میں افلاطون کو بھی خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔

مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون

اور مذکورہ کتاب "ریاست" کے بارے میں ڈاکٹر ذاکر حسین رقم طراز ہیں: "سچ یہ ہے کہ اس (کتاب) میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے۔ البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے۔ اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پُرمعلوم ہوتا ہے لیکن یہ نہیں ہے کہ فکر و خیال کی دنیا کو یک قلم نظرانداز کر دیا گیا ہو فلسفے کی بلندیاں دیکھنی ہوں تو عین جزمیں سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ بھی اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے۔ اخلاق کا سبق لینا ہو تو اس میں روحِ انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق موجود ہے۔ تعلیم کے مسائل پر روشنی درکار ہو تو بقولِ روسو "تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ سب سے بہتر ہے"۔ سیاسی زندگی میں رہنمائی کے لیے یہ ایک جدید ہیئتِ اجتماعی اور اس کے اداروں کی جیتی جاگتی تصویر لا کھڑی کر دیتی ہے اور انسانی جماعتوں کے تغیرّ عروج و زوال کے اسرارِ سربستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو فلسفۂ تاریخ کے یہ مشکل مسائل بھی اس میں پانی کر دیے گئے ہیں۔"

اپنی اس مختصر سی تحریر میں اس حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش میں نے نہیں کی کہ سیاست میں علامہ اقبال اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے رستے الگ الگ تھے، وہ تو خیر تھے ہی

لیکن سیاست کی اقدار سے زندگی کی اقدار کہیں بلند ہیں اور اگر زندگی کی اقدار پیش نظر ہوں تو نگاہ ہمیشہ ایک دوسرے کے سن پر جاتی ہے، اقدار مشترک پر جاتی ہے اختلافات پر بھی جاتی ہے لیکن مخالفت پر نہیں جاتی اور اس وقت انسان کا اپنا کھرا پن ہی اس کی پرکھ کا پیمانہ بنتا ہے۔ دراصل اقبال اور ذاکر حسین دونوں درویش صفت انسان تھے اور اگر اپنی اس تحریر کو میں اقبال کے ان دو اشعار پر ختم کروں تو بے جا نہ ہوگا۔

اے حلقۂ درویشاں وہ مرد خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی میں شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

عبدالستار

مکمل انسان — مکمل استاد

ہوا ہے تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے   وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

ذاکر صاحب کے بارے میں نہ معلوم کتنے اہلِ قلم حضرات نے اپنے اپنے انداز سے لکھا ہے اور ان کو اس کا حق بھی تھا اس لیے کہ وہ یا تو ان سے قریب رہے تھے اور بہت قریب سے جانتے تھے یا اہلِ بصیرت اور مردم شناس جہاں تھے اور اس کا سلیقہ بھی رکھتے تھے کہ جو کچھ لکھیں وہ فہم و فراست کی کسوٹی پر پوری اتر سکے۔

مجھ میں ان میں سے کوئی خوبی نہیں نہ تو ذاکر صاحب کے بارے میں کوئی قطعی بات کہہ سکتا ہوں اور ان کی شخصیت کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ البتہ ایک بہت معمولی طالب علم کی حیثیت سے جو کچھ دیکھا یا مجھ سے متعلق رہا اس کو بیان کروں گا۔ میں ابتدائی تعلیم ہی سے ان کا شاگرد رہا۔

ذاکر صاحب اور ان کے قریبی ساتھی شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم بجنور چندہ کے لیے تشریف لے گئے۔ والد صاحب مرحوم اس زمانے میں تحریک آزادی سے وابستہ تھے۔ حکومت کی ملازمت چھوڑ کر صرف تحریک آزادی کا کام ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ جہاں تک میری اور میرے بھائیوں کی تعلیم کا معاملہ تھا اس وقت ہم لوگ مسلم اسکول بجنور میں جو والد صاحب کے ایک قریبی دوست اور درویش صفت شخصیت نے محض اپنی لگن اور محنت سے کام کیا تھا پڑھتے تھے۔ خاندان کے دوسرے لوگ والد صاحب کے خیالات کے برعکس حکومتِ وقت سے قربت رکھتے تھے ان کی تعلیم گورنمنٹ اسکول بجنور اور اس کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ والد صاحب نے عہد کیا تھا اور اس عہد کو آخر تک نبھایا کہ اپنے کسی بچے کو انگریزی حکومت کے کسی ادارے یا ایسے اسکول اور کالج جس کو سرکاری امداد کسی طریقہ پر ملتی ہو تعلیم نہ دلواؤں گا۔ ذاکر صاحب اور شفیق صاحب سے بات ہوئی اور ہم لوگ جامعہ کو سونپ دیے گئے۔ میرے دونوں بھائی تو چند سال بعد واپس بجنور چلے گئے لیکن میں جب ہی سے جامعہ میں رہا دوسری درس گاہ کا منہ نہ دیکھا۔

غالباً لوگ نہ جانتے ہوں یا کم ہی جانتے ہوں کہ ہندوستان کا راشٹرپتی کبھی دہلی میں میونسپلٹی کی ممبری کا امیدوار رہا تھا۔ غالباً ۱۹۳۷ء کی بات ہے کہ ساتھیوں کے کہنے سننے سے انھوں نے ممبری کی نامزدگی کا فارم بھر دیا۔ ڈاکٹر

بدھ بیر سنگھ جو بعد میں دہلی میونسپلٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ ان کے مقابل تھے۔ لیکن خوبیٔ قسمت کہئے یا بدقسمتی کہ فارم ریجکٹ ہوگیا۔ ہوا یہ کہ ایک قریبی ساتھی نے فارم بھرا تھا اور ان کی انتہائی خواہش کہ ذاکر صاحب ممبر بنیں۔ انھوں نے فارم میں ذاکر حسین خاں نام لکھا۔ ذاکر صاحب کی نہ عادت تھی اور نہ خوشی وہ اپنے نام کے ساتھ کبھی خاں نہیں لگاتے تھے۔ میرے خیال میں اس کی ان کو ضرورت بھی نہ تھی کہ اس طرح کے القاب و آداب ہم جیسے لوگ اپنی کمزوریوں اور کمیوں کو پورا کرنے کے لیے یا احساسِ برتری کو رونق بخشنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال نتیجہ معلوم ذاکر صاحب کے دستخط میں خاں کا لفظ ندارد اور درخواست نامزدگی جو ذاکر حسین خاں کی طرف سے دی گئی تھی مسترد کردی ہم لوگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رات کے وقت منظم شکل میں چھوٹے جلوس نکالتے اور ذاکر حسین زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ گلا پھاڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرے سے فارم مسترد ہوگیا اور ہم لوگ مایوس ہوکر اپنے اپنے ہاسٹلوں میں بیٹھ گئے۔

علی گڑھ سے جامعہ قرول باغ میں منتقل ہوگئی تھی۔ اس کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا تھا۔ طبیہ کالج جو حکیم اجمل خاں کی کوششوں کا ثمرہ تھا وہ بھی قرول باغ میں ہی تھا۔ حکیم اجمل خاں نے جامعہ کی ذمہ داریوں میں کافی حد تک ذمہ داریاں لی تھیں اور اس لیے وہ چاہتے تھے کہ یہ ادارہ آپ کے ادارے سے قریب ہوتا کہ وہ دونوں جگہ کام کرسکیں۔

کرایہ کے مکانوں میں زمانہ ابتدائی، ثانوی اسکول اور چھوٹا سا کالج۔ شاید ذاکر صاحب نے سوچا کہ کرایہ کے مکانوں میں اس کے ساتھ ہوسٹل کے لیے مکانات مہیا کرنے اور ان کا باقاعدہ کرایہ دینا کب تک چلتا رہے گا اس لیے بات ذہن میں آئی کہ کہیں دہلی شہر سے باہر جاکر اپنی بستی بسائی جائے۔ واقعی بڑا کام تھا کہ زمینوں کی فراہمی اور اس پر عمارات کا بنانا ان حالات میں ناممکن نظر آتا تھا لیکن جو لوگ کام کے دھنی ہوتے ہیں وہ مشکلات سے نہ گھبراتے ہیں اور نہ وسائل کی کمی ان کے آڑے آتی ہے۔ اوکھلا اس زمانے میں شہر سے بہت دور دراز سفر معلوم ہوتا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح زمینوں کی فراہمی کا کام شروع ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا رہا تا آنکہ پھر یہ بات سوچی جانے لگی کہ اب عمارات کا کام شروع کیا جائے۔ ذاکر صاحب کے ایک قریبی دوست ۸۱۱ تھے ذاکر صاحب نے ان سے پلان بنانے کی بات کی۔ ذاکر صاحب خود بھی با ذوق تھے۔ عمارات سے ٹیکنیکی واقفیت تو شاید نہ تھی لیکن ہر چیز میں خوبی اور حسن پیدا کرنا ان کی بڑی خوبی تھی یائنز صاحب کی مدد سے عمارات جرمنی اور ہندوستانی ملی جلی تعمیر شروع ہوئی۔ اس وقت کی تین عمارتیں ابتدائی، ثانوی اور استادوں کا مدرسہ آج بھی فنی شاہکار ہیں۔ بعد میں عمارتیں کافی بنیں اور بڑی بڑی بنیں لیکن ان میں وہ حسن نفاست اور مشرق و مغرب کی آمیزش نہیں ملتی۔

جیسے جیسے جامعہ میں شعبوں کی ضرورت ہوتی رہی وہ بے سرو سامانی کی حالت میں بنتے رہے۔ کہیں تو اچھا کارکن مل گیا اور اس کی وجہ سے ایک ادارہ کھڑا ہوگیا۔ اور کبھی ادارہ کھولنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو جیسے جیسے مناسب صلاحیت کے کارکن ملتے گئے ادارے بنتے گئے۔

استادوں کا مدرسہ کھور روڈ قرول باغ میں ہی قائم ہوگیا تھا۔ تعلیم بالغان کا کام بھی بے سرو سامانی کی حالت میں ذاکر صاحب کے ایک معتمد ساتھی شفیق الرحمٰن قدوائی کی مدد سے ابتدائی مرحلات سے گزر کر ایک تعمیری کام نظر آنے لگا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کام بڑھتے جا رہے تھے لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے کوئی کام رکتا نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے کہ نامساعد حالات میں مشکلات کو نظرانداز کر کے لوگ کیسے کیسے بڑے کام کر لیتے ہیں۔ کام کرنے والے بھی مل جاتے ہیں مدد کرنے والے بھی مل جاتے ہیں۔ اس زمانے میں گاندھی جی اور حکیم اجمل خاں کی وجہ سے مالی مشکلات میں خاصی کمی ہوئی اور ان لوگوں کی پرخلوص، پرجوش محبت اور جانفشانی سے مالی مشکلات کسی حد تک کام میں رکاوٹ نہ بن سکیں جمنالال بجاج اس زمانے میں جامعہ کے خازن تھے اور مالی انتظام میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ مولانا محمد علی کے بعد ڈاکٹر انصاری امیر جامعہ مقرر ہوئے۔ ذاکر صاحب کو سہارا ملا اور کام میں خوب مدد ملی۔ حکیم اجمل خاں کے انتقال سے جو کمی پیدا ہوگئی تھی وہ کسی حد تک پوری ہوگئی۔ یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ شروع سے ہی جامعہ کا نصب العین جدید تعلیم اور متحدہ قومی تحریک تھی سچ پوچھیے تو علی گڑھ سے علاحدہ ہو کر اپنے اصولوں کو سامنے رکھ کر جامعہ کا کام چل رہا تھا۔ کام کرنے والے، کام میں مدد کرنے والے ہر طرح کے خیالات ہر مذہب کے لوگ تھے۔ ان میں ای۔ جی کیلاٹ کیمبرج سے ایم۔ اے کر کے آئے تھے وہ جامعہ کے ساتھ ہوگئے۔ جرمنی کے انجینئر اور ایک خاتون مس گرڈا فلپس بورن نے بھی خدمات پیش کر دیں۔ گاندھی جی، جمنالال بجاج اور اسی طرح دوسرے لوگوں نے جامعہ کے کاموں میں ہاتھ بٹایا۔ دراصل جب مقصد کام ہوتا ہے تو یہ باتیں نہیں ہوں گی کہ کون ہے اور کیا کر رہا ہے۔ بس مقصد کام ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب میں یہ خوبی شروع ہی سے تھی کہ کیسا ہی کارکن مل جائے بشرطیکہ وہ کام کرنا چاہے ذاکر صاحب اس سے نہ صرف کام لے لیتے تھے بلکہ اس کی انفرادیت کو بھی اجاگر کر دیتے تھے اور آہستہ آہستہ وہ کارکن کام کا ایک ضروری جز بن جاتا تھا یہ بات بہت مشکل ہوتی ہے بہت سے لوگ جو مختلف جگہوں سے آئے ہوں، خیالات مختلف ہوں۔ صلاحیتیں مختلف ہوں ان کو کسی کام کے لیے جمع کر کے کام لینا آسان کام نہیں ہے۔ ذاکر صاحب ہمیشہ یہ بات کہا کرتے تھے آدمی اہم نہیں کام اہم ہے۔ وہ بہت پڑھے لکھے لوگوں سے معمولی کام لے لیتے اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے ذمہ بڑے بڑے کام سونپ دیتے۔ میرے خیال میں یہ ان کی اپنی صلاحیت تھی کہ وہ سب لوگوں سے مشورہ تو ضرور کرتے لیکن میرے خیال میں اپنی بات منوا لیتے اور لیڈرشپ کی جو صلاحیت ہوتی ہے اس کو بروئے کار لاکر ایک کام کے اردگرد جمع کر دیتے۔ لوگوں کو کام میں آزاد چھوڑ دیتے لیکن بہت قریب سے اس کی دیکھ بھال بھی کرتے۔

بعض ذاتی اور دلچسپ باتیں جو ذاکر صاحب کی خدمت میں رہ کر میں نے سیکھیں یا ان

سے بلاواسطہ یا بالواسطہ متاثر ہوا۔

ہمارے معاشیات کے استاد پروفیسر محمد عاقل صاحب مرحوم گورنمنٹ کی ایک تعلیمی اسکیم کی سفارشات کے سلسلے میں انگلستان گئے تھے تاکہ وہاں کے دیہی اور شہری حالات کا قریب سے مطالعہ کریں۔ اس دوران ہماری ایف۔ اے کی کلاس ذاکر صاحب نے لینا شروع کر دی۔ ذاکر صاحب کے یہاں مہمانوں کی بہت کثرت رہتی تھی اور بسا اوقات اس کی وجہ سے کلاس کا وقت آگے پیچھے ہو جاتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ کلاس کا وقت ہو گیا ہم میں سے کوئی ذاکر صاحب کے دفتر دیکھنے گیا تو معلوم ہوا کہ باہر سے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں اور شاید آج کلاس نہ ہو سکے گی۔ ہمارے انڈونیشیا اور ملیشیا کے کچھ ساتھی تھے وہ خود تو مچھلی کے شکار کے ماہر تھے ان کے ساتھ ہی کچھ اٹکل ہمیں بھی آگئی تھی۔ موجودہ ٹیلہ ہاوس کے ساتھ ایک نالا بہتا تھا اور اس کا جوڑ جمنا سے بھی تھا۔ مچھلیاں اچھی خاصی تعداد میں مل جایا کرتی تھیں۔ ساتھیوں نے باقاعدہ پروگرام بنایا۔ جال لے کر نالے پر پہنچے جال ڈالا تو اچھا خاصا مال مل گیا۔ مچھلیاں لے کر ہوسٹل پہنچے مچھلیاں بنانے اور پکانے میں خوب لطف آ رہا تھا۔ اچھی خاصی پکنک کا مزہ تھا۔

مہمان جب چلے گئے تو ذاکر صاحب کو یاد آیا کہ مجھے تو کلاس لینا تھی۔ اِدھر اُدھر تلاش کیا تو کسی کا پتہ نہیں، صرف ایک ساتھی چلتے پھرتے دکھائی دئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو آواز دی اور سلام کیا اور کہا کہ کلاس ہے میں حاضر ہوا ہوں، وہ بڑے خفیف ہوئے اور کہا کہ باقی ساتھی انتظار کر کے چلے گئے اور اب ہوسٹل میں ہیں۔ ذاکر صاحب اس کو ساتھ لے کر ہوسٹل چلے۔ راستے میں خاصی رونق تھی۔ دیکھا کہ ذاکر صاحب آ رہے ہیں۔ دیکھتے ہی سب پریشان ہو گئے لیکن ذاکر صاحب ہوسٹل میں داخل ہوئے اور السلام علیکم کہہ کر کہا کہ میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ کلاس تھی۔ کسی کو کچھ کہتے بن نہ پڑا۔ سب چھوڑ چھاڑ کر پیچھے پیچھے ہو گئے۔ ذاکر صاحب نے نہ کوئی سوال کیا اور نہ ڈانٹ ڈپٹ کی۔ واپس سب کو لے کر کلاس میں آ گئے۔ آگے آگے ذاکر صاحب تھے۔ طلباء کلاس میں داخل ہو گئے کلاس شروع ہو گئی۔ جتنا وقت بچا تھا اس میں پڑھایا اور کلاس ختم ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ طلباء پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا کہ آئندہ کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ ذاکر صاحب کی کلاس چھوڑ سکے۔

ہر چیز کو باریکی کے ساتھ دیکھنے کی ان کی عادت تھی۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ان کی نظر رہا کرتی تھی کہ کھڑکی میں گرد یا مٹی جمع ہے اس کا صاف کرنا شروع کر دیا ہوسٹل میں کسی قسم کی صحن میں گندگی نظر آئی اور بات چیت ہی کے دوران جوتے سے اس پر مٹی ڈالنا شروع کر دیتے۔ راستے میں کوئی کاغذ کا ٹکڑا نظر آتا اس کو اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

ایک بار "ابو خاں کی بکری" ان کی کتاب کے سلسلے میں جامعہ ملیہ کی طرف سے کوئی چھوٹا سا جلسہ تھا۔ میں بھی موجود تھا۔ اس زمانے میں کھیتی کیا کرتا تھا اور خصوصی طور پر پھولوں کی کھیتی

گلاب کی کھیتی میں شاید اس وقت دہلی میں کاشت کے لحاظ سے سرفہرست تھا۔ خصوصی طور پر Red rose رائل گلاب میرے یہاں سے وافر مقدار میں روز منڈی جایا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب نے حسب معمول مجھے دیکھا۔ پوچھا کیا کر رہے ہو۔ میں نے بتایا خوش ہوئے اسی درمیان کسی نے بتایا کہ آج کل گلاب کی کھیتی میں بہت زیادہ مصروف ہیں۔ فوراً میری طرف متوجہ ہوئے۔ پوچھا۔ اچھا بتاؤ گلاب کی سب سے اچھی بنیاد Base کون سی ہوتی ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا میں ایک کاشتکار کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس باریکی کو میں کیا سمجھتا۔ میں سٹ پٹا گیا اور جب جواب بن نہ پڑا خود بولے دیسی گلاب سب سے اچھی Base ہوتی ہے۔

ذاکر صاحب ہاتھ کے کام کو بہت اہمیت دیتے تھے ان کا کوئی طالب علم کام کرتا تو بہت خوش ہوتے تھے۔ رڑکی میں ایک والد صاحب کے جاننے والے بیکری کا کام کرتے تھے۔ والد صاحب نے مجھے وہاں کام سیکھنے بھیج دیا۔ وہاں میں کام سیکھ کر جامعہ آیا اور الفا بیکری کے نام سے ایک بیکری قائم کی۔ ذاکر صاحب نے اس کا افتتاح کیا اس میں جامعہ کے اسٹاف ممبر بھی شریک ہوئے۔

میں خود بھی کام کرنے والوں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ایک دن میں کام کر رہا تھا۔ ہاتھ کہنیوں تک میدے میں لت پت تھے۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں گیا تو ذاکر صاحب کو دیکھ کر گھبرا گیا لیکن ان کے چہرے پر خوشی تھی میں کیا بتاؤں۔ کچھ دیر کام دیکھتے رہے پھر بولے۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے شکر کی بیماری ہے۔ اس میں براؤن بریڈ مفید ہوتی ہے کیا تم بنا سکتے ہو میں نے ہاں تو بھر دی لیکن اس کا مجھے تجربہ نہ تھا۔ کام کرنے والے جانتے تھے ان سے مشورہ کیا اور براؤن بریڈ تیار کر کے میں نے گھر بھیجنا شروع کی۔ انھوں نے معلوم نہیں کھائیں یا نہ کھائیں لیکن اس کی قیمت چکانے کی فکر لاحق ہوگئی۔ قیمت لینے سے میں نے انکار کر دیا ان کا اصرار اور میرا انکار۔ ایک دو ہفتہ بعد انھوں نے بہانہ کیا کہ اب ضرورت نہیں ہے اور روٹی بند کر دی۔ مجھے یاد ہے کہ کسی انداز میں مدت تک وہ اس کی قیمت چکاتے رہے۔

میرے ایک دوست ستیش چندر جو پہلے جامعہ اسٹاف کے ممبر تھے بعد میں نئی دہلی فیملی پلاننگ میں ایجوکیشن افسر ہوگئے تھے مجھ سے بولے کہ کیا خیال ہے فیملی پلاننگ کا ایک جلسہ اوکھلا چوپال پر کرادیں اور ذاکر صاحب اس وقت نائب صدر جمہور یہ تھے شرکت کی درخواست کریں۔ میں اس وقت تعلیم و ترقی کے دیہی مرکز کا کام کرتا تھا۔ اوکھلا میں بھی ہمارا کام تھا۔ میں نے ہاں بھر لی۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ہم لوگ ذاکر صاحب کے سامنے آتے ہوئے ذرا گھبرا گئے تھے۔ ذاکر صاحب گاڑی میں بیٹھ گئے کچھ یاد آیا تو میری تلاش ہوئی۔ بلوایا گیا تو کھڑکی کے پاس آکر مجھ سے بہت رازدارانہ انداز میں بولے تمہارے ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں

میں نے عرض کیا کہ ماشاء اللہ ۶ بچے ہیں۔ میری طرف معنی خیز انداز میں دیکھا اور ڈرائیور سے کہا کہ چلو اور یہ کہہ کر چلے گئے۔ سوچتے ہوں گے کہ اب فیملی پلاننگ کی سوجھی ہے۔

نائب صدر جمہوریہ ہونے سے پہلے اوکھلا آئے تھے۔ اپنے گھر میں مقیم تھے۔ بھارت سیوک سماج نے اوکھلا اسکول میں اپنا کیمپ لگایا تھا۔ اس سلسلے میں ان لوگوں نے ذاکر صاحب کو کیمپ میں مدعو کیا۔ ذاکر صاحب گھر سے پیدل اوکھلے کے بیچ سے ہوتے ہوئے اوکھلا اسکول پہنچے اور راستہ میں اوکھلا گاؤں کو جیسے پہلے دیکھا تھا ویسا ہی پایا، کوئی خاص ترقی اس میں ان کو نظر نہ آئی۔ نہ صفائی نہ سڑک، نہ صاف ستھرے مکان۔ انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا یہاں جامعہ کی طرف سے کوئی کام ہوتا ہے لوگوں نے بتایا کہ جی ہاں۔ تعلیم بالغان اور اس کے ساتھ کچھ اور کام بھی ہوتے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ عبدالستار بھی دیہی مراکز کے انچارج ہیں۔ اور ان ہی کے ذمہ یہ کام ہیں۔ اس وقت تو خاموش ہو گئے اور جلسہ سے فارغ ہو کر مکان واپس چلے گئے۔

اسی دوران ایک دن میں نے گھر پر حاضری دی۔ ذاکر صاحب نے ایک چھوٹا سا کام میرے سپرد کیا تھا۔ اس کے سلسلے میں میں خورشید عالم صاحب کے پاس گیا۔ یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ موصوف محترم اندر ہی ہوں گے۔ بے تکلف گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند منٹ بعد دیکھتا ہوں ذاکر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ ہوا خراب ہوئی۔ میں جلدی بولا ماسٹر صاحب (اس زمانے میں ہم لوگ ماس صاحب ہی کہا کرتے تھے) آپ سے کام نہیں خورشید صاحب سے کام ہے۔ بولے تمہیں تو مجھ سے کام نہیں لیکن مجھے تم سے کام ہے۔ یہ کہہ کر بات کرتے ہوئے مجھے باہر لے آئے۔ اور بہت اطمینان سے بولے۔ یار ستار۔ میرا ایک خیال ہے اوکھلا گاؤں میں آگ دیدو میں نے بولنے کی ہمت کی۔ پھر بولے، گھبراؤ نہیں۔ میری ذمہ داری تم اس وقت گاؤں میں آگ دیدو۔ دوبارہ بسے گا تو اچھا بسے گا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پروفیسر محمد مجیب صاحب آنکلے۔ مجھے چھوڑ مجیب صاحب میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ اوکھلا گاؤں میں آگ دیدو۔ مجیب صاحب تیور سمجھ گئے ویسے بھی ٹکر لینے کی ہمت اس وقت کسی میں نہ تھی۔ مجیب صاحب بولے ہاں خیال تو اچھا ہے۔ بہت اچھا۔ یہ کہنا تھا کہ مجھے تو چھوڑ دیا اور مجیب صاحب سے لپٹ گئے اور معلوم نہیں کیا کیا کہا اس لیے کہ مجیب صاحب ہی ایک طرح سے تعلیم و ترقی دیہی مراکز کے ذمہ دار تھے۔ میں تو موقع دیکھ کر وہاں سے کھسکا مڑ کر نہ دیکھا۔

ذاکر صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی کام اس قابل ہے کہ کیا جائے تو وہ اس قابل ہے کہ اس کو حسن و خوبی کے ساتھ کیا جائے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن میں ان کا یہ تاثر نظر آتا ہے۔ ہر کام میں ان کا انداز اچھوتا اور نیا پن لیے ہوئے ہوتا تھا۔ جامعہ میں اس زمانے میں جلیانوالہ باغ کے حادثہ کو یاد دلاتے اور اس کو قومی سطح پر منانے کا مستقل پروگرام بنا تھا

اس کو قومی ہفتہ کا نام دیا جاتا تھا۔ ۱۴ اپریل کو جامعہ میں عام تعطیل اس طرح پر ہوتی تھی کہ تمام کام کرنے والے چپراسی، باورچی چھوٹے کارکنان۔ صفائی کرمچاری سب چھٹی پر رہتے، اور سارا کام اساتذہ اور طلبا کرتے۔ کوئی صفائی کر رہا ہے کوئی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے کوئی کھانا پکا رہا ہے اور طلبا اور اساتذہ ہی نالوں کی صفائی اور دھلائی کرتے تھے اس زمانے میں ڈرائی لیٹرین Dry latrine تھے۔ فلش لیٹرین کا رواج نہ تھا۔ ہم لوگ بغیر کسی پس و پیش کے وہ پاخانے بھی صاف کرتے۔ کسی قسم کی کوئی جھجک یا شرم محسوس نہ کرتے اور یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا۔ قومی ہفتہ کا پروگرام سال میں ہونا ضروری ہوتا تھا۔ شام کو جلسہ ہوتا۔ قومی ہفتہ کی ضرورت کا احساس اور جلیانوالہ باغ کے واقعہ کو اجاگر کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذہن میں یہ بات بھی بیٹھ گئی کہ کوئی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ اس ٹریننگ کا اثر مجھ پر اب تک ہے۔ ۱۵۔۲۰ سال پہلے ایک صفائی کرمچاری سے ناچاقی ہوگئی اور اس نے گھر کا کام چھوڑ دیا میں نے بہت اطمینان کے ساتھ اپنے گھر کی Dry latrine تقریباً دو تین ماہ تک صاف کیں۔ بچوں کو بلا کر دکھاتا کہ اس سے بہتر صفائی تو میں خود کر لیتا ہوں۔ گھر کے لوگ اس بات پر شرم بھی محسوس کرتے تھے اور اس کو چھپاتے لیکن مجھے کبھی عار محسوس نہ ہوا۔

ذاکر صاحب کی انفرادی زندگی کو بھی میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مالی مشکلات جب ادارے ہی میں تھیں تو ان کا گھر اس سے متاثر کیوں نہ ہوتا ہوگا۔ بیگم صاحبہ بھینس اور مرغیاں پالتی تھیں ایک آدھ گائے بھی تھی اور زندگی نشتم پشتم چلتی رہتی تھی لیکن کبھی لباس شیروانی پر ایک دھبہ نظر نہ آتا۔ دفتر میں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ تکیہ کے سہارے ڈیسک پر کام کرتے تھے۔ ایک کتبہ جوان کے دفتر میں آویزاں تھا، آج بھی مجھے یاد ہے۔ وہ کتبہ خوشنویسی کا شاہکار تو تھا ہی لیکن معنوی اعتبار سے اس میں بہت زیادہ گہرائی تھی۔

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

ذاکر صاحب کا برتاؤ اپنے ساتھیوں کے ساتھ برابری کا رہتا تھا۔ ہر شخص کو ایک مقام دیتے تھے سب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے جہاں تک بن پڑتا ساتھیوں کی چھوٹی موٹی مدد بھی کر دیا کرتے۔ مل جل کر کام کرتے سے انھیں ایک ایسا ہنر پیدا ہو گیا تھا کہ صلاحیتوں کے لین دین کی کیفیت تھی۔ وہ دوسروں کو سکھاتے بھی تھے دوسروں سے سیکھتے بھی تھے ذاکر صاحب کی شخصیت تنہا شخصیت نہ تھی وہ ان کے سارے ساتھیوں کی صلاحیتوں اور محنتوں کا خلاصہ تھا اس لیے ذاکر صاحب کے حالات سمجھنے میں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ سارے

ساتھیوں کی اجتماعی کوششوں اور کاوشوں کا نام ذاکر حسین تھا۔

وہ پکے مسلمان تھے اور اس میں ان کا مطالعہ بھی بہت تھا۔ درویش صفت تھے اور اخلاص کی وجہ سے ان میں ایک غیر معمولی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی۔ ہندوستان کا تاریخی پس منظر خصوصی طور پر مسلمانوں کے حالات جس طرح مختلف زمانے میں کروٹیں لیتے رہے تھے اور اس میں جو نشیب و فراز اسلامی معاشرہ میں پیدا ہوتے رہے وہ ان کی نظر میں تھے شاہ ولی اللہ کی تحریک بھی ان کے ذہن میں تھی صوفی ازم سے بہت متاثر تھے اس لیے وہ سخت حالات میں آگ میں کودنا جانتے تھے۔ وہ ہر طرح کے لوگوں سے خواہ وہ کسی مذہب یا کسی علاقے کے ہوں اپنی میل جول بڑھا لیتے تھے اور ان سے اپنی تعلیمی تحریک میں کام لیتے تھے۔

جامعہ میں اس زمانے میں طلبا کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن مختصر سی تعداد میں وہ زیادہ اہلیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ ملک کے ہر کونے سے طلبا جامعہ میں آکر تعلیم حاصل کرتے بہار، مدراس، کیرل، پنجاب، یوپی، بنگال کے علاوہ ہندوستان سے باہر کے طلبا بھی جامعہ میں آکر تعلیم حاصل کرتے اس میں ساؤتھ افریقہ، جنوبی بحرین ملیشیا کے طالب علم بھی خاصی تعداد میں آتے۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ ذاکر صاحب نے ان تمام علاقوں میں کسی نہ کسی حد تک اپنا اثر قائم کر رکھا تھا اور یہ ایک ساکھ بن گئی تھی۔ ورنہ کوئی سرپرست کیوں اتنی دور سے اپنے بچوں کو ایسی درس گاہ میں تعلیم حاصل کرنے بھیجتا۔ جس کا مستقبل تاریک تھا کہ حکومت وقت کی مدد اور ڈگریوں کی منظوری اس ادارے کو عرصہ دراز تک حاصل نہ ہوسکی تھی اور بظاہر حکومت کی آنکھ میں تو یہ تحریک کی طرح تھی اور کانٹے کی طرح چبھتی تھی۔

ذاکر صاحب نے تعلیمی کاموں کے ساتھ اپنا نصب العین متحدہ قومیت کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس کو میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں مسلمانوں نے انگریزوں کی حکمت عملی کے مقابلہ کے لیے مختلف محاذ بنائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک جماعت نے جو مذہب کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں اور مختلف خیالات کے لوگوں کے ساتھ کندھے ملانے کے لیے جولائحہ عمل تیار کیا تھا۔ ذاکر صاحب نے اس سے فائدہ اٹھایا اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت جو مذہبی انفرادیت کے ساتھ انگریز دشمنی اور ملکی سیاست میں سب لوگوں کو لے کر قدم بڑھاتے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے ساتھیوں نے جو انگریز دشمنی میں قومی سطح پر جو کار ہائے نمایاں انجام دیے تھے وہ ان کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ہمیشہ ان کی عزت کرتے اور ان سے مدد لیتے۔ اس سلسلے میں مولانا محمود الحسن صاحب نے تو جامعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ مولانا محمد علی یہاں کے روح رواں تھے۔ دیوبند اور علی گڑھ کی تحریک سے متناط انداز میں برابر مدد لیتے۔ اپنے کاموں میں ان کی جگہ رکھتے اور اس سے فیضیاب ہوتے تھے میں نے خود دیکھا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی جو جلاوطن ہو کر روس چلے گئے تھے اور بعد میں ہندوستان آگئے تھے ان سے انھوں نے کافی فائدہ اٹھایا:

اور ان سے متاثر ہو کر بیت الحکمت کی بنیاد رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا محمد الیاسؒ جو تبلیغی جماعت کے بانی تھے ان سے ان کا کافی ربط ضبط تھا۔ مولانا موصوف مسلمانوں میں دینی جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے سیاست سے دور اور بالکل بے تعلق رہنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ ان کا تعلق دیوبند تحریک سے تھا وہ متحدہ قومیت کے خیال سے متفق رہا کرتے تھے میں اس بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ذاکر صاحب سے ان کا تعلق تھا اور ذاکر صاحب کسی تعصب خواہ کسی شکل میں ہو برداشت نہیں کرتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ اچھا مسلمان ہو اور ملک اور سیاست کے کاموں میں کندھے سے کندھا ملا کر چلے۔

ڈاکٹر انصاری ملک کے قومی رہنما رہے اور سیاست میں ان کی شخصیت اہم سمجھی جاتی تھی۔ وہ امیر جامعہ رہے لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ موت نے ان کو آ لیا جامعہ پر اس کا بہت زیادہ اثر ہوا اور ذاکر صاحب تو اس موقع پر بہت زیادہ متاثر ہوئے میں اس وقت ابتدائی ششم کا طالب علم تھا مسوری ایکسپریس میں ڈاکٹر انصاری کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ جامعہ پر غم کے بادل چھا گئے۔ طے ہوا کہ ڈاکٹر انصاری کو اوکھلا جو بعد میں جامعہ نگر ہو گیا ان کو یہاں دفن کیا جائے لاریوں کا انتظام ہوا اور جامعہ کے تمام طالب علم اور اساتذہ اپنے اس محسن کی نعش کو لے کر جامعہ نگر آ گئے۔ ڈاکٹر انصاری کے جنازے کے ساتھ ان کے بھائی حکیم نابینا بھی آئے تھے۔ میں تھا تو چھوٹا سا لیکن قبر کے قریب ہی موجود تھا۔ ذاکر صاحب کو لوگوں نے ہنستے بھی دیکھا ہوگا سنجیدگی کا رنگ بھی دیکھا ہوگا ان کا پروقار چہرہ بھی دیکھا ہوگا لیکن شاید ان کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا جس وقت تدفین سے فارغ ہوئے تو ذاکر صاحب بہت خاموش کھڑے تھے اور کہنے لگے کہ آئیے اب چلیں اور یہ کہہ کر اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ میں آج تک اس کو نہیں بھولا۔ ذاکر صاحب کا کوئی نسبی رشتہ نہیں تھا۔ عمر میں بھی کافی فرق رہا ہوگا۔

لیکن صرف وہ جذبہ تھا کہ جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اس کا ایک مخلص کارکن چلا گیا۔ شاید آل انڈیا ریڈیو کے ریکارڈ میں ڈاکٹر انصاری کے انتقال پر ذاکر صاحب کی جو تقریر نشر ہوئی تھی اس سے اندازہ ہوگا کہ ذاکر صاحب ان کی موت سے جو نقصان ہوا تھا اس کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔

اسی طرح کا ایک حادثہ مولانا شوکت علی صاحب کا انتقال تھا۔ مولانا محمد علی کا جو تعلق اور احسان جامعہ پر تھا اس کو کون نہیں جانتا۔ وہ اس وقت خلافت اور قومی تحریک کے روح رواں تھے۔ مولانا شوکت علی ان کے بھائی۔۔۔ اور دست راست تھے اگرچہ ان کو وہ مقبولیت نہ مل سکی تھی جو مولانا محمد علی کو ملی تھی۔ مولانا شوکت علی کے انتقال پر ذاکر صاحب نے ان کی تدفین کا انتظام کیا جامعہ کے تمام اساتذہ اور طالب علم ان کے جنازے کو لے کر چلے۔

جنازے کے ساتھ ایک جھنڈا بھی تھا یہ مجھے یاد نہیں کہ جھنڈا کیسا تھا لیکن یہ جنازے کے جلوس میں قرول باغ سے باڑہ ہندو راؤ ، صدر بازار، چاندنی چوک ہوتا ہوا جامع مسجد پہنچا اور ہرے بھرے شاہ کے مزار کے پاس جامعہ کے انتظام میں ان کو سپرد خاک کیا گیا ۔ اب وہ قبر ایک مسجد کے بیچ میں ہے مینا بازار کے قریب ایک مسجد ہے اس میں کبھی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہ قبر سامنے رہتی ہے اور یاد آتا ہے کہ ان کی تدفین میں ہم لوگ شریک تھے اور وہیں سے قریب دوسو قدم کے فاصلہ پر مولانا ابوالکلام آزاد کا مقبرہ ہے جب یہ دونوں نظر آتے ہیں تو عجیب طرح کا احساس ہوتا ہے ۔

آج کل لوگ بچوں کی اسکول کی تعلیم کو بہت اہمیت دیتے ہیں وہ اس لیے کہ یہی ذہنی نشوونما کا وقت ہوتا ہے اور بچہ جو اس وقت سیکھتا ہے اس کی زندگی کے ہر میدان میں اس کا اثر غالب رہتا ہے ذاکر صاحب نے یہ بات آج سے ۵ سال پہلے محسوس کی اور اس پر خصوصی توجہ دی اور ایسا راستہ بنایا کہ بعد میں اوروں نے ان کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا ۔

ابتدائی اور ثانوی اسکول دونوں اقامتی تھے اگرچہ ڈے اسکالر طالب علموں کو بھی داخلہ مل جاتا تھا لیکن خصوصی توجہ بورڈنگ ہاؤس کے طالب علموں پر رہتی تھی ۔ اس کے لیے ۲۴ گھنٹے کے اوقات تعلیمی اور معاشرتی ماحول میں گزرتے تھے اور طلباء کی ذہنی نشوونما اور ان کی نگہداشت پر ہمہ وقت نظر رہتی تھی ۔ تعلیم کے ساتھ اچھا صاف ستھرا رہن سہن، ڈسپلن کھیل کھانے کے آداب ۔ اسپورٹس اور مذہبی تعلیم جس سے ایک طالب علم متاثر ہو سکتا ہے ۔صرف اقامتی درسگاہ میں میسر آسکتی تھی ۔

اسکول میں بچوں کا بنک بچوں کی دکان ۔ بچوں کی عدالت الیکشن کھلی ہوا کا مدرسہ جو اپنے اسکول سے دور جاکر بنانا ہوتا تھا وہ اسکول کے لازمی جز تھے ۔ بچے صاف ستھرے کیسے رہتے ہیں ۔لباس کس طرح کا پہنتے ہیں ۔ آپس کی بول چال اور نشست و برخاست کے آداب بچوں میں غیر شعوری طور پر پیدا ہو جاتے ہیں ۔ بچوں کا ایک رسالہ پیام تعلیم کے نام سے نکلتا تھا جو ہر طالب علم کو پڑھنے کے لیے دیا جاتا تھا ۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملک اور غیر ممالک کے تعلیمی ماہرین اس تجربے کو دیکھنے آتے اور ذاکر صاحب ان لوگوں کو خصوصی طور سے مدرسہ دکھاتے وہ لوگ اس سے متاثر ہوتے تھے اور تعریفی کلمات لکھ کر واپس جاتے تھے ۔

بچوں کو جیب خرچ کے طور پر تین آنے ہفتہ ملتا تھا ۔ بچوں کو خرچ کرنے کی آزادی تھی ۔ اس زمانے میں بہت تو نہیں لیکن خاصے ہوتے تھے ۔ بچے باہر سے غلط ماحول میں جاکر خرید و فروخت نہ کریں اس کا بھی انوکھا انتظام ہوتا تھا ۔ بچوں کا بینک اپنا نوٹ چھپواتا تھا جو منتخب دکانوں پر چلتے تھے ۔ اس طرح بچے اِدھر اُدھر جانے سے اور غلط خرید فروخت سے بچ جاتے تھے ۔

دیکھنے میں تو یہ بات معمولی سی تھی لیکن بچے کی تربیت پر اس کا اچھا اثر پڑتا تھا مجھے افسوس ہے کہ اب اس طرح کا ماحول بہت کم باقی رہا ہے۔ اتالیق اور اساتذہ میں وہ لگن اور دلچسپی نہیں رہی ہے اور یہاں کا قصور نہیں بلکہ حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے کہ آوا کا آوا آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ اب تو داخلہ امتحان اور جلدی جلدی تعلیم پوری کرنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ اس کا ہوش کس کو ہے کہ بچہ کس ماحول میں پرورش پا کر کیسا بنا۔ ہم لوگ اس وقت ملک کے Convent اسکولوں کی طرف دوڑتے ہیں اور داخلوں کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں صرف اس لیے کہ ان کے یہاں بچوں کی تعلیم و تربیت اور ڈسپلن کا معقول انتظام ہے۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر لگن ہو تو ہمارے اسکولوں میں بھی وہی ماحول بہت تھوڑی سی محنت سے بن سکتا ہے۔

اسکول کی تعلیم سے ذاکر صاحب کو اس قدر دلچسپی تھی کہ ایک زمانے میں وہ مدرسہ ثانوی کے ہیڈ ماسٹر بن گئے اور اسکول کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس زمانے میں یہ بات نہ تھی کہ کون کیا کام کرتا ہے۔ جو بھی کام کو بہتر کر سکتا تھا یا کرنے کی کوشش کرتا تھا اسی کے ذمہ وہ انتظام کر دیا جاتا اسی زمانے کا ایک بہت دلچسپ لطیفہ یاد آگیا۔

میرے چھوٹے بھائی عبدالرب منن مرحوم ساتویں جماعت میں فیل ہو گئے۔ اس زمانے میں پاس فیل کے ساتھ ترقی دینے کا بھی رواج تھا امتحان کا عجب عجب ذریعہ ہوتا تھا میرے ریاضی کے استاد برکت علی صاحب مرحوم جو اصولوں کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ روزمرہ کے کام اور ماہانہ تعلیمی رپورٹ بھی بنایا کرتے تھے۔

تو میرے بھائی ساتویں جماعت میں فیل ہو گئے مجھ سے آکر بولے کہ میں تو فیل ہو گیا، اب کیا کروں میں نے فوراً ہمت بندھائی اور وعدہ کیا اور بڑے اطمینان سے کہہ دیا کہ میں ذاکر صاحب سے سفارش کر کے تمہیں ترقی دلا دوں گا۔ بات یہ تھی کہ ذاکر صاحب اور ان کے دوسرے ساتھی طالب علموں سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ ہر طالب علم یہ سمجھتا تھا کہ مجھے ان کی محبت میں خاص مقام حاصل ہے۔

میں بھائی کو لے کر ذاکر صاحب کے دفتر میں گیا۔ اس وقت ذاکر صاحب صاف ستھرے فرش پر بیٹھے کسی کام میں مشغول تھے۔ میں نے بے تکلفی سے چق اٹھائی اور اندر آنے کی درخواست کی۔ انھوں نے بشاشت سے فرمایا آؤ۔ آؤ۔ میں بھائی کو لے کر حاضر ہو گیا۔ بولے ہاں، کہو کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ بولے ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ ویسے میں بے خبر رہتا ہوں لیکن بہت باخبر ہوں۔ میں عرض کیا کہ یہ ساتویں میں فیل ہو گیا۔ بولے۔ اچھا فیل ہو گیا۔ بڑا افسوس ہے۔ پھر کیا ہو۔ میں نے بڑی بے تکلفی سے کہا کہ اس کو ترقی دیدیجئے۔ بولے اچھا، اچھا ترقی دیدوں۔ پھر تھوڑی دیر بعد خاموش ہو گئے اور چپراسی کو آواز دی۔ کفیل خاں، کفیل خاں۔ کفیل خاں آئے۔ ارے بھائی کفیل خاں ذرا کالج کے داخلہ کا رجسٹر لے آؤ۔

میں کچھ سٹ پٹایا اور کچھ بولنا چاہا۔ خود بولے میں اس کا داخلہ کالج میں کر دیتا ہوں۔ میں گھبرا گیا۔ کچھ بولنا چاہا لیکن کیا بولتا۔ خود بولے ارے بھائی کیا پریشانی ہے۔ یہ گھر کی بات ہے۔ میں اس کا داخلہ کالج میں کیے دیتا ہوں۔ مجھے پسینہ آ گیا۔ کہوں تو کیا کہوں۔ ایسا پھنسا کہ نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ اٹھ کر باہر کا راستہ لیا۔ ذاکر صاحب نے نہ غصہ کیا نہ بحث کی بس ایک جملہ میں بات ختم کر دی۔ بات کی بات اور تفریح کی تفریح۔ اس کے بعد کیا مجال جو کسی کی سفارش کا خیال بھی کیا ہو۔

حالات نے کروٹ لی۔ سیاسی فضا پر سیاہ بادل نظر آنے لگے۔ مسلم لیگ اور کانگریس نبرد آزما ہو گئے انگریزوں کا کھیل دنیا ہے جنگی حالات عجب فضا تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ مسلمان جوش میں آکر پاکستان کا نعرہ لگا رہے تھے متحدہ قومیت کا ڈھانچہ پارہ پارہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ ملک کا سمجھ دار طبقہ جس میں تعلیمی اور مذہبی ذمہ دار لوگ شامل تھے۔ قوم کو ہوش کی باتیں سمجھانا چاہتے تھے لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ مسلمان زیادہ تر مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئے تھے اور پاکستان ہی اپنا حل سمجھتے تھے۔ مختلف ہندو اور مسلم لیڈروں نے کوشش کی۔ مختلف تجاویز سامنے آئیں لیکن دیکھتے دیکھتے نواکھالی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ گاندھی جی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ اچھے اچھے اور سمجھ دار لیڈروں کے ذہن میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔

اسی زمانے میں جامعہ کی جوبلی منائی جانے والی تھی۔ اسی پُر آشوب دور میں کون مائی کا لال جوبلی کا خواب دیکھ سکتا تھا لیکن کچھ مرد مجاہد ایسے بھی ہوتے ہیں کہ حالات کے اچھے اور بُرے ہونے پر ہوش نہیں کھوتے۔ جو سوچتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ جامعہ جوبلی منانا طے ہو گیا تھا۔ اگرچہ حالات ناگفتہ بہ تھے یعنی یہاں تو لوگوں کو آگ سے کھیلنے کا سلیقہ آتا تھا۔ آگ سے بچ کر اپنا راستہ نکال لیتے تھے اور بڑے سے بڑا کام کر گزرتے تھے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ ہر طبقہ میں لوگ ان کی قدر کرتے تھے۔ یہ قدر خواہ مخواہ نہ تھی بلکہ وہ اس کے لائق تھے۔ لوگ ان کو پرکھ کر ان کی قدر کرنے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔ گاندھی جی جیسی شخصیت کی نگاہ واردھا اسکیم مرتب کرنے میں ذاکر صاحب پر خواہ مخواہ نہیں پڑی تھی اور ذاکر صاحب نے بھی مسلمانوں کو ناراض کر کے جو غلطی سے رچھوٹا ہوا ہے اس کو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے اس کو پورا کر کے دم لیا۔

ذاکر صاحب ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہم تو تعلیم کا کام کرنے والے لوگ ہیں۔ ہمیں سیاست سے کیا سروکار لیکن پھر بھی دیکھا گیا کہ بڑے بڑے سیاسی جغادری ان سے آکر مشورہ کرتے اور ان سے پرخلوص دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ اس میں مسلم لیگ کے بھی بہت سے رہنما تھے جن سے ذاکر صاحب کا قریبی تعلق تھا لیکن ذاکر صاحب نے بنیادی اصولوں پر کبھی مفاہمت نہیں کی وہ متحدہ قومیت کے علمبردار تھے ملک کے لیے اسی کو حل سمجھتے تھے مسلمانوں کا مفاد بھی اسی میں سمجھتے تھے اور اسی پر آخر تک کاربند رہے۔

مالی امداد کے سلسلہ میں وہ نوابوں سے بھی ربط ضبط رکھتے تھے اور حکومت وقت کی مخالفت کے باوجود ان سے مالی امداد۔۔ لیتے تھے۔ غرضیکہ ہر طبقہ سے ان کا تعلق تھا اور اس کو کارآمد سمجھ کر اپنے کام میں امداد لیا کرتے تھے۔

جامعہ جوبلی کے موقع پر کوئی بھی ہوش مند رائے نہیں دے سکتا تھا کہ ملک کی ایسی

فضا میں جامعہ جوبلی کا جشن منایا جائے۔ لیکن جشن انہی حالات میں منایا گیا اور خوب منایا گیا۔ حیدر آباد بھوپال اور رامپور ریاستوں سے مالی امداد لی گئی۔ ملک کے خوش حال اور امیروں سے بھی چندہ لیا گیا اور بڑے زور شور سے جوبلی منائی گئی اور ایسی کوئی بات بھی نظر نہ آئی ملک کے حالات اور مالی مشکلات کی وجہ سے کوئی کام ادھورا چھوڑ دیا گیا ہو۔

اس موقع پر ہندوستان کی تاریخ میں شاید یہ انوکھی اور انہونی بات تھی جو صرف ذاکر صاحب کی فہم و فراست ان کی ہر دلعزیزی، جواں مردی اور دلفریبی اولوالعزمی کی وجہ سے منظر عام پر آئی۔

ملک کی تقسیم ہوگئی جس کا جہاں سینگ سمایا بھاگ کھڑا ہوا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے۔ اُدھر ہندو ادھر مسلمان مخالف سمتوں کی طرف دوڑے۔ کسی کو ہوش نہیں تھا۔ خون کی وہ ہولیاں کھیلی گئیں کہ انسان نے انسانیت سے منہ پھیر لیا۔ اور ایسا پھیرا کہ اس کے کرتوت پر درندہ جانوروں کو بھی شرم آنے لگی۔ زندہ تو زندہ مردوں کی قبروں تک کو نہ بخشا گیا۔

دہلی کے گرد و نواح کو بھی اس آگ نے لپیٹ میں لے لیا۔ برادران وطن اپنا منصب اور شرافت بھول کر اس سیلاب میں بہہ گئے۔ دہلی شہر کے علاقے قرول باغ، پہاڑ گنج، سبزی منڈی، صدر بازار، باڑہ ہندوراؤ اور چھوٹے علاقوں کے لوگ تو دہلی سے بے سر و سامانی میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ حکومت بھی کیا کرتی۔ پرانا قلعہ اور ہمایوں کے مقبرے میں کیمپ لگا دئے گئے۔ ایک جم غفیر تھا جو ان میں آجاتا تھا۔ کتنے مارے گئے۔ کتنے بے گھر ہوئے کوئی حساب نہ تھا۔ لاشوں کے ڈھیر آگ کے شعلے عورتوں کی آہ و بکا غرض عجیب منظر تھا۔ آس پاس کے دوسرے علاقے کے لوگ جہاں جہاں مسلمان تھے گھر بار چھوڑ کر پناہ لینے کیمپ میں آگئے۔ شاہدرہ خالی ہوا، جھجبل کر نجہ خالی ہوا غرضکہ سب کچھ لٹ گیا۔ ادھر پاکستان سے جو لوگ بھاگ کر آئے کم و بیش یہی حال تھا۔ جو ٹرین آتی تھی اس میں لغشیں اور خون جو قافلے آتے تھے وہ برباد اور مفلوک الحال۔ یہاں کے لوگ اس منظر کو دیکھ کر اور بھی برافروختہ ہوجاتے تھے اور بدلہ لینے کے لیے یہاں کے لوگوں کو نشانہ بنا لیتے تھے مہرولی خالی ہوا، تغلق آباد، بدرپور، کلوکڑی۔ کیا کیا نام گنائے جائیں۔ کلام پاک کی آیت کے مفہوم کو کہ "آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں دل اندھے ہوجاتے ہیں"۔ اس طرح کا منظر تھا۔

ان حالات میں اوکھلا جامعہ نگر جیسی بستی کی کیا حقیقت تھی۔ چاروں طرف کالے بادل۔ رات ہوتی تو معلوم ہوتا کھا جائے گی۔ دن ہوتا تو ہر طرف پیڑ پودے بھی خونخوار دشمن نظر آنے لگتے۔

اس وقت گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ جامعہ کے طلبا اور اسٹاف کے لوگ اپنے اپنے وطن گئے تھے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کی عدم موجودگی کیا رنگ لاتے گی۔ ذاکر صاحب کے دست راست ساتھیوں میں صرف چند لوگ رہ گئے تھے۔ اسے جیسے کیلاٹ حافظ فیاض صاحب مرحوم ماسٹر عبدالحئی

رہ گئے تھے۔ کچھ گنے چنے اسٹاف کے لوگ اور طلبا رہ تھے۔ سر جوڑ کر بیٹھے کہ اب کیا ہو۔ عجیب عجیب طرح کی رائے لوگ دے رہے تھے۔ کچھ لوگ پاکستان اور کچھ رامپور جانے کے حق میں تھے۔ ایسے ہی مواقع آتے ہیں جب کوئی سرپھرا خاموش مرد مومن اپنے دل کے نور اور روشنی سے راستہ نکالتا ہے۔ ذاکر صاحب کا فیصلہ تھا کہ چاہے جو حالات ہوں ہم یہیں رہیں گے۔ جس ادارے کی اب تک آبیاری کی ہے اس کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے چاہے ہماری جانیں جان آفریں کے سپرد کر دی جائیں۔ ہمت بندھانے والا کوئی ہوتا ہے اس کی پشت پناہی قدرت کی طرف سے کی جاتی ہے۔ سب نے بے چون و چرا اس رائے کو سر چڑھایا۔ کھانے کا انتظام ماسٹر عبدالحی کے ذمے۔ انتظامی معاملات اختر حمید صاحب کے ذمے جو اسٹاف کے ذمہ دار ممبر تھے اور علامہ مشرقی کے داماد تھے۔ ان کو ڈکٹیٹر کا درجہ دے دیا گیا۔ پروفیسر سے جے کیڈٹ جو اسپورٹس مین تھے شکاری بھی اور معلم بھی انھوں نے جس قدر لوگوں کے پاس لائسنس کے ہتھیار تھے اس کی فہرست بنائی اور سب لوگوں کو جمع کر کے جامعہ اسکول کے برآمدے میں اپنا مورچہ بنا لیا۔

ہر طرف سے بری اطلاعات آتی تھیں شہر جلتا ہوا یہاں سے دکھائی دیتا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا لیکن مرد مومن اپنے آشیانے کے چند تنکوں پر حصار کر کے ان کو بچانے میں ملیتان کر رکھا تھا۔ راشن کی کمی ہوتی گئی۔ پیٹ دو روٹی کی کس متی تھیں پھر ایک روٹی ملنے لگی پھر بھی لوگوں کے ماتھے پر بل نہ پڑے۔ آس پاس کے دیہاتوں جن سے جامعہ کے تعلقات تھے ان حالات کے باوجود جو کچھ ممکن تھا ساتھ دیا۔ کیڈٹ صاحب کی مدد سے مسیح گڑھ چرچ نے کچھ اناج جو ان کے اسٹاک میں تھا۔ دیدیا۔

حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ ہر روز خبریں آتی تھیں کہ دھاڑ ایک منظم اور مسلح مجمع جن کا کام تخریب کاری بلکہ تباہ کاری تھا، آج آئے گا کل آئے گا۔ دن میں بھی آ سکتا ہے رات میں بھی۔ حکومت کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ایڈمنسٹریشن نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس موقع پر ذاکر صاحب ڈھلا گاؤں کو بھی جو اس وقت بہت چھوٹا تھا اپنے آغوش میں لے لیا۔ اس سے جامعہ کو تو کسی قسم کی مدد نہ مل سکتی تھی۔ لیکن جامعہ ان کی مدد اس طرح کر سکتی تھی کہ جو ہمارا حال وہ تمہارا لیکن ہم تمہیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ شام کو عورتیں بچے سب جامعہ کے ابتدائی مدرسہ میں آ جاتے۔ ہم لوگ ثاب عموں کی حیثیت رکھتے تھے۔ رات رات بھر ان کی حفاظت کرتے تھے۔ دن میں وہ لوگ گاؤں میں واپس چلے جاتے اور یہی سلسلہ چلتا رہتا۔

ایک دن شام کو پنڈت نہرو یکایک آ گئے۔ ذاکر صاحب سے تعلق اور جامعہ کی فکر تھی۔ اس افراتفری میں انھیں جامعہ یاد رہی۔ ذاکر صاحب سے انھوں نے آس پاس کے علاقوں کی باتیں بتائیں کہ وہ کس طرح مسلح اور منظم بھیڑوں کو روکتے رہے اور کیا کیا نتیجہ نکلا۔ باتیں کافی دیر تک ہوئیں۔ ذاکر صاحب سے پوچھا تو ذاکر صاحب نے بڑے اطمینان سے اپنا یہاں

چھپنے اور ٹھہرنے کا فیصلہ سنایا ورنہ ہو سکتا تھا پنڈت نہرو جامعہ کی محبت میں جامعہ کو کسی محفوظ مقام یا کیمپ میں بھیج سکتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ رات ہی میں مدراس رجمنٹ جو اس زمانے میں تعصب سے پاک سمجھی جاتی تھی اس کی ایک بڑی تعداد جامعہ اور اس کے اردگرد تعینات کر دی گئی۔ حتیٰ کہ اوکھلا پر بھی وہ پوزیشن لے کر تعینات ہو گئی ایک دن گاندھی جی بھی تشریف لائے اور ڈھارس بندھائی۔ بالکل تو نہیں لیکن کچھ اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن کام کرنے والے ایسے بگڑے ہوتے حالات میں بھی تعمیری کاموں کی طرف سے توجہ نہیں ہٹاتے۔ پرانا قلعہ اور ہمایوں کیمپ میں کھانا اور دوسری ضروری چیزوں کی تقسیم کا مسئلہ تھا اور جامعہ نے اس کام کو اپنے ذمے لے لیا۔ کیمپ میں سیکٹر بنا دئے گئے اور ہم لوگ ان میں کام کرنے لگے جامعہ لاری ہم لوگوں کو صبح کیمپ پہنچاتی تھی اور شام کو واپس لے آتی تھی۔ یہ خدمت کا موقع تھا اور جو بھی ممکن ہوا ذاکر صاحب کی سرپرستی میں اس کو بھی کیا گیا۔

ایک دن ہم لوگ شام کو واپس کیمپ سے آرہے تھے۔ راستہ میں بھوگل میں گاڑی رک کر کچھ ضروری سامان خریدیں۔ وہیں پر اچانک یہ خبر ملی کہ گاندھی جی شہید کر دئے گئے۔ اس کا ملک پر عجب ملا جلا اثر پڑا۔ لوگ کچھ ہوش کی باتیں سوچنے لگے۔ تبادلہ آبادی تو جاری رہا اسپیشل ٹرینیں آتی جاتی رہیں لیکن اب تشدد کی وارداتیں کچھ کم ہوئیں۔

حکومت کو بھی ہوش آیا کہ ایسا کب تک چلے گا کچھ انتظامات کیے گئے۔ جو لوگ باقی بچ گئے تھے ان کی طرف توجہ کی اور جو سرحد پار سے سر چھپانے یہاں آئے تھے ان کے لیے رہنے سہنے کھانے پینے کا انتظام شروع کیا گیا۔

چھٹیاں ختم ہونے پر جامعہ کے اسٹاف اور طالب علم جن کا تعلق دہلی سے تھا آنے لگے اور لشتم پشتم پڑھائی کا کام شروع ہوا۔ لیکن انداز ہر طرف بہت محتاط سا تھا۔ لوگوں کا ایک دوسرے پر سے یقین اٹھ گیا تھا۔ ٹرین میں اقلیتوں کے لیے الگ ڈبے لگائے جاتے تھے لیکن پھر بھی حالات معمول پر آتے نظر آنے لگے۔

سینٹر اور صوبوں میں حکومتوں نے اقتدار سنبھالا اور انتظامی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ مرکز میں مولانا آزاد ایجوکیشن منسٹر ہو گئے۔ تعلیم کا کام ایسے حالات میں ایسا گڑبڑ ہو گیا تھا کہ اس کا اندازہ کوئی بھی کر سکتا ہے۔ تعلیم کا کام کرنے کے لیے اطمینان بخش فضا بہت ضروری ہوتی ہے۔ اس کا یہاں فقدان تھا۔

ادھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معاملہ بہت سخت مرحلے میں تھا۔ وہاں کے طلبا اور اسٹاف نے پاکستان بننے میں منظر عام پر آکر کھلم کھلا کام کیا تھا۔ ملک کے خواص اور عوام میں ادارہ آنکھوں میں کھٹک رہا تھا لیکن اس کو بند کر دینا آسان نہ تھا مولانا آزاد اور ان کے رفقا سمجھتے

تھے کہ ایک ایسا ادارہ جو عرصہ دراز کی ان تھک محنتوں سے وجود میں آیا ہوا ور قوم و ملک کے بہترین دماغ اس کو بنانے میں لگے ہوں اس کی طرف سے آنکھ بند کر لینا آسان نہیں۔ ورنہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ قومی نقصان اور نا قابلِ تلافی امر ہوگا لیکن پچھلے زہریلے اثرات جو سیاسی غلطی سے اس ادارے میں سرایت کر گئے تھے ان کا یک لخت نکالنا بھی ممکن نہ تھا۔

مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی نگاہیں ذاکر صاحب پر تھیں۔ اس میں شبہ بھی نہیں کہ اتنے بڑے کام کو اپنے سر لے لینا ہر کس و ناکس کا کام نہ تھا۔ ذاکر صاحب کا تعلق علی گڑھ سے رہ چکا تھا۔ وہ اس سے الگ ہو کر جامعہ میں کام کر رہے تھے اور کامیاب بھی تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اس ادارہ کا بھی مسلمانوں اور خصوصی طور پر ان پر حق ہے اس حق کو نبھانے کا موقع یہی تھا۔

ذاکر صاحب کو راضی کیا گیا اور وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے۔ اس طرح سے جامعہ سے ان کا تعلق صرف کم ہی نہیں بلکہ بہت کم ہو گیا اور یہ جامعہ کی تاریخ کا اہم موڑ تھا۔ ذاکر صاحب پہلے ہی جامعہ کے کاموں میں دل چسپی لیتے رہے ہوں بلکہ صرف دل چسپی ہی کام نہیں کرتی اس کے لیے عملی کاموں میں شرکت ضروری ہوتی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی جامعہ سے بہت بڑی تھی۔ اس کی اپنی جگہ ایک ساکھ تھی۔ اس کا کام بھی بڑا تھا۔ مسائل بھی بہت تھے۔ سب سے بڑا کام یہ تھا کہ سوچ میں تبدیلی لانا تھی اور یہ تبدیلی مہینوں اور چند برسوں کا کام نہ تھا۔ اس میں ایسے لگے اور ایسے الجھے کہ پھر جامعہ کی طرف عملی رخ نہ کر سکے ویسے تو وہ بنگلو عربک اسکول کا کام شفیق میموریل میں ان کے دوسرے ساتھی شفیق الرحمٰن کے ساتھ مل کر اس اسکول کی اور دلّی کا یتیم خانہ جس کا نام انھوں نے بچوں کا گھر رکھ دیا تھا۔ ایسے کاموں میں بھی وہ برابر دلچسپی لیتے رہے اور اینگلو عربک اسکول کے معاملہ میں تو انھوں نے بہت جگر سوزی کے ساتھ کام کیا۔

علی گڑھ میں یونیورسٹی کا کام جامعہ کے کاموں سے مختلف تھا۔ جامعہ میں تعمیری اور تخلیقی کام تھا۔ علی گڑھ میں ایک بنے بنائے ادارے کو از سرِ نو نیا موڑ دینے کا کام تھا۔ ویسے نئی عمارت کا بنانا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا پرانی عمارت کو سنوارنے اور نئے سرے سے ترمیم اور ترتیب دینے کا کام ہوتا ہے یعنی پرانی بنیادیں بھی باقی رہیں اور کام میں نیا رخ پیدا کیا جا سکے۔ علی گڑھ کی قومی ساکھ جو بری طرح اہل وطن کے دلوں میں مجروح ہو گئی تھی وہ ذاکر صاحب کی وجہ سے اور حکومت کی پوری توجہ اور مولانا آزاد کی خصوصی نظر کی وجہ سے کسی حد تک بحال ہوتی نظر آنے لگی۔ ویسے اس زمانے میں ایجوکیشن سکریٹری جناب غلام السیدین صاحب تھے ان کا اور ذاکر صاحب کا پرانا تعلق تھا۔ ذاکر صاحب کے ہم خیال تھے اور تعلیمی میدان کے پرانے مرد تھے۔ ان کی وجہ سے بھی علی گڑھ کے کاموں کو بحال کرنے میں یقیناً مدد ملی ہوگی اس لیے ایجوکیشن سکریٹری کی حیثیت سے بہت سی مشکلات بہت آسانی سے حل ہو جایا کرتی ہوں گی۔

آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور علی گڑھ دوسری طرز زندگی کی طرف راغب نظر آنے لگا۔ ویسے بھی بہت بڑا نقصان اٹھانے کے بعد آزاد قوم والوں کی آنکھیں کھلتی ہیں اور غلطیوں کا احساس شدید ہو جاتا ہے اس کے علاوہ وہ عنصر جو تقسیم ہند کے وقت وہاں پر برسر اقتدار تھا یا تو پاکستان چلا گیا تھا یا انھوں نے ہاتھ پیر چھوڑ کر علاحدگی اختیار کر لی تھی۔

علی گڑھ سے جب کچھ اطمینان نظر آیا حالات بہتر ہوئے تو ذاکر صاحب نے کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم کو وائس چانسلری سونپی۔

حکومت کی نظر میں جس میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور دوسرے ذمہ دار لوگ تھے یہ مسئلہ پیش آیا کہ اب ذاکر صاحب سے کون سا کام لیا جائے جو ان کے شایان شان بھی ہو اور وہ اس کو قبول بھی کر لیں۔ جامعہ میں اب حالات معمول پر آ گئے تھے۔ ذاکر صاحب کے پرانے ساتھیوں نے بظاہر کام سنبھال لیا تھا اور پرانی بنیادوں پر کاموں کو لے کر چل رہے تھے لیکن ایسے میر کارواں کے بغیر وہ حسن تو پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

ذاکر صاحب کی تعلیمی زندگی کا یہ خطرناک موڑ تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہم تو تعلیم کا کام کرنے والے لوگ ہیں۔ ہمیں سیاست سے کیا واسطہ لیکن انسان کے بس میں سب کچھ نہیں ہوتا برٹش حکومت کے زمانے میں حکومت جب کسی ذہن اور غیر معمولی صلاحیت کے آدمی ابھرتا دیکھتی تھی تو اس کے سامنے کوئی سنہری جال یا کوئی دوسری نوکری دے کر اس کی توجہ قوم کی طرف سے ہٹا دیتی تھی اور پھر وہ شخص حکومت کی مشین کا ایک ذمہ دار کارکن بن جاتا۔ ٹریننگ ایسی دی جاتی کہ عوام سے سوائے اس کے کہ اس پر حکومت کرے اور شان کے ساتھ حکومت کرے اور کوئی رابطہ نہ رہتا تھا۔ عہدوں میں ترقی ہوتی رہتی اس کے دوسری طرف دیکھنے کا سوال نہیں اٹھتا تھا۔

لیکن یہاں برٹش حکومت کا معاملہ نہ تھا یہاں تو ساتھیوں کی رائے تھی اور انہی کی درخواست تھی کہ ذاکر صاحب کی جھولی میں بہار کی گورنری پیش کر دی گئی۔ ذاکر صاحب صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے۔ حشم و قدم کی طرف ان کی نگاہیں کبھی نہ اٹھتی تھیں۔ یہ میرا اپنا خیال ہے کہ ذاکر صاحب اس طرح کی سیاسی رائے سے کبھی متفق بھی نہ ہو سکتے تھے لیکن ذاکر صاحب کی زندگی میں رواداری اور وضعداری کا یہ اثر تھا۔ یہ بات تھی یا کوئی اور حالات رہے ہوں لیکن ذاکر صاحب نے چار و ناچار اس کو قبول کر لیا۔

حکومت کے ذمہ دار لوگوں نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ ایک شخصیت کو جس نے قوم کی خاطر اس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کی ہیں اس کو کچھ آرام بھی ملنا چاہیے اور گورنری میں کیا ہے کرنا کچھ نہیں۔ بس شان و شوکت اور بے فکر زندگی ہی تو ہوتی ہے اور ذاکر صاحب کی ذات ان تمام چیزوں کی ضد تھی۔ کچھ بھی ہوا ہو۔ جال پھینکا گیا اور ذاکر صاحب اس کے پھندے میں آ گئے۔

تھے کہ ایک ایسا ادارہ جو عرصہ دراز کی ان تھک محنتوں سے وجود میں آیا ہوا ور قوم و ملک کے بہترین دماغ اس کو بنانے میں لگے ہوں اس کی طرف سے آنکھ بند کر لینا آسان نہیں۔ ورنہ یہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ قومی نقصان اور نا قابلِ تلافی امر ہوگا لیکن پچھلے زہریلے اثرات جو سیاسی غلطی سے اس ادارے میں سرایت کر گئے تھے ان کا یک لخت نکالنا بھی ممکن نہ تھا۔

مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی نگاہیں ذاکر صاحب پر تھیں۔ اس میں شبہ بھی نہیں کہ اتنے بڑے کام کو اپنے سر لے لینا ہر کس و ناکس کا کام نہ تھا۔ ذاکر صاحب کا تعلق علی گڑھ سے رہ چکا تھا۔ وہ اس سے الگ ہوکر جامعہ میں کام کر رہے تھے اور کامیاب بھی تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اس ادارہ کا بھی مسلمانوں اور خصوصی طور پر ان پر حق ہے اس حق کو نبھانے کا موقع یہی تھا۔

ذاکر صاحب کو راضی کیا گیا اور وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوگئے۔ اس طرح سے جامعہ سے ان کا تعلق صرف کم ہی نہیں بلکہ بہت کم ہوگیا اور یہ جامعہ کی تاریخ کا اہم موڑ تھا۔ ذاکر صاحب پہلے ہی جامعہ کے کاموں میں دل چسپی لیتے رہے ہوں بلکہ صرف دل چسپی ہی کام نہیں کرتی اس کے لیے عملی کاموں میں شرکت ضروری ہوتی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی جامعہ سے بہت بڑی تھی۔ اس کی اپنی جگہ ایک ساکھ تھی۔ اس کا کام بھی بڑا تھا۔ مسائل بھی بہت تھے۔ سب سے بڑا کام یہ تھا کہ سوچ میں تبدیلی لانا تھی اور یہ تبدیلی مہینوں اور چند برسوں کا کام نہ تھا۔ اس میں ایسے لگے اور ایسے الجھے کہ پھر جامعہ کی طرف عملی رخ نہ کر سکے ویسے تو وہ اینگلو عربک اسکول کا کام شفیق میموریل میں ان کے دوسرے ساتھی شفیق الرحمٰن کے ساتھ مل کر اس اسکول کی اور دلّی کا یتیم خانہ جس کا نام انھوں نے بچوں کا گھر رکھ دیا تھا۔ ایسے کاموں میں بھی وہ برابر دلچسپی لیتے رہے اور اینگلو عربک اسکول کے معاملہ میں تو انھوں نے بہت جگر سوزی کے ساتھ کام کیا۔

علی گڑھ میں یونیورسٹی کا کام جامعہ کے کاموں سے مختلف تھا۔ جامعہ میں تعمیری اور تخلیقی کام تھا۔ علی گڑھ میں ایک بنے بنائے ادارے کو از سرِ نو نیا موڑ دینے کا کام تھا۔ ویسے نئی عمارت کا بنانا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا پرانی عمارت کو سنوارنے اور نئے سرے سے ترمیم اور ترتیب دینے کا کام ہوتا ہے یعنی پرانی بنیادیں بھی باقی رہیں اور کام میں نیا رخ اپنایا جا سکے۔ علی گڑھ کی قومی ساکھ جو بری طرح اہل وطن کے دنوں میں مجروح ہوگئی تھی وہ ذاکر صاحب کی وجہ سے اور حکومت کی پوری توجہ اور مولانا آزاد کی خصوصی نظر کی وجہ سے کسی حد تک بحال ہوتی نظر آنے لگی۔ ویسے اس زمانے میں ایجوکیشن سکریٹری جناب غلام السیدین صاحب تھے ان کا اور ذاکر صاحب کا پرانا تعلق تھا۔ ذاکر صاحب کے ہم خیال تھے اور تعلیمی میدان کے پرانے مرد تھے۔ ان کی وجہ سے بھی علی گڑھ کے کاموں کو بحال کرنے میں یقیناً مدد ملی ہوگی اس لیے ایجوکیشن سکریٹری کی حیثیت سے بہت سی مشکلات بہت آسانی سے حل ہو جایا کرتی ہوں گی۔

آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا اور علی گڑھ دوسری طرز زندگی کی طرف راغب نظر آنے لگا۔ ویسے بھی بہت بڑا نقصان اٹھانے کے بعد آزاد قوم والوں کی آنکھیں کھلتی ہیں اور غلطیوں کا احساس شدید ہو جاتا ہے اس کے علاوہ وہ عنصر جو تقسیم ہند کے وقت وہاں پر برسر اقتدار تھا یا تو پاکستان چلا گیا تھا یا انھوں نے ہاتھ پیر چھوڑ کر علاحدگی اختیار کر لی تھی۔

علی گڑھ سے جب کچھ اطمینان نظر آیا حالات بہتر ہوئے تو ذاکر صاحب نے کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم کو وائس چانسلری سونپی۔

حکومت کی نظر میں جس میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور دوسرے ذمہ دار لوگ تھے یہ مسئلہ پیش آیا کہ اب ذاکر صاحب سے کون سا کام لیا جائے جو ان کے شایان شان بھی ہو اور وہ اس کو قبول بھی کر لیں۔ جامعہ میں اب حالات معمول پر آ گئے تھے۔ ذاکر صاحب کے پرانے ساتھیوں نے بظاہر کام سنبھال لیا تھا اور پرانی بنیادوں پر کاموں کو لے کر چل رہے تھے لیکن ایسے میر کارواں کے بغیر وہ حسن تو پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

ذاکر صاحب کی تعلیمی زندگی کا یہ خطرناک موڑ تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہم تو تعلیم کا کام کرنے والے لوگ ہیں۔ ہمیں سیاست سے کیا واسطہ لیکن انسان کے بس میں سب کچھ نہیں ہوتا برٹش حکومت کے زمانے میں حکومت جب کسی ذہن اور غیر معمولی صلاحیت کے آدمی ابھرتا دیکھتی تھی تو اس کے سامنے کوئی سنہری جال یا کوئی دوسری نوکری دے کر اس کی توجہ قوم کی طرف سے ہٹا دیتی تھی اور پھر وہ شخص حکومت کی مشین کا ایک ذمہ دار کارکن بن جاتا۔ ٹریننگ ایسی دی جاتی کہ عوام سے سوائے اس کے کہ اس پر حکومت کرے اور شان کے ساتھ حکومت کرے اور کوئی رابطہ نہ رہتا تھا۔ عہدوں میں ترقی ہوتی رہتی اس کے دوسری طرف دیکھنے کا سوال نہیں اٹھتا تھا۔

لیکن یہاں برٹش حکومت کا معاملہ نہ تھا۔ یہاں تو ساتھیوں کی رائے تھی اور انہی کی درخواست تھی کہ ذاکر صاحب کی جھولی میں بہار کی گورنری پیش کر دی گئی۔ ذاکر صاحب صوفی منش اور درویش صفت آدمی تھے۔ حشم و قدم کی طرف ان کی نگاہیں کبھی نہ اٹھتی تھیں۔ یہ میرا اپنا خیال ہے کہ ذاکر صاحب اس طرح کی سیاسی رائے سے کبھی متفق بھی نہ ہو سکتے تھے لیکن ذاکر صاحب کی زندگی میں رواداری اور وضعداری کا یہ اثر تھا۔ یہ بات تھی یا کوئی اور حالات رہے ہوں لیکن ذاکر صاحب نے چار و ناچار اس کو قبول کر لیا۔

حکومت کے ذمہ دار لوگوں نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ ایک شخصیت کو جس نے قوم کی خاطر اس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کی ہیں اس کو کچھ آرام بھی ملنا چاہیے اور گورنری میں کیا ہے کرنا کچھ نہیں۔ بس شان و شوکت اور بے فکر زندگی ہی تو ہوتی ہے اور ذاکر صاحب کی ذات ان تمام چیزوں کی ضد تھی۔ کچھ بھی ہوا ہو۔ جال پھینکا گیا اور ذاکر صاحب اس کے پھندے میں آ گئے۔

اب پہلے کے حالات نہ تھے ان کو تعلیم کے ساتھ عوام کی رہنمائی کا کام کرنا تھا۔ ذاکر صاحب میں یہ صلاحیت تھی انھوں نے جرمنی اور یورپ کی تعلیمی فضا میں تجربات حاصل کیے تھے۔

یہ نازک ترین موقع تھا تاریخی فیصلہ تھا جس پر ذاکر صاحب جیسی شخصیت کو فیصلہ کرنا چاہیے تھا ان کو ایسے حالات مل سکتے تھے کہ قوم ان کی آواز پر لبیک کہہ سکتی تھی اور ان کی بصیرت اور علمی اور سیاسی صلاحیت پر پورا بھروسہ کر سکتی تھی۔ دوسرا اہم مسئلہ نیشنلسٹ مسلمانوں کا گروہ جو اس وقت کش مکش میں مبتلا تھا ذاکر صاحب کی ہمنوائی کر سکتا تھا۔ حکومت اور مسلمانوں کے درمیان وہ ایک مسلسل رابطہ کا کام کر سکتے تھے۔ میں تو یہاں تک کہنے میں پس و پیش نہیں کرتا کہ نیشنلسٹ مسلمانوں نے جس خلوص نیت اور جفاکشی کے ساتھ ہندوستانی متحدہ قومیت کے بغیر لبیک کہا تھا ایسی مٹی پلید ہوئی کہ ان پر قیامت گزر گئی کوئی ایسا نہ تھا جس سے دل کا درد کہتے، راستے کے نشیب و فراز میں مدد لیتے اور پھر ہندوستانی سماج میں اپنی ایک جگہ اور مقام حاصل کرتے۔ اس کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ سوچنے لگے کہ کیا انھوں نے اب تک اس قدر مصیبت اور جفاکشی اس لیے کی تھی کہ اسی سماج میں ان کو کوئی معمولی سی حیثیت اور مقام نہ مل سکا۔

شاید ذاکر صاحب اگر یہ بات سوچ لیتے کہ مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی لیڈرشپ ان کے ساتھ ہو سکتی ہے عام مسلمان ایسے فوقیت حاصل کر سکتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ قوم کو جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں ایک مخلص مرد مجاہد مل جاتا بلکہ خود ذاکر صاحب زندۂ جاوید بن کر رہ جاتے۔

خود جامعہ اور علی گڑھ جس پر ان کا احسان ہے باقی نور ہے لیکن ایسا باقی رہنا کس کام کا۔ اس میں شبہ نہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے سے علی گڑھ کو کس حد تک حکومت اور عوام کا اعتماد حاصل ہوا لیکن جامعہ کو جس نے بہت حد تک ایک خاص نصب العین کی بازی لگا رہی تھی ایک تعلیمی خانقاہ بن کر رہ گیا۔ ذاکر صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ جامعہ کی طرف ان کی نظر التفات ہو تو وہ سچ مچ کی نیشنل مسلم یونیورسٹی کا مقام حاصل کر لیتی۔ تعلیم اور سیاست دونوں میں ان کا مقام ہوتا۔ آپ کے ایک اشارے پر زیادہ سے زیادہ وسائل اور ترقی کے مواقع فراہم ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ سب نہیں ہوا اور وہ سیکڑوں کالجوں کی ایک کالج کی سطح سے آگے نہ بڑھ سکا نہ اس میں وہ سوچ تھی اور نہ کام کا جذبہ ویسے تو اس کے بعد بڑھتے بڑھتے یہ یونیورسٹی کا درجہ تو پا گیا۔ لیکن یونیورسٹیاں تو بہت ہیں لیکن جامعہ نے جن حالات اور قومی سطح پر کام کیا تھا اس کا درجہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں نمایاں مقام ہونا چاہیے تھا لیکن کیا ہوا۔ یہ سب کو معلوم ہے۔

اگر ذاکر صاحب اس وقت حکومت کے نمائشوں عہدوں کی طرف سے معذرت کر لیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ سوجھ بوجھ کی صلاحیت بھی تھی۔ مجاہدانہ

اقدار بھی تھیں اور ذہن مذہبی تعصب سے آزاد تھے وہ ذاکر صاحب کے گرد جمع ہو جاتے اور ایک صحت مند لیڈر شپ کی بنیاد پڑ جاتی جس کی بنیاد تعلیم اور سیاست پر ہوتی۔ افسوس یہی نہ ہو سکا اس پر کس کی ذمہ داری آتی ہے کون اس کا جواب دے گا۔ قارئین خود ہی فیصلہ کریں بس میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ

کون نہیں قائل فکر و عمل کی راہ میں
آدمی سوچے ہے کیا، کرتا ہے کیا، ہوتا ہے کیا

ذاکر صاحب نے ساری زندگی تعلیم کی نذر کر دی۔ چھوٹے بڑے تعلیمی اداروں کو از سر نو توانائی بخشی۔ تعلیم کے ساتھ سیاست پر ان کی بہت دقیق نظر تھی، حالات بھی تھے لیکن اس کا موقع نہ ملا ورنہ وہ بھی ہندوستانی پارلیمنٹ میں اپنے جامعہ جوبلی کے خطبہ کا وہ مصرعہ دہراتے کہ ــــ آغوشتہ ایم برسر خارے بخون دل۔ قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم۔ وہ غیر معمولی شخصیت تھے لیکن انسان تھے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نہ انھیں شان و شوکت کا شوق تھا نہ مالی منفعت سامنے تھی، اور ہر دلعزیزی کی طرف نگاہ رکھی۔ انھیں کبھی گورنری سے لے کر راشٹر پتی کی کرسی تک اطمینان نصیب نہ ہوا ہوگا۔ وہ مرد مجاہد جس نے شروعات ہی مجاہدہ سے کی حالات سے ٹکر لی اور کبھی کام سے سر نہ اٹھایا وہ تن آسانی کیسے قبول کر سکتی تھی۔ وہ آزاد رائے رکھتے تھے بے لاگ تعلیمی اور سیاسی کام کرتے اور درویشانہ صفت کے ساتھ جو ان کی طبیعت ثانیہ تھی قوم کو صحیح راہ دکھاتی۔

لیکن مقدر میں سونے کا پنجرہ تھا بہتر سے بہتر آسائش کا سامان تھا۔ لیکن یہ سب ان کے لیے بارگراں تھا اور وہ بار آخر تک قائم رہا۔

لوگوں نے خبر سنی کہ ذاکر صاحب حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ میں کہتا ہوں کہ مرد مجاہد ذہنی کش مکش کا شکار ہو کر سونے کے پنجرے میں پھڑ پھڑا کر دم توڑ گیا۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

ذاکر صاحب نے پچھلے ۴۰ سال آزادی فکر و عمل میں زندگی گزاری تھی وہ قوم کے مزاج سے واقف تھے۔ ہندو مسلمان سب ان کی قدر کرتے تھے۔ پچھلے تجربے کی بنیاد پر ان پر کلّی طور پر اعتماد تھا۔ تعلیمی کام کرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ سیاست سے ان کا جوڑ پہلے ہی ہو چلا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے راہنما ان کی رائے کو وزن دیتے تھے۔ گاندھی جی مولانا آزاد پنڈت نہرو ان پر اعتماد کرتے تھے۔

مسلمانوں کی نیشنلسٹ خیالوں کی ایک بڑی جماعت جو بغیر لیڈر کے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کر رہی تھی۔ جہاں تک مذہبی خیالات کے مسلمانوں کا معاملہ ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تقریباً ۹۰ فی صدی علماء نیشنلسٹ خیالات کے لوگ تھے اور ذاکر صاحب

کی شخصیت پر انھیں کلی اعتماد تھا ۔

لیکن بد قسمتی سے ایک ایسا تاریخی موڑ آیا اور ایسی تاریخی غلطی ہوئی کہ جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں اور معلوم نہیں کب تک بھگتتے رہیں گے ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اپنے سینے میں خلش شک و شبہ کے جذبات رکھتے تھے ۔ سامنے آنا شروع ہو گئے ۱۵ سال کسی نہ کسی طرح خیریت سے گزر گئے ۔ لیکن اس کے بعد وہ طبقہ ابھرا اور ایسا ابھرا کہ حکومت کو للکارنے لگا مسلمانوں کو خصوصی طور پر ان کو شبہات تھے کیونکہ وہ اب تک حکومت کے دستِ راست تھے ۔

خلیق انجم

ہمارے ذاکر صاحب

یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لینے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچے۔ تقسیم ملک کے بعد کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لوگوں میں یہ اعتماد اور بھروسہ پیدا کرنے کے لیے کہ وہ بھی سیکولر ہندوستان کی مین اسٹریم کا حصہ ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین کو وہاں وائس چانسلر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ان دنوں میرے سگے ماموں حبیب الرحمٰن عزیزی مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر مجیب کے پرسنل سکریٹری تھے۔ جب ہم لوگ علی گڑھ جا رہے تھے تو ماموں جان نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام مجیب صاحب سے خط لکھوا کر ہم کو دے دیا۔ اس خط میں ہمارا تعارف تھا اور میرے بارے میں مجیب صاحب نے لکھا تھا کہ یہ مالی مدد کے مستحق ہیں، ان کی کچھ مدد کر دیجیے۔ علی گڑھ پہنچنے کے بعد ہم وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ وہاں علاحدہ علاحدہ کمروں کے تین دروازے تھے اور تینوں پر چقیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کمرے سے ایک صاحب باہر نکلے تو میں نے ان سے کہا کہ ہمیں ذاکر صاحب سے ملنا ہے۔ جس کمرے سے باہر آئے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اس کمرے میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں اور اسلم پرویز چق اٹھا کر بے دھڑک اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہاں ایک میز کے گرد پانچ چھ حضرات بیٹھے ہوئے تھے اور میز پر فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ مجھ میں غلط ہونے کی حد تک خود اعتمادی تھی۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں کی موجودگی سے مجھ پر کسی بھی قسم کا خوف یا ہیبت طاری نہیں ہوئی۔ چنانچہ بہت زور سے السلام علیکم کہتے ہوئے میز کے قریب آ گیا اور ان حضرات سے مخاطب ہو کر میں نے پوچھا کہ آپ میں سے ڈاکٹر ذاکر حسین کون ہیں۔ دراصل میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے کبھی ملا نہیں تھا۔ ذاکر صاحب کھڑے ہو کر ہمارے قریب آئے اور میری کمر پر ہاتھ رکھ کر ہم دونوں کو کمرے سے باہر لے آئے۔ میں نے انھیں پروفیسر مجیب کا خط دیا۔ ذاکر صاحب نے کھڑے کھڑے وہ خط پڑھا اور ہمیں لے کر برابر کے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں ایک میز پر منشی سے ایک صاحب بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ذاکر صاحب نے ان سے مخاطب ہو کر کہا، مرید صاحب! یہ مجیب صاحب کا خط لے کر آئے ہیں۔ ان کا جو بھی کام ہو، وہ کر دیجیے۔ اور پھر

ذاکر صاحب نے ہم سے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ ہم نے بتایا کہ ہم دہلی ہی کے ہیں۔ انھوں نے پھر ہم سے یہ پوچھا . . . . . حبیب الرحمٰن عزیزی صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے . . . دراصل مجیب صاحب نے ذاکر صاحب کے نام اپنے خط میں حبیب صاحب کا بھی ذکر کیا تھا۔ میں نے بتایا کہ وہ میرے سگے ماموں ہیں۔ ذاکر صاحب نے کہا اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ آپ پھر کسی وقت آئیں تو باتیں ہوں گی۔ اس وقت ہمیں ذاکر صاحب کے اس تمام رویے میں کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی لیکن کچھ بڑے ہو کر دنیا کے نشیب و فراز دیکھے تو ذاکر صاحب کی اس غیر معمولی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔

پہلی بات تو یہ کہ جس کمرے میں وہ بیٹھے تھے، کوئی چپراسی وغیرہ نہیں تھا . . . . . پھر غیر معمولی طور پر مصروف ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ وہ کمرے کے باہر آئے۔ ہم سے تفصیلی گفتگو کی اور پھر اپنے پی۔ اے مرید صاحب کے حوالے کر کے چلے گئے۔ کیا آج کا کوئی وائس چانسلر طالب علموں کے ساتھ اس محبت، خلوص اور اخلاق کے ساتھ پیش آ سکتا ہے اور ہمارے اس رویے کا کہ ہم بے دھڑک ان کے کمرے میں داخل ہو گئے اور ہمارے بے ساختہ یہ پوچھنے کا کہ آپ میں سے ڈاکٹر ذاکر حسین کون ہیں، گویا انھوں نے ہماری ناسمجھی کی عمر کا تقاضا سمجھ کے بالکل ہی درگزر کر دیا۔ مرید صاحب کو ہماری زیادہ مدد کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان دنوں داخلہ لینے والے طالب علموں کو اسٹریچی ہال جانا پڑتا تھا۔ ہال میں رجسٹرار آفس کے وہ تمام کارکن بیٹھے ہوتے جو داخلے کی کارروائی پوری کرتے تھے۔ اسٹریچی ہال میں داخل ہوتے ہی ایک سینیئر طالب علم نے ہم سے اپنا تعارف کرایا اور پھر مختلف میزوں پر لے جا کر داخلے کا کام مکمل کرا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ کے سینیئر طالب علم جونیئر طالب علموں کو چھوٹے بھائی جیسے سمجھتے تھے۔

جب ہم ہاسٹل میں جم جما گئے۔ تو ایک دن ذاکر صاحب یاد آئے۔ چنانچہ ایک بار پھر میں اور اسلم پرویز ذاکر صاحب کے دفتر پہنچ گئے۔ آج وہاں دفتر کے باہر چپراسی بیٹھا تھا۔ ہم نے چپراسی سے ذاکر صاحب کو کہلوایا۔ انھوں نے ہمیں اندر بلالیا۔ اندر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ لوگ کھڑے تھے۔ ذاکر صاحب ہم دونوں کو پہچان گئے اور دیکھتے ہی کہنے لگے کہ آپ شام کو گھر آئیں۔

میں اور اسلم پرویز شام کو ذاکر صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ نوکر کے ذریعہ اطلاع کروائی تو ذاکر صاحب نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ ڈرائنگ روم میں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے تھے جن کا غالباً جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلق تھا۔ اس وقت وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ یہ بات مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ بس یہ یاد ہے کہ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ترقی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ یہ بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ذاکر صاحب نے کہا کہ مجیب صاحب بہت بڑے اسکالر ہیں۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ منتظم کیسے رہیں گے۔ تھوڑی دیر میں جب یہ لوگ اٹھ کر چلے گئے تو ذاکر صاحب

ہم سے مخاطب ہوئے۔ انھوں نے ہم سے ہمارے خاندان کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اپنے نانا مرحوم پروفیسر عزیزالرحمٰن کا ذکر کیا جن کی انگریزی میں کئی کتابیں ہیں اور اردو میں " علم مجلسی" کے نام سے انھوں نے کئی جلدوں میں شعروں کی ڈکشنری تیار کی تھی ذاکر صاحب مرحوم کی ڈکشنری اور انگریزی میں جامع مسجد پر میرے نانا کی کتاب سے بخوبی واقف تھے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ جامع مسجد پر کتاب تو بہت عرصہ پہلے میری نظر سے گزری تھی۔ لیکن " علم مجلسی " کا پورا سیٹ میرے پاس ہے۔ ذاکر صاحب نے پھر ہمارے ادبی ذوق کے بارے میں سوالات کیے۔ کون کون سے شاعر آپ کو پسند ہیں۔ آپ کے پسندیدہ ناول نگار اور افسانہ نگار کون ہیں وغیرہ وغیرہ۔

غرض آدھے گھنٹے تک اسی قسم کے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ہماری ادبی معلومات بہت محدود تھی۔ شاعروں میں علامہ اقبال، سردار جعفری، احسان دانش اور مجاز لکھنوی ہمارے پسندیدہ شاعر تھے۔ جب سردار جعفری کا ذکر آیا تو ذاکر صاحب نے کہا کہ ان کے کچھ شعر سنائیے۔ اسلم پرویز کو اس زمانے میں سردار جعفری کی بہت سی نظمیں منہ زبانی یاد تھیں۔ انھوں نے کئی طویل نظموں کے کچھ حصے سنائے ہماری گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کچھ لوگ آ گئے۔ شاید انھیں غالباً یونیورسٹی کے کچھ اہم معاملات پر گفتگو کرنی تھی۔ ذاکر صاحب نے ہم سے کچھ نہیں کہا لیکن ہم موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اجازت لے کر کھڑے ہو گئے اور ہم لوگ دل ناخواستہ واپس آ گئے۔

دراصل ہمیں وائس چانسلر کی حیثیت کا اندازہ نہیں تھا۔ ہم انھیں اپنے اسکول کے پرنسپل کی طرح ہی سمجھتے تھے۔

یونیورسٹی میں دو چار مہینے گزرنے کے بعد ہمیں ان کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ ہوا۔ پھر وہ بے تکلفی ختم ہو گئی جو ہماری ناسمجھی کے باعث پیدا ہو گئی تھی اور ذاکر صاحب اور ہمارے درمیان ایک فاصلہ آ گیا۔ اب ذاکر صاحب سے ملنے کی ہمت باقی نہیں رہی۔ کچھ دن بعد ایک جلسے میں ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں اور اسلم آداب کر کے دور کھڑے ہو گئے۔ ذاکر صاحب نے اشارے سے ہمیں بلایا، کہا کہ آپ دونوں مجھ سے ناراض ہیں۔ میں نے بہت مودبانہ لہجہ میں کہا یہ کیسے ممکن ہے ۔ ۔ ۔ آپ تو ہمارے بزرگ ہیں۔ ذاکر صاحب نے فرمایا تو پھر آپ اتنے دن سے آئے کیوں نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہم ضرور حاضر ہوں گے۔ دو تین دن بعد جب ہم ذاکر صاحب سے ملنے گئے تو بہت مصروف تھے اور ان کے ڈرائنگ روم میں لگ بھگ پندرہ بیس آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب نے ڈرائنگ روم میں سے باہر آ کر ہم سے کہا کہ معاف کیجیے ۔ ۔ ۔ اس وقت کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں پھر سہی۔

علی گڑھ میں ہمارا بی۔ اے کا آخری سال تھا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک ان چار سالوں میں ہم پر مسلم یونیورسٹی کا رنگ خوب اچھی طرح سے چڑھ چکا تھا۔ اس میں کچھ تو خود ہمارے مزاج

کی شوخی اور شرارت کو دخل تھا اور کچھ ان سینیئروں کی صحبت کا فیض تھا جو ہمارے روم پارٹنر تھے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر ابو سعید زیدی تھے جو اس وقت جب ہم علی گڑھ پہنچے ہیں تو چودہ سال کے سینیئر تھے اور وہی ممتاز ہاسٹل میں ہمارے بیک روم پارٹنر تھے۔ غرض پڑھنا پڑھانا تو جیسا تھا ویسا تھا ہی۔ لیکن ایک سے ایک ACTIVITY ہمارا روز کا مشغلہ تھا۔ ہمارے علی گڑھ کے دور کی سب سے آخری سب سے زبردست اور سب سے خطرناک بھی وہ ACTIVITY تھی جو ہم نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ کی۔ ان کی صاحب زادی کی شادی تھی خورشید عالم خاں کے ساتھ ظاہر ہے وائس چانسلر کی بیٹی کی شادی تھی اور یوں بھی ذاکر صاحب ہمارے قومی رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ اس لیے اس میں کثیر تعداد میں لوگ مدعو تھے۔ اس میں کچھ ایسے طلبا بھی مدعو تھے جو یونیورسٹی کی مختلف سوسائیٹیوں یا کلبوں کے اسٹوڈینٹ انچارج یا مختلف کھیلوں کے کیپٹن بھی تھے۔ چونکہ ذاکر صاحب کا تعلق قائم گنج سے تھا اور علی گڑھ میں قائم گنج کے طلبا کی اچھی خاصی تعداد تھی جن میں سے بہت سے ایسے ہوں گے جو یا تو ذاکر صاحب کے قریب یا دور کے رشتے دار تھے یا پھر ان کے بزرگوں سے ذاکر صاحب کے خاندانی مراسم تھے۔ چنانچہ اس شادی میں مدعو ہونے والے قائم گنجی طلبا بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ بس اسی بات سے ہمارا دماغ گھوم گیا۔ ہم نے سوچا کہ ذاکر صاحب نے یہ غیر قائم گنجی طلبا کے ساتھ تفریق برتی ہے کہ انھیں شادی میں مدعو نہیں کیا۔ چنانچہ ہمارے گروپ کے تمام ممبران سر جوڑ کے بیٹھے اور ایک زبردست ACTIVITY کا پلان تیار کیا گیا۔ ہم لوگوں نے اس شادی کے کچھ جعلی دعوت نامے چھپوائے اور خوب فراخ دلی سے یونیورسٹی ایریا میں رہنے والے تمام معززین کو اور بہت سے طلبا کو بھی تقسیم کرا دیے۔ ان دنوں میں علی گڑھ شہر میں اوپر کوٹ کے علاقے سے شائع ہونے والے ایک فلمی رسالے "جھلک" کا اڈیٹر بھی تھا۔ یہ دعوت نامہ جھلک پریس ہی میں چھپوایا گیا تھا۔ لیکن جھلک پریس والوں نے اپنی قانونی بچت کے طور پر اس دعوت نامے پر جھلک پریس کی پرنٹ لائن بھی ڈال دی اور جھلک پریس سے میری وابستگی علی گڑھ میں کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اس کا علاج ہم نے یہ نکالا کہ شادی کی دعوت میں جائیں گے تو ہم بھی ضرور۔ لیکن یہ نقلی دعوت نامہ لے کر نہیں جائیں گے۔ تاکہ رنگے ہاتھوں پکڑے نہ جائیں۔ یوں بھی اس مہذب اجتماع میں دعوت نامے کو کون چیک کرتا۔ بہر حال شادی کی دعوت میں مہمان جوق در جوق پہنچنے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آ گیا کہ منتظمین کو یہ محسوس ہوا کہ غیر مدعو شدہ مہمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد یہاں آ پہنچی ہے اور اب کھانا کم پڑنے والا ہے جس کے لیے فوری طور پر کوئی تدبیر بھی کرنی ہوگی۔ ادھر شام کو ہمارے گروپ کے پانچ چھ افراد بن ٹھن کر ڈنر پر جانے کے لیے ہاسٹل سے نکلنے شروع ہوئے۔ ہاسٹل میں ہمارے برابر والے کمرے کے دو تین پارٹنر بھی کہیں باہر جا رہے تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ لوگ کدھر چل دیے تو انھوں نے بتایا کہ شمشاد بلڈنگ کھانا کھانے جا رہے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا کہ آج شمشاد بلڈنگ

لہ یہ شادی صفیہ کی ظل الرحمٰن صاحب سے ہوئی تھی۔

کھانا کھانے کا کیا کام ہے۔ آج تو ذاکر صاحب کے ہاں ڈنر ہے۔ انھوں نے کہا کہ مگر ہمارے تو کوئی دعوت نامہ نہیں۔ ہم نے ان سے کہا دعوت نامے کی فکر نہ کیجیے۔ ہمارے پاس فالتو دعوت نامے ہیں۔ چنانچہ وہ تین شریف اچکن پوش بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ جب ہم دعوت کے پنڈال میں پہنچے تو کچھ منتظمین کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑتی ہوئی دیکھیں۔ بہرحال ہم ایک خالی میز پر جا کر بیٹھ گئے۔ ہم نے دیکھا ہمارے ممتاز ہاسٹل کے وارڈن انس صاحب ہمارے اور آفتاب صاحب ہال کے پرووسٹ کیپٹن مظفر صاحب بھی منتظمین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انس صاحب نے ہمیں میز پر قبضہ جماتے ہوئے دیکھ لیا اور ہم سے کچھ کہنے کے بجائے کیپٹن مظفر کو کچھ اشارہ کیا۔ اس بات کا اندازہ وہاں ہو چکا تھا کہ مہمانوں کی اس بھرمار کا سبب یہ ہے کہ بہت سے جعلی دعوت نامے بھی تقسیم ہوئے ہیں۔ چنانچہ انس صاحب کا اشارہ پاتے ہی کیپٹن مظفر لفٹ رائٹ کرتے ہوئے دو ہی منٹ میں ہماری میز پر تھے۔ انھوں نے آتے ہی بڑے رعب دار انداز میں ہم سے کہا، "شو می یور انویٹیشن کارڈز" ہم نے کہا سر وہ تو نہیں ہیں۔ مظفر صاحب کا اگلا جملہ تھا گیٹ اپ، ہم سب لوگ ایک دم گیٹ اپ ہو گئے۔ ان کا اس سے اگلا جملہ تھا گیٹ آؤٹ، اور ہم سب گیٹ آؤٹ ہونے شروع ہو گئے اور ہمارے ساتھ وہ تینوں شریف اچکن پوش بھی۔ پھر وہاں سے نکل کر انہی تینوں کے ساتھ ہم نے بھی شمشاد بلڈنگ میں کھانا کھایا۔ یہ بات تو یقیناً ہو چکی تھی اس ACTIVITY میں کن لوگوں کا ہاتھ تھا۔

دو تین دن بعد پراکٹر کے ہاں ہم سب کی پیشی ہوئی۔ وہ اپنی کار میں بٹھا کر ہمیں ذاکر صاحب کے دفتر لے گئے۔ ذاکر صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ پراکٹر نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس دن کی بیہودہ شرارت ان لوگوں کی تھی۔ ان لڑکوں میں مجھے اور اسلم کو دیکھ کر ذاکر صاحب کے چہرے پر جو تاثرات پیدا ہوئے، انھیں میں آج تک نہیں بھولا۔ جن کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ میں اور اسلم ان کی اس طرح کی بے عزتی کریں گے۔ ذاکر صاحب نے پراکٹر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ انھوں نے میرے خلاف تو کچھ نہیں کیا۔ ان کی بہن کی شادی تھی، اس لیے یہ جائیں اور ان کی بہن اس کے بعد ذاکر صاحب بالکل نارمل ہو گئے۔ کچھ دیر ہم سے پڑھائی کے بارے میں باتیں کر کے انھوں نے ہمیں رخصت کر دیا۔ ہم لوگ انتہائی شرمندگی کے عالم میں بھاری قدموں سے باہر آ گئے۔ اگر ذاکر صاحب ہمارے خلاف کارروائی کرتے تو ہم لوگ اس طرح شرمندہ نہ ہوتے۔ اس واقعے کو طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن آج تک ذاکر صاحب کا وہ مہذب اور شریفانہ انداز یاد ہے۔

اور اس ACTIVITY کی بنا پر مہمانوں کی کثرت اور کھانے کی کمی کی وجہ سے ذاکر صاحب جس سراسیمگی سے گزرے ہوں گے، اس کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ان کی شرافت، کشادہ دلی اور خرد نوازی تھی کہ اس گستاخی پر ہمارے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ اس لیے

کہ اس معاملہ کا تعلق ذاکر صاحب کی ذات سے تھا۔ یونیورسٹی کے نظم و نسق سے نہیں اور ذاتی طور پر شاید ذاکر صاحب نے ہمیں معاف کر دیا تھا۔ کیونکہ بعد میں کئی بار ملاقات ہوئی۔ لیکن ذاکر صاحب نے اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

کروڑی مل کالج

جس زمانے میں کروڑی مل کالج کی بزم ادب کا صدر تھا۔ ۔ ۔ پروفیسر سروپ سنگھ کالج کے پرنسپل تھے۔ کروڑی مل کالج میں ان دنوں اردو کے کئی شاندار فنکشن ہوئے۔ ہر سال بزم ادب ایک مشاعرہ کرتی تھی۔ یہ مشاعرہ اتنا مقبول تھا کہ سال بھر لوگوں کو اس کا انتظار رہتا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے مشہور ادیب اور شاعر یہاں اکثر مدعو کیے جاتے تھے۔ اس کالج میں جوش ملیح آبادی بھی آئے۔ پاکستان سے حبیب جالب اور حمایت علی شاعر بھی آئے۔ اردو دنیا میں پہلی بار فراق کا جشن منایا گیا اور جب ذاکر صاحب نائب صدر جمہوریہ ہوئے تو بزم ادب نے انھیں بھی یہاں آنے کی خصوصی دعوت دی۔ ذاکر صاحب نے ہماری دعوت پر کالج میں تشریف لانا منظور کر لیا۔ میں اور اسلم پرویز جب ان کی خدمت میں یہ درخواست لے کر حاضر ہوئے اور انھوں نے ہماری درخواست قبول کر لی تو ہم نے عرض کیا کہ ہم آپ کو لینے کے لیے کالج کی طرف سے کسی صاحب کو بھیج دیں گے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا میرے آنے کا دن، تاریخ اور وقت مقرر ہو چکا ہے۔ میرا سیکورٹی کا عملہ مجھے آپ کے کالج پہنچا دے گا اور وہاں تو آپ سب میرے استقبال کو موجود ہوں گے ہی۔ میں نے انتہائی ادب سے عرض کیا کہ یہ تو ضابطہ کی کارروائی ہے۔ لیکن تہذیب اور شائستگی کے بھی کچھ تقاضے ہیں اور ہم اردو والوں کی تو یہ تربیت کا ایک جز ہے۔ ۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ اسلم پرویز اور میں ذاکر صاحب کو لینے آئیں گے اور جب مقررہ دن اسلم پرویز ان کو لینے پہنچے تو ذاکر صاحب نے انھیں اپنی کار میں اپنے پاس بٹھایا اور راستے میں باتیں کرتے ہوئے کالج تک ساتھ آئے۔

ہم لوگ متنازہ ہاسٹل میں رہتے تھے۔ کھانا ٹھیک ٹھاک ملتا تھا۔ میس کا باورچی کسی بات پر ناراض ہو کر ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کی جگہ دوسرا باورچی آیا۔ ہاسٹل کا کھانا پہلے ہی بدمزہ ہوتا تھا۔ اس نئے باورچی کے ہاتھ کا کھانا اور بھی بدمزہ ہو گیا۔ کبھی نمک بہت کم ہوتا کبھی تیز ہوتا کبھی مرچیں زیادہ ہوتیں۔ غالباً اتنے بڑے پیمانے پر کھانا پکانے کا اسے تجربہ نہیں تھا۔ لڑکوں نے وارڈن سے شکایت کی۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ کچھ لڑکے ذاکر صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ دوسرے دن شام ہم لوگ شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ اس دن کھانے میں نمک غیر معمولی حد تک تیز تھا جس پر

کچھ لڑکے ادھم مچا رہے تھے۔ اچانک وہ لڑکے خاموش ہوگئے اور ڈائننگ ہال میں سناٹا چھا گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ذاکر صاحب تشریف لائے تھے۔ ان کے ساتھ انس صاحب بھی تھے جو ہمارے وارڈن تھے سب لڑکے کھڑے ہوگئے۔ ذاکر صاحب نے پورے ڈائننگ ہال میں گھوم کر سب لڑکوں سے دعا سلام کی اور پھر ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ویٹر سے کھانا منگوایا۔ سب لڑکوں کے سامنے کھانا پہلے ہی آچکا تھا۔ ذاکر صاحب نے لڑکوں سے کہا بسم اللہ کیجیے اور خود کھانا شروع کر دیا۔ اس دن نمک اتنا زیادہ تھا کہ منہ میں نوالہ رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ مگر ذاکر صاحب آرام سے کھانا کھاتے رہے۔ انھیں دیکھ کر تمام لڑکے مجبوراً کھانا کھاتے رہے۔ کھانا ختم ہوگیا تو ذاکر صاحب ہاتھ دھو کر اسی میز پر آکر بیٹھ گئے اور ہاتھ کے اشارے سے سب لڑکوں کو بلا لیا۔ جب سب لڑکے آگئے تو ذاکر صاحب نے بہت پیار سے اور نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا، میں مانتا ہوں کہ آج کھانے میں نمک بہت زیادہ تھا۔ یہ مسئلہ سلجھانے کا ایک طریقہ وہ ہے جو آپ لوگوں نے اپنایا یعنی شور و غل ۔ ۔ ۔ ۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ مہذب طریقے سے احتجاج کریں۔ گھر میں بھی تو کھانے میں نمک تیز ہو جاتا ہے۔ کیا آپ اسی طرح غل مچاتے ہیں۔ طلبا کو بہت دیر سمجھانے کے بعد ذاکر صاحب نے وارڈن سے کہا کہ ایک دو دن میں باورچی بدل دیجیے۔ ایسا باورچی رکھیے جسے کھانا پکانا آتا ہو۔ پھر طلبا سے مخاطب ہوئے۔ آپ کو کچھ دن سے کھانا خراب مل رہا تھا مجھے افسوس ہے۔ اس کی تلافی اس طرح کی جاتی ہے کہ وی سی فنڈ سے دو دن تک آپ کو وہ کھانا ملے گا جس کی آپ فرمائش کریں گے لڑکوں نے وائس چانسلر کی اس فیاض دلی پر بہت دیر تک تالیاں بجائیں۔

ایک دفعہ ایک فارم پر دستخط کرانے کے لیے میں اور اسلم پرویز دونوں ذاکر صاحب کے پاس گئے۔ ذاکر صاحب اس وقت ہسٹری کے ایک طالب علم سے بات کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو سن کر اندازہ ہوا کہ یہ طالب علم ذاکر صاحب کے کسی دوست کے صاحب زادے ہیں اور ہسٹری میں ایم۔ اے کرنے کے بعد اب پولٹیکل سائنس میں ایم۔ اے کرنا چاہتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے ان سے کہا کہ آپ پولٹیکل سائنس میں دوسرا ایم۔ اے غالباً اسی لیے کرنا چاہتے ہیں کہ ہسٹری میں جتنا مطالعہ ممکن تھا آپ کر چکے اور اب اس مضمون میں مزید مطالعے کی گنجائش نہیں۔ طالب علم ذہین تھا، اس طنز کو سمجھ گیا۔ اس نے بتایا کہ میں تو دراصل ہسٹری ہی میں پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ جو موضوع مجھے پسند ہے وہ صدر شعبہ کو پسند نہیں۔ انھوں نے اس کی جگہ دوسرا موضوع تجویز کیا ہے۔ اس وقت مجھے یہ تو یاد نہیں آرہا کہ صدر شعبہ کا تجویز کیا ہوا موضوع کیا تھا۔ نام اتنی اچھی طرح یاد ہے کہ ذاکر صاحب نے صدر شعبہ کے تجویز کردہ موضوع پر گفتگو کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ موضوع درست نہیں اور پھر کوئی نیا موضوع تجویز کیا۔ جب وہ طالب علم رخصت ہوگیا تو ذاکر صاحب نے ہمارے فارم پر دستخط کر دیے۔ دراصل فارم میرا تھا۔ بات یہ تھی کہ 'ڈیوٹی سوسائٹی' ضرورت مند طلبا کو وظیفے دیا کرتی تھی اور سوسائٹی کا کرتا دھرتا تھا محیط خاں لاحول و لاقوہ...

فارم پر کسی لیکچرر سے دستخط کرانے تھے۔ لیکن ہمیں تو گھمنڈ اپنے ذاکر صاحب پر تھا۔ دستخط کرانے کے لیے سیدھے ان کے پاس پہنچ گئے۔ دستخط کر کے ذاکر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ڈیویٹی سوسائٹی کے انچارج کون صاحب ہیں۔ بیمیرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "جی محیط خاں لاحول ولاقوۃ"۔ ذاکر صاحب مسکرا دیے۔ پھر انھوں نے ہم سے پوچھا آپ ایم۔ اے کس سبجیکٹ میں کریں گے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ کہا سائکلوجی میں۔ ہاسٹل کے کمرے میں ہمارے سینیئر پارٹنر ابوسعید زیدی نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ ہم دونوں کو سائکلوجی میں ایم۔اے کرنا چاہیے۔ معلوم نہیں انھوں نے ہمیں یہ مشورہ کیوں دیا تھا ذاکر صاحب نے کہا کہ ابھی تو آپ کے ایم۔اے تک پہنچنے میں کئی سال ہیں۔ (اس وقت ہم انٹرمیجیٹ فائنل میں تھے)، لیکن جب یہ منزل آئے تو بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے۔ ایم۔اے میں داخلہ لینے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیجیے کہ آپ کو دلچسپی کس مضمون میں ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ دونوں کو اردو ادب سے گہری دلچسپی ہے۔ اس لیے میرا ذاتی مشورہ تو یہ ہے کہ آپ اردو میں ایم۔اے کیجیے۔

جب ہم ذاکر صاحب کے پاس جاتے وہ یہ ضرور پوچھ لیتے کہ آج کل آپ کیا پڑھ رہے ہیں۔ ان دنوں ہم اردو کی جو بھی کتاب پڑھتے اس کا تذکرہ ان سے کرتے۔ یہ کتابیں زیادہ تر شعری مجموعے ہوتے تھے یا پھر ناول اور افسانے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک روز اسی طرح ہم ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ قدرے فرصت سے تھے۔ انھوں نے وہی سوال کیا کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں۔ ہم جو کتابیں پڑھ رہے تھے ان کے نام ہم نے ان کو بتا دیے۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ذاکر صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ دونوں سرسید، شبلی اور حالی کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ اس سے آپ کی بنیاد مضبوط ہوگی۔ دوسرے ہی دن سے ہم لوگوں نے لائبریری سے کتابیں حاصل کر کے ان عظیم شخصیتوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ۔ ۔ ۔

بی۔اے کے بعد بعض وجوہ سے ہمیں دلی آنا پڑا۔ ہم دلی یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اکانومکس میں ایم۔اے کریں۔ داخلہ کا فارم بھر دیا اور داخلہ ہو گیا۔ ابھی فیس جمع نہیں کی تھی کہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی سے ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب کی کوششوں سے دلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو ایک علاحدہ شعبے کی حیثیت سے نیا نیا قائم ہوا تھا۔ ۔ ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی میں اردو پر بہت برا وقت پڑا ہوا تھا۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی جانب سے اس نئے شعبے کے لیے ایم۔اے کے طلبا کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری تھا۔ خواجہ صاحب کو علم تھا کہ ہم اردو میں کچھ الٹا سیدھا لکھتے ہیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ہم اردو میں ایم۔اے میں داخلہ لیں۔ ذاکر صاحب کی ہدایت یاد تھی کہ ہم لوگ اردو میں ایم۔اے کریں۔ اس لیے ہم دونوں نے دلی یونیورسٹی میں ایم۔اے میں داخلہ لے لیا۔

اسلم پرویز کی کتاب "انشاء اللہ خاں انشا" شائع ہوئی تو انھوں نے اس کتاب کی ایک کاپی

اکر صاحب کی خدمت میں بھی بھیجی۔ ذاکر صاحب اس زمانے میں بہار کے گورنر مقرر ہو چکے تھے۔ انشا پر شائع ہونے والی اردو میں یہ پہلی کتاب تھی اور خود اسلم پرویز کی بھی یہ پہلی ہی کتاب تھی۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے جو تفصیلی خط اسلم کو لکھا اس نے ہم دونوں کو بے پناہ متاثر کیا۔ بھلا کسی ریاست کے گورنر کو اتنی فرصت کہاں کہ نوآموز لوگ اپنی کتابیں چھپوا کر اسے بھیجتے رہیں اور وہ ان کتابوں کا نہ صرف سنجیدگی سے مطالعہ کرے بلکہ ان پر تفصیلی رائے بھی خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجے۔ انشاء اللہ خاں انشا پر اگرچہ انھوں نے اپنے تبصرے میں کتاب کے محاسن اور کمزوریوں دونوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی۔ لیکن ان کے لب و لہجے میں شروع سے آخر تک حوصلہ افزائی کا پہلو تھا۔ میں نے اپنی سب سے پہلی کتاب " معراج العاشقین " ذاکر صاحب کو اس وقت بھیجی تھی، جب وہ بہار کے گورنر تھے۔ چونکہ یہ کتاب میرے ایم۔ اے کرنے کے فوراً بعد ہی آ گئی تھی۔ اس لیے ناتجربہ کاری کی بنا پر اس میں بہت سی غلطیاں راہ پا گئی تھیں۔ ذاکر صاحب نے میری کتاب پر بہت تنقید کی۔ کتاب میں قرآن شریف کی آیتوں کے حوالے تھے ان آیتوں میں املا کی بہت سی غلطیاں تھیں۔ ذاکر صاحب نے ان غلطیوں کی نشاندہی کی اور خط کے آخر میں لکھا " میں جانتا ہوں کہ آپ کو عربی نہیں آتی۔ اس لیے ایسا کام نہ کیجیے جس میں عربی کے علم کی ضرورت ہو اور اگر کوئی مجبوری آ پڑے تو عربی کی عبارت سے متعلق کسی عربی داں سے مشورہ کر لینا چاہیے اور خاص طور پر جب قرآن شریف کی آیتوں کا معاملہ ہو تو کسی عالم کو دکھائے بغیر کتاب ہرگز نہ چھاپیے "

ذاکر صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۹۶۵ء میں میری کتاب " مرزا محمد رفیع سودا " شائع ہوئی۔ میں نے ذاکر صاحب کے پی۔ اے کو فون کر کے ملاقات کا وقت لے لیا۔ جب وقت مقررہ پر میں وہاں پہنچا تو ذاکر صاحب کے پاس ہندوستان سے باہر کے کچھ لوگوں کا وفد آیا ہوا تھا، اس لیے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ ذاکر صاحب کے لیے جو کتاب لے کر گیا تھا، وہ ان کے پی۔ اے اکرام صاحب کو دے کر آ گیا۔ تین دن بعد اکرام صاحب کا ایک رسمی خط موصول ہوا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ میری کتاب نائب صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے۔ مجھے یہ بات سخت ناگوار گزری۔ اس سے پہلے قاعدہ یہ تھا کہ جب میں ذاکر صاحب کو اپنی کوئی کتاب بھیجتا تھا تو چوتھے پانچویں دن ان کا خط آتا تھا، جس میں کتاب کی وصولیابی کی اطلاع ہوتی اور پندرہ بیس دن بعد ان کا خط آتا جس میں ذاکر صاحب کتاب کے بارے میں تفصیلی رائے دیتے۔ کتاب کی خوبیوں اور خرابیوں پر بے لاگ تبصرہ ہوتا۔ میں نے کچھ دن ذاکر صاحب کے خط کا انتظار کیا۔ جب خط نہیں آیا تو میں نے اکرام صاحب کو خط بھیجا جس میں لکھا کہ میں نے کتاب اپنے کرم فرما کو بھیجی تھی جو خط ملتے ہی اپنے دست مبارک سے کتاب کی وصولیابی کی اطلاع دیتے تھے۔ آپ میری کتاب نائب صدر جمہوریہ ہند سے واپس لے کر

میرے ذاکر صاحب کو دے دیجیے یا مجھے واپس کر دیجیے۔ خط کے دو چار دن بعد اکرام صاحب کا فون آیا کہ ذاکر صاحب نے دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پروفیسر نثار احمد فاروقی کو بھی کھانے پر بلایا ہے۔ ہم دونوں وقت پر پہنچ گئے۔ میں نے اپنے گستاخانہ خط کی معذرت کی تو ذاکر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ مجھے آپ کا وہ خط بہت پسند آیا۔ ایک تو ادیب اور فنکار میں انا ہونی بہت ضروری ہے اور دوسرے آپ مجھے اپنا سمجھتے تھے، اس لیے تو آپ نے وہ خط لکھا۔ اس موضوع پر دو چار باتیں ہوئیں اور پھر گفتگو کا رخ مختلف ادبی موضوعات کی طرف مڑ گیا۔

اپریل ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ ذاکر صاحب کے پی۔ اے کا فون آیا کہ ذاکر صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ میں گھر پر نہیں تھا۔ مجھے فون کی اطلاع ہوئی تو میں نے پی۔ اے کو فون کیا۔ ملاقات کا وقت نہیں مل سکا۔ تین چار دفعہ کوشش کی۔ ہر بار پی۔ اے نے میرا فون نمبر لے لیا۔ لیکن انھوں نے مجھے وقت نہیں دیا۔

۳ مئی ۱۹۶۹ء کو میرے ذاکر صاحب خدا کو پیارے ہو گئے اور میں ان کی ملاقات سے ہمیشہ کے لیے محروم رہ گیا۔

عبداللطیف اعظمی

حیاتِ ذاکر حسین مرحوم

کی اہم تاریخیں

مرحوم کی زندگی کی اہم تاریخیں لکھنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ ان کے وطن، ان کے ماحولِ خاندانی پس منظر اور ان کی سیرت و شخصیت کی خصوصیات پر اختصار کے ساتھ ایک نظر ڈال لی جائے۔

مرحوم کا وطن قائم گنج تھا جو اتر پردیش کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ جسے ۱۷۱۳ء میں محمد خاں بنگش نے، جن کا تعلق عہد اورنگ زیب سے تھا، اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر آباد کیا تھا۔ ان کے والد کا نام فدا حسین خاں تھا۔ جو قائم گنج کے اسکول سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد (دکن) چلے گئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ انھوں نے بیگم بازار میں مراد آبادی برتنوں کا کاروبار شروع کیا، جس میں بڑی کامیابی ہوئی۔ انھوں نے ذاتی شوق سے قانونی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور اس میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ وکالت کے امتحان میں شرکت کی اور اول درجے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد کاروبار چھوڑ کر وکالت شروع کر دی۔ خدا کے فضل و کرم سے ان کی وکالت چل نکلی اور خوب پیسہ کمایا۔

فدا حسین خاں کے سات بیٹے تھے، لڑکی کوئی نہیں تھی۔ ذاکر حسین خاں تیسرے نمبر پر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین نے ذاکر صاحب کو فخر خاندان کا اعزاز بخشا ہے۔ حیدر آباد کے ایک نومسلم انگریز ماسٹر عبدالغنی ان کے اولین استاد تھے۔ نوجوانی کے زمانے میں ذاکر صاحب کی سیرت و کردار پر ایک صوفی اور درویش حسن شاہ کا گہرا اثر پڑا جو ان کے دادا غلام حسین خاں کے دور کے عزیز ہوتے تھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی کتاب "یادوں کی دنیا" میں لکھا ہے کہ حسن شاہ ہم سب بھائیوں میں ذاکر میاں کو بہت چاہتے تھے۔ ان سے اپنی فارسی کی کتابیں جو تصوف پر تھیں، نقل کرواتے تھے، ذاکر صاحب کا کہنا ہے کہ اس کی وجہ سے میرا اردو خط بہت اچھا ہو گیا۔ جن لوگوں

کو ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا ہے، انھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ حسن شاہ مرحوم و مغفور کے اثرات کا کسی نہ کسی شکل اور کسی نہ کسی روپ میں ضرور اظہار ہوتا ہے۔

ذاکر صاحب جب ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے تو ۱۹۲۰ء کی تحریک ترک موالات میں شریک ہو گئے۔ جس کے بعد مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ جامعہ ملیہ چلے آئے۔ جیسے ان کے چھوٹے بھائی یوسف حسین خاں نے ان کی زندگی کا فیصلہ کن موڑ قرار دیا ہے۔ آگے چل کر موصوف مزید لکھتے ہیں: "انھیں قدرت نے ہم بھائیوں میں سب سے زیادہ حسین، صحت مند اور توی جسم عطا کیا تھا۔"

اس ضروری وضاحت کے بعد اب مرحوم کی زندگی کی اہم تاریخیں ملاحظہ ہوں:

۱۸۹۷ء۔ ۸ ر فروری: ذاکر حسین خاں حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد ماجد فدا حسین خاں بہ سلسلہ وکالت مقیم تھے۔

۱۹۰۷ء۔ ۸ ر دسمبر: اسلامیہ ہائی اسکول۔ اٹاوہ (یوپی) میں داخلہ لیا۔

۱۹۱۱ء۔ ذاکر صاحب مدرسہ اسلامیہ اٹاوہ کی آٹھویں کلاس میں پڑھتے تھے تو اس زمانے میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا: "طالب علم کی زندگی" اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا: "اسے علم کو علم کے لیے پڑھنا چاہیے۔ نیز تعلیم کی ترویج و اشاعت کی کوشش کرے اور اسے اپنی تعلیم کا جزو سمجھے۔"

۱۹۱۳ء۔ اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں انٹر میجیٹ (سائنس) میں داخلہ لیا۔

۱۹۱۵ء۔ کرسچین کالج۔ لکھنؤ میں بی۔ایس۔سی میں داخلہ لیا۔ مگر علالت کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

" " اٹاوہ ہائی اسکول پاس کر کے علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے کہ ان کے بھائی نے خاندان کی ایک صاحب زادی شاہ جہاں بیگم سے ان کی شادی کر دی جن سے تین لڑکیاں ہوئیں سعیدہ بیگم۔ صفیہ بیگم اور رقیہ ریحانہ۔ رقیہ ریحانہ پانچ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ سعیدہ بیگم کی شادی خورشید عالم خاں سے ہوئی اور صفیہ بیگم کی ظل الرحمٰن سے۔

۱۹۱۶ء۔ ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ ان کے مضامین انگریزی ادب۔ فلسفہ اور معاشیات تھے۔

۱۹۱۷ء۔ ایم۔اے۔او کالج کی یونین کے وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔

" " "ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس پر سو روپے کا انعام ملا۔

۱۹۱۸ء - ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے اول درجے میں بی۔ اے پاس کیا۔
۱۹۱۹ء - علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم۔ اے کے پہلے سال کا امتحان پاس کیا۔ مگر ترک موالات کی وجہ سے دوسرے سال کا امتحان نہ دے سکے۔
۱۹۲۰ء - ۲۹ر اکتوبر: علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی۔ ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی چھوڑ کر جامعہ ملیہ میں آ گئے۔
۱۹۲۲ء - بی۔ اے کرنے کے بعد پروفیسر ایڈون کینن کی کتاب: "ایلی منٹری پولیٹکل اکانومی" کا ترجمہ کیا جو "مبادیِ معاشیات" کے نام سے شائع ہوا۔ نیز اسی سال ذاکر صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے برلن (جرمنی) تشریف لے گئے۔
" - ستمبر: ذاکر صاحب نے جرمنی میں تقریباً سوا تین سال قیام کیا۔ اُس زمانے میں ہندوستانی طلبا کی انجمن کے صدر رہے۔ ان کا ایک قابل ذکر کارنامہ یہ بھی ہے کہ برلن کے کادیانی پریس سے دیوان غالب کا خوب صورت ٹائپ میں ایک دیدہ زیب ایڈیشن شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں غالب کی جو تصویر شائع ہوئی تھی، اسے ذاکر صاحب کی ہدایت پر ایک جرمن آرٹسٹ نے بنایا تھا۔ جو اس قدر مقبول ہوئی کہ آج تک وہی شائع ہوتی رہی ہے۔
۱۹۲۸ء - ۲۹ر اپریل جامعہ ملیہ کی فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں مجلس امنا (ٹرسٹیز) کا قیام عمل میں آیا جو جامعہ کے جملہ نظم و نسق کی ذمہ دار تھی۔ اس کے معتمد (سکریٹری) ڈاکٹر ذاکر حسین مقرر ہوئے۔
۱۹۳۱ء افلاطون کی مشہور کتاب "اسٹیٹ" کا ترجمہ ذاکر صاحب نے ایم۔ اے کے زمانۂ طالب علمی میں شروع کیا تھا۔ یہ ترجمہ "ریاست" کے نام سے اسی سال شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔
" - ۵ر تا ۷ر مارچ: ہندوستانی اکیڈمی یو پی (الٰہ آباد) کی دعوت پر ذاکر صاحب نے ایک مبسوط مقالہ پڑھا جو "معاشیات، مقصد اور منہاج" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔
۱۹۳۵ء - ۱۴ر اگست: کاشی ودیا پیٹھ (بنارس) کے کل پتی (وائس چانسلر) ڈاکٹر بھگوان داس کی دعوت پر ذاکر صاحب نے قومی تعلیم کے موضوع پر ایک خطبہ پڑھا، جس کے آغاز میں موصوف نے فرمایا: "میرا پہلا خیال یہی تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے معافی چاہوں اور یہ لکھوں کہ شاید آپ نے تار میں غلط آدمی کا پتہ لکھ دیا ہے۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ شاید اس بلاوے میں ایک اور بات چھپی ہے۔ یعنی یہ کہ جامعہ ملیہ میں

میرے ساتھی قومی تعلیم کا جو کام بڑے کٹھن حالات میں کر رہے ہیں، اس میں کاشی ودیا پیٹھ کے بھائی اور ساتھی جو خود اسی قسم کے کام میں لگے ہوئے ہیں، ہماری ہمت بڑھاتے اور اس پر اپنی پسند کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنی ذات کی طرف سے معافی مانگ لیتا مگر میرے دل میں آپ کے کام اور آپ کے کام کرنے والوں کی جو عزت ہے اس نے اجازت نہ دی کہ ان کی اس ہمت افزا دعوت کو رد کر دوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت آپ کے سامنے حاضر ہوں۔"

۱۹۳۶ء ۱۰ مارچ: ذاکر صاحب نے بچوں کی تربیت کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے پہلی قسط نشر کی۔ اس کے بعد دوسری قسط ۸ اپریل کو اور تیسری و آخری قسط ۲۶ اپریل کو۔

〃 ۱۵ مئی: ذاکر صاحب نے "اچھا استاد" کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے تقریر نشر کی، جس کے بالکل آغاز میں انھوں نے فرمایا: "آدمی کی زندگی ہمیشہ کسی دوسری زندگی سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کسی دوسری ذہنی زندگی سے روشن ہوتا ہے۔ زندگی کی لہلہاتی باڑی میں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اور یوں ہر انسان کسی دوسرے کا استاد، سکھانے والا، بنانے والا اور بنانے والا ہوتا ہے۔" آگے چل کر مزید فرماتے ہیں: "استاد کی کتابِ زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا، محبت کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسان سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہوتا ہے ان سے محبت ہوتی ہے۔ ان ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں۔ ۔ ۔ یہ اس میں مدد دیتا ہے۔ اسی کام میں اپنے دل کے لیے راحت اور اپنی روح کے لیے تسکین پاتا ہے۔"

〃 ۹ اور ۱۰ مئی کی درمیانی شب میں ملک کے مسیحا اور جامعہ ملیہ کے امیرِ جامعہ (چانسلر) ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے اچانک انتقال کے موقع پر ذاکر صاحب نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک تقریر نشر کی، جس میں اپنے مخصوص انداز میں فرمایا: "ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دن سے دنیا کے میدانِ عمل میں قدم رکھا، ان کی شخصیت نے سب کا دل موہ لیا۔ اس لیے کہ وہ نیک تھے۔ سچے تھے۔ مخلص تھے۔ فیاض تھے۔ ۔ ۔ اس سے پہلے کہ ان کی سیاسی خدمات انھیں مشہور کریں، ہزاروں آدمی ان کو اپنا سمجھنے لگے تھے۔ ۔ ۔ ان کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ لوگوں پر اپنا جادو کیا۔ اس وقت ان سب کی نظروں میں ان کی پریم بھری آنکھیں۔ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا۔ ۔ ۔ آج سہ پہر کے وقت جامعہ ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی (جامعہ نگر) کے پہلو میں جا کر دفنایا ہے۔"

۱۹۳۷ء گاندھی جی نے ماہرینِ تعلیم کی کانفرنس بلائی جس میں ذاکر صاحب نے بھی شرکت کی۔ اسکیم اور نصاب تعلیم مرتب کرنے کے لیے جو کمیٹی مقرر ہوئی تھی ذاکر صاحب اس کے چیرمین منتخب ہوئے۔

〃 ۲۹ مارچ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس جوبلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جو خطبہ پڑھا تھا، اس کا عنوان تھا: "مسلمانوں کی ثانوی تعلیم"۔ اس کا آغاز ان الفاظ میں کیا تھا: "اس تاریخی تعلیمی انجمن کے محترم کارکنوں کی خدمت میں اس کی پنجاہ سالہ جوبلی پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس ذرہ نوازی پر جو مجھے اس شعبے کی صدارت کے لیے بلاکر فرمائی گئی۔ دلی شکریہ۔" آگے چل کر فرمایا: "آپ کی کانفرنس کا نام اور اس کے کارناموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ آپ صحیح طور پر تعلیم کو ایک جماعتی کام سمجھتے ہیں۔ فرد کی تمام قوتوں کو پوری پوری نشو و نما جماعت ہی میں ممکن ہے۔ ۔ ۔ تعلیم نام ہی اس کا ہے کہ متعلم کے کُل قوائے جسمانی و ذہنی کی تربیت کرکے ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اسے تمدنی زندگی کے کُل شعبوں کا محرم بناکر اس میں اپنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کے لیے تیار کیا جائے۔ لہٰذا تعلیمی نظام کی تشکیل اس وقت ممکن ہے کہ جماعت کے سامنے کوئی تمدنی نصب العین موجود ہو۔"

〃 ۲۲ اکتوبر: بقول پروفیسر محمد مجیب: "ذاکر صاحب کی زندگی کے ایک رُخ کا آغاز جامعہ ملیہ کی تاسیس سے سامنے آتا ہے جو سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ کرنے کی گاندھی جی کی تحریک کا نتیجہ تھی اور دوسرے رُخ کی ابتدا، اس وقت سے ہوتی ہے جب وہ اس کانفرنس میں شریک ہوئے جو ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو وردھا میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس گاندھی جی کی اس اسکیم پر غور کرنے کی غرض سے بلائی گئی تھی جو دیہی علاقوں کے لیے مفت، لازمی اور خود کفیل تعلیم سے متعلق تھی۔"

۱۹۳۹ء ذاکر صاحب نے گورنمنٹ طبیہ کالج پٹنہ (بہار) کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر طبّی تعلیم پر خطبہ پڑھا، جس میں انتہائی بے تکلفی کے ساتھ اور کسی قدر مزاحیہ انداز میں فرمایا: "ابھی تک میں ٹھیک نہیں سمجھا کہ اس گورنمنٹ طبیہ اسکول کے تقسیم اسناد کے موقع پر میں کیوں بلایا گیا ہوں؟ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تو خیال آیا کہ کہیں میرے نام کے ساتھ جو کچھ دن سے ڈاکٹر کا لفظ لگ گیا ہے، اس سے تو دھوکہ نہیں ہوا۔ کبھی کبھی دیہاتوں اور قصبوں میں لوگوں نے مجھ سے نبض دیکھنے اور نسخہ لکھنے کی فرمائش اسی دھوکے میں کی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں تو یونانی طبیبوں اور ایلوپیتھی کے ڈاکٹروں میں کچھ ایسی بہت بنتی بھی نہیں ہے کہ اس شبہے میں مجھے

یہاں بلایا جاتا . . . پھر گمان ہوا کہ شاید مجھے امکانی بیماریوں کے اس گروہ کا نمایندہ سمجھ کر آپ نے دعوت دی ہو جو آپ کے شریف فن سے استفادہ کرتا ہے اور آپ کے نئے سند پانے والوں کے لیے کم از کم چند سال اور آپ کے بعض وضع دار ساتھیوں کے لیے عمر بھر تختۂ مشق کا کام دیتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں واقعی اور امکانی بیماریوں کی بھی کچھ ایسی کمی نہیں ہے کہ لفظِ انتخاب مجھ تک پہنچتی۔ کسی ایک وجہ پر طبیعت پوری طرح جمی نہیں تو میں نے سوچنا بند کیا اور یہ طے کیا کہ جو تینوں وجہیں سمجھ میں آتی ہیں، انھیں کو ٹھیک مان کر آپ سے کچھ عرض کروں۔"

۱۹۳۸ء ۔ ۴ اگست: استادوں کے مدرسہ (ٹیچرس ٹریننگ کالج) کا افتتاح ہوا اور ذاکر صاحب نے اس موقع پر ایک مختصر تقریر کی۔

۱۹۳۹ء ۔ یکم مارچ: ذاکر صاحب نے انجمن طلبائے قدیم جامعہ کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا: "جب کبھی جامعہ میں کسی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جاتا ہے تو میرا دل تھرتھراتا ہے۔ ایسے مواقع پر فائدہ اٹھا کر میں اہل جامعہ کو یاد دلاتا ہوں کہ عمارتوں کی کثرت کسی ادارے کے لیے قابلِ فخر نہیں ہے۔ اکثر عمارتیں یا تو مقبرے ثابت ہوتی ہیں یا قید خانہ۔ اگر عمارت میں رہنے والے اصل مقاصد کو بھول جائیں تو وہ عمارتیں ان کے مقاصد اور ارادوں کا مقبرہ بن جاتی ہیں عمارتیں مقصود بالذات بن جائیں تو وہ جیل خانہ ہیں، جن سے حوصلوں، امنگوں اور ولولوں کو نکلنے کی راہ نہیں ملتی۔"

۱۹۴۰ء ۔ ۱۱ اپریل: جامعہ ملیہ میں بنیادی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کا افتتاح بابو راجندر پرشاد نے کیا۔ ان کی معرفت ذاکر صاحب نے سیاسی رہنماؤں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "خدا کے لیے ملک کی سیاست کو سدھاریئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے، جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے۔ کمزوروں کو زور آوروں کا ڈر نہ ہو۔ غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے۔ جس میں تمدن، تمدنی امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں۔ جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے۔"

۱۹۴۲ء ۔ مارچ: ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات اور ریڈیو کی تقریریں کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ جسے خاکسار نے مکتبہ جامعہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف اور طباعت کے انچارج کی حیثیت سے مرتب کیا تھا۔ جس کے لیے میری درخواست پر میرے استاد پروفیسر محمد مجیب صاحب نے پیش لفظ لکھا جس پر ۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء کی تاریخ درج ہے۔ ایک موقع پر

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ایک ایسی بات کہی جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ غالباً انھیں کسی وجہ سے میرا یہ اقدام پسند نہیں آیا۔

جب یہ کتاب چھپ کر تیار ہو گئی اور جلد سازی کے مرحلے میں تھی تو ذاکر صاحب مکتبہ جامعہ تشریف لائے اور مجھ سے کتاب کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے صحیح صورت عرض کر دی۔ اسی وقت حسب ذیل عبارت برجستہ لکھی اور فرمایا کہ اسے کتاب میں شامل کر لیا جائے:

آپا جان گرڈا فلپس بورن کے نام

آپا جان! اس کتاب کے آخری حصّے آج چھپ کر آئے ہیں۔ ان تقریروں میں، میں نے جو کچھ کہا ہے اور جس طرح کہا ہے، اس میں آپ کا بہت حصّہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ اجازت دیں تو اس مجموعے کو آپ کے نام منسوب کروں۔

آپ اس وقت بڑی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ آپ نے اپنی محبت اور خدمت سے جامعہ کے سب ساتھیوں کے دل میں جو جگہ بنالی ہے، اس کا اندازہ شاید خود آپ کو نہ ہو۔ اگر درد بٹ سکتا ہے تو یہ سب اس کو تقسیم کر لیتے اور اس کا سارا بوجھ آپ ہی پر نہ چھوڑتے۔ لیکن کیا کیجیے کہ یہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ بس یہ دعا ہے کہ جس نے یہ تکلیف آپ پر رکھی ہے، وہی اس کی برداشت کی طاقت اور اس پر صبر کی توفیق عطا فرمائے اور آپ کی مشکل کو آسان کرے۔

جامعہ نگر

۱۱ر مارچ ۱۹۴۳ء

آپ کا ساتھی
ذاکر حسین

۱۹۴۲ء۔ ۳۱ر مئی: ذاکر صاحب نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے تقریر نشر کی، جس کا عنوان تھا: "ننھا مدرسے چلا" بچوں کے سرپرستوں اور ان کے استادوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "بچے کو آدمی کا پیش رو سمجھیں۔ اسے بے سہارے خود بھی بڑھنے دیں۔ اس کی قدرتی صلاحیتوں اور میلانوں کا احترام کریں۔ سمجھیں کہ یہ ننھی سی جان اپنی نشو و نما کی امکانی تکمیل کی طرف خود قدم اٹھاتی ہے۔ اسے سہارا دیجئے۔ راستے سے کانٹے ہٹا دیجئے۔ مگر اس کے چلنے کی سمت تو نہ بدلیے۔ نہ اس پر اتنی توجہ دیجئے کہ وہ پھر اپنے پر خود توجہ ہی نہ کر سکے۔ نہ اتنی بے اعتنائی برتیے کہ اس کی وہ ضرورتیں بھی پوری نہ ہوں جن میں وہ آپ کا واقعی محتاج ہے۔"

۱۹۴۴ء۔ دلّی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر موریس گائر کی دعوت پر ذاکر صاحب نے "کیپٹلزم" کے عنوان سے دس خطبے پڑھے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

۱۹۴۵ء - ۳ر مارچ: جامعہ ملیہ میں تعلیمی مرکز ہال (کمیونیٹی سنٹر) قائم کیا گیا، جس کا مقصد تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے تعلیم اور تفریح کے مواقع بہم پہنچانا تھا۔ اس ہال کا افتتاح کرتے ہوئے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے فرمایا: "جو لوگ اسکولوں اور کالجوں سے نکلنے کے بعد سمجھتے ہیں کہ ان کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ اب انھیں کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے وہ دھوکے میں ہیں۔ . . بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کے لیے مزید تعلیم کے مواقع فراہم کرنا بھی تعلیمی نظام کا بہت بڑا مقصد ہے۔"

" ۲۳ر اکتوبر: ذاکر صاحب یونسکو کی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن روانہ ہوئے۔ دوسرے روز جہاز سے جامعہ کی مجوزہ سلور جوبلی کے سکریٹری کے نام اپنے خط میں لکھا: "میں چاہتا تھا کہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے آپ کو ایک تحریر بھیجوں ... لیکن چلتے وقت کس طرح اور کاموں میں پھنسا رہا اور یہ تحریر نہ بھیج سکا۔ راستے میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے ۲۹ر اکتوبر یعنی جامعہ کے یوم تاسیس سے پہلے مل جائے۔"

۱۹۴۶ء - عارضی حکومت قائم ہوئی تو ذاکر صاحب کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

" ۲۴ر فروری: نیو ایجوکیشن فیلوشپ پنجاب کے اجلاس منعقدہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں "ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم" کے عنوان سے ذاکر صاحب نے خطبہ پڑھا۔

" اپریل: مشہور جرمن فریڈرش لسٹ کی ایک کتاب کا ترجمہ بہت پہلے ذاکر صاحب نے کیا تھا۔ اس سال "معاشیاتِ قومی" کے نام سے شائع ہوا۔

" ۱۷ر نومبر: جامعہ کی سلور جوبلی کے اجلاسِ خاص میں "جامعہ کے پچیس سال" کے عنوان سے ذاکر صاحب نے ایک رپورٹ پڑھی۔

۱۹۴۷ء - ۱۷ر جنوری: ذاکر صاحب نے سنّی مجلس اوقاف دہلی کی انتظامی اور مالی بدانتظامیوں کی ایک مفصل رپورٹ پیش کی اسی مجلس کے تحت دریا گنج دہلی کا ایک یتیم خانہ بھی چل رہا تھا۔ جس میں وہ تمام خرابیاں تھیں جو بالعموم یتیم خانوں میں ہوتی ہیں۔ ذاکر صاحب نے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان تمام خرابیوں کی اصلاح کی پُرخلوص کوشش کی۔ مثلاً سب سے پہلے اس کا نام یتیم خانے کے بجائے بچوں کا گھر رکھا۔ نیز انھوں نے طے کیا کہ بچے کسی کے گھر پر کھانے کے لیے نہیں جائیں گے۔ اگر کوئی صاحب ثواب کی خاطر انھیں کھانا کھلانا چاہتے ہیں تو اسے ادارے کو بھیج دیں۔ اسی طرح انھیں چندہ اکٹھا کرنے کے لیے گھر گھر جانے سے روک دیا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب یہاں کے بچوں کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ یتیم بچے ہیں۔

۱۹۴۷ء۔ اگست: ملک کی تقسیم کے بعد اینگلو عربک کالج (اجمیری دروازہ۔ دہلی) کی عمارت پر شرنارتھیوں/ ریفیوجیوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ ذاکر صاحب کی مخلصانہ کوششوں سے اس کا انخلا ہوا۔ اس کے بعد اس کالج کا نام ذاکرحسین کالج کردیا گیا اور اس کے نظام کو مستحکم بنانے کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کے شیخ الجامعہ کو اہم اختیارات تفویض کیے گئے۔

" ۳؍ستمبر: دہلی میں خوفناک فسادات کا سلسلہ شروع ہوا، جس کی وجہ سے مختلف علاقوں مثلاً سبزی منڈی، پہاڑ گنج، قرول باغ وغیرہ کے مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر پرانا قلعہ اور ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے انتظام کے لیے حکومت نے ذاکر صاحب کو مقرر کیا چنانچہ انھوں نے جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کی مدد سے یہ خدمت بہ احسن انجام دی۔

۱۹۴۸ء۔ ۲۸؍نومبر: مسلم یونیورسٹی کی کورٹ نے بہ اتفاقِ رائے ذاکر صاحب کو یونیورسٹی کا وائس چانسلر منتخب کیا۔

۱۹۵۱ء۔ یوپی کے وزیر تعلیم کی خدمت میں لکھنؤ شہر کے دس ہزار دستخطوں سے ذاکر صاحب نے ایک درخواست پیش کی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہمارے بچوں کے لیے ان کی مادری زبان اردو میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

" ۲۹؍نومبر: نئے قاعدے کے مطابق چھ سال کے لیے مسلم یونیورسٹی کا ذاکر صاحب کو دوبارہ وائس چانسلر منتخب کیا گیا۔

۱۹۵۲ء۔ ۱۲؍مارچ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علی گڑھ میں "قومی تعلیم کے مسائل ایک مسلمان کی نظر سے" ذاکر صاحب نے بحیثیت صدر جلسہ ایک خطبہ پڑھا جس میں موصوف نے فرمایا: "اس ملک میں مسلمانوں کی جو جماعت آباد ہے صرف اسی کے مخصوص مسائل پر غور کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس جماعت کی فلاح و بہبود کی مخصوص راہیں تلاش کرنا ہمارا کام ہے۔" اپنے اس خطبے کو ذاکر صاحب نے ان الفاظ پر ختم کیا۔ "خدا کرے کہ آپ کی کوشش اور توجہ سے اس کانفرنس کی زندگی کا نیا دور جو آج شروع ہوتا ہے، پہلے دور سے زیادہ کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہو اور آزاد ہندوستان میں آپ کی مساعی مشکور ہوں۔ آمین۔"

" جولائی: ذاکر صاحب امریکہ کے تعلیمی دورے پر تھے، اسی زمانے میں راجیہ سبھا کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۱؍اگست کو حلف لیا۔

۱۹۵۴ء۔ صدر انجمن ترقی اردو (ہند) کی حیثیت سے ذاکر صاحب نے صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں یوپی کے دو لاکھ بالغ شہریوں کے دستخطوں سے ایک درخواست/ میمورنڈم

پیش کیا، جس میں یو پی میں اردو کو دوسری علاقائی زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔
۱۹۵۴ء۔ ذاکر صاحب کو پدم وی بھوشن کا خطاب ملا۔
" ۵ اردسمبر: یونسکو کی طرف سے ذاکر صاحب عرب ممالک میں بنیادی تعلیم کو روشناس کرانے کے لیے قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے۔
۱۹۵۵ء۔ ۱۲ رنومبر: وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو مسلم یونیورسٹی تشریف لائے تو ذاکر صاحب نے ان کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا: "میری کیسی خوش نصیبی ہے کہ اپنے محبوب اور محترم مہمان کے خیر مقدم کا شرف حاصل ہوا۔"
۱۹۵۶ء۔ ذاکر صاحب راجیہ سبھا کے دوبارہ ممبر نامزد کیے گئے۔ ۲۶ راپریل کو حلف لیا۔
" مئی۔ شاہ ابن سعود کی دعوت پر سعودی عرب کا پندرہ روز کا دورہ کیا۔ اس موقع پر انھیں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا اس کے جواب میں وضاحت سے بیان کیا کہ: "ہندوستان کے مسلمان تاریخ کا اہم رول ادا کرنے پر مامور ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کا مقام ہندوستانی قوم میں آج خاص حیثیت رکھتا ہے۔۔۔ مسلمانانِ ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیرِ اقتدار نہیں لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے۔ وہ ایک آزاد جمہوریہ میں آزاد شہری کی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔ اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہیے مسلمانوں کی وہی ہندوستانی زندگی میں ہے۔"
" ۱۵ رستمبر: مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی معیاد میں تقریباً سوا سال باقی تھے کہ ذاکر صاحب اس سے استعفا دے کر جامعہ نگر واپس آگئے۔ اس موقع پر ذاکر صاحب کے دیرینہ اور مخلص ساتھی نیز مسلم یونیورسٹی کے ممتاز دانشور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس اقدام سے روکنے کے لیے ایک طویل اور انتہائی جذباتی انداز میں خط لکھا، مگر وہ جو فیصلہ کر چکے تھے، اس کو بدلنے کے لیے کسی حالت میں تیار نہیں ہوئے۔ وہ اپنے اس غیر مطبوعہ خط کے آخر میں لکھتے ہیں: "قصہ مختصر یہ کہ اپنا ٹرم پورا کر لیجئے، پھر چھوڑ دیجئے۔ ایسا کیجئے گا تو فتنہ دب جائے گا اور آپ کا کچھ نہ بگڑے گا۔ آپ سب کی آنکھ کا تارا بنے رہیں گے اور یہ یونیورسٹی اور یہاں کے مسلمان ہمیشہ آپ کے شکرگزار رہیں گے۔ ڈیڑھ دو سال کی بات ہے۔ انتہائی ناگواری کے ساتھ بھی اتنی مختصر مدت کاٹ دی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف اس سے ہم سب تباہی سے بچ جائیں گے۔"
۱۹۵۷ء۔ ۲۸ رجنوری: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جلسۂ تقسیم اسناد کی ذاکر صاحب نے صدارت کی اور خلافِ روایت اردو میں خطبہ پڑھا۔ پرو چانسلر نواب محمد احمد سعید خاں چھتاری اور وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

جناب شیخ جب جناب والا کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے میرا تعارف کرا رہے تھے تو میں سوچتا تھا کہ کیا میں کوئی اجنبی ہوں، جس کا یوں تعارف کرایا جا رہا ہے اور مجھے میرؔ کا وہ مشہور شعر یاد آ رہا تھا جسے مطابق حال بنانے کے لیے دوسرے مصرعے کو ذرا بگاڑنا پڑتا ہے:

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

یہ کیسے کہوں: "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" کہ گل تو خوب جانتا ہے اس لیے یوں کہوں گا:

"گل بھی خوب ہی جانے ہے ہم کو، باغ بھی سارا جانے ہے"

پھر بھی جی چاہتا ہے کہ میں اس دانش گاہ کے اور اپنے تعلق کو جس طرح محسوس کرتا ہوں اس کا کچھ ذکر آپ سے کروں"

اپنے خطبے کے آخر میں ڈگری حاصل کرنے والوں سے خطاب کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے فرمایا: "تمہارا راستہ تمہاری فطری انفرادیت سے شروع ہوتا ہے اپنی انفرادی صلاحیتوں کی ہر جہتی نشوونما کرکے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرکے مستقل سیرت کے مقام سے گزرتا ہے اور جب یہ سیرت کسی اعلیٰ قدر مطلق کی خدمت گزار بن جاتی ہے تو یہی راستہ شخصیت اخلاقی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ بہت دشوار گزار ہے مگر انسانی زندگی کے شایان شان راستہ یہی ہے اور باوجود اپنی صعوبتوں کے بڑا ہی دلکش ہے یہ راستہ۔ اس پر چلنے کے لیے کمر کس لو میرے نوجوان دوستو۔ مسافروں کا نگہبان اور راہ گیروں کا رکھوالا تمہارے سفر کو برکتوں سے بھر دے"

۱۹۵۷ء۔ جولائی: ذاکر صاحب بہار کے گورنر مقرر کیے گئے۔

۱۹۵۸ء ۱۲ تا ۱۴ دسمبر EDUCATION RECONSTRUCTION IN INDIA کے عنوان سے ذاکر صاحب نے سردار ولبھ بھائی پٹیل میموریل لکچر دیا جو ستمبر ۱۹۵۹ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا اور جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے قلم سے مئی ۱۹۶۲ء میں "ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم" کے نام سے شائع ہوا۔

۱۹۶۲ء ۷ مئی۔ ذاکر صاحب نائب صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔

〃 ذاکر صاحب کو ملک کا سب سے بڑا خطاب "بھارت رتن" ملا۔

۱۹۶۳ء۔ ذاکر صاحب کی چند مشہور اور مقبول کہانیاں یعنی "ابو خاں کی بکری اور چودہ اور کہانیاں" بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی گئیں۔

〃 اشاعت اسلامیہ ہائی اسکول کی ڈائمنڈ جوبلی منائی گئی جس میں ذاکر صاحب نائب صدر جمہوریۂ ہند نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔

۱۹۶۴ء۔ صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن کے قائم مقام کی حیثیت سے ذاکر صاحب نے صدر جمہوریہ کے فرائض انجام دئے۔
" ذاکر صاحب الجیریا اور مراکش کے خیرسگالی مشن پر گئے اور کویت، سعودی عرب، جارڈن، ترکی اور یونان مئی و جون ۱۹۶۵ء میں پہنچے اور جولائی ۱۹۶۶ء میں افغانستان گئے۔ ان کے مدت العمر کے مخلص اور بے لوث رفیق کار پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اپنی کتاب "ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ایک سوانح" کے آخر میں لکھا ہے: "اپنے عہدے کی مدت ختم ہونے تک وہ خاموشی کے ساتھ اپنے تصور کے ہندوستان اور ہندوستانی کی تصویر بنانے میں مصروف رہے۔"
" ۲۷مئی: وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے حادثۂ وفات پر نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "ہم اپنے زمانے کے نہایت ممتاز ترین آدمیوں میں سے ایک کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں جو سترہ برسوں تک ہماری جمہوریہ کی رہبری کرتا رہا۔ نہرو ایک ایسی چٹان تھے جس پر ہم نے اپنے اعتماد کی عمارت کھڑی کی تھی۔ وہ ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے مزاج میں امارت پسندی تھی، لیکن انھوں نے اپنے آپ کو جمہوری آدرشوں، جمہوری اداروں اور جمہوری طریقۂ کار کے لیے وقف کر دیا تھا۔
۱۹۶۷ء۔ ۹مئی: ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہند منتخب ہوئے اور ۱۳مئی کو انھوں نے صدارتی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے انھوں نے جو کچھ فرمایا، اس کا لب لباب یہ ہے: سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور اس کے باشندے میرا کنبہ۔ عوام نے کچھ عرصے کے لیے مجھے اس کنبے کا سربراہ منتخب کیا ہے۔ میں سچی لگن سے اس گھر کو مستحکم اور خوب صورت بنانے کی کوشش کروں گا، تاکہ یہ گھر ان عظیم لوگوں کے شایانِ شان بن سکے جو انصاف۔ خوش حالی اور شائستگی کی بنیادوں پر زندگی سنوارنے میں لگے ہیں۔

اس زمانے میں جب ذاکر صاحب کا صدارتی الکشن ہوا تو راقم الحروف ماہنامہ صبح (دہلی) کا مدیر تھا۔ موصوف کی کامیابی کے بعد خاکسار نے لکھا تھا: "ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہندوستان کے سب سے بڑے اور معزز عہدے کے لیے یعنی صدارت جمہوریہ کے لیے بہت بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئے ہیں۔ اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس واقعے کو آزاد ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہوگی، صرف اس لیے نہیں کہ فرقہ واریت کے مقابلے میں نیشنلزم کو، تنگ مذہبیت کے مقابلے میں سیکولرازم کو انتشار کے خلاف اتحاد کو اکثریتی فرقے کے

امیدوار کے مقابلے میں اقلیتی فرقے کے ایک فرد کو شاندار کامیابی ہوئی۔ ان باتوں کو بھی اہمیت حاصل ہے، مگر میرے خیال میں اس کامیابی کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ قوم نے ایک ایسے شخص کو سربراہ مملکت منتخب کیا جس نے سیاست کی ہنگامہ خیزیوں سے الگ رہ کر انتہائی خاموشی کے ساتھ قومی تعلیم کی خدمت کی تھی اور زمانہ حال کے جوڑ توڑ کے فن سے یکسر ناواقف ہے۔"

صبح کے اسی شمارے میں ذاکر صاحب کے دیرینہ اور مخلص رفیق کار اور میرے استاد ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے:
"ڈاکٹر ذاکر حسین — شیخ الجامعہ سے صدر جمہوریہ تک"

۱۹۶۹ء ۳ مئی: بالآخر وہ وقت آ گیا جس سے ہر شخص کو گزرنا ہے۔ چنانچہ پونے گیارہ بجے دن کو اپنے پروردگار کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ زندگی بھر کے ساتھی پروفیسر محمد مجیب صاحب نے لکھا ہے: "ذاکر صاحب نے محسوس کیا کہ آسام اور نیفا کے دورے کی تھکان جو کچھ ہی روز پہلے ختم ہوئی تھی، اب باقی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنا معمول پورا کرنا چاہا۔ ادھر ڈاکٹر ان کے معائنے کے لیے آنے والے تھے۔ پونے گیارہ بجے وہ سب جمع ہو گئے۔ وہ ڈاکٹروں سے ایک منٹ کی مہلت لے کر باتھ روم چلے گئے۔ یہ لوگ انتظار کرتے رہے، لیکن ذاکر صاحب واپس نہیں آئے۔ ان کا ذاتی ملازم اسحاق جس نے ان کی تقریباً بیس سال بڑی ذمہ داری اور جفاکشی سے دیکھ بھال کی تھی اور صرف اسے ہی اس کی اجازت تھی، پریشان ہوا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہ پا کر وہ اس طرف گیا، جہاں روشن دان تھا اور اوپر چڑھ کر نیچے دیکھا۔ اس نے اپنے آقا کو دروازے کے قریب پڑا ہوا پایا۔ وہ دروازہ کھولنے کی کوشش میں گر پڑے تھے۔ ڈاکٹروں نے انتہائی کوشش کی، لیکن تھکے ہوئے دل کو دوبارہ حرکت کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ فوراً یہ خبر نشر ہوئی کہ صدر وصال پا گئے۔"
مزید لکھتے ہیں: "غم واندوہ عالم گیر تھا۔ سلطنتوں کے عمائد اور ان کے اپنے اہل ملک لاکھوں کی تعداد ان کی میت کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے۔ ان کا جنازہ دو روز بعد فوجی اعزاز کے ساتھ اٹھا۔ عوام کے بے پناہ مجمع نے انتہائی نظم وضبط کا مظاہرہ کیا۔ جس کو وہ (یعنی مرحوم) پسند کرتے تھے۔ غالباً ہندوستان میں یا مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار مسلم اور غیر مسلم عورتوں نے تین تین مٹھی مٹی قبر میں ڈالی اور مرحوم صدر کے نظریے کے عین مطابق، کہ خالص انسانی رشتے کا مظاہرہ ہو اور عقیدت و پاکیزگی کے عمل میں سب متحد ہوں یہ آخری رسم ادا ہوئی۔

اب وہ جامعہ ملیہ کے احاطے میں تقریباً سو فٹ کی بلندی پر ایک قدرتی پلیٹ فارم پر، جس کے مشرق میں مدرسہ، شمال میں مسجد اور مغرب میں کتب خانہ ہے، مدفون ہیں۔ اس سے بہتر اور موزوں جگہ دوسری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ امن و سکون سے آسودہ ہیں اور چاروں طرف وہ چیزیں ہیں جو ان کی زندگی کو بامعنی بناتی ہیں۔ یعنی ترقی پذیر دماغ۔ علم اور عبادت۔"

کتابیات

مرتّب

گلزار نقوی

کتابیات

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین: مولفہ: پروفیسر محمد مجیب۔ ترجمہ: محمد طیب جامعی
سنہ اشاعت: ۱۹۷۶ء

۲۔ ورودِ مسعود (خود نوشت سوانح حیات) مصنفہ: پروفیسر مسعود حسین
سنہ اشاعت: ۱۹۸۸ء

۳۔ جامعہ کی کہانی۔ مولفہ: عبدالغفار مدھولی
تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۶۵ء

۴۔ یادوں کی دنیا: مولفہ: ڈاکٹر یوسف حسین خاں
تاریخ اشاعت درج نہیں تاریخ دیباچہ: ۵ جنوری ۱۹۶۷ء

۵۔ ہمارے ذاکر صاحب: مصنفہ: پروفیسر رشید احمد صدیقی
تاریخ اشاعت: اگست ۱۹۷۳ء

۶۔ شہید جستجو ـــ ڈاکٹر ذاکر حسین: مولفہ: پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی
تاریخ اشاعت: اگست ۱۹۸۸ء

۷۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ـــ شخصیت و معمار: مرتبہ: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
تاریخ اشاعت: اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء

۸۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ـــ سیرت و شخصیت: مرتبہ: عبداللطیف اعظمی
تاریخ اشاعت: اگست ۱۹۶۷ء

۹۔ تعلیمی خطبات: مصنفہ: ڈاکٹر ذاکر حسین: مرتبہ: عبداللطیف اعظمی
تاریخ اشاعت: ستمبر ۱۹۸۸ء

ذاکر صاحب کی تصانیف

کتابیں

۱ ابو خاں کی بکری اور چودہ کہانیاں
مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۶۳ء ۔۔۔ ۱۳۶ ص
مندرجہ ذیل کہانیاں شامل ہیں: ۔
(۱) ابو خاں کی بکری ۔ (۲) عقاب (۳) سعیدہ کی اماں (۴) جولاہا اور بنیا (۵) چھدّو (۶) اندھا گھوڑا (۷) آخری قدم (۸) سچی محبت (۹) ماں (۱۰) بکاری (۱۱) پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی (۱۲) مرغی اجیر چلی (۱۳) مرغی کا نرالا بچہ (۱۴) اسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم (۱۵) آؤ گھر گھر کھیلیں ۔

۲ اچھا اُستاد
دہلی، لطیفی پریس، ب ت ۔۔۔ ۲۴ ص

۳ افلاطون: ریاست یا تحقیق عدل ۔ مترجم ذاکر حسین
نئی دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۶۷ء ۔۔۔ ۵۵۴ ص

۴ بچّوں کی تربیت
کراچی، ایجوکیشنل پریس، ب ت ۔۔۔ ۳۲ ص

۵ **تعلیمی خطبات**

دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۶۱ء (بار دوم) ۲۰۸ ص
"پہلا ایڈیشن مارچ ۱۹۴۳ء میں نکلا جو عبداللطیف اعظمی نے مرتب کیا تھا"

۶ **حالی محبِّ وطن**

دہلی، اُردو گھر، ۱۹۴۳ء ... ۴۶ ص
اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حالی صدی کے موقع پر

۷ **حسین اور انسانیت**

دہلی، لطیفی پریس، ۱۹۴۵ء ... ۱۳ ص

۸ **دیانت: ڈراما**

دہلی، مراری آرٹ پریس، ۱۹۳۱ء ... ۱۶ ص

۹ **دیوان حکیم اجمل خاں شیدا: مرتب ذاکر حسین**

برلن، کاویانی پریس، ۱۹۲۶ء

۱۰ **ذاکر صاحب: اپنے آئینۂ لفظ و معنی میں**

مرتبہ، ضیاء الحسن فاروقی۔ نئی دہلی
ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ۱۹۸۷ء ... ۲۳۱ ص
"پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے ذاکر صاحب کے مضامین کو اپنے وسیع مطالعے کی روشنی میں بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے"

۱۱ ذاکر صاحب کے خط

پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، 1995ء

۱۲ ذکر حسین

دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۴۲ء ص ۳۲

۱۳ کچھوا اور خرگوش

نئی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۰ء ... ۷۱ ص

۱۴ لسٹ : معاشیات قومی

لاہور، کتاب منزل، ۱۹۴۶ء ... ۶۰۷ ص
"فریدرش لسٹ کی جرمن زبان میں کتاب کا ترجمہ۔
"ذاکر صاحب نے اپنی طرف سے کتاب کی اہمیت اور مصنف کی زندگی کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔"

۱۵ مبادیِ معاشیات : ذاکر حسین، مترجم

علی گڑھ، جامعہ ملیہ علی گڑھ، ۱۹۲۲ء ... ۱۴۰ ص
ایڈورڈ لینن پروفیسر معاشیات لندن یونیورسٹی کی کتاب ایلیمنٹری اکانومی کا اُردو ترجمہ۔

۱۶ معاشیات : مقصد اور منہاج

الہ آباد، ہندوستانی اکیڈمی، ۱۹۳۲ء ... ۱۰۹ ص

۱۷ نگارِ معنی: انتخاب اشعار فارسی: ڈاکٹر ذاکر حسین کی بیاض سے

تقدیم و انتخاب، ضیاء الحسن فاروقی. نئی دہلی، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ۱۹۸۷ء ... ۱۳۶ ص
"ذاکر صاحب کی بیاض سے لیے ہوئے اشعار کے اس انتخاب نے ذاکر صاحب کی شخصیت و سیرت کی تعمیر میں فارسی شاعری کے اثرات دریافت کیے اور ان کی طبیعت، مزاج اور ان کے پسندیدہ اشعار کے مابین ہم آہنگی تلاش کرنے کی ایک خوب صورت کوشش کی ہے۔"

۱۸ ہمارا اتحاد ایک زندہ حقیقت ہے

نئی دہلی، گلاب سنز، ب ت ... ۵ ص

۱۹ ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم

ترجمہ، عابد حسین۔ دہلی، پبلیکیشنز ڈویژن، ۱۹۵۸ء ... ۸۸ ص
"سردار ولبھ بھائی پٹیل لیکچرس ۱۹۵۸ء"

۲۰ انتخاب غالب: مرتبہ، ذاکر حسین

دہلی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء ... ۳۲ ص
غالب کے فارسی کلام کا انتخاب

۲۱ غالب، اسد اللہ خاں

دیوان غالب
برلن، کاویانی، ۱۹۲۵ء ... ۲۷۶ ص

۲۲ قومی تعلیم کمیٹی (واردھا)

بنیادی قومی تعلیم : ذاکر حسین کمیٹی
دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۳۸ء - - - ۲۴۷ ص
"رپورٹ کے انگریزی ایڈیشن میں گاندھی جی کا پیش لفظ شامل ہے"

مضامین

۲۳ آزادی

جامعہ - دلی، جون ۱۹۲۸ء

۲۴ ابدیت یا کھلونا - مترجم، اصغر عباس

اردو ادب - علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳) - - - ۱۱۳ - ۱۱۸ ص
"ذاکر حسین صاحب نے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میگزین میں انگریزی میں یہ مضمون لکھا تھا۔ اس میں علی گڑھ یونیورسٹی کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل کے لیے ایک محکم اور واضح نصب العین پر روشنی ڈالی ہے۔

۲۵ اٹلی، برطانیہ اور بحر روم

جامعہ - دلی، اپریل ۱۹۳۷ء

۲۶ ارشادات
تعلیم و ترقی - دسمبر ۱۹۵۰ء - - - ۴ ص

۲۷ اسپین
جامعہ - دلی، اپریل ۱۹۳۷ء

۲۸ اشتراک

جامعہ۔ دلی، ۱۲، (۲، ۴) فروری، اپریل ۱۹۲۹ء،
ص ۱۴، ۲۴، ۲۷۶، ۲۸۵۔

۲۹ امریکہ، روس اور جاپان

جامعہ۔ دلی، فروری ۱۹۳۴ء

۳۰ انگلستان، امریکہ اور معیشت عالم: ہٹلر کا پروگرام

جامعہ۔ دلی، ۲۰ (۴) اپریل ۱۹۳۳ء ... ۳۷۱۔۳۷۷

۳۱ ایسٹر کا خواب، مترجم ذاکر حسین

جامعہ۔ دلی، ۱ (۵) مئی ۱۹۲۳ء۔
ولہیم شوور سے ترجمہ

۳۲ بابی مذہب

الناظر۔ لکھنؤ، ۱۲ (۷) اپریل ۱۹۱۵ء ... ۲۱۔۳۶ ص

۳۳ برطانوی وزارت کی تبدیلی، جاپان، سیاسی ملاقاتیں اور وسطی یورپ کی تنظیم آئین

جامعہ۔ دلی، جولائی ۱۹۳۷ء ... ۵۷۵۔۵۸۴ ص۔

۳۴ برطانیہ، آئرستان، چین و جاپان

جامعہ۔ دلی، اپریل ۱۹۳۲ء

۳۵ برطانیہ اور اٹلی، یونان میں شاہی جزائر فلپائن کی آزادی

جامعہ۔ دلی، ۲۴ (۱۲)، دسمبر ۱۹۳۵ء۔۔ ص ۱۰۶۳ - ۱۰۷۲

۳۶ بندوبست دوامی

جامعہ۔ دلی، ۷ (۵)، نومبر ۱۹۲۶ء۔۔۔ ص ۳۷۱ - ۳۸۴
"اس مقالہ کا تعلق گزشتہ دو مضامین سے ملتا ہے جو رسالہ جامعہ میں "ہندوستان کی معیشت زرعی"، کے عنوان سے پچھلے شماروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مضمون میں ایک ہندوستانی معیشت کی تاریخ کے مورخ کی حیثیت سے عالمانہ بحث کی گئی ہے۔"

۳۷ (i) بنگال میں عطایہ دیوانی سے قبل (ii) عطایہ دیوانی کے بعد

جامعہ۔ دلی، ۷ (۲) اگست ۱۹۲۶ء۔۔۔ ص ۱۲۲ - ۱۳۴۔

۳۸ بہادر شاہ ظفر (مترجم، ڈاکٹر عابد حسین)

جامعہ۔ دلی، دسمبر ۱۹۶۲ء۔

۳۹ بین الاقوامی قرضے، جرمنی اور انقلاب
جامعہ۔ دلی، ۲۰ (۲)، فروری ۱۹۳۳ء۔۔۔ ص ۹۰ - ۱۹۳۔

۴۰ ترکی اور جنگِ عظیم

جامعہ۔ دلی، ۱۳ (۲)، ۱۹۲۹ء۔۔۔ ص ۹۹ - ۱۰۸

۴۱ ترکی قوم پرستی اور اتحاد تورانی، مترجم ذاکر حسین

جامعہ۔ دلی، مارچ ۱۹۲۸ء ... ص ۵
خالدہ ادیب خانم کی خود نوشت کے ایک باب کا ترجمہ۔

۴۲ تعلیم اور روایتی قدریں۔ مترجم، ڈاکٹر عابد حسین

جامعہ۔ دلی، نومبر ۱۹۶۲ء

۴۳ تعلیم و آزادیٔ فکر:

راہ عمل (۱)۔ جامعہ۔ دلی، اپریل، جولائی ۲۳ ۱۹ء۔
"رسل کی، سماجی تعلیم کے اصول، سے ترجمہ"

۴۴ جاپان اور ہندوستان، انتقال عدن، معاشی کانفرنس روس اور سرمایہ دار ممالک
جامعہ۔ دلی، ۲۱ (۱) جولائی ۳۳ ۱۹ء ... ص ۸۰-۸۸۔

۴۵ جاپان: ایک دل چسپ دستاویز

جامعہ، دلی، جولائی ۱۹۳۵ء

۴۶ جاپان۔ سیاسی ملاقاتیں اور وسطی یوروپ کی تنظیم

جامعہ۔ دلی، جولائی ۱۹۳۷ء

۴۷ جاپان، فرانس، آسٹریا، جرمنی

جامعہ۔ دلی، مئی ۱۹۳۴ء ... ص ۲۹۱-۳۰۲

۴۸ جاپان کا ظلم

جامعہ۔ دلی، ۲۶ (۲)، فروری ۱۹۳۶ء ... ص ۹۲-۱۰۱

۴۹ جاپان، معاشی کانفرنس، جرمنی، آسٹریا

جامعہ۔ دلی، ۲۱ (۳)، ستمبر ۱۹۳۳ء ... ص ۷۲-۲۷۷

۵۰ جامعہ بیت الحکمت

ہمدرد جامعہ، ۱۱ (۲)، مئی ۱۹۴۵ء ... ص ۱۵-۱۶

"علوم اسلامی کی تحقیقات کے لیے جامعہ میں بیت الحکمت کے نام سے ادارہ قائم کرنے کی اپیل۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق صحیح فکرِ اسلامی کی نشر و اشاعت، سیاست، معیشت، معاشرت اور تمدن کے جدید نظریات اور اداروں کو اسلامی تعلیم کی روشنی میں پرکھنا اس کے خاص مقاصد ہوں گے۔"

۵۱ جامعہ کتب خانہ

ہمدرد جامعہ ۱۱ (۴)، جولائی ۱۹۴۵ء ... ص ۱۱-۱۲

"اسلامی اور ہندوستانی تاریخ و تمدن کے متعلق کتابوں کا اچھے سے اچھا ذخیرہ فراہم کیا جائے۔"

۵۲ جامعہ ملیہ نے کیا کیا اور کیا کرنا باقی ہے۔ (مسلمانانِ ہند سے اپیل)

ہمدرد جامعہ، ۱۱، (۱)، اپریل ۱۹۴۵ء

۵۳ جامعہ کا نشان

پیام تعلیم۔ دہلی، جوبلی نمبر ۲۸ (۲، ۳) نومبر، دسمبر ۱۹۴۶ء ... ص ۵۵-۵۷

۵۴ جامعہ ملیّہ کیا ہے؟ مقاصد اور پروگرام

جامعہ۔ دلّی، دسمبر ۱۹۳۸ء

۵۵ جگر کو خراجِ عقیدت

جامعہ۔ دلّی، نومبر ۱۹۶۳ء

۵۶ جمیعتہ اقوام اور جنگِ حبش، جاپان اور حبش نہرا ور حبش

جامعہ۔ دلّی، ۲۴ (۱۰)، اکتوبر ۱۹۳۵ء ۔۔۔ ص ۸۷۱۔ ۸۷۸

۵۷ جنگِ حبش

جامعہ۔ دلّی، ۳۴ (۱۱)، نومبر ۱۹۳۵ء ۔۔۔ ص ۹۶۷۔ ۹۷۱

۵۸ چسٹرٹن کے ایک مضمون کا ترجمہ

علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ، فروری ۱۹۲۱ء

۵۹ چین اور جاپان، منگولیا کی خود مختاری، روس اور چین کا معاہدہ

جامعہ۔ دلّی، اکتوبر ۱۹۳۷ء ۔۔۔ ص ۸۶۷۔ ۸۷۲

۶۰ چین اور منچوریا، جاپان، فرانس، جنوب مشرقی یورپ کا معاشی اتحاد

جامعہ۔ دلّی، ۱۸ (۵) مئی ۱۹۳۲ء ۔۔۔ ص ۴۷۲۔ ۴۷۸

۶۱ چین، جاپان اور دول مغرب، ایک چینی اخبار سے اقتباس

جامعہ۔ دلی، ۲۶ (۱)، جنوری ۱۹۳۶ء۔ ۔ ۔ ص ۸۸-۹۷

۶۲ چین میں اعلیٰ تعلیم

جامعہ۔ دلی، مئی ۱۹۲۶ء
"پیکنگ یونیورسٹی کے چانسلر کے مضمون کا ترجمہ"

۶۳ چین و جاپان اور مغرب، حبش اور جمعیۃ اقوام

جامعہ۔ دلی، ۲۵ (۱)، جنوری ۱۹۳۶ء۔ ۔ ۔ ص ۸۸-۹۴

۶۴ چین و جاپان، برطانیہ، آئرستان، جرمنی

جامعہ۔ دلی، ۱۸ (۳،۴) مارچ۔ اپریل ۱۹۳۲ء۔ ص ۲۸۲، ۲۸۶، ۳۸۴، ۳۸۸۔

۶۵ چین و جاپان کے تعلقات، منگولیا۔ وسائل معاشی چند اعداد۔ جرمن۔ مالیات۔

جامعہ۔ دلی، ۲۶ (۴)، اپریل ۱۹۳۶ء ص ۳۷۹-۳۹۳۔

۶۶ حبش اور اٹلی۔ اسپین، یوگوسلاویہ، رومانیہ، یونان، چین

جامعہ۔ دلی، ۲۴ (۹)، ستمبر ۱۹۳۵ء۔ ۔ ۔ ص ۷۷۷-۷۶۳۔

۶۷ حبش، عقبہ، ترکی، عراق اور ایران، روس

جامعہ۔ دلی، ۲۴ (۷)، اگست ۱۹۳۵ء۔ ۔ ۔ ص ۶۵۱-۶۶۲۔

۶۸ **حکومت اڑلیسہ کا فیصلہ**

ہمدرد جامعہ۔ دلی، اپریل ۱۹۴۱ء
"حکومتِ اڑلیسہ کے پندرہ بنیادی اسکولوں کو بند کرنے کے فیصلے پر ذاکر صاحب کے تاثرات"

۶۹ **حکیم صاحب (حکیم اجمل خاں)**

جوہر جوبلی نمبر۔ دلی، نومبر ۱۹۴۶ء ... ص ۱۷۴ - ۱۷۹

۷۰ **خالدہ ادیب خانم سے انٹرویو**

جامعہ۔ دلی، ستمبر ۱۹۲۳ء

۷۱ **دنیا کی رفتار، ہندوستان، جاپان اور ہندوستان، انتقال عدن**

جامعہ۔ دلی، جولائی ۱۹۲۳ء

۷۲ **ذاکر صاحب نے کہا۔ فرد اور سماجی ذمہ داری**

اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳) ... ص ۱۱۹ - ۱۳۷
"ذاکر صاحب نے مختلف مجالس میں مختلف موضوعات پر جو خامہ فرسائی کی ہے اُن کو سمیٹ کر ایک مضمون کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ جن میں ہندی مسلمانوں کا مسئلہ، مشترکہ تہذیب، تعلیم کا بنیادی مقصد، استاد کا مقصد، شخصیت کی تعمیر، گم شدہ لمحوں کی بازگشت اور آزادی کا مطلب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"

۷۳ **ذکرِ حسین**

علیگ۔ علی گڑھ، ۱۵ اگست ۱۹۵۷ء

۷۴ راہِ عمل

جامعہ۔ دلی، اپریل ۱۹۲۳ء
"برٹرنڈرسل کی کتاب کے ایک باب کا ترجمہ"

۷۵ روس اور ایشیا میں صنعتِ جدید کی ترقی

جامعہ۔ دلی، ۲۷ (۶)، دسمبر ۱۹۳۶ء ... ص ۱۰۱۱-۱۰۱۸

۷۶ روس اور جاپان، امریکہ

جامعہ۔ دلی، فروری ۱۹۳۴ء ... ص ۹۰-۹۸

۷۷ روس تخفیف اسلحہ

جامعہ۔ دلی، ۲۱ (۶)، دسمبر ۱۹۳۳ء ... ص ۵۲۷-۵۷۳ء

۷۸ سعودی عربیہ

مدینہ۔ بجنور، یکم اکتوبر، ۱۹۵۶ء

۷۹ سیرت اور کردار کی تشکیل

کتابی دنیا۔ کراچی، اگست، ستمبر، ۱۹۶۷ء

۸۰ شخصیت کی تعمیر

علیگ۔ علی گڑھ، ۱ (۹)، ۱۰ جنوری ۱۹۵۷ء

۸۱ شمالی یوروپ

جامعہ۔ دلی، ستمبر ۱۹۳۷ء

۸۲ صنعتی تعلیم

جامعہ۔ دلی، (۱)، جنوری ۱۹۲۳ء

۸۳ علم سیاست اور اجتماعی تباہی

جامعہ۔ دلی، ۱۰ (۴۳)، اکتوبر ۱۹۳۵ء ۔۔۔ص ۸۵۹۔۸۶۴
"مشہور اطالوی عالم موسکا کی تصنیف "سیاست بحیثیت علم" سے ماخوذ"

۸۴ علی گڑھ

علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ نمبر ۱۹۵۳ء ۔۔۔ ص ۶

۸۵ علی گڑھ، ۱۹۰۳ء کے بعد

علیگ۔ علی گڑھ، ۱ (۹)، جنوری ۱۹۵۷ء ۔۔۔ ص ۱
"علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کا ایک ۔۔۔ سلسلہ"

۸۶ فاشزم، مترجم ذاکر حسین

جامعہ۔ دلی، ۱۰ (۲۴)، ۱۹۳۵ء ۔۔۔ ص ۸۶۵۔۸۷۰
"مسولینی کے مقالہ کا ترجمہ"

۸۷ قرار یا فرار
نئی روشنی۔ ۱ (۲) ۲۴ جون ۱۹۴۸ء۔ ص ۲
"۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی کے جنم دن کے موقع پر ڈاکٹر صاحب کی تقریر کی ایک رپورٹ۔ ۱۹۴۷ء کے پر آشوب ہنگاموں سے خوف کھا کر وطن چھوڑ کر جانے والوں کو ہمت اور استقلال سے حالات کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ فرار مسئلے کا حل نہیں ہے"

۸۸ قومی تعلیم کا نصب العین

جامعہ۔ دلی، ستمبر ۱۹۳۵ء
"کاشی ودیا پیٹھ کا خطبہ صدارت"

۸۹ قومی تعلیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

تعلیم و تربیت۔ علی گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۲۸۔ جلد (۴)

۹۰ کانگریسی وزارتیں

جامعہ۔ دلی۔ ستمبر ۱۹۳۷ء ۔۔۔ ص ۸۹-۹۳

۹۱ گاندھی جی کا راستہ

جامعہ۔ دلی ۵۶۰ (۵): نومبر ۱۹۶۷ء
"خطبہ گجرات ودیا پیٹھ"

۹۲ مذہب

طلوع اسلام۔ شمارہ نمبر ۱۔ ۱۹۳۶ء

۹۳ **مذہب اشتراک کے بانی**

جامعہ۔ دلّی، ۴: (۳)، مارچ ۱۹۲۳ء ۔۔۔ ص ۱۷۹-۱۹۱

۹۴ **مشرق و مغرب**

جامعہ۔ دلّی، ۸ (۳)، مارچ ۱۹۲۷ء ۱۶۱-۱۷۲ص۔

۹۵ **معاشی دنیا**

جامعہ۔ دلّی، ۴۴ (۴)، اپریل ۱۹۴۷ء ۔۔۔ ص ۳۷-۴۱

۹۶ **معاشی کانفرنس، جرمنی و آسٹریا، جاپان**

جاپان۔ دلّی، ستمبر ۱۹۳۳ء

۹۷ **معاشی کانفرنس، روس اور سرمایہ دار ممالک**

جامعہ۔ دلّی، جولائی ۱۹۳۳ء

۹۸ **معاشیات**

جامعہ۔ دلّی، ۶ (۴)، اپریل ۱۹۲۶ء ۔۔۔ ص ۲۵۵-۲۶۶

۹۹ **معاشیاتِ قومی**

کتاب منزل۔ لاہور، مارچ ۱۹۴۶ء ۔۔۔ ص ۶-۷

۱۰۰ **مکتوبات جرمنی**

جامعہ۔ دلّی، جنوری ۱۹۲۳ء

۱۰۱ **موزہ (ترجمہ)**

جامعہ۔ دلّی، ۳۶ (۳) ص ۲۸۰-۲۸۳ء

"ایک روسی ادیب کے مختصر افسانہ کا ترجمہ جس میں جدید روسی دفتریت کا ایک طنزیہ خاکہ ہے۔ لندن کے "نیو اسٹیٹسمین اینڈ دی نیشن" سے ماخوذ۔"

۱۰۲ مولانا ابوالکلام آزاد

آج کل۔ آزاد نمبر۔ دلی، ۱۹۵۸ء

۱۰۳ نرخِ مبادلہ

جامعہ۔ دلی ۱(۱)، جنوری ۱۹۲۳ء۔۔۔ ص ۴۷۔۵۱

۱۰۴ واردھا تعلیم اسکیم

جامعہ۔ دلی ۲۹(۳)، مارچ ۱۹۳۸ء۔۔۔ ص ۲۳۵۔۲۴۲
• واردھا اسکیم کے اوپر مختلف دانشوروں کے تاثرات پر ذاکر صاحب کا جواب۔

۱۰۵ ہسپانیہ، علاقہ سار، میثاق بلقان

جامعہ۔ دلی، مئی ۱۹۳۴ء۔۔۔ ص ۱۹۴۔۲۰۵

۱۰۶ ہند اور کشمیر کا ناتا

آج کل۔ دہلی، ۸(۸)، دسمبر ۱۹۴۹ء۔۔۔ ص ۲۔۴

۱۰۷ ہزار سالہ جرمن ادب

جامعہ۔ دلی ۶(۵)، مئی ۱۹۲۶ء۔۔۔ ص ۳۱۵۔۳۲۳
"جرمن کے ڈاکٹر موریس گولڈ اسٹائن کے مضمون کا ترجمہ"

۱۰۸ ہندوستان کی معیشت زرعی

جامعہ۔ دلی ۷(۱)، جولائی ۱۹۲۶ء۔۔۔ ص ۴۴۹۔۴۶۳

۱۰۹ ہندوستان کیا ہے۔ در کتاب، ہندوستان کا لسانی مسئلہ
مرتبہ، زیڈ احمد

نومبر ۱۹۴۰ء ... ص ۹۷ - ۱۰۰

۱۱۰ ہند کی مشترک زبان اردو

تحریک۔ دلی، اکتوبر ۱۹۵۳ء

۱۱۱ یورپ اور آنے والی جنگ۔ جرمن، فرانس، برطانیہ، جرمنی میں یہودی

جامعہ۔ دلی، ۲۰ (۵)، مئی ۱۹۲۳ء ... ص ۸۰ - ۸۸۔

۱۱۲ یورپ ایک دل چسپ دستاویز

جامعہ۔ دلی، ۲۴ (۷)، جولائی ۱۹۳۵ء ... ص ۵۴۳ - ۵۵۳۔

پیش لفظ و تعارف

۱۱۳ امام غزالی (عمرالدین ۱۹۴۶ء)

۱۱۴ تعارف۔ درکتاب، قاطع برہان۔ مرتبہ، قاضی عبدالودود
پٹنہ، ادارۂ تحقیقات اردو، ۱۹۶۷ء ... ط۔ی۔ ص

۱۱۵ پیش لفظ۔ تاریخ مشائخ چشت از خلیق احمد نظامی
دہلی، ندوۃ المصنفین، ۱۹۵۳ء

۱۱۶ پیش لفظ۔ درکتاب، ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد۔
مرتب، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۶۴ء
"ذاکر حسین نے مولانا کی کتاب ترجمان القرآن کا پیش لفظ لکھا ہے۔"

۱۱۷ پیش لفظ۔ درکتاب، میری یادداشتیں از مارشل شاہ ولی خاں
نئی دہلی، لکشمی بک اسٹور، ۱۹۶۶ء

۱۱۸ پیش لفظ. نہرو نامہ از ساغر نظامی ۱۹۶۷ء

۱۱۹ تقریب، تعلیم اور سماج از سعید انصاری ۱۹۴۴ء

۱۲۰ حرف آخر، تعلیم کی نئی بنیادیں۔ از ر دولف فریز

مترجم، شیخ غلام حسین۔ لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۵۸ء

۱۲۱ دیباچہ، حسرت موہانی، از عبداللہ ولی بخش

۱۲۲ فکر انسانی کا سفر از تقادر خواجہ غلام السیدین۔ ۱۹۶۶ء)

تقاریر، خطبات، مکاتیب

۱۲۳ آپ کی سند، ایڈیٹر رسالہ جوہر، جامعہ ملیہ کے لیے پیغام

ہمدرد جامعہ۔ دلی، فروری ۱۹۴۳ء

''اس پیغام میں ذاکر صاحب نے کہا کہ محض حاصل کی ہوئی سند یہ بتا سکے گی کہ اس علم سے واقعی کوئی لگاؤ بھی ہے کہ نہیں۔ کوشش کیجئے کہ کم از کم آپ خود اس سند کے بین السطور میں یہ بھی درج پا سکیں گے کہ اس سند سے ذہن کی جو تربیت مقصود ہے وہ بھی آپ کے حصے میں آئی ہے۔''

۱۲۴ آزاد تعلیم کا ایک تجربہ

نئی روشنی۔ دہلی، ۱ (۱۹)، یکم نومبر ۱۹۴۸ء ...ص ۲ ... ''جامعہ جوبلی پر خطبہ''

۱۲۵ آزادی کی سہولتیں اور دشواریاں مبارک

نئی روشنی۔ دہلی، ۳ (۷)، ۱۶، ار اگست ۱۹۴۹ء ... ص ۱-۴
"یوم آزادی کے موقع پر ریڈیائی تقریر۔"

۱۲۶ آسٹریائی فلسفی کوڈین ہوف کلرگ کے افکار پر مبنی

"ینگ مینس انسٹی ٹیوٹ پٹنہ میں ایک لیکچر۔"

۱۲۷ ابوالکلام آزاد، ایک ہمہ گیر شخصیت

آج کل۔ دہلی، آزاد نمبر ۱۹۵۸ء ... ۱۷، (۱۱)، ۱۱-۱۲ ص
"یہ تقریر ۲۳ فروری ۱۹۵۸ء کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی صدارت میں وفات کے دوسرے دن دلی کے ایک تعزیتی جلسے میں فرمائی تھی۔ یہ نیا خواب" رامپور میں ۱۶ فروری ۱۹۶۳ء کو بھی چھپی ہے۔"

۱۲۸ اراکین دارالمصنفین سے خطاب

اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳) ص ۱۳۸-۱۳۹
"ذاکر صاحب مشترکہ تہذیب کے علمبردار تھے۔ اپنی اس تحریر میں اسی مشترکہ تہذیب کو برقرار رکھنے کے لیے عوام سے درخواست۔"

۱۲۹ اردو میری زبان

پٹنہ کے ادارہ تحقیقات اردو کی ایک تقریب میں تقریر، ۱۹۶۲ء

۱۳۰ ایک خط

اردو ادب ۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء ۔۔ ص ۱۴۰
"راج بھون، پٹنہ سے ذاکر صاحب نے ۲۴ر فروری ۱۹۶۲ء کو جناب فاطمی صاحب کو خط لکھ کر دلنو باجی کے انتخاب قرآن مجید پر پیش لفظ لکھنے سے معذرت کی۔"

۱۳۱ بھارت میں تعلیم کا مستقبل

آج کل ۔ دہلی، ۱۲ (۵)، دسمبر ۱۹۵۳ء ۔۔۔ ص ۷۔۴۸
"نشری تقریر"

۱۳۲ تاریخ اسلام کے چند پہلو

جامعہ ۔ دلی، اپریل ۱۹۳۴ء ۔۔۔ ص ۱۷۵۔۱۶۴

۱۳۳ تعلیم اور اس کی الجھنیں

لکھنؤ ۱۹۵۸ء
"۲۸ر جنوری ۱۹۵۸ء کو لکھنؤ یونیورسٹی سے خطاب"

۱۳۴ تعلیم کے لیے کام ۔ کوئمبٹور، راما کرشنن ودیالیہ ۔ ۱۹۶۱ء

"۱۱ر نومبر ۱۹۶۱ء کو راما کرشنن ودیالیہ سے خطاب"

۱۳۵ تعلیمی خطبات ۔ دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۵۲ء

۲۶۰ ص

۱۳۶ **تقریر غالب اکیڈمی کے افتتاح کے موقع پر**

نئی دہلی، غالب اکیڈمی، ۱۹۶۹ء، متفرق صفحات

۱۳۷ **ٹیچرس ڈے کے موقع پر نشری تقریریں**

۵ ستمبر ۱۹۶۶ء

۱۳۸ **جامعہ جوبلی ۱۹۴۵: شیخ الجامعہ کی اپیل**

دہلی، جامعہ نگر، ۱۹۴۵ء ۔۔۔ص ۷

۱۳۹ **جامعہ کے پچیس سال؛ تقریر جلسہ جشن سیمیں ۱۹۴۶ء**

دہلی، لطیفی پریس، ۱۹۴۶ء ۔۔۔ص ۲۹

۱۴۰ **جنگ کے بعد تعلیم**

جامعہ۔ ۴۲ (۳)، ستمبر ۱۹۴۶ء ۔۔۔ص ۲ ۔ ۹
"آل انڈیا ریڈیو سے تقریر"

۱۴۱ **خانۂ فرہنگی (ایرانی کلچر ہاؤس) میں تقریر**

آج کل۔ دہلی، ۱۵ (۱۰)، مئی ۱۹۵۷ء ۔۔۔۔ ص ۵ ۔ ۷
"۲۱ فروری ۱۹۵۷ء کو دہلی میں ایرانی کلچرل مرکز کے افتتاح کے موقع پر ہند اور ایران کے تعلقات پر بصیرت افروز تقریر"

۱۴۲ خطبہ افتتاحیہ: غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر

دہلی، یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۹ء ۔۔۔ ص ۸

۱۴۳ خطبۂ افتتاحیہ نظام اردو خطبات

دہلی، یونیورسٹی دہلی، ۱۹۶۶ء

۱۴۴ خطبہ: دوسری بنیادی تعلیمی کانفرنس جامعہ نگر

دہلی، لطیفی پریس، ۱۹۴۱ء ۔۔۔ ص ۱۵

۱۴۵ خطبۂ صدارت: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

دہلی۔ جامعہ پریس، ۱۹۳۷ء ۔۔۔ ص ۲۳

۱۴۶ خطبۂ صدارت: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۵۲ء علی گڑھ

علی گڑھ، لیتھو کلر پرنٹس، ۱۹۵۲ء ۔۔۔ ص ۲۱

۱۴۷ خطبہ صدارت: اردو ورکرس کانفرنس، ۱۹۵۳ء لکھنؤ

علی گڑھ، نیشنل پرنٹرس، ۱۹۵۳ء ۔۔۔ ص ۳۲

۱۴۸ خطبۂ صدارت۔ شبلی اکیڈمی، بموقع جوبلی

الجمیعتہ۔ دہلی، ۲۳ فروری ۱۹۶۵ء

۱۴۹ خطبہ: کانوکیشن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بمبئی کیو پریس، ۱۹۵۷ء ... ۲۲ ص

۱۵۰ ڈاکٹر انصاری

جوہر جوبلی نمبر۔ دلّی، ۱۹۴۶ء ... ۱۸۰-۱۸۴ ص

"ڈاکٹر انصاری صاحب کے انتقال پر ریڈیائی تقریر۔"

۱۵۱ ڈاکٹر ذاکر حسین: تقاریر

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی گزٹ، ۵۵-۱۹۵۱ء

"علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ ۵۱-۱۹۵۰ء۔ متفرق"

۱۵۲ ڈاکٹر کے۔ جی۔ سیدین صاحب کے ۶۰ سالہ یوم پیدائش کے موقع پر تقریر

۱۶ اکتوبر ۱۹۶۴ء

۱۵۳ سعودی عرب میں ایک خطبہ۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ ۱۹۵۴ء

"سعودی عرب میں مقیم ہندوستانیوں کی طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیہ کے موقع پر۔"

۱۵۴ سماجی بھلائی کے لیے صنعتی تعلیم۔ کھڑک پور۔ آئی۔ آئی۔ ٹی ۱۹۶۲ء

"۱۰ مارچ ۱۹۶۲ء آئی۔ آئی۔ ٹی کھڑکپور سے خطاب۔"

۱۵۵ غالب

ہماری زبان۔ علی گڑھ، ۲۷ (۹)؛ یکم مارچ ۱۹۶۸ء ... ص ۹-۱

"غالب میموریل ہال کا بنیادی پتھر رکھنے کے موقع پر ۱۵ فروری ۱۹۶۸ء پر ایک تقریر۔"

۱۵۶ غیر محدود دماغی آزادی

چنڈی گڑھ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۰ء

"۱۷ دسمبر ۱۹۶۰ء کو پنجاب یونیورسٹی میں دیا ہوا لکچر"

۱۵۷ فرد کا روحانی ارتقاء۔ کلکتہ یونیورسٹی، ۱۹۵۹ء

"۲ جنوری کو کلکتہ یونیورسٹی کو خطاب کیا"

۱۵۸ قومی جنگ کا ادبی محاذ

صبح۔ دہلی، ۶۳ ۱۹۴۳ء ... ص ۱۵-۱۸
"۲۲ راپریل کو نئی دہلی میں قومی جنگ کے ادبی محاذ کے افتتاح کے موقع پر جناب ذاکر صاحب کی تقریر۔"

۱۵۹ محبت، خدمت اور اقدارِ روحانی کی چاکری

نیا خواب۔ رامپور، ۱ (۵)، ۱۶ نومبر ۱۹۹۲ء ... ص ۳
"عرس نظام الدین اولیاء کے موقع پر تقریر۔"

۱۶۰ معاشیات اور جمہور

آواز۔ ۷ راپریل ۱۹۴۲ء ... "۲۲ جنوری کو براڈ کاسٹ۔"

۱۶۱ مکاتیب۔ در کتاب، حنائے علی گڑھ از پروفیسر محمد عبدالقادر

بنگلور ۱۹۸۶ء ... ص ۱۳۸-۱۵۵
"۱۳ خطوط کا مجموعہ جو ذاکر حسین نے مصنف کو معنون کیے۔"

۱۶۲ مولانا آزاد کو اعزازی ڈگری

نئی روشنی۔ ۲ (۹) دہلی، یکم مارچ ۱۹۴۹ء ... ص ۳-۵
"تقریر۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے۔"

۱۶۳ ہندوستانی۔ دہلی،

مکتبہ جامعہ، ب ت ... ص ۷۹
"آل انڈیا ریڈیو پر ہندوستانی کیا ہے؟ کے موضوع پر نشر ہوتے والی تقاریر بشمول تقریر از ذاکر حسین۔"

سوانح و شخصیت

دیگر مصنفین کے قلم سے

کتابیں

۱۶۴ احسن علی مرزا

ڈاکٹر ذاکر حسین ؛ سیرت و شخصیت . مرتبہ مظفر حسین
سرینگر ، شاہین بک اسٹال ، ۱۹۷۲ء ... ص ۲۰۰

۱۶۵ اطہر پرویز

ہمارے ذاکر صاحب . در کتاب ، رشید احمد صدیقی : آثار و اقدار از اصغر عباس .
علی گڑھ ، شعبۂ اردو ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، ۱۹۸۴ء .. ص ۳۶۸-۳۷۲
"اصغر عباس کی کتاب رشید احمد صدیقی : آثار و اقدار میں ، ڈاکٹر اطہر پرویز نے
ذاکر صاحب پر سوانحی مضمون لکھا ہے"

۱۶۶ (غلام) السیدین ، خواجہ

مرد مومن ؛ ڈاکٹر ذاکر حسین : در کتاب ، آندھی میں چراغ
نئی دہلی ، ترقی اردو بیورو ، ۱۹۸۲ ... ص ۲۶۱-۲۹۸
"خواجہ صاحب کا اس کتاب کو لکھنے کا مقصد ذاکر صاحب کے تعلیمی خیالات
منصوبوں اور زندگی کے اصولوں پر مفصل روشنی ڈالنا ہے۔

۱۶۷ امامی ، محمد امام

نقوش و تاثرات : مجموعۂ مضامین . مضمون ، ڈاکٹر ذاکر حسین ۔
بنگلور ، انجمن ترقی اردو بنگلور ، ۱۹۵۸ء

۱۶۸ بیدار، عابد رضا

متاعِ فقیر، ڈاکٹر ذاکر حسین
رامپور، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ۱۹۶۹ء ... ص ۱۷۶
"اس کتاب کے آخر میں متعدد اہم موضوعات کے اوپر ذاکر صاحب کی ذہنی کاوشوں کی ایک مفید و مفصل فہرست شامل ہے۔"

۱۶۹ بیدار، عابد رضا۔ مرتبہ

نثر کا حسن: میرے عہد کے صاحب طرز نثر نگار: ڈاکٹر ذاکر حسین۔
رام پور، رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ۱۹۶۸ء ... ص ۴۵
"تحریروں کے اقتباسات"

۱۷۰ خورشید عالم خاں و شیخ علی (دہلی)

ڈاکٹر ذاکر حسین
دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۵ء ... ص ۱۴۸

۱۷۱ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کمیٹی (حیدر آباد)

ڈاکٹر ذاکر حسین
حیدر آباد، مصنف، ۱۹۷۲ء ... ص ۲۰۰

۱۷۲ ذاکر حسین: ہندوستانی جمہوریت کی علامت

نئی دہلی، پبلی کیشنز ڈویژن، ۱۹۶۹ء ... ص ۴۰

۱۷۳ ذاکر صاحب : ذاتی یادیں

پٹنہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء ... ص ۲۳۰

۱۷۴ رضوی، خورشید مصطفیٰ[۱]

حیات ذاکر حسین
دہلی، مکتبہ برہان، ۱۹۶۹ء ... ص ۳۶۸-۱۸

۱۷۵ رقیہ ریحانہ (ذاکر حسین خان)

آدمی کی کہانی ایک ستارے کی زبانی
پیام تعلیم۔ دلی۔ دسمبر ۱۹۳۱ء

۱۷۶ رقیہ ریحانہ (ذاکر حسین خان)

باچھو
پیام تعلیم۔ دلی۔ نومبر ۱۹۲۸ء

۱۷۷ رقیہ ریحانہ (ذاکر حسین خان)

پن چکی والا
پیام تعلیم۔ دلی۔ ۲۱ اگست ۱۹۲۸ء

۱۷۸ رقیہ ریحانہ (ذاکر حسین خان)

جوگی
پیام تعلیم۔ نئی دہلی۔ مارچ ۱۹۳۹ء

۱۷۹ رقیّہ ریحانہ (ذاکرحسین خان)

سچی محبت
پیام تعلیم۔نئی دہلی،ستمبر ۱۹۳۷ء

۱۸۰ رقیّہ ریحانہ (ذاکرحسین خان)

کھوٹا سونا: ڈرامہ
پیام تعلیم۔نئی دہلی،جنوری ۱۹۳۹ء

۱۸۱ رقیّہ ریحانہ (ذاکرحسین خان)

نِہنگے انڈے
پیام تعلیم۔دلّی، فروری ۱۹۳۰ء

۱۸۲ سعیدہ خورشید عالم

ذاکر صاحب کی کہانی
دہلی۔نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۵ء۔۔۔ص ۹۶

۱۸۳ صدیقی، رشید احمد

ہمارے ذاکر صاحب
نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۳ء۔۔۔ص ۱۹۱

۱۸۴ عبدالحق خاں، مرتب
نقش ذاکر: جامعہ ملیہ اسلامیہ۔۔جشن ذاکر
مجموعہ مضامین، ۱۹۸۷ء۔۔۔ص ۲۱۷

۱۸۵ عبداللطیف، اعظمی

تیسرے راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین۔ نئی دہلی
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء ... ص ۴۸

۱۸۶ عبداللطیف اعظمی

ڈاکٹر ذاکر حسین : سیرت اور شخصیت
دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۶۷ء ... ص ۱۶۰

۱۸۷ فاروقی، ضیاء الحسن

شہید جستجو : ڈاکٹر ذاکر حسین
نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۸۸ ۱۹ء ... ص ۶۰۷
"ذاکر صاحب کی ایک مکمل داستان حیات"

۱۸۸ فہمیدہ بیگم

ڈاکٹر ذاکر حسین : شخصیت و معمار
دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۵ء ... ص ۳۹۹
"ذاکر حسین کی سوانح پر مبنی ایک مکمل کتاب جو ذاکر حسین صدی تقریبات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے"

۱۸۹ قادری، عبداللہ ولی بخش، مرتب

بچوں کے ذاکر صاحب
نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۷ء ... ص ۸۸

۱۹۰ محمد مجیب

ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ترجمہ، محمد طیب
نئی دہلی، نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۶ء ۔۔۔ ص ۲۶۶

۱۹۱ محمد مجیب

ڈاکٹر ذاکر حسین
آج کل۔ دہلی، ۵۵ (۷)، فروری ۱۹۹۷ء ۔۔۔ ص ۴۴
"ماہنامہ آج کل میں محمد مجیب صاحب کی تصنیف کردہ کتاب تبصرے کے کالم میں شائع ہوئی۔ نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے "قومی سوانح حیات کے سلسلے" کے تحت اس عظیم شخصیت کی سوانح کا اردو ایڈیشن شائع کیا ہے"

۱۹۲ فاطمہ امتیاز حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کی اردو خدمات
حیدر آباد، مصنف، ۱۹۶۶ء ۔۔۔ ص ۱۸۳
"مقالہ (ایم۔اے)، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد"

۱۹۳ نذر ذاکر

نئی دہلی، مجلس نذر ذاکر، ۱۹۶۸ء ۔۔۔ ص ۶۶۹
"مجموعہ مضامین، جو ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمت میں ان کی اکہترویں سالگرہ پر پیش کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر تارا چند کا لکھا ہوا اداریہ شامل ہے"

۱۹۴ یوسف حسین خاں

ذاکر میاں
شملہ، مصنف، ب ت ۔۔۔ ص ۳۷

۱۹۵ یوسف حسین خاں

یادوں کی دنیا
اعظم گڑھ، معارف پریس، ۱۹٦٧ء ... ص ۴٧٢
"مصنف کو ڈاکٹر ذاکر حسین کے سگے بھائی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ موصوف نے اپنی آپ بیتی لکھنے میں ذاکر صاحب سے صلاح مشورہ ہی نہیں لیا بلکہ ان کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو بھی قلمبند کیا ہے۔"

مضامین

۱۹٦ آصفہ مجیب

ذاکر صاحب
پیام تعلیم۔ ذاکر نمبر، ستمبر ۱۹٦٧ء

۱۹٧ احمد ضیاء

ڈاکٹر ذاکر حسین کا ادبی مرتبہ۔
کتاب۔ لاہور، جنوری ۴۲ ۱۹ء
"مصنف نے ذاکر صاحب کے ادبی مرتبے کو جانچتے وقت ان کی تخلیقات میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھ کر علم حاصل کرنے کی صلاحیت کو سراہا ہے۔ بکری سے، کچھوے سے، خرگوش سے، حد یہ ہے کہ کنکروں اور پتھروں سے۔"

۱۹۸ اختر، ڈاکٹر، ش

صدر جمہوریہ کے نام کھلی چٹھی
مورچہ۔ گیا (بہار)، ۲۳ر نومبر ۶۸ ۱۹ء

۱۹۹ ارشاد، نقی احمد

ذاکر صاحب کے خط: ایک تبصرہ
خدابخش لائبریری جرنل۔ پٹنہ، خدا بخش لائبریری، (۱۰۵)، ۱۹۹۶ء... ص ۲۳۱-۲۳۵

۲۰۰ اکرام، شیخ محمد

موج کوثر
کراچی، فیروز اینڈ سنز، ۱۹۵۸ء

۲۰۱ (غلام) السیدین، خواجہ

ڈاکٹر ذاکر حسین
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳)... ص ۵۱۔۵۵
"غلام السیدین صاحب نے ذاکر صاحب کی شخصیت و کردار کی حسنات و توصیفات کو اپنے مضمون میں اجاگر کیا ہے۔"

۲۰۲ الہاشمی، رحم علی

ذاکر صاحب
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳)... ص ۶۹-۷۱
"مصنف نے ذاکر صاحب سے ذاتی تعلق کی روشنی میں ان کے روزمرّہ معمولات کا خاکہ کھینچا ہے۔"

۷۳ انصاری، اسلوب احمد

ابو خاں کی بکری اور چودہ اور کہانیاں
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ (۳)۔ ص ۶۳ ـ ۶۸
"انصاری صاحب نے اس مضمون کے ذریعے ذاکر صاحب کی ہمہ جہت خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔

۷۴ باقر مہدی

بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ذاکر صاحب کے کچھ خیالات۔
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹، (۳) ... ص ۸۹ـ۹۷
"بچوں کی نشو و نما اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے ان کی نفسیات کو سمجھنا از حد ضروری ہے اس کے لیے معلم کی شخصیت کو جامع ہونا چاہیے یہی سب کچھ ذاکر صاحب کے خیالات کا خلاصہ ہے"

۷۵ تاراچند، ڈاکٹر

ڈاکٹر ذاکر حسین
نذر عقیدت۔ در کتاب نذر ذاکر

۷۶ رضوی بہار الحق

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، وائس چانسلر اور چند یادیں
تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ، ۱۶ (۲)، فروری ۱۹۹۷ ... ص ۴۷ـ۵۱
"بہار الحق صاحب نے ذاکر صاحب کی نرم و لطیف مزاج کی چند خوب صورت یادوں کو قلمبند کیا ہے۔ اور شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ان کی نمایاں کارکردگی پر روشنی ڈالی ہے"

۷۷ سرور، آل احمد

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹، (۳)۔ ... ص ۵۷ ـ ۶۲

۲۰۸ سرور، آل احمد

ذاکر صاحب کی واپسی پر۔
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹، (۳)...ص ۱۴۲
"آل احمد سرور صاحب کی نظم میں ذاکر صاحب کے کردار کی ایک خوب صورت کاوش دجھلک"

۲۰۹ سرور، آل احمد

ذاکر صاحب کی یاد میں
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹، (۳) ص ۹۹ - ۱۱۰
"آل احمد سرور صاحب نے ذاکر صاحب کا سوانحی خاکہ پیش کیا ہے"

۲۱۰ شمیم حنفی

ذاکر صاحب
جامعہ۔ نئی دہلی، ۹۰ (۷)، جولائی ۱۹۹۳،...ص ۵-۸
"یہ مقالہ پروفیسر شمیم نے ذاکر صاحب کے یوم وفات پر ۳ مئی ۱۹۹۳ کو ذاکر حسین میموریل لکچر، بہ اہتمام ذاکر حسین میموریل ٹرسٹ، دہلی کے موقع پر جامعہ میں پڑھا"

۲۱۱ صدیقی، اولاد احمد

ذاکر حسین ایک معاشی کی حیثیت سے
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹، (۳)...ص ۷۲-۸۳
"صدیقی صاحب نے اس مضمون میں ذاکر صاحب کو ایک ماہر معاشیات کی حیثیت سے متعارف کرایا"

۲۱۲ صدیقی، رشید احمد

آشفتہ بیانی میری
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۱۳ صدیقی، رشید احمد

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳)، ص ۵ ۔ ۴۹
"مصنف کی نگاہ نے ذاکر صاحب کو اقبال کے مرد مومن اور گاندھی کے مرد حق کی شان سے گردانا ہے"

۲۱۴ صدیقی، رشید احمد
ذاکر صاحب
جوہر۔ دہلی، جوبلی نمبر ۴۶ ۱۹ء

۲۱۵ صدیقی، رشید احمد

سیاحت برما
علی گڑھ منتھلی۔ اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۱۸ء

۲۱۶ صدیقی، رشید احمد

مرشد در کتاب مضامین رشید: مجموعۂ مضامین
دہلی۔ مکتبہ اردو ۔۔۔ ص ۵

۲۱۷ صدیقی، رشید احمد
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہ خیال
در کتاب، نذر ذاکر۔ ۱۹۶۸ء۔

۲۱۸ صدیقی، رشید احمد

(۱) ہم نفسان رفتہ۔ (۲) سہیل کی سرگزشت
حیدر آباد، نفیس اکیڈمی، ۱۹۴۷ء

۲۱۹ صدیقی، رشید احمد
یاد یار مہرباں آید ہمی
مسلم یونیورسٹی گزٹ۔ ذاکر نمبر۔ فروری ۱۹۵۷ء

۲۲۰ صدیقی، قاسم

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
اعتمادیہ، بیاد غالب ۔ دہلی، ۶۹-۱۹۶۸ء ۔۔۔ ص ۵
"ذاکر صاحب کے سانحۂ ارتحال پر قاسم صدیقی کے جذبات"

۲۲۱ عابد حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ سے صدر جمہوریہ تک
صبح ۔ دہلی، مارچ ۱۹۶۷ء

۲۲۲ عابد حسین

ذاکر صاحب
نقوش ۔ لاہور، شخصیات نمبر

۲۲۳ عبد الغفار، قاضی محمد

حیاتِ اجمل
علی گڑھ، انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۵۰ء ۔۔۔ ص ۵۳۲-۵۲۸
"قاضی صاحب نے مذکورہ کتاب کے صفحہ نمبر ۲۸ پر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ جو ان کی شخصیت کے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔"

۲۲۴ عبد القیوم، شاہ

ذاکر صاحب اور علی گڑھ
علی گڑھ میگزین، مجاز نمبر ۵۶-۱۹۵۵ء

۲۲۵ عبد الماجد دریا بادی

ذاکر صاحب کیسے بچے
نیا خواب ۔ رامپور، ۴ مارچ ۱۹۶۳ء

۲۲۶ غلام السیدین، خواجہ

ڈاکٹر ذاکر حسین: ایک تقریر جو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ۳رمئی ۱۹۶۹ء کو نشر کی گئی۔
نئی دہلی، آل انڈیا ریڈیو، ۱۹۶۹ء۔۔۔ص ۵

۲۲۷ قادری، عبداللہ ولی بخش

جامعہ اور گاندھی جی
جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء

۲۲۸ کیول دھیر

ایک عظیم شخصیت
پیام تعلیم۔ ذاکر نمبر

۲۲۹ مالک رام

ڈاکٹر ذاکر حسین
صبح۔ دہلی۔ اگست، ۱۹۶۵

۲۳۰ محمد مجیب

ڈاکٹر ذاکر حسین: ایک خاکہ
جامعہ۔ جون ۱۹۶۷ء

۲۳۱ مسعود حسین

ذاکر میاں: چند باتیں
جامعہ۔ نئی دہلی، ۹۲(۷۔۹)، جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۹۵ء۔۔۔ص ۴۷۔۳۷
"ذاکر صاحب کے بھتیجے (مسعود حسین) نے ذاکر صاحب پر ایک سوانحی مضمون لکھا ہے۔"
نقوی، غلام حیدر
ہڈی کی پلیٹ
پیام تعلیم۔ ذاکر نمبر

رسالے اور اخبارات

۲۳۲ **آج کل (دہلی)**

ذاکر نمبر۔ نئی دہلی، آج کل، جون ۱۹۶۹ء

۲۳۳ **آزاد روزنامہ (لاہور)**

جامعہ ملیہ اسلامیہ: ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے تعلیمی مستقبل کے نقش ونگار
لاہور ۱۹۴۶ء

۲۳۴ **اجمل (بمبئی)**

جامعہ ملیہ احیائے ملی کی تعلیمی تجویز کا سنگم ہے
اجمل، بمبئی۔ ۱۹۴۶ء

۲۳۵ **اردو ادب (علی گڑھ)**

ذاکر نمبر۔ اردو ادب، علی گڑھ، شمارہ ۳، ۱۹۶۹ء"

۲۳۶ **اُمنگ**

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر۔ نئی دہلی، جامعہ سینئر سکنڈری اسکول، ۱۹۸۶ء۔۔ ص ۱۵۲ فروری ۱۹۸۶ء۔

۲۳۷ **بھارت ٹائمز (ہندی) نئی دہلی۔ ۱۰ر مئی ۱۹۶۷ء**

۲۳۸ **پیام تعلیم (نئی دہلی)**

ذاکر صاحب کی یادیں۔ نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۔۔۔ ص ۸۰۔ پیام تعلیم (۷) ۶، ۱۹۶۹ء

۲۳۹ **پیام تعلیم (نئی دہلی)**

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر۔ نئی دہلی، مکتبہ جامعہ ۔۔۔ ص ۹۶ در پیام تعلیم، ر (۲) ۲۵، ۱۹۸۷ء

۲۴۰ **پیام تعلیم (نئی دہلی)**

ذاکر نمبر۔ نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، ۶۷-۱۹۶۷ء۔۔۔ص ۱۴۴

۲۴۱ **ترجمان سرحد (پشاور)**

جامعہ ملیہ کی پچیس سالہ کارگزاری شیخ الجامعہ علامہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی رپورٹ
ترجمان سرحد (۴۶)۲۱، ۱۲ دسمبر ۴۶ ۱۹ء

۲۴۲ **جامعہ (نئی دہلی)**

ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر، جامعہ، نئی دہلی، (۱۱) جولائی ۱۹۶۹ء

۲۴۳ **جامعہ (نئی دہلی)**

ڈاکٹر ذاکر حسین کی یادیں: سالنامہ ۷۳-۱۹۷۲
جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۳۔۔۔ص ۵۲، ۳۶، ۳۲
"ہندی اور انگریزی مضامین و منظومات بھی شامل ہیں"

۲۴۴ **جوہر، نئی دہلی۔ جوبلی نمبر ۱۹۳۵ء**

۲۴۵ **دعوت۔ دہلی، ۱۹۵۶ء**

۲۴۶ **سروج۔ دہلی۔ جون ۱۹۶۷ء**

۲۴۷ **علیگ۔ علی گڑھ، ۵۷-۱۹۵۶**

۲۴۸ **علی گڑھ منتھلی۔ علی گڑھ، ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۹ء**

اس رسالے میں ذاکر صاحب کے مختلف احباب کے لکھے ہوئے مضامین کا سلسلہ ذاکر صاحب کا جابجا تذکرہ ملتا ہے۔

۲۴۹ علی گڑھ میگزین ۔ علی گڑھ ۔ ۱۹۵۲ء تا ۱۹۶۲ء

۲۵۰ فروغِ اردو ۔ لکھنؤ، ۱۹۶۹ء

۲۵۱ کتاب نما ۔ نئی دہلی، ۱۹۶۹ء

۲۵۲ گہوارہ

ذاکر نمبر ۔ نئی دہلی، جامعہ مڈل اسکول، ۱۹۸۶ء ۔ ص ۹۲ ۲ "گہوارہ ۱۹۸۶ء"

۲۵۳ مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ

ذاکر نمبر ۔ علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی گزٹ، ۱۹۵۷ء
"مسلم یونیورسٹی گزٹ، علی گڑھ (۱۶ ۔ ۱۳)، ۲۴/۲۶ فروری ۱۹۵۷ء"

۲۵۴ نیا خواب ۔ رام پور ۔ ۶۳ ۔ ۱۹۶۲ء

۲۵۵ نیا دور (لکھنؤ)

نذرِ ذاکر ۔ لکھنؤ، محکمہ اطلاعات، اتر پردیش، ۵۰ ص "نیا دور ج ۲۵، ۳ ۔ ۱۹۶۹ء"

۲۵۶ ہماری زبان ۔ علی گڑھ، ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۷ء

۲۵۷ ہندوستان (ہندی) نئی دہلی، ۱۰ مئی ۱۹۶۷ء

منظومات

۲۵۸ آنند نرائن ملّا

خوشبو کا سفر ۔ اعتمادیہ: بیادِ غالب ۔۔ ۔ دہلی ۶۹ ۔ ۱۹۶۸ء ۔۔۔ ص ۶
"منظوم خراجِ عقیدت"

۲۵۹ **حاذق، محمد**

نظم تبریک: ڈاکٹر ذاکر حسین با لقابہ کی خدمت میں جلالۃ الملک شاہ سعود الاول کے خیر مقدم کے موقع پر۔ علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، شعبۂ فارسی، ب ت۔ ص ۱

۲۶۰ **حرمست الاکرام**

غالبؔ کی صدی روتی ہے
اردو ادب۔ علی گڑھ۔ ۱۹۶۹ء، (۳)۔۔۔ ص ۱۵۳
"ذاکر صاحب کو ایک اور منظوم خراجِ عقیدت۔"

۲۶۱ **خان، احمد سعید نواب چھتاری**

خراجِ عقیدت۔۔۔ اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳) ص ۱۱۱-۱۱۲

۲۶۲ **خلیل الرحمٰن اعظمی**

اب نہ آئے گا کوئی آبلہ پا
اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، (۳)۔۔۔ ص ۱۴۵-۱۴۶
"خلیل الرحمٰن اعظمی نے ذاکر صاحب کی وفات پر ایک پرسوز مرثیہ کہا ہے۔"

۲۶۳ **راغب چھتاروی، حکیم سید نور العین حسن**

قطعاتِ تاریخِ وفات۔۔۔ اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، (۳)۔۔۔ ص ۱۵۶

۲۶۴ **سرور، آل احمد**

نذرِ ذاکر۔ اردو ادب۔ علی گڑھ۔ ۱۹۶۹ء۔ (۳)۔۔۔ ص ۱۴۱
"آل احمد سرور نے ذاکر صاحب کی پر وقار شخصیت اور ان کی مدبرانہ و عاقلانہ صلاحیتوں کو اپنے خوب صورت اشعار میں قلمبند کیا ہے۔"

۲۶۵ **سرور، آل احمد**

نئے علی گڑھ سے خطاب۔۔۔ اردو ادب۔ علی گڑھ ۱۹۶۹ء، (۳)۔۔۔ ص ۱۴۴
"آل احمد سرور صاحب نے ذاکر صاحب کے توسط سے علی گڑھ کے لیے یہ نظم کہی۔"

۲۶۶ **شمیم کرہانی**

فرزندِ ہمالیہ۔ اعتمادیہ: بیادِ غالب۔ دہلی، ۶۹-۱۹۶۸ء... ص ۶

"منظوم خراجِ عقیدت جو اس میگزین میں آل انڈیا ریڈیو کے توسط سے چھپی"

۲۶۷ **شہریار**

ذاکر صاحب۔ اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، (۳)... ص ۱۵۰

"شہریار صاحب نے بہت خوب صورت اشعار میں ذاکر صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے"

ملاحظہ ہو: "نسیم صبح رو رہی ہے وادیٔ گلاب میں
لہو کی ایک بوند بھی نہیں آفتاب میں

۲۶۸ **صبا جائسی علیگ**

ذاکر صاحب کی یاد میں۔ اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ (۳)... ص ۱۵۴-۱۵۵

"صبا جائسی نے ذاکر صاحب کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے سانحۂ ارتحال پر خوب صورت اشعار میں خامہ فرسائی کی ہے"

۲۶۹ **نظر برنی، سید**

ذکرِ ذاکر حسین۔ اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳) ص ۱۵۱

"نظر برنی نے منظوم کلام میں خراج عقیدت پیش کیا ہے"

۲۷۰ **نقش صحرائی**

الوداع: ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند... اعتمادیہ: بیادِ غالب۔ دہلی ۶۹-۱۹۶۸ء... ص ۴

"منظوم خراجِ عقیدت"

۲۷۱ **واحد پریمی**

آہ وہ ماہِ درخشاں سو گیا۔۔ اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳) ص ۱۵۲

"ڈاکٹر ذاکر حسین کے سانحۂ ارتحال پر واحد پریمی کا خراجِ عقیدت"

۲۷۲ **وحید اختر**

وہ ایک شعلۂ منور تھے، جس سے لاکھوں دماغ ...

اردو ادب۔ علی گڑھ، ۱۹۶۹ء (۳)... ص ۱۴۷-۱۴۹

"وحید اختر کی شاعرانہ کاوش بہ وفات ذاکر حسین"

ہمارے لکھنے والے

محمد مجیب	:۔ مورخ ادیب کئی زبانیں جاننے والے ۔ڈاکٹر ذاکر حسین کے بعد جامعہ کے شیخ الجامعہ ۔
رشید احمد صدیقی	:۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر اُردو کے مشہور طنز و مزاح نگار ۔
خالدہ ادیب خانم	:۔ ترکی کی مجاہدۂ آزادی، ادیب ماہر تعلیم ۔ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب سے گہری دلچسپی رکھتی تھیں ۔
یوسف حسین خاں	:۔عثمانیہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اردو کے نقاد ۔ڈاکٹر ذاکر حسین کے چھوٹے بھائی ۔کئی زبانیں جانتے تھے ۔
سید عابد حسین	:۔ فلسفی، ادیب، دانشور، مترجم جامعہ میں فلسفے اور اُردو کے پروفیسر کئی زبانیں جانتے تھے۔
خواجہ غلام السیدین	:۔ ماہر تعلیم، دانشور، ادیب مولانا آزاد کے زمانے میں وزارت تعلیم میں سکریٹری ۔کئی ز ا میں جانتے تھے ۔
حبیب الرحمٰن	:۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر متعدد کتابوں کے مصنف ۔
کے ۔ اے ۔حمید	:۔مشہور صنعت کار ۔ذاکر صاحب کے گہرے دوست فلاح و بہبود کے کاموں میں نمایاں مقام رکھتے تھے ۔
محمد حفیظ الدین	:۔ جامعہ کے پرانے کارکن ۔ صحافی ۔
سعیدہ خورشید	:۔ ذاکر صاحب کی بڑی صاحبزادی، جامعہ کے ابتدائی اسکول کی طالبہ ۔

عبیدالحق	:۔ آرٹسٹ۔ جامعہ کے قدیم طالب علم اور جامعہ آرٹ انسٹیٹوٹ کے سابق استاد۔
ضیاءالحسن فاروقی	:۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر صحافی۔ متعدد کتابوں کے مصنف۔
بمل پرساد	:۔ مشہور مورخ، راجندر پرشاد اکیڈیمی کے اعزازی ڈائریکٹر۔ جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے پروفیسر۔ نیپال میں ہندوستان کے سفیر۔
سلامت اللہ	:۔ جامعہ ملیہ کے استادوں کے مدرسے کے پرنسپل، کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ تعلیم کے صدر۔ انگریزی اور اردو میں تعلیم کے موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف۔
خلیق احمد نظامی	:۔ مشہور اسکالر مذہب، تاریخ اور تصوف پر کئی کتابوں کے مصنف۔
ہیرندرناتھ مکرجی	:۔ آندھرا اور کلکتہ یونیورسٹی، یونیورسٹی میں تاریخ اور سیاسیات کے پروفیسر۔ بنگالی اور انگریزی میں متعدد کتابوں کے مصنف۔
صدیق الرحمٰن قدوائی	:۔ جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر، اسکول آف لینگویجز کے ڈین، سینٹر آف انڈین لینگویجز کے صدر۔
چترا نائک	:۔ پلاننگ کمیشن کی سابق صدر۔ ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان پر متعدد کتابوں کی مصنف۔
رام کمار	:۔ مشہور آرٹسٹ اور ہندی کے ادیب۔
خورشید عالم خاں	:۔ کرناٹک کے گورنر اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے داماد۔
عبداللہ ولی بخش قادری	:۔ جامعہ کے استادوں کے مدرسے کے ممتاز استاد۔ نفسیات اور تعلیم کے موضوعات پر متعدد کتابوں کے مصنف۔ اردو کے ادیب۔
محمد یونس	: جنگِ آزادی کے مجاہد۔ بادشاہ خاں کے روحانی وارث "خدائی خدمت گار" کے ممبر۔ کئی کتابوں کے مصنف۔
ایل۔ پی۔ سنگھ	:۔ شمال مشرقی ریاستوں اور آسام کے گورنر۔ نیپال میں ہندوستان کے سابق سفیر۔
چنچل سرکار	:۔ صحافی، ادیب پریس انسٹیٹوٹ آف انڈیا کے ڈائریکٹر۔
اے۔ جی۔ نورانی	:۔ مورخ کالم نگار، متعدد کتابوں کے مصنف۔ ان کی دو اہم کتابیں ہیں "ذاکر حسین" اور "بدرالدین طیب جی"۔

محمد اکرام خاں : ۔ جامعہ کے استادوں کے مدرسہ کے سابق استاد ۔ ماہر تعلیم ۔ تعلیم کے موضوع پر کئی کتابوں کے مصنف ۔

سید ظہور قاسم : ۔ مشہور سائنس داں ۔ انسٹیٹوٹ، آف اوشنوگرافی کے سابق صدر ۔ انٹارٹیکا ایکسپڈیشن کے لیڈر ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر ۔

کے ۔ نٹور سنگھ : ۔ سیاست داں، مصنف اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ کے نائب صدر ۔ نہرو میموریل فنڈ کے سکریٹری ۔

غلام حیدر : ۔ بچوں کے ادیب، متعدد کتابوں کے مصنف بچوں کے ادبی ٹرسٹ کے بانی ۔

سوشیلا نیر : ڈاکٹر، مجاہدہ آزادی، مہاتما گاندھی اور کستوربا گاندھی کے ساتھ کام کیا ہے لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج کی سابق رجسٹرار ۔ ریاستی اور مرکزی حکومتوں میں وزیر رہ چکی ہیں ۔

بی ۔ شیخ علی : ۔ مورخ ماہر تعلیم ۔ گوا اور منگلور یونیورسٹیوں کے سابق وائس چانسلر ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین پر چار کتابوں کے مصنف ۔

صادق علی : ۔ مجاہد آزادی ۔ گاندھی سمارک سنگھا رلیہ سمیتی اور گاندھی میموریل فنڈ کے صدر ۔ مہاراشٹرا اور تامل ناڈو کے سابق صدر ۔

قیصر نقوی : ۔ جامعہ کے پرانے استاد ۔ سوشل ورکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سوشل ایجوکیشن آفیسر ۔

راج موہن گاندھی : ۔ سینٹر فار پالسی ریسرچ کے ریسرچ پروفیسر ۔

رفیق ذکریا : ۔ مجاہد آزادی، جامعہ اردو علی گڑھ کے چانسلر متعدد کتابوں کے مصنف ۔ درجنوں کالج اور اسکول آپ کی محنت وکاوش سے کھولے گئے ہیں ۔

آل احمد سرور : ۔ اردو کے مشہور نقاد ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر اور پروفیسر، شاعر ۔

فاروق عبداللہ : جموں کشمیر کے وزیر اعلیٰ ۔ شیر کشمیر شیخ عبداللہ کے صاحبزادے ۔

آمنہ آہوجہ : ۔ مشہور آرٹسٹ، خطاط ۔ کئی زبانیں جانتی ہیں ۔

جگن ناتھ آزاد	:۔ مشہور شاعر، ماہرِ اقبالیات جموں یونیورسٹی کے پروفیسر ایمرٹیس کل ہند انجمن ترقی اردو کے صدر۔
عبدالستار	:۔ سماجی کارکن، جامعہ کے قدیم طالب علم۔ دیہاتی لوگوں کی فلاح و بہبود و ترقی کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ۔
خلیق انجم	: محقق، کل ہند انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری۔
عبداللطیف اعظمی	: جامعہ کے قدیم طالب علم اور کارکن ۔ ادیب۔ رسالہ جامعہ کے معاون مدیر ۔